



مدیر جو شمس آبادی

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا

تازہ تر شاہکار

فکر و نشاط

۱۸۸۱ء

نقش و نگار اور شعاع و شبنم کے بعد یہ شاعر انقلاب کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جس میں بالکل نئی نظمیں شامل کی گئی ہیں، یہ تمام نظمیں نابھہ فطرت اور حساس شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں، ایک ایک شعر میں مسائلِ حیات اور دنیا رنگارنگ واقعات پر ایب رنگین تبصرہ کیا ہے جس کی تشریح و تفسیر ذہنوں میں نہیں سما سکتی، اور بیان کی شگفتگی و شاد و ہزاروں حمن نثار ہیں۔ شاعر انقلاب نے اپنے پیام کے ذریعے اپنے مخاطب کو فکر کی بیج و بیج گھاٹیوں میں بھٹکا ہوا چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ اُسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے و ماغ کو الجھنوں میں نہیں ڈالا ہے، بلکہ سا دل کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے اور ان سے وہ موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالم و جد طاری ہو جاتا ہے۔

کتابت، طباعت، کاغذ نہایت اعلیٰ ہے، سائز بڑا، صفحات ۱۲۵ سرورق خوشنما رنگین، کتاب محبد ہے، اور

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ
نیچر کلیم بک ڈپو، جنتی نو اسٹ، دریا کنج، دہلی



ہزارہاؤں میں واقعہ پٹیالہ



نانکن۔ ہن شہر پنا کے دروازہ سے جمہوریہ چین کے قاضی
سی یوف کے صدر کا اطار

بنام قوت و حیات

کلید

آگے گئی صدیوں ہے فنا نہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترا نہ اپنا
چند لاکھ ماہی، دور روپے

منظور شدہ

ڈائرکٹر ان تعلیم

آئے گانہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت بلا ہے مجھ کو صد حریف حکم
سالانہ چند لاکھ روپے
ششماہی چند تین روٹواٹھ آٹے

ریاستہائے میسور، پٹیا لہ وحید آباد (دکن) قیمت فی پرچہ: نو آنے

جلد ۱ بابۂ ماہ جنوری ۱۹۳۸ء نمبر

| نمبر شمار | عنوان | مضمون نگار | نمبر شمار | عنوان | مضمون نگار |
|-----------|--------------------------------|---------------------------------------|-----------|-------|-------------------------|
| ۱ | اشارات | مذہب | ۳ | ۱۶ | کب آئے گا؟ (نظم) |
| ۲ | مسکب چوش (نظم) | چوش شیخ آبادی | ۱۱ | ۱۷ | افواہ |
| ۳ | قرآن اور اس کے مخالفین کا نزاع | جناب مولانا ابوالکلام صاحب آواز لکھنؤ | ۱۳ | ۱۸ | جناب بل مافانہ (نظم) |
| ۴ | رفیقہ حیات کے نام (نظم) | جناب حمید ملک صاحب | ۱۶ | ۱۹ | بلکٹان بکر (نظم) |
| ۵ | انسانی فرائض و حقوق | جناب سید اختر علی صاحب تھری | ۱۷ | ۲۰ | عورتوں کی لڑائی |
| ۶ | باغی شاہ | جناب نند لال صاحب مظلوم بھٹلوئی | ۲۰ | ۲۱ | آزادی تحریک (نظم) |
| ۷ | مقالات زرین | چوش شیخ آبادی | ۲۱ | ۲۲ | شاہی اور تختہ مبدیہ |
| ۸ | انہن کے فوجاؤں سے خطاب (نظم) | جناب علامہ پنڈت برہمچرن صد دتار نیپنی | ۲۲ | ۲۳ | اسے کھش ... (نظم) |
| ۹ | محاشی قومیت | جناب عبدالرحیم صاحب شیخی بی کام | ۲۳ | ۲۴ | حب وطن اور مسلمان (نظم) |
| ۱۰ | نسیم ان کو بھی ساتھ لانا (نظم) | جناب بزم لکھنوی | ۲۴ | ۲۵ | نسر و کافشان |
| ۱۱ | وقت سے جنگ | جناب حمید ملک صاحب | ۲۵ | ۲۶ | ادب ہندو |
| ۱۲ | ریا کاری (نظم) | جناب منیش اکبر آبادی | ۲۶ | ۲۷ | محبت |
| ۱۳ | محبوبی آدمیت | جناب انصاف احمد خان صاحب شیخ آبادی | ۲۷ | ۲۸ | رقی و وقت |
| ۱۴ | جوانی (نظم) | چوش شیخ آبادی | ۲۸ | ۲۹ | نقد و نظر |
| ۱۵ | انہم اور قدم (دکٹر ہیروگی) | مترجمہ جناب اسرائیل احمد خان صاحب | ۲۹ | ۳۰ | استہدات |

(چوش شیخ آبادی پرنٹر و پبلشرز صاحب الملاحی برلی دیس دیس چھوڑ کر دفتر سولہ ایم دریا گنجی نمبر ۵ جلی سے شائع کیا)

ہندوستان کی غلامی کے ذمہ دار

اس وقت تو صرف اس امر پر غور کرنا مقصود ہے کہ اس مہیوں میں
میں، جب کہ تمام قومیں بیدار ہو چکی ہیں، وہ کونسی بنیادی شے ہے جو ہندوستان
کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور بدستور اسے مغلوب و محکوم بنائے ہوئے ہو؟
اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کو غلام بنائے ہوئے ہے، انگریز کا
تدبیر، انگریز کی حکمت عملی، انگریز کے جنگی جہاز، انگریز کی فوجیں، تو ہیں،
اور مشین گنیں، یا انگریز کی وہ چیز جسے ہم اپنی ایشیا، اقبال کے وسیع یعنی
لفظ سے منسوب کرتے ہیں، تو میں نہایت مبند آواز سے کہوں گا کہ یہ غلط اور
سراسر غلط ہے۔

میشاب انگریزی حکومت کا شعور حکمرانی، انگریزی حکومت کی سحری و تہری و ہوائی قوت، اور انگریزی حکومت کا لفظ ایک بہت ہی بیشاب اور ٹیسب چیز ہے، لیکن ہندوستان کے سے دیو پیکر و عظیم الشان براعظم کی طاقت کے سامنے، بشرطیکہ وہ اپنی طاقت کو استعمال کر سکے، بیچارہ انگلستان

ملک

آخر ایسے کے اسباب کیا ہیں؟

ہر چند میں سیاسیات کا ماہر نہیں ہوں، اور اسی وجہ سے یہ بہت ممکن ہے کہ میری رائے سطحی، یا غلط ہو، مگر میں نے خلوص کے ساتھ جس چیز کا تہا چلایا ہے، اجازت دیجئے کہ اُسے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔

میرے نزدیک ہندوستان کو انگریز نہیں، بلکہ غلام بنائے ہوئے ہیں ہندو۔ اور مسلمان — جی ہاں، آپ کے کافروں کو دعو کا نہیں ہوا، میں نے یہی عرض کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اُن کے مذاہب۔

مذہب کا نام شکر آپ چونکے نہیں۔ یہ ہم میں بڑا عجیب ہے کہ
 ادھر مذہب کا نام شتا، ادھر ہم گفت و دو ہاں ہو کر حبت و خیر کرنے لگے۔
 حواس کو مجتمع کر کے میری بات سنیے۔ میں نفس مذہب پر
 کوئی حملہ نہیں کر رہا ہوں۔ یہ میرا مدعا نہیں کہ ہندوؤں مسلمانوں کا مذہب
 ایسا ناقص ہے کہ وہ احمقین غلام بنائے ہوئے ہے۔

میں تو صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو، اور مسلمان، دونوں مذہب اور مفہوم مذہب کو اس غلط طور سے استعمال کر رہے ہیں کہ ان میں مشترک قوم کی مجموعی قوت پیدا ہی نہیں ہونے پاتی، اور اسی وجہ سے ہندو

اب تک آزادی سے محروم ہے۔

کاوش پیہم کے بعد بھی تبدیل نہیں کی جاسکتی — اس لئے آئیے، آج سے ہم یہ عہد کر لیں کہ ایک آن واحد میں تبدیل ہو سکنے والی چیز کو، خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو، ہم اس قدر اقتدار و اختیار بھی نہیں دیں گے کہ وہ اس شے کو سطیس پیہنچا دے جو بھی، اور کسی حالت میں بھی تبدیل نہیں ہو سکتی ہے۔

اچھی طرح اسے ذہن نشین فرمایا جائے کہ مشورہ یہ نہیں دیا جا رہا ہے کہ ہندو، ہندو — اور مسلمان مسلمان نہ رہے، اور یہ دونوں خدا سمجھا سستہ اپنے اپنے مذہب کو ترک کر دیں — ہندوؤں اور مسلمانوں کو کامل اختیار اور مکمل آزادی ہے کہ وہ صرف تمام عمر ہی نہیں، بلکہ حیات بعد الممات میں بھی ہندو اور مسلمان ہی رہیں۔ لیکن صرف اسی قدر متوجہ: درخواست ہے کہ اپنی فلاح و سہو کی خاطر اور اپنی آئندہ نسلوں پر رحم رکھا کر ہندو اور مسلمان یہ ہتھیار لیں کہ وہ

(۱) مذہب کو ایک شخصی اور پرائیویٹ چیز سمجھیں گے۔
(۲) مذہب کی بنا پر ایک دوسرے کو آزار نہیں پہنچائیں گے۔
(۳) مذہب کی رو سے اپنے کو علیحدہ علیحدہ دو قومیں نہیں سمجھیں گے
(۴) اپنے کو ایک قوم سمجھ کر، حبیب کہ درحقیقت ہے، زندگی کے تمام امور میں دوش بدوش جنک کریں گے۔

(۵) اور ہنگام میں اپنے کو "ہندو" اور "مسلمان" کہنے کے عوض خود کو "ہندوستانی" اور صرف "ہندوستانی" کہیں گے۔

(۶) اور اگر کوئی اُن سے اُن کے مذہب کے باب میں سوال کرے گا تو وہ اُسے اپنے وطن عزیز، اور اپنی متحدہ قومیت کا دشمن سمجھنا نہایت درستی کے ساتھ یہ جواب دیں گے کہ "تجھے ہمارے پرائیویٹ حالات، اور ہمارے سرسبز اسمار دریافت کرنے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے؟" اور اُسی کے ساتھ ساتھ اُس سے یہ بھی کہیں گے کہ "تو ایک ایسا خطرناک جاسوس معلوم ہوتا ہے کہ غارتگری کے عوض ہماری ذہنی تلاشی، کن فکر میں لگا ہوا ہے — جا اپنے کپڑے تاک یہ اتنوسناک خبر پہنچے کہ ہم ہندوستانی اور صرف ہندوستانی ہیں، ہندوستانی کے سوا ہم اور کچھ نہیں ہیں۔"

کسی کو یقین ہو کہ نہو — مگر مجھے تو یقین، بلکہ کامل یقین ہے

مذہب اور مہنوم مذہب کے غلط استعمال سے میری یہ مراد ہے کہ ہم مذہب کو زندگی کے ہر سٹکے میں پیش پیش رکھتے، اور حیات کے ہر چھوٹے بڑے نتیجے کو مذہب، اور صرف مذہب ہی کی ترازو میں تولیے کرتے ہیں، ورنہ یہ کہ معاشرت، سیاست ہو کہ اقتصادیات، فنون لطیفہ ہوں کہ علوم ریاضی اور علم طبی ہوں کہ مذہب منزل، یہ تمام مسائل اُس وقت تک ہمارے نزدیک ہیچ، بوج ہیں، جب تک کہ مذہب اُن پر بھر پور تصدیق ثابت نہ کر دے۔

ہندوستان کے علاوہ اس گڑھ ارض میں اور بھی بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں متحدہ مذاہب کا وجود پایا جاتا ہے، لیکن ہندوستان کی طرح وہاں یہ اندھی نہیں ہے کہ مذہب کے بغیر قدم ہی نہ اٹھایا جاتا ہو۔ ہزاروں ہتھوڑیں لکھانے، اور کثیر مشاعر میں خون بہا جانے کے بعد دیگر اقوام کی سمجھ میں یہ بات آچکی ہے کہ مذہب نام ہے ایک ذاتی اور پرائیویٹ تصور کا، ایک ایسے ذاتی اور پرائیویٹ تصور کا جسے زندگی کے دیگر مسائل پر حاوی نہ ہونا چاہیے، اور جس کی بنا پر انسان کو انسان سے نفرت کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔

لیکن ہندوستان میں شکل یہ اڑی ہے کہ یہاں مذہب کے بغیر رٹس تک لینا حرام سمجھا جاتا ہے — ذرا تصور کیجئے، اُس ملک کی بدستور کا جہاں جھینک آتے ہی "الحمد للہ" کا نعرہ لگایا جاتا ہو، اور جہاں جا ہی آتے ہی فوراً چٹکیاں بننے لگتی ہوں — اور جہاں مثل خانے میں داخل ہوتے ہی کان پر ڈورالپیٹ لیا جاتا ہو —

میں، حبیب کہ اسی عرصے کو چکا ہوں، مذہب کی متغیر نہیں کرنا چاہتا، لیکن اتنا کہوں گا اور ضرور کہوں گا کہ مذہب لاکھ مقدس سہی، مگر اُس کے سبب سے وطنیت کے حقوق کو مجروح نہ کرنا چاہیے — کیونکہ کسی چیز کو خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو، عقل انسانی اس کی جائز نہیں، حتیٰ کہ وہ زندگی کے بنیادی اصول، اور اساسی مسائل کو تباہ کر دے۔ میں اس قول کو بسر و چشم قبول کئے لیتا ہوں کہ مذہب ایک آسانی چیز ہے، لیکن کسی کی مجال ہے کہ وہ اس حقیقت سے انکار کر دے کہ مذہب ایک ایسا آسانی چیز ہے، جسے آن واحد میں تبدیل کر دیا جاسکتا ہے، اور اس کے برخلاف وطنیت ایک ایسی ارضی شے ہے کہ کروڑوں صدیوں کی

ایک جگہ سے دوسری جگہ تماشاش معاش میں گھبراہٹا گھبراہٹا پھرتا تھا، مگر تم کو بتانا علم و ادب نے اُسی کے معائب کا احساس ایک بار بھی نہیں کیا۔
میں ہر آواز بلند کہتا ہوں، سننے والے سن لیں کہ پریم چند کی موت نے ہمیں، ہندوستان کی ناقدریوں نے تہید کر ڈالا ہے۔
آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ کلیم میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا، وہ اس حاج حرف بھرت پر راہوا۔

ابھی کیا ہے، ابھی تو پریم چند کی موت کو صرف ایک ہی سال لڑا۔
ہے کہ اُن کی برسی میں اکابر و ابا و شر یک ہونے لگے تین، ذرا اُن کی موت کو اور مدت گزر جانے دیجئے۔ پھر دیکھئے ہندوستان کے مروجہ برست کیا کیا شاندار سوانگ بھرا کریں گے، اُن کتنے شہر وں میں مٹی ہی کے استیچ نصب کئے جائیں گے۔

اگر زندگی میں مٹی پریم چند حیدر آباد جاتے اور کوشش کرتے کہ انہیں لازم رکھ لیا جائے، یا کم سے کم اُن کی ادبی مینٹن سرفردی حاسے تو یہی اکابر و ابا اُن پر قہقہے مارتے، انہیں حقیر الفاظ سے یاد کرتے اور انہیں ممالک محروسہ سے خارج کر دیتے۔ مگر چونکہ وہ آج دنیا میں موجود نہیں ہیں، اور یہیں اس کا اطمینان ہو چکا ہے کہ اب بھی اُن کی کوئی اولاد نہیں کرنا پڑے گی، اس لئے ہم چوڑے پڑے ہیں، اُن کی تعریفوں کے پل باندھ باندھ کر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہم دنیا سے بزرگ ترین مسددر شناسان علم و ادب میں سے ہیں۔

اگر اسی برسی کے موقع پر یکایک مٹی جی کی بیوہ اسٹیج پر آجائیں۔ اور اپنے مرحوم شوہر کے نام پر صرف اتنی سی درخواست کرتیں کہ مرحوم کے چند غیر مطبوعہ ناولوں کی اشاعت کے واسطے حقوڑے سے سرمائے کا انتظام کر دیا جائے، تو مجھے کمال یقین ہے کہ یہی منانے والوں میں سے کچھ نوکر سول کے نیچے چھپ جاتے، اور کچھ گھبرا کر بالا خانے کی کھڑکیوں سے سڑک کی طرف کود پڑتے۔ خواہ اس کو دہڑنے سے اُن کی ٹانگیں ہی کیوں نہ ٹوٹ جاتیں۔
یہ کچھ حیدر آبادی پر موقوف نہیں ہے (حیدر آبادی تو کچھ بھی ارباب علم و فن کی نسبت بہت کچھ قدر دانی کی جاتی ہے) ہمارے تمام بول منلوں، کشنویوں، شہروں، اور قصبوں کا یہی حال ہے کہ ہم اپنے ارباب جوہر کی زندگیوں کو نہایت ہی حقارت سے ٹھکراتے رہتے ہیں۔ لیکن اُن کے

جس روز ہم آپ اپنے کو ہندوستانی صرف ہندوستانی، خالص ہندوستانی، ظاہر و باطن ہندوستانی اور اول و آخر ہندوستانی سمجھ لیں گے، تو اُس کی دوسری مٹی کو جب آفتاب طالع ہو گا تو وہ آزاد ہندوستان کے آفتاب سے طالع ہو گا۔

موت زندہ باد!

روزنامہ پیپم حیدر آباد دکن، مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء کے ذریعے سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ حیدر آباد میں مٹی پریم چند مرحوم کی برسی بڑے ترک و احتشام سے منائی گئی اور حیدر آباد کے اکابر، ادبا نے اس میں سرگرم حصہ لیا۔ اور مٹی صاحب مرحوم سے ادبی و قومی خدمت کو بڑے پرجوش طریقے سے سراہا گیا۔

یہ وہی چیز ہے جس نے وقت کی پہلی ہی سے توقع تھی۔ اور مٹی صاحب کی وفات کے موقع پر کلیم میں جس کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا گیا تھا کہ:-

”پریم چند! مبارک ہو کہ تو اس مایا کے جال، اور اس جھوٹے سنسار سے نکل گیا، جہاں دولت کے سوا کسی جوہر کی پرکشش نہیں ہوتی، تو اس ہندوستان کی بھرپور محفل کے دیرانے سے اکٹو گیا، جہاں اہل قلم کو سوانی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔“

اسے ہندوستان کے مروجہ پرستو! آؤ، اب ہتھاری حبست و خیر کی باری ہے۔ پریم چند مر گیا، اب اخباروں میں مقالے لکھو، اُس کی تعریفوں کے پل باندھ دو۔ اور اُس کی یادگار قائم کرنے کی، جھوٹے پلیٹ فارموں سے آوازیں بلند کرو۔ تاکہ دنیا ہتھاری معارف نوازی، اور علم دوستی پر ایمان لے آئے۔ ایسے ذریعے مواقع کہیں روز روز ملنا کرتے ہیں۔ یہ خود مافی کا دن تو کہیں برسوں ہی میں آتا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں تم کیسے ہو۔ مجھے ہتھاری علم دوستیاں خوب اچھی طرح معلوم ہیں۔

آج تم جس پر مقالے لکھ رہے ہو، اور لکھنے والے ہو، وہی پریم چند مجھ سے ہتھاری بے اتفاقیوں اور سردہریوں کا رونا آئے دن رویا کرتا تھا۔ اُسے قلم نے ایک دن بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ لاغر و نحیف انسان

مرنے ہی اُن کی قبروں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہندوستان ایک مژدہ ملک، اور ہندوستانی
ایک مژدہ قوم ہے ظاہر ہے کہ مژدوں کو زندوں سے کوئی ہمدردی نہیں
ہو سکتی۔ زندہ ہی زندوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب تک
کوئی شخص زندہ رہتا ہے، ہندوستان کے مردے اُس سے بچر و بگاڑ
کرتے ہیں۔ اور جب وہ مڑ کر اُن کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے تو
کندھن یا بھٹس پر وز کے تحت یہ اُس کی قدر افزائی کرنے لگتے ہیں۔
وہ ارباب فکر جن کے قلوب یو یو کی طرح فضا سے آوازیں اور
دلوں کے مہمات سن سکتے ہیں، اُن کا بیان ہے کہ جب رات بیگ
جانی ہے تو صبح تک یہ آوازیں آتی رہتی ہیں کہ اے ہندوستان کے
پریشان حال ارباب ہنر تم سرنگوں اور آبدیدہ کیوں ہو۔۔۔۔۔
یہ کونسی دانش مندی ہے کہ تم زندہ ہو۔۔۔۔۔ تم آخر مر کیوں
نہیں جاتے۔ تمہارے لباس بوسیدہ اور تمہارے معدے خالی
ہیں محض اس جرم میں کہ تم زندہ ہو۔ تم سالنے لے رہے ہو۔ اور تم
ہو تو مر جاؤ، خدا کے لئے مر جاؤ۔ ہم تمہاری قوم کے انراؤ تمہاری قدرت
گزار می کے شرف سے کب تک محروم رہیں گے۔ ہم نہیں یقین
دلاتے ہیں کہ جس روز تم مر جاؤ گے ہم تمہارے نام پر لنگ جاری کریں گے
غریبوں کو کپڑے پہنائیں گے اور تمہاری قبر پر سونا چڑھا کر دنیا کو دکھائیں گے
کہ ہندوستانی اپنے مایہ ناز انراؤ کی قدر وانی میں کسی قوم سے پیچھے
نہیں ہیں۔

مر جاؤ، مر جاؤ، خدا کے لئے مر جاؤ، اور ہمارے
ممبر کو دیر تک نہ آناؤ!

میری مشاعروں کی شرکت

مجھے اس کا ہنایت قلع ہے کہ دوسروں کی طرح، آخر کار میرے لئے بھی یہ دن آنا لازمی تھا جس دن انسان میں وہ چیز بیدار ہو جاتی ہے، جسے شعور، سود و زیاں کا لقب دیا جاتا ہے۔
میں اب تک اس شعور سے بیگانہ رہا، بیگانہ ہی نہیں، بلکہ نافر۔

مگر خیام کے اس قول کے مطابق کہ :

بر موجب عقل، زندگانی کردن
شاید کردن، دلسعدانی کردن
استاد تو روزگار را بکرت است
چندان مکعب زند که خدائی کردن

میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ایک میرے سے نفیس الوسائل شخص کے لئے جو
خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہے، اپنے اہل و عیال کو بھی زندہ رکھنا چاہتا ہے،
اور کچھ نہ کچھ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی بھی مالی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ یہ
پہچانیں یہ ہیں کہ وہ شعور و ذیال سے نافر ہے، اور اس سر و بہر دنیا میں ایک اُبالی انسان
کی طرح زندگی بسر کر کے اپنے تعلقین کے حقوق کو نہ بھری سے ذبح کر ڈالے۔

اسی لئے میں اپنے کو ان احسان پر مجبور پاتا ہوں کہ اب میں اُس وقت تک کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گا۔ جب تک مقامی مشاعرے کی شرکت کے لئے مبلغ پچیس روپے اور برزنی سفامات کے واسطے (ملازم سمیت) سینکڑوں کلاس کے کرایہ آمد و رفت کے علاوہ، میرے دیگر ضروریات اور "تعلیم" کے اُس مالی نقصان کی خانہ پڑی کے طور پر جو میری عدم موجودگی کے باعث پیشہ ہوتا رہتا ہے، مزید ستر روپے وصول نہ ہو جائیں گے۔

آج سے دو برس پیشتر تک میں اسے ایک ننگ سبوتا تھا کہ ارباب
مشاعرہ سے کرایہ لیں۔ مشاعروں کی طرف سے جب کبھی کرایہ روانہ کرنے
کے واسطے لکھا جاتا تھا تو میں اس قدر براخود ہوتا تھا کہ انتقام کے
طور پر اس مشاعرے میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ — جس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا
کہ ہر مشاعرے کے سلسلے میں کہ سے کم میرے سوا سو اسو روپے صرف ہوتے تھے۔
لیکن اب حالات کی وہ نوعیت باقی نہیں رہی ہے۔ میری زندگی،

ایک بہت بڑے مالی انقلاب سے دوچار ہو چکی ہے۔ اور اسی کے دوش بدوش دوسری شکل یہ آپڑی ہے کہ میری غیر حاضری کا 'ظلم' کی انتظامی اور مالی حالت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ہر چند کہ اس اعلان سے میرے جالیاتی شعور کو تو عذر و صدمہ پہونچ رہا ہے، مگر میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔

یہ دُنیا ہے۔ سر دو بے مہر دُنیا۔ اس کے قوانین سے نہ انبیاءِ مستفی ہو سکتے ہیں نہ شاعر۔۔۔ جم لطافت کے پروں پر اُڑتے ہوئے خواہش و کُرسی ہی سے کیوں نہ گزر جائیں۔ مگر یہ دُنیا ہیں ہماری تمام

برسرِ نفاق ہیں، تو میں ایک لمحے کے پس و پیش کے بغیر ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاؤں گا۔

میرے دوستو! افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال پر چلنا بہت ہی نعتِ کام ہے، ہم صرف جذباتی حیوان ہی نہیں ہیں، قدرت نے ہم میں عقل و شعور اور عدل و انصاف کا بھی مادہ رکھا ہے، اور ہمارا یہ فرض ہے کہ جب عقل و شعور اور عدل و انصاف سے ہمارے جذبات ٹکرانے لگیں تو ہم جذبات کو ترک کر کے عدل و انصاف کا ساتھ دیں، اس لئے کہ اسی میں ہمارے واسطے برکت و سعادت ہے۔

میں نے اپنے بے کدوؤں پٹ کھول کر اپنی پوری کیفیت دکھا دی ہے، اب آگے آپ کو اختیار ہے کہ مجھے مسلمانوں کا دشمن سمجھ کر مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ یا سیری ۶۸ سے جو اشتباہ آپ کے دل میں پیدا ہوا تھا اس سے توبہ کر لیں۔

اگر یہ کوئی جرم ہے کہ میرے نزدیک کانگریس ہی وہ جماعت ہے جو ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے سے ملک کو آزاد کر سکتی ہے تو بیشک میں مجرم ہوں۔ آپ جو سزا دے چاہیں، میں اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔

سر دستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

پُر امن ہندوستان یا انسانِ مقبرہ

”تمام ممالکِ یورپ کے مقابلے میں ہندوستان غیر معمولی طور پر امن ہے۔ بمبئی کے سب سے بڑے شہر میں کوئی بار بار طیارہ نہیں، حالانکہ یورپ کا ایک شہر بھی ایسا نہیں ہے، جہاں تسویل کے اندر اندر پائونڈ بار طیارے ہر وقت موجود رہتے ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ میں ہندوستان میں اس قدر خوش ہوں جہاں ہر شے نہایت پُر امن، اور ہر نظر نہایت ہی خوشگوار ہے۔“

یہ ہیں وہ بظاہر شیریں، اور باطن تلخ الفاظ جو ہمارے مربی و سرپرست حضورِ لارڈ لوٹھین ہیاو نے دوسری یا تیسری دسمبر ۱۹۲۷ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن بمبئی سے رات کے وقت براڈ کاسٹ فرمائے تھے۔

شاید ہم سے اکثر بھولے بالے ہندوستانی لال صاحب ہیاو کی اس شیطانی تقریر سے دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ ہمارا

”اہل اسلام“ اور ”مذہب اسلام“ کی ”بدترین دشمن“ ہے، یا کانگریس ”اردوؤں کی شدید ترین مخالفت“ اور ”ہندو راج کی عمبردار“ ہے تو میں ہندوستان کا وہ پہلا شخص ہوں گا جو کانگریس کے سر پر اپنے ہاتھ کے تمام اعصاب کو پوری شدت کے ساتھ کھینچ کر ایک ایسا زبردست گھس اور ایک اتنا ہون گڑ مارے گا کہ کانگریس کا سمجھا ناک کے راستے سے نکل جائے گا۔

مجھے میرے بھائی مذہبی نقطہ نظر سے خواہ وہ کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں، نہیں، انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں مسلمان خواہ ان میں پیدا ہوا ہوں، مسلمانوں کا خون میری رگ و پے میں گردش کر رہا ہے، اور مجھسی زندگی میں مجھے قطعی طور پر اچھوت محسوس نہیں ہو سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعت اور ہندی مسلمانوں کا حلقہ ہے۔

میری معاشرت، اور میرا مزاج، میرا ادبی ذوق، اور میرے ماہیات تمام تر اسلامی ہیں۔ میرے دل سے کوئی قوت مسلمانوں کی محبت نہیں نہیں سکتی ہے، اگر میں خود بھی کوشش کروں کہ میرا دل مسلمانوں کی محبت سے خالی ہو جائے تو بھی میں اس سعی میں ناموفق رہا ہوں، میں ہو سکتا ہوں۔ اس لئے کہ مسلمانوں سے محبت نہ کرنا، میرے واسطے خود اپنی ذات سے محبت نہ کرنا ہے۔ اور کون ایسا ذمی حیات ہے جسے اپنی ذات سے محبت نہ ہو۔

لیکن مجھ میں اور دوسرے غیر کانگریسی مسلمانوں میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ ہندوؤں سے محبت کیسی، نفرت کرتے ہیں۔ اور اس نفرت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان متحدہ قومیت کے تمام برکات سے محروم ہے، میں ہر چند کہ مسلمانوں کی محبت پر مجبور ہوں، اسی طرح مجبور ہوں جیسے کوئی ہندو، ہندوؤں کی محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور یہ محبت ایک ایسی فطری شے ہے جس پر صرف عقل کے اندسے ہی اعتراض کر سکتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ ساتھ میرا دل ہندوؤں کی محبت سے بھی خالی نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں اس قدر شقی واقع نہیں ہوا ہوں کہ اُس گروہ سے محبت نہ کر سکوں جو میرا پڑوسی، میرا وطن اور میرا بھائی ہے۔

مجھے صفائی کے ساتھ یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ کسلی، اور آبائی اثرات کی بنا پر اس محبت کے باوجود مجھے مسلمانوں سے ہے، اگر میں یہ دیکھوں گا کہ ہندوؤں، اور مسلمانوں میں جنگ ہو رہی ہے، اور مسلمان سراسر

ہندوستان ماشا اللہ پتھر پتھر اس قدر پُران اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس درجہ خوشگوار واقعہ ہوا ہے کہ حضور زلات "صاحب اسے اپنے بلین عزیز کے مقابلے میں دیا وہ پسند فرماتے ہیں۔

اس میں کمال فخر و شک ہے کہ لارڈ صاحب موصوف ہندوستان کے پُران ۱۰۰ خوشگوار ہوئے۔ نہایت ہی خوش ہیں۔ لیکن یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کی اعلیٰ ترین خوشگوار لارڈ صاحب پنا کی یہ عزت اس قسم کی طائیت آئیزسرت ہے جو ایک ہوشیار آقا کے دل میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے قومی غلام نہ کہ ہم کو کاہیدہ اور اس کی میان کو بلبلہ تلوار دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اب میری طاقت کے سامنے میرے غلام کھینچے عاجز اور قلمی بے دست پا ہو چکا ہے۔

اس زمانے میں جب کہ دنیا کی ہر چھوٹی سے چھوٹی قوم اپنی بقا کی خاطر اپنے مقبوضات کی تسلیں پر جان دینے دے رہی ہے اور ہر چھوٹے سے چھوٹا ملک ہی نہیں ہر معمولی سے معمولی شہر اپنے جسم پر زرہ اور سر پر خود پہن چکا ہو۔ عین اس دورِ فتنہ و فساد میں ہندوستان کی عسکری روح کا مضمحل اور ہندوستانی قوم کا غیر سحر رہنا ایک ایسی شرمناک حالت ہے جس پر خود موت تک آئو بہا سکتی ہے۔ لیکن ہمارے لارڈ صاحب بہادر اس صورت حال پر ماتم کرنے کے عوض انہما برسر ت فرماتے ہیں۔

دائیں ہو کہ لارڈ صاحب کا یہ انہما برسر ت کسی لڑائی کی سادہ لوحی یا عصر حاضر کے مقصدات سے بیخبری کا نتیجہ نہیں۔ لارڈ صاحب خدا انھیں سلامت رکھے نہایت ہی ہوشیار واقع ہوئے ہیں اس انہما برسر ت سے صاحب بہادر کا مقصود یہ ہے کہ ہم ہتھیاروں اور طیاروں کی عدم موجودگی کو اپنے ملک کے واسطے ایک برکت و سعادت خیال کریں اور جب ہم میں سے کوئی ہندوستانی شہر اور ہندوستانی قوم کو مسلح ہونے کا شور دے تو ہم اپنے کالوں میں انگلیاں دے لیں اس وجہ سے انگلیاں دے لیں کہ ان "نوس" اور "امن شکن" سامانِ حرب کی عدم موجودگی ہی وہ دولتِ بیدار ہے جس پر ہمارے امن پسند لاٹ صاحب انہما برسر ت فرما چکے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ لارڈ صاحب جس چیز کو برا سمجھتے ہیں اُسے ہم کیونکر اچھا سمجھ سکتے ہیں۔

اس انہما برسر ت یا امن کی گزلی میں ایک غیر ملفوظ اعلان یہ بھی

ہے کہ اسے ہندوستان بھڑا شکر بجا لاؤ کہ ہم تمہارے ایسے شفیق حاکم ہیں کہ عین اس دورِ فتنہ میں جب کہ خاکِ یورپ مشتعل ہو چکی ہے اور مغرب کے ہر ذرے سے ٹوٹل رہی ہے ہم نے تمہارے گروسلانج کی ایسی ایسی دیوارِ اتحادی ہے کہ تم ہر فتنے اور ہر ہلاکت سے بے خبر رہ کر عین زندگی بسر کر رہے ہو اور عین اس لمحے میں کہ بیدار یورپ میں آگ اور خون کا کھیل کھیل جا رہا ہے ہم نے تمہیں ایسی خاموش خوابی میں ڈال دیا ہے کہ تم سمجھی منید سو رہے ہو۔

اس میں لارڈ صاحب بہادر کا کوئی خاص تصور نہیں۔ دنیا کے ہر مہیا کا مزاج ایسا ہی واقع ہوا ہے۔ ہر مہیا نفس کے پاس آکر چپکاتا ہے کہ اسے میری پیاری بچے بچکے بڑوں والی پڑی تمہیں کیا معلوم کہ آزادوں بڑوں پر زمین اور فضا میں کیا کیا عینیں گزر رہی ہیں۔ وہ دانے دانے کے مارے مارے پھر رہے ہیں دشمنوں کے تعاقب اور شکوں کے شدا اندنے انھیں زندہ در گور کر رکھا ہے۔ مبارک ہیں تمہاری ہمتیاں کہ تمہارے کرد و پیش پر امن سلاخیں ہیں اور تمہارے آب و دانے کے فرائض میں نے اپنے ذمے کر رکھ دیں۔

لارڈ صاحب ہندوستان کی جس چیز کو "امن" کے نام سے منسوب فرماتے ہیں وہ دراصل ہندوستان کی ایک ایسی کمزوری ہے جسے اپنے ہتھیار زیادہ دیر تک برداشت نہ کرنا چاہیے۔

ظالم ہونا کوئی عیب ہو کہ ہو لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مظلوم ہونا عیب اور سب سے بڑا عیب ہے۔ ظالم کی پشت پر وہ چیز ہوتی ہے جسے عظیم الشان طاقت کہتے ہیں اور طاقت دنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے لیکن مظلوم کے قابلِ حال وہ چیز ہوتی ہے جسے نا طاقت کہتے ہیں اور نا طاقتی اس کرنا ارض کی سب سے بڑی سختی ہے۔

لارڈ صاحب بہادر ہمارے دوستوں کو سعادت "ہماری کمزوریوں کو طاقت" اور ہماری "ضعف کو امن" کا خطاب دے کر ہمیں کب تک دھوکے میں رکھتے گئے؟

نوعین صاحب نے ہندوستان کو صرف پُران ہی نہیں فرمایا ہے اس بد بخت خطہ ارض کو خوشگوار کا بھی خطاب دیا ہے۔

ہندوستان۔ اور۔ خوشگوار! سچ ہے۔

حکیم کی دو سالہ زندگی پر ایک نظر

جنوری ۱۳۳۵ء کے سائنس فیم ماسٹر انڈسٹریس سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ بظاہر یہ کوئی خوش کی فتح نہیں ہو سکتی۔ اتنی سی مدت زندگی عمر دوازہ کیا مہینے کی بھی نہیں کہی جاسکتی تاہم چونکہ ہندوستان "شیر خوارگی کے" آباد کی ہلاکت عام "Infantile mortality" کی سر زمین ہے۔ اس لئے کسی سینئر ادب کے لئے ابتدائی ۲۰ مہینوں کا محفوظ بحری سفر خاصی ناخوش آئند بری کی بشارت ہے؛ ہماری ادبی کشتیوں کے اکثر حادثات، ساحلی رہے ہیں۔ اس لئے سواصل کے قرب و جوار کی ان غلیچوں، آبناؤں، اور سخت انجیر چٹانوں سے سلامت گزر جانا عطا اک "ہفتخوان" کے لئے ہو جانے کے برہمنی سمجھا جاسکتا ہے! سہ

غافل مرد کو تا در بیت الحرام عشق
صد منزل رست و منزل اول قیامت

تاہم ہم ان صد ہا منازل و مراحل کی میزان کل کو محسوب کرنے سے انکار نہیں کر رہے ہیں؛ ہم "دائرہ حیات" کی اس بھرپور خطرات کا پورا علم ہے جس کی پیمائش "زندہ ابن زندگی" کے کسی دائم اکس نے کسی اس طرح کی کشتی کو: سہ

دائم ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوئے تنگ

ہاں ہم مستقبل کی فکر کو مستقبل ہی پر چھوڑ سکتے ہیں؛ ہم اک معلوم و مشہور مثل کی قبیل پر یہ کسی قدر اک نیا مقولہ بنا سکتے ہیں کہ "تم حال انظام کرو، اور مستقبل اپنا انظام خود کرے گا!" — درحقیقت یہ اک وسیع و عمیق حکمت حیات ہے؛ وہ نہ صرف ساری زندگی پر حاوی ہے، بلکہ آخرت تک پر تجاوز ہے؛ اک محتاط جوانی اک محفوظ پیری کا ہمیشہ ہے، اور اک متقی حیات ارمنی اک با مرد عاقبت کی ضمانت؛ لاریب کہ ہم اپنے موجودہ طرز عمل سے اپنی آئندہ تقدیر کی کتابت کیا کرتے ہیں! سہ
باشد نقش با تر فہم سر نوشت! سہ

نہن ہے خادم کا آقا کے ٹھکان کی بہار

لارڈ صاحب آپ نے بالکل سچا فرمایا، ہندوستان نہایت ہی خوشگوار واقعہ ہے۔ کہوں نہ ہو اگر ہندوستان کا سا جواں بخت، آزاد و نکات خوشگوار نہ ہو کہ تو پھر اور کون ہو گا۔ —

ہاں وہ ہندو اقبال ہندوستان، جہاں ہمارا، ایک ہی تہ جاری رہنے والے آبشار کی طرح دوسرے ممالک کی طرف لگاتار بہت چلا جا رہا ہے، وہ خوش قسمت ہندوستان، جس کا غلہ اور خام مال، دوسروں کے حدود اور کارخانوں میں ہر روز داخل ہو رہا ہے۔ وہ بے روزگار ہندوستان جس کے نالوں سے فیصدی گریجو ریٹ پیٹ پائیس پکڑے و فوج میں صدیوں دیتے پھر رہے ہیں۔۔۔ وہ بھوکا ہندوستان جس کے لئے فیصدی فروخت کو ابلد ہزار دھواری صرف ایک وقت غذا ملتی ہے، اور وہ سبھی ناکافی۔۔۔ امام میل ہندوستان جہاں مسلم ٹیب اور "مہا سبھی" کے مداری، مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنی اپنی لکڑیوں پر سچا چار حزن ریزیاں کرا رہے ہیں۔۔۔ وہ ہندوستان جہاں مطیع و منبر کا گلا گھٹا رہتا ہے۔۔۔ اور وہ ہندوستان جس کے گھے میں غلامی کا طوق لٹ پڑا ہوا ہے۔۔۔ اگر خوشگوار نہ ہو گا تو اور کون ٹک ہو گا؟

اگر حقیقت نشان ہندوستان خوشگوار نہیں ہے، تو پھر کیا امریکہ، انگلستان، جرمنی، فرانس، اور اٹلی کو خوشگوار کہا جائے گا، چنانچہ زندگی کی کشمکش، توپوں کے دھانے کھولے ہوئے ہے؟

ہاں مرزا غالب نے خوب فرمایا ہے۔

نے تیر کہاں میں ہے نہ میا دکیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

پایندہ باد گوشہ قفس

زندہ باد گوشہ قبر!

میں ماضی کے سرے اور حال کے نئے سرے سے زیادہ نہ ہم پر کچھ
تغییرات ہیں نہ ہمارے کچھ نکسات، ہمارا اپنی حدود کی حد تک اپنا جائزہ
لیتے ہیں اور۔۔۔ اگر یہ کوئی خود ستانی یا خود غرضی ہو تو۔۔۔
چنانچہ اس سے نکالتے ہیں ان اسباب نہیں جانتے، جو کچھ مجھ سے ہو گا ناقابل
عمل نہیں کیا جاسکتا، اور جو ہونے کا اُس کے لئے وہ ناناگوں مواقع اور ارا
تہ روزوں کی شکست کافی، ممدوار ہیں، جو ہندوستان کی ادبی صحافت میں
حاضری معروف و بدنام ہیں، ہم اپنے معیار کی رغبت سے نا آشنا نہیں لیکن
اسے انحراف سے وقار میں سالک کی راہ و رسم منزل سے باخبری کچھ
برائے نام ہی تو نہ سفر ہو چکا ہے، لیکن شکست کو محض خوش نغمہ
کہاں تاکتیں کر سکتی ہیں؟

مگر تو سب ہی ہم دیکھیں کہ مجھوں نے کیا یا

وہ مت تلاش غم پہناں ت گرے!

میں بار و گریہ کہنے کی اجازت جانتا ہوں کہ حکیم کی موجودہ دوا
عمر میں اس کے شبابِ بزم کی بعض تنہا میں اُس کی جہن صبح پر درخشاں
پاتا ہوں ممکن ہے بعض حضرات میرے ہم نظر ہوں، لیکن مجھے تو اپنی اس سن
مولود فکر و کاوش۔۔۔ حکیم کی چشم و ابرو کی بعض ادائوں میں یہ کتبہ کد

نظر آتا ہے کہ

بالائے سرش زہو شمشیری

می تافت ستارہ لبندی

کم از کم اتنا کہنے میں تو مطلق کلام نہیں کہ میرا اک رسالے کا نشانہ یہ ہے
جن مخلص ترین دوستوں کے لئے اک خزانہ شوق و عہد بنا دیا، یا جو
"لہجہ دشمنوں" کے لئے مستقبل قریب کی اک یقینی شہادت ہمسایہ کی بشارت ابن
ہر و طائفوں کے ارکان کے فضائل و توہمات کی روشنی میں میرے عقولیت
کا اک ایذا فی معرکہ سر کیا ہے!

نوسید ہم مباشر کہ زندان جرمہ نوش

ناگہ چو یک خورشید بزل رسد اند

بہر حال حکیم کے مستقبل کے ممکنات و مقدمات کے متعلق اگر کہیں
اندازہ سبھی لگایا جائے تب بھی اُس کی زندگی و سلامتی کے بارے میں
تمام سامعین کیلئے میری اتنی اطمینان دہی تو ہر شانہ ستاب سے بااثر
بی نسیم کی جائے گی کہ

گزر گیا ہے وہ کوسوں دیا بر حوال سے!

~~~~~

بزرگ ہے آفتابِ بیکس  
براب ہے اک ترابِ بیکس  
خود شہرِ جہاں کے عیون کا بھجا  
نہیں ہے بے نقابِ بیکس

زخمِ تحقیق دل پہ کھاتے ہوئے آؤ  
زورِ مطلق سے لو لگاتے ہوئے آؤ  
زمر کے یہاں بار نہیں دیکھو لگا  
شہرِ قمر قدم پر جاتے ہوئے آؤ

# مسک جوش

کیا تجھ کو ہے یہ وہم کہ شبنم ہے ترا جوش؛ افسوس کہ تو واقفِ اسرار نہیں ہے  
 آگاہ ہو آگاہ کہ اس جوش کے دل میں بیہودگی اندک و بسیار نہیں ہے  
 واللہ کہ یہ جوش، خرابات نشیں جوش منجملہ زبا و زبیا کا رہیں ہے؛  
 وہ نشہ صہبیا کا ہے چڑھتا ہوا پارہ ہاں زہد کی گرتی ہوئی دیوار نہیں ہے  
 ہو اُس میں جو ہے ابر کی مستانہ خرامی رکتی ہوئی منضوں کی تو قمار نہیں ہے  
 ہاں ہاں وہ نظر باز و قدح خوار ہے یعنی توفیقِ الہی کا گنہ گار نہیں ہے؛  
 اس آدمِ خاکی کے ہوا خواہ کے دل میں جزمہر و وفا اور کچھ آزار نہیں ہے؛  
 ہاں اُس کو مبارک ہو غم و غیظ و عداوت جو زلفِ محبت کا گرفتار نہیں ہے؛  
 دشنام و ملامت کا تو کیا ذکر کہ یہ شخص یاروں کی شکایت پہ بھی طیار نہیں ہے  
 اس خلوتی شاہدِ توحید کے دل میں آشفگیِ سب و زنا رہیں ہے؛

اس واقفِ اضداد کی دنیائے نظر میں بیہودگی کا فروید سدا رہیں ہے !  
 ہاں اُس کا یہ ایمان ہے اس باغِ جہانیں ہر خار و خس اک گل ہے کوئی خار نہیں ہے !  
 اس شخص کے سینے میں ہیں بیگانے بھی داخل یہ صرف یگانوں ہی کا غماز نہیں ہے !  
 ہاں خانہ دشمن کی بھی جاروب کشی میں واللہ کہ اس شخص کو کچھ عار نہیں ہے !  
 اس واقفِ ماحول و وراثت کی نظر میں قاتل بھی ملامت کا سزاوار نہیں ہے !  
 آواز دو، آواز، کہ یہ رندِ قدحِ خوار کیا دوست کہ دشمن سے بھی بیزار نہیں ہے !  
 اس محرمِ خود داری عشاق کے نزدیک ابلیس بھی مردود و گنہگار نہیں ہے !  
 رکھے گا وہ، اور تجھ سے عداوت کا تعلق؟ کونین سے کچھ جس کو سروکار نہیں ہے !  
 خود جنسِ دو عالم ہو تو ہو اُس کی خریدار  
 وہ جنسِ دو عالم کا خریدار نہیں ہے !

جوش ملیح آبادی

|                                                                                                                                                                                 |                                                                                                                                                                                                      |
|---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| <p>پادشہ شہین ہے ترغیب دہا<br/>         فریاد کی اک لہر ہے غمِ مہا<br/>         مانے گا اسے کون کہ ہوتا ہے بلوے<br/>         ہر سو کے افق سے ہر تہمِ مہا<br/>         (چٹن)</p> | <p>آغاز ہی آغاز ہے اور کچھ سچی نہیں<br/>         انجام ہم اک راز ہے اور کچھ سچی نہیں<br/>         کہتی ہے جسے نغمہ شادی و نوب<br/>         اک کرب کی آواز ہے اور کچھ سچی نہیں<br/>         (چٹن)</p> |
|---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|





یکم جنوری ۱۹۳۰

دسمبر ۱۹۲۹ء



سوانا ادا والا آزاد



# قرآن اور اُس کے مخالفوں میں بنا نزاع!

مولینا ابوالکلام آزاد

اُس نے کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کر دے۔ بلکہ جب کبھی مطالبہ کیا تو یہی کیا کہ اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جاؤ، کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل تعلیم ایک ہی ہے۔ اُس نے نہ تو کوئی نیا اصول پیش کیا، نہ کوئی نیا عمل بتلایا، اُس نے ہمیشہ اُنہیں باتوں پر بند دیا جو دنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بُھھی ہوئی باتیں رہی ہیں، یعنی ایک پروردگارِ عالم کی پرستش، اور نیک عمل کی زندگی؛ اُس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرہ، دعوت و ہی ہے تو یہی کہا ہے، اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم از سر نو تازہ کر لو، تمہارا الہا کرنا ہی مجھے قبول کر لینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اُس میں اور اُس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو بُرا نہیں کہتا، سب کو ماننا اور سب کی تعلیم کرتا ہے، اور ہمیشہ اُنہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں، کوئی اُس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور لیوں لوگوں کو اُس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟

کہا جاسکتا ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ قرآن نے بُت پرستی سے انکار کر دیا تھا اور وہ بُت پرستی کے طریقوں سے مألوف ہو چکے تھے، بلاشبہ ایک وجہ نزاع یہ بھی ہے، لیکن صرف یہی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی، سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بُت پرستی سے قطعاً کنارہ کش تھے، عیسائی کیوں برسرِ پکار ہو گئے، جنہوں نے کبھی بُت پرستی کی حمایت کا دعویٰ نہیں کیا؟

اب چند لمحوں کے لئے اُس نزاع پر غور کرو جو قرآن اور اُس کے مخالفوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مخالفت کون تھے؟ کچھ مذاہب کے پیرو تھے، جن میں سے بعض کے پاس کتاب تھی، بعض کے پاس نہ تھی۔

اجنبانہ نزاع کیا تھی؟

کیا یہ تھی کہ قرآن نے اُن کے بانیوں اور رہنماؤں کو جھٹلایا تھا، یا اُن کی مقدس کتابوں سے انکار کیا تھا؟ اور اس لئے وہ اس کی مخالفت میں کمر بستہ ہو گئے تھے؟

کیا یہ تھی کہ اُس نے دعویٰ کیا تھا، خدا کی سچائی صرف میرے ہی حصہ میں آئی ہے، اور تمام پیروان مذاہب کو چاہیے، اپنے اپنے مذہبوں کی دعوت سے برگشتہ ہو جائیں؟

یا پھر اُس نے دین کے نام سے کوئی ایسی چیز پیش کر دی تھی، جو پیروان مذاہب کے لئے بالکل نئی بات تھی، اور اس لئے قدرتی طور پر اُنہیں ماننے میں تامل تھا؟

قرآن کے صفحے کھلے ہوئے ہیں اور اُس کے نزول کی تاریخ بھی دنیا کے سامنے ہے۔ یہ دونوں ہیں بتلاتے ہیں کہ ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی، اُس نے نہ صرف اُن تمام رہنماؤں کی تعریف کی جن کے نام یوں اُس کے سامنے تھے، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا، مجھ سے پہلے جتنے بھی رسول اور مذاہب کے بانی آچکے ہیں میں سب کی تصدیق کرتا ہوں، اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی خدا کی سچائی کا انکار سمجھتا ہوں۔

ہذا کی براہ راست پرستش کی جائے، لیکن دنیا کے تمام مذاہب کی گروہوں نے کسی نہ کسی شکل میں شرک و بت پرستی کے طریقے اختیار کر لئے تھے، اور گو انھیں اس سے انکار نہ تھا کہ اہل دین خدا پرستی ہی ہے، اور خدا ایسا ہی ہے، لیکن یہ بات شاق گزرتی تھی کہ اپنے مالوت و منعت و طریقوں سے درست بردار ہو جائیں۔

## خلاصہ بحث

متذکرہ صدر تفصیلات کا اہل حسب ذیل دفعات میں بیان کیا جا چکا ہے (۱) نزولِ قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی تخیل اس سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ سنسوں، خاندانوں، اور قبیلوں کی معاشرتی حد بندیوں کی طرح، مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کرنی گئی تھی باہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا، دین کی سچائی صرف اُسی کے حصہ میں آئی ہے، جو انسان اس کی مذہبی حد بندی میں داخل ہے، نجات یافتہ ہے، جو داخل نہیں ہے، نجات سے محروم ہے۔

(۲) ہر گروہ کے نزدیک مذہب کی اصل و حقیقت محض اُس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے، جو نہی ایک انسان اُنھیں اختیار کر لیتا، یقین کیا جاتا کہ نجات و سعادت اُسے حاصل ہو گئی، مثلاً عبادت کی شکل و طریقہ، قربانیوں کے رسوم و عوائد، کسی خاص طعاع کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع و قطع کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔

(۳) چونکہ یہ اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے۔ اس لئے ہر مذہب کا پیرو یقین کرتا تھا کہ دوسرا مذہب مذہبی صداقت سے خالی ہے، کیونکہ اُس کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اُس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

(۴) ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہ تھا کہ وہ سچا ہے، بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرا جھوٹا ہے، نتیجہ یہ تھا کہ ہر گروہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہتا کہ اپنی سچائی کا اعلان کرے، بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف، تعصب و نفرت پھیلائے، اس صورتِ حال نے نوعِ انسانی کو ایک دائمی جنگ و جدال کی حالت میں مبتلا کر رکھا تھا، مذہب اور خدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرتا اور اُس کا خون بہانا جائز سمجھتا۔

(۵) لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی اصل و حقیقت پر اصول پیش کیا۔

(الف) اُس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں یہی بات

اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ اپنے جھوٹا تا کیوں نہ ہو، بلکہ اس لئے تھی کہ جھوٹا تا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ وہ صرف اُسی کو سچا کہے، باقی سب کو جھوٹا، اور چونکہ وہ مکمل طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا، اس لئے کوئی بھی اُس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا، یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰ کی تصدیق کرتا ہے، لیکن وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا، وہ حضرت عیسیٰ کی بھی تصدیق کرتا تھا، اور عیسائی اگر اُس میں اور یہودیوں میں نزاع شروع ہو جاتی تھی، عیسائیوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریمؑ کی پاکی و صداقت کا اعلان کیا جائے، لیکن قرآن نہ صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا، وہ یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دار و مدار اعلیٰ پر ہے نہ کفارہ اور اطمینان پر، اور قانونِ نجات کی یہ مالگیر و وسعت عیسائی کلیسا کے لئے ناقابلِ برداشت تھی!

اسی طرح قرآن نے اُس سے بڑھ کر کوئی درخواست نہیں ہو سکتی تھی، کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی بزرگی کا اعتراف کیا جائے، لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ قرآن جس طرح ان دونوں کی بزرگی کا اعتراف کرتا ہے، اُسی طرح یہودیوں کے پیغمبروں اور عیسائیوں کے داعی کا بھی تعریف ہے، تو اُن کے سنی اور جماعتی غور کو تحسین لگتی تھی، وہ کہتے تھے، ایسے لوگ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے پیرو کیوں کر ہو سکتے ہیں، جو اُن کی بزرگی اور صداقت کی صف میں دوسروں کو بھی لاکھڑا کرتے ہیں؟

مختصر ازیں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کے تین اصول ایسے تھے جو اُس میں اور تمام پیروانِ مذہب میں دج نزاع ہو گئے!

(۱) وہ مذہبی گروہ بندی کی روح کا مخالف تھا، اور دین کی وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا، اگر پیروانِ مذہب یہ مان لیتے تو انھیں یہ تسلیم کر لینا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصہ میں نہیں آئی ہے سب کو یکساں طور پر ملتی ہے، لیکن یہی ماننا اُن کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔

(۲) قرآن کہتا تھا، نجات اور سعادت کا دار و مدار اعلیٰ پر ہے، نسل و قوم گروہ بندی اور ظاہری رسم ریت پر نہیں ہے، اگر یہ اصل وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز، تمام نوعِ انسانی پر کھل جاتا، اور کسی ایک مذہبی حلقہ کی ٹھیکیداری باقی نہ رہتی، لیکن اس بات کے لئے اُن میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا، (۳) وہ کہتا تھا، اہل دین خدا پرستی ہے، اور خدا پرستی یہ ہے کہ ایک

بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اُس نے کہا کہ دین خدا کی عام بخشش ہے، اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت ہی کو دیا گیا ہو، اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(ب) اُس نے کہا، خدا کے تمام قوانین فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے، اور سب کے لئے ہے، پس ہر دین مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ: "مخول نے دین الہی کی وحدت فراموش کر کے الگ الگ گروہ بن دیاں کر لی ہیں۔" اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے الگ رہی ہے۔

(ج) اُس نے بتلایا کہ خدا کا دین اس لئے تھا کہ نوزائیدہ بچوں کا تفرقہ اور اختلاف دور ہو، اس لئے: "تَحَاکُمُ نَفَرًا" (نزع کی ایک ملت بن جائے پس اس سے بڑا ذکر گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز تفرقہ دور کرنے کے لئے آئی ہو، اسی کو تفرقہ کی بنیاد بنا لیا ہے؟

(د) اُس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے، دین ایک ہی ہے، اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے، البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا، اور یہ اختلاف ناگزیر تھا، کیوں ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی، اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اُس کے لئے اختیار کئے جائیں، پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اہل دین مختلف نہیں ہو جاسکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے، محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(دھڑا) اُس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں! یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں، اور خدا کا بٹھرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے، وہ دین حقیقی کیا ہے؟

وہ کہتا ہے، ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی جو انسان بھی ایمان، اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اُس کے لئے نجات ہے، خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو!

(و) اُس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اُس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشرک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں، وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن ہر دین مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں! اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گا۔ اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا، تمام مذاہب کی یہی مشرک اور متفقہ سچائی ہے، جسے وہ "الدین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے!

(س) وہ کہتا ہے، خدا کا دین اس لئے نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے، بلکہ اس لئے ہے ہر انسان دوسرے سے محبت کرے، اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتہ عہودیت میں بندہ کر ایک ہو جائیں، وہ کہتا ہے جب سب کا پروردگار ایک ہے، جب سب کا مقصد اسی کی بندگی ہے، جب ہر انسان کے لئے ذہی ہوتا ہے جیسا اُس کا عمل ہے تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ تمام جنگ و نزاع کیوں ہے؟

(۶) مذاہب عالم کا اختلاف صرف اختلاف ہی کی حد تک نہیں رہا ہے بلکہ باہمی نفرت و مخالفت کا ذریعہ بن گیا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ مخالفت کیونکر دور ہو؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام ہر دین مذاہب اپنے دعوے میں سچے مان لئے جائیں، کیونکہ ہر مذہب کا پیرو صرف اسی بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہ سچا ہے، بلکہ اس کا بھی مدعی ہے کہ دوسرے جھوٹے ہیں، پس اگر ان کے دعاوی مان لئے جائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مذہب بیک وقت سچا بھی ہے، اور جھوٹا بھی ہے، یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سب کو جھوٹا قرار دیا جائے، کیونکہ اگر تمام مذاہب جھوٹے ہیں، تو پھر مذہب کی سچائی ہے کہاں؟ پس اگر کوئی صورت

تھے سب انسان کے ہاتھوں ٹوٹ چکے، سب کی نسل ایک تھی، مگر ہزاروں نسلیں ہو گئیں، سب کی قومیت ایک تھی، مگر بے شمار قومیتیں بن گئیں، سب کی وطنیت ایک تھی، لیکن، لیکن سیکڑوں وطنیتوں میں بٹ گئے، سب کا درجہ ایک تھا، لیکن امیر و فقیر، شریف و وضع، اور ادنیٰ و اعلیٰ کے ہیئت سے درجہ ہٹا گئے، ایسی حالت میں کونسا رشتہ ہے جو ان تمام تفرقوں پر غالب آسکتا ہے، اور تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاسکتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ، یہی ایک رشتہ ہے جو انسانیت کا بچھا ہوا گھرانہ ہے، آباد کر دے سکتا ہے، یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے، اور ہم سب کے سر اسی ایک چوٹ پر جھکے ہوئے ہیں، یک جہتی و یکجہالت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ممکن نہیں، انسان کے بنائے ہوئے تعزیمات اس پر غالب آسکتے۔

رہنہ نزاری کی ہو سکتی ہے، تو وہ دہی ہے جس کی دعوت لے کر قرآن نروار ہوا ہے، نام مذہب یہ ہے، کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے، اور وہ سب کو دیا گیا ہے، لیکن تمام پیروان مذہب بھائی سے منحرف ہو گئے ہیں، کیونکہ انہوں نے دین کی حقیقت اور وحدت مٹانے کر دی ہے، اور اپنی گمراہیوں کی انک انک ڈلیاں مٹائی ہیں، اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آجائیں، اور اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر یکساں بند ہو جائیں تو مذہب کی تمام نزاعات ختم ہو جائیں گی، ہر گروہ دیکھ لے گا کہ اس کی راہ بھی اسی راہ ہی ہے جو اور تمام گمراہوں کی راہ ہے، قرآن کہتا ہے نام مذہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت: اللہین ہے، یعنی نوح انسانیت کے لئے حقیقی دین، اور اسی کو وہ اسلام کے نام سے پکارتا ہے۔

۱۱، نوح انسانیت کی باہمی یکجہالت اور اتحاد کے جتنے رشتے بھی ہو سکتے

## رفیقہ حیات کے نام

میں اپنی طبع کی آوارگی سے خائف ہوں کہ مجھ کو پھر یہ ہواؤ ہوس میں ڈال نہ دے  
مرے لہو کو یہ وحشت سے مہلت نہ کرے سکونِ قلب کو ترغیبِ اشتعال نہ دے  
تری نظر نے جو مجھ کو کمال بخشا ہے یہ اُس کمال کو خمیازہ زوال نہ دے  
ترے لئے یہ کہیں وجہِ غم نہ بن جائے مجھے کہیں قلقِ شرم و انفعال نہ دے  
خدا کرے کہ مجھے فصلِ گل کی رعنائی تخیلاتِ ملوث بہ ابتذال نہ دے

مبادا اپنا مقام بلند کھو بیٹھوں

مری ہوس مجھے فردوسِ سزوکال نہ دے

مجید ملک

# انسانی فرائض و حقوق کی بحث

## جوزف میرنی کے خیالات

سید اختر علی تھری

(گزشتہ سے چوستہ)

### اٹلی کے مزدور!

میرے بھائیو، میری باتیں اچھے طریقے سے سمجھو۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ حقوق کے علم سے انسان اس قابل نہیں بنتا کہ وہ کوئی قابل مدد مستقل ترقی وجود میں لائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے حقوق ترک کر دو۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ حقوق کا قیام فرائض کے تکمیل کے نتیجے ہی کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ حقوق کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ابتداء فرائض کی انجام دہی کے جاوہ پر چلنا لازمی ہے۔ اسی طرح میں جب یہ کہتا ہوں کہ خوشحالی و خوشوقتی و بہبودی یعنی مادی اغراض کو زندگی کا مقصد قرار دینے سے ہم ایسے لوگوں کی آفرینش کے خطرہ میں مبتلا ہوں گے جن میں انسانیت و خود پسندی "پورے طور سے موجود ہوگی تو اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہمیں ان چیزوں کے حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ صرف مادی اغراض کے حاصل کرنے کی سعی کرنا اور انھیں کو اصل قرار دے لینا خوفناک نتائج پیدا کرنے کا سبب ہو سکتا ہے۔

جن ملکوں نے اپنے شہنشاہوں کے تحت سوائے مادی اغراض حاصل کرنے کے اور کسی چیز سے مطلب نہیں رکھا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ ایک

ذلیل قوم بن گئے اور اپنے بادشاہوں کے سناکانہ اور خوشخوارانہ مظالم بہتے بہتے دستی حد اور قوموں کی غلامی میں بنابت ذلیل طریقے سے گرفتار ہو گئے۔ فرائض میں اور دوسرے مقامات میں معاشرتی ترقی کے دشمنوں نے مادی عید و چہد کو ترقی دے کر تخریب و فساد کی تخم ریزی کی اور تغیر و تبدل کے خیالات دوسری طرف موڑ دئے۔ کیا ہم دشمنوں کی مدد اپنے ہاتھ سے خود کر رہے گئے؟ مادی ترقی عزوری ہے اور ہمیں اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، لیکن اس لئے ہمیں کہ ایک انسان کے لئے یہ عزوری ہے کہ اسے "اچھا کھانا" اور "اچھا مکان" ملے بلکہ صرف اس لئے کہ کسی شخص میں خودداری اور اخلاقی ترقی کا احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خواہشوں اور مزدوروں سے مسلسل جنگ میں مشغول ہے جس کی آجکل حالت ہو رہی ہے۔ تم ہر روز دس یا بارہ گھنٹے کام کرتے ہو، تم کو اس بے وقت کہاں مل سکتا ہے کہ تم اپنے کو تعلیم دو۔ تمہاری بڑی تعداد شکل سے انسانی ہے جو اسے اور اس کے متعلقین کے لئے کافی ہو سکے۔ ایسی صورت میں تمہارے پاس وہ ذرائع کہاں ہیں جن سے تم اپنے کو تعلیم دے سکو؟ کام کے لیٹینی نہ ہونے اور پھر اس میں حواتر و خنوں کے پیدا ہونے سے یہ عورت ہوتی ہے کہ یا تو تم اپنا وقت کاہلی و سستی میں صرف کر دیا پھر بہت زیادہ

کام کر۔ اس صورت میں ترتیب اوقات پابندی اوقات اور مسلسل سرگرمی کی عادت تم میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ کمائیوں کی کمی کی وجہ سے تم اتنا بچا ہی نہیں سکتے جو تمہارے بچوں کے یا عالم مصطفیٰ میں تمہارے کام آسکے۔ ایسی حالت میں تم کیونکر اپنے میں کفایت شہری کی عادت پیدا کر سکتے ہو؟ افلاس کی وجہ سے تم میں سے بہتر سے اس پر مجبور ہیں کہ اپنے بچوں کو (یہ تو میں کہہ نہیں سکتا) ماؤں کی پُرانہ تہمت سے کیونکہ غریب مزدوروں کی غریب بیویاں اپنے بچوں کو تربیت ہی کو نہ ہی دے سکتی ہیں۔ البتہ یہ کہوئی نکالنا ماؤں کی محبت بھری نگاہوں سے علیحدہ کر دیں، اور انہیں چند پیسوں کے لئے گھر سے باہر فیکٹریوں میں غیر صحت بخش محنتوں کے لئے بھیج دیں۔ ان صورتوں میں خاندانی محبت کے سونے تمہارے دلوں سے کیونکر بھوٹ سکتے ہیں۔ اور ان میں شرافت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ ہمیں شہریوں کے حقوق حاصل نہیں ہیں اور نہ انتخاب یا ووٹ کے ذریعے سے تم ان قوانین کے بنانے میں کوئی شرکت رکھتے ہو جو تمہارے اعمال اور زندگی پر حاوی ہیں۔ ایسی صورت میں تم میں شہریت کا کونسا فخر یا حکومت کے متعلق کونسا جوش یا قوانین کا کونسا خیال پیدا ہو سکتا ہے؟ دوسرے طبقوں کے ساتھ جو انصاف رمارکھا جاتا ہے وہ تمہارے ساتھ نہیں۔ ایسی صورت میں بدل و انصاف کی محبت اور عزت تم میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ ہوسنا تمہارے ساتھ بالکل ہمدردی کا برتاؤ نہیں کرتی۔ ایسی صورت میں ہوسنا کے ساتھ ہمدردی کا سبق ہمیں کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟ ان اسباب کی بنا پر ہمیں اپنے مادی حالات کے بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ اخلاقی حیثیت سے تم ترقی کر سکو۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ محنت اور مزدوری کا کافی معاوضہ ملے تاکہ تم کچھ پس انداز کر سکو۔ مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ، اور اپنے نفوس کو ان نام جذبات انتقام و قصاص سے پاک کر دو جو ان لوگوں کی طرف سے تمہارے دلوں میں جاگزیں ہیں جنہوں نے تمہاری ہمتا کے ساتھ رحم کا برتاؤ نہیں کیا۔

اس تغیر کے لئے ہمیں کوشش کرنا چاہیے اور اس طرح تم کامیاب بھی ہو گے۔ لیکن اس کے حصول کی کوشش ہمیں اسے ذریعہ واسطہ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اسے مقصد نہیں قرار دے لینا چاہیے۔ نہ صرف حق سمجھ کر بلکہ ایک فیض سمجھ کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرو، صرف مادی حیثیت سے اپنے خوشحال

بنانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے بہتر بنانے کے لئے اس کے حصول کی کوشش کرو۔ اگر یہ صورت نہیں ہے تو پھر تم میں اور تمہارے ظالموں میں کیا فرق ہو گا؟ وہ صرف اسی لئے تو ظالم کہلاتے ہیں کہ انہیں اپنی بہتری پیش اور طاقت کے سوا کسی اور بات کی پروا نہیں ہے۔

اپنے کو بہتر بنانا تمہاری زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ اپنی حالت کو ترقی ہی دے کر تم اپنے کو مستقل طور سے خوشحال بنا سکتے ہو۔ اگر تم صرف مادی اغراض کی خاطر کسی مخصوص جماعت کے نام سے جنگ کر دو گے تو ہزاروں ظالم تم میں پیدا ہو جائیں گے۔ اگر تم موجودہ پست و فرومایہ جذبات اور انا کے اپنے میں بدستور باقی رکھو گے تو معاشرتی تنظیم کے تبدیل سے کوئی فرق نہیں پیدا ہو گا۔ یہ سوسائٹیاں یا جماعتیں مثل بودوں کے ہیں جو اپنے طریق استعمال کے لحاظ سے ذہریا تریاق پیدا کرتے ہیں۔ اچھے آدمی بڑے سا جوں اور بڑی جاعتوں کو اچھا بنا دیتے ہیں اور بڑے آدمی اچھی جاعتوں کو بُرا۔ ہمیں ان طبقوں کی جو اختیاری یا اضطراری طور سے تم پر آج حکم کرتے ہیں اصلاح کرنا اور انہیں ان کے فرائض جانا نہیں، لیکن تم اس میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کا کافی حد تک اپنی حالت کے بہتر بنانے سے ابتدا نہیں کرتے۔

جب تم ان لوگوں کو جو مکمل معاشرتی تبدیلی کی ضرورت کی نہیں تسلیم کرتے ہیں یہ کہتے ہوئے سنو کہ وہ صرف تمہارے حقوق سے اہل کے اس ضرورت کو پورا کر دیں گے تو ان کی نیک نیتی کے تو شکر گزار ہو نیکن ان کے پیش نظر نتیجہ پر اعتبار نہ کرو، غریب آدمیوں کی تکلیفیں اور مصیبتیں کم سے کم ایک حد تک امیر طبقہ کو معلوم ہیں۔ لیکن اُسے اس کا احساس نہیں ہے۔ ایک مشترکہ عقیدہ کے فقدان کی وجہ سے جو عام بے پروائی موجود ہے اور اتنے برسوں تک مادی بہتری و خوشحالی کی مسلسل تبلیغ و تلقین کے سبب سے جو انانیت پیدا ہو گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ لوگ جو ان مصوہ ہوں اور تکلیفوں سے الگ ہیں وہ رفتہ رفتہ اس خیال کے عادی ہو گئے ہیں کہ یہ تکلیفیں معاشرتی تنظیم کے رعبہ لازم میں سے ہیں۔ اور اسی لئے انہوں نے اُس کے درمیان کی تلاش آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ دی ہے۔ ان کو اس کا یقین دلانا دشوار نہیں ہے بلکہ دشواری جو کچھ ہے اس میں کہ ان کی اس بے علی کی حالت کو ان سے دور کیا جائے اور ان کی اس کی ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے یقین پر عامل ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ

متحدہ اور شریک ہو کر مہائیوں کی طرح ایسی معاشرتی بنیاد جماعیہ کے وجود میں لانے کے لئے جدوجہد کریں جو اس حد تک چلاں تک کہ انسانی حالات ابڑت دیں۔ ہماری مصیبتوں اور ان کے خوف کو مٹا دے مگر یہ بغیر عقیدہ کے ہنپا ہر سکتا بغیر اس عقیدہ کے جو انسان کو اس مشن پر ہونا چاہیے جس کی تبلیغ کے لئے وہ دنیا میں بھیجا گیا ہے بغیر اس عقیدہ کے جو اس ذمہ داری پر ہو جسے انجام دے بغیر ہر شخص ایک قسم کا بار محسوس کرے۔ بغیر اس عقیدہ کے جو اس فریضہ پر ہو جو ہر فرد کو صداقت کی خاطر عمل سسلیں اور قربانی پر مجبور کرتا ہے۔

حقوق اور مادی خوشحالی کے تمام نظریے صرف ان کوششوں تک منتهی ہو سکتے ہیں جو اگر جماعتی اور تنہا بہتاری فوٹ پر منحصر رہے تو وہ کبھی کامیاب بنیں ہوں گے۔ البتہ بدترین قسم کے معاشرتی جرائم اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں باہمی جنگ پیدا کر دیں گے۔

اٹلی کے مزدور: "ہم سب بھائیو! جب مسیح کا ظہور ہوا تھا اور اُنہوں نے دنیا کی ظاہری حالت بدل دی تھی تو اُن کی طرف سے نہ تو کبھی امیروں کو "نظریہ حقوق" کی تعین کی گئی تھی (جن کے حاصل کرنے کی فی نفسہ انہیں ضرورت بھی نہ تھی) اور نہ کبھی غریبوں کو جو بہت محنت کا امیروں کی نقل میں اُن سے ناجائز فائدے اٹھاتے۔

جناب مسیح نے کبھی اپنے فائدے اور ذاتی اغراض پر نظر رکھنے کی تبلیغ اس قوم کو نہیں کی جسے یہی چیزیں تباہ و برباد کر چکی تھیں۔ اُنہوں نے فرائض کی بجائے اور ہی کی تعین کی، محبت کی تعین کی، قربانی کی تعین کی، اعتقاد کی تعین کی۔ اُنہوں نے یہی کہا کہ سب سے آگے والی جگہ وہی لوگ پائیں گے جنہوں نے دوسروں کے ساتھ سب سے زیادہ بھلائی کی ہے۔ ان خیالات نے اس سماج کو جس میں زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہی تھی پھر سے زندہ کیا۔ لاکھوں کو مغلوب کیا۔ دنیا پر فتح حاصل کی۔ اور انسانی جماعت کی تعلیم کو ترقی کے راستہ پر لگایا۔

اٹلی کے مزدور: ہم بھی حضرت مسیح ہی کے سے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم بھی اسی سماج میں سانس لے رہے ہیں جو رومی سلطنت ہی کی طرح فاسد ہو چکی ہے۔ ہم اپنی روحوں میں یہ احساس رکھتے ہیں کہ اس سوسائٹی کو باطل

بدل دیں۔ اُس میں نئی روح پیدا کر دیں۔ اُس کے تمام افراد اور کام کرنے والوں کو ایک عقیدہ میں ایک قانون کے ماتحت ایک مقصد پر لگا دیں اور خدا نے اپنی مخلوق میں جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں اُن کو آزادانہ اور صحیح فہم و فہم دیں۔ ہم دنیا پر ویسی ہی جگہ اُس سے کچھ بہتر طور پر خدا کی حکومت چاہتے ہیں جو آخرت میں ہوگی۔ تاکہ دنیا عقبی کے لئے تیاری کی جگہ اور سوسائٹی کا قیام پر ذاتی تصور کی طرف رہنمائی کی کوشش نہ کیے۔ حضرت مسیح کا ہر عمل اُن کے اُس عقیدہ کا جس کی وہ یقین کرتے

تھے منظر ہوتا تھا، اُن کے ارادہ جو وہ اپنی جہت پر لگے تھے اُن کے اعمال بھی اسی عقیدے کے منظر تھے جسے انہوں نے قبول کیا تھا۔ انہیں جیسے تم بھی ہو جاؤ۔ تم بھی مظہر و مظہر ہو گئے۔ اُن طبقوں کو جو تم سے بالاتر ہیں فرائض کی تعین کرو اور جہاں تک ہو سکے اپنے فرائض پورے کرو۔ نیکی، قربانی اور محبت کی تعلیم دو۔ خود نیکی، محبت کرنے والے اور قربانی کے لئے آمادہ اور مستعد بنو، جرات کے ساتھ اپنی ضرورتوں اور اپنے خیالات کا اعلان کرو۔ لیکن اس میں غصہ ہو۔ انتقامی جذبہ ہو اور کوئی دھمکی ہو۔ سب میں زیادہ طاقتور، چمکی (اگر اس کی ضرورت کچھ لوگوں کو پہنچا تو وہ تقریر ہوتی ہے جو عزم و ارادہ کی مالک ہو۔ وہ تقریر نہیں جو غیظ و غضب پر مشتمل ہو۔

جب کہ تم اپنے ساتھیوں میں اپنے مستقبل کے انتخابوں کے تخیل اور ایک ایسی قوم کے تخیل کا پروپیگنڈا کرتے ہو جو تمہیں تعلیم، کافی مزدوری اور کام کے دوش بدوش خودداری اور بہارت عطا کر سکے اور اسی طرح جب کہ تم اُن کا جوش اس لئے ابھارتے ہو کہ وہ کشمکش کے لئے اپنے کو آمادہ کر سکیں اور خراب و اجنبی حکومت کی طاقتوں کے باوجود وہ تمام چیزیں حاصل کر سکو تو یقیناً تمہیں چاہیے کہ اپنے کو بہتر بناؤ۔ اپنے فرائض اچھے طریقے سے سمجھو، اور اُن پر عمل کرو۔

اٹلی کے بڑے حصہ میں عوام کے لئے یہ کام نامکن ہے، جمہور کے واسطے مفید تعلیم و تربیت اُس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی، جب تک کہ لوگوں کی مادی حالت میں تغیر اور سیاسی فضا میں انقلاب نہ ہو۔ وہ لوگ جو کہ اپنے تئیں دعوہ کر دے کہ اس کے خلاف امید رکھتے ہیں اور آزادی کی تیاری کے لئے اسے مزدوری سمجھ کر اس کی تبلیغ کرتے ہیں وہ



بے عملی کے علاوہ کسی دوسرے امر کی غنیمت نہیں دے رہے ہیں۔

اس کام کو بہتر سے درمیان میں وہ لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کے حالات کسی قدر اچھے ہیں اور جنہوں نے غیر مالک میں قیام کی وجہ سے آزاد تعلیم حاصل کی ہے انہیں لوگوں کو یہ کام انجام دینا چاہیے۔

یہی چند افراد جیسے ہی ان میں وہ سچے اصول سرایت کر گئے جن پر ایک قوم کی واقعی تعلیم کا انحصار ہے انہیں ہزاروں آدمیوں میں منتشر کر دیئے گئے۔ یہی اصول راستہ کے رہنما ہیں گئے اور ان مغالطوں اور باطل نظریوں سے تحفظ کا کام دیں گئے جو صحیح اصولوں پر رہنمائی کے لئے راستہ میں ملے ہیں۔

## باغی شاعر

### مظلوم کیتھلوی

”لیکن حضور میں اپنے غمیر کی قیمت مال و زر سے کہیں زیادہ سمجھتا ہوں۔“  
شاعر نے جواب دیا۔

اشارہ گو لطیف تھا، مگر راجہ فوراً سمجھ گیا، آنکھوں سے آگ برسنے لگی، بھویں خنجر کی طرح تن گئیں اور مدد کی طرح گرج کر بولا: اسے جیل میں ٹھونس دو! شاید اسے معلوم نہ تھا کہ آج کا باغی کل کا تاجدار بن سکتا ہے۔

راجہ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی، ستھوہ قید خانہ میں ڈال دیا گیا، جیل پنجر میں ٹھونس دی گئی، لوگوں نے یہ دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے، راجہ کے حکم سے شاعر کا نام لینا جرم قرار دے دیا گیا۔ لوگ اس کی ننگوں کو ترسنے لگے، راجہ کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا موت تھی، اور اسی خوف سے لوگ خاموش تھے، مگر راجہ سمجھتا تھا۔ میں نے باغی شاعر کی یاد لوگوں کے دلوں میں نکال دی ہے۔

ایک روز جب سورج اپنے پورے جلال میں زمین پر آتشیں کرنیں برسا رہا تھا، جیل کے بڑے پھانک سے ایک اربتی باہر نکلی، یہ شاعر کی ابنتی تھی، اس شاعر کی جو اپنا ضمیر فروخت کرنے کی بجائے موت سے ہم آغوش ہو گیا، اربتی کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں راجہ کے خلاف نفرت و حقارت کا سمندر موجزن ہو گیا، راکھیں دہلی ہوئی جنگاری بھڑاک اٹھی، ان کی نڈ میں راجہ بیٹے ظالم، بدچن اور بے رحم ہی تھا مگر اب قاتل بھی بن گیا تھا۔

وہ شاعر تھا، اس کی ننگوں میں آزادی کا پیغام مضمر تھا، وطن کی جٹ زار پر خاک میں ترپنے والے آنسو پوشیدہ تھے، غریبوں کا خون چوسنے والے ظالموں کے خلاف اعلان جنگ کی تلقین تھی، ہر شعروں میں اتر جانے کی تاثیر رکھتا تھا، مظلوم، مظلوب اور مجبور لوگ اس کے اشعار پڑھ پڑھ کر جھومتے تھے، اس شاعر کا نام تھا ستھوہ۔

ستھوہ ایک ایسی ریاست میں رہتا تھا جس کا راجہ بدچلن تھا اور ظالم۔ وہ ہر وقت شراب میں غلطاں اور خوبصورت عورتوں کے حلقہ میں گھرا رہتا تھا، مگر اس عیش پسندی کے باوجود اسے شہرت کی تلاش تھی۔ نام آوری کا جنون تھا، عظمت کی خواہش تھی۔

سورج طلوع ہو اور روشنی نہ پھیلے یہ ناممکن ہے، ستھوہ بھی آسمان ادب پر آفتاب بن کر چمک رہا تھا، راجہ کی عیش گاہوں میں اس آفتاب کی کرنیں نہیں۔ راجہ نے اسے طلب کر کے کہا: ہماری شان میں قلعیدہ لکھو شاعر!

ستھوہ نے حیرت کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا: آپ کی شان میں؟  
وہ سوچ رہا تھا کہ ایک ظالم، شرابی اور ادب کی شان میں کیا لکھا جاسکتا ہے؟  
اسے شش دہانچ میں دیکھ کر راجہ نے کہا: ہم تمہیں خوش کریں گے شاعر!  
— ذرا مال سے بہتاری مجھ کو بھرو دیں گے! —

اب سب آزاد تھے، ظالم اور بدچمن راجہ کا خوف سٹ چکا تھا، اور لوگ ہر طرف وہی نظیں بکھانے لگے جن میں آزادی کا پیغام سفر تھا، وطن کی حالت زار پر تراپنے میں آنسو پوشیدہ تھے، غریبوں کا خون چوسنے والے ظالموں کے خلاف اعلان جنگ کی تلقین تھی۔

دربار کی روانی رک سکتی ہے مگر جذبات کی روانی کو نہیں روکا جاسکتا۔ لغزت نے قہر و غضب کی صورت اختیار کر لی، راجہ اپنی زندگی خطرے میں دیکھا بخت و تاراج چھوڑ کر ایوانک نکلا اور جنگلوں میں جا چھپا، لوگوں نے شاعر کا ایک غلامی بُت سخت پر رکھ دیا، اور شہر کے بہترین، مارغ اس کے نام پر حکومت کرنے لگے۔

## مقالہ آزرین

بعض مر گئے اور زندہ ہیں، اور بعض زندہ ہیں اور مردہ۔  
ایک اچھا دل بہتر ہے دنیا کے تمام اچھے دماغوں سے۔  
صرف شہید ناک الموت کو شکست دیتا ہے۔  
شباب کی آنکھوں کے سامنے کوئی بد صورت نہیں۔  
بیاریاں کیا ہیں؟ اجل کے تقاضے۔ اور موت "اُن تقاضوں پر کامیاب معذرت کا نام ہے۔  
خوشی کے بچوں کو زیادہ پیار نہ کرو، ورنہ اُس کی نازک پٹھریلے ت غم کا عرق ٹپکنے لگے گا۔  
دواؤں کی کم وقتی اسی سے ظاہر ہے کہ جب تک اُسے جہان کیا جائے، راحت نکل نہیں۔

میں آج کے مسرت خیز واقعات سے کیا خوش ہوں؟ جانتا ہوں کل ہی، اوقات ایک عبرت انگیز باد بن کر ستانے آئیں گے۔  
اے دنیا ہم فقیروں کو نہ تنہیک، ہم شاعروں کو نہ لہجہ، بڑھے! میں نہیں جھٹلائے جاتے۔  
بیوقوفوں کی ہربانیاں بڑی بڑی بزمیں ہیں، جو یکایک پڑ لگتی ہیں، اور چشمِ زدن میں غائب۔  
نیکہ کلام ایک عصا ہے، جس کے سہارے ضعیف گویائی ٹٹولتی چلتی ہے۔

(جو شمس علی آبادی)

عالمِ شباب میں موت آنا، کہانی شروع ہوتی سنی کہ زندہ لگتی۔  
وہ تبسم ہی نہیں، جس کی جلو میں آنسوؤں کا لشکر نہ ہو۔  
خدا نہ کرے، خوشی ورجہ کمال تک پہنچ جائے۔  
جس مرض کا علاج نہیں اُس سے مصالحت کر لو۔  
محبت، تلوار کے بغیر ذبح کرنے کی مناسبتی ہے۔  
حسد کے محلے میں کبھی تعلیل نہیں۔  
سزا بھی وہی دے جو محبت کرتا ہے۔  
صرف رقیق القلب ہی بہا ور ہو سکتا ہے۔  
تاریکی بھی ایک قسم ہے خواب کی۔  
جوانی کی بے اعتدالیاں بارِ قرض ہیں، جنہیں پیری نہ سودا دلا

لکھے گی۔  
خوبصورتی کا نازک ترس حصہ وہ ہوتا ہے جو تصویر میں نہ آ سکے۔  
ہمارے دور میں نیک آدمیوں کے سوا سب شریک ہیں۔  
اے مغرور! کوئی ایسی ترکیب بھی ہے کہ تو قبر میں نہ لیٹے؟  
رواجِ بُری سے بُری چیز سے صحافت کر دیتا ہے۔  
تمام دنیا کی بہترین عقلیں، شاعر کے ایک جنون کی قیمت نہیں دیتیں، اگر اتنے بڑے آدمی نہ ہوتے تو اس قدر اچھے وکیل بھی نہ ہوتے۔  
سچے شاعر کائنات کے تابع ہیں۔  
ہیت سے استاد، شاگردوں کے بنائے ہوئے ہیں۔

# وطن کے نوجوانوں سے خطا

تو ہی تو اے نوجوان تعبیر خواہ قوم ہے! —  
زندگانی کے قصیدے کی تو ہی تشبیہ ہے  
نوجوان یہ یاد رکھ متید مستقبل ہے تو —  
ہے عروس زندگی کا تو ہی سرتاج اور نہاگ  
کیا فقط ماں باپ ہی کی آنکھ کا تار ہے تو  
کارگاہ دہر میں ہے تو اک ایسی خور و میں  
طعن کی باتیں بھی سنتے ہیں جوانوں کے خلاف  
جاو بجا لوگ کہہ اٹھتے ہیں تم کو دیکھ کر —  
بن سنور کر کالجوں کو اس طرح جاتے ہو تم  
وقت ثانی اور برش کنگے میں ہو جاتا ہے صرف  
زیب وزینت اور خود بینی کا ہے تم کو مرض  
وم سے چلتی ہیں تمہارے یہ دکانیں پال کی —  
ہوٹل، لکچر کے کمرے، کھیل کے میدان میں  
زیب و تزئین کے ہو بندے، سادگی سے دور ہو —  
پاس ہونے کی خوشی ہوتی نہیں اتنی تمہیں  
اور کچھ باتیں بھی ہیں کہہ جاتے ہیں جو کلمہ میں  
تھوڑے جاتے ہیں جو تم پر عیب یا ہیں واقعی

وقت پرانے ہوئے ہستی ہے، شباب قوم ہے!  
حریت کی تو وطن کے واسطے تقریب ہے  
قوم گویا جسم ہے۔ اُس کا دماغ دول ہے تو  
تو رہا بستی انساں کا ہے کلیان راگ  
ہے وطن کا تو ریشم، اور قوم کا پیارا ہے تو  
جس سے آئینہ ہو اسرارِ فلک۔ رازِ زمیں  
کچھ گن یہ میں بھی جاتی ہیں تو کچھ صاف صاف  
”تم میں نسوانی ادائیں آگئی ہیں بیشتر  
اپنی زیبائش سے دلہنوں کو بھی شرماتے ہو تم  
اس سے جو بھتا ہے پڑھ لیتے ہو اس جارح  
یہ بدی ہے کہ کسی چیز؟ اس سے کیا غرض  
جان ہو تم ہی سنیما اور تھیٹر ہال کی  
مبول جالے حضرت یوسف کو دیکھے جو تمہیں  
تم خود آرائی کے نشہ میں ہمیشہ چور ہو  
جس کی کالج چھوڑ کر ہوتی ہے مایوسی تمہیں  
ذمہ داران کا مگر میں تم کو کہہ سکتا نہیں  
مستہم اُن کے لئے تم ہو نہیں سکتے کبھی

اس حقیقت سے مگر واقف نہیں ہیں خودہ میں  
مغزنی یا مشرقی ہو کچھ بھی ان کی نوعیت  
ذمہ دار اس کے سلف ہیں، کب ہمارے ذات  
ان عوارض میں بہت رد عمل درکار ہے  
امر حق میں کچھ ضرورت استعارے کی نہیں  
مجھ کو کہنا ہے یہ تجھ سے کُن سے لے لے لے لے لے  
جو بڑے ہیں تجھ سے، لے لے لے لے لے لے لے لے  
ہو وطن آزاد۔ اس کی لاکھ ہم باتیں کریں  
فرقہ بندی سے یہاں مجروح ہے حب وطن  
ہم اٹھتے ہیں قدم تو پھونک کر اور قول کر  
تجزیہ ہو ذہنیت کا ان بزرگوں کی اگر  
تجزیہ بد بختیوں، ناکامیوں کا ہے ہیں  
سوچ کا اور فکر کا تو اب زمانہ ہو چکا  
ہے ہماری ماقبت مبنی کا یہ کچھ حاصل  
مصلحت اندیشیوں سے کام چلنے کا نہیں  
کام وہ ہو جس سے نکھرے کچھ وطن کا رنگ و  
جونہ آیا تھا کبھی وہ انقلاب آنے کو ہے  
دیکھتے ہو کُل جہاں کس کام پر تیار ہے  
تم عصا ہو لے جو انو اپنی قوم پیار کا  
قومیت اپنی جو ہے۔ اک ملیت کا نام ہے  
مغز فرسودہ میں ہے زعم بزدلی اس قدر  
مذتوں صبر و سکون کی شعبہ بازی رہی

یہ سب اخلاق وراثت کے سوا کچھ سبھی نہیں  
ان میں اسلاف اور بزرگوں کا عطیہ ہے بہت  
نمرہ ہے سوشل وراثت کا یہ سیدھی بات ہے  
یہ جو ہو جائے تو پیراک دم میں بیڑا پار ہے  
ہو چنیت نیک تو حاجت اشارے کی نہیں  
تیری ہی جانب اٹھائے ہے نظر ہندوستان  
تو اولو العزمی کا اُن کوتاہیوں سے لے سبق  
ہے غلامی حاوی و ساری ہماری ذات میں  
جل رہا ہے تفرقہ کی آگ میں سارا چین  
یہ ہماری چال تعلیق اور لب اسفر  
تو جگہ دی جائے اس کو اک مدی سے بیشتر  
آزمو دہ کار ہیں ہم صبر میں اور شکر میں  
بند صبر و شکر کا اب کارخانہ ہو چکا  
وقت آیا ہے کہ لو تم ہاتھ میں تیغ عمل  
یہ شجر آہوں کی گرمی سے تو پھلنے کا نہیں  
اہل دنیا کو دکھا دو تم ہو بھارت کے پوت  
عالم تہذیب کو روز حساب آنے کو ہے  
جانتے ہو تم کہ کیا اس عزم میں اسرار ہے  
رنگ بدلو اس کی تم بگڑی ہوئی تقدیر کا  
ملیت بھی کیا کہ اک فرقہ سے ہے جو کام ہے  
تیز چلنے میں نظر آتا ہے گرنے کا خطر  
عقل کی ذوق عمل سے حلیہ پر داندی رہی

دیکھتے ہیں جب جوانی کا کہیں جوش و خروش  
میں نے مانا کام بے سوچے کوئی اچھا نہیں  
کاٹ دی ہے سوچنے میں ہم نے جو عمر عزیز  
سادگی اطوار میں ہوا دل میں ہو خستہ وطن  
یہ جوانی تو نہیں بس خط اٹھانے کے لئے  
گل سجاول اور رونق باغ کی پھولوں سے ہر  
پھول تو کچھ دن میں مٹ جاتا اور کھٹا جاتا ہے  
تم سے آئے گی بہارِ بخیراں گلزار میں  
تم وطن کے کام میں مصروف ہو گئے جس گھڑی  
ہادیوں کے بھیس میں پھکانے والے آئیں گے  
لے کے تسبیح اور شمرن بھی بہت آئیں گے لوگ  
اک بے یاک ناک نرک اور دوزخ دکھایا جائیگا  
ایک بھی اُن کی نہ سننا وہ ریاکاری جو سب  
چل چکا صدیوں وہ جادو اُن کا اپنی قوم پر  
فتنہ پرداز می سے اُن کی بچکے رہنا نوجواں!  
اُن کو ماضی جان کر مطلق نہ رکھو اُن سے کام  
ہے یہ سیدانِ عمل! آجاؤ تم سر جوڑ کر!  
اس قدر خود رفتہ ہو جاؤ طلب کی راہ میں

تو یہ کہہ اٹھتے ہیں، لو کھو بیٹے وہ بے عقل و ہوش  
سوچ ہی میں کاٹ دینا عمر بھی اچھا نہیں  
استفادہ تم کرو اس سے کہ ہو صاحبِ تیز  
اور اداسے فرما آئندہ کی ہو سچی کو لگن  
رکھو محفوظ اس کو آئندہ زمانے کے لئے  
خور سے دیکھو تو ہستی پھول کی کلیوں سے ہر  
ہیں وہ غنچے ہی تو جو گلزار کو مہکا میں گے  
جلوہ گر ہو گا ارم اس وادئی پر خاریں  
خضر و نار دین کے آئیں گے بیت سے آدی  
تم کو راہِ راست سے بھکانے والے آئیں گے  
ڈاڑھیوں اور چوٹیوں سے تم کو بھکائیں گے لوگ  
محشر کبریٰ کا منظر آگے لایا جائے گا  
وہ تو چادر اور تختہ کی اداکاری ہے سب  
اُن کی لوری کام دے سکتی نہیں وقتِ سحر  
آپنیے جو دام میں اُن کے تو آزادی کہاں  
تم ہو مستقبل کرو آئندہ کا حسنِ نظام  
اور وطن کے فرما کو انجام دو جی توڑ کر  
ہر قدم پر منزلِ مقصود خود دھونڈے تھیں

جب تمہارا جذبہ نہپہاں عیاں ہو جائیگا  
نوجوانو! پھر وطن بھی نوجواں ہو جائیگا

# معاشی قومیت

عبد الرحیم شبلی بی کام

”معاشی قومیت“ وہ جذبہ یا اعتقاد ہے جو اپنے ملک کو اقتصادی طور پر خود مختار اور کافی بالذات بنانے کے لئے کسی گورنمنٹ میں پایا جائے، اس کو قومی ترقی یا ملکی خوشحالی کے مرادف سمجھنا غلطی ہے۔ تاریخی لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”معاشی قومیت“ انیسویں صدی کے حامیان تجارت کے خیالات کی مرہون منت تھی، کیونکہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیں اپنی درآمد کو درآمد سے محض اس لئے زیادہ رکھنا چاہئے تاکہ زندہ مخارج کے عرصہ میں سونا حاصل ہو، اور ملک کی خوشحالی بڑھے، پس یہ جذبہ حصول دولت اور معاشی اقتدار ہی ”معاشی قومیت“ کا باعث بنا۔

انیسویں صدی کے آخر میں آدم سمٹھ نے ”معاشی قومیت“ کے نظریہ کی پر زور مخالفت کی۔ علاوہ ازیں کچھ سیاسی و معاشی حالات میں بھی تغیر رونما ہو گیا۔ اس لئے قومیت کی بجائے ”معاشی بین الاقوامیت“ کے خیالات زور پکڑنے لگے۔

کچھ عرصہ کے بعد فریڈرک لٹ

نے پھر معاشی قومیت کی حمایت کو نا شروع کر دی، اور اپنے خیالات کی رافقت میں مہنگی کے اس فلسفہ کو پیش کیا، کہ حکومت کا اقتدار اور دقاری سب سے بڑا شعور اور عقلیت منفردہ ہے۔ پس اس وقار اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک معاشی طور پر خود مختار اور کافی بالذات رہے۔

لیکن باوجود اس حانتی پروپگنڈے کے معاشی قومیت عرصہ دراز تک ایک مجبور کر دینے والی طاقت کی بجائے ایک محکوم قوت رہی اور اندر ہی اندر اس نے معاشی سامراجیت کے خیالات کو فروغ دیا جو بعد کو محار پر علیم کا باعث بنے۔ اس جنگ کے بعد سب سے بڑا سبق حواظ عالم نے سکھا، یہ تھا کہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشی تقویٰ ہی حاصل ہو، اور اس کے لئے اُنہوں نے معاشی خود مختاری اور تجارتی انقطاع کے اصول وضع کئے۔

پس اگرچہ تاریخی لحاظ سے معاشی قومیت کا ارتقاء ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن معاشی طور پر اس کی حمایت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی، دوسرے الفاظ میں تاریخ والوں کے نزدیک یہ نظریہ لاپرواہی ہو تو ہو لیکن ایک ماہر معاشیات کے نزدیک یہ مسلح نظر قابل قبول نہیں۔ آئیے ہم اس کی موافقت و مخالفت میں مختلف دلائل کا تفصیل تجزیہ کریں۔ پہلی دلیل معاشی قومیت کی حمایت میں حیاتیات یا بیالوجی سے متعصب ہے: ”قدرتی انتخاب“ اور بقا اصل کے قوانین نے اجتماعات کو کیا حیاتیات کے بارہ میں بھی انسانی خیالات کو تبدیل کر دیا ہے۔ ان کی دوسے کمزور کوفنا ہو جانا چاہیے۔ صرف اصل کو باقی رہنے کا اتنا حق ہے، پس اگر کوئی ملک یا قوم زندہ رہنا چاہتی ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے آپ کو سیاسی لحاظ سے مضبوط بنائے اور سیاسی لحاظ سے مضبوط بننے کے لئے ضروری ہے کہ معاشی طور پر خود مختاری حاصل کی جائے۔

دوسرے الفاظ میں جنگوں کے اسناد کا بہترین طریق یہ ہے کہ کسی ملک کو معاشی طور پر خود مختار نہ ہونے دیا جائے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ جب دوسری اقوام اس اصول پر عمل نہیں کرتیں تو ہمیں دوسروں پر انحصار رکھ کر تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ بظاہر یہ دلیل وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دوسروں کی تقلید کسی لائحہ عمل کو درست ثابت کر سکتی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ دلیل بالکل اس دلیل کی طرح ہے کہ اسلحہ اٹھانے سے ہی اسلحہ کم ہو سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اعتبار صرف اعتبار کرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ پس دوسروں کے دل سے شک و شبہ دور کرنے کے لئے کسی قدر قربانی کی ضرورت ہوگی۔

حال ہی میں معاشی قومیت کی حمایت میں عالمگیر کساد بازاری کی دلیل پیش کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تجارتی زبوں حالی سے بچنے، بہترین طریق یہ ہے کہ اقتصادی طور پر خود مختاری حاصل کی جائے۔ لیکن ایسا کہنے والے غالباً ملت و مملکت میں فرق نہیں لیتے۔

در اصل معاشی قومیت کی وجہ سے زراعت و زری کی مذہم عادت پیدا ہوتی ہے اور اس وجہ سے تجارت میں قفل پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں صنعتی زبوں حالی اور اقتصادی انحطاط کا فائدہ ہوتا ہے۔ پس معاشی قومیت کو، جو ایک علت ہے، کساد بازاری کی جو معلول ہے، علاج کے طور پر پیش کرنا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ علاوہ ازیں آج کل کے پیچیدہ تمدن میں معاشی انحصار ناممکنات میں سے معلوم ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معاہدہ درمیانی ممالک کی قریب ایک بڑی فتح تھی۔ لیکن اقتصادی نقطہ نظر سے اس کی نہ ساری اہمیت نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اگرچہ سرمایہ کی آزادی تجارتی ممالک میں اقتصادی طور پر اس کی وجہ سے تمام یورپی ممالک نقصان ہوا۔

معاشی بین الاقوامیت کی موافقہ میں سب سے زیادہ یہ ہے کہ قدرت نے ہر ملک کو مختلف مصلحتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر، بہتر یہ ہے کہ

بہتر نسبت کا خیال ہے کہ چونکہ غیر مساوی اجزاء میں ارتباط نہیں ہو سکتا۔ اس لئے معاشی عالمگیریت اور انحصار باہمی کے رشتہ میں منہک ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تمام اقوام، ملکیاں طور پر مضبوط و معتد ہوں اور اس کے لئے معاشی قومیت ہی بہترین لائحہ عمل ہے۔

لیکن اگر یہ تسلیم ہی کر لیا جائے کہ تباہی کے لئے مصنوعی انتخاب کے معر میں مل میں آنے کا کوئی امکان نہیں تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اقتصادی انقطاع اور معاشی خود مختاری کمزور اقوام کو مضبوط اور طاقتور بنادے گی۔ کمزور اقوام کو مضبوط بنانے کا طریق تو دوسروں کے اتحاد و ارتباط ہے نہ کہ انقطاع و خود مختاری۔ موزن ذکر طریق سے تو ممالک قدرت اور طاقت و قوت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ ان کے صنعت بخش رواداروں ہونے کی اُمید نہیں۔

دوسری دلیل جو معاشی قومیت کی حمایت میں پیش کی جاتی ہے، متوازن معیشت ہے۔ یعنی ملک میں زراعت و صنعت و حرفت اور تجارت یکساں نسبت سے ترقی یا نہ ہونا چاہئیں تاکہ ملک تمام پہلوؤں کے لحاظ سے متوازن کہلا سکے۔

خیال اچھا ہے۔ لیکن متوازن معیشت کی برکات کو صرف ایک ملک تک ہی محدود کیوں رکھا جائے۔ ان کو بین الاقوامی کیوں نہ بنایا جائے؟

کہا جاتا ہے کہ اگر معیشت غیر متوازن ہو تو جنگ کے دوران میں جب خارجی تجارت منقطع ہو جاتی ہے تو اس وقت لازم حیات کا ملنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ان میں حالات کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہر ملک کافی بالذات ہو۔

اس قسم کی دلائل کا پیش کرنا نیک فال نہیں ہے۔ ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم انسانی جماعتوں کو آپس میں متحارب و کینا پسند کرتے ہیں پھر یہ بات میری دلیل کو اور بھی زیادہ قوی کرتی ہے۔ اگر معاشی خود مختاری کے بغیر جنگیں کامیابی سے نہیں لڑی جاسکتیں تو یہ تو بہت مفید بات ہے

زیادہ ہے۔ اگر تجارت آزاد نہ ہو، اور سب مالک بل بل کر کاروبار کریں تو اس رائیگاں جانے والے سرمایہ کی بچت ہو سکتی ہے۔ یہی حال دیگر آلات دولت آفرینی کا ہے۔

اب، اُن معاشی مسائل کو لیتے ہیں جو اس جذبہ قومیت کی وجہ سے منقہ شہود پر آ گئے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو جرمنی کو مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے جنگی قرضجات اور تادان کا تعفیہ کرے اور دوسری طرف تحفظات تجارت کے ذریعہ سے اُس کے لئے جو ادائی کا واحد راستہ تھا وہ بند کر دیا گیا ہے۔

پھر معاشی قومیت کی وجہ سے رہنے کو ایک طاقت تصور کیا جانے لگا ہے۔ اور ہر ملک زیادہ سے زیادہ سونا اپنے بنکوں میں جمع کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ اس وقت دنیا کا پُر سونا فرانس اور امریکہ کے پاس ہے۔ علاوہ ازیں آبادی اور مزید رقبات کے حصول کا مسئلہ بھی اسی جذبہ قومیت کی تخلیق ہے۔

جنگ عظیم کے بعد یورپ کو لاتعداد چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ معاشی طور پر دیگر دنیا سے منقطع ہونے پر مجبور ہو گیا اور آج اُس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جرمنی اور اطالیہ ایسے مالک جو حربی اور سیاسی لحاظ سے قدرے مضبوط ہیں اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث مزید رقبات کے حصول کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے وہ جنگ آزمائی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ حال ہی میں رومانیہ اپنی ہینا کو پامال کیا ہے۔ اور مزید علاقہ جات پر دندانِ حرص و آزر کھتا ہے۔ جرمنی نے اپنے "مغلوب شدہ" مالک کی داپھی کے لئے جمعیتہ اقوام والوں کو چیلنج دئے ہیں جس کا نتیجہ سوائے خون آشام محاربہ عظیم کے اور کچھ نہ نکلے گا۔ یہ سب معاشی قومیت کی برکات ہیں !!

معاشی خرابیوں کے علاوہ اس جذبہ سے کئی دیگر برائیوں کے پھولنے کا بھی احتمال ہے۔ اگر یہ نظریہ قائم رہا تو لوگ روز بروز متعصب اور تنگ نظر ہوتے جائیں گے۔ اگر وہ انگلستان میں ہیں تو صرف انگریزی اشیاء کے استعمال پر مصر ہوں گے، حتیٰ کہ ایک دن وہ رُدی سے رُدی انگریزی فلم محض اس لئے دیکھیں گے کہ وہ قومی ہیں اور امر

ان اشیاء کی ساخت و پیدائش میں تخصیص کرے۔ جن کے لئے اُس کے قدرتی وسائل اور جغرافیائی حالات سازگار ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ملک اپنے وسیع رقبات اور مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے صرف کاشتکاری کے ہیں ہے تو اسے چاہئے کہ صرف زراعت کی طرف ہی توجہ رکھے۔ لیکن اگر، صناعہ و تجارت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے تو اُسے اسی شعبہ کی ترقی و تہذیب کی طرف توجہ دینا مفید رہے گا۔

اس کے علاوہ اس کے خلاف یہ کہتا ہے کہ عمل کی اس بے ادبی و نفیس اور بادل آزاد سے قوم کی تخلیقی قدر یا ذمہ داری بڑھ جائے گی۔ لیکن تخلیقی قوتوں کو اس کا بہت نا خوشگوار اثر پڑے گا۔

لیکن میرا خیال ہے کہ تخلیقی قوت "ایک میچر اصطلاح ہے اور اس سے بڑا اس کے معنی صنعت کے علاوہ اخلاقی اور سیاسی ادارہ کے بھی کئے ہیں۔ لیکن ہمیشہ معاشیات کے ایک "اسب علم ہونے کے ہیں اس کے معنی صرف صنعت، و حرفت تک محدود رکھنا جائز نہیں۔ پھر نیز سے نزدیک کسی قوم کی دولت آفرینی کے لئے حسن کارکردگی کا کوئی مسئلہ حیا نہیں ہے۔ اور نہ ہی جلد مالک پیدائش دولت کے لئے مساویانہ اہل ہوتے ہیں۔

اگر ہم دولت آفرینی میں انسان کی قابلیت مساویانہ تسلیم کر لیں تو سبھی آب و ہوا معاشرت، اور جغرافیائی حالت یقیناً جدا جدا ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا پیدائش دولت پر کم اثر نہیں ہوتا۔

پس چونکہ دولت آفرینی ایک اعتباری اور اضافی شے ہے اور ہر ملک کی قوت پیدائش دولت جداگانہ ہوتی ہے، اس لئے بہتر یہ لائحہ عمل یہی ہے کہ ہر ملک صرف اُن اشیاء کی ساخت و پیدائش میں تخصیص کرے جس کے لئے اُس کے قدرتی وسائل سازگار ہیں۔ اور باقی اشتباہ بین الاقوامی مبادلہ کے ذریعے سے درآمد کرے۔

پھر معاشی قومیت سے اقتصادی منافع کا بھی خطرہ ہے۔ مثلاً اگر قومیت کے زمانہ میں ہر ملک جدا جدا چار بنانا ضروری سمجھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طلب کے مقابلہ میں چاروں کی پھر سائی بقدر ۲۲ فیصد کا



نظم کا محض اس لئے ہائیکاٹ کر دیں گے کہ وہ خارجی ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے یہ  
مذہب کتبوں اور اخباروں کے بارہ میں بھی کارفرما ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ  
کوئے ٹاسٹائی اور وکٹر ہیرو کی کتابوں کا محض اس لئے مطالعہ کریں  
کہ وہ خارجی معنی میں تھے۔ پس یہ جذبہ سوائے مجنونانہ حرکت کے اور کچھ نہیں، اور اس کی  
حقیقت بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

## نسیم اُن کو بھی ساتھ لانا

اگر کہیں ہو اُدھر بھی جانا  
نسیم اُن کو بھی ساتھ لانا

سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا      ذرا دبے پاؤں پاس جانا  
بٹھانا آہستہ اُن کی زلفیں      مگر اُنھیں ہاتھ مت لگانا  
پیام بن کر جودل میں اترے      وہ مست نغمہ اُنھیں سُنانا  
زیادہ اٹھکیلیاں نہ کرنا      بہت متانت سے گد گدانا  
بڑے ہی نازک مزاج ہیں وہ      نزاکتوں سے اُنھیں جگانا  
اگر وہ پوچھیں کہ کس نے بھیجا      نہ کچھ بتانا پتا ٹھکانا  
نہ آئیں گے گر ہوا بھی پالی      یہی ہے بہتر ہوا بتانا

بنا کے جھوٹا کوئی پہانا  
نسیم، اُن کو بھی ساتھ لانا

بزم، لکھنؤ

# وقت سے جنگ

مجید ملک، بی۔ اے، ایل، ایل، بی  
ملک

میں نے کہا مجھے ایک گھڑی چاہیے :  
اُس نے جواب دیا "معاف کیجئے، گھڑیوں کی قیمتیں مجھے معلوم نہیں،  
ملک دوکان باہر گئے ہیں، تھوڑی دیر میں آئیں گے"  
میں نے دل ہی دل میں باہر کی کڑا تھی، جھپٹاتی دھوپ کا دوکان کی  
خٹک، وحشی روشنی سے مقابلہ کیا، اور بادل ناخو استہ واپس چلا، لیکن اس  
آدمی نے کہا اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو کچھ دیر انتظار کر دیجئے"  
میں ایک آرام کرسی پر جو کچھ ایسی آرام دہ نہ سہی بیٹھ گیا، مختلف گھڑیوں  
کی متوازن ٹما ٹما اور سبکی کے شکلیں مسلسل سنسن ہٹ کے علاوہ دیر تک  
میں نے اور کوئی آواز نہیں سنی، آہستہ آہستہ خشکی اور وحشت کے لئے اپنا  
اثر کیا۔ میری آنکھیں وزنی ہو گئیں۔ باہر بازار میں دو آدمی باتیں کر رہے  
تھے، ایک نے کہا میں اس کا غلام نہیں کہ ہر وقت ہاں میں ہاں ملتا رہوں،  
دوسرے نے کہا "مسیحا وقت ہو ویسا ہی کرنا چاہیے، پہلے نے کہا وقت  
کی ایسی تھی"

خدا جانے ان الفاظ میں کیا بات تھی کہ تمام گھڑیوں میں ایک  
خشونت ایک کرختی پیدا ہو گئی۔ ٹما، ٹما، ٹما، آوازیں بلند اور  
بلند تر ہوتی گئیں، اور انجام کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ گویا کوئی ترمز  
آہنگر تھوڑے کی چوٹیں لگا رہا ہے، بڑے بڑے کلاک اور معر نامہ میوں کی

بعض باتیں درست ہوتی ہیں اور بعض غلط، لیکن وقت یہ ہے کہ ایک  
ہی بات کو کچھ لوگ درست بتاتے ہیں اور کچھ غیر درست۔  
مثلاً ایک مرتبہ بن ایک لڑائی میں شریک ہوا۔ شریک کیا ہوا ہیں۔  
اکیلا ایک طرف تھا اور دوسری جانب۔  
لیکن بہتر یہ ہو گا کہ ابتدا سے قصہ بیان کر دوں۔

میں ایک بارہ ہندو روپے کی گھڑی خریدنا چاہتا تھا، میرا خیال  
تھا اور ہے کہ بڑی دوکانوں پر ہندو روپے کی گھڑی پھیں روپے میں ملتی  
ہے، اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمارے ہی بازار میں گھڑیوں کی جو چوٹی  
سی، نیکن پرانی اور مشہور دوکان ہے اُسی سے گھڑی خریدوں گا۔

چنانچہ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے ارادے کی تکمیل کے  
لئے ایک بے رنگ دروغن دروازے سے ایک بوسیدہ سی چٹ ہٹا کر  
دوکان کے اندر داخل ہوا۔ باہر کی تیز دھوپ کے بعد دوکان کی وحشی  
روشنی میں تین چار لمحوں کے لئے میری آنکھوں نے پوری طرح سے کام  
نہیں دیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دوکان بالکل خالی ہے، دوکان کا  
مالک جس غیر معمولی طور پر اونچی کرسی پر بیٹھنے کا عادی تھا وہ کرسی یقیناً  
خالی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک کونے سے ایک آدمی نکلا اور میرے  
پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

آواز میں غیظ و غضب کے ساتھ تکنت اور وقار بھی تھا۔ لیکن چھوٹی گھڑیوں کی آوازیں ایک مسلسل اور نامتناہی احتجاج کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ سب سے بڑا کلاک مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ سنا اس کے ان دوسرا نوا میں جن سے چابی دی جاتی ہے ایک حرکت، ایک چپک۔ ایک جان ہی پیدا ہو گئی۔ اور اب جو دیکھتے ہیں تو وہ غضب آلودہ آنکھیں ہر چار طرف دیکھ رہی ہیں۔ گھنٹوں اور منٹوں کی سیڑیوں نے قوی ہاڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے، اور شاہ بلوط کا صدمہ ساد چھوٹی فریم انسانی جسم کے حصہ زیریں کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

میں نے اس ہیبت ناک مشاہدے کو ایک ڈراونا خواب سمجھنے کی کوشش کی اور گہرا کر اس بڑے کلاک سے نگاہ ہٹائی۔ لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ کمرے کی تمام گھڑیاں انسانی پیکر اختیار کر چکی ہیں، ایسا انسان پیکر جس میں ایک بدیہی قسم کی آہنیت اور جوہیت کے باوجود لچک اور جان ہے۔ بڑے بڑے کلاک اور ٹائم پیس اپنے اپنے کارکنوں سے یوں اتر رہے ہیں جس طرح کسی فاتح فوج کے قومی مہلک، دیو پیکر، زرہ پوش سردار، بہریت خوردہ غنیم کے قلعہ کی فصیلوں سے اترتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی گھڑیاں نازنینان حرم کی طرح حریر و پریاں میں ملبوس مشرق و مغرب کے حسن کو ماند کرتی ہوئی اپنے جھلوں سے نکل کر بوں زمین پر قدم دھر رہی ہیں جس طرح آخر شب میں شبنم گلاب کی پتیوں پر گر جاتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان نازنینوں کے چہروں پر بھی عزم بلکہ خشونت اور شرم کے آثار موجود ہیں۔

بڑا کلاک تین چار قدم آگے بڑھ کر مالک دکان کی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا، اور بولا۔ میں اس حق کی رُو سے جو محبکہ حاصل ہے اور جس کی تفصیلات کے اظہار کی ضرورت نہیں، اپنے آپ کو صدمہ نامزد کرتا ہوں۔ نامزد نہیں منتخب کرتا ہوں، اور میں حکم دیتا ہوں کہ آپ لوگ تقریریں کریں، اور ان تقریروں میں میرے خیالات کا اظہار کریں۔

کمرے میں جتنے مرد و زن لہجہ کلاک، ٹائم پیس، اور چھوٹی بڑی گھڑیاں موجود تھیں، سب نے تالیاں بجائیں، جو زیادہ جوشیلے تھے انہوں نے نعرے بھی سر کئے۔ صدر نے ہاتھ اٹھا کر کہا "خاموش" اور ایک معمر کلاک کی طرف اشارہ کیا، اس معمر کلاک نے دو قدم آگے بڑھ کر

کہا۔ "خواتین و حضرات! انسان سمجھتا ہے ہم اس کی مخلوق ہیں، اس کی عقل و دانش اور صفت کاری کا مظہر ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہمارا ادنیٰ غلام ہے، یہ غلام باغی ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس فکر میں ہے کہ ہمارے غلام سے نکل جائے، بلکہ انسان جماعت کے وہ کچ نکلا دے کچ میں افراد جو اپنی عقل کو عقل کل اور حاصل کائنات سمجھتے ہیں، اور جن کے دلوں میں عذاری اور بغاوت کا زہر ہر رجہ اتم سرایت کر چکا ہے اس فکر میں ہیں کہ موجودہ غلام کو درہم برہم کر دیں، میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ انسان کو اس گستاخی کی قرار واقعی سزا دی جائے۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا "بیشک، بیشک یہ معمر کلاک بولا، مسز اکیا ہو؟ کسی نے کہا سولی پر لٹکا دیا جائے" ایک جوشیلے ٹائم پیس نے کہا "جس بھی پر اسے بہت ناز ہے اور جس کے بل بوتے پر اسے زمان و مکان کی سزائیں ملے کرنے کا خطبہ ہے اسی کی لہروں میں پھنسا کر اس کی زندگی ختم کر دی جائے۔ کسی نے کہا "دن کو طیل کر دیا جائے، یہاں تک کہ آفتاب کی گرمی سے تڑپ تڑپ کر مر جائے؛ پچھلی قلعہ دلوں میں سے ایک آواز آئی "ہیں، ایک لائٹنا ہی رات کی تاریکی میں اسے خود مسر پھوڑ پھوڑ کر مرنے کا موقعہ دیا جائے" اس آخری تجویز پر ہر طرف سے آفرین و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں، اور میں نے سمجھا کہ یہی تجویز منظور ہو گئی۔

لیکن ایک نازنین آگے بڑھی، اور اس نے کہا "میں موجودہ فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہوں، اور تجویز پیش کرتی ہوں کہ اسے ستر دیا جائے، اس نے نہیں کہ یہ فیصلہ غلط ہے یہ فیصلہ صحیح، اور بالکل صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود یہ قابل استرداد ہے، کیوں؟ اس لئے کہ طبقہ انات کی رائے اس میں شامل نہیں۔

میں نے دیکھا کہ معمر کلاکوں کی پیشانی پر کچھ بل سے پڑ گئے، لیکن نوجوانوں نے شریک آہنگ ہو کر کہا "بجائے، درست ہے، بالکل درست ہے، یہ فیصلہ قابل استرداد ہے، صدر نے کہا "ہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ خواتین ایک علیحدہ مجلس قائم کر کے فیصلہ کریں۔ چنانچہ اسی وقت خواتین کا ایک علیحدہ جلسہ ہوا۔ جس میں بار بار نئے نئے لباس پہن کر گرم گرم تقریریں کی گئیں، بہت سے آنسو پیائے گئے اور پونچھے گئے یہاں تک کہ بعض مقررین اور سامعین کی ساڑیوں کے آنچلوں پر عصیوں کے

وہن ترکا شبہ ہونے لگا۔ لیکن جذبات کا یہ تلام۔ سر ملی آوازوں کا یہ زیر و بم، بیوسات کا یہ رنگین تنوع، نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ اور محسوس کوئی رائے قائم نہ کر سکی۔ انجام کو سب نے مل کر صدر سے کہا ہم رائے قائم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ انکار ہمارا پیدائشی حق ہے۔ اور اس حق سے ہمیں کوئی مجرم نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کے جی میں جو آئے وہی بچے۔

تعب اس بات پر ہے کہ اس وقت تک مجھے کسی نے بھی نہ دیکھا تھا۔ میں خائف اور مبہوت اپنی کرسی پر سٹ سٹ کر دشمنوں کی نگاہوں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس مرحلہ پر خوف بچہ پر اس قدر غالب آ گیا کہ میں نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ یہی کوشش میرے لئے مصیبت کا باعث بن گئی۔ کیونکہ بھاگنے سے کہا۔ دیکھو، بکراؤ! باغی قرار ہوتا ہے۔ ایک ہی لمحے میں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ میں نے دل میں کہا "موت کا ایک دن مقرر ہے مردوں کی طرح جان دوں گا" چنانچہ دو قلم آگے بڑھ کر میں نے ایک جوان کلاک کے چہرے پر اس قدر زور سے گھونسا مارا کہ وہ چیخ مار کر زمین پر گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی دوسرا کلاک میرے اور نجات کے درمیان حائل ہوا، اور فرار کا راستہ پھر سدود ہو گیا۔ اب میں مرنے اور مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ خون میرے سر پر سوار تھا۔ میں دیوانوں کی طرح اپنے دشمنوں پر پل پڑا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں، جہاں اور جس طرح ممکن ہوا، پھرتے بدل بدل کر۔ موت سے بے خوف اور اندگی سے ناامید ہو کر میں نے پے در پے حملے کئے۔ میرے ہاتھ کلاک کی خراشوں سے لہو لہان ہو گئے۔ لیکن میرے دشمن ہر چار طرف زخمی ہو ہو کر گر رہے تھے اور میں آزادی کی امید سے محروم اور فحشندی کے احساس سے سرشار ہو کر انہیں موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔

آخر کار مجھے فرار کا راستہ مل گیا اور میں بوڑھے صدر کے چو دروازے کے سامنے کھڑا تھا پیٹ میں ایک گھون مار کر بھاگ نکلا، بوڑھا صدر تڑاق سے نیچے گر کر چلنا چور ہو گیا، لیکن جب میں دروازے سے باہر نکلا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کے اندر سے قہقہوں کی آواز آرہی ہیں۔

میں رواں دواں، افتال خیزاں، ہانپتا کانپتا دور نکل گیا، اُد اُس وقت تک دم نہیں لیا جب تک مجھے یقین نہیں ہو گیا کہ تعاقب کا کوئی اسکان باقی نہیں رہا۔ ایک کلمے میدان میں پہنچ کر میں سست نے کئے لئے بیٹھ گیا۔ میں نے گرد و پیش کے حالات پر غور کیا۔ اپنی نجات پر خدا کا شکر بجالایا۔ اپنی چوٹوں کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر کہ کوئی شدید چوٹ نہیں آئی مطمئن ہو گیا۔ لیکن مٹا مجھے احساس ہوا کہ میرے پاؤں میں ٹخنے کے پاس کوئی چیز مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ میں نے پانچھ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بالی برابر ٹخنے کے گرد لپیٹی ہوئی ہے، میں نے اسے اتارنے کی کوشش کی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بلکہ وہ اور بھی لپٹ گئی۔ میرا دل زبردورست دھڑکنے لگا، میرا صحن خشک ہو گیا، کیونکہ میں نے دیکھا کہ یہ باریک تار درحقیقت ایک گھڑی کا اسپرنگ ہے۔ اور اس کا ایک سر میرے ٹخنے پر ہے اور دوسرا سر ا— خدا جانے کہاں ہے۔ میں نے گھبرا کر سٹپا کر— جھنجھلا کر— ڈر کر— کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس تار کو پاؤں پر سے فوج کر پھینکنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس باریک تار نے مجھے شکنجے کی طرح جکڑ لیا۔ مجھے بے درت و پا کر دیا— اور اب کسی نا دیدہ طاقت نے مجھے کھینچنا شروع کیا۔ میں تڑپا۔ اٹھا۔ بھاگا۔ گرا۔ لیکن وہ باریک اسپرنگ نہیں ٹوٹا، اور میں کھینچا، گھسٹا، گرتا، پڑتا، لڑکھڑاتا اور سنبھلتا ہوا پھر اسی کمرے میں پہنچ گیا، جس سے میں جان بچا کر بھاگا تھا۔

اور جب میں اس کمرے میں پہنچا تو سب کلاک اور ٹائم میں اپنی انسانی شکلوں میں زندہ و سالم موجود تھے۔ اور مجھ پر نہیں رہے تھے۔ نازنین جیسی گھڑیوں نے سر ملی آوازوں میں اور معمر کلاکوں نے کھوکھلے۔ پھٹے ہوئے گلوں سے کھانسنے کا لہجہ کر قہقہے لگائے۔۔۔

میرے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے ڈر کر کہا: اوه میرے خدائے! لیکن میرے سامنے دو کا نڈار کھڑا تھا، اس نے کہا، "آپ سو گئے۔ کچھ آپ کو کیسی گھڑی چاہیے؟" اس سے عرض نہیں کہ میں نے کیسی گھڑی خریدی، یا خریدی

سچی یا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ میں نے اس  
بھیانک خواب میں جو کچھ دیکھا وہ سچ ہے، اور حقیقت پر مبنی ہے، اور میرے  
احباب کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد لغویت پر ہے۔  
سوال یہ ہے کہ سچا کون ہے؟

## ریاکاری

ترے مخلص کہ صبر جائیں تباہے ایزد باری کہ بے دینی سچی اک فیشن ہے مذہب بھی یا کاری  
بنے بیٹھے ہیں سب معبود اپنے اپنے حلقوں میں نائش کا ہے تقویٰ اور تصنیف کی ہے میخواری  
ہیں کیفیات بھی مسٹر کی داخل و اب مجلس میں مثال گر یہ صوفی یہ ہنسنا بھی ہے مکاری  
عزوری جانکر روتا ہے بیامرگ مادر پر مگر سمجھا ہے اس کو بھی محرم کی عزا واری  
مٹی جمعیت خاطر بھی صوفی کو تو محفل میں گوئیے نے اگر خلوت میں گائی بھی تو درباری  
مٹے جاتے ہیں باہم عاشق و معشوق الفت میں مگر اسٹیج پر جس طرح کرتے ہوں ادا کاری  
لئے پھرتا ہے شوق خود نمائی سر پہ شاعر کو اسی چلنا نہیں سیکھا ہے یہ فرزند بیکاری  
بجدا اللہ سلماں ہو گئے تنظیم کے خوگر کہ اب بے انجن کرتا نہیں ہے کوئی غداری  
اسی میں مافیت ہے کیجئے تنظیم ملا کی اگرچہ شہر پر پوشن ہے ملا کی سیہ کاری  
اسی میں مصلحت ہے مانے ہر حکم لپڈر کا اگرچہ کھل چکی ہے قوم پر لیڈر کی غداری

غلط فہمی ہے دنیا کو مرے طرزِ نظم سے

بیاں کرتا ہوں ورنہ میں تو میکش کی سیکاری

میکش اکبر آبادی

# بھوکلی آدمیت

نہیں ہماری زمین، ہزاروں انقلابات کے کیشے دیکھ چکی ہے، اور بہ قانون قانون تغیر آج بھی جاری ہے، جو کل معاوہ آج نہیں ہے، جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا۔

دفعہ امر و زمین، فردا و دوش کے نہ جانے کتنے صحیفے، حیات انسانی کے نہ جانے کتنے دلوں، زیر ترتیب و تنقید ہیں۔ ہزاروں تغیرات، لاکھوں انقلابات ہو چکے ہیں۔ مگر آدمیت کی اشتہا، آج بھی اتنی ہی شدید ہے جتنی کبھی تھی، بھوکلی آدمیت، گزشتہ شخصیت، آج بھی غیر آسودہ ہے، جو سوال کل تھا وہ آج بھی ہے، آدمیت کیا جانتی ہے؟ آدمیت کا معدہ اتنا قوی ہے کہ علوم و در علوم، اس کی اشتہا کو ناکافی ہیں۔ مگر پھر بھی آدمیت، اپنی غذا کی نوعیت سے ناواقف نہیں، اپنی اشتہا کی اہمیت سے آگاہ ہے مسلسل جدوجہد جاری ہے۔ اور ہر قدم پر حرکت محسوس ہو رہی ہے۔

آدمیت کا عہد طفلی، طفلانہ حیرت و استعجاب میں صرف ہوا یہ عظیم الشان کارخانہ عالم، روحوں میں تھر تھری پیا کر دینے والا کارخانہ عالم، جاذب نظر بنا رہا۔ قوت تخیل کی بہترین پیداوار نظریہ تخلیق آدمی بہریرت، و استعجاب کا مہم ہون منت ہے۔

زمین کو نظام شمسی کا مرکز قرار دیا گیا اور آدمی خالق کو زمین کی محبوب مخلوق، جو نظام شمسی کا وجود آدہا ہے، جو دیکھ کر ہون منت ہے،

## انتمغات احمد خاں بی اے طبع آباد

آدمی، شرف انمونات ہے، رُوح آدم کل اسرار کائنات کا گھینہ ہے جس نے رُوح کو چپن لیا، خدا کو پہچان لیا۔ اس وقت آدمی کو اپنی زندگی کی ضروریات کے سلسلے میں جس عقیدے کی ضرورت تھی وہ نظریہ تخلیق نے نہایت خوبصورت انداز میں ہم پر سچایا، اس عقیدے کی یوں اور ضرورت پیش آئی، کہ اس شرف انمونات کو اپنے روحانی سفر میں کچھ ایسے بعد سے پہلو نظر آئے، جو روحانی تکرار کے خلاف ہیں۔ لہذا ایک مکمل آئین کے تحت — مذہب نے — اپنی رہنمائی شروع کی۔

ایک عظیم الشان ہمہ گیر قوت کا اقرار کیا گیا، جو ب العلمین ہے، خالق کو نہیں ہے، پروردگار عالم ہے، ہر چیز پر قادر ہے، اس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس کی قدرت و عظمت کا مقابلہ، دنیا بھر کی قوتیں مل کر بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ سورج سے زیادہ حبیل القدر، شہنشاہوں سے زیادہ واجب التعلیم ہے۔

مذہب نے جہاں حشر انسانی پر مغاں ہر عالم کا عقدہ دالیا وہیں چند نفسیاتی ضروریات کی ترجمانی بھی کی۔ یتیم آدمیت کو ایک سرپرست کی ضرورت تھی۔ ایک عادل فرمانروا کی ضرورت تھی، وہ مذہب نے پوری کی، قبر کے پہلو پر پہور حوکی ضرورت تھی، لہذا احذر رحم کسی ہے، کریم بھی، و رزاق بہتہ، حق دینا ہے، ایمنیوں کی فریاد منت ہے، شررگ سے زیادہ قریب ہے۔

ہو گیا کہ زمین نظام شمسی کا مرکز ہے، بلکہ آفتاب ہے، کوئین آدمی کے لئے خلق نہیں کی گئی ہے، بلکہ زندگی کا سلسلہ ارتقائی صورت سے قانونِ فطرت کی ضرورت کے مطابق آدمی کی شکل میں اختتام پر پہنچا ہے۔

آدمی حیوان ہے، حیوان کی آخری صورت ہے۔ حیوانی دنیا سے الگ، کوئی مخصوص مخلوق نہیں، وہی سلسلہ ہے، آدمی بطور ارتقائی آخری اولاد ہے۔

زندگی کے اس تصور نے کایا میٹ کر دی۔ آدمی کی خود ساختہ عظمت "خدا داد" وقار، گہرا اٹھا، مذہبی روایات کو شدید دھکا پہنچا، اور آدمی کی برہنگی، آسمان سے زمین کی طرف رجوع ہونے لگی، جمعیت کے ہر طبقہ پر اس کا اثر پڑا، انقلاب و بغاوت کی چنگاریاں، تصورات سے اڑنے لگیں اور بھوک کی آدمیت نے مذیدوں کی طرح زندگی کے اس پہلو پر منہ ڈالا۔ مگر ہم کو بے لوثی سے ہر حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے، خواہ کسی سمت سے کیوں نہ آئے، یہ انتہائی طفلانہ خیال ہے کہ حقیقت صرف اُس مابنی کا حق ہے جو مذہب کے دوبرکامرائی میں نکشف ہوئی، حقیقت کسی لباس، کسی بھینس میں آئے، اُس سے ہٹنا رہنا حق پرستی کی شان ہے، میں سمجھتا ہوں کہ صحیفہ حقیقت کا ٹکڑا بھی نہیں ہوا، ہزاروں اسرار بھی اوجھل ہیں۔

"نظریہ ارتقاء نے وہ حقیقت میں پیش کیا اور اوراق کا اضافہ کیا ہے جس سے مستقبل و حال کو مزور فائدہ اٹھانا چاہیے، مذہبی لوگ ہر دنیا تصور جو انہیں حال میں شکل ماضی نظر نہیں آتا، الحاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ کونسی دیانت داری ہے کہ ہم ایک حقیقت کا محض اس عذر پر انکار کریں کہ وہ ہمارے بزرگوں کی نظر سے اوجھل تھی، میں نہیں کہتا کہ نظریہ ارتقاء، سلسلہ حقیقت کی آخری کڑی ہے، ہاں یہ کہوں گا کہ حقیقت کی ایک اہم کڑی ضروری۔

نظریہ ارتقاء نے آدمی کی "بنیادی حیوانیت" کا صحیح اندازہ کیا، اور اُس کے دماغ کو رسوم سے بڑی حد تک آزاد کر دیا، جنہوں نے اب تک نہ جانے کتنے دماغوں کو تاریکی کے غار میں جھونک دیا ہے، اور مذہب کے پردے میں نہ جانے کتنے شخصی و قومی جوہر چوس لئے۔ کیا حیوانیت سے صرف اس وجہ سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہ خوشنما ارادوں کے سلسلے میں

دعا میں مستجاب ہے۔ غلاموں سے خفا ہوتا ہے، اور جن نقصانات کی تلافی جمعیت انسانی نہ کر سکے اُن کا اجر عقیقی میں دیتا ہے، خدا عبادوں کے ساتھ ہے، جو لوگ نیک ہیں اُن پر رحمتیں نازل کرتا ہے وغیرہ۔

اس تصور سے عظیم جمعیت میں بے حد حساب مدد ملی، جس کے ہلکے اثرات بیسیوں صدیوں میں بھی محسوس کئے جاتے ہیں، مگر ان تصورات سے اُن لوگوں کو بہت فائدہ ہوا، جو اپنی صدی کے فارغ البال گوشوں میں پیا ہوئے۔ کیونکہ جمعیت انسانی فرمانِ الہی کے مطابق ہے، جو جہاں ہے وہی اُس کا مقام ہے، اور وہی تغذیر ہے۔ ان جمعیت سے انحرافات، خدا سے انحراف ہے، لہذا اسخرف ہر جہر و تشدد کا کشتی، ہندوؤں میں ذات پات کا طوق اسی لوہے سے بنایا گیا ہے۔ رہنمائیوں نے اکثر جمعیتِ وقت سے انحراف کیا، مگر صرف اس عذر پر کہ وہ فرمانِ الہی کے مطابق نہیں ہے، اس روحانی تحریک کو "حیوانیت" سے اس قدر سوئے من تھا کہ مادیات اور روحانیات میں ایک وسیع علیحدہ پیدا کر دی۔ حیوانیت نے اس میں سب سے زیادہ غلو سے کام لیا۔ مگر مثل مشہور ہے، سامجے کی ہانڈی چوڑا پر پونٹھی ہے، پنا پنے پوپ، اہل قیصر کی روحانی ہاتھ پائی، زندگی کے دغل میں ہزاروں شکوک کا سبب بن گئی۔ اس ہاتھ پائی میں قیصر نے پوپ کو جپت کیا۔ کیونکہ آدمی نے اپنے کو مادیات سے زیادہ قریب پایا، وقتی طور پر اسلام نے وحدانیت کے بل بوتے پر اس قوت کا مقابلہ کیا مگر رفتہ رفتہ روحانیت اور مادیت کا تضاد روشن ہوتا گیا، اور روحانیت، مادیت کو اپنا سرخو و حریف تصور کرنے لگی۔

بواسطہ اسلام نے آدمیت کو وہ مراعات بخشیں جس میں دوسرے مذاہب نے دماغی نخل سے کام لیا تھا، مگر بہت جلد خود اسلامی اداروں کے سینے میں خلفشار پیدا ہوا اور متعدد فرقوں نے پیغامِ رسالت کی مختلف تاویلیں کیں، جب اسلامی مملکتوں پر زوال آیا اور پوپ نے قومیت کی آندہ میں پوپ اور قیصر دونوں سے انحراف کیا، روحانیت بڑی طرح زخمی ہوئی۔ قومیت کی تحریک نے آزادانہ تنقید و تحقیق کا سلسلہ شروع کیا۔ انقلابِ فرانس نے ان مشغلوں کو اور تیز کیا، سائنس اور فلسفہ نے دینیات کے فرائض ترک کر کے، پوری جدوجہد جاری کی۔ اس کشمکش میں ڈارون اور دیگر مفکرین پیدا ہوئے۔ یہ فعلی طور پر غلط ثابت

ہے، جسے مہربوں صدی میں یوں کہتے ہیں کہ خدا خالق نہیں آدمی کے ذہن کی مخلوق ہے۔ مگر میں اس خیال سے متفق ہونے کی کوئی دلیل نہیں رکھتا، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ذرا ممکن ہے نہ انکار۔

جہاں تک معاشی و معاشری پہلو حیات کا ہے مذہب بڑی طرح سے ذہنی افلاس میں مبتلا ہے اس افلاس کے اسباب سے آگہی کے قبل چھپے یہ ذہنی نشین کرینا چاہیے کہ اس وقت آدمیت کے کیا معانات ہیں: وہ کس قدر تفریق غذا چاہتی ہے، اس وقت زندگی کے ہر لمحہ پر آفتاب تحقیق کی شعاعیں پڑ رہی ہیں، جو چہرہ توہمات کا کچھ دیکر سامنے آئے گا وہ محسوس جائے گا۔ ضروری ہے کہ ہر پہلو کو بخوبی ٹٹولا جائے۔

فرد اور فرد کے ساتھ جماعت دونوں کا سمجھنا یہ کیا گیا ہے، اور ہر تصور آج دنیا محسوس ہو رہا ہے، اسی صدی نے دہرے بدست شخصیتیں پیدا کیں، جنہوں نے فرد کی نفسیات اور جماعت کے تجزیے میں بہت مبالغہ افسانہ اقدام سے کام لیا۔ اور ایک حد تک مسائل حیات کی نوعیت بدل دی۔

میرا اشارہ ڈاکٹر فریڈ اور کارل مارکس کی طرف ہے، میں ان کے دلائل کی صداقت کبھی کا نہیں، اہمیت کا ضرور قائل ہوں۔ طوالت کے خوف سے مختصر تذکرہ دو: لڑن کا فرد۔ سی ہے۔

ڈاکٹر فریڈ نے اپنی تحقیق کا مرکز ”فرد“ کی نفسیاتی زندگی قرار دیا۔ فریڈ نے اعلان کیا کہ محض ”شعور“ سے نفس انسانی کی توضیح نہیں ہوتی، شعور کی پشت پر ایک نیم شعوری دماغ ہے، جہاں ہزاروں غلبوں اور خواہشوں کا تلام ہوتا رہتا ہے، سیکڑوں تناسل، ہزاروں آرزوئیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ جو بہت کم اپنے اصلی رنگ میں شعور کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں، تہذیب و تمدن کی پابندیاں ان فطری خواہشوں پر برت، کابیل لگا کر روکتی ہیں۔ ضمیر کی بیداری، تہذیب و تمدن کی دھڑکنی آن پر نقاب ڈالتی ہے، اور ان کو تھک سمجھ کر سخت الشور کے حجرے میں مقفل کر دیتی ہے جہاں ایک دوسرے سے سہ جوتی پھرا رہتی ہے، اور شعور کی بزم میں وہی خواہش بازیجو سکتی ہے جو ضمیر کی بیداری اور اس کے پیر بزرگوار تمدن، کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے۔

ڈاکٹر فریڈ کے نزدیک فرد فطرتاً باغی ہے۔ تہذیب و تمدن سے باغی، تمدن اس کی فطری خواہشوں کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے، یہ خواہشیں

نظریہ ارتقاء زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں جس کی بدولت بیسویں صدی اک جگہ گئی ہوئی صدی ہے۔ اکثر لوگ چیں چیں ہیں کہ ان تجربوں سے آدمی مادیات سے قریب تر ہو گیا۔ مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ ادیت سے انسان ظن بطور رد عمل خود مذہب کی شدت سے پیدا ہوا، اور یہ مادہ پرستی، روحانیت کی پیداوار ہے، لوگ اسے قبول نہ کریں گے مگر مجھے ایسا ہی نظر آتا ہے۔ آج مادی کشش کی مایوسیوں روحانیت کے حق میں سفید ثابت ہو جائیں تو عجب نہیں مگر درحقیقت یہ بین الاقوامی خیمہ کی بے غلطی کی شہادت ہے، قومیں بے نظام ہو رہی ہیں بے احسوس نہیں، مذہبی جماعت منظم ضرور رہتی مگر بے اساس تھی، اور صرف ایک نفسیاتی کدوری پر قائم تھی یعنی خوف، لہذا بے اساس بھی تھی، غیر مستقل بھی آج اگر کوئی جماعت مذہبی روایات پر منظم ہونا چاہتی ہے تو سائنس کے نشانے کے بغیر ایک منڈی بھی سانس نہیں لے سکتی۔

نظریہ ارتقاء نے بہت بڑا فائدہ دیا، یہ سچی قدر و قیمت کو پہنچا ہے، جن سے عہد ماضی کی اکثر تنظیمیں پوری توضیح سے اپنے سینے کے راز کھول دیتی ہیں، جو اصول عالم حیوانی میں کارفرما محسوس کیا گیا وہی جمعیت انسانی کا بھی راز ہے، یعنی فرد کی طرح اس کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ بچپن، شباب اور پیری کے دور اس پر بھی آتے ہیں، اگرچہ فرد و جماعت کی موت میں ضرور فرق ہے، نظریہ ارتقاء کو اس کا دوسے کوئی تعلق نہیں، ہاں تجربے نے یہ ضرور بتایا کہ مذہب آدمیت کے ارتقائی سفر میں ایک خاص منزل پر ظاہر ہوا، جس نے اس وقت آدمیت کی اشتہا کو آسودہ کیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر منزل کو پیادہ پار ہر وہ کی پوری پوری شکن اور سفر کا پابند ہونا پڑے گا۔ ہر منزل کا ایک مقام ہے جہاں پہنچکر مسافر وہ نہیں رہتا جو ایک منزل قبل تھا، مذہب بھی جمعیت انسانی کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

مذہب کے اس حقے کا فیصلہ جو خدا کے وجود سے متعلق ہے ہنوز ناممکن ہے۔ ممکن ہے اس نظام عالم کی پشت پر ویسی ہی ہم گیر و ہمہ ساعت بیدار قوت ہو جیسی مذاہب نے تصور کی ہے۔ مگر پھر بھی محکمہ اقرار اور اقرار پر اس کی تبلیغ محض روحانی، معصومیت ہے، خدا کا اقرار بھی سفر ارتقاء کی ایک منزل



ہر ذور شعور و رب تو جاتی ہیں مگر مٹا نہیں جوتیں۔ سخت الشوریہ: اگر فرد کی ایسی کھلی ذاتی ہیں جو اکثر صبح ہائے کی محدودی کے باعث فرد کی شخصیت کو میل کر دیتی ہیں، انفس کی بنیاد پر دہاتی ہے اور فرد اگر کافی بیدار نہیں تو غیر فطری رہنمائی کے گرداب میں گھس جاتا ہے۔

مکن ہے ڈاکٹر فرما کا نظریہ نقطہ ثابت ہو، اور جہاں تک ان خواہشوں میں مرکزی خواہش کا تعلق ہے اُس نے ضرور نوسے کام لیا ہے تاہم ان خیالات کے ہادلوں میں ایک خاص قسم کی چمک ہے۔ جس غلبوں کو ہم "شیطانی" غلبے کہتے ہیں ان کی اہمیت اور بلاکٹ خیز نتائج کی نزاکت دو چند ہو جاتی ہے۔ جس سے والدین اور استاد کی سرپرستی اور زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ یہ شیطانی غلبہ بھی ویسے ہی فطری ہیں جب روحانی جذبے اور یہ کہ فرد کی نفسیاتی زندگی نہایت نازک ہے۔ جن پر ہر دم بہر توجہ کی ضرورت ہے، فرد کی اصلاح و روائے کی کورانہ عقیدت میں ان غلبوں کو قوت سے دبانے پر مکن نہیں، بلکہ پورے پورے اظہار کا موقع دینا چاہیے، اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان اخلاق کی ہر قید سے آزاد ہو جائے بلکہ ان غلبوں کو صحیح راہ دکھا کر خواہشوں کو شخصیت کے لئے مفید بنانا چاہیے۔

مجھ اپنے ایک نہایت کمرے دوست کا تجربہ ہے۔ جس کا ہر دور زندگی میری آنکھوں نے دیکھا تھا، جس کی بیا شخصیت نے عین عنوان شباب میں روایات کے منبر پر ایڑیاں رگڑا کر جان دے دی۔ تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا، اور آج صبح آباد کا ہر فرد اُس جوان کی موت پر کڑتا ہے، مگر وہ اُس کے والد کے عقائد میں تزلزل نہیں آیا، اُن عقیدہ بھی کس قدر سفاک ہوتا ہو۔ کارل مارکس نے اپنی تحقیقات کا مرکز جماعت کو قرار دیا، اور معاشی و معاشری زاویہ نگاہ سے تجزیہ کیا۔ سماج کی دھنکی رگ پکڑی۔ آج سرمایہ دہنت کی معرکہ آرائیاں اُس کی نگاہ نے دیکھی تھیں۔ جب مارکس دور طالب علمی سے گزر رہا تھا جرمنی میں ہگنل کا سکہ دلوں پر بٹھایا ہوا تھا۔ ہگنل کا فلسفہ جرمنی کے جزو کل پر چھایا ہوا تھا، فلسفہ روحانی فلسفہ۔

ہگنل اپنے عہد کے مفکرین سے اس خصوصیت کی وجہ سے ممتاز ہے کہ اُس نے، مدی کشش کی اہمیت کو برقرار رکھا، مگر یہ حیثیت ایک فرض ثنائی کے ہگنل کے نزدیک عالم آدمیت ایک ذات مطلق کی تلاش میں ہنگامہ آرا ہے اور سلسلہ اضداد سے رفتہ رفتہ وہ ذات مطلق اپنے کو تدریجی ارتقا میں ظاہر کرتی جا رہی ہے۔

ہر عہد کی ایک اسپرٹ ہے، اور یہی مخصوص اسپرٹ ذات مطلق کا عکس ہے، اس فلسفے سے حکومت وقت کی حقانیت تسلیم کر لی گئی، کارل مارکس نے اس متحرک خیال پر نظر دوڑائی، اداروں کے "روحانی" فریبوں کا اثر قبول کیا، سحر ہو کر رہ گیا، وہ خود ہگنل کا شاگرد تھا مگر اُس کی ذہنیت ہندوستانی کے "مذہبی عالم" کی نہ تھی جو صرف اُس صداقت کا قائل ہو جائے، جو کاغذ کے پُرزے پر خط و عربی ثبت ہو، قدرت نے اُسے دل بھی دیا تھا، دماغ بھی، اُس نے بہت جلد اس سپر دی فلسفے کو تار لیا کہ مادی کشش کے بھونڈے جہم پر یہ محض خوبصورت نرم و نازک لباس ہے اور کچھ نہیں۔

اگر وہ مخصوص اسپرٹ ہر ادارہ قومی کو حرکت میں لاتی ہے تو خود اُس اسپرٹ کو متحرک کرنے والا کونسا عقدہ ہے؟ اس سوال نے ہگنل کی صوفیت کو ایک بھونک میں اڑا دیا۔ مارکس نے ہگنل کا اصول "اصفاد" (Dialectics) ترک نہیں کیا۔ مگر اُس نے اُس کا عکس نہیں اصلی رخ دیکھا، خیال کے باہر مادی کشش کو دیکھا اور خیال کو اُس کا عکس قرار دیا۔ ہگنل کی کشش اضداد سماج میں طبقاتی جنگ و فساد کی پیداوار ہے جو اپنی حفاظت کے لئے "خیال" کی نقاب ڈال لیتی ہے۔ سماج کو اُس نے دو بڑے اقتصادی طبقوں میں منقسم کیا اول وہ کہ جن کے ہاتھ میں قوم کی پیداوار و ذرائع پیداوار ہیں جو اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے ذہنی استحکام بھی کرتے ہیں، مذہب، فلسفہ، اخلاقیات اور قانون سے حسبِ مدعا مدد لیتے ہیں۔ دوم وہ گروہ ہے جس کی روزمرہی صرف اُس کی محنت ہے، قوت و اقتدار سے محروم ہے۔ جب پیداوار، ذرائع پیداوار اور تقسیم پیداوار کے بدن پر سماج و حکومت کا جامہ تنگ ہو جاتا ہے، بھینپی پیدا ہوتی ہے۔ تغیرات و انقلابات دونوں ہوتے ہیں۔ محروم طبقہ اپنے حقوق کے لئے جنگ کرتا ہے۔ ان طبقوں میں اُس وقت تک کشش رہے گی، جب تک جمعیت کی تنظیم طبقوں کے فرق و مراتب پر قائم رہے گی۔ آدمیت اُس دن سکون پائے گی، جب سماج میں صرف ایک طبقہ رہ جائے گا وہ طبقہ آدمیت کا طبقہ ہو گا جمعیت کی تنظیم طبقوں کے مفاد پر نہیں آدمیت کی فلاح پر ہوگی۔

کارل مارکس نے خصوصیت کے ساتھ نظام سرمایہ داری کا تجزیہ کیا۔ اور دکھایا کہ کس طرح یہ پیرزن فرما دے ہمدردی دکھا کر چالیں چل رہی ہیں۔ نظام سرمایہ داری جمعیت میں صرف سرمایہ دار طبقے کے لئے ہے یا ان انجمن

اپن کی وہ بغاوت جو اٹلی و جرمنی کے ایسا سے ہزاروں معصوموں کا بھونپ چکی ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے ہے چین کے کراہنے کی صدا، جاپان کی ڈکا کی، واز ان کے کانوں میں آرہی ہے۔ مگر ان سنیا کیوں پر اتنا استعجاب کیوں ہے، کیا انہیں خبر نہیں کہ تحفہ خودی کے غلبے وہ شدید غلبے ہیں، کہ جب زخمی ہو جاتے ہیں، آدمی یوری و زندگی سے مقابل ہو جاتا ہے، و زندگی کے علاوہ اور توقع ہی کیا ہے! کیا سرمایہ داری خوشی سے اپنا گھا آپ گونٹ لے، خود کشی وہ حماقت (یا نیکی) ہے جو صرف خروس سرزد ہو سکتی ہے، لیکن جماعت امید کے آخری لمحے تک ہنگامہ آرا رہی۔ یہ زندگی باخاں خطرہ ہی ہے۔

یہ ہیں اس وقت بھوک آدیت کے مطالبات۔ مذہب کا افلاس یہیں سے ظاہر ہو جاتا ہے، وہی طریق کار ممکن ہیں، مذہب یا تو غیر جانبدار ہے یا ان متضاد ارادوں میں سے ایک کا معاون بنے۔ حالات موجود ہیں اصل طریق کار محض دھوکا ہے، غیر جانبداری ناممکن ہے، اور جہاں تک حالات کی روشنی کام دیتی ہے، اغلب ہے کہ مذہب، استعماریت کا ہجو کا مذہب، سرمایہ دار قوتوں کا ساتھ دے گا۔ اگرچہ اس کا افلاس خود بہت ہی پر ہل ہے۔

اس افلاس کے کیا اسباب ہیں؟ مذہب بیسویں صدی میں ایک رتبہ پسند ذہنی رجحان ہے، جو معاشی قوتوں سے گھرایا ہوا ہے، مذہب نے اپنے اوائل عمر میں آدمی کی صرف روحانی اصلاح کرنا چاہی، اور افراد کو حیثیت افراد کے دیکھا، جمہوریت انسانی سے قدرے بے نیازی دکھاتے ہوئے معاشی و معاشرتی شکلات کو حل کرنے کے عوض ان سے گریز کیا، مثلاً میرے دو چھوٹے بھائیوں میں ام کے پیڑاں پر چھگڑا ہو گیا ہو، اب اگر میں یوں اسے حل کروں کہ یہ یہ بانیں دو ان مانیں، ورنہ جب ٹھٹھ کر آئیں گے تو ایک کو رسی پر لٹا دیں گا اور ایک کو آگ میں جلا دوں گا تو میں نے اس مسئلے کو حل کیا یا اس سے گریز کیا؟ اگر میں اپنی ہٹ دھرمی سے اسی کو حل کہوں، "بہترین حل" تو مجھے یہی یقین کر لینا چاہیے کہ جب میرے دونوں بھائیوں کو اس "بہترین" سے بہتر کوئی حل مل جائے گا تو دونوں نہایت حسرت و تنفر سے مبرا رہیں۔ "الہامی" حل کو جو بزم بزرگی میں نے صادر کیا تھا ٹھکرا دیں گے۔ کیا

نے لئے جو سرمایہ داری کی ہم آہنگی میں سازشیں کر رہی ہیں، محروم طبقہ عوام کا بڑا اس سے قوت چھین لینے کا حق رکھتا ہے کیونکہ کل دولت، کل پیداوار اسی طبقہ کا غرہ ہے۔ سرمایہ داری کو اس سے مستفید ہونے کا حق نہیں۔

کارل مارکس کے اس مطالبے نے روحانی اور مادی دنیا میں کھلبلی مالدی، سمین، و عسایان، اور محفل سرمایہ داران، دونوں سرو پر لگ گئیں۔ خزانہ نے فو کو ان تند و تیز غلبوں سے آگاہ کیا جو سیکڑوں معصوم افراد کو کھیل پیلے ہیں، مارکس نے "غریب طبقہ" کو سیاسی ترقیوں سے متنبہ کیا جو اوسیت تہذیب و تمدن کے نام پر اس کا خون چوس رہے ہیں۔ چنانچہ آج سرمایہ و دولت پر سر پہنچا رہا، زمین سرمایہ پر مسل زلزلوں کے پہلے آہے ہیں۔ غنقریب نابود ہونے کو ہے۔ مارکس کا اثر سیاست و حاضرہ پر بے مدد و ستا ہوا ہے، رہنما و وقت بدل گئی، محاذ بدل گئے۔

بالخصوص روس نے اس کی نئی ترجمانی کر کے سرمایہ دار قوتوں کو چونکا دیا ہے، فزاقوں کو خبر ہو گئی ہے، کہ اوسیت کا گھر آسانی سے نہیں لو جاسکتا، گروا سے جاگ پڑے ہیں، باشویرم، جو مارکس کی محنتوں کا پہلا غرہ ہے، اسے آسانی سے گھروٹے نہ دے گا۔

اب سرمایہ داری کے پاس صرف دو ذرائع ہیں، شبہید ہو جائے یا دہشید کر دے۔

اول تو ممکن نہیں، دوم ہی ممکن ہے، لہذا سرمایہ دار قوتیں قومیت و نیشنلزم کے پردے میں (سب پر وہ یہ کہی نہیں آتیں) "فاشیزم" کا غم بننے کو رہی ہیں، جب جھجھکا کر علم بلند کر رہی ہیں، سرمایہ داری آج زندگی کے رن میں ہار چکی ہے، حکومتیں، سرمایہ دار حکومتیں آخری سانس لے رہی ہیں، اکھڑی اکھڑی سانس لے رہی ہیں۔ آخری زور آزمائی کے لئے نیشنلزم کا دوہرا پی پی کر سرمایہ داری خم ٹوٹ کر رہی ہے، اس کے ساتھ فرزند سولینی اور ہٹلر، دودھ کا حق ادا کر رہے ہیں۔ یہ جھجھکاؤ ہوئی فاشیزم گم گم اور ہم میں پھوٹی ہوئی فاشیزم، یورپ کے دنگل میں گود رہی ہے، اور ایک عالمگیر جنگ کا خواب دیکھ رہی ہے۔ مگر شاید لہارک حائے سے اتر گیا ہے۔

محکوم و غلام مالک، اٹلی، جرمنی اور جاپان (اور برطانیہ؟) پر فلکی و درندگی کے الزام رکھ رہے ہیں، کیونکہ ان کے سامنے اٹلی نے حبش کو کھلایا،

کہتے ہیں اس سلسلہ کے پیچ میں خواجہ حسن نظامی یا مولانا عبدالماجد دریا بادی صاحبان۔

مذہب نے معاشی شغلات کا کیا حل پیش کیا ہے؟ میرے داغ ناقص میں کچھ نہیں آتا۔ اخلاقیات کے کچھ اصول ضرور وضع کئے مگر وہ بھی اتنے مبہم (غالباً متضاد) جو یک وقت تباہی، زچہ و دولوں کے ہم آہنگ ہوں یا جس کو بھی قوت ہو، مذہب نے اس جوان کو جسے اشراف المخلوقات کہتے ہیں، ایسے مشتبہ وعدوں پر فرشتہ بنانا چاہا جو مایوسی کے لحوں میں اکثر و بیشتر شیطان پر زیادہ اعتبار رکھتا ہے، پولیس کی لاشی اور دوزخ کی آگ سے نیکی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اور نیکی بھی کیا، جمعیت وقت کی حماقت، ظاہر ہے غنیم دوہی طرح پر فتح کیا جاسکتا ہے یا اپنی قوت سے یا خود اس کی کمزوری سے، اس غنیم، مدن کے پیدا ہونے یا اپنی کو بھی اس میں حربوں سے فتح کرنے کی کوشش کی گئی، پولیس کی لاشی نے فاتح کی قوت کا مظاہرہ کیا، دوزخ کی آگ نے غنیم کو اس کی کمزوری کا احساس دلایا۔

آج بیسویں صدی میں فرد و کساح اپنے حقوق اور اپنے مقاصد سے بہت کچھ واقف ہیں لہذا اس دور میں دوزخ کی آگ کا حربہ رنگ آلود ہو گیا ہے، اب صرف پولیس کی لاشی سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن اگر ایک طرف پولیس کی لاشی ہے تو دوسری طرف دہقان کا ڈنڈا، اب مذہب لاشی کا ساتھ دے گا یا ڈنڈے کا؟ دوسرے الفاظ میں یہ کہئے کہ مذہب اب سرمایہ دار استبداد کی حمایت کرے گا یا بھوکا آدمی کا مولش و غمخوار ہو گا؟ مذہبی ادارے نے اب تک اس دنیا سے بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا ہے (معلیٰ نہیں) "خدا" سے اتنا شغف بڑھا رہا کہ بندے کے اُداس چہرے پر نظر ہی نہ گئی، اور اگر کبھی مادی ضروریات نے مجبور کیا تو ماضی کے منبر پر شعلہ افشانی کر کے افراد سے مطلب برآری کر لی۔ مذہب نے معاشیات، مادیات میں کبھی انقلاب پیدا کرنے کی تمنا ہی نہیں کی، کبھی بنیاد کو چھوا ہی نہیں۔ تقدیر سے رشوت لے کر ہر عہد کے فرمانروا کی تائید کی۔

چند افراد ضرور حیات کے اہم فریضوں کی طرف رجوع کرتے رہے۔ مگر مذہب نے بحیثیت ادارے کے بعد ختم نبوت کبھی انقلابی جدوجہد کی

حمایت نہیں کی۔ بہت کچھ اس وجہ سے کہ مادیات کو حیوانیت کی بنیاد فرض کرتے ہوئے اُسے ہمیشہ روحانیت کے منافی سمجھا۔

مگر کیا کسی میں اتنی بہت ہے کہ مادیات سے بے نیاز ہو جائے؟ کیا آدمی محض روحانیت سے آدمیت کو آسودہ کر سکتا ہے؟ کیا یہ حیوانِ مذہب یعنی آدمی — صرف اخلاقی فتوؤں سے صلح کا رہن سکتا ہے؟ اور کیا انفرادی تکمیل روحانی کی کج شعاری، حماقت سے بے نیازی کو اخلاقاً مستحسن قرار دے سکتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں، لاکھ بار نہیں اور اگر اس پر بھی کوئی سر پھراہٹے ہاں تو میں اتنا کہوں گا (بقول جوش صاحب) "خدا، رے مادے!"

مذہب نے اس خوف سے کہ آدمی مادیات میں پھنس نہ جائے جس کی لازمی شکل روحانیت سے اسخلاف ہوگی، اُسے اور مادیات سے قریب تر کر دیا، آدمی جس پر کبھی عقلی شباب نہیں آتا، جو ہمیشہ سنجہ ہی بتا ہے۔ ادا مرد و نواہی کا اُلٹا ہی اثر قبول کرتا ہے۔ نتیجہ کیا ہوا، وہ مادیات پر اور زیادہ فریفتہ ہو گیا، اور اپنی عقیدت کا اظہار عالمگیر جنگوں میں کر رہا ہے، کیا یہ کہنا غلط ہے کہ جو دن حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا تھا، وہی سال ۱۹۱۴ء تھا؟

ماہرین نفسیات نے اس طریق کار کا ذہنی افلاس پوری طرح سے روشن کر دیا، بیسویں صدی کا پیغمبر روحانی پیغمبر نہ ہو گا، اُس کا صحیفہ بھوکا آدمیت کے لئے ہو گا، معاشی مل کا صحیفہ ہو گا، معاشری استحکام کا صحیفہ ہو گا، آسمان نہیں زمین کا صحیفہ ہو گا، نفسیاتی کمزوریوں کا نہیں قوتوں کا صحیفہ ہو گا، وہ پیغمبر حال مستقبل کا پیغمبر ہو گا، آدمیت کا پیغمبر ہو گا، اُس کی اُمت میں نہ تاجدار ہوں گے نہ گدا، نہ امیر ہوں گے نہ غریب، اُس کے سایہ عاطفت میں آدمیت کو فروغ ہو گا، آدمیت پہلی بار کھلی ہوا میں سانس لے گی، آسمان بڑھا ہو چکا، اب زمین جوان ہوگی۔ زمین پر شباب آئے گا، اور آدمی آزاد ہو گا آزاد۔

## ضروری نوٹ

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔ پتہ صاف اور غلط لکھئے۔

# جوانی

کیا شریعت کروں جوش، جب آتی ہے جوانی      سینے میں عجب دھوم مچاتی ہے جوانی  
 اک آگ سی پہلو میں لگاتی ہے جوانی      اُس آگ میں پھر دل کو تپاتی ہے جوانی  
 یوں خاک کو اُسی ریت بناتی ہے جوانی  
 اندر سے جذب و شہوانِ گریزِ زہا      احساس میں آتا ہے وہ طوفان کہ توبہ  
 پہلو میں کچھ اُن طرح مچلتی ہے متنا      آغوش میں بے جائے ہوئے بن نہیں پڑتا  
 اس طرح اشاروں سے بُلاتی ہے جوانی  
 ہر روز قیامت کے نظر آتے ہیں سماں      ہر صبح سناتی ہے حدیثِ رُخِ تاباں  
 ہر شام دکھاتی ہے خمِ کاملِ بچیاں      ہر رات کو، واکر کے دہِ خانہِ خواہاں  
 پہلو میں حسینوں کے بٹھاتی ہے جوانی  
 ہر آنکھ میں ملکیں ہیں سنبھالے ہوئے بھالے      اک کھیل ہے، جو سامنے آئے، وہ اُٹھالے  
 ہر راہ میں معشوق ہیں، گورے ہوں، کہ کالے      ہر گام پہ موجود ہیں دل چھیننے والے  
 ہر بام پہ سَوَ طُور دکھاتی ہے جوانی  
 ہر شے پہ عجبِ حسن ہے، کیا دل کو بجائیں      ہر ذرہ عالم پہ بستی ہیں ادائیں  
 ہر سنگ سے صدم کی آتی ہیں صدائیں      الفاظ ہی ملتے نہیں، کیا تجھ سے بتائیں  
 ہر چیز کو کیا کر کے دکھاتی ہے جوانی  
 اندر سے خمِ کامل و رنگِ لب و رخسار      جو سامنے آیا، وہ ہر اول سے خریدار  
 زنجیر میں گمبو کی دو عالم ہے گرفتار      صوفی ہو کہ مئے نوش، گداگر ہو کہ زردار  
 دیکھو جسے، کھینچے لئے جاتی ہے جوانی

اوروں کا کوئی ناز نہ بھاتا ہی نہیں ہے      جزا اپنے کوئی دل میں سنا تا ہی نہیں ہے  
جلوہ ہو کوئی، رنگ جاتا ہی نہیں ہے      اپنا کوئی ثانی نظر آتا ہی نہیں ہے

اس ناز سے اُمید دکھاتی ہے جوانی

خوں ریز و دل آرام ہے کجخت کی چتون      عالم کی ہر اک آن ہے تکین کی دشمن  
مکن نہیں جبنے سے بچاے کوئی دامن      ہم کیا ہیں، رسولوں کے سنگ اُٹھے نہیں  
بجلی وہ بسم سے گراتی ہے جوانی!

اللہ ری خواب اور مئی لحن خدا ساز      تاروں کا در سچہ کوئی رہتا ہی نہیں باز  
میکسوئی وہ ہوتی ہے کہ آتی ہے بعد ناز      مژگانِ دو عالم کے جھپک جانے کی آواز  
جب پچھلے پر ساز اُٹھاتی ہے جوانی

اللہ ری خوبانِ مجازی کی حکومت      معشوقِ حقیقی کو بھی ہو جاتی ہے حیرت  
مُنہ ڈھانپنے لگتا ہے ہر افراطِ ندامت      پیرانِ کہن سال کا پندارِ عبادت  
اصنام کے یوں ناز اُٹھاتی ہے جوانی

ذروں میں دکتے ہیں دُرِ صاعقہ پرور      قطروں سے اُبلتے ہیں شرابوں کے سمندر  
خاشاک کے سینے میں جھلکتے ہیں گل تر      آئینوں کے اندر نظر آتا ہے سکندر  
ہر بُت کو خدا کر کے دکھاتی ہے جوانی

ہر خار میں اک پھول ہے، ہر سچل میں سُنا      ہر برگ میں اک رنگ ہے، ہر رنگ میں گلزار  
ہر موج میں اک قص ہے، ہر قص میں جھنکار      ہر شاخ میں اک لوح ہے، ہر لوح میں تلواریں  
تصویر پہ تصویر بناتی ہے جوانی

کیا کُفر کی قوت ہے کہ وہ جاتا ہے ایمان      اسلام کے سینے میں باز اُٹھتا ہے قرآن  
اُڑ جاتے ہیں مسجد میں موزوں کے بھی اوسان      گہرا کے نکل آتے ہیں کعبے کے نگہبان

یوں دیر کی زنجبیل پھلتی ہے جوانی!

# قلم اور قدم

”قلم اور قدم“ — یا اقوال و افعال — عظیم فرہنگی رشتہ  
نویس اور انقلاب نگار و کٹر بیوروگ کی بلبل زندگی، خطبات اور  
کتب بات کا جیدہ ہے، جو ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے دوران میں  
شائع ہوا۔ اس تصنیف میں وکٹر بیوروگ نے فلسفہ سیاسی و  
معاشی کے متعلق اپنے مسلک و مشرب کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ  
کتاب متعدد جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد ۱۹۴۵ء کے وقت کو  
بیان کرتی ہے، دوسری، اُس کے سینچن جلا وطنی کے واقعات و  
واردات کی ترجمان ہے، اور تیسری اور چوتھی جلد ۱۹۴۵ء کے  
حوادث و سوانح پر حاوی ہے! آخر الذکر سال اس کتاب  
نکڑ اور ”شباب مجاہدہ“ کا ”سینہ فروب“ ہے! ڈاکٹر رائے  
کا تاریخی فیصلہ یہ ہے کہ وکٹر بیوروگ کی زندگی انیسویں صدی کے  
نیمہ اول میں سرزمین فرانس کی ساری تحریکات کی آئینہ دار واقع  
ہوئی ہے! — قلم و قدم میں یہ حیثیت مجموعی انقلابیہ ہے  
سے نڈاری پر اک صدائے احتجاج ثبت جمیدہ کی گنج ہے! یہ بیورو  
کا مہر کہ آرا کا نام ہے! وہ نیپولین کو لڑنے چار دم کا اوتار  
سمجھتا ہے! اُس کے دادا نے نیپولین کے خلاف سازش کرنے کی  
یاداش میں تختہ دار کا فیہ مقدم کیا تھا! اپنے جدِ محرم کی ہیبت

## مترجمہ اسرائیل احمد خاں

بیوروگ کے کائنات میں ہمیشہ گو سختی رہی کہ عجب پورا! اعلان حق اور  
قیام عدل مقدم ترین وظیفہ انسانی ہے! تمام اسباب تعلیم کا  
یہی عنوان بنی ہے! — وکٹر بیوروگ کو لاریب کہ اک نادرا  
رد و کار شخصیت گزردہ ہے! وہ بیک وقت حکیم، شاعر، اور مجاہد  
واقع ہوا تھا! وہ بالفاظِ خویش ”عورت کے دل کی نری اور  
غازی کے جگر کی گری“ سے بناتا! — برگ گل اور  
پارہ خار کا نادرا الوجود استزاج! قوسِ قزح اور —  
موجبِ خون کی اہونی ہم آغوشی!! — ایسے انسان خود  
اپنے خالق کے لئے موجبِ دلچسپی ہوتے ہیں! —  
خدا ہم در تلاش آسمے ہست!

۳۴۸۳۸

وکٹر بیوروگ کی سوانح عمری کے سائنس میں ایک چیز قابلِ غور  
ہے! آپ دیکھیں گے کہ ایک جہاں انما جماعتِ خون کا ذکر  
کرتا ہے! واقعہ یہ ہے کہ جماعتِ خون اور ان کی زندگی میں ایک  
مستقل تاریخی منظر ہے، ہر جہاں نے، نہ زن اور اک دوسرے  
دور کے نوحہ ولادت کے ماحول میں اک ناگزیر بہشت و جشت،  
آغا زہر پر بابِ تاریخ کے متعلق محسوس کی جاتی ہے! یہ عنوان تو

مرث ناستنائی کی خوف زگی ہوا کرتی ہے جس میں عوام و خواجہ  
سبھی کم و بیش مبتلا ہوتے ہیں، لیکن چراگ خاص جماعت اس  
داہیہ کو اپنا موت بنا لیتی ہے اور اس کی بنا پر ایک سیاسی  
پارٹی میں داخل جاتی ہے وہ مخلصانہ حوصلے سے زیادہ ایک راز  
خود غرضی کا شکار ہوا کرتی ہے! ہم اُسے خوف سے یکسر خالی  
نہیں سمجھ سکتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا ذونا دربی  
ہوا کرتا ہے کہ دل کی کسی کچی کے ساتھ دماغ کی کوئی تاریکی ہر  
بنیو! دل و دماغ اسی طرح یکساں ترکیب فرما ہوا کرتے ہیں،  
جس طرح کہ مدد و تکریم ایک وقت گرفتار ہوئے ہر سب سے حرکت! —  
تاہم غالب اور فیصلہ کن عنصر ان کی نصیت میں لوت ہوا کرتی ہے، بلکہ  
مکرمی معدوری! لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ ہلکے کے سامنے خوفناک  
مستقبل کی ایک لڑائی و زماں وعید ہی بن کر آتے ہیں! اس لئے کہ وہ  
جاہل ہوتے ہیں، اور ان کے کافروں میں ہم جو چاہیں پھونک سکتے ہیں!  
اس طرح خوف جو کہ انکا سارا معدنہٴ پیشہ ہوتا ہے، اس لئے جوش  
خوف، کما تسمیہ اگر ان کا خطرے استیاد قرار دیا جائے تو بجا نہیں،  
تاہم یاد رہے کہ ان کے خوف کا قلعن ان قدر خود ان سے نہیں ہوتا  
جس قدر کہ ان کے سامعین سے ہوتا ہے۔ جماعت خوف و دراصل  
دوسروں کے خوف کی حامل یا محرک ہوا کرتی ہے! وہ اتنی ڈرتی نہیں  
یعنی کہ ذرا آتی ہے! ہر حال خوف و اندیشہ چونکہ اس کا نگہ کام ہوتا  
ہے اس لئے اُسے ایسی صفت سے مصفت اور معروف ہونا چاہیے۔  
جدید العہد ہندوستان میں اس قسم کی ذہنیاں کہ اسلام  
خطرے میں! تہذیب اسلامی خطرے میں! نظام ملکی خطرے میں!  
اسی ذہنیت کی لڑائیں ہیں! حقیقتہً ان میں سے کوئی چیز بھی خطرے  
میں نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو محرم کے ان کرانے کے نیچے  
داؤں کو سلفاً اس کا ختم نہیں! — جو چیز خطرے میں ہے وہ  
مرد جماعت و عاشق نظام میں ان کی صفت خوریوں اور کاجوئیوں کا  
منصب ہے! (۱) اس تقریب سے ہم براہ راست بھی اس گروہ کو  
مجاہد خوف کہہ سکتے ہیں! تاہم یہ بند بھان فرض اپنے ہی قلعے کی  
دفاعت کے لئے اپنی جانیں بلکہ خود اپنی راجتیں بھی خطرے میں ڈالنا

نہیں جانتے! اپنے سارے گروہوں کا مقدمہ بنا دینا ان کے بے  
اندک کا کرب ہوتا ہے! اس کے لئے اپنے مخالفین کی زیادہ سے زیادہ  
تخلیفات و ترمیم ان کا مسلسل مستقل تعلق ہوا کرتا ہے۔ خوف و خوفناک  
کی یہ محسوس دعوت ان کی چشمانوں پر جماعت خوف کا سیاہ  
کشتہ کندہ کر دیتی ہے!

ہم بند دستائی انقلاب منتظرہ کے اس ماقبل مرث پریشا  
اس لئے بھی شایع کر رہے ہیں کہ دلی کا لڑکا ان طبقہ جہد حاضر کی  
جماعت خوف کو بچانے! اور ان کی سرگ لڑائیوں کو انقلاب  
زندہ ہونے کے نعروں میں دفن کر دے! ج

مردانہ غار سے کن، دستے بدو عالم زن!

## (۱) حق و باطل!

نیل آدم کا سارا دفتر فصاحت و بلاغت — تمامی اقوام علم  
کا، اور صحیح قرون تاریخ میں فراہم ہونے والا! — سب کا لب لباب  
یہ ہے کہ وہ ایک ضخیم سلسلہ مقدمہ ہے۔ نزاع حق و باطل کی! — لیکن حق  
و باطل کی اس آدیزش کی تاریخی رفتار یہ رہی ہے کہ اس کی حرارت و جذبت  
مسئل کم ہوتی رہی ہے! — یہی کمی، مستیاس رہی ہے انسان فی ترقی کی  
جس شام غم میں یہ معرکہ ختم ہو جائے گا، اسی کے بعد کی صحت سعادت کو بشری  
تہذیب کا آئینہ عالم تاب طلوع ہوگا! (تجاء الحق و نزہق الباطل!)  
ان الباطل کا نثر ہو قاتل! — قرآن مکرم! وہ چیز جو ہونی چاہیے تھی،  
ہم آہنگ ہو جائے گی اس شے سے جو ہے! (۲)

آئینہ بود دست و نباید، ذمیاں خواہد رفت

و آئینہ با سبت و بند دست، ہاں خواہد بود — (اقبال)

حوادث و سوانح کا سلسلہ ختم ہو جائے گا! — اور گویا واقعات

و انقلابات ہی کے کہور کا ایک قلعہ عمل میں آئے گا!!

(موجہ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی)

ہاں زمین پر انسان کی مصنوعی تاریخ کا ممت بالآخر ہو جائے گا! اور مندر شری

میں کبھی نہیں ہے! — حق اور قانون اک غیر ختم آویزش کے حریف ہیں!

حق کے پرچم کے سائے میں انسانی جان، امن، اور آزادی کی حرمت ہے، اپنی کئی پہلو بہ پہلو ہر وہ چیز استواء نظر آتی ہے جو ناقابل انفساخ ہے، ناقابل رجوع ہے، اور ناقابل تلافی! — قانون کے سمجھنے کے نیچے تختہ دار کھڑا ہے، تیغ جلا وطنی جوتی ہے، اور عصائے شاہی علم ہے! — تمام سلب و فہب، اور جلد جلا وطنی و فساد میں قیام پذیر ہیں! نیز ہر قسم کا طوق لعنت، ناقابل خلاق شادی کے انحال و سلال سے لے کر محاصرہ شہر کی شہر آشوبیوں تک! حق کی رخصت مطلقہ کئے گئے، عام خلعت کی آزاد آمد و رفت، خرید و فروخت، مبادلہ و تجارت انجام پاتی ہے، قانون اپنی سرحدوں کی پھیلیں کھڑی کرتا ہے، اور اپنے رُک قانون کی حراست لگا میں قائم کرتا ہے! حق کا فرمان ہے، از میمنت، تعلیم، — جس کی فیس میں بچوں کی معصوم غمخیزیں شوق نہیں کی جاتیں، قانون، جاہل و جاہل راہیوں کو مسند درس پر بٹھاتا ہے! حق، تربیت و استاد کا روح پرور پیام دیتا ہے، قانون سرکاری مذہب قائم کرتا ہے! عام و غیر مشروط حق و عدالت کا علیہ ہے، محدود و محدود حقوق شہریت قانون کی ایجاد بندہ ہیں! —

میں تفاوت رہ، از کجاست تا بہ کجا،

اصلاح و تلبیہ ہیئت اجتماعیہ کے سارے "جہاد باللسان" کا مقوم اُس گوشے میں واقع ہے جو قانون کی "راج ہٹ" کے مقابلے میں حق کی استقامت کا میدان ہے: میری زندگی کا مقولہ رہا ہے حق جو انسانوں کو بناتا ہے، "نکہ قانون" جسے انسان بناتے ہیں! میرا ایمان ہے کہ حریت، حق کا رفیع ترین منظر ہے! نیز یہ کہ جمہوریت کے کلیات طلیات — حریت، مساوات، اخوت — آخری تمام شریعت سیاسی کی بشارت ہیں! اس لئے کہ حریت حق ہے، مساوات اک حقیقت ہے، اور اخوت اک فرض عین! یہ انسان کامل کے جملہ عناصر ضروری ہیں، ہم صحن حیات کے اندر کھیلنے والے مجموعی بھائی ہیں، مادہ انسانیت کی آغوش کے اندر یکساں پستانوں سے دو سو پینے والے قوم بچے ہیں: کنا بہ محمد کے اندر یکساں عرض و طول کے بستر پر لیٹنے والے ہم چشم ہیں!

کا مولود، مادر فطرت کی آغوش میں پروان چڑھنا شروع ہو گا!

اس دور لوہو میں نہ نزاعات ہوں گے، نہ خصومات، اور ان کے نفسی وقفہ کے لئے نہ قوانین ہوں گے: آمین! — صرف ایک ناموس فطرت ہو گا، جو قانون کی طرح وضع نہ کیا جائے گا، الہام ربانی کی حبیبیت سے مدد منکشف کیا جائے گا! اک عظیم محکمہ تعلیم تمام دنیا پر جنگ کو شروع کر دے گا! اور آلت ہر اہر و راسخے کے ذریعے قوم آدم کے لئے اک پارلیمنٹ ذہن کا انتخاب مل میں آئے گا! —

(اس میں مژدہ گویاں و شہر وادہ)

اس شاندار و فندوس جہد میں کوئی سر نہ بچا کر بیکار نہ ہوں گے! — صرف ارباب بیکار ہوں گے! — خالقین، کہہ سکیں! — "صوبہ نل" کا تمدن ختم ہو جائے گا، اور عبداللہ خیل، کا عبداللہ اس کا وراثت بنے گا! اس دور کی دنیا کے "خواہش علیہ" ہر حق ادبیت اور فنون لطیفہ کے "اصول" عادت نکال دے گا! —

"ملکوں کی" سرحدات معدوم ہو جائیں گے! — انقلاب فرائض کا مخلوق فرائض شہد کی موت مرے گا، اور ہر زمان از غیب جاں و بیکارست کے اعجاز سچائی کے تحت پھر اٹھیں گے، اور اُس کی یہ نشاۃ ثانیہ آگ آگ یورپ سریت کے پیکر عظیم میں نمایاں ہوگی! — انقلاب فرائض "آرٹسٹ" عالم برتر بشریت کی دستاویز "کا عنوان" جلی اختیار کرے گا! — فرائض اس لئے پابان عرقریزی تنہا اپنے ہی لئے نہیں کی ہے، اُس نے مائیکر امیڈوں کو اپنی شورش کے اندر اک "پیام" سنایا ہے، اپنے "حریت، مساوات، اخوت، عدالت" والے لہرہ خلیل میں وہ تمامی بشریت کا ترجمان بنا ہے! —

حق اور قانون وہ دو قوتیں ہیں جن کی ہم آہنگی سارے نظم و ان کے مولود سعادت کی ولدیت واقع ہوئی ہے، لیکن جن کی ان بن جملہ مصائب تاریخی کا شہر خلیث رہی ہے: حق ملکوتی صداقت ہے، اور قانون ارغنی حقیقتہ نفس الامری! — حق لبرٹی ہے،

اور قانون "سوسائٹی" گویا اس جنگ و عالم میں دو آیوان عدل ہیں! ایک اہل واقعات کا، اور ایک ارباب خیالات کا! — ان دو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے درمیان بیشتر افراد بشری کی غیر



اور فضا نے آزادی میں ہماری رو میں طیو جنت کی طرح غیر شہر برپا ہیں اس

(ماہر تو آفتاب حسن از لیم)

فرزند ایم آدم و حوا را)

(۳)

## ایام طفولیت

اس انیسویں صدی کے سر آغاز میں اک بچہ تھا، جو اک پُر شوکت قصر میں رہتا تھا! قلعہ مذکور اک خانہ باغ کے آغوش میں تھا، لیکن پلسمہ زار عشرت و معیشت شہر پیرس کے اک ایسے حصے میں اپنی جائے وقوع رکھتا تھا، جہاں عام سا کینن آبادی کی آمد شد سب سے کم نظر آتی تھی! یہاں اُس کا رہنا سہنا اپنی ماں، دو بھائیوں، اور اک بزرگ بن وفا صل پاوری کی معیت و صحبت میں تھا۔ آخر الذکر بزرگ اس بچے کا خلیفہ و اتالیق بھی تھا، جس نے اپنے اس شاگرد کو ہیئت سی لاطینی پڑھائی، تھوڑی سی یونانی، لیکن تاریخِ مطلقاً کچھ نہیں! پیرس کا یہ موقع تھا، اور فرانس کی سلطنتِ اولیٰ کا زمانہ، کہ یہ تینوں بچے کھیلنے تھے اور کام کرتے تھے، آسمان پر بادلوں کا تاشا دیکھتے تھے، اور درختوں پر چڑیوں کے گیت سُنتے تھے، — اپنی ماں کے منہ کی تاثیر شیریں کے تحت! اس بچے کی یہ ہستی تھی — اگرچہ کسی کا اس میں کوئی تصور نہ تھا — کہ اپنی تعلیم و تربیت میں اُسے اک پاوری سے سابقہ پڑا! اس سے زیادہ ہولناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ جھوٹ کا اک نظام تعمیر کیا جائے، اور اُس کی محرابِ لطافت میں سجدہ ہائے عقیدت نہ رکھنے جائیں! اک پاوری کی مسندِ درس کی حقیقت ایسی ہی واقع ہوئی ہے! وہ خرافات کی تعلیم دیتا ہے، اپنی ٹہل لڑائی سے بالکل معصوم ہوتا ہے، اور یکسر اس ماجرے کی اک نظیر کہ

آں کس کہ نہ اند و بد اند کہ بد اند

در جہل مرکب ابد الدہر برب ند

ایسا استاد اپنے بد بخت شاگرد کے لئے جو کچھ دماغ سودی کرتا ہے

وہ بجائے ذہنی تعمیر کے ذہنی تخریب کا کام انجام دیا کرتی ہے، ہر اُس ریشہ

دماغی کو جسے فطرت نے درست بنایا، وہ اکت زلیخہ قلبی میں تبدیل کر دیتا ہے!

وہ اک معصوم کی روح کو سہم کر دیتا ہے! وہ اک کس کے سینے کو کبیرا سن تعبث

سے پاٹ دیتا ہے! وہ سپید سحر کی نامیہ جمال پر غروب آفتاب کی نقاب ڈال دیتا ہے!

(روزے کہ شود اذالہ سمار نشست

من و ابن تو بگیرم اندر عصمت

پرستم شیخا ابای ذنب قتلت۔

وہ قدیم و عزت گزین مکان اور باغ، جو اپنے سابق ترمانی

میں اک خانقاہ رہا تھا اور بعد ازاں اس بچے کی ہمد گاہ بنا تھا، آج اُس

کی شام پیری میں بھی اُس کے لئے اک حرم محترم کی حیثیت رکھتا ہے! —

اگرچہ اُس کا مقدس موقع اب اک جدید الہد مرکب سے ناپاک

کیا جا رہا ہے! اُس کا شامہ یہاں اک کیف انگیز فضا کو سونگھتا ہے، جہاں

شعاع ہائے آفتاب اور شگوفائے گلاب کے درمیان اُس کا غنچہ روح

بھی کھلا تھا! اس مکان کے دیوان خانوں، یا اس خانقاہ کے حجرہں میں

کبسا دیدنی سکوت گوشہ گیر واقع ہوا تھا، صرف طویل وقفوں کے ساتھ

اس قصر خاموش کی ہر سکوت ٹوٹا کرتی تھی! یہ وہ موقع ہے کہ اُرتے تھے کہ

اک شمشیر در کمر اور پر شرخاب در کلاہ سر جزل نزول اعلان فرمایا کرتا تھا،

— یہ جزل اس بچے کا باپ تھا، جو سو کہ محارب سے شہستان خلوت کی

طرف اپنی عنان توجہ موڑا کرتا تھا! — اُس کا بچہ اب بن تیز کو

پہونچ رہا تھا۔

یہ بچہ نہیں تھا!

ایک رات کا ذکر ہے — سلطنتِ فرانس کے یہ کسی بڑے جشن

کی تقریب تھی! — سارا پیرس چراغاں سے مطلع الاوار بنا ہوا تھا!

میری ماں اسی خانہ باغ میں محو حرام تھی! میرے باپ کے تین نوادہ وقتاً

جنگ کے جھرمٹ میں! میں بھی اسی جماعت کا اک مقتدی تھا! — ناگہلا

درختوں کی تاریکی میں اک طویل القامت پیکر پر میری نظر پڑی! —

یہ اُن ایام کا نامور باغی، وکٹر ڈیولیرا ہی تھا! — میرا دادا!

— یہ اُس مہیت ہار وقت میں بھی قیام آزادی کی راہ میں جبار و

قہار میولین کے نو ظہور استبداد کے اہدام کے لئے معروف سازش تھا!

— مستقبلِ قریب ہی میں وہ تختہ دار پر سرافراز ہوا۔

(چوں حرف حق بلند شود و اثری شود!)

مجھے اپنے جہد و الجھ کے کلماتِ حلیل یاد ہیں! — اگر وہ اپنے

استنداد!

(دادری دارم، ولے یارب کراو اور کٹم)۔

جلد وطنی سے قبل جو حیرت خیز ماہ و سال گزرے، اس کے

## (17)

کو بھی منھا گیا !

بہی ادا کیا! نیز اس ادا سے فخر کی قرار واقعی داد بھی ملتی! — یعنی وطن!

اسمٰنِ حق کی داد لوں کس سے

سن چکا ہوں ف: منظور ہے)

مجھے یاد ہے کہ جب عبد سابق کے لال کھجکڑ، "مقوق والدین" پر دخط فرمایا کرتے تھے تو بعض بے دعت ایسے بھی ہوتے تھے جو یہ ادب، انجیبہ فک کہہ دیا کرتے تھے کہ "بچوں کے بھی کچھ مقوق ہیں"!

(ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں !)

کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے !)

میں وہ دیدنی لمحے بھی نہیں بھولا ہوں، جبکہ لوگوں کو یہ کہہ کر میں غریب حیرت کو دیا کرتا تھا کہ "مفسر بشری سے اُس کی ازلی نکت و فَلَک کو ختم کر دینا دائرۃ امکان سے خارج نہیں ہے۔"

۱۸ جولائی ۱۸۵۱ء کی آتشیں جہازیں سمیٹ کر میں نے "لوئی بونا پارٹ" کی سازش بخلاف انقلاب کو بے گناہ و بے نشانہ ملامت بنایا اور اس کے اس منصوبہ پر مشورہ کو بے نقاب کر دیا کہ وہ پریزیڈنٹ کی پردہ ریا کاری کے پیچھے چھپائے ہوئے ملوکیت و زیب تن کر رہا ہے۔

اک دوسرے عظیم النظیروں کے روز روشن میں ابوانِ عدل کے صد  
 (منبر اے میں نے چننا ایسے کلمات کا تحفظ کیا جو اس سے پہلے فرنگستان کی خفا

کے شہداء تاجستان کی نور انگینوں سے تعمیل ہو رہے ہیں! اگر بیدار و زندہ  
کی برقراریاں اور ملعون پاؤں ہتوں کے ابرغلیظ حقیقتہً چھٹتے رہے ہیں  
اگر سیاہ سخت بشریت کی قسم کی صورت کو گنبد گرداں برابر پھٹتا رہا ہے  
تو کچھ شک نہیں کہ ہم مطلع عالم پر اک گلابی صبح کے طلوع کا جشن منانے والے  
ہیں! (خوش باش، کہ بات کو خدا پر ہو!)

آئیے اپنے سر سے دشمنان تاجستان کو اک پیام اس و اخوت  
دیں! صلح و سلام کی مراعات بہشتی پر کسی نادر و خس کا گزرنہ ہونا چاہیے! مگر  
خدا کی مادیات کی آغوش میں بہت بچہ انسانی خون بہہ چکا ہے! قافلہ  
آدم کب سمجھے گا کہ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں! ہماری سیاسی  
جہان بینی ایک "حصار آہنی" ہوئی، لیکن ہماری بڑی برادری و رفقاء  
گلاب کی اک صف جمیل بنے گی!

(ذاتفاقاً گلابی شہدائی شوق سپہ!)

خدا پر لذت شیریں و اتفاق بہت ہے)

(۴)

## اصول جمہوریت

قوم کا اقتدار اعلیٰ، ہمہ گیر و وٹ، اور آزادی پر پس یہ تینوں  
چیزیں تین مختلف ناموں کے برابر ہیں ایک ہی تین نکاح حقیقت ہیں!  
یہ عناصر رکنا ہماری پبلک زندگی کی کلیت کے اجزائے ترکیبی ہیں! پہلی  
چیز مقصود باذات ہے، دوسری اس کا طریق کار ہے، اور تیسری اس  
پر ایہ اظہار! اس طرح یہ سب ایک دوسری سے غیر منفک واقع ہوئی  
ہیں! عامۃ الناس کی سیادت، قوم کی حیات پر و روح رواں ہے،  
رائے عامہ فرداں حکومت ہے، پس سارہدایت ہے! لیکن پھر یہ ہر  
ایک ہی چہرہ تقبلیت کے تین رخسارے ہیں، جلد خط و خالی کی حامل صورت  
کی میثاقی پر جمہوریت "کا طفرائے لکھا ہوا ہے! یہ تین جو اہر اک نظام جمہوری  
میں جس طرح اپنے مظاہر رکھتے ہیں، وہ اک دلچسپ ماجرا ہے، قوم کا غلبہ  
سیاسی آزادی پیدا کرتا ہے، عام ووٹ سطح سادات کو ہموار کرتا ہے،  
اور پرس اخوت کا منہر خطابت بنتا ہے!

وہ دے زمین کے جس گوشے میں یہ عناصر ملتا ہے! اپنی پوری قوت اور

میں نہ گونجتے تھے! --- ریاست ہائے متحدہ یورپ!

معاذت و حقارت کے کلمات تہری کی مجھ پر بارش کی گئی! مگر میں اس  
ذیل بانی و قیاس کو کیا، خود سماعت بنانے والا تھا! --- کیا ان گدھوں نے  
جائزہ و شکر گن کو بھی جیب کترا نہیں کیا تھا!

(دور بمان ازل و کورین) بتم ہر میں!

ہر دور انجائے نگرند، آنچہ دور، آنچہ بیند!

پھر ہمارے ذہن کے باقیات بہت کے سہل یہ اتنی اپنی ان  
باطل و تہوں میں کیا چنچ لوی کا سیراب شرارت کرتے تھے! مطلق میں!  
تعلیم ان کے قریب غور و نگاہ اپنے، کو اپنی سببہ تاریوں کا آتش نہ بنایا  
تھے! سببہ وہ سمجھوتہ ہوتے تھے، لیکن ان کی بطنی صلاحیت کی وکیر ثابت  
ہو رہی تھی!

(مرد و شو، سبب خیر گرد، خواہند!)

وہ زبان سے ہر خلو، پروری بنے ہوئے تھے، لیکن ان کی غنچ پڑی  
کی جہان، شوقی چینی رہی تھی، ان پیشا ر قوانین و ضوابط کے اعمال و سہل  
میں جو غنچ، سہ کے لئے جانستان بنے ہوئے تھے!

دنا غنچ من قنق شدہ غنچ میں ترا!

دارند اہل فقر و درویش، تہہ و تہہ ہزار!

وہ مجلس خلعت نہ تھے، خدا کی مہداریوں کا اک غول تھے! پھر  
اس کو، وہ بلعقل کے خضر طرب بھی مانتے، اندر وہ تھے جو بدترین خلاف واقع  
دستہ تھے!

انہی اعدائے بکار شیطانی، کمالا حوں پڑھیں، اور ان کے ذکر زشت  
کو کو کر رہے! --- شب و بھر کو اجازت دو کہ وہ تاریکی کی ذریات  
پر آتش، پر وہ ڈال دے! (آلا بعد دعوم اللامعون! --- قرآن)

کیا پرواہ ہے ہماری ساری و تر بڑیوں، خاندانیوں، جگر کا دیوں،  
اور جلا وطنیوں کی، اگر انکا مال و حاصل بستریت کے لئے ایسا شریک بنایا!  
(سفینہ جبکہ کنارے پہ آٹھا غالب!)

خدا سے کیا ستم و جور ناغہ ا کہنے!

جر نسل انسانی سچ بہن دوسے کی زہریلے سے آردی بہشت  
و خور وادی شگوفہ پر و شیر گری کی طرف نہ رواں ہنہ! اگر دامنہ زستان

گھڑت میں پائے جائیں گے، وہاں جمہوریت بھی صورت نہ نظر آئے گی۔ پھر چار  
اس پر ملکیت ہی کا طغیانی کیوں نہ منقوش ہو! — اسی طرح جہاں ان  
معتادہ صلیب سے خیانت کی جاتی ہے، ان کی راہ میں مزاحمت پیش کی جاتی ہے۔  
ان کی ٹھوگری زبان بندی کی جاتی ہے، تو تحقیقی زبان فرمائی وہاں ملکیت  
یہی کی ہے۔ — اگرچہ جمہوریہ کے تسمیہ سے اس کی اک نظر غریب دانش کی  
جہاتی ہو!

آخر الذکر صورت حالات میں ہم وہ ہولناک منظر سیاست دیکھتے ہیں،  
جب کہ اک حکومت کو خود اس کے "امین" دغا دیتے ہیں، ایسی بارے شگفت  
ہے جسے دیکھ کر بڑے بڑے راسخ الایمان قلوب، انقلاب سے بدول ہو جاتے  
ہیں! انقلابات عبارت ہیں ناپید انرا، شتر مہیا تحریکات سے جو بحر  
فلسفہ سے عظیم ترین و عمیق ترین حقائق کے جو اہر نکالتی ہیں، اور سفارہ  
ان لڑائی کو صلح بالائی کے منظر عام پر لے آتی ہیں۔

(ہر کے اذنین خود دست، یا رمن و زورون من نہ حبت اسرار من!  
بتر من از نال من دور نیست یک کس را بغم آں منظور نیست)  
سب ہم دیکھتے ہیں کہ انقلاب کی جلو میں کیسے جلیل انسان اصول  
معروضہ میں آتے ہیں تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن جب ہمیں یہ  
نظر آتا ہے کہ اس ہنگامے میں کیسے کیسے ناشدنی انسان اپنی سینہ زوری سے  
صفت اول میں آ جاتے ہیں تو بادل نا خواستہ ہیں انقلابات کو حادثات کا  
مام دینا پڑتا ہے! (کھیب من السماء فیہ ظلمات و سرحد و بوق  
— قرآن مجید)

ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جمہوریت کے معرضہ با  
اعضائے رئیس اک جسم واحد کی صورت میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں! یہ قیوں  
باہم خواجہ تاش واقع ہوئے ہیں! وہ قیام و اہتمام دولاں میں ساتھ ساتھ  
رہتے ہیں! وہ ہجوم و دفاع ہر دو حالتوں میں رقعائے جنگ نظر آتے ہیں!  
مثلاً اگر پریس کی آزادی خطرے سے دوچار ہوتی ہے تو رائے عامہ اٹھتی ہو  
اور اس کی پشت پناہی کرتی ہے! اور اگر حقوق شہریت کو دھکی دی جاتی ہے تو  
پریس انھیں اپنے سایہ عاطفت میں لے لیتا ہے، ان دولاں میں سے کسی کے  
خلاف اگر کوئی اقدام کیا جائے گا تو اس میں قوم کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف  
اک فدا رسی تصور ہوگی!

اس عظیم انیسویں صدی کی جدوجہد کسی ایک قوم کی تحریک نہ شمار  
کی جانی چاہیے، وہ تمام اقوام عالم کا اک ہم گیر جہاد عام ہے! اس جلوس  
انسانیت میں فرانس میر کارواں واقع ہوا ہے، اور باقی اقوام اس کے  
پیام "فرم" پر اٹھ اٹھ کر اس کے نقش قدم پر آرہی ہیں! ہم عہد قدیم کو خیر باد  
کہہ کر عہد جدید میں داخل ہو رہے ہیں! اور ہمارے حکام عالی مقام اور  
ہمارے قوانین، والا احترام کی کوئی کاوش ساعت وقت کی سونیوں کو اٹا  
چلنے پر مجبور نہیں کر سکتی! قائلہ بشریت، سوخ  
گزر گیا ہے وہ کوسوں دیار حرمیں سے!

فرانس اور سارے یورپ میں اس وقت ایک جماعت موجود  
ہے جو جبریل امیدی نہیں، البتہ ہر اس کی ہمہ واقع ہوئی ہے: یہ لوگ کسی  
سر زمین میں غفر راہ نہیں بن سکتے! باہمی عناد و پرغاش کی اس فضا میں  
جو سوال اک غیر ختم تسلسل سے پوچھا جا رہا ہے وہ یہ ہے۔۔۔۔۔ کون ملزم ہے؟  
جس نازک دور سے ہم گزر رہے ہیں۔۔۔۔۔ اگرچہ یہ دور اپنی ساری  
نزاکت کے باوجود و سحر خیر کے کسی اور انجام کا پیش خیمہ نہ بنے گا۔۔۔۔۔  
ہر شخص موجودہ خوفناک اخلاقی اندر کی اور بھی خطرہ اخطا پر وحشت زدہ  
و فریادگیاں ہے! اچھا تو کون باقی کار ہے ان مظالم و جرائم میں ہمارے  
بر اعظم یورپ میں جماعت خوف کا جواب ہے! فرانس! سارے فرانس  
میں اسی کا جواب ہے! پریس! سارے پریس میں جس چیز کی طرف انگلی اٹھائی  
جاتی ہے وہ ہے! لیکن ساری اغوا عام کے علی الرغم جو چیز بانی و  
مبانی ہے وہ ہے! روح انسان!

توڑ ڈالیں فطرت انسان نے زنجیریں تمام!  
دوروی جنت میں روتی چشم آدم کب تک!

ہاں لاریب کہ یہ روح انسان ہی ہے جس نے اقوام عالم کو اپنی  
معلوم ماہیت و حیثیت بخشی ہے! صبح آفرینش سے لے کر اس وقت تک،  
بے پایاں بحث و مذاکرہ اور نامتناہی رد و قدح کے دشوار گزار خارزار  
سے عبور و مرور کرتے ہوئے، اس روح انسان نے برابر یہی کوشش و  
کاوش کی ہے کہ اس عقدہ لایخل کو حل کرے جو ازل سے اس کے خالق  
نے اس کی راہ کا سنگ راہ بنایا ہے! — یہ روح انسان ہی ہے جو  
عہد بہد تاریخ کے تمامی انقلابات کے ہار عظیم کی بارکش بنی ہے! اس کے مظاہر

باری باری سے، — اور کبھی بیک وقت — رہے ہیں، غلطی، غلط،  
فریب نظر، ارتداد، نفاق و شقاق، لغو و احتجاج، اور گلبانگ حق؛  
— روح انسان ہی تمام شعبائے بشری کی عظیم الشان "شبان" رہی  
ہے؛ اُسے کتنے ہی گونا گوں منازل و مراحل پیش آئے ہوں، لیکن اُس کا  
شدید بحال ہمیشہ قبلہ حق اور کعبہ عدل ہی کی سمت میں رہا ہے؛ اُس سے  
بیشمار لکڑشیں اور لاقعد و کج رویاں سرزد ہوئی ہوں، تاہم اُس کی عام  
شاہراہ حق، حسن، تنویر خلق، اللہ، ارتقاء ارواح، تقرب مابین انسان  
واللہ کے رُخ ہی پر رہی ہے۔

فرنگستان کی جماعتِ خوف کو حلام ہونا چاہیے کہ جو ہم عظیم  
انھوں نے اپنے نازک شانوں پر اٹھائی ہے وہ سچ بہت ہی عظیم ہے،  
انھوں نے قبل ازیں "پیرس" کو تباہ کر دیا ہے، لیکن یاد رہے کہ یہ اُن کی  
فتح کا ثمرہ نہیں؛ — "پیرس" کے بعد ابھی "انجین پیرس" کو بھی تباہ کرنا  
ہے، قبل اس کے کہ اُن کی یہ ہم اتمام کو پہنچے؛ لیکن "پیرس" کی تباہی کے  
بعد "فرانس" موجود ہے؛ اور "فرانس" بھی آخری خطہء افعت نہیں؛ —  
آخری حصہ و خرتیہ و قلعہ جمہوریت خود روح انسان ہے؛

اور یہ "روح انسان" وہ شئی عجیب ہے جو ناقابلِ مس ہے توڑ  
کی طرح؛ اور بالائے دسترس ہے آفتاب کی طرح؛!! (یریدون لطیفون  
فوق اللہ بافواہمہم واللہ منہم فوسرہ ولو کسہ الکافرون  
— قرآن عظیم)

(۵)

## عالمِ جلا وطنی میں!

کوئی چیز جلا وطنی سے بڑھ کر زہرہ گداز نہیں؛ میں یہ نہیں کہتا کہ  
جلا وطنی کا یہ قاتل اثر جلا وطنی پر ہوتا ہے؛ نہیں، بلکہ اس کا نشانہ وہ دیو  
استبداد بھی ہوتا ہے جس کے فرمان سے وہ صاف و نافرمان ہو کر رہتا ہے۔  
ایک ایک دہنا پیکر ہوتا ہے، جو کسی دور دراز ساحلِ بحر پر سرنگوں خرواں  
نظر آتا ہے، یا صبح کے وقت اُٹھتا ہے تو اپنی زبان پر یہ کلمات جاری پاتا ہے  
سہ چیز است آنچہ پایا نے ندارد  
شبِ من، درِ من، افشا نہ من!

یا گو شہلے کو بہتان اور گنجائے اشجار میں خدا کو پکارتا ہے۔  
کس پر دے میں ہے آئینہ پرواز لے خدا؟  
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے؛

آہ کہ اُس کے بال کالے سے بھورے ہو جاتے ہیں، اور بھورے  
سے سفید؛ ماہ و سال، شب و روز، صبح و شام کس صبر آزما گراں گامی سے  
گزرتے ہیں، جہالت کو وطن اور گھر نہیں ملتا، اور قافلہ عمر منزلِ فناء  
دو چار ہونے لگتا ہے؛ آف؛ اُس کی قسمت کیسی سو بانِ روح ہوتی ہے؛  
— با اینہم اُس کی مصومی، و نا کردہ کن ہی اک مستقل چیلنج ہوتی ہے؛

اُس تاج پوش باطل کو ش" کے لئے، ط"۔ کمر کج و بیاباں تو داؤد مارا  
شہر سے یکرستہ تک مجھ پر بھی دوزخِ شعلہ جاری رہا، ط" آہ ماہ و سال  
ہائے، آئینے انگریزی "کے وہ جزائر کتنے بہشت سودا واقع  
ہوئے ہیں؛ — اور محبوبِ فرانس کے کتنے روکش جزیرہ جیوسی

شاید گرن تھی سے بھی زیادہ دل زبا ہے؛ اُس کا حسن ضرور آخر الذکر  
سے بڑھ کر ہے، اگرچہ وہ اتنا پُر شوکت نہ ہو؛ جیوسی کی ٹکڑی میں مینٹان  
اک چمنستان بن گیا ہے؛ سا سا جزیرہ اک ٹکڑہ سستہ نظر آتا ہے؛ جو شہر  
لندن کی قد و قامت کا ہو گا! — یہ گویا اک نگینہء لعین ہے جو بحر  
محیط کی انگشتی میں جڑ دیا گیا ہے؛

جلا وطن پر جلد اک خاص حقیقت کا انکشاف ہونے لگتا ہے؛  
— وہ یہ کہ اگرچہ وہ اک دور دست جگہ میں پھینک دیا گیا ہے، تاہم  
ظلم کی دست درازی نے اُس پر سے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی ہے؛  
اس دور افتادہ وطن کے لئے کتنے جال ہوتے ہیں، اور کیسے کیسے  
شاطرانہ؛ مثلاً اس عالمِ جلا وطنی میں اک "شہزادہ" تم سے ملنے کو آتا  
ہے، لیکن اگرچہ بلاشبہ وہ خاندانِ شاہی کا اک رکن ہے، تاہم  
وہ سرشتِ پولیس کا اک جاسوس "بھی ہے؛ اک ثقہ و متقلع پر فخر  
تمہارے ہاں چند روز قیام کرتا ہے، اور تم ایک دن یہ دیکھ کر حیران  
رہ جاتے ہو کہ اپنی "معلومات عامہ" میں اضافہ کرنے کے لئے وہ تمہارے  
کاغذات کا مطالعہ کر رہا ہے؛ تمہارے خلاف ہر بات مباح ہے؛  
اس لئے کہ تم "باغی" ہو؛ — امانِ قانون سے باہر؛ دائرہ حقوق  
انسانی سے خارج؛ ان کرانا کا تبین "میں سے بچنے ایسے آئیں گے،

جو کہ ہے باہمی گفتگو کو شان کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ اور پھر تہارے وہ الفاظ عقل کر رہ گئے، جن سے تہارے ہونٹ کبھی مس نہیں ہوئے، ہاں جلا جی میں کبھی کسی دوست یا عزیز کو کوئی خط نہ لکھنا! ہر مکتوب کے مکتوب الیہ بہ سرکاری کیمبرن خود بن جاتے ہیں! ان ذاتہ سے شریف سے ہوشیار رہنا جو جلا وطنی میں نہیں ولسو خط لکھا کرتے ہیں! یہی بزرگ پیرس میں تہا ہی جزیں کاٹ رہے ہیں!

نہ اک جذبہ امی کی طرح الگ تنگ کر دئے گئے ہو، لیکن ہر محنت لوگ تہارے گلے کا بار بنے ہوئے ہیں، ایک پراسرار اجنبی آتما ہے اور مہربانہ سرگوشی کرتا ہے! کہو تو بونا پارٹ کو قتل کر دوں؟! — یہ بونا پارٹ ہی بونا پارٹ کے قتل کی پیشکش کر رہا ہے!

ہر طلوع صبح اک نیا فتنہ لاتا ہے، اور ہر غروب آفتاب اک نئے غم پر پردہ ڈالتا ہے!

صرف ایک ہی عالم کی پہنائیاں جلا وطن پر کھلی ہوئی ہوتی ہیں! —

عمری وفد فیاہ ذکر و فکر کی دنیا! یہاں کم از کم وہ سحرِ غم کا ہم نشین ضرور ہوتا ہے — جو اسے وحیِ الفطرت، عمیقِ الفکر، اور غواہِ عکس بنانے کے لئے کافی ہے! وہ ابدی تصادم، انواعِ طوفان کا سوا حل سے، اور ان کی سرکوبی و پسپائی ان سوا حل پستہائے سنگِ خارہ سے، گویا پورشین ہوتی ہیں، باطل کو شاستہاد کی، اعلانِ واعلانے کلمہ حق پر، ظلم و کذب کا طغیان و ظلم مہیہ و نعل و آتش ہوتا ہے! کف و در وہاں دریا سے شور کہ اس رعب انداز شورِ آشوری سے کچھ سچی حاصل نہیں ہوتا، ماحولِ خار کا اس سے شکستہ و فرسودہ ہو جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ اس کی اور شستہ و شو ہو جاتی ہے، اور آفتاب مالتاب کی تجلی میں اور برق تاب ہو جاتا ہے!

جلا وطنی کا ایک فیضانِ نہایت عظیم ہوتا ہے! — اس حالت میں ایک انسانِ تفکر، تخیل اور شراذہ حیات سے تنہا بننے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے! یکہ و تنہا ہونا اور پھر بھی اس عالمِ بھو میں یہ محسوس کرنا کہ میں ساری بشریت کے ساتھ "من تو شدم تو من شدمی" کے مقام میں ہوں! شہرِ بدو ہونا اور اس کے علی الرغم ملکاتِ انسانیت کا "شہری" بن جانا، سارے مراکزِ مدن سے خارج البلد ہو جانا، اور اس کے باوجود اپنے بازوئے بہت پر

نظر ڈالنا اور اپنے ہی لئے قوتِ لامیوت بہم پہنچانا! یہ خواب دیکھنے کیلئے یکسو ہو جانا کہ خیرِ عدل کیا ہے، اور پھر اس منصوبے کے لئے فارغ ہو جانا کہ اس خواب کی عملی تعبیر کیونکر حاصل ہو! خلقِ اللہ کے مفاد کے معاملے میں محبتِ جلالی حق ہو جانا، لیکن اپنے ذاتی غم و کدوش پر ضبط کے معاملے میں کیسراک نفس کش راہب بن جانا! عرصہ صحر کے بسط کرنا یا د میں سانس لینا اور روئے پائیاں ہو جانا! اک عمیق غنہ و غضب کو اک عمیق تر طمانیت و سکینت سے نئو دینا! —

رہا نیدی مرا از سترِ سستی

چو پیوڑی پیاپے جام سے را!

چنانچہ جلا وطنی کے اس وحشتِ زار میں بھی میں اکثر اپنے سے کہا کرتا تھا

اگر تسلط یافتہ موجودہ ملکیت و دورِ استبداد کے

خلاف اک کامیاب جوانی انقلابِ جمہوریت ظہور میں آئے

اور بونا پارٹ اپنی جان لے کر بھاگے اور میرے گلہ احوال

پر اگر دستک دے تو واللہ کہ مجھے یہ نعرہ میزبانی بلند کرنا

چاہیئے کچھ

قدم نما و فرود آکر خانہ خانہ تست!

ہاں! —

کہیں کیا دل کی دستہ اپنی ہم، اللہ دہری و مست

اگر نہ آساں ہوں جسے اک خال سویدا ہوا

ہاں لاریب کہ اک مقہور و منظر و جلا وطن اک عاشقِ فطرتِ محبت

عالم بن جاتا ہے! وہ گلاب کے پھولوں پر آنکھیں سینکاتا ہے! چڑیوں کے

گھونسلوں کے آشیانہ امن کے نظارے سے آسودگی وانی پاتا ہے! تکیوں

کی پروازِ رنگ سے اک استہزائے روحِ جلاوطن کرتا ہے! وہ وحش و دیور کی

محفلی فطرت سے خلا پیدا کر لیتا ہے، اور جلوہ زارِ عالم کے پیچھے اک

دیدنی ہر و لوازش کو مٹاتا ہے! اس جولاں و مٹناں حقیقت پر اس کے

سینہ عرفان میں اک غیر متزلزل ایمان بالنعیب پیدا ہو جاتا ہے! نیتان

کے کچھ اس کی چیدہ خلوت نکالیں ہوتے ہیں! اس کے سالِ عمر میں اک مستقل

ماوِ اردو سیت رہا کرتا ہے! وہ گھانٹس کے ایک فرخِ زمردیں لیٹا ہوا

اک برگِ درخت پر معرفتِ گوشت و گھار کا اک ورقِ فقر و تلاوت کیا کرتا ہے!

ایک ایک شاخِ گل میں وہ گویا ایک ننھی سی "بہری" بھری ریاستِ جمہوری کی

اس لئے کہ پیرس اس کے ستونِ روشنی ہے! ع  
مباد میں مجھ یا یارب علم از با و پریشانی!

## (۴) جلا وطنی کے بعد

میری زندگی کے یہ ابوابِ ثلاثہ — "ما قبل جلا وطنی، دورانِ جلا وطنی، مابعد جلا وطنی" — اس قدر میری کارفرمائی نہیں جس قدر کہ "پہلے ثلاثہ" کی کارستانی ہے: اُسی نے میری حیاتِ ارضی کی توحید کو اس "تشلیثِ بالاکراہ" میں تبدیل کر دیا۔ اس میں اُس نے میری رُوح کے ارتقاء کے "سراشبِ سگانہ" — خام بدم، پختہ شدم، سوختم — کو پزیرا اور ملحوظ رکھا!

۵۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کو جب میں طویل سالوں کے بعد میرا دو بارہ سالہ اپنے وطنِ مالوت سے ہوا تو میں نے اس زمین کے آسمان کو اور بھی زیادہ تاریک و اُزادو پایا، جس کی تنویر و تعلیم کے لئے میں نے محسوس کیا کہ میرے "شعلہ فریاد" کی اک پیپے سے بھی بڑھ کر "برقی خالط" کی ضرورت ہے! آہ! وطنِ مقدس کو خیر باد کہنا کون کہنا ہے کہ شاق نہیں! لیکن اس حالتِ ناشدنی میں اُس کی طرف مُراجعت کرنا بڑا اصل شاق تر ہے! واللہ کہ اک فرانسیسی تازلیت جلا وطنی کا خیر مقدم کرے گا، بمقابلہ اس کے کہ فرانسیسی کو پریشانی کی ایزھی کے نیچے اس طرح پامال اور گھیل پائے! وہ سرزمینِ وطن میں اس عالم میں لوٹے کہ میٹرو اور اسٹرا سبرگ کے اغتہائے جگر اُس کے پہلو مجروح سے کاٹ لئے گئے ہوں۔

(دخواتم زمانے کہ ایں بُعرو س)

میفتہ بزر جوان "پردہ س"

مندانِ زارِ فرانس پر یہ باطلِ دوحش و برابری کی اک یویش تھی! لیکن اسی مصیبت کی جلو میں اک دوسری بدتر افتا و بھی تھی! — میرا بُشا ز الیہ!

لے پدیشیا یا پودسیا سے "پوس" جس طرح روسیہ سے "موس" — اصل شعر: ہر شہید ایرانی شاعر و انقلابی، آقا کرمانی، کا ہے جس کے دوسرے مصرعے میں "پروں کے بھلے روس ہے اُپدوسیا، جن دن وطن اور جن مسکبِ حریت کا خاص تر جان خط!"

دیکھتا ہے! وہ چڑیوں کو ان کے چھپوں سے ایسا بچانے لگتا ہے جیسا کہ ہم اپنے دوست آشنائوں کی شناخت ان کے لب و لہجے سے کر لیتے ہیں! وہ نادار بچوں کو برہنہ پا ساصلِ سحر کی کنارہ ریز گار میں کھینچ دیکھتا ہے، اور خود بھی، بس ریش و منش، ماد و فطرت کی آغوش میں چل جانا چاہتا ہے۔

یہ ہے وہ خطرناک انسان جس کے شردھنے کو پابِ تجربہ کرنے کے لئے حکومتیں اور سلطنتیں اپنی طاقتِ خدا داد کا سارا زور صرف کر دیتی ہیں! رحمتِ مآب حضرت علیا علیہ السلام نے خطرہ و کوریہ، فرانسیسی مہاجرین، انقلاب کو سرکارِ دولتِ مدارِ فرانس کے حوالے کر دینے کی پیشکش فرمائی ہیں! اور مہاجرین ان کی ان دو کمین گاہوں — تختِ انگلستان و فرانس — کے درمیان — "من ترا حاجی لگویم تو ما حاجی لگو" والا مہاجر پیش آتا ہے! ع  
مدارِ روزگارِ سفید پر دراما شاکن!

مگر یہ حسابِ دوستانِ درول کی داد و ستدِ عملاً مہور میں نہ آئی! برطانیہ کے شاہِ پرست پرلین نے تو اس پر عدائے آسنت و مرجا بند کی، لیکن قلبِ انگلستان — لندن — کی سپاک اس شرمناکی کی روادار نہ ہوئی! اس عظیم الشان شہر کے آسمان کے مکررِ سطح پر احتجاج کی بند گردِ شستانی دمی، اور اس مجوزہ ناشدنی حرکت پر مہر جو کر رہ گئی! بلوکیٹ، ملبوس بہ شرافت! — یہ ہے انگریزی قوم کی سیرت! الغرض اس نیک مرشت اور غیور قوم کو جلال آگیا! اور عالی جناب پامرٹن اور مینچسٹر لون پارٹ کے درمیان اس سے زیادہ بدایا و تحائف کا مبادلہ عمل میں نہ آیا کہ جلا وطنوں کا بس باہمی اخراج ہو گیا!

اپنی غیبت و جلا وطنی کی سب سے طویل شبِ دیوچر میں قمرِ پیرس ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں سے اوچل ہوا۔ جب کہ فرانس، بلکہ سارا یورپ، گہن میں آگیا، پیرس کا مطلعِ روشن بدستور میرے مشتاقِ لٹارے کے سامنے رہا! ع

گو میں ہارمیں سستہائے روزگار!

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

اس کی وجہ یہ ہے کہ پیرس ملکِ مستقبل کی سرحد ہے! — غیر معلوم عالمِ نو کا مشہودِ آستانہ! پیرس گل کے روز روشن کی شبِ آسنت ہے! سمزلی نڈر کو جانے والے جتنے مشافر ہیں ان کی نزول گاہِ اول پیرس ہے!



فرانس پر سحر ظلمات کا ایک طوفان! انیسویں صدی کے مطلع الاوار پر قرون  
تاریک کی رجوت ہنقری! شہنشاہِ فرانس کی معقودہی کے بعد پاپائے  
کی سبز قدی! برتن والی گردن زنی کے بعد روم والی گلوگیری! شمشیر کی قتالی  
کے بعد شب و سحر کا قفسِ نظر!۔۔۔ اس لئے کہ تمدن کے مہتاب کی قندیا  
کو، و آندھیاں بھجا سکتی ہیں۔۔۔ ایک فوجی حملہ، دوسرے استبدادِ دی  
کا ایک محاصرہ! اولیٰ الذکر مادیو فرانس کے لئے ایک خطرہ ہے، آخر الذکر  
مادیو مستقبل کا گلا گھونٹ دینے کی ایک دھمکی ہے!!

آخر میں ہیں جو ایک مہذب قوم کی قیمتی ترین متاع ہیں۔۔۔ اس کا  
وہی حصارِ ارمنی، اور اس کا اندرونی حرمِ ضمیر، حملہ آور عسکری پہلی چیز میں  
مداخلت کرتا ہے، اور سختیگ پادری، دوسری کی بے احترامی کرتا ہے! لیکن  
ابن کاروبار میں عسکری مارشل لا کی فرمانبرداری کرتا ہے، اور پادری  
اپنے بے روح کلماتِ دینی کی اس طرح آخر کار وہی بنیاں رہ جاتی  
ہیں، جن کی گردن پر سارا بارِ جرم واقع ہوتا ہے! ایک قیصرِ قاتل، دوسرا  
چیرا باطل! (استکبار اس آئی الاسلام میں مسکرا رہی ہے!)۔۔۔ (الفران)  
معارفِ ادبیاں و مذاہب میں کوئی ایسا نہیں جس کا حرم، رُوح  
انسانی کے لئے ایک محض بن گیا ہو! فرانس آج اسی گردش میں گرفتار ہے!  
ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہمارے زمانے کی تعلیم و تلقین کے مدرسے  
میں دوسندھائے درس واقع ہوئی ہیں، ایک کی انگشتِ قید میں مستقبل  
کی طرف اٹھی ہوئی ہے، دوسری کی انگلی ماضی کی طرف اک اشارہِ منکوس کر  
رہی ہے! تمدنِ انسانی کی تقدیر آج اپنی دونوں قوتوں کی کشمکش میں ملتی  
ہے! اول الذکر درستہ سپرس کہلاتا ہے، اور آخر الذکر کا نام "روم" ہے!  
یہ ہر دو مدارس یا معابد اپنا اپنا ایک ایک صحیفہ دینی رکھتے ہیں، پہلے کے صحیفے  
کا نام "اعلانِ حقوقِ انسان" ہے، دوسرے کا۔ پاپائی تو رہ چٹخیز خاں!!  
پہلا "ترقی" کو کہتا ہے، خوش آمدی! دوسرے کا پیام ہے: "کاش کہ باز گشتی"  
ان دو متضاد دلائل میں کلمہ حق دخل دیتا ہے، اور پہلی کو پروانہ راہداری  
بخشتا ہے!۔۔۔ لاریب کہ "ترقی و تقدم" خود خدا کے قدوس کا نقش  
قدم ہے!!

سپرس کے مجمع "اخوان الصفا" کے ارکان ہیں، سنٹین، ریبلائے،  
پاسکل، کارنیل، مولیر، ٹامسکیو، ویدرو، روسو، و آئیر میرابو، اور

ڈونٹن، روم کے جتنے میں داخل ہیں، پوپ، انوسینٹ سوم، پوپ پائس بیچ،  
اسکندر ششم، آرن ہشتم، آرتور، سبسنس، لینیز، گلائڈس، اور گلائڈس!  
لوگوں کو تعلیم دینا ان پر حکومت کرنے کا دوسرا نام ہے! مسند  
درس، ایوانِ حکومت کی ہم اقتدار ہے! پس ایک دفتر ہی تعلیم کے اجراء کے  
معنی! ایک دفتر ہی حکمرانی کے قیام کے ہیں! اس قصرِ حکومت کا سنگ بنیاد بچا  
ہوتا ہے، اور قد آخین استبداد و شخصیت!

روم کے پنجہ قبر میں ٹھہر چکے ہیں، اور سپرس اس کی گرفت  
کی دوسری زنجیریں سنے والے ہیں! ہم اک موت و حیات کے سر کے کے ٹائپ  
بن رہے ہیں! ہمارے خلاف صفت آ رہا ہے وہ قرنِ الشیطان والی قوت  
جس کا سر مشہ چاہ ماضی ہے!۔۔۔ تاریکی کی یہ ذرات ہیں، عفریتِ ملوکیت،  
عصبتِ فوجی بارک، دینی خائفاء، جن کی اخواتِ طریقت میں بزدلی،  
دیدہ دلیری، بھیمائی، خوفزدگی، شک گزیدگی!

ہمارا تنہا حلیف اس سر کے آما مقابے میں علم و نور ہے!  
پہی درجہ ہے کہ فتح ہماری ہوگی، ہمارا حربہ جنگ روشنی ہے، روشنی،  
زنجیرِ غلامی کے آہن کو تحلیل کر ڈالے گی! لیکن حقیقی مصالحِ آزادی، ذمہ داری،  
کی اک "پازیب" اپنے ساتھ لاتی ہے! آزادی سے بڑھ کر کوئی چیز سنگین  
و نازک نہیں! دارستہ مزاج تربیت کے دوش پر سہی بڑے بڑے بار واقع  
ہوئے ہیں! وہ انسانی جسم کے اعتبار و جوارح سے چٹنہ بند کاٹتی ہے انہی  
ہی قیدیں انسانی ضمیر پر عاید کر دیتی ہے! ہم محرمیروں کی حق تلفیوں کو ختم  
کرنے حقوق حاصل کرتے ہیں، لیکن دوسرے ہی قدم پر ہمارے یہ حقوق ہماری  
"ذمہ داریاں" بن جاتے ہیں! غ

خود بخود آزاد ہو دی، خود گرفتار آمدی!

پس ہم کو بڑے احتسابِ نفس کی ضرورت ہے! ہم ماضی کے معصوم ہیں،  
اور مستقبل کے امین! اس لئے میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم شہرِ مہیار  
غوغا کو اک خوش عنان فریبِ مراعات میں تبدیل کر دیں! انسانی تہذیب  
کی شاہ گام رفتار ایسی ہی ہونی چاہئے! ترقی کے معنی ہیں اک خاموش انقلاب  
کی سبک دوی!

پس اسے واضعانِ قوانین اور اسے شہریانِ ریاست! آؤ! اک  
سینہ بے کینہ پیدا کریں! آؤ! سارے زخموں کو مندمل کریں! ہر آتشِ مذہب



آؤ اپنے انسانی جمال و جلال کی ایک ایک رگ کو جنٹیل میں لے آئیں!!  
 آؤ، قوموں کے مشعل جذبات پر صلح و آسختی کا مہم تہرہ رکھیں!  
 آؤ، قلوب انسانی کو اخوت کے پیام کی زلف گرہ گیر کا اسیر کر لیں۔  
 آؤ، اس حقیقت کو اپنے آفتاب قلب کے کسی ادھیل نہ ہونے دیں کہ  
 ہم اک عظیم ماضی اور اک عظیم مستقبل کے مابین اک ہرزخ واقع ہوئے ہیں،  
 پہلی چیز انقلابِ فرانس ہے، دوسری چیز انقلابِ یورپ!

کو سنبھالیں!، باہمی نفرت و عناد پر غالب آکر ہی ہم جنگ کو پاؤں بھر کر سکتے ہیں!  
 آؤ ہر ممکن مادے کو ہر ممکن پیش بندی سے روکیں! مستقبل کے غیر مشہود عالم  
 میں ہمارا داخلہ ان کردہات کے بغیر ہی کچھ کم دکھلا رہیں ہے! میں ان لوگوں  
 میں ہوں جو غیر معلوم مستقبل پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں! لیکن اس شرطانگیر  
 کے ساتھ کہ ہم اس دورِ زریں کے مہمانِ عزیز کے لئے زیادہ سے زیادہ  
 اپنے صحنِ دل کی زلفت و ردوبد کریں!

## کب آئے گا؟

وعدہ خلافتِ وعدہ فردا کب آئے گا؟  
 وہ منتہائے ذوقِ متن کب آئے گا؟  
 جانِ ادا و نازِ سراپا کب آئے گا؟  
 وہ جس کے پاس بیٹھنا فر دوس ہے مجھے  
 دل ہے بھجا بھجاسا، تنہا ادا، ادا اس  
 کب تک رہے گا سلسلہ اشکِ متصل  
 ہنس ہنس کے لوگ دیکھیں گے کتنی مری طرف  
 آتا ہے جس سے دل میں زمانہ بہار کا  
 کاندے پہ زلفِ ناز کی موصیں لئے ہوئے  
 وہ جس کا ہر نشانِ قدم صد بہارِ خلد  
 اس میری جانکھی کی قسم ہے تجھے صبا

یارب وہ میرا بھولنے والا کب آئے گا؟  
 فردوسِ دل بہشتِ نظارہ کب آئے گا؟  
 میری طرف نہ دیکھنے والا کب آئے گا؟  
 وہ مجھ سے دور بیٹھنے والا کب آئے گا؟  
 وہ جانِ دل، وہ جانِ تن کب آئے گا؟  
 ان آنسوؤں کا پونچھنے والا کب آئے گا؟  
 وہ مسکرا کے دیکھنے والا کب آئے گا؟  
 یارب بہار کا وہ زمانہ کب آئے گا؟  
 وہ سر و گلستانِ متن کب آئے گا؟  
 وہ پیکرِ بہارِ سراپا کب آئے گا؟  
 اُس جانِ انتظار سے کہنا کب آئے گا؟

بہل، پھر آئے گا وہ عزور آئے گا، مگر!  
 اب اُس کو یاد وعدہ فردا کب آئے گا؟

# افواہیں!

مصلح الدین احمد آسیر

بیوی، لیکن تمہارا مہتمم تو شادی شدہ ہے؟  
بورسل، تو اس سے کیا ہوتا ہے۔۔۔ مگر پیاری ڈارس یہ  
ایک دفتری راز ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔  
(دو لڑاں اندر چلے جاتے ہیں)  
(۲)

(مسٹر ڈارس بورسل، اپنے بالا خانہ پر کھڑی ہوئی اپنی پڑوسن  
مسٹر اسنیٹ سے باتیں کر رہی ہیں)  
ڈارس، کیا تم میرے شوہر کے مہتمم مسٹر سینن سے واقف ہو؟  
اسنیٹ، ہاں، کیوں کیا بات ہے؟  
ڈارس، دراصل مجھے تم سے یہ بات نہ کہنی چاہیے مگر مجھے تیرا اعتبار  
ہے کہ تم اس کو راز رکھو گی،

اسنیٹ، (اشتیاق سے) ہاں، ہاں قطعی، کیا معاملہ ہے؟  
ڈارس، وہ غسوب ہو گیا ہے، وہ لڑکی اس کی محرومیت پر غور کر رہی ہے۔  
اسنیٹ، تم ایسا مت کہو، وہ تو شادی شدہ ہے،  
ڈارس، تو اس سے کیا ہوتا ہے، مگر وہ کیوں قطعی اس کو راز رکھنا،  
اسنیٹ، ہاں ہاں عزیز من قطعی۔  
(۳)

(مسٹر اسنیٹ، مسٹر ہارلووس اسٹن بیک سے راستہ میں ملتی ہے)

(مسٹر ہیرم اینڈ اسکیرم کے مینیجر مسٹر تقاس بورسل اپنے دفتر  
سے ذرا دیر سے گھر پہنچتے ہیں، اُن کی بیوی اُن کی دیررسی پر باز پرس  
کرتی ہے وہ اس کے جواب میں مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں)  
بیوی۔ پیارے! آج تم غیر معمولی تاخیر سے آئے؟  
بورسل۔ ہاں پیاری،

بیوی۔ کیوں؟  
بورسل۔ کوئی خاص بات نہیں، دفتری میں دیر لگ گئی،  
بیوی۔ (ذرا جھجھلاہٹ سے) آخر اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟  
بورسل۔ (دردا بے صبری سے) چونکہ آج مہتمم کو ایک نوخیز لڑکی  
سے ملاقات کرنا سنی، اس لئے میں بھی بیٹھا رہا۔  
بیوی، نوخیز لڑکی؟

بورسل، ہاں، وہ اس کے ہمراہ دیر تک رہی اور میں مہتمم سے  
پیشتر کسی صورت دفتر سے اٹھ ہی نہ سکا۔

بیوی، (اپنے ہونٹ پھلا کر) میرا خیال تھا کہ تمہارا دفتر ایک  
ہنڈ ادارہ ہے، آخر وہاں مہتمم کو ایک لڑکی سے کیا تعلق؟  
بورسل، مجھے کچھ خبر نہیں، غالباً وہ اس کو رکھنا چاہتا ہے،  
کیونکہ ہمارے محرومیت کے متعلق کچھ شکایتیں پہنچتی ہیں، لیکن میں ٹھیک  
طور پر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا،

براؤ کا سٹ، تو یہ کہو کہ تم بھی اس راز سے واقف ہو، مسٹر بولرل،  
اور ڈنیر سی اسٹپٹ، سے مجھے بھی معلوم ہوا تھا، مگر خبر نہیں کہ طلاق کی کارروائی  
کامیاب ہوئی؟  
اسٹف بیک، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تم کل قصہ سے واقف نہیں ہو،  
مجھے تو اندرونی حالات بھی معلوم ہوئے ہیں کہ طلاق منظور ہو چکی ہے،  
براؤ کا سٹ، اس قدر جلدی؟ افسوس غریب آئیوی، اب کیا کرے گی۔  
اسٹف بیک، یقیناً اس کی بسر اوقات کے لئے کچھ گزارہ مقرر  
کر دیا جائے گا۔

(مس اسٹف بیک رخصت ہوتی ہے)

(۵)

(زنانہ دار التفریح میں چند خواتین آپس میں گفتگو کر رہی ہیں، مسٹر  
آئیوی بیٹن کے آتے ہی سب کی سب بیک دفعہ خاموش ہو جاتی ہیں، وہ سب کو  
سلام کرتی ہے اور کسی پر بیٹھ جاتی ہے)  
ایک خاتون (دوسری خاتون کی جانب آنکھ مارتے ہوئے) آہ مسٹر  
بیٹن، کہو تم یہاں سے کب رخصت ہو رہی ہو؟ ہم لوگ ابھی تہا رہی ہی  
مشکلات کا ذکر کر رہے تھے،  
بیٹن، میرے مشکلات کیسے؟ میں تو ان دنوں کہیں باہر نہیں جا رہی ہوں،  
دوسری خاتون، ہاں، مگر ہم لوگوں نے خیال کیا کہ اب تم بچا رہی ہو۔  
اپنے باپ کے پاس شیفیلڈ ہی چلی جاؤ گی۔  
بیٹن، کیوں خیریت ہے؟ میں شیفیلڈ کیوں جانے لگی، میں تو یہاں  
خدا کے فضل سے بہت مزے میں ہوں۔

تیسری خاتون، بہت مزے میں، اس واقعے کے بعد بھی؟ جو ابھی  
ابھی ہم لوگوں نے سنا ہے،  
بیٹن، کیا تم لوگوں نے سنا ہے آخر کچھ میں بھی تو سنوں؟  
پہلی خاتون، یہی تہا رہی تکالیف کے متعلق۔ افسوس عزیز آئیوی،  
ہم لوگ سب تہا رہے غم میں شریک ہیں،  
بیٹن، میری سمجھ میں تو مطلقاً نہ آیا کہ تم کیا پسندیاں بھجوا رہی ہو،  
چوتھی خاتون، ہم لوگوں کو معاف کرو۔ ہم لوگوں نے سنا ہے کہ تہا رہے  
شوہر نے تم کو طلاق دیدی ہے اور انھوں نے اپنی محرابی خاتون کے ساتھ

اسٹپٹ، عزیز و مہاجر،  
باؤلر، اسٹف بیک، صبح بخیر مسٹر اسٹپٹ،  
اسٹپٹ تم لوگوں سے آج بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی،  
باؤلر، تم بھی تو عید کا چاند ہو گئی۔۔۔ کوئی تازہ خبر؟  
اسٹپٹ، کوئی خاص بات نہیں عورت۔۔۔ لیکن مجھے تم سے نہیں  
کہنا چاہیے، کیونکہ مجھے تم سے نہیں کہا جاتا ہے، کیونکہ میں نے اس راز رکھنے کا  
وعدہ کیا ہے۔

اسٹف بیک، اشد، اشد، مسٹر اسٹپٹ،

باؤلر، آخر وہ کیا ایسا عجیب راز ہے؟

اسٹپٹ، نہیں کوئی عجیب راز تو نہیں ہے، میں سمجھتی ہوں کہ اس معاملہ  
میں مجھے تم پر اعتبار کرنا چاہیے، آہ آئیوی بیٹن،

باؤلر، عزیز سن، کیوں وہ کس حال میں ہے؟

اسٹپٹ، مسٹر بیٹن، اس کے شوہر نے ایک خاتون رکھ لی ہے، اس کا  
ارادہ ہے کہ آئیوی کو طلاق دے کر اسی کے ساتھ شادی کر لے، فی الحال تو وہ  
اس کی محرابی حیثیت کا کام کرتی ہے۔۔۔ نہیں، کھو اس کو قطعی کئی نہ کہنا۔

باؤلر، اسٹف بیک، ایک دم، آہ دنیا کا بھی عجیب رنگ ہے،

اسٹپٹ، دیکھو کسی سے کہنا نہیں کہ یہ بات تم کو مجھ سے معلوم ہوئی۔

باؤلر، ہیں۔

اسٹف بیک، قطعی نہیں۔

(وہ دونوں مختلف شاہراہوں پر روانہ ہو جاتی ہیں)

(۶)

(مس اسٹف بیک، مسٹر براؤ کا سٹ سے ملتی ہے، دونوں آواز لڑکے  
کے یہاں پہنچے ہیں، کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مس اسٹف معنی خیر بنی  
بنستی ہے)

براؤ کا سٹ، عزیزم پر بے وجہ نہیں کسی؟

اسٹف بیک، نہیں کچھ نہیں، مجھے صرف دنیا پر ہنسی آتی ہے۔

براؤ کا سٹ، کیا دینے نہیں بھی کوئی چرکا دیا؟

اسٹف بیک، مجھے؟ نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ مر و کس قدر مکاریا کرتے

ہیں، مجھے تو غریب آئیوی کے حال پر ترس آتا ہے۔

عقد کر لیا ہے،

تیسری خاتون، ہم لوگوں کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ یہ خبر صحیح

نہیں ہے۔

بٹین، (دانت پسکر) تم لوگ سب اوندھی عقل کی ہو، طلاق بھی کیا کوئی کھیل ہے، میرے شوہر کی پیشی میں کوئی خاتون نہیں ہے، تم سبوں کی ملی ہوگت ہے،

(اور غصہ میں اُٹھ کر چل دیتی ہے)

(۴)

اسٹریٹن جب دفتر سے گھر واپس آتے ہیں تو دروازہ پر بوی کو معمولی استقبال کرتے ہوئے نہ پا کر غلبت کے ساتھ بالا خانے پر جاتے ہیں جہاں ان کو بوی اپنے آرام کمرے میں روتی ہوئی ملتی ہے،

بٹین، پیاری تم کو کیا تکلیف ہے؟

بوی، ہٹ سکار،

بٹین، (پریشان ہو کر) آئیں میں نے کیا کیا؟

بوی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، اور جو کچھ اُسے دارالتفریح میں پیش آیا تھا سب رو رو کر اپنے شوہر کو سناتی ہے)

بٹین، (جھنجھلا کر) لہو، دارالتفریح کی وہ مرداریں یقیناً ذبح کر دینے کے قابل ہیں، اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ کیونکر یہ قصہ بنا گیا ہے، سر دفتر نے مس ڈاکٹ کو ہماری شاخ میں نئی آگہی کے قیام کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تھا، کل وہ کلکتے رخصت ہو رہی تھیں، میں اُن کو اُن کے ہوٹل تک پہنچانے کے لئے بینک گیا تھا، افوہ! کس قدر غلط افواہیں اڑا دی جاتی ہیں،

(اسٹریٹن آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کر اپنے شوہر کے ساتھ اُن کے دارالطعام میں جاتی ہیں، جہاں نئی آگہی سے متعلق وہ کل پوشیدہ خط و کتابت دیکھ کر اپنا اطمینان کرتی ہیں)

بوی، اسے میری پیارے کس خوفناک دنیا میں ہم نے جہنم لیا ہے،

اسٹریٹن، بینک کچھ عجیب دنیا ہے، تم کو چاہیے کہ جو کچھ سنو اُس پر مطلق اعتبار نہ کرو، اور جو کچھ دیکھو اُس سے ادھما ہی تسلیم کرو۔

## تجاربہ عارفانہ

کیوں صبح یوں عرق میں نہلے ہوئے ہو تم  
شاید کسی غلش کے جگائے ہوئے ہو تم  
الہجا ہوا ہے کرب سے ہر رشتہ نفس  
گو دیکھنے میں زلف بنائے ہوئے ہو تم  
جن مشغلوں سے کھیلتی رہتی تھی کم سنی  
میں مشغلوں سے ہاتھ اٹھائے ہوئے ہو تم  
شاید یہ اتہام ہوا خفائے راز کا  
ہجو لیوں سے آنکھ چرائے ہوئے ہو تم  
خود کو لے ہوئے ہو مگر کہہ رہے ہیں طور  
سینے میں ایک حشر مچپائے ہوئے ہو تم

کیا جوشِ نامراد کو دیکھا ہے خواب میں

یوں صبح کو جو شام بنائے ہوئے ہو تم

# بلاکشی ایک خلوت پسندانہ

## وکٹھ میوگو

تھا، گلیٹ اور زیادہ قریب ہو گیا، اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی سو رہا ہے، وہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک پادری محلوں ہوتا تھا، جس کو گلیٹ نے اسے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا، گلیٹ چٹان کے واسطے اس کے ارد گرد جھک لگتا ہوا چوٹی کے اس قدر قریب پہنچ گیا کہ وہ اپنی کشتی پر کھڑا ہو کر اس مصروف خواب انسان کے پاؤں کو چھو سکتا تھا، چنانچہ وہ اُس کو جگانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ آدمی اٹھا اُس نے آہستہ سے کہا میں جستجو میں تھا، گلیٹ نے اسے اپنی کشتی میں کو دھڑنے کا اشارہ کیا، جب وہ اس انسان کو جو کسی قدر انسانی بناوٹ کا جسم اور شغاف آنکھیں رکھتا تھا، ساحل پر اتار چکا تو گلیٹ نے دیکھا کہ وہ نہایت گور سے ہاتھ سے ایک سادہ پیش کر رہا ہے، گلیٹ نے نرمی کے ساتھ اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا ایک لمحہ کے سکوت کے بعد وہ نوجوان سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

گلیٹ اس اجنبی شخص کو بالکل بھول چکا تھا کہ کسی آواز نے اس کا خیر مقدم کیا، یہ اسی کے گاؤں کا ایک باشندہ تھا، جو جلدی جلدی اُس کی طرف آ رہا تھا،

گلیٹ! پرویز پر ایک ہنگامہ ہو رہا ہے: اُس نے ہانپتے ہوئے کہا،

گلیٹ گرتیز کا ایک باشندہ تھا، جس سے اُس کی خلوت پسندی اور فطرت پرستی کے باعث جسے بالعموم شیطان فی چیز سمجھا جاتا ہے، لوگ محترم رہا کرتے تھے، ایک دن یہ پھلی کے شکار سے واپس آ رہا تھا۔ سمندر کی موجوں چڑھ رہی تھیں کہ یکایک اسے سامنے سمندر میں ایک چٹان پر کسی انسانی سامنے کا دھوکہ ہوا۔

گلیٹ اس منظر کو گھسی سے دیکھنے لگا، ایسی جگہ اسے نہایت مزعوب تھی، پہاڑ کی بلند چٹانوں کے درمیان قدرت کی تراشی ہوئی ایک ایسی نشستگاہ جہاں سمندر کے دلکش مناظر بلا روک عدد و نظریں آسکیں، یہ ایسی جگہ تھی جہاں ایک قید منزل سے آزاد مسافر ساحل سے ہوتا ہوا اُسترا کے ساتھ منظر کے کھلے ہوئے درختوں میں بیٹھ جائے اور محویت کے عالم بن میں سمندر کی چڑھتی ہوئی موجوں کے خطرہ کو بھی بھول جائے، یہاں تک کہ سلامتی کا دروازہ اس پر بند ہو جائے، اس خاموش شیطان کی کرسی سے چھٹکار کی رسانی کسی انسانی کان تک ناممکن تھی۔

گلیٹ اپنی کشتی اس چٹان کے قریب لے گیا، اس نے دیکھا کہ چٹان پر یہ سایہ واقعی ایک انسان کا تھا،

اب سمندر کافی چڑھاؤ پر تھا، چٹان کے چاروں طرف پانی ہی پانی

”کیا معاملہ ہے؟“

میں جلدی میں بیان نہیں کر سکتا۔ جلدی واپس جاؤ، ہمیں سب علم ہو جائے گا۔

پرویز لیتھری کے مکان کا نام تھا، جس نے گرنیز اور مارنڈی کے سواصل کے درمیان پہلی دفعہ سٹیم کے جہاز کا سلسلہ جاری کر کے اپنی مالی حالت کو مستحکم بنا لیا تھا، اُس نے اپنے جہاز کا نام لاڈیورینڈ رکھا تھا۔ وہیات کے باشندوں کا جو اس سبب شے کو شیطانی ایجاد تصور کرتے تھے، یہ جہاز شیطانی کشتی کے نام سے مشہور تھا، لیکن ڈیورینڈ ان دونوں بندرگاہوں کے درمیان بلا خوف و خطر آتا جاتا رہا، جس سے لیتھری کی امارت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ اُسے تمام دنیا میں اس جہاز سے زیادہ کوئی شے عزیز نہ تھی، البتہ اس کے بعد وہ اپنی بہانچی ڈراوچٹ کو عزیز رکھتا تھا جو اُس کے گھر کی سنگم تھی،

ایک دن گلیٹ برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر ٹہل رہا تھا، ڈراوچٹ وہ سری چٹان پر ان کے سر کی بلندی پر بھی، وہ ایک لمحہ کے لئے رک گئی اس نے عجیب کر اپنی انگلی سے برف پر کچھ لکھا اور پل گئی، جب یہ ماہی گیر وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس غصی سی شوخ جان نے اسی کا نام لکھا تھا، اس لمحہ کے بعد گلیٹ اپنی زندگی کی گہری غلطیوں میں ہمیشہ ڈراوچٹ کے خیال میں محو رہنے لگا۔

اب پرویز پر ہنگامے کی خبر سننے ہی اس غلوت پسند انسان نے لیتھری کے مکان کا رخ کیا جو ڈراوچٹ کا آشیانہ تھا، ہنگامے کی تشریح بہت جلد کر دی گئی، ڈیورینڈ و مندر کے بادلوں میں خوفناک چٹانوں کے ساتھ ٹکرا کر تباہ ہو گیا تھا، البتہ اس کا انجن ابھی تک شگستگی سے محفوظ تھا، اب اگرچہ تمام جہاز کو بچا لینا تو ناممکن تھا، لیکن انجن کو بچا لینا ممکن ہو سکتا تھا، یہ انجن بے نظیر تھا، اسی تم کا دوسرا تیار کرنا روپیہ کا دریا بہانا تھا، اور پھر اُس کے معیار کی تلاش اس سے بھی دیا دہ شکل تھی، اس کا معیار مچکا تھا، اور مشینری دو ہزار پونڈ کی لاگت سے تیار ہوئی تھی، اب اگر کوئی ناقابل عمل اور غلوت جہم خیال دماغ میں آسکتا تھا تو وہ انجن کو بچانے کا تھا، جو اس وقت ڈوریز کی چٹانوں میں پھنسا ہوا پڑا تھا، ان چٹانوں پر کسی علاج کو کام کرنے کے خیال سے

بھینا فضول تھا، یہ بھری طوفانوں کا موسم تھا، ملاوہ اڑیں سمندر کے درمیان چٹان کی بلند ترین چوٹی پر شکل ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی، لہذا جہاز کو بچانے کے لئے صرف ایک آدمی ڈوریز پر جاسکتا تھا، جہاں وہ سمندر کے درمیان ساحل سے پانچ میل کے فاصلے پر پھنسیں تیار کر کام کرے، بالکل تھا، اس ہیبت ناک خطہ میں ہر طرح کے خطروں کے مقابلہ کے لئے، بھوکا اور عربائی کی سمورت میں ہائل ناچار، جہاں اس کا موت کے سوا دوسرا کوئی ساتھی نہ ہو۔

ایک علاج نے ابستادہ ہو کر فیصلہ سنایا،

”نہیں اب کام تمام ہو چکا ہے، اس وقت وہ آدمی زندہ نہیں ہے۔“

جو وہاں جا کر ڈیورینڈ کے انجن کو بچا سکے؟

”اگر میں نہیں جاتا“ ڈیورینڈ کے انجنیئر نے کہا ”تو اس کی وجہ صرف

یہ ہے کہ اب یہ کام انسانی طاقت سے باہر ہے،

”اگر ایسا شخص زندہ ہو۔۔۔“ علاج نے اپنی تقریر کو پھر جاری کیا،

ڈراوچٹ نے فوراً اس طرف رخ کر کے علاج کی بات کو کاٹ دیا،

”تو میں اس سے شادی کروں، اس نے معصومانہ انداز سے کہا پھر ایک سکوت

طاری ہو گیا، ایک آدمی مجھ کو چیرتا ہوا اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا، لیکن زرد اور

اور متغیر تم اس سے شادی لوگی ڈراوچٹ؟“

اس نے شوق سے پوچھا، یہ گلیٹ تھا، سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی

تھیں، لیتھری نے بھی اُسے دیکھا، اس کی آنکھیں محبت سے چمک رہی تھیں، اس نے

اپنی جبری ٹوپی کو اتار کر فرش پر رکھ دیا، پھر استدلال کے ساتھ سامنے دیکھا

اور مجھ کا خیال نہ کرتے ہوئے کہنے لگا، ”تو ڈراوچٹ اس کی ہوگی؟“

”میں اس کام کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔“

چٹانوں کی دو عمودی دیواروں میں تباہ شدہ جہاز کا باقی حصہ

دروازے کی ڈاٹ کے مانند سختی سے پھنسا ہوا تھا، اس کا وحشت انگیز

شغاف آسمان کے نیچے بالکل صاف نظر آ رہا تھا، جب گلیٹ اپنی وحشی

اُستی میں وہاں پہنچا۔

یہ چٹانیں اپنے شکار کو دبوچے ہوئے نہایت ہیبت ناک نظر آتی

تھیں، ان کی وضع میں ایک دھمکی کا انداز تھا، وہ اپنے وقت کی ٹکران نظر

یہ بھری امواج کی وحشمانہ دل لگی کے لئے ایک کھلونہ بنا ہوا تھا، اب کوئی صورت نہ تھی، شیرازی کا بلاک جو بیک وقت وزنی اور نازک بھی تھا اپنے برجھ سے دو چٹانوں کے درمیان پھنس چکا تھا، اور اسے اس عالم سکوت سے نکال کر ساحل تک لے جانے کا خیال بھی دیرانگی معلوم ہوتا تھا، گلیٹ نے اپنے بدن کا جائزہ لیا۔

جب وہ اپنے بیٹے کی جگہ بنا چکا تھا اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی خوراک کی لڑکری کو چکا ہے، اس کے پاؤں تیسے زمین نکل گئی، ڈیورینڈ کے انجن کو چٹانوں سے نکالنے کے لئے جن میں وہ تین چوتھائی سے زیادہ دھنس چکا تھا، ایک پورے لشکر کی ضرورت تھی اور گلیٹ بالکل تنہا تھا، یہاں بڑھی کے پورے ہتھیار اور انجینئر کے پورے اوزار درکار تھے، لیکن گلیٹ کے پاس صرف آری جمبی، کھنڈی، ایک تھوڑا سا تھا، اس کو ایک پورے درکشپ کی ضرورت تھی، لیکن وہاں سائے کے لئے چھت بھی نہ تھی، اس خشک چٹان پر خوراک بھی ضروری تھی، لیکن اس کے پاس کوئی روٹی تک نہ تھی۔

پہلا ہفتہ اس نے شکستہ جہاز کے کارآمد منتر ٹکڑوں کو فراہم کرنے میں گزارا، وہ ہر ایک چٹان پر پھرا اور ہر وہ چیز سمندر کی موجوں نے چٹانوں پر پھینکی تھی اکٹھا کر لیا، گھلے ہوئے کپڑوں کی دھجیاں، لوہے کے ٹکڑے، چولوں کے پڑے، منتشر تختے، ٹوٹی ہوئی سلاخیں، کہیں سے زخمی کہیں سے چرخی، الغرض جو کچھ ملا اکٹھا کرتا رہا، اس نے سیپوں کے کپڑوں اور پانی پر گزارا کیا، وہ جنگھاڑتے ہوئے بھری شیروں اور اڑتے ہوئے اڑدہوں کے زخموں میں گھرا ہوا تھا، شوریدہ موجوں کی آواز اس کے کانوں سے کبھی جدا نہیں ہوئی، وہ دن کو دھوپ کی بھٹی میں ٹھنکتا اور شب کو لہری سمندر کی سچ کر دینے والی سردی سے شبنم ہو جاتا، اور ہر وقت بھونکا پیاسا رہتا تھا۔

ایک دن چٹان کے گوشوں میں پھرتا ہوا گلیٹ، ایک نارین بیٹہ گیا جو بھری پھولوں سے لدی ہوئی سمندر کی دیوی کی خلوت گاہ معلوم ہوا تھی، یہاں سپیاں جو اس کی طرح چمک رہی تھیں۔ پانی میں چاند کی روشنی مریض تھی، اکثر پھول بزرگ کی مانند تھے، ایک عمیق گرہے کے کنارے کھڑے ہوئے شفاف پانی میں گلیٹ نے اچانک ایک طلسمی چیز کو برائے ہوئے

آتی تھیں، اس سے زیادہ غور اور تکرر کے منظر کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا، شکست خوردہ جہاز، فخر مند عقیقہ بھج — گزشتہ روز کے طوفان کے باعث دو ٹان چٹانوں سے دھارے اس طرح ابل رہے تھے، جیسے دو پہلو ٹانوں کے جسم سے پسینہ بہ رہا ہو جو ابھی ابھی پیکار سے فارغ ہوئے ہوں۔ ماسٹ انصیل پانی سے باہر نکلے ہوئے دو شیطانی بازو تصور کرتا تھا، جو سمندر کے طوفانوں کو تباہ شدہ جہاز کا مشاہدہ کر رہے ہوں، اگر گلیٹ کو جہاز کی تباہی کی وجہ معلوم ہوتی تو وہ اس مبتلاک منظر سے اور بھی زیادہ متاثر ہوتا، تباہی کی وجہ ایک حادثہ کے باوجود دارادہ پر مبنی تھی۔

کھین یعنی اس جہاز کے عیار کپٹن نے جہاز سے روپہ اڑا لیا۔ اب اس کی پیٹی میں تین ہزار پونڈ تھے، اس کا ارادہ تھا کہ وہ ساحل سے ایک میل کے فاصلہ پر جہاز ہینوینر میں ڈال کر غرق کر دے اور جب مسافر کشتیوں کے ذریعے ساحل پر پہنچے جائیں تو یہ جہاز کے ساتھ ہی ڈوبنے کا ارادہ ظاہر کر کے کچھ دیر ڈیورینڈ میں توقف کرے اور بعد میں تیر کر ساحل پر پہنچ جائے، جہاں سے کشتی لے کر مشرق کی جانب فرار ہو جائے، اس کے مختصر ڈرامہ کے عمل کی تکمیل ہو چکی تھی، ہر ایک کپٹن کھین کے اشارے کی تعریف کرتا ہوا چلا گیا — جب ڈھنکاکا صاف ہو گیا تو کھین کے خوف کی انتہا نہ رہی، اس نے دیکھا کہ وہ ہینوینر کی بجائے ڈاورینر پر تھا، جہاں سے ساحل ایک میل نہیں بلکہ پورے پانچ میل تھا۔

کھین نے دوسرے ایک جہاز کو دیکھا، اس نے تیر کر دوسری چٹان پر پہنچنے کا ارادہ کیا، جہاں سے وہ جہاز والوں کو نظر آ سکے، اس نے اپنے چمڑے کی پیٹی کے سوا تمام کپڑے اتار کر عرشہ جہاز پر رکھ دیے اور سر کے بل سمندر میں کود پڑا، چونکہ وہ بلندی سے گر تھا وہ پانی کی تہ تک پہنچ گیا، اس نے سمندر کی تہ کو محسوس کیا، ایک لمحہ کے لئے وہ زیر آب چٹانوں کے گرد پھرا، پھر دوبارہ سطح آب پر آ گیا، اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کا ایک پاؤں کسی چیز کے پتے میں ہے،

لیکن جب گلیٹ ڈوریز پر پہنچا تو وہ اس حقیقت سے مطلق آگاہ نہ تھا، وہ تباہ شدہ جہاز کے منظر کو دیکھ کر حیرت میں تھا، اس نے دیکھا کہ ڈیورینڈ کی شیرازی بالکل محفوظ تھی، جس کو سمندر نے آہستہ آہستہ مہدم کرنے کے لئے بچا لیا تھا، جس طرح ایک بلی اپنے شکار سے کہتی ہے

دیکھا، ایک گول گول شے جھومتی ہوئی موجوں میں حرکت کر رہی تھی، یہ تیرتی نہیں تھی، بلکہ پھیلاؤنگ رہی تھی، اس وقت یہ ایک مقصد کے ساتھ ایک طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی، اس کی مشابہت ایک ٹھلوٹے کو مانند تھی جس کی لڑکھارہ لٹکتی ہوئی شاخیں موجوں میں دوبارہ ہو رہی تھیں، یہ کیڑے اس طرح بڑھتی ہوئی نظر آتی تھی، جس پر پانی کا معلق اثر نہ ہو سکے وہ غائب ہونا کہ تریں پہلو تماش کر رہی تھی، یہاں وہ بالآخر غائب ہو گئی۔

گلیٹ اپنے کام پر واپس آگیا۔ لیکن اس کے دل میں یہ سبب ناک منظر ہر وقت تازہ رہتا۔ انتہائی بے ہوشی کے بعد مشین کی آہستہ میں اتارنے کے لئے تیار ہوئی۔ گلیٹ نے ایک کنڈا تیار کیا، اس کی مدد سے مشین کو پانی سے ہل چکی تھی، اب دوسرے روز وہ کنڈا کو ڈال جانے والا تھا، لیکن نہیں اس نے انتظار کیا، کہ وہیں کشتی کو آدیاں آج کے قریب تریں سے آئیں، وہ بھیڑ کی کھال اور دھڑکے۔

جب وہ اٹھا تو طوفان کی آمد آتی تھی، اب اس کھانے کو چڑھتی ہوئی موجوں سے بچانے کے لئے ایک فصیل ضروری تھی، اس نے ڈیورینڈ کی سلاخوں، ٹوٹے ہوئے تختوں کو اکٹھا کر کے غذائی غضب سے بچاؤ کا سامان کیا۔

جب غضبناک طوفان کا چڑھاؤ کم ہو گیا گلیٹ بھوک سے دیوانہ ہو رہا تھا، اس نے اتری ہوئی موجوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فصیلی کی تلاش میں نکلے گا اور وہ کیا۔ وہ نہر عریانی کی حالت میں دانتوں میں چھرا بائے ہوئے ایک ایک چٹان پر بھاگ رہا تھا، اچانک اس نے اپنے آپ کو دوبارہ اسی غار میں پایا جو جہاں کے مانند چلتے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی، اس نے پانی کی سطح پر ایک شکلات میں ایک مچھلی کو دیکھا۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا اور تارکی میں زیر آب ٹوٹنے لگا، دفعۃً اس نے اپنے بازو کو کسی چیز کے پنجے میں جکڑا ہوا محسوس کیا۔ اس پر ایک عجیب بلیٹ طاری ہو گئی۔

ایک باریک کھر دی چٹھی سی ٹھنڈی اور لیسدار چیز اس کے بازو پر لپٹ چکی تھی جو اس کے سینے کی طرف رہتی جاتی تھی، اس کا دباؤ ایک دسی کے مانند تھا، اور اس کا متواتر بڑھتے جانا جسم پر ایک برے کی طرح محسوس

ہوتا تھا، ایک لمحے کے اندر اندر۔ یہ بل کھاتی ہوئی چیز اس کی کلائی اور کمر سے گزر کر شانے تک پہنچ چکی تھی اور ایک تیز لڑکھائی کی لہلہ میں کھینچ گئی، گلیٹ لڑ گیا۔ لیکن اس کو ہٹنے کی تاب نہ تھی، وہ اسی جگہ پر گھٹکیا، اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے جو ابھی تک آزاد تھا چھرا پکڑ کر اپنے آپ کو پھراٹنے کی کوشش کی، لیکن بھری بلانے اپنا قبضہ اور بھی مضبوط کر لیا، یہ چڑھے کی مانند نرم لپے کی مانند مضبوط اور رات کی مانند ٹھنڈی تھی۔

ایک دوسری شکل، تیز اور سکڑی ہوئی شکلات سے اس طرح برآمد ہوئی جیسے ایک اڑنے کے منہ سے زبان پھیرے وہ اس کے نکلے جسم کو چاٹتی ہوئی محسوس ہوئی پھر پکائی بارکس اور ٹوٹیل ہو کر اس کے جسم کے گرد لپٹ گئی، شہید درو کی وجہ سے گلیٹ کے جسم کے تمام پچھے سارے گئے، اس نے اپنے جسم پر کتنی زشت چھتے ہوئے محسوس کئے، اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کئی ہزار جونکیں اس کے جسم پر چھٹ کر اس کا جوس رہی ہوں۔

ایک تیسری لمبی ٹھنڈی شے سوراخ سے باہر آئی، اور اس کے بدن کو ٹوٹتی ہوئی اس کی ٹہنیوں کے گرد رسی کی مانند مضبوطی سے لپٹ گئی گلیٹ ان نادار اشکال کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ ایک اور چیز تیرتی طرح تیزی سے اس کے پیٹ پر چند آدمی ہوئی۔

یہ جاندار چیزیں جابجا اس کے جسم کے گرد لٹکی ہوئی تھیں، اس نے دباؤ کے مقامات پر غور کیا۔ تیسے موبے جہاز کو دیکھ کر اس نے جو ہر لحاظ اپنی نگاہ بدلتے تھے۔

پھر ایک بھاری لیسدار چٹھی سی شکل پانی سے نمودار ہوئی، یہ ایک وسطی حصہ تھا، جس کے اطراف پر کئی قسم کے نابینا آویزاں تھیں، اس نے اس لیسدار ڈھیر کے وسط میں دو جاکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔

اب گلیٹ نے شیطانی مچھلی کو پہچان لیا۔

اس کے پاس صرف ایک ہی ہتھیار یعنی چاقو تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ خوفناک عجیب اختلافت بلا میں صرف ایک مقام سے زخم پذیر ہو سکتی ہیں، اس کے جسم کا ایک ایک مقام اس سے گزرتے میں مضروب اور مجروح ہو رہا تھا، گلیٹ نے شیطانی مچھلی کی آنکھوں کو دیکھا اور شیطانی مچھلی گلیٹ کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔

شیطانی مچھلی کے مقابلے میں بیل کے مقابلے کی طرح ایک ایسا



اور سر پر سیاہ آسمان تھا، اس نے تمام جدوجہد چھوڑ دی، وہ ایک چٹان پر لیٹ گیا، اس نے نہایت آزدگی اور عاجزی سے اپنے ہاتھ اٹھائے، اس کی زبان کی بے ربط جنبشوں میں رحم، رحم کی پکار سنی، جب وہ اس بے خودی کے عالم سے بیدار ہوا، تو سورج کافی بلند ہو چکا تھا، وہ دوبارہ تازگی سے کھڑا ہو گیا، اس نے ہمت بانجی ایک دن کی محنت سے کشتی کا سوراخ بند کیا، دوسرے روز وہ فراہم کردہ چمقیزوں سے ملبوس ڈاربر سے ساحل کی جانب چل پڑا۔

### فتمت کی آخری ضرب

گلیٹ اپنے چمقیزوں میں ملبوس رات کے وقت ساحل پر پہنچا، اور لیٹھری کے مکان کی تاریکی میں کچھ دیر تک ادھر ادھر بھرتا رہا، پھر اُس نے ٹمٹم باغ کا رخ کیا، وہ تھاس پر بیٹھ گیا، اور ارد گرد دیکھنے لگا، باغ نے قبول ہٹنریاں اور مکان اس کی نظر میں تھے، اُس نے ڈراویٹ کے کمرے کی کھڑکیوں کو دیکھا، اس کا تنفس بھی ایک رکاوٹ کے ساتھ جاری تھا، ان کھڑکیوں میں ایک عجیب کشش تھی، جن میں دیکھتے رہنا اس کے لئے دائمی مسرت کا شعل تھا، اچانک اس کی نظر ڈراویٹ پر پڑی،

وہ قریب آ رہی تھی، کچھ فاصلے پر وہ کھڑی ہو گئی، ہم چند قدم پیچھے ہٹ کر ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گئی اور ایک لکڑی کی اینچ پر جا کر بیٹھ گئی، چاند درختوں کی آڑ میں تھا، زرد زرد ستاروں میں بادل کے چند ٹکڑے سیر رہے تھے، سمندر کی موجیں زبرد گنگنا رہی تھیں،

گلیٹ کے بدن پر لکڑی طاری ہو گئی، وہ اس وقت اپنے آپ کو انتہائی بدبخت اور بددھار خوش نصیب محسوس کر رہا تھا، وہ اس لمحہ میں تھا کہ اسے کہہ کرنا چاہیے۔ دیدار کی خوشی سے اس پر سرسام کی حالت طاری تھی، اس نے ڈراویٹ کی گردن اور سنہری بالوں کو غور سے دیکھا،

اچانک ایک آہٹ نے دونوں کو ہشیار کر دیا، کوئی شخص بارغ میں ٹہل رہا تھا، ڈراویٹ نے اپنی آنکھ اٹھائی، وہ شخص قریب ہوتا گیا، اب درخت کی شاخیں درمیان میں اس طرح عایل تھیں کہ ڈراویٹ کو لاوارد کر دیکھ سکے، تھی، لیکن گلیٹ نہیں دیکھ سکتا تھا، اُس نے ڈراویٹ کی طرف دیکھا،

وہ بالکل زرد ہو رہی تھی، اس کے نیم والے ایک حیرانی کی پہنچ رہا تھا۔

ہوتا ہے جب اُن پر قابو پالینا چاہیے، یہ موقع اس وقت ہوتا ہے جب ہیل اپنا سر نیچا کرے اور شیطانی مچھلی اپنا سر اٹھائے، یہ موقع نہایت قبل ہوتا ہے، اور جو فریق اُسے کھودے وہی تباہ ہو جاتا ہے،

یہ ایک شیطانی مچھلی نے ایک اور شاخ چٹان سے باہر نکالی، اور اس سے گلیٹ کا بایاں بازو بھی پکڑ لیا اور ساتھ ہی اپنا سر آگے بڑھایا۔

جب ہی یہ خوف مختصر تھا گلیٹ نے اتنی ہی تیزی سے تمام کوشش کے ساتھ اپنا خنجر اس زم زم لیس دار چیز میں گھونپ کر فوراً اس کی آنکھوں کے گرد ایک زخم کا حلقہ بنا دیا۔

تمام چونکیں بیک وقت گر گئیں اور تمام کا تمام ڈیسر پانی کی تہ میں غائب ہو گیا۔

گلیٹ زخموں سے چور ہو چکا تھا اس نے اپنے آپ کو پانی میں ڈال دیا۔ اس کی نظریں ایک گوشے کی جانب پہنچیں وہ قریب گیا۔ یہ کیا چیز تھی۔ ایک انسانی خنجر، جس میں سفید ہڈیوں کے سوا کچھ باقی نہ تھا، ہاں ایک چیز۔ ایک چمڑے کی پتی اور تبا کو کا ڈبہ۔ پیٹی پر گلیٹ نے بھگن کا نام پڑھا، پھر اس نے تبا کو کے ڈبے کو چاقو سے کھول کر دیکھا، اس میں تین ہزار اشرفیاں تھیں،

جب گلیٹ اس ڈبے اور پیٹی کو لے کر اپنی کشتی کی جانب پلٹا تو اس کے خوف کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ کشتی میں پانی بھر رہا ہے۔ اگر وہ ایک گھنٹہ اور دیر سے آتا تو اسے پانی کی سطح پر کچھ نہ ملتا۔ اس نے زنجیر کے ساتھ ایک ترپال کشتی میں لپک کر سوراخ بند کر دیا، اور کشتی میں پانی آنا بند ہو گیا۔ گلیٹ نے اپنے تمام کپڑے سوراخ کے منہ میں بھسا دیئے،

اس تنہا خاموش چٹان پر گلیٹ کو لاتعداد اذیتیں پہنچیں، وہ تنہا، بھوک، پیاس، مشقت اور خنجر پر فح پانچکا تھا، لیکن ایک مایوس کن چیز کا مقابلہ ابھی باقی تھا، گلیٹ کی چٹان کی چوٹی پر چڑھ گیا، اور دور دور نظر دوڑانے لگا، اس کے پاس کوئی لباس نہ تھا، اور وہ اس نے

پا پاں سمندر کے وسط میں بالکل عیاں کھڑا تھا،

ان طعنات خیر امواج کی گونج میں جہاں اس کے نیچے بحر بے پایاں

ہوئے معلوم ہوتے تھے،

نوادرجو عرف گلیٹ کے لئے اپنی تھانہ، حروف گنگو پڑا، دغوں کے درمیان ایک آواز سنائی دی جو سنوائی پہلے سے زیادہ نرم تھی، گلیٹ ایک طویل گنگو سناتا رہا، اس کے بعد

اسے خوبصورت دوشیزہ تم غریب ہو، میں آج صبح سے امیر ہوں، کیا تم مجھے اپنا خاوند قبول کرو گی، میں تم سے محبت کرتا ہوں، خدا نے انسان کا دل خاموش رہنے کے لئے نہیں بنایا، اُس نے اس سے سیات اپنی کا وعدہ اس لئے کیا ہے کہ یہ ایک اندر رہے، میرے لئے روئے زمین پر صرف ایک خاتون ہے اور وہ تم ہو، میرا ایمان خدا پر ہے اور امید پڑا

گلیٹ نے اس کو گنگو کرتے ہوئے سنا، وہ اس سے محبت کرتا تھا، اُس کا سایہ راستے کی پٹری پر پڑا تھا، پھر اُس نے اسی آدمی کو کہتے ہوئے سنا، دوشیزہ تم خاموش رہو میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں، میری آواز خدا سن چکا ہے، ڈراو پیٹ نے جواب دیا۔

بہرہ آگے بڑھی، اب پٹری پر وہ زل سائے نظر آ رہے تھے، دو زل سائے مل گئے، گلیٹ نے دونوں کے کس کو ہم آغوش ہوتے ہوئے دیکھا۔

اچانک دور سے چیخ پکار کا شور سنائی دیا، مدد، مدد، ساتھ ہی بندرگاہ کی گنگی بجنے لگی،

یہ لیتھری تھا، اس نے ڈیورینڈ کے فنل کو ساحل پر دیکھ لیا تھا، اس کے نظارے نے اسے خوشی سے دیوانہ بنا دیا تھا، اور وہ مدد دیکھتا ہوا ہمارے ہجاگ آیا، ایک دم وہ ٹھہر گیا، اُس نے ایک آدمی کو ابھی گھاٹ سے اُترتا ہوا دیکھا، یہ گلیٹ تھا، لیتھری دیک کر اُس سے بنگیر ہو گیا، اور پیار کرتے ہوئے بردین کے زیریں کمرے میں گینچ کر لے گیا۔

”مجھے یقین دلاؤ کہ میں دیوانہ تو نہیں، وہ کہتا جاتا تھا۔ یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔“ اجن کا ایک ایک پن سلامت ہے، یہ کس قدر عجیب ہے، اب عرف تیل دینے کی ضرورت ہے، تم میرے عزیز بنے ہو، بہادر بنے، تم سمندر کے وسط میں اپنی جان پر کھیل کر میرے عزیز ترین جہاز کو چٹانوں سے سلامتی کے ساتھ واپس لے آئے، میں نے اپنی زندگی میں کئی عجیب و انتحار دیکھے لیکن اتنا عجیب واقعہ کبھی نہیں دیکھا۔

گلیٹ نے گلیٹ کی بیٹی اور ٹین کا ڈو جس میں تین ہزار پونڈ تھے، لیتھری کو پیش کر دیا، دوبارہ لیتھری بھر حیرت میں غرق تھا، ”کیا کسی نے گلیٹ کو سائرف آدھی دیکھا ہے؟“ اس نے کہا، ”میں خاک میں مل گیا تھا اور بالکل تباہ ہو چکا تھا، تم نے میری حالت کو دوبارہ سنبھال دیا، میں تو عزیز یا تمہیں یاد ہے کہ ہمیں ڈراو چیٹ سے شادی کرنا ہے،“

گلیٹ دوا سے اپنی کمرنگ کر کھڑا ہو گیا، اس نے نہایت دبیہ لائن صاف آواز میں کہا، ”نہیں۔“

لیتھری چونک اٹھا، کیسے نہیں؟

”میں اس سے محبت نہیں کرتا۔“

لیتھری نے اس کے خیال پر نفرت آمیز تہقید مارا، وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا، گلیٹ اور عرف گلیٹ ہی ڈراو چیٹ سے شادی کرے گا۔

اب ہسائے بھی گنگی کی آواز سنکدا لگتا ہو گئے تھے، نام کرہ بھر گیا تھا، اب ڈراو چیٹ بھی کمرے میں داخل ہوئی، لیتھری نے اُسے دیکھا اور ہجوم میں اسے خبر سنائی۔ ”ہم دوبارہ امیر ہیں، اور تم اس پیادہ سے شادی کرو گی، جس کے سر پر کامیابی کا ہرا ہلکا ہوا ہے۔“ اس کی نظریں ایک دوسرے آدمی پر پڑیں، جو ڈراو چیٹ کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا، یہ وہی نوجوان پا رہی تھا، جس کو گلیٹ نے سندر کے وسط میں چٹان سے بچا یا تھا،

”کیا آپ بھی یہاں ہیں؟“ بڑے لیتھری نے کہا، ”آپ ان دونوں کا نکاح پڑھ دیجئے“ اس نے ڈراو چیٹ اور گلیٹ کی طرف اشارہ کیا،

”گلیٹ کا چہرہ اس وقت ڈراونا معلوم ہو رہا تھا وہ ابھی تک انھیں چیتھروں میں ملبوس تھا، جن کے ساتھ وہ ڈوریز کی چٹانوں سے چلتا تھا، انکی نیکی کہنیاں، لٹکتی ہوئی دھجیاں، پریشان بال، خون آلود آنکھیں۔ اس کے بڑا پر جاسنا سور، اس کے خراشوں اور زخموں سے بھرے ہوئے ہاتھ۔“

الغرض وہ ایک عجیب حالت میں تھا، ”یہی میرا داماد ہے“ لیتھری نے جہاں کہتا اس نے سندر کے ساتھ کھڑا مقابلہ کیا ہے، وہ چیتھروں میں ملبوس ہے، اس کے شانے اور ہاتھ قابل ترین ہیں، یہ ایک بہت بڑا انسان ہے،

لیکن گلیٹ لیتھری کی آنکھ بھا کر کمرے سے باہر نکل چکا تھا، اس نے

خود ڈرامہ چیٹ اور پادری کی شادی کا انتظام کیا اور ان کے سفر کے لئے ایک جہاز میں انتظام کیا، جو انگلینڈ کو روانہ ہو رہا تھا، یہ نام انتظام کر کے گلیٹ نے سمندر میں اسی چٹان کی راہ لی، اور وہاں انتظار میں بیٹھ گیا، تاکہ صبح سے جہاز کو نکلتا ہوا دیکھے، یہاں تک کہ وہ عد نظر سے بعید ہو جائے۔

جہاز نہایت سرعت رفتار سے نکلا، گلیٹ نے اُست و بکھا، اس کے جسم پر کچی طاری ہو گئی، اس نے سر جھکا لیا، سمندر چڑھ رہا تھا، اور پانی اُس کے پاؤں تک آچکا تھا۔

اُس نے نکلا ہے جب کہ لیں، پھر ادھر دیکھا، اب جہاز چٹان کے مقابل آچکا تھا۔ اس کے سپاہ دستور میں نہایت خوبصورت معام ہوتے تھے۔ اونچے اونچے بادبان ایک لمحہ کے لئے سورج کی شعاعوں سے منور ہو گئے، پانی کا شور جہاز کے چلنے سے زیادہ ہو رہا تھا۔

گلیٹ عرشہ جہاز پر زندگی کی چل چل کا نظارہ کر رہا تھا، یہ اس قدر صاف نظر آ رہا تھا جیسے گلیٹ اسی میں سوار ہو، اُس نے عروس اور فرشتہ کو ایک جگہ بیٹھ ہوئے دیکھا۔ ان دو معصوم چہروں پر شادی لڑ رہا تھا، اور خوشی میں ایک ہنسی سکوت مغموم تھا۔

جہاز گزر گیا، گلیٹ کی نگاہیں اس پر ہوئی تھیں، یہاں تک کہ بادبان آہستہ آہستہ دور ہونے ہوتے شفق پر ایک سفید دھبہ کے برابر نظر آنے

لگے، اُس نے محسوس کیا کہ پانی اس کی کمر تک پہنچ گیا ہے۔ جہاز متواتر دور ہوتا گیا،

چٹان کے گرد چٹان گلیٹ میٹھا ہوا تھا، کوئی جھاگ نہ تھا، اُس کے اطراف کوئی شوریدہ موج نہیں ٹکراتی تھی، پانی نہایت سکون سے چڑھ رہا تھا، اب یہ گلیٹ کے شانوں تک آچکا تھا۔

چپختے ہوئے پرندے اس کے سر پر پھر پھر اڑ رہے تھے، اب صرف اس کا سر پانی سے باہر رہ گیا تھا۔

موتوان اپنے پورے دور پر تھا، شام قریب آ رہی تھی، گلیٹ کی آنکھیں شفق کی جانب جہاز پر جمی ہوئی تھیں، اس سکوت میں غم خیز گہرائیاں تھیں، ان میں مابوس اسیدوں کی تسکین تھی، اُس پر ایک خاموش، لیکن منہم طریق سے اپنے انجام کو قبول کرنے کا جذبہ، جو اُس کی اُسیدوں کے باطن پر عکس تھا، طاری ہو گیا۔

رفتہ رفتہ شام کی ہلکی غلٹ پھیلنے لگی، لیکن گلیٹ کی آنکھیں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ شام کی دہری نے آنکھیں موند لیں، اور سمندر کی چڑھتی ہوئی تند موجوں نے گلیٹ کی آنکھوں کو بند کر دیا۔

عین اُس وقت جب جہاز نکلا ہوں سے اوجھل ہوا، گلیٹ کا سر غائب ہو گیا۔ اب سطح آب پر پانی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

(منظر)

ہنسی کی ایک شے کو چھپانا تو ہے  
تنہا کیا ہے اک زمانا تو ہے  
ہر شے سے زیادہ مستحق تشریفات  
خسوساً اسی کو چھپنا تو ہے  
(پیشکش آئینہ آبادی)

ہنسی خالقِ نوبہار کو چھپا کر چھپا کر چھپا کر  
پیرہ یہ لالہ زار کو چھپا کر چھپا کر چھپا کر  
غفلت کے لیے چھپا کر چھپا کر چھپا کر  
اے موحبِ آئینہ آبادی  
(پیشکش آئینہ آبادی)

# عورتوں کی لڑائی

کوثر چاند پوری

بوسلام!

سکینہ نے اپنے کوٹھے کی دیوار سے سر نکال کر رضیہ کو مخاطب کر کے کہا جو مکان کے صحن میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی اس نے اپنی سفید، سفید بھوئی، سکیر کر کے، دقن نگاہوں سے اوپر کو دیکھا، اور بے زحمتی سے کہا، پڑے خاک ایسے سلام ہے!

کیا ہوا بڑا، آج کیوں منہ سجائے بیٹھی ہو؟

میں پرے، لمبی بن، آئی وہاں سے بوا کی لاڈلی۔

بوا کیا ہو گیا تمہیں، کیوں تمہارے سر پر سنبھر سوار ہے آج؟

سنبھر سوار ہو تیرے سر پر، دیکھ سکینہ میرے منہ مت لگیو!

بوا کیا باؤ لے گئے نے کاٹ کھا یا نہیں، جو کاٹ کھانے کو دوڑتی

پڑتی ہو،

گٹن کاٹے تجھے، تیرے پیادوں کو، اللہ نہ کرے جو مجھے کاٹے

باؤ لاگتا!

بوا، دیکھو میرے پیادوں کا نام لیا تو چٹیا کی خیر نہیں، ذرا منہ

سنبھال کر بات کرو،

منہ وہ سنبھالے جو تیری دہلی لہی رہتی ہو، تیرا دیا کھاتی ہو، مجھ پر

تیرا بیا دباؤ ہے، جو میں سنبھالوں منہ کو،

دیکھ سکینہ منہ میں لو کا دیدوں گی، جو میرے بوڑھے چوندے کا

نام لیا!

بوا تمہارا تو داغ چل گیا ہے، ذرا دستی جیب چلانے کو بیٹھ گئیں تم،

میں نے بھلا کہا گیا تھا، نہیں سیدھے سبھاؤ سلام کرنے کو چلی آئی تھی، مجھے کیا خبر تھی، یوں جی بھٹی بیٹھی ہو،

جے تو، پچھنے بھی تو، میں کیوں جیتی، جیب چلانے کو مجھے تیرا کیا ڈر پڑا ہے!

ہے کیسی لگائی، بازی نہیں آتی، ہاگل سر پہ بی چڑھی جا رہی ہے،

ہم تو بڑھاپے کا خیال کر رہے ہیں، آپ ہیں کہ آپے ہی سے باہر ہوئی جا رہی ہیں،

آئی وہاں سے بھاری بڑھاپے کا خیال کرنے والی، بڑھاپے کا خیال

کرتی تو مردوں میں جھٹک میری صورت میں کپڑے ہی تو ڈالتی، ارے میرے

منہ میں دانت نہیں رہا، آنکھوں سے پانی پتا ہے، دیتیرے بادا کا کیا نقصان

ہے، یہ تو اللہ کی قدرت ہے جس کو چاہے جیسا بنا دے، مگر بندے کو کسی

بات پہ گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے۔

بوا، ذرا دوسرے کی بھی سنا کر دے، تم تو اپنی ہی کہے جا رہی ہو،

کون کہتا ہے میں نے تمہاری صورت میں کپڑے ڈالے، بوا جھوٹ بولنے

کی میری عادت نہیں، دیکھو، ایسے طوفان مت اٹھاؤ تم مجھ پر، کوئی سنے گا

گا تو کیا کہے گا، میرے ہی جنم میں تنوکے کا کہ ضرور اس نے بوا کو کچھ کہا ہوگا،

اس گھر میں بہتے بہتے میرے بال سفید ہو گئے، آج تک کوئی کہہ تو

دے، میں نے کس پر طوفان اٹھائے ہیں، کس پر ہمت لگائی ہے، اکیلی تم ہی

تو رہتی ہو، مجھے میں کوئی اور تو رہتا ہی نہیں، ایک تم پر ہی طوفان توڑ رہی

ہوں، میں!

اوروں کی میں کیا جانوں بڑا، میں تو اپنی کہتی ہوں، خدا اپنا دیدار اور محمد کی شفاعت نصیب نہ کرے، جو میں نے کسی کے سامنے نہیں کچھ کہا ہوا! خدا کے خوف سے ڈر سکتی!

اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں کہ ان ہوئی بات کو میرے سر سے دھوپ دو، کوئی بیچ میں ہو تو اس کا نام لیا میں، لا دکی تو دے کر پوچھو کس کے آگے کہا میں نے بڑا کڑوا ہوا!

سکینہ یوں باتوں میں ستاؤ مجھے، میں نے دھوپ میں یہ بال سفید نہیں کئے۔

بوا تم نے دھوپ میں سفید کئے ہوں بال یہ سنا یہ میرا مجھے اس سے واسطہ نہیں میں تو یہ کہتی ہوں نہ اس ہندی کا نام بناؤ جس کے سامنے میں نے نہیں بڑا بھلا کہا، جب جھوٹے سچ بھلے کہا، بڑا اللہ کرے میں اتنی ہی بڑی م جاؤں، جو میں نے اب حرف بھی زبان سے نکالا ہو۔

کس کس کا نام بناؤں سکینہ، کوئی ڈھکی چھپی بات ہو تو میں نام بھی بتاؤں، کسی کا بھرے مجھ میں جھٹکرم نے اس دن نیم والے گھر میں مجھے اندھا بنایا، انھوں نے کہا، آنسو ڈھال کہا، آنسو نے کہا صبح صبح کوئی اس کی شہادت بھی نہ دیکھے جس دن میں اس کا منہ دیکھ لیتی ہوں شام تک چین نہیں ملتا، تو بہ کر دوا تو بہ! دیکھو ایسا طوفان مت اٹھاؤ، اللہ ایسے پستان باندھ رہی ہو، خدا جانے آسان کس کے بھاگوں کھڑا ہے۔

اچھا تم کھاؤ، تم نے نہیں کہا،

بوا تمہارے سر کی قسم، اپنے بچہ کی سول، جو میں نے تمہارا نام بھی لیا ہو، پڑے خاک جھوٹ بولنے والے کی صورت ہے، بچہ سے زیادہ دنیا میں مجھے اور کیا ہے؟ ہاں اتنی بات تو ہوئی تھی، بوا، دیکھو میں کچھ سچی باتوں نہیں کہتو دھوپ کا ذکر آگیا تھا، تو میں یوں بولی کہ اب تو اسے سوجھتا بھی نہیں، اور منہ پے تو جھپڑوں تو رہتا ہے، جس دن سویرے ہی سویرے صورت دکھا جاتی ہے، روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی، اور کچھ نہیں تو کتنا ہی ہنڈیا میں منہ ڈال جاتا ہے، بوا ویہ بات تو غرور میں نے بھی سنی، تمہارا تو نام بھی نہیں لیا، نہ معلوم بڑھاپے میں تمہاری عقل چرنے چلی گئی ہے کیا، پہلے بات کا انجام سوچ لیا کرو، پھر منہ سے کچھ نکالا کرو، وہ تو اچھا ہوا میں چلی آئی اس وقت، نہیں تو تمہارے دل میں یہ سیل بھرا ہی تھا

سکینہ اللہ تیرا کچھ بھنڈا رکھے، بچی! بے میری کیا خلا ہے، مجھ سے تو مصیبت کسی نے کہہ دیا، میں نے یقین کر لیا، میں آپ تو کچھ سننے لگی نہیں تھی، مجھے کیا خبر کہ بلو دھوپ کا قصہ تھا، میں تو یہی سمجھتی تھی کہ تو بھی تو کہہ رہی ہو گی، سکینہ میرا دل تو اندر سے گواہی دے رہا تھا کہ زمین آسمان ٹل جائے اپنی جگہ سے، مگر سکینہ میرے لئے ایسے بول منہ سے نہیں نکال سکتی، اور اسفین باتوں کی بدولت تو رات دن تیرے لئے دعائیں ملتی رہتی ہیں، میرے بدن کے روئیں روئیں سے!

مگر بوا اتنے کچھ کان بھی کس کام کے آج تو یہ ہوا اہل کو اور کچھ کہہ دیا، کسی نے تم سے، تو میں کیا بگاڑ لوں گی، اس کا یا تمہارا۔

یوں کہنے سے کیا ہوتا ہے سکینہ! ایسی میں بالکل سڑی تھوڑا ہی ہوں، جو ہر کسی کے کہنے سے یقین نہ ہوں گی، اب ملے اتنی بات تو مجھے والے نے بھی جھوٹی نہیں کہی، کسی کا ذکر تو تھا، تم خود ہی کہتی ہو، بلو دھوپ کو کہہ رہی تھیں، ہاں اتنی بات اور بڑھ گئی، کہ اس کی جگہ میرا نام ملے دیا۔

یہی تو کر قوت میں بوا دشمنوں کے میں تمہاری ہی بات کی تم کھا کر کہتی ہوں بلو دھوپ کو کہہ رہی تھی، تمہیں کیا معلوم نہیں اس کی صورت و کھ لومع صبح تو روٹی نہیں ملتی، سارے دن بھوکا رہتا تھا، بھائی خدا کی قسم میں نے تو جس روز اس مردار کی صورت دیکھی، مجھے سورج ڈوبنے تک چین نصیب ہوا نہیں،

کیا کہہ رہی ہو سیدانی، بلو دھوپ کا دم نہ ہوتا تو جھینک جھینک کر مر جاتی تم، یہ میں ہی تھی کہ جب ناگیں پھیلنے لگیں پڑی تھیں تم اور کوئی پانی پلانے والا بھی پاس نہ تھا تو اپنے کچھ کو ہلکا چھوڑ کر تمہاری پٹی نیچے آ بیٹھی تھی، پیر میں نے دہائے تمہارے منہ ہاتھ میں نے دھلوا دیا، روٹی میں نے پکا کے کھلائی سارے کنبہ کو، اور آج تم کہتی ہو بلو دھوپ ہے، اس کی صورت دیکھنے سے نہ ہنس ملتی، وہ دن بھول گئیں کیا جب بلو کے بڑا تمہیں کوئی نہ چھنے والا بھی نہ تھا، سچ کہا ہے کسی نے نیکی کر اور کنویں میں ڈال

سکینہ بلو کو دیکھتے ہی چونک گئی اس کے بدن میں، حال یہ کہ کی بوند ہنیر اسے سان گمان بھی نہ تھا کہ بلو دیوار کے نیچے

جیسا ہوگی دیبا سنگی، بتو اچھی طرح سن لے مکان کھول کر میں تیری برابری کی  
بنیں ہوں۔

زمین پے پاؤں رکھ کے چلو بوا زمین پے؛

اب کیا تیرے سر پے رکھ کے چل رہی ہوں۔

میرے سر پے تم کیا بیڑ رکھو گی، بیاری، چرخہ کاتنے کاتتے تمہاری  
عمر گزر گئی، ایک دن چرخہ پونے کے نہ ٹھٹھو تو اگلے دن کھانے کو روٹی  
نے تم میرے سر پے کیا ماؤں رکھو گی؟

بتو، کیونکہ میں تجھے دے، چربی نہیں کی کئی و ماں۔ سے باتیں بنائے  
ابراں تو ران کی،

بوا عمر کا خیال کرتا، ہوں، سفید بانوں سے اللہ میاں کر بھی شرم آتی  
سے نہیں تو وہ بے لطفہ سر، اتنی کہ سر پریشانیں تم بنا۔

نہج، تیرے دروازے سے، پتھر میرے سر پے دستہ آروں کی،

میں چوڑا رکھ رکھوں گی، ابھی مارنے والی کا!

باب کب سے جا رہا ہے، جب نہیں جوتی، کینو!

تم ہزار، تھکتی،

سیدہ سن، ہی ہو، اس دوسری کی باتیں تم،

ہاں برا سن تو رہی ہوں، مگر کیا کروں، مجھ پس نہیں جلتا۔

وہ کیا ہے، کہ، بی، نہ بچھ، اس کے دانے دیکھنے ہیں، تم تو ویسے

بھی بچ میں ٹانگ، اڑا مجھیں، جھگڑا تو سیدانی سے ہو رہا تھا،

میرے لیا دانے دیکھنے کی لو چڑلی؟

سیدانی، زبان سب، نہیں فوسہ، لڑچ لڑچ گی، باول میں آگ

لگا دوں گی،

میں تیری ہسیا، لڑ لڑ لگی؛

میں تیرے، "لوں کا خون پی لوں گی؛

ارے تیرے منہ، اگلے آگ خون پی اپنے پیاروں کا۔

سیدانی، اند کرے تو مجھ سی ہی ہو جا؛

خدا نہ کرے مجھے تجھ سا،

تیرے مریں بچے سیدانی، مجھے مخوس کہنے والی

بتو دیکھو زبان قابو میں رکھو، کیسا منہ بھر بھر کے کوس رہی ہے، نام نہاد!

کھڑی سب کچھ سن رہی ہے، وہ بہت ہی گھبرائی، بتو نے سارا قصہ  
اپنے کانوں سے سن لیا تھا، اب اس کی تردید ہی کیا ہو سکتی تھی، بوا  
کو تو اس نے بھابھا کر ٹھنڈا کر دیا تھا، وہ بڑے وقتوں کی نیک  
دل بیوی تھیں، مگر بتو باہر پھرنے والی بیاک عورت، اس کی بیا  
کسی کے سامنے رکنے والی ہی نہ تھی، مگر سکینہ نے بہت کر کے کہا،

بتو کیوں آپ سے باہر ہوئی، جا رہی ہے، میں تو مذاق کر رہی  
تھی، بوا کو معلوم کیا ہو گیا تھا، ایک دم سے مجھ پر جوس ہی تو پڑا،  
ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو میں نے تیرا نام لے دیا تھا، تیرے بچہ کی  
قسم کئی اور بات، منہ ڈا ہی تھی، پوچھ لے بوا سے میں نے کوئی نکالی  
دی ہو تجھے تو؛

نکالی تو کیا دیتیں سیدانی، میں تو اچھے اچھوں کی نہیں بنتی،  
تم تو بیاری بیویں تار تار میں، اور گہلی، بے میں مارنے کا کسر  
رکھی ہے، مخوس تم نے کہا، اندھا، نے کہا، اور کیا، دے لیا بھلا کہنے  
کو، سیدانی مجھے تمہارے یہ کن معاملہ، تھے، نہیں تو کبھی مقرر تھی  
بھی نہیں، تمہارے لہر آ کے اور اب دیکھو، گے گے۔

بتو معلوم ہوتا ہے تو سبھی بنگ پی کے آئی ہے، میں نے تو  
کھڑی ہی مخوس اور اندھا نہیں کہا تجھے، پوچھ لے بوا سے!

آنکھوں میں انگلیاں مت کر و سیدانی، میں بہری تو ہوں  
نہیں، اللہ رکھے میرے کان ابھی سلامت ہیں، میں میں بھی سب  
کچھ سن رہی تھی، کوئی اور ہوتا تو اینٹ مار کے پیس سے سر بھجور  
دیتی، اللہ کی سوں! وہ تو معلوم کس بات کا خیال آ گیا، اور بوا  
سے کیا پوچھ لوں، تو تم سب کی ہی بدی ہے، تم سب ایک تیلی  
کے پٹے پٹے ہو، پھر بوا کا ہے کو کہیں گی؟

بتو دیکھو میں اور تم کی عورت ہوں، سکینہ ہی سے منہ بلا جا،  
میرا نام لیا تو تھیک نہیں!

کس قسم کی عورت ہو تم بوا، میرا بھلا کیا کر لو گی، جیسا ہو گی،  
ویسا سنگی، میں کب تمہاری دی ہوئی روٹی کھاتی ہوں جو دہوں گی  
دبے گی کیسے نہیں۔ کینوں کو منہ لگانے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔  
سکینہ دیکھو ہماری برابری مجھے بیٹھے آج بتو کا یہ حوصلہ ہو گیا کہ وہ بھی ہے

تیرے میں دل۔

نہا کے لئے

تیرا لئے ہواگ۔

تیرا مے خود

تیرا کھلے جنا۔

تو تیرے مجھ میں پیرے۔

تیرے منہ میں کھلے کھلا دیا

تو خدا کے سے اس کی بیب نہ ہو

سیدانی تو اتنی ہی بڑی مہ جائے انداز کرے، تجھے شام ہونی نصیب

نہ ہو، اور ہوا ذالی کوئی ہوتی ہے تیرے کئے دلی۔

تو میں پہلے کہہ چکی ہوں میرے منہ میں لگ تو

تو میرا کیا کھاؤ نہ کی۔

میں تیرا بھیجہ کمال لوں گی

میں تیرے منہ پہ خاک ڈالوں گی!

نکل چیل میرے گھر سے:

ہوا دیکھو مجھے ہاتھ لگایا تو جان کی خیر نہیں، میں تو مرنے کو پہنچ رہی ہوں، کل کی مہرتی آج مر جاؤں، مجھے پروا نہیں، مگر تم کچھ کچھ پیرو کی زمانے بھر میں۔

ہوا! رہو کو ابھاکر، لیکن دے پاؤں کو رخصت سے اتر کر  
سے کو اڑوں کی زنجیر لگا دی، ستوڑی دیر تو رہو کو کو کسو، کھانڈ  
کسی برابر جواب دیتی رہیں، اسنے میں، میں میرا کیا، اور ہوا سناڑ کو کھڑا  
ہوئے، ہونے نہ صحت پا کر اوپر دیکھا تو لیکن غائب! اس نے غصہ میں  
ہائیں ہاتھ کی پھیلی پر دابنے ہاتھ کو کھڑا کر کے زور سے مارا، اور دانت  
کچا کے بولی، تیرے کھڑے تھے! تو آگ لگا کر چل دی، چتر اکہیں کی،  
مجھے ہوا سے لڑا دیا، اور آپ کسک گئی۔



## آزادی تحریر

افسوس کہ اب تک یہ خطرناک حقیقت  
افراد کو دہوانہ بنا دیتے ہیں کیسے  
لاکھ ان کو دبائے کوئی یہ دب نہیں سکتے  
جس خار سے خونبار رگ جان وطن ہے  
ہاں اور نہیں کوئی مداوائے اسلامی  
جس قوم سے چھینی گئی آزادی تحریر

پوشیدہ ہے اس ملک کے اربابِ شہت  
آزاد ہوں جذبات اگر قیدِ قسم سے  
آہو کو کوئی روک نہیں سکتا ہے زہر سے  
وہ خار نکل سکتا ہے بس نوکِ قلم سے  
زنجیر کٹے گی یہ اسی تیغِ دو دھم سے  
نام اس کا مٹا صفحہ تاریخِ اُسم سے

حبیب ہے تو حاصل کرو آزادی تحریر

آزادی تحریر کے قبضے میں ہے شمشیر

## شاعری اور تنقید جدید

ریش نارائن ماتھرا میاں آگرہ

کار آمد اور مفید ہوں۔ شاعری محض وہم و قیاس ہے، اور وہ خیال کے پلاؤ پکانے کے سوا کسی اور بات میں امداد نہیں کر سکتی ہے۔  
عملی زندگی میں شاعری کی تائید میں کچھ کہنا امر لازمی ہے، یہ اکثر پوچھا جاتا ہے کہ شاعری کے مطالعے سے کیا فائدہ ہے؟ اور وہ کیا ہے؟ لیکن جب غلط فہمیاں جو لوگوں کو اس کے بارے میں ہو گئی ہیں دور ہو جائیں گی، اور جب یہ بات منکشف ہو جائے گی کہ بہترین شاعری کیا چیز ہے اور وہ کیا کرتی ہے تو اس بات کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہے گی، کہ اس کے پڑھنے کے فائدے بیان کئے جائیں، حکمت پر اس کی فوقیت دکھائی جائے،  
بہم کسی پس و پیش کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ شاعری سے ہر شخص اور ہر فرد کو دلچسپی نہیں ہو سکتی، لیکن ہیں قوی امید ہے کہ ہم عفاۃ تنقید سے شاعری کے مدد و بڑھاسکتے ہیں، اور اس کے دامنِ عاطفت سے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو مستفیض کر سکتے ہیں، افلاطون نے جب شعرا کے خلاف الزام عاید کیا اور ان کو اپنی مخصوص جمہوریت میں داخل ہونے سے محروم رکھا تو اس کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا تھا، جس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکتی ہو۔ اگر شاعری کی عذر داری میں مستغنا نہ دلائل پیش کی جاتیں تو پھر اس کو جلا وطنی سے واپس ہونے کی اجازت مل جاتی، اور اس کا خوشی سے استقبال کیا جاتا، چنانچہ حضرت افلاطون خود فرماتے ہیں اور شاعری کے تائید کرنے والوں میں سے جو خود شاعر نہیں ہیں، لیکن شاعری کے مشیدائی ہیں، میں خیال کرتا ہوں،

”شاعری اور تنقید سے عامشہ ان س کو کوئی تعلق نہیں، یہ عرف بیکاروں کا شغل ہے، جو اپنے خلوت خانے میں لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اس طرح پوپ نے شاعری و تنقید کے متعلق شاعر میں لکھتے ہوئے اس بات کا احساس کیا تھا کہ شاعری و تنقید کا ذوق محض چند تعلیم یافتہ بیکار لوگوں کی مختصر جماعت تک محدود ہے، لوگوں کا بائبل ہی خیال آج بھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ شاعری کے اصلی مقصد، ماہیت کو کہ وہ حقیقت میں کیا ہے، اور ہمارے لئے کیا کر سکتی ہے غلط سمجھ جاتے ہیں، نفاذوں نے سمجھانے کی ہر چند کوشش کی، لیکن نفاذی سے مطلب کو خطا کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تنقیدوں سے لوگوں کا یہ اعتقاد ہو گیا کہ شاعری، مصنوعی لطافت و دلاویزی کا دوسرا نام ہے، وہ محض تقلید اور اطاعت فن کا نتیجہ ہے اور تفسیح اوقات ہے، اس میں پاک و لطیف جذبات کا سراسر فقدان نظر آتا ہے، اس میں تعین و تکلف، دور از کار تشبیہات و مرقع سازی ہے اس کا زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہے، آتش کا شعر اس خیال پر صادق آتا ہے،  
کھینچ دیتا ہے شبیبہ شعر کا خاکہ خیال عقل رنگیں کام اُس پر کرتی ہے پرواز کا  
جیشِ الفاظ بڑھنے سے نکلیں گے کہ نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا  
ہمت سے لوگوں کے نزدیک حکمت اور شاعری میں یہ فرق ہے  
کہ حکمت میں امر حقیقی کا انکشاف ہوتا ہے۔ برعکس اس کے شاعری میں خیالی نکات سے بحث ہوتی ہے، حکمت ان امور پر دلالت کرتی ہے جو زندگی میں



ان کو اختیار ہے کہ وہ شاعری کی بابت نہیں لکھیں، اور یہ بات ثابت کریں کہ شاعری خوشگوار ہی نہیں بلکہ امر سلطنت اور انسانیت کے لئے مفید ہے، اگر یہ مسئلہ طے ہو جائے تو ہم کو دو گن فائدہ ہو گا کہ شاعری مفید بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔

اس زمانے میں نقاد کا بھی پی فرض ہے۔ اس کو دکھنا ہے کہ شاعری زندگی کے لئے فرحت افزا ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔ ہمارا شاعری برائی وجہ سے اعتقاد ہے کہ دنیا کی شاعری میں بڑے بڑے حکماء و عقلمان اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور شاعری کو زندگی سے تعلق ہے۔

شاعری زندگی سے وابستہ ہے، رومن لوگوں نے شاعری میں اخلاقی پہلو کو بڑی اہمیت دی تھی، اس یقین و اُفق پر کہ شاعری میں یہ قوت موجود ہے، کہ وہ انسان کو شائستہ بنائے، اس کے اخلاق کو درست اور اس کو نیک امور کے لئے آمادہ کرے، رومن لوگوں نے اس کو اپنا ذریعہ تعلیم بنایا تھا، ان کے یہاں تعلیم کا اہم مقصد شعرا کے کلام کا مطالعہ تھا، شعرا لوگوں کو بہادر اور دلیر بناتے تھے، اُن کو خطیب اور مقرر بناتے تھے، اور اُن کو موزونیت بخشتے تھے، ہورس کا قول ہے "شاعر بچے کی ناکمل اور لکنت ذہن و زبان کو سنوانا ہے، اور اس کے کانوں کو دہیات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کو زندگی کے راز سکھاتا ہے۔ اس کے دل کے سانچے کو ڈھانچا ہے، اُس کے ناپاکیزہ خیالات کی اصلاح کرتا ہے، اسے عنفوانِ شباب میں کارنامہ عظیم سناتا ہے، اور اعلیٰ شاہیں پیش کرتا ہے جس سے اُس کی انگلیں کھل جاتی ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے لوگ بھی شاعری کے اخلاقی پہلو سے بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانے کے لوگ خیال کرتے تھے کہ لوگوں کو بہتر بنانے کے لئے سب سے قوی تر شے شاعری ہے، اسی خیال سے متاثر ہو کر سڈنی نے لکھا ہے، اکی کو مد نظر رکھتے ہوئے بن جونس نے غلط سنایا ہے، اور یہی شے ملن میں ہے جو شاعری کی اخلاقی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے۔

اٹارہویں صدی کے شعرا کا مزاج اور نقطہ نظر مختلف تھا، اور وہ دنیا دی تھا، تاہم اس دور کے شعرا بھی شاعری کا اہم ترین مقصد زندگی کو شائستہ کرنا اور اخلاق اور سیرت کی تعلیم دینا سمجھتے تھے، یہ عقیدہ انہوں

صدی کے رومانٹک کے ورثہ میں آتا ہے۔ ہم بازن کو ناصح کبھی خیال نہیں کرتے، لیکن وہ بھی یہی کہتا ہے "بہترین شاعری اخلاقی ہے، کیونکہ اخلاقی امور سب اشیاء سے اعلیٰ تر ہیں۔"

یہ کہنا کہ ایک بڑے مصنف کا فرض نصیحت کرنا نہیں ہے، بعید از قیاس بات ہے، شاعرانہ دلائل میں درحقیقت مسائلِ زندگی کا انکشاف ہوتا ہے، شاعری میں جذبات کا جو اظہار کیا جاتا ہے تو وہ جذبات زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں، جس سے ہمارے اخلاق کا گہرا تعلق ہے، اس لئے وہ نقاد جو اخلاق اور شاعری میں ایک جَدِ فاعل قائم کرنا چاہتے ہیں، سخت غلطی پر ہیں۔

اخلاق، انسان کا اہم ترین قابلِ غور مسئلہ ہے۔ ہم اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ بذاتِ خود اخلاق بے لطف و ناخوشگوار چیز ہے، اور ہم اخلاقی دلائل سے اور بھی منحرف اس لئے ہوتے ہیں کہ ہمارے مذہبی اعتقادات میں بھی فرق آگیا ہے، اس لئے شاعری کی نہایت ضرورت ہے کہ وہ ان ناخوشگوار چیزوں کی جو مذہب اور فلسفے سے تعبیر کی جاتی ہیں، قائم مقام بنے۔

اپنے موضوع کی تائید میں کہ فن لطیف اور شاعری تفسیر حیات ہے، میں شاعری، ڈرامہ اور فنِ مصوری و معاری کے گزشتہ سحر بات کے تنازع ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

کسی ملک میں کوئی مشہور زمانہ فن لطیف یا مصنف شاعری کا لے لیجے اور آپ کو واضح ہو جائے گا کہ شاعر کا مقصد زندگی کے نکات اچے روز کا انکشاف کرنا ہے، فنِ لطیف شمعِ حیات کا کام دیتا ہے، فنِ نقاشی یا شاعری میں جو حسن ہے بذاتِ خود وہ بے معنی و مہمل ہے، اگر وہ کسی خیال یا دلی آرزو یا دماغی کیفیت کا اظہار نہیں کرتا ہے۔

قدیم یونان اور قدیم ہند میں فنِ نقاشی کا کوئی شاہکار نہیں ہے، جو اس زمانے کے لوگوں کے عقائد اور دلی جذبات اور احساسات کا اظہار نہ کرتا ہو۔ قدیم ہندوستان، یا قدیم یونان کا کوئی ڈرامہ یا شاعرانہ کام نہیں ہے جو اس دور کے طرزِ زندگی اور سوسائٹی کی حالت کا بعینہ نقاشہ نہ کھینچتا ہو، آسٹریں بادشاہوں کے نقاشی کے شہ پاروں سے اُس زمانہ کی صحیح رفتار کا اندازہ ہو جاتا ہے، سانچی اور امر دتی کی نقاشی اور مصوری

ہم کو بڑھ مت کی زندگی سے آگاہ کرتی ہے۔

خواہ آپ مہابھارت کا ذکر کریں، یا کالی داس کے بڑے ڈراموں پر غور کریں، یا یونانی ٹریجڈی یا دائم الحیات ٹیکسپیرس ڈرامہ، یا مغل سلطنت کی معررہ کا، یا گیتا دور کی بہترین ولطیف نقاشی کا، یا شمالی ہند کے بادشاہوں کی قدیم موسیقی کا، یہ سب کے سب زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دلالت کرتے ہیں۔

اس لئے شاعری کا زندگی سے گہرا تعلق ہے، وہ زندگی کے مختلف

اعمال پر نظر عمیق ڈالتی ہے، ہم کو زندگی کا مقصد سمجھاتی ہے، اور ہماری زندگی کو فرحت بخش بنا دیتی ہے، شاعری تفسیر حیات ہے۔ بہترین شاعر وہی ہے جو واقعیت و اصلیت پر مبنی ہو، ایسی شاعری جو بظاہر دلاویز ہے، لیکن زندگی سے قطعی تعلق نہیں رکھتی، چند روزہ ہے، اور ایسی شاعری ہرگز قبولِ عام کا شرف حاصل نہیں کر سکتی۔ بہترین شاعری وہی ہے جو زندگی سے تعلق رکھتی ہے، وہ دائم الحیات ہے اور دلچسپ ہے، اور مقبولِ عام رہے گی۔

## اے کاش!

بیباک خطائیں ہیں، افسردہ مزاریں ہیں مقبول دُعائیں ہیں، محبوبِ قضائیں ہیں  
میتاب و فائیں ہیں، شرمندہ جفائیں ہیں، غمورا دائیں ہیں، سرشارِ نوائیں ہیں  
پُر کیف صدائیں ہیں، ابدست فضائیں ہیں، گھپاش ہوائیں ہیں، مے بارگھنائیں ہیں

اے کاش کہ ایسے میں اک لمحہ کو آجاؤ!

اس دُصوم سے گلشن میں کچھ موسمِ گل آیا ہر ذرّہ بے حس پر اک جوشِ منو چھپایا  
پتوں نے جھول بل کر اک گیت نیا گایا لی سبزے نے انگڑائی، کلیوں کو بھی ہوش آیا

اے کاش کہ دم بھر کو ایسے میں تم آجاؤ!

کاندھے پہ لئے ہا دل سامانِ بہار آیا ہر قطرہ لئے دل میں طوفانِ بہار آیا  
ہر ٹوٹے رکھے سر پر بستانِ بہار آیا پڑھتا ہوا ہر پتہ شہرِ آنِ بہار آیا  
ہر غنچے کے ہونٹوں پر عنوانِ بہار آیا ہر پھول لئے دل میں عرفانِ بہار آیا

اے کاش کہ تم خود بھی اک روز چلے آؤ!

# حُبِ وطن اور مسلمان!

ظرف، اور اس حد کا تنگ اے حامیِ دین نہیں حیف اے نا آشنائے رحمتہ للعالمین!

اختلافِ مذہبِ دولتِ پہ، اور اتنا جلال؟ بھائیوں کے خونِ ناحق کو سمجھتا ہے حلال!

حیف اے دیوار کے پابند، اے دُزر کے اسیر اپنے جُرجے، اپنے گُنبد، اپنے منبر کے اسیر!

دلِ پتیرے نقش ہے وہ فلسفہ اَدیان کا کائنات ہے رشتہ جو انسان سے انسان کا!

چھین لیتا ہے جو لطفِ باہمی کے قہقہے قلب میں بھینکارنے لگتے ہیں جس سے اثر دہے!

مجلسی اخلاق کے جذبے کو ٹھکراتا ہے جو آدمی کو آدمی کا گوشت کھلواتا ہے جو!

مجھ سے کیا کرتا ہے ہندو کے تعصب کا گلہ؟ مجھ سے کیوں کہتا ہے ہندو کی جفا کا ماجرا؟

تنگ فکر و تنگ اماں، تنگ ظرف و تنگ حسیب مان بھی لوں میں کہ ہندو عیب ہے، اور زندہ عیب

فرض بھی کر لوں کہ ہندو، ہند کی رسوائی ہے لیکن اس کو کیا کروں، پھر سبھی وہ میرا بھائی ہے!

مرد اگر ہوں بھائیوں کا خون پی سکتا نہیں! بھائیوں کا خون اگر پی لوں تو جی سکتا نہیں!

باز آیا میں تو ایسے مذہبی طاعون سے بھائیوں کا ہاتھ تر ہو بھائیوں کے خون سے!

سُبح و زُنا کی لہروں ہی پر بہتا ہے تو اور اس تنگی پہ مجھ کو کم نظر کہتا ہے تو؟

تیری ہستی تنگنائے کفر و ایماں کے لئے میں بنا ہوں آب و رنگِ نوحِ انساں کے لئے  
گو سنجی ہیں قصرِ آفاقی میں آوازیں مری کفر و ایماں سے بہت بالا ہیں پروازیں مری  
لیکن اس کے ساتھ ہی اے مُبتلائے کُفر و دیں دولتِ حُبِ وطن کو چھوڑنا ممکن نہیں!  
حقہ ہے سب سے مقدمِ زندگی میں خوشی کا خویش سے بچ جائے تو پھر مال ہے درویش کا  
سعی کرنا چاہیے پہلے تو گھر کے واسطے لکھ سے فرصت ہو تو پھر نوحِ بشر کے واسطے  
تیرے لب پر ہے عراق، شام و مصر و روم و چین لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں!  
کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں؟ کُل جہاں تیرا، مگر ہندوستان تیرا نہیں؟  
مردِ حق کو قعرِ باطل سے اُبھرنا چاہیے کعبہ حُبِ وطن میں سجدہ کرنا چاہیے!

سب سے پہلے مردِ دین بندِ دُستاں کے واسطے

بندِ جاگ اُٹھے تو پھر سارِ جہاں کے واسطے

جوشِ ملیح آبادی

## خسرو کا فیضان

من قبہ راست کو دم بر طرف کجکلا ہے  
کل رات کو اس شعر نے دل پر ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کر دی، اور  
اُس کیفیت سے ذیل کا شعر پیدا کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔  
ایں نکتہ را ندانہ بر اس کہ پیش عاشق  
معدِ عشرت و نداد، یک فرصت نگاہ ہے!

جوش

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت محبوب الہی ایک روز بانکی ٹوپی پہنے بیٹھے  
تھے کہ خسرو آگئے۔ حضرت محبوب الہی نے یہ مصرع پڑھا۔  
ہر دین راست را ہے، ہر قوم قید گاہ ہے!  
یہ مصرع سننے ہی خسرو نے اپنے پیر پر نظر جما کر فوراً یہ دوسرا مصرع  
پڑھا۔ ط

# مادرِ مسند

اسمعیل امرتسر

ماں تو اغیار کی آماجگاہ

تیری مقدس سرزمین اجنبیوں کے لئے ایک مسلسل قمارخانہ  
ہاہر کے لوگ تیری دوت پر ڈاکہ زن

..... ہند بھیا تیرے سینے کو چیرتے پھر یہ  
ماں تجھ پر یہ عالم دوزخ۔۔۔ تو آبرو بانٹتے، شائستہ قوموں کی  
نظروں میں۔

تیرا جو بن پڑ مرہ پھول کی پتیوں کی طرح۔۔۔ یہ سب کیوں  
ہم ہی تیرے سپوت، تیرے نام لیواؤں کے باہمی نفاق کی وجہ سے،

ماں، تیرے یہ فلک بوس پہاڑ، قابلِ فخر حکایات کے آئینہ دار  
رب العزت سے دست بدعا ہیں،

تیرے یہ ترنم ریز دریا پتھروں سے سرشار ہیں۔  
یہ وسیع میدان سوگوار، یہ شاداب مرغزار خزاں دیدہ  
یہ سونا اُگلنے والی زمین زلزلہ بدوش

یہ کیوں۔۔۔ ماں۔۔۔ آہ۔۔۔ جھکوی۔۔۔ ناقابلِ معافی گناہ

بوڑھی ماں۔ تیری ہانکیں اشکبار۔ تُو رہی ہے،  
ہم تجھے اپنا رہے ہیں، اپنا کر چھوڑیں گے،  
تیرے غلامی سے طوٹ دامن داغدار نہ رہنے دیں گے،  
یہ غلام آباد و گودا زادوں سے ہری ہوگی  
تب یہ ہمارا دیش ایک نئی دنیا ہوگا، ماں  
باہمی افتراق سے کوسوں دور، اتحاد کا منظم مرکز  
اور ہم تیرے سپوت ایک دوسرے سے ہم کنار  
گنگا جمن کے سنگم کی طرح

# محبوب

سحب وحید

رات زیادہ گزر چکی تھی، مگر میں جاگ رہا تھا، کمرے میں بیٹھے تیل  
کا چراغ روشن تھا، اس کی ٹپکی ٹپکی روشنی میرے کمرے کو سوز کر رہی تھی،  
میرا دل محبت کے جذبات سے لبریز تھا، مگر میں محبت کی حقیقت کو جاننا  
چاہتا تھا، غور کرتے کرتے میرا دماغ چکرانے لگا، میں نہیں جانتا تھا کہ  
میں ان جذبات کو اپنے دل سے کیونکر دور کر دوں، میں نے کوشش کی  
مگر ناکام رہا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا، مجھے پیاس معلوم ہو رہی تھی، صحن میں کاشے  
پڑ گئے تھے، میں نے تھوڑا پانی پیا اور پھر لیٹ گیا۔

بہرا قدر سے تیز ہو چکی تھی، رات کی پرباں رقص میں محو تھیں، دیر  
کانوں میں بھی کبھی ہوا کے گنگروں کی آواز بھی آجاتی تھی۔۔۔ تار بک،  
دوسرے کے شانے پر سر رکھے میٹھی نیند سو رہے تھے، کہ یکایک ٹنڈی  
ہوا کے جھونکے نے چراغ گل کر دیا۔

چراغ گل ہوتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ میرا دل حقیقت محبت سے  
جھٹکا رہا ہے، سچ ہے حقائق تاریکی ہی میں روشن ہو سکتے ہیں۔

فکھلے

جس کی راتوں میں اب اس طرح سے آماجگاہ

جس کے عہد زلیوں کا گریہ صبح و شب  
جیسے کہ ننہیں کر دے تیرے وقت چوہن  
کان میں آئی ہے ہلکی موجِ باران کی صدا  
(پیش)

# زقارِ وقت!

## منبرِ سیاست کے فتوے کفر!

پچھلے بیسے منظرِ تور (تہار) کے اک پہلک جیسے میں اک لنگی مولوی نذیر احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق فرمایا کہ وہ "کانگریس نواز ہیں، ہندو پرست ہیں، اور غور کفر!"

بد مذمتی و خورسند مذمت، عفاک اللہ کو گنتی!

کیا مولانا ابوالکلام کی بالغ نظر حکمتِ اسلامی، اور ژرف نگاہ تدبیرِ سیاسی کی یہی داوید اوتھے؟ کیا چونکہ مولانا آزاد نے ننگ و جودِ مسلم لیگ کی طفلانہ زارنالی اور شرناک ذبوں کاری کو سر پائے استحقاق سے ٹھکرا دیا، اس لئے وہ (نعوذ باللہ من ذلک) کافر قرار پائے؟! ہیں مسلم لیگ کے دارالافتاء کا معیارِ تعقیق اور اصل الاصول کفر و ایمان اچھی طرح معلوم ہے! یعنی

ہر کوئی ذراست کافر شیعہ اند!

ہم اپنے سامعہ تجلیل میں عظیم الشان ابوالکلام کی زبانِ قادرِ اطلاق کا یہ اعلانِ اذغان گوش زد ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں:

کفر جو سننے، گزاف آسان نشود! محکم تراذایان من، ایماں نشود! در دہر جو سن یکے، دآں ہم کافر! پس در دو جہاں یکے صلاں نشود!

(۱-۱-خ)

## جنرل نیل کا مجسمہ عبرت!

جنرل نیل، جو غنڈہ شہ کے اک بھلا لڑی ہیز دتے، کانگریسی

## احسن کلمہ

دو دہائی تک ماؤنٹ روڈ، مدراس، کی اک عام گزرگاہ اور نمایاں نظر گاہ پر گویا اہل شہر کی چھاتی پر سوار تھے، اب خیر سے اُن کی سنگی نقشہ گورستانِ عجائب خانہ میں منتقل ہو گئی ہے، جہاں اُن کی ہشتاد سالہ روشناسی کو چہ و بازار اب تا قیامت اک گوشہ گنمی کی حیا زہ نش بنے گی! ۱۰

بس کن ذکرِ ناز کہ دیدہ آرد رنگار چمنِ قبائے قیصر و طوفِ کلاہ کے! جنگی خود نمائی، سیاسی ہشہمار بازی، اور قریب پرستانہ لفظی کے اور جتنے مظاہر و مناظر، خدا کی پاک زمین کو ہنوز بدمنا کر رہے ہیں، غالباً ایک مزید عشرہ سن کے اندر، جنرل نیل کے بت کی طرح، لحدِ سپری میں پہنچ جانے والے ہیں، افسانہ یزم و انجمن چیزوں کا چند روزہ نمود و نمائش کے بعد اس انداز سے اک سوختہ پھلجھڑی میں خاکستر ہو جائیگی دیدنی عبرت ہے! اللہ اللہ، جنرل نیل کا گرائڈیل جرنیلی پکیر، اور آثارِ قدیمہ کے قبرستان میں اک گوشہ لحد کا دریوزہ گر؟! ۱۰

دیکھنا اسے اہل عبرت! انتقام آگیا بننے میں جامِ گدا خاکِ سرفروز سے! (۱-۱-خ)

## کانفرنسِ عجائبِ خاسنات!

کانفرنسِ عجائبِ خاسنات ہند کا اجلاس دہلی، گزشتہ ماہ کا اک قابل ذکر واقعہ ہے، کانفرنس مذکور کا سابق اجتماع یا دش بھیر ایکسپو صدی اواخر ۱۹۱۲ء میں بمقام مدراس عمل میں آیا تھا! ایک پورے قرن

لیکن قسمت کی ستم ظریفی اور مادی مشقت کی برابری یہ ہے کہ خود مادر کانگریس اُسے ہنوز اپنا خجیب الطرفین جگر گوشہ نہیں سمجھتے وہ اپنے اس (ہ خیال خویشت) مجہول الغیب بچے سے اپنی گود خالی کرنے کے ورپے نظر آتی ہے! اور شاید عہد قدیم کی فراموش شدہ رسم دختر کشی کو تازہ کرنا چاہتی ہے! — ہم کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی دختر کسن کو زبان حال سے یہ تلخ نوا شکوہ سنی کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ روزے کا شوق اذاسمار اشقت وال دم کو بود اذ الجوم انکدرت من دامن تو بگیرم اندر عصا پُرس من! ہا ہی ذنب قدرت! لعل یہ ہے کہ مسلسل دو سال سے کانگریس ہمارا جانی بن نوجوان ہڈا دھرا کی دو جیت صدارت میں ہیں۔ ہمارے مشاڑ الیہ راشٹرتی جو ہلال ہنرو میں! — اُنہوں نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو اپنی جیتی اندرا کی طرح گود بھی لے لیا، تب بھی اس مادر شفق نے اُسے اچھوت کنیا ہی سمجھا! بڑے بڑے برہمن کانگریس اُسے کانگریس پنڈال کے چوکے میں ایک نظر دیکھنا نہیں چاہتے!

تاہم یاد رہے کہ بزرگان کانگریس کی یہ بھری و دیر آشنائی اپنا قدرتی دوزخم کر چکی ہے! یہ کسی بعید مستقبل کی بات نہیں کہ کانگریس ہمارا جانی کو اپنی راج گدی اپنی اس ننھی راجکار سی — کانگریس سوشلسٹ پارٹی — کے لئے خالی کرنی پڑے گی! اور وہ ہندوستان کی مجلس تاریخ میں سوتیلی ماں کے میوہ جلا کے کی اک افسوسناک فطیر چھوڑ جائے گی اسے

ہوشیار، اپنی متاعِ ربیری سے ہشیار لے خلس نا آشنا پیری و شبیہ ہر زہ کاڑا اڑ گیا دوسے نگار آسمان سے رنگِ خواب جھللاتی شمعِ رخصت ہو کہ ابھر آفتاب کا کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب میرا نعرہ، انقلاب، انقلاب، انقلاب! بایں ہر ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ نیشنل کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی

کی باہمی آویزش مزید کاوش اختیار کرے، بقول پنڈت جواہر لال کے بالفعل ملک کی عام و ختم و کار آزموہہ خلیج فوج کانگریس ہی ہے، اور جب تک کہ اُس کے ہاتھ میں پیکار آزمائی کا یہ پرچم ہے، نوجوان گروہ کو بھی اس کی متابعت نیز سب سے عار نہ ہونی چاہیے! لیکن ایک حقیقت ہماری اس سیاسی جدہ ماجدہ کے بھی گوش گزار رہے، کہ ہندوستان کی نجات کا مسئلہ اک دو گزہ معرکہ واقع ہوا ہے! — ایک ہندوستانی مقہوروں اور برطانوی قیصریت پرستوں کے درمیان، دوسرا ہندوستانی محروموں اور ہندوستانی ہی

میں بیداری کی کلمہ چار کر دیں لینا، اس میں شک نہیں کہ کلید بردارانِ آئندہ قدیمہ اور مجاورانِ محاب خانہ کے شایان شان ضرور ہے! لیکن جدید العہد ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کے مقتضیات کے لئے یاں انگیز بھی درجہ غایت ہے! تاہم اب یہ شکر خرابی اور گراں گشتی زیادہ ممکن نہیں۔ ایک طرف خاکِ وطن کا ایک ایک ذرہ انگڑائی لے رہا ہے دوسری طرف خود مادرِ وطن اپنے لہن کے اسرار و آثار تاریخی کو اچھا رکھی ہے، ہمارا دوسرے سخن ہر پا اور موسیقی درو کے لاشانی انگشتات کی طرف ہے! — جو چالیس قرون قبل کے ماضی بعید کے ہندوستانی مدن و عمران کا ایک ہوشربا منظر دکھاتے ہیں! نیز ہندوستان کی تہذیب کو عراق و بابل کی یادگار شائستگی سے ہم عصر ہم آغوش ہونے کی سہیت کرائی سے پیش کرتے ہیں! الغرض اب ہمارے ہندوستانی محاب خانوں کے خوابیدہ فرش، بیداری و سرگرمی کی اک زنجیر سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے! اب تک ہمارے "میوزم" نوادہ کھنڈ کے مردہ نقش خانوں سے کچھ ہی بہتر رہے ہیں! — جہاں کبھی کبھی دھڑکی جوائی شہر کے دہقان، مویشی کے اک پیگے ہوئے گلے کی طرح آگھستتے تھے، جنہیں ہستم محاب خانہ اپنے بھان متھ کے کنبے کی مناش سے سہوت کر دیا کرتا تھا! محاب خانے اپنے اصلی قدنی معرفت و منصب کے لحاظ سے ملک کی تاریخ و ثقافت کے مراکزِ تعلیم واقف ہوئے ہیں! ہمیں امید ہے کہ ہمارے قدیم تاریخی اور بزرگ باشرعی وطن کے محاب خانے اپنا یہ موقف بعد از جلد حاصل کرنیکی جدوجہد کریں گے، اور پائے تخت کی حوالہ بالا "میوزیم کانفرنس" اس مطلوبہ عہد کو فاتح باب ثابت ہوگی!

ہوتا ہے جاہ و پیامبر کارواں ہمارا!

(۱-۱-خ)

## نیشنل کانگریس اور ہندوستانی سوشلسٹ جماعت

انڈین نیشنل کانگریس کے شکمِ مادری میں ایک عرصے سے اک مولودِ نو کی ولادت کا شدید دُوروزہ اپنے سارے شش کے ساتھ نایاں نظر آتا ہے! ایک سنی کر کے اس بچے کا وضع محلِ عمل میں بھی آچکا ہے، اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی صورت میں یہ طفلِ نو زائید ہمارا کافی روشناس بھی ہو چکا ہے!

”سوشلسٹ پارٹی“ کی منتظر موقع موجودگی میں کانگریسی حاکمین وزارت و حکومت سے برطانوی قیصریت کا بگاڑاک خوریز انقلاب کی دعوت کے ہم معنی ہوگا؛ یادش بخیر نامزات انڈیا جو کانگریسی وزراء کے دفنائی و مناتب میں یوں رطب اللسان ہے، وہ اس قدر نخب علی نہیں ہے جس قدر کہ لجنہ العادۃ“!۔

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دورت کا کھاؤں فرب  
آستین میں دشنہ نہاں، ہاتھ میں خنجر کھنڈ!

(۱-۱-۱) (خ)

## پریزیڈنٹ کا دورہ آسام!

ہندت جواہر لال نہرو، صدر انڈین نیشنل کانگریس نے گزشتہ ماہ ہندوستان کے منہائے مشرق و شمال کے گوشہ آسام کا دورہ کیا۔ کانگریس کے اس صدر نے اپنی سابقہ دو سالہ صدارت کے دوران میں کانگریس نڈال کے اندر معلوم صدر نشینی زیادہ کی ہے، یا برعکس ہند کے میدان و کوہستان میں گرداوری زیادہ! کانگریس نے صرف چند روز کے لئے جواہر لال کو اپنی مسند صدارت کی عزت بخشی، لیکن خود جواہر لال کی فراہد صفت کو کھنڈیوں اور قیس مثل صحرا گردیوں نے اس مسند کو اک ابدی ششیں غلٹہ و جلائے بنادیا؛ آج وسیع و عریض ہندوستان کے دشت و دوز کا چپہ چپہ جواہر لال کے دامن گردش گنن قدموں کے مس سے گونج رہا ہے!۔

سچی ہم ہے نشان قیس نشان کو بہن  
عشق نے آہا و کر ڈالے ہیں دشت کو بہا

اس نازک بدن، لیکن حقیقتہً روئیں تن“ مرد جوان کے اس زمین آسمان کے قلابے لانے کی کوئی حد ہے، ہمارا یقین ہے کہ اگر مستقبل قریب میں کوئی آل ایشیا یونین کا خواب ہار و بر تعبیر ہوا تو اس کی سرکردگی و کارواں سالاری بھی ہمارا جواہر لال اتنی ہی چابکدستی و سبک پائی سے انجام دے لے گا، جس سے اس نے کسی شہر الہ آباد کی میونسپل کارپوریشن کے کاروبار کی سربراہی کی تھی!۔

نگاہ رو بردارے رُوح غلٹہ داریں  
بہوش باش کہ یزدان شکار ہیں ہم لوگ!

سرباہ داروں کے مابین! لڑجوان گروہ کا شکوہ و شبہ یہ ہے کہ قدامت لڑاؤ بزرگان کانگریس، ہندوستانی جنگِ حریت کو دوسرے خطہ جنگ تک متجاوز ہونے دینا اپنے ذوقِ رجعتہ کس لئے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں پاتے؛ اس طرح اُنکا جو کچھ مسلح نظر ہے وہ برطانوی خداوندوں اور ہندوستانی ”ہندوگانِ عالی“ کے درمیان اک استعلا اقتدار سے زیادہ نہیں ٹھہرتا؛ اپنی فطری ماہیت کے تقاضے سے یہ ماجرا ان فریقین کے درمیان ”شرکتِ بالِ لہیت“ کا بن جاتا ہے!۔ درآئیں لیکہ ہندوستانی قوم کا سواؤ اعظم ——— کاٹھکاران و مزدوران و عام عوام و مساکین ——— خارج البلد ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بد بخت ہندوستان صرف آقاؤں کے مبادئے کے لئے لڑا تھا؟ اگر نتیجہ بھی اور اتنی ہی تھی تو اس کے معنی نہ صرف یہ ہوتے کہ اسی خلق اللہ کے کچھ ہاتھ نہ آیا، بلکہ اُس نے دوسروں کی تاج پوشی کے لئے اشکارا بذر فریبی بن کر یہ سارا عرق ریز اور خون سوز مجاہدہ تسلیم انجام دیا!۔

کٹ مرانا داں خیالی دیوتاؤں کے لئے  
سکر کی لذت میں تو لٹا گیا نقدِ حیات!

تاہم ہیں مستقبل کے مقدرات سے یہ خوف نہیں؛ انقلاب، عوام کے لئے آتا ہے نہ کہ خواص کے لئے؛ مانسون کی طوفانی بارشوں کو اگر اُمرا اپنے من خالوں کے حوصلوں میں مقید کرنا چاہیں گے تو صرف اپنے ان تنکِ ظرف آبدار خالوں کو دریا برد کریں گے؛ مناسب یہی ہوگا کہ ہمارے عمر رسیدہ و چناندیدہ اکابر کانگریس، جہاننی کے خط و خال کی شکنیں اپنی ”جبین دولت“ پر زیادہ نمایاں نہ کریں؛ اور ملک کی ٹکٹن الاحزاب و مذہبی جنگ (Religious Communalism) کو وطن کے بیرونی معرکے سے پہلے دعوت نہ دیں!

”سوشلسٹ پارٹی“ کو بھی خود کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت ہے؛ ذرا سنجہ الاعتقاد و رباب کانگریس کو اُن کے وجود کو تحمل کار یا مخرب تعبیر سمجھنے کا موقع؛ ہماری کانگریسی حزب الاشتر اکین“ بحالت موجودہ کانگریسی وزراء کی بہترین محنت ہے، کانگریسی موبجائی حکومتوں کے اصلاحی و معاشی ہمت کے لئے اک مسلسل تادیب ہے، اور ڈکٹیٹر گورنروں اور منتخب وزیراعظموں کے درمیان جمود کو روکنے کا اک بے خطا آلہ!۔



## مطلع عالم

ڈاکٹر سید حسین نے راجس کالج ہال، دیرا گنج، دہلی میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن "جمعیتہ الطالبہ" کے زیر اہتمام اک اجتماع کی تقریب سے مارو سبر گزشتہ کو اپنی اک برق پاش تقریر میں لمحہ حال کے سیاسی مصلح عالم پر سیر حاصل روشنی ڈالی؛ لیکن کچھ حاصل حسب ذیل ہے:

دنیا پر جنگ و بیکار، اضطراب و عدم اعتماد کی اک مژمن بیماری مستولی ہو گئی ہے؛ جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کی غنی و آتشین روشنائی سے لکھے ہوئے بن کیسرفراموش ہو گئے ہیں؛ انگلستان کے سابقہ چند روزہ قیام و گشت کے دوران میں یہ تحیر انگیز منظر دیکھنے میں آیا کہ شہروں کے کچھ دباؤ دار نوجوان آبادی سے تمام و کمال ویران ہو گئے ہیں؛ پُر امن ممالک عالم میں بھی اک نفسیاتی حالت جنگ کی فضا طاری ہے، اور ایک ایک نوخیز برودوش مسخ کیہوں سے پابزنجیر ہے؛ اس وقت خطرے کے تین نسلے ہیں:-

(۱) اسپین:- جہاں اسامہ سٹاک "مدنی جنگ" جاری ہے لیکن جو عملاً اک بنی الیور دلی مجاہد ہے، بلکہ اک بنی الا قوامی معرکے کا میدان کارزار بنا ہوا ہے؛ فضا کے عالم میں اک سنگین مدنی نزاع درپیش ہے۔۔۔ کیونکہ یافا، یسرم، ایک لاکھ ایٹالوی سپاہی اسپین میں موجود ہیں؛ اور جرمن عساکر اس پرسترا د ہیں؛ دوسری طرف روسی سرفروش ڈو آرش جان ہارڈ اور مختلف اقوام عالم کے رضا کار جہود یہ سپاہیہ کے معرکہ عام مجاذق "پرسبہ سپر ہیں؛ اک قیامت کی دستخیز خوریز برپا ہے، جو روز قیامت ہی کی طرح طولانی و غیر مختتم ہے۔

(۲) اٹلی اور جرمنی، سوویت اور ہٹلر بلاشبہ بڑی تہار و جہاں ہستیاں واقع ہوئی ہیں، تاہم ان کی آمرانہ نادر شاہی نشینیں بڑی نازک اور سترزل پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ قیصر جو لیس کے خلف الصدق، سیناروینی اپنی "بنی مبارک" ہی ان شب دروز کی افتادوں کی نذر فرما چکے ہیں؛ جلیل القدر ہٹلر اشارہ اللہ ۲۰ ارکان ہاڈی گارڈ کے حصار حراست میں رہتے ہیں اور ساری نقل و حرکت، خطرناک زمین سے بالا بالا کر ہوائی میں بذریعہ لیارہ عمل میں آیا کرتی ہے؛ یہ دولوں فرنگتانی آتش زن ہیں

ہم حیران ہیں کہ جو آبرلال، بال ہوا پر پڑا ہے یا دوش برق پر پروا — وہ آج آسمان میں ہے تو کل صوبہ سرحد شمال و مغرب میں تھا، اور پرل برتا دلا یا ہیں؛ وہ سج پچ ہمارا "مخدوم جہانیاں جہانگشت" ہے؛ — ایسی شیعہ محفل؛ یہ نوز و نگداز تن و جان!!، اور ایسی شیل جام گردوش مدام؛ فیضی؛ احسن اذین عشق کہ دوراں امرہ

گرم دار و دتو ہنگامہ رسوائی را! ہمارا دعویٰ ہے کہ جو آبرنے تن تنہا مغرب کے سارے ڈکٹیٹروں کو سرگرمی و گرم گامی، اضطراب و اضطراذ، شکیبائی و برق دوشی کے میدان میں ہر اصل پیچھے چھوڑ دیا ہے؛

ہم ہیں وہ گرم بدواہ و فاجوں خورشید

سایہ نمک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو!

کانگریس پر یڈنٹ کامونوی ذکر دورہ آسمان بعض معنی خیز اور انقلاب انگیز مظاہر و مناظر دکھتا ہے؛ باوجود غیر کانگریسی صوبہ ہونے کے آسمان میں ان کا استقبال کانگریسی قلمروں سے بھی کچھ زیادہ شاندار ہوا، سرزمین ہند کے اس بعید گوشے میں ان کا خیر مقدم سج و جہاں کے "بے تاج کے بادشاہ" کی طرح ہوا؛ انہیں ریلوے اسٹیشنوں، پبلک مقاموں اور ان کی بجی فرو دگا ہوں میں "خوش آمدی" کہنے والوں میں، بلا تفریق غیر سرکاری و سرکاری لوگ، ہندو و مسلمان فرقے، ہندوستانی و یورپین طبقے، اور مرد و زن کے صنفین یکساں شریک تھے؛

دو عالم نقد جہاں بردست دارند

بہاؤ دارے کہ سودائے تو باشد!

لطف یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی ذہنی طور پر "پردہ نشین" آبادیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، ان سے براہ راست خطاب و کلام کرنے کی اجازت بلکہ دعوت اس مرد حق و حریت کو دی گئی؛ پھر نہ صرف لوگوں نے اپنے چشم و گوش ان کے پیام جہاں ناز اور ان رُوسے عشق خیز پر نثار کئے، بلکہ گراں قدر رقوم کی تختیاں ان کے حجرے میں دیں؛ آسمان کے مسلمان بھی اپنے تن من و دھن کے ساتھ اس بجوم عشق میں شریک تھے؛

کشتے کہ عشق دار و نگدازوت بدنیماں

ڈانٹا میٹ کے انبار لگا رہے ہیں، جن میں صرف ایک چٹاری جبال نازہ میں منتقل کر دے سکتی ہے، ذیلی طور پر مشرق قریب کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، جہاں بعد جنگ کے ایک کیمپ منصوبی واستبداد کو شظیفہ نے انبیاء و رسول کی خاک سر زمین، فطین، کو اک جوش زن۔ دو گاہ آتشیں بنا رکھا ہے۔

جلدہ زار آتش و دوزخ ہمارا دل سہی  
فتنہ شور قیامت کس کے آب دہل میں ہے؟

(سچین) یہاں شاید بلا استعارہ ایک قیامت کبریٰ گرم ہے: غلیم چین، ہم کرور خلق اللہ کی ہم آہنگ تنہا جامعہ بشری ہے: چند لاکھ چینیوں کے مقبول یا چند چینی علاقوں کے مفتوح ہو جانے سے یہ ظلمت نا پید ان رعبور نہیں کیا جاسکتا: پس مشرق بعیدہ کا چینی عہدہ مشرق غالباً مدت دراز تک لالہ زار بنا رہے گا: جاپان کو جوع الارض کا موزی مرن بڑی طرح عارض حال ہے: تاہم ستر طر فنی یہ ہے کہ

تیغ اور جزیرہ سینیہ یاراں نہ نشست!  
دوسری طرف مشرق کا دوسرا غلیم ملک — ہندوستان —  
ہنوز برطانوی دولت مشترکہ افوام کے شاہی دندان کا عروس اور امیریزیم کے دام کا اسیر ہے۔

یادش بحیرہ برطانیہ غلیم جنگ غلیم سے قبل کے تاریخی دور میں دنیا کی غلیم ترین بحری، تہی، دسانی، مالی، صرافی، اور اخلاقی قوت تھی، لیکن صرف دو عشرت سن میں جو دیدنی انقلاب بھور میں آگیا ہے، اُس کا نقشہ یہ ہے کہ انگلستان آج امریکہ کا مقروض ہے — اور اکت ناوہ مقروض: بحر قزاقے جنگی کے اعتبار سے انگریزی ملکہ بحر، نو دولت امریکہ کے ساتھ ہم نشینی کی پستی انگیز کر چکی ہے: پھر جنوبی امریکہ و مشرق جیدہ کی غلیم زریز تجارت گاہیں ریاستہائے متحدہ اور جاپان کے ٹوک انجار کے نام، اعلیٰ خارج ہو چکی ہیں: وادی نیل اور وادی گنگا کی کاہنائے تجارتی بھی جزوہ انگلستانی "فرہا و تجارت" کے تیشے کی زو سے پرے نکل چکی ہیں: مشرق ادنیٰ کے مطلقہ سیاسی میں برطانیہ کا زوال اقتدار قار اک عبرت آموز ماجرا ہے: برا غلیم یورپ میں انگلستان غلیم کی جو ہوا خیزی ہوئی ہے وہ اب اک طشت ادبام رسوائی ہے، وہ لاف خراٹھی اور اعادہ شباب یافتہ جرمی کی سسل لکد کو بی کی ہدف اک نقش تجس بنا ہوا ہے: یہ

غلطہ و جبروت یزداں را بسبب انقلاب روم و الماں را بسبب: تاہم معذور و معزول انگلستان کے معنی اک آزاد تاج پوش ہندستان کے نہیں: یہاں اک مدائے غفلت شکن رسید کرنے کی ضرورت ہے: بہترین بیرونی و بین الاقوامی نقشہ بساط سیاست بھی ہمارے لئے کوئی ذہین موقع نہیں ہو سکتا: شاید یہاں لسان الغیب غالب ہمارا خیر راہ ہے، جب کہ وہ کہتا ہے کہ

انہی سستی ہی سے ہو جو کچھ ہو! (۱-۱-خ)

## جنگ چین!

فی الحال تو چینی افواج، جاپانی چنگیزوں کی یلغار کے سبیل بے پناہ کے سامنے خس و خاشاک ہو کر بہہ گئی ہیں: — اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ موجودہ آذربائش پہلا موقع ہے کہ جود و سکوت کے انیون لاش چینیوں نے حربیت و عسکریت کی شراب دوا تشر سے بدست جاپانیوں کا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے متعدد معرکوں میں سامنا کیا، مارشل چیانگ کا فی شیک کے روح پرورد جو دے ناٹنگ سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی پائخت کے حصار کے قلعہ بند چینی لشکر نے مسلسل ایک ہفتے تک شبانہ روز حملہ آور غلیم کی اثر و دم توڑوں اور بلائے آسمانی لیادوں کی برپائی ہوئی قیامت میں جو آتش و خون کا غسل کیا ہے، وہ تجدید چین کے شاندار رزمیہ کا عنوان بھی ہے: آئندہ کے متعلق بھی چینی سرعمر، مارشل چیانگ، کے اعلان کی رو سے چینی شطرنج جنگ کی بساط کا مجوزہ نقشہ یہ ہے کہ وہ شہروں اور مندن مرکڑوں کے بجائے دیہات و مضافات کے کھلے میدانوں میں قرآنی جنگ کے مضروبے رکھتے ہیں: — جبکہ جاپانی افواج وسیع مفتوحہ علاقوں میں منعم و منتشر ہو جائیں گی، اور اپنے خطوط مواصلات کی حفاظت اور اپنے غیر کرکٹا لشکر کے رات کی بہر سانی میں مخصوص شکاریوں سے دوچار ہوں گی، چین کی "سرخ سپاہ" اسی موقع پر خون کی اک ہولی کھیلنے کی منتظر ہے۔

پھر جنگ چین و جاپان میں اس وقت تک متعدد بیرونی مداخلتوں کا بھی احتمال ہے: اپنے جہازوں پر حال میں جاپانی درست درازی ہونے پر امریکی اور برطانوی حکومتوں نے جو سختگیرانہ لٹ لکھ کر رسید کئے ہیں،

میں بر ملا سی نظارت خارجہ کو بھی شریک سازش کر کے، پیرس کی بدنام ہو رلا دہلی سجادیز معرین تشکیل میں آئی تھیں! اور جن کا منشا یہ تھا کہ اب جبکہ مالی مسروقہ خانہ رہزن کو منتقل ہو گیا ہے تو پھر مقصد را درون خانہ چہ کار؟

ان، چین، حبش کی طرح نہ حقیر و ناچیز ہے، نہ منقطع و گوشہ گیر، نہ بے وسیلہ و سہرس، نہ محروم حکومت نیابتی، نہ آشنائے عوام قومی بغیل اس کے کہ ہم چین کا آخری انجام دیکھیں، ہمیں بہت کچھ دکھانا ہے! صورت آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ! شورش امروزی میں مجھ سرود و دوش رہ!

(۱-۱-خ)

پھول مُٹھی میں اگر کچھ دیر تک رہتے ہیں بند

ہات میں ہوتی ہے پیدا اک معطر سی نمی

یونہیں جب کچھ دیر کرتا ہوں تصورِ حُسن کا

سانس میں ہوتی ہے خوشبو، اور آنکھوں میں تری

اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جاناں نے مجھے

بھینچ کر آغوش میں تاویر چھوڑا ہے ابھی

(جوش)

## ضروری طالع

ہندوستان کے ہر دلعزیز رسالہ کلم دہلی کی سول کھنٹی امرت سر میں ناردرن انڈیا سٹیٹ سروس جبر و ہال بازار امرت سردالوں کے پاس ہے۔

ان میں اپنی زور آزمائی کے لئے اک جلد جوئی مغربی جاکتی ہے۔ آگے ہاکے چینی پابنوں میں اس ستر کے مزید غنی، حوادث میں آسکتے ہیں، اور انگریزی، امریکی جاپانی مُٹھی تصادم کے آثار کو قریب ترک دے سکتے ہیں، سر زمین چین میں اپنے نوناگوں تجارتی و تمدنی منافع و مصالح کے تحفظ کے لئے یہ آخری مُٹھت ہے اپنی کا لقمہ تر ہنوز جاپان کے صحن میں ہے، لیکن بہت جلد وہ چین کے ڈرگین کے معدہ چیمپ میں مغمم ہو جائے گا! سویت روس کی مُٹھت آزمائی بھی شاید ان خیالات میں اپنے تذبذب کو ترک کر دے! چینی جاپانی چپاک میں اُس کی انگلیاں کودے تو روزِ اول ہی سے ہیں، حال میں کثیر التعداد مزید طیاروں کی چینی کارزار میں ارسال، نیز ماسکو کی شہ پر چینی شیرازہ حکومت و سیاست کی ترتیب جدیدہ جس میں قوم کے سوادِ اعظم کے اعراض و مقاصد کی رعایت اُس کی خصوصیت خاصہ ہوگی، — اک معنی خیز اقدام کے پیامبر کی طرح سموعہ ہوتی ہے! چین کے اندر روسی پیام کیونرم کی راہ میں جیانگ کانگ شیک کی غالی قوم پرستی بدقوتوں سنگ راہ رہی ہے! اب بعد خرابی بسیار وہ چینی دلدل کا ٹوسلزم کو ملت کا اک چوہا لا ینفک تسلیم کرنے کے آمادہ ہوا ہے! شاید یہ رو براہی بعد از وقت ہو، تاہم یہ بتا خیر علاج کا بھی غیت ہے،

ابھی تک انگلستان و فرانس، بحرِ اَروم اور اسپین کے معلومہ حالات میں گرفتار رہے ہیں، روس اپنے داخلی فتنہ بیدار سے پریشان رہا ہے؛ نیز جرمنی و آلمانی کی طرف سے اک بیرونی حصے کی تہدید کی خبر گرم سے حیران؛ روس و برکن کا خطبہ سیاسی جو آنا نانا کو گونام وسعت پذیر ہو گیا ہے، اُس نے ان تمام ایام میں سوویت روس کو لرزہ بر اندام اور اُس کا خطاب و خور حرام رکھا ہے! تاہم انگلستان و امریکہ کی شرکت کے بعد بسا و سیاست اُلٹ جائے گی! اُس وقت سولینی و تبار کی تیس مار خائیاں انگشتِ جبرت دروہا رہ جائیں گی! پھر یہ بھی نامکن نہیں کہ سرخ روس کا ایک ہی آخرین جھینڈا جاپانی چہرے کو فتن کر دے۔

بس مکمل ابھی ختم نہیں ہوا ہے! اگرچہ جاپان کی مغنی آرزو یہی ہے؛ فتح نامنگ کے بعد جاپانی افواج کا حُسن و حکم کر کشائی، نیز جرمنی کی جانب سے بحیثیتِ وسیلہ کے فریقین کو پیشکشِ صلح، ان سب باتوں میں ہی عذیر کو خاطر نظر آتا ہے! جرمنی، چینی، جاپانی ڈرائے میں شاید وہی "رولی" کھیلنا چاہتا ہے جو حبش کے اسٹیج پر موسیلا دہلی نے کھیلا تھا، اور جس جنگِ درگری

# نقد و نظر

(۱) گل فروش ، دہلی

پایہ تخت کے اس منظور سیاسی و ادبی ہفتہ وار پر عرصہ ہوا ہم نے ایک ہرگز رپو بول کیا تھا، صرف یہی نہیں کہ وہ سلی نظر ایک عین تر جاز سے بدلی جانکی طاب ہے، بلکہ گزشتہ دو تین ہینے کے دوران میں اخبار مذکور کی ظاہری و معنوی حیثیت میں اک نہایت خوشگوار تغیر فہور میں آیا ہے جو اک نظر ثانی کا متقاضی ہے، ہم نگفروش کے صیغہ ادارت و اہتمام کو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ماضی قریب میں اک معتد بہ ترقی و بہتری کی چھوٹی سی ٹیم سر کی ہے، ہمارے ملک کی علمی و ذہنی فضا ادبی صحافت کے لئے سازگار نہیں ہے، پس اس بہت شکن ماحول کے علی الرغم اگر کوئی ہندوستانی رسالہ یا اخبار محض افشاں و خیراں جاری بھی رہے تب بھی کافی داؤ کا سخن ہے! اور اس ریگزار خشک و گرم میں ترقی و سرسبزی کے کسی نخلستان کو نشوونما دے لینا تو اک "جوسے شیر لانے سے کم نہیں، تم گل فروش" کی تازہ نشاۃ ثانیہ کو کچھ ایسی ہی "کوہ کنی" سمجھتے ہیں! جناب محمود مودرخ صاحب بی لے، علامہ ادارت کے "میر کارواں" ہیں، اور نگفروش کا موجودہ دور جدید بیشتر انہی کی کاوشوں اور عرق بزیوں کا ثمرہ ہے، ہم اپنے مجوزہ مفصل نقد کو اب بھی ملتوی کرتے ہیں، بہت جلد نگفروش اپنے اک اپیل نمبر کی صورت میں تازہ گل "کھلونے والا ہے، ہم اس کے گل حسن بسیار سے اپنے دامان نگاہ" کو اسی وقت گل بدامن بنائیں گے یا زندہ صحبت باقی!

(۱-۱-خ)

(۲) (ماہنامہ "تتویر" بمبئی)

چوڑا رسالہ جاتی ساز - ضخامت ۱۰ صفحات، کتابت و طباعت، و کاغذ درجہ اول، لوح منور و رنگین مع دو تین تصاویر آرٹ پیپر زیر ادارت "سحر" صاحبہ، چند ہیہ سالانہ - مرکز اشاعت، ایم عبداللہ بڈنگ،

## اداسٹ کلیم

مقر ڈسٹریکٹ اسٹریٹ، بمبئی ۸۰

یہ اک ذاماعت ذمناۃ ادبی و اصلاحی رسالہ ہے، جو اردو زبان کے کسی قدر شگوار خٹے، مغربی ہند سے شائع ہوا ہے، ہمارے سامنے (بغرض ریویو) اس کا تیسرا نمبر ہے۔

تتویر اس معاملے میں خوش قسمت ہے کہ اس کو ادبی ہندوستان کی بعض ممتاز شخصیتوں کے مبارکباد نامے نصیب ہوئے ہیں، پھر شاعر انقلاب کا منظوم پیام نہایت، جو زیر نظر اشاعت کے صفحہ اول کی زینت ہے، بلاشبہ اک مایہ ناز اثر فخر ہے! صنف لطیف کا عنصر اجتماعی تحریکات کے اسلوب ذمہ میں جو ڈائنامیٹ کی چٹکی اور جو دو گوندہ دم و بزم ہم نپا تا ہے اس کا شکر بیاں دو ایک شعروں میں ملاحظہ فرمائیے!

ہاں یہ عورت ہی میں قوت ہے کہ وہ چاہے اگر

بہن شبنم سے شر پید اہوں، آہن سے گہرا  
رقص کرتا ہے زمانہ عورتوں کے ساز پر

کارواں چلتے ہیں ان کے شعلہ آواز پر!  
تتویر کے صفحات میں اک خاص جان و جولانی کر دہیں لیتی محسوس ہوتی ہے۔ جوش صاحب کے اس شعر میں شاید جائز شاعرانہ جوش بیان سے برائے نام ہی کچھ زیادہ متبالغ ہو گا کہ

اس کے ہر اک حرف میں غلطاں ہے ذہنی انقلاب

دوش پر اس کے ہے روشن عصر نو کا آفتاب!

جو ان بہت سحر ماجہ کی مدد و جہد کا یہ کرشمہ قابل ذکر ہے کہ تتویر کے تحریری حلقہ معاونین میں حضرت آزاد انصاری، حضرت فرق گو رکھپوری، حضرت محمود آسرا نی، حضرت جگر مراد آبادی، حضرت سائر نظامی وغیرہم

شعرا میں حضرت فطرت و اہلی کا میاب نیچرل شاعر ہیں بشتی لغائی مرحوم پر گوری سر نال صاحب جوہری نے، کا مختصر مقالہ بلاشبہ اک اجتہادی لب و لہجہ رکھتا ہے۔ تاہم شبلی کے شاواذ مرتبے کے متعلق اُن کا نظریہ محل نظر ہے؛ اسی طرح مولفینا حسین احمد صاحب کی ایک فرضی سیاسی قلم بازی پر ضخیم عارف صاحب کا احتساب اک نیم حکیارہ "تخصیص سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا" جانشین شیخ الہند ہر ممکن شبہ و دایمہ سے بالاتر اک ذبردست مجاہد حق اور مجتہد فکر واقع ہوئے ہیں؛ عارف صاحب کو ذرا بہتر معرفت حقیقت کا ثبوت دینے کی ضرورت تھی!

(۵) ہندوستان (مفت وار)

ادست اخباری ساز، ۱۶ صفحہ مختصرت، کاغذ و عام گیت آب  
دغیرہ پاکیزہ، چندہ سالانہ سے روز فرہندوستان، ٹیل روڈ وٹسٹو  
ہندوستان اک جدید الاشاعت سیاسی و معاشی پرچہ ہے، اس کا  
مخاطب غزبار و عوام الناس کا طبقہ معلوم ہوتا ہے! تاہم وہ اک عام مطالعے  
کا بھی ہر دل عزیز سیاسی آرگن کہا جاسکتا ہے! علماء ادرت اور حلقہ  
مصنوع نگاران کی اکثریت، یوپی کے مسلم کانگریس میں اور مسلم سوشلسٹ  
میں، جن کے سامعین اصولاً و عموماً مسلمان غزبار و محمدین میں! ہندوستان  
یوپی میں کانگریسی تحریک دربارہ قیامت رابطہ عوام مسلمین کا علمبردار ہے!  
اپنی زبان و بیان، انتخاب موضوعات، اخذ و تفسیر اخبار و معلومات وغیرہ  
وغیرہ کے اعتبار سے وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوتا نظر آتا ہے! خدا  
ہمچیں گنا! ذریعہ نظر میں مبین احسن مذہبی کی نظم ہلالی عید اشتر کی ادب  
کا احیا پارہ ہے! (۱-۱-خ)

(۴) کاروان پنه

منہاجت سوم صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت خاصی خوب۔  
چندہ عر سالانہ، پتہ۔ کارواں بکڈ پو۔ دفتر کارواں، بانگی پور۔ پٹنہ۔  
کارواں اک خاصا کم خرچ بلا نشین ماہنامہ معلوم ہوتا ہے، مضمون نویسوں یا افسانہ  
نکاروں میں جناب امیر آسم صاحب، جناب عبدالباقی صاحب، بی۔ اے (جامعی) اور جناب  
آخر قادری بی۔ اے (آرٹس قابل) ذکر ہیں؛ کارواں کا یہ مہینہ افتتاحی نمبر ہے آثار  
انقلاب کی اک عین فلسفیانہ نظم۔ راجو کاوش کی اسیں اشاعت، کارواں کے طر  
ماہ اول کو طے کرنے کا اک ایسا طریقہ ہے جو سالانہ آشنائی راہ و رسم مہینہ

ایسے خواص و انکار ایسی سے شریک ہیں؛ خود شہرِ تنبیہ کے اندر تنویر و ہاں کے  
بہترین ادبی قلم کاروں کی ترجیحات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ چنانچہ  
حصہ نثر میں جناب عبدالحی صاحب "و دیارِ ستمی" اور جناب مہر محمد خان شہاب  
، لبر کوٹلوی کے علمی و ادبی مقالے متنازع چیزیں ہیں۔ خود سحرِ صاحبہ کی "صوفیہ"  
"نگارِ شین اک" ادبی سرچہ کی "برق و دم" نثر کارِ بیاں ہوتی ہیں؛ "تابِ مدبر"  
کے ترجمے اور شذرے، "دنگ و روشنی" کے دلچسپ مُرکب واقع ہوئے ہیں؛  
ہم تنویر کا خیر مقدم پوری گرجوشی سے کرتے ہیں، اور اُس کی ورازی عمر کے  
لئے دُعا گو ہیں!

(۳) پیمانہ میرٹھ

در میانی کتابی فامست، کاغذ و کتابت و طباعت پاکیزه و ضخامت ۵۰ صفحات، مع متعدد تصاویر آرٹ پیسز چندہ سالانہ .....  
شائع شدہ ادبی مرکز، میرٹھ.

جناب مصیبا کی براہ راست ادارت میں، اور حضرت سائغ کی سیاسی سیادت میں،  
یادش بخیر، نیناد اکبر آباد کا سابق "پیانہ" اب ادبی مرکز، میٹرک کی ہزم رندان  
کے اندر دوبارہ "گروٹس" میں آیا ہے، پیانہ پر بہت سی گردشیں آئیں، لیکن  
اُس کا "دورِ جام" اور سرشار شعر و ادب سائغ کا صحافتی "شربِ بدم" ہمیشہ  
یہی دُر و کرتار باک ہے

جب تک بس چل سکے "ساغر" چلے !  
 "ساغر" کی سرستیاں مہتاب کے ہاتھ میں دو آتش کی شرر غنٹیوں کے منار  
 رکھتی ہیں، اسیانہ کے شذرانی جرمات اور پار این میکہ کی خرابات دور ازل  
 سے بھی کچھ زیادہ شرابور ہے ! بعض چھینے تو پسینوں میں نہا ہی دیتے ہیں !  
 تاہم حضرت "سیاب" کو اب زیادہ مابھی بے آب بنانے سے کیا غائبہ ؟! اپنا  
 کانٹری حقہ بھی عمومی ادبیات کے نام معروف دست ازل شعبوں پر مشتمل ہوتا  
 ہے، یہاں ہم رنگ و بو، اور ذائقہ و تغذیہ دونوں پاتے ہیں ! (اداسخ)

شاہکار گورکھپور

صفحہ ۵۰ صفحات کا نذر و کتابت و طباعت، درجہ دوم کی، منظور و  
 رنگین لوح منقوش مرقع سابق اساطین ادب نثر اردو، چند و سہ رسالہ،  
 شاہکار خاصا متین و مفید رسالہ ہے، اُس کے مضمون نگار، کم و بیش بلا استغناء ایک  
 مسلمہ نامی ادبی رکھتے ہیں، اور موضوعات تحریر بھی عموماً اہم و قیہ پائے جاہیں:

حسین بن جانا کس قدر آسان ہو گیا ہے

# میسور صندل سوپ

یہ چہرے کے رنگ کو تروتازگی، نرمی اور صحت آمیز شگفتگی بخشتا ہے۔  
اس کے مسامات میں اتر جانے والے بالائی کے سے مالا مال جھاگ

چہرے کی جلد کو تمام آلودگیوں  
سے پاک کر دیتے ہیں، کیونکہ میسور

صندل سوپ میوڑ کے شہر آفاق روغن کچی آمیزش ہوتی ہے، اور  
یہی وجہ ہے کہ تمام حسین و جمیل خواتین میسور صندل سوپ کا استعمال  
کرتی ہیں، اس لئے کہ انہیں یہ بھیجید معلوم ہو چکا ہے کہ یہ صابون  
ان کے حسن و جمال کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

میسور صندل سوپ ہر دوکاندار سے مل سکتا ہے  
کوئٹہ سوپ فیکٹری ننگلو

# عروسی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس کے ترتیب دیا گیا، مگر  
اشتہار میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام مخفی شکایات کا ہر  
موسم میں واحد علاج ہے، مخصوص اذکار رختہ فائدہ اٹھائیں، اس لئے کہ ارزن  
تجربہ ہے، اس کے ساتھ چار چیزیں موسمی، نباتی، اعلیٰ دبی، اعلیٰ اور ہمراہ ہیں،  
جن کی تفصیل اور ترکیب استعمال خزیدار پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سوٹ عروسی  
کا ہفتہ بھر کو کافی ہوتا ہے، جس کی قیمت صرف ایک روپیہ سبز رہا آنہ عروسی  
مقرر ہے علاوہ محصول ڈاک، اکثر تین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔  
صاحب فرمائش نام و پتہ صاف اور خوشخط تحریر فرمائیں

المش  
شفا خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

# آم کے آٹھ گٹھلیوں کے دام

مریضوں کی شفا یابی کے لئے یہ نایاب رعایت رکھی ہے کہ یک مرتبہ دوائی خانہ  
کی صداقت اور آٹھ گٹھلیوں اور یہ کا استعمال فرمائیں مشک آنت کہ خود بوبید  
نکھ عطار بگوید، محافظہ حکم حیات اعمال، دافع خارش، تریاق جربان، انہی  
پائیریا، سستی مار، قاتل سوزاک، سفید سنوائ، اکریم سسل، وٹمن چینل، زوال  
سعال، حسن پوست، شبابی خضاب، موت بوا سیر معمل، دافع دمر، اکسیر  
دمہ، سچائے چشم معمل، جلا، نزلہ، رستی طلا، اور ایک عدد اصلی پائٹاچ کی  
قیمت صرف تین روپے علاوہ محصول

بصورت عدم شفا یابی دوا دوبارہ مفت کی جائیگی، گھڑی نہ خریدنے کی صورت  
میں قیمت ادویہ صرف عکس ہوگی، اور دوبارہ مفت نہ ملے گی۔

مینجر سیک دوائی خانہ شامی ضلع مظفرنگر

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

## چار پرانی تہ صفا

حضرت جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے، لیکن ان کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی عبادت زدگی کو انہیں شائع کرنے اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گزریں تو مناسب معلوم ہوا کہ ان کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کر کے انہیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

۱) جذبات فطرت { حضرت جوش کی وہ معرکہ آرا نظم ہے جس میں مظاہر اہل کی نگاہ ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کر دیں۔ قیمت ۳۰ روپے رمانتی اور

۲) اوراقِ سحر { کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں قیمت ۵۰ روپے رمانتی ۲۰

۳) آوازِ حق { مدیم المثال، ہیرو اور جنگ حق و باطل کے سب سے بڑے سادہ حسین ابن علی کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک ہنایت درخشاں آئینہ ہے۔ قیمت ۸۰ روپے رمانتی ۳۰

۴) مقالاتِ زرین { ادبی لطائف کا دلچسپ اور کارآمد مجموعہ ہے، قیمت ۱۱ روپے رمانتی ۱۰

پورے سٹک کی رمانتی قیمت ۱۰۰ محصول ڈاک ۲۰ روپی، پی منگانی کی رحمت نہ فرمائیں۔ بلکہ ڈاک کے بمطابق بھیج کر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو، جنتی نو اس نمبر ۴ - دریا گنج، دہلی

## شاعر کی راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور کیفیت آور انداز میں بیان کیا ہے، جنہیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو اسی حوال میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل سب ذیل ہے۔

مست رات - بدست رات - راز و نیاز کی رات - انتظار کی رات  
اندھیری رات - چاندنی رات - جوانی کی رات - تصورات کی رات  
الغامت کی رات - جدائی کی رات - اشکوں کی رات - برسات کی رات  
ربو دگی کی رات - بخود دی کی رات - سرش رات - بھگی ہوئی رات  
تصورات کی رات - بچپن رات - پیا بن ناگ کالی رات  
قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جنتی نو اس نمبر ۴ - دریا گنج، دہلی

## پیشہ اسلام

خدا جہاں سرور کائنات آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قہر کم ہر نگوں ہوتا ہے۔ ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس فانی شاہکار کے انوکھے استدلال میں تیر کی طرح اترتے چبے جاتے ہیں اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل قاطع کے سامنے ادراک منطقی چھٹاٹنا محال ہوتا ہے۔ شاعر انقلاب پر جب ایک سرشاریت کا عالم طاری ہوا اسی وقت اُسوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی، عالمِ بخود دی میں چار روز کی ریاضتِ شاعر اور کیسوی قلب سے جو چھ حاصل ہوا صرف وہی صفحہ قرطاس پر تحریر کیا گیا۔ جب تک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے نہ کچھ کھانا پیا اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے قیمت صرف ۸۰ روپے

کلیم بک ڈپو، جنتی نو اس نمبر ۴ - دریا گنج، دہلی



# ہمالیوں

۱۔ ہمالیوں۔ اتنا پابند وقت ہے کہ جنوری ۱۹۳۲ء سے لے کر اب یہ جاری ہو رہا تھا آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی۔

۲۔ ہمالیوں۔ آرمیل جٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہاتھوں مرحوم جی ہائیکوٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے، اس لئے اس کے قلمبرسی و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصیبت مد نظر نہیں رکھی جاتی۔

۳۔ ہمالیوں۔ اخلاقی اعتبار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں محض اشتہارات، عوامی تصاویر اور محض اخلاق مضامین اور نکتوں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ ہمالیوں۔ کی ادارت جناب سہاں بشیر احمد صاحب بی لے (آکسن) پریشر ایٹ لاکے قبل ہاتھوں میں ہے اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہاتھوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے کیساں جاذب و توجہ ہوتا ہو۔ ۵۔ ہمالیوں۔ کے مضامین محض پراز معلومات ہی نہیں ہوتے بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہاتھوں آپ اپنی نظیر ہے۔

۶۔ ہمالیوں۔ صحت زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔

۷۔ ہمالیوں۔ میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نئلیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

۸۔ ہمالیوں۔ ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، اور ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

۹۔ ہمالیوں۔ کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر دیکھ کر یہ بات کہ جاتا ہے۔

۱۰۔ ہمالیوں۔ کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی ذائد نیت نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے بششما ہی تین روپے، مع محصول ہے۔

اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز

## رسالہ ساربان لاہور

رسالہ ساربان اردو میں ایک بلند پایہ ماہوار رسالہ ہے، جس میں ذہنی اصلاح و تہذیب کے مد نظر سبق آموز نکتوں اور علمی مقالہ کے علاوہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر زبردست فضا میں لکھے جاتے ہیں، ان وجوہات کی بنا پر علمی جرائد اور شاہیر قوم نے ساربان کو اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا ہے۔ رسالہ ساربان میں عشقیہ غزلیں یا ایکٹریوں وغیرہ کی تصاویر قطعاً شائع نہیں کی جاتیں۔

چند سالانہ تین روپے، ہونے کیلئے ۳ روپے ٹکٹ آنا ضروری ہیں  
منیجر رسالہ ساربان لاہور

خاکسار۔ منیجر رسالہ ہمالیوں لاہور



# ادبی دنیا

ملک بھر کے جادو نگار ادیبوں اور شعرا کے بہترین افکار — مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار  
۸۲ دلاویز افسانے۔ مضامین اور نظمیں ۴۸ ہفت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے ملائے محمول

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے (۵) مع محصول ڈاک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجئے ————— سینچر ادبی دنیا لاہور

## ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ تعلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادباء کے جوہرے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو  
کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہوں

اگر آپ اپنے علمی اور ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔

اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں

اگر آپ ماضی اور حال کے شعراء اور ادباء کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں

اگر آپ کم قیمت پر بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

کلیم بک ڈپو جنیتی نوا اس نمبر ۱۰ دریا گنج دہلی کو یاد رکھنے

چند دن کے استعمال سے سفید بال جس سے گلے ہو جائیں گے

## بھنگرہ میرا دل

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سیاہ اور دراز کرنے، گرنے سے روکنے، چمک پیدا  
کرنے، جلد سے جلد نئے بال اگھانے اور بالوں کا انبوہ پیدا کرنے میں کامیاب  
تجربہ شدہ اور منطقی روغن ہے۔ خواتین کے لئے بے پناہ اور نئی چیز ہے۔ ہم  
اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ عرض کریں گے کہ آزمائش کے لئے اولاً صرف ایک  
مہینہ استعمال کے لئے منگوا جائے، اور استعمال سے قبل اپنے بالوں کی لمبائی  
ناپ لی جائے، پھر چند روز کے بعد چائے کی جائے، اتنا کافی ہے کہ ہمارا آئینہ  
غلیظ ثابت نہ ہوگا، اور تحریر کے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔

بائیں خیال کہ ہمارا روغن اپنا اشتہار خود بھی بن جانے کی اہل قیمت لاکٹ

کے برابر رکھی ہے۔ قیمت فی ادھا ۱۲ اتین اد سے عارضہ لکٹ لکٹ

بے کاچہ۔ انڈین اسٹور، بریلی

# شعر کا سب

ش. جگر، اصغر، حسرت، تیر، درد، غالب، موتمن، داغ  
(کے)  
ایک ایک سو بہترین اشعار۔

ہر کسی کو ہر شاعر کا سب کلام پڑھنے اور اس کی شاعری کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اسی خیال سے یہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے، ہر کتاب میں نوور جدید یا ذوق قدیم کے ایک ممتاز شاعر کے تمام مکتوبات اور غیر مکتوبات سے منتخب کر کے بہترین شعر و شاعری گئے ہیں۔ ساتھ ہی سوانح حیات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ کتاب آپ کو اپنی پسند کے میں لگے۔

کسی ساز کاغذ، کتابت، طباعت ویدہ زیب، سرورق خوشنما جس پر شاعر کی تصویر بھی ہے۔

قیمت فی کتاب چار آنے  
نیچر کلیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰، دریا گنج ہلی

دنیا کی صحافت کا اہوار علمی ادبی، طبی "مصور رسالہ"

## ہنسائے صحت لکھنؤ

نمونہ مفت

طیب اور حفظ صحت کے معلومات کا خزانہ، مجربات و اسرارِ مینہ نسخہ علاج کا عجینہ ملک کی جڑی بوٹیوں اور دواؤں کی روانہ انگیز داستان کا دلچسپ مرجع، صنفی معلومات Saeval Science جنسی امراض کے قدیم و جدید انکسار کا بہترین مجموعہ، حکمائے سلف کے علمی فنی کارناموں کا خوشنما البوم، ملک کے شاہیر اہل قلم کے افسانوں و ادبیات سے مست فوٹو آرٹ کی تصاویر سے مزین، کتابت و طباعت ویدہ زیب، ٹائٹل بیچ و فریب، محدثوں کے لئے بہترین ہدایت نامہ، بچوں کی صحت کا محافظ، ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے دلچسپ علمی تفریح، چند سالانہ جنگی طہ منجر ہونے کی صحت و کٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے طلب فرمائیے



## کیش سنگھ امیرائیل

بالوں کو لمبے، سیاہ، نرم اور چمکدار کرنے میں لاثانی ہے، خوشبو و عمدگی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، ہنزائیل ہائیس امیر



سعودی، عہد حکومت، نجد و حجاز سے خوشنودی کا سارٹیفکٹ حاصل کر چکا ہے۔

لاہور نمائش

کیمیکل سیکشن بلاک (ڈی) میں تشریف لاکر ملاحظہ کریں

کاہن سنگھ موہن سنگھ گولڈ میڈلسٹ پرفیومرز کرموں ڈیوڑھی (فیکٹری چہرہ) امرتسر

ریشک منیر

بچوں کا سینٹ  
ایک بہترین تحفہ ہے

اس کے پُر معنی سے لاکھوں کا کھبلا ہوگا

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ ہندو کہ وہ ہم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حرب وخواہ فائدہ نہ ہو تو صلیبی تحریک کا کھیت واپس منگوائیں یہ صورت میں کسی کو پیہ رکھنا نہ سمجھنا ہوں اگر کوئی صاحب اس دوائی سے ابھی فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی قسمت

ضروری اطلاع :- یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامزد ہی ہستی جو ایمان، احکام، سعادت، کمزوری، اور لاعلمی جو ایمان، لکھو، لہو، لہو، لہو کے لئے مخصوص ہے۔ یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں، صحت یا کثرت مہاشرت یا عادت بد سے سب کے لئے یکساں مفید ہے، سوزاک یا آتشک سے پیدا کی ہوئی کمزوری کے لئے اس کا استعمال کرنا طاقت کا ہمہ گراں ہے، اور ماڈرنا نامزد ہی کے سوائے میری دوائی ان کے لئے نہیں ہے۔

ہزاروں تعریفی خطوط و شریکیت موجود ہیں جن کے لکھنے والے عام صاحبان کے علاوہ کئی ذاکر حکیم اور وید ہیں۔ ان میں سے چند اصحاب کے تھے چاکر کو لیتیں ولائیکے لئے نیچے لکھے عبارتے میں جو چار ہی دوائی استعمال کر کے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ ڈاکٹر ایس ایس، ڈاکٹر ایل آر سی، ڈاکٹر ایل ایف بی، ایس ایڈن گامگو، ڈاکٹر شاہ خیرات، ایم ایم ڈی، ایچ حسین آباد، ڈاکٹر بھگت سنگھ، سر محمد یاسین قریشی، بی بی محمدہ 37-11-17 تحریر فرماتے ہیں آپ کی ہر دوا دیات کا استعمال کیا، جنہی تعریف کی جاوے تو بڑی ہے۔ یہ مادہ اثر رکھتا ہیں، آپ برائے ہر بانی ایک علاحدہ نسخہ تعوی گویاں اور روغن ماش طلا بذریعہ بی بی بھیکو شکر فرمائیں۔ سر ڈر ہمدیا رگسینی، ہندت آفتاب نام سب پوشا شکر سانکی، سر نگر گنیر۔ ابو رشید علی بڈن، شیخ محمد احمد صدیقی، بی بی، سر محمد صدیق کیمبرن ہل روڈ سنگا پور بڈلویہ ہوائی ڈاک۔ شیخ اکبر خاں بنگلور، مرزا حاجہ حسن بنگلور، سید میر احمد صاحب اسلام پور ضلع بنارس۔ خان شمس علی خاں بیہ، ڈاکٹر بھری سکوت، سر خلیل احمد کھارلا، ضلع بڑہہ، پوسٹ آفس بالی، سر نثار علی صاحب ۲۶ رگنہ، رحمت اللہ خاں، امیر شریف، لال بہاری لال صاحب لاہور، لال انیش داس صاحب اندرون شاہ عالمی دروازہ لاہور۔ جناب امین میاں خاں میسی پور سے فرماتے ہیں آپ کی گویاں دروغن ماش طلا رنگو ایا تھا فائدہ ہوا ہے اور دوسرے آدمی کو ایسے فوراً بذریعہ بی بی بھیکو شکر فرمائیں، مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۷۵ء کو انکو دیکھو دی گئی رائے یہ داراشا تعوی گویاں روغن ماش طلا ۱۰ روغن خواہ نہ ت دوائی تھے کا پتہ۔ مینچر داراشفا ر گویاں جبرو ڈبہ مالہ ضلع گوروارسپور (پنجاب)

# ایک نفسی مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کر دو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو  
منتخب کر سکوں تعمیل حکم کے  
فیصلہ سوزر لینڈ، شباب  
سرغزاروں میں گل چینی کی گئی،  
سفر کے بعد مہارانی کے حضور  
خوشبو کھوچکے تھے، اور باقی  
کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں  
خواہش کے پورا نہ ہونے سے  
ردیا، مہاراجہ کو فکر دامگیر ہوا



لئے فردوس مثال کشمیر جنت  
انگیز تسمانیہ کے گلپاش  
جب سب پھول دور دراز  
میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی  
اس قدر فرجھائے ہوئے تھے  
کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس  
مول رہنے لگی، کھانا پینا ترک  
اور روزار سے مشورہ طلب کیا،

متم توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا، اسے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو  
مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لے واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی تاج عطر، لکھنؤ (یو۔ پی۔)

REG. NO. 3694.L.

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

(کی)

تازہ ترین تصنیف

جنون و ز...

(یعنی)

رہائی کی مجموعہ رباعیات

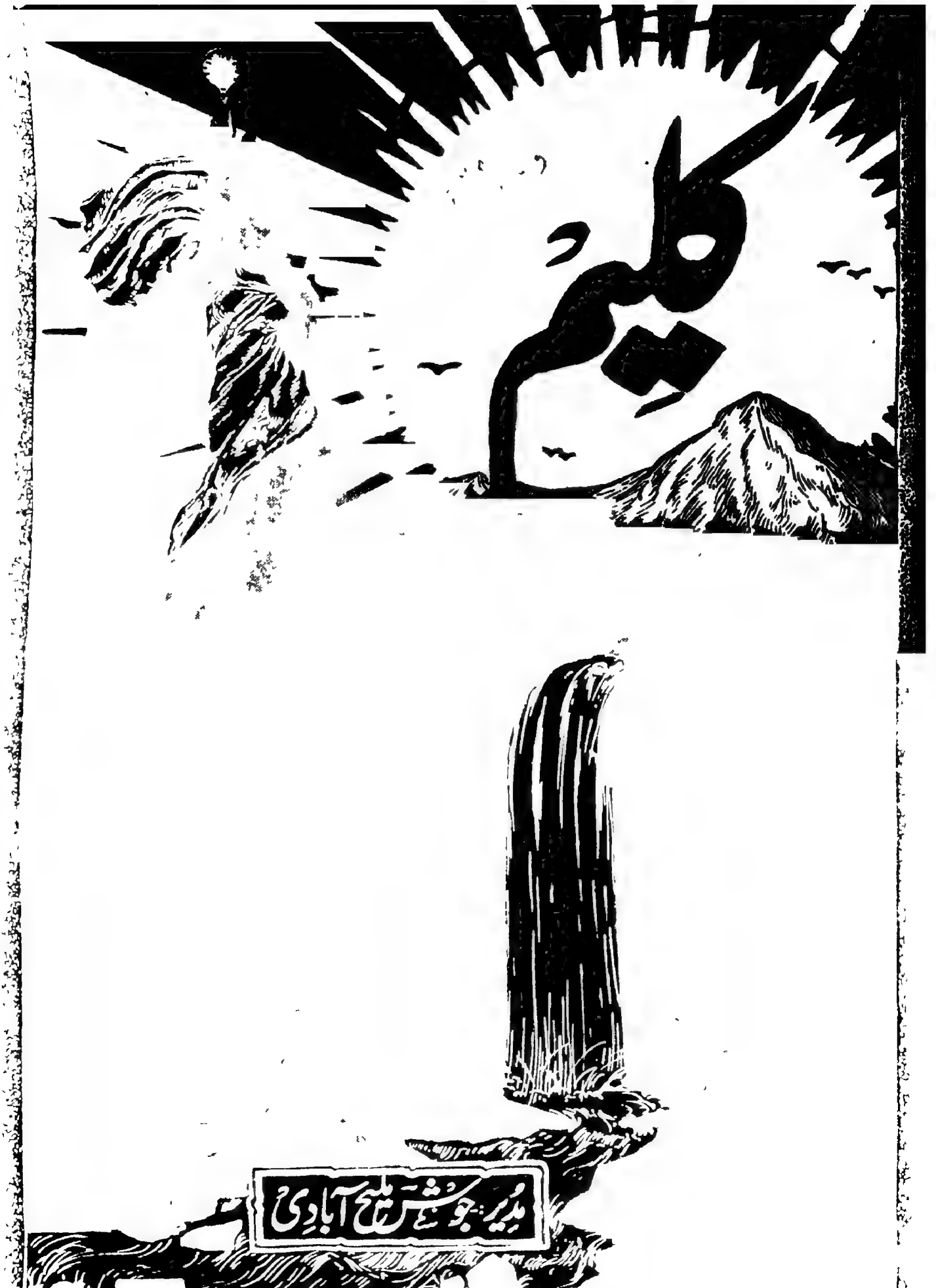
رہائی تمام انسانیت میں وہ تہا رنگین، عمیق اور سفید صفت ہے۔ جو عظیم شعرا کی مشافی کے نقطہ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ اور کسی شاعر کو اس وقت تک حقیقی رہائی گوشہ کا پر شکوہ خطاب نہیں مل سکتا، جب تک کہ اس کی بے پناہ جنون پرور تخیلی قوت بلند ہوتے ہوئے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہمدوش نہیں ہوتی۔ بہشت ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رہائی بھی ہر چرچہ کی طرح غلطی و غلط فہم کے زمرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، یا رانِ طریقت نے بڑے عم خود یہ سمجھ رکھا ہے کہ رہائی نام ہے رہائی کی بحروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا۔ اور بس — حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رہائی شاعرانہ مطالعے، شاعرانہ فکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ ریشمی خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی سبھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔ اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تنہا پیدا ہوئی ہے کہ کاش ہندوستان میں سبھی کوئی خیام پیدا ہوتا تو آپ کا یہ اولین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں جنون و ز...

کاملاً فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاض قدرت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں ایک خیام پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اس کی قدر نہ فرمائیں۔ — آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک فیئر جبر لڈ مل گیا تھا جس نے اُسے ایک زندہ قوم سے روشناس کرا دیا تھا، لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مردہ اور غلام ہے، اور غلامی کو صرف یہی نہیں کہ کوئی فیئر جبر لڈ نہیں ہا کرتا، بلکہ خود اس کی قوم بھی اس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے تیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون و حکمت مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے (۱) معارف (۲) خرابات (۳) حسن و عشق (۴) پیرانِ سالوس (۵) متفرقات

قیمت صرف تین روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

نیچر کلیم بک ڈپو، جنتی نو اسٹ، دریا گنج، دہلی



میر جوشن علی آبادی

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا

تازہ ترین شاہکار

# فکر و شہ

نقش و نگار اور شعلہ و شبنم کے بعد یہ شاعر انقلاب کا تیسرا محبوب کلام ہے جس میں بالکل نئی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ یہ تمام نظمیں نباضِ فطرت اور حساس شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں، ایک ایک شعر میں سائلِ حیات اور دنیا کے رنگارنگ واقعات پر ایسا رنگین تبصرہ کیا ہے جس کی تشریح و تفسیر دفتروں میں نہیں سما سکتی اور بیان کی شگفتگی و شادابی پر ہزاروں محنِ نثار ہیں، شاعر انقلاب نے اپنے پیام کے ذریعے اپنے مخاطب کو فکر کی بیچ در بیچ گھاٹیوں میں سبکتا ہوا چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ اسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے، دماغ کو الجھنوں میں نہیں ڈالا ہے، بلکہ سازِ دل کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے اور ان سے وہ موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالم و جد طاری ہو جاتا ہے۔

کتابت، طباعت، کاغذ نہایت اعلیٰ ہے، سائز بڑا، صفحات ۱۲۵ سرورق خوشنما رنگین، کتاب مجلد ہے، اور

قیمت ایک روپیہ

بایں  
منیر کلیم بک ڈپو، جنتی نو اسٹریٹ، دریا، دہلی



ایک برطانی قہارتی جهاز پر ہاپانی ہوائی جهازوں کی بمباری



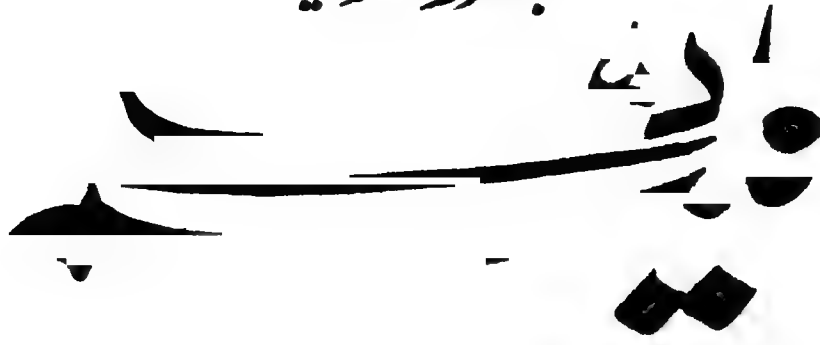
رسالہ کلہم دہلی

مورخہ یکم فروری ۱۹۳۸



حکومت چین کی مرکزی نگرا نی کمیٹی کا شاندار دفتر

# بِنَامُ قُوْتٍ وَحَیَا



آئے گانہ جانے کب زمانہ اپنا

قدرت سے بلا ہے محکومہ حریف حکیم

سلاقلہ چندہ: چھ روپے

ششماہی چندہ: تین روپے

منظور شدہ

ڈاکٹر ان تعلیم

ریاستہائے میسور، پٹیالہ و حیدرآباد (دکن)

آگے لئی صدیوں ہے فسانہ اپنا

یہروں کو سنائے جا ترا نہ اپنا

چندہ سہ ماہی: دو روپے

قیمت فی پرچہ: نو آنے

## جلد ۵ بابۃ ماہ فروری ۱۳۸۰ء نمبر

| نمبر شمار | عنوان                    | مضمون نگار                            | نمبر صفحہ | نمبر شمار | عنوان                      | مضمون نگار                            | نمبر صفحہ |
|-----------|--------------------------|---------------------------------------|-----------|-----------|----------------------------|---------------------------------------|-----------|
| ۱         | اشعارات                  | ادارہ کلیم                            | ۹۰        | ۱۲        | جو (نظم)                   | جوش ملیح آبادی                        | ۱۳۹       |
| ۲         | دقائق ہند                | ادارہ کلیم                            | ۹۵        | ۱۳        | اسے نیند میں اب آجا (نظم)  | جناب ذاب جعفر علی خان صاحب آٹھ لکھنوی | ۱۴۰       |
| ۳         | سیاسی سیاست عالم         | جناب عبدالوہاب صاحب شیعہ بی کام       | ۹۶        | ۱۴        | پیام اقبال اور کشاف        | جناب راجی صاحب                        | ۱۴۱       |
| ۴         | سلاسل کے رہبر (نظم)      | جناب ملک صاحب اکبر آبادی              | ۱۱۴       | ۱۵        | اسندہ راگ سنجاب کشاف       | جناب کشاف صاحب                        | ۱۴۶       |
| ۵         | گاندھی انم اور سوشلیزم   | جناب پنڈت جواہر لال صاحب بنبرو        | ۱۱۵       | ۱۶        | ہندوستانی قومیت            | جناب نمان شغل صاحب بھوپال             | ۱۵۳       |
| ۶         | دعا (نظم)                | جناب مجید ملک صاحب                    | ۱۲۵       | ۱۷        | آج کچھ کھایا نہیں (نظم)    | جناب رضا صاحب نقوی                    | ۱۵۶       |
| ۷         | سرایہ مادی سے خطاب (نظم) | جناب محسن صاحب اعظم گڑھی              | ۱۲۶       | ۱۸        | گستاخ شیطان                | جناب وجاہت علی صاحب سندھی بی اے       | ۱۵۸       |
| ۸         | تجربہ معاش               | جناب بھول چند صاحب                    | ۱۲۷       | ۱۹        | لوائف سے خطاب (نظم)        | جناب بیک صاحب حقانی امر دہری          | ۱۶۰       |
| ۹         | یاد و دست (نظم)          | جناب سائر صاحب قدوائی ایڈیٹر شاہد بری | ۱۳۱       | ۲۰        | دقت و وقت                  | ادارہ کلیم                            | ۱۶۱       |
| ۱۰        | تقین نفس (نظم)           | جناب مداح الحق بیہرہ ندوی             | ۱۳۲       | ۲۱        | شاعر (نظم)                 | جناب محمود طرزی صاحب کلکتہ            | ۱۶۶       |
| ۱۱        | انسان کی تخلیق           | جناب مراد خان مراد صاحب               | ۱۳۳       | ۲۲        | یہ فکر کس کے لئے ہے۔ (نظم) | جوش ملیح آبادی                        | ۱۶۸       |

(جوش ملیح آبادی پر نثر و پشیرنے محبوب و لطیف برقی پرکھیں دیں چھو کر دفتر سارا کلیم جینے کو اس نمبرم دریا گئے دلی سے شائع کیا)

# اشک

## سال نامہ

بعض احباب نے شکایت کی ہے کہ "عظیم" کا سال نامہ یہ ل نہیں نکال گیا، حالانکہ شکایت یہ کرنا چاہئے تھی کہ سوگ نامہ کیوں نہیں نکالا گیا۔

سال نامہ وہ نکالتے ہیں کا ملک آزاد، اور جس کی قوم آسودہ حال ہو۔ سال نامہ وہ نکالتے ہیں کا ہر روز اس کے ملک اور اس کی قوم کے لئے ایک تازہ بشارت لاتا، اور ایک نئے فوج باب کا شہرہ سناتا ہو۔

میں حیران ہوں اور اپنی قوم کے جذبہ غیرت کی افسردگی پر شرمندہ بھی کہ ہمارے مدیر کس منہ سے سال نامہ نکالنے کا ارشاد کیا کرتے ہیں۔

اول تو عیسوی سال سے ہم ہندوستانیوں کو محکومی کے علاوہ، کوئی دور کا بھی تعلق نہیں کہ ہم اس کی پہلی جنوری کو یوم جشن قرار دیں۔

اس کے علاوہ ہمارے سیاسی اور اسی کے نتیجے میں اقتصاد کی حالات اس ہولناک حد تک تاریک اور ڈراؤنے ہیں کہ ہمیں نو روز کے موقع پر شادیانے بجانے کے عوض ماتم کرنا چاہیے، ماتم کرنا چاہیے اس بات کا کہ ہم اب تک علیل و ذلیل ہیں۔

ان لوگوں کو جو ساہا سال سے بیمار ہیں، تہواروں کے موقع پر آنسو بہاتے بھی دیکھا جاتا ہے کہ افسوس یہ ساہواری بھی گزر گیا، اور ان بد بختوں کو جو مدتوں سے نامراد چلے آ رہے ہیں، ہر فصل گل کے زمانے میں یہی ماتم کرتے دیکھا جاتا ہے کہ

اب کی بھی دن بیمار کے یو نہیں گزر کے

## مدیر

لیکن خدا جلے ہماری مصافحتی برادری کو پہلی جنوری کو کیا دولت پیدا مل جاتی ہے کہ وہ بڑے بڑے پیانوں پر سالنامے نکال کر جشن مناتے ہیں اور اپنے قلیل وسائل معاش کو بڑی طرح مجروح کر کے نفس سے نفس زہنتے چلے جاتے ہیں۔

کیا نو روز کے موقع پر کسی پرانے بیمار کو کبھی یہ فخر مسرت بند کرتے رکھا گیا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ آج میرے مرض کا بار ہواں سال شروع ہوا ہے؟ اور کیا یہ ایک حقیقت تسلیم نہیں ہے کہ محکومی، دنیا کے تمام ملک امر ان کی ماں ہے؟ اور کیا جنوری کی ہر پہلی تاریخ یہ اعلان نہیں کرتی کہ اسے ہندو نو آگاہ ہو کہ ہماری غلامی کی عمر میں آج ایک سال کا مزید اضافہ ہو گیا ہے؟ اور کیا اس موقع پر ہمارا جشن منانا گویا یہ الفاظ دیگر یہ اعلان کرنا نہیں ہے کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اب تک غلامی میں گرفتار اور غلامی کی جمع ذلتوں سے ہلکا رہیں؟

جس طرح جرائم پیشہ بچوں کی ماں، کو تو ال کا نام سنکر کانپنے لگتی ہے، باطل اسی طرح جب دہسبر کی اکیسویں کی رات کو میں بستر پر راز ہوتا ہوں تو انتہائی پشیمانی کے ساتھ غور کرتا رہتا ہوں کہ کل صبح کو جس وقت آزاد قوتوں پر چلنے والا آفتاب مشرق سے طالع ہو گا، تو میں کیا منہ لے کر اس کے سامنے جاؤں گا۔ اسی اڈیٹر ٹن میں گردنیں لیتے لیتے دب سو، یا یوں کہنے کی بہت ہو جاتا ہوں تو ایسے ایسے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کوثر دنگل کے دھارے، نیولے اور سانپ کی طرح ایک دوسرے سے گتے ہوئے ہیں پاسکجائے، اور دھوتیاں دونوں

نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ایسے دہر دست مالی شان دین  
ہیں۔ یا نہیں بننا چاہتے ہیں جو اپنی غریب رعایا کی حالت سے  
باجل بے مہر ہے۔ جناب ہر بانی فرما کر اپنی کھال میں رہے جس  
طرح آپ اپنی مائے کی، ملک ہیں، اسی طرح ہر شخص مختار ہے۔  
روایات کہن یعنی اسلامی روایات کہن کا آپ اپنی نئی تہذیب  
سے تقابل کر کے اپنی بالئے نظری کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ  
نئی تہذیب اس قدر عریال ہے کہ اب اس کے پرستار بھی  
دو ہائی دے رہے ہیں۔ رت اگر تم اس جوش جنوں میں کپڑ  
بچاؤ کر اپنے عشرت کو سے سے نکل آؤ تو تمہیں معلوم ہو کہ برادران  
دن کا غریبوں کے ساتھ کیا رتاؤ ہے، مگر اب تو تم نے اپنی قیمت  
بیت بڑھالی ہے۔ پچیس روپیہ فیس، سیکنڈ کلاس کا کرایہ۔ یہ حال  
مختصر یہ ہے کہ اس خط کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ آپ پر  
بھی صادق آتا ہے، اور اب آپ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ نے اپنے  
نے لکھا ہے۔ فقط

آپ کی رائے کو تسلیم نہ کرنے والا

مکرمی! یاد آوری کا شکریہ۔ سب سے پہلی توجہ کا سنی ہے جناب  
کے مکتوب کرامی کا لغافہ جس کے چاروں گوشوں پر آپ نے ایک مصرعہ تحریر  
فرمایا ہے، جو اس وقت یاد نہیں، لیکن اس مصرعے میں مجھے محاذ لب کر کے  
ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تو خاک کا پتلا ہے، اس قدر مغرور ہو۔

اجازت دیجئے کہ مذبح المومنین کے طور پر میں آپ کے اس نصیحت  
آمیز اور عبرت انگیز مصرعے پر مختصر کچھ اظہار خیال کروں۔ آپ نے مجھے  
اس مخفی حقیقت سے آگاہ فرمایا ہے کہ میں خاک کا پتلا ہوں۔ اس اطلاع  
رسانی، یا کشت راز پر میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں۔ میں آج تک اپنے  
کو پیش کا پتلا سمجھے ہوئے تھا۔ اب آپ کی عنایت سے معلوم ہوا کہ پتیل کا  
بہن، میں، خاک کا پتلا ہوں۔

کیا آپ براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں گے کہ آپ کس چیز کے پتے ہیں؟  
خاک کے، پتیل کے یا کسی اور وصات کے؟

ہی کے ساتھ ساتھ آپ نے مجھے نصیحت فرمائی ہے کہ اد خاک کے  
پتے مغرور ہو۔ یعنی آپ کے نزدیک اگر میں پتیل، یا لوہے کا پتلا ہوتا تو مغرور

ہوتا پائی کر رہے ہیں، تسمیوں اور ڈناروں میں رسد کٹی ہو رہی ہے، اذانیں اور  
ناقوس ایک دوسرے کا منہ نوچ رہے ہیں اور وارمیاں اور چٹیاں ایک دوسرے  
کی ناکوں پر جھک کر رہی ہیں، مندر دانت نکالے ہوئے غرا رہے ہیں، مسجدیں  
کماندھوں پر ڈنڈے رکھے چنگھاڑ رہی ہیں اور ان دونوں کے پیچھے کورجیوں  
کا ایک گروہ ہے جو ستوڑے فاصلے پر دبکا ہوا ہتھ مار رہا ہے۔۔۔۔۔۔  
۔۔۔۔۔۔ کہ بکا یک گبر اگر میری آنکھ کھل جاتی ہے، اور آنکھ کھلتے ہی میرے  
کان میں نوروز کے آفتاب کی یہ آواز گونجنے لگتی ہے کہ میں ہوں آزاد و قوی  
کا قدر شناس آفتاب، اسے ہندوستان بنو، تباہ تم زندگی کی کس منزل  
میں ہو۔۔۔۔۔۔ میں نے اپنی گردش کے سلسلے میں تمہیں دس بیس، سو دو سو  
بہنیں، بلکہ کامل تین سو ستر سو تھے دئے، کیا واقعی تم نے میرے دئے ہوئے  
ان سیکراؤں نیا منادہ مواقع میں سے کسی ایک موقع سے بھی اب تک  
کوئی فائدہ نہیں اٹھایا؟ تم کس قسم کے انسان ہو؟ آفتاب کا یہ نعرہ سنئے  
ہی میں کاتوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں، اور صحبت کے چپے سے نکلنے کی  
جرات نہیں کرتا۔

## ایک دوسرا خط

یاد ہو گا کہ جنوری ۱۹۳۷ء کے "کلمہ" میں ایک صاحب کا خط مع جواب  
شائع کیا گیا تھا، اب اسٹین صاحب نے میرا جواب الجواب روانہ فرمایا  
ہے، جو جواب کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مگر ہے قارئین "کلمہ"  
اس سے کچھ حاصل کر سکیں۔

میری جوش صاحب تسلیم: آپ کا دعویٰ مطلق فیصد جی کا پتلا ہونا  
آپ نے مدراس کے طیارہ کار کا خط شائع فرما کر اپنے خیالات ظاہر فرما  
ہیں، گو یا کہ خط شائع کر کے آپ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ آپ سیاست  
کے ایسے ماہر ہیں کہ خط میں جو دو بات بیان کئے گئے ہیں وہ سب  
لغز ہیں، اور آپ نے جو مائے قائم کی ہے وہ مزدوری ماننے کے  
قابل۔ حضرت آپ دہوش ہیں کا ٹکڑے کے ٹٹے ہیں، اور یہ نشہ غیر  
ترشی کے نہیں اتر سکتا۔ وقت آ رہا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ بھی  
منافق ماہر راست کو تسلیم کر لیں گے۔ میں بیابانگ دہل آپ سے  
عزم کرتا ہوں کہ کلمہ میں "اسلام" اہل اسلام اور ملت نام

یہ ظاہر فرمایا ہے کہ آپ سیاسیات کے ایسے ماہر ہیں کہ خط میں جو جو بات بیان کئے گئے ہیں وہ سب لغو ہیں، اور آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ مزور ہی ماننے کے قابل ہے۔

میں اُس کے جواب میں آپ سے تو نہیں، قارئینِ حکیم کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ وہ ہر بات فرما کر جنوری شاعر کے حکیم کو خط فرمائیں، جس میں دونوں خطاں لکھے گئے ہیں، اور رائے قائم فرمائیں کہ مندرجہ بالا عبارت آرائی کس ذریعہ کے منطقی کانٹے پر تولی جاسکتی ہے، اور اسے میرے جواب سے کیا ارضی یا آسمانی تعلق ہو سکتا ہے۔

میرے مددگار دوست، اگر آپ بڑا نا مایوس تو اس مندرجہ بالا عبارت میں آپ نے جو دو علمی غلطیاں کی ہیں ان سے بھی آپ کو آگاہ کر دوں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے "گویا کہ، حالانکہ" گویا کہ بعد کاف بیانیہ کی ضرورت نہیں، اس کے بعد آپ نے تحریر فرمایا ہے "وجوہات" حالانکہ "وجہ کی جمع" وجوہات نہیں، بلکہ "وجوہ" ہے۔

اس کے بعد آپ ہر بات فرما کر تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت آپ درہوش ہیں کانگریس کے نشے میں اور یہ نشہ بغیر نشی کے نہیں اتر سکتا" میں اس کے متعلق اس سے دیا وہ کچھ اور عرض نہیں کروں گا کہ اس کے یہ سنی ہیں کہ آپ مجھے دھکی دے رہے ہیں، اور دھکیان دینا مردوں کا شیوہ نہیں۔

پھر آپ نے تحریر فرمایا ہے "وقت آرہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ آپ جیسے منافق راہِ راست کو تسلیم کر لیں گے" اس جملے میں آپ نے پھر مجھے دھمکیا ہے، اور اُسی کے دوش بدوش، اسلام کے مقدس پیغمبر کی روش کے خلاف، جو حقیقی منافقوں کے واسطے بھی منافق کا لفظ استعمال نہیں فرماتے تھے، آپ نے بے دھڑک مجھے منافق کہہ دیا ہے۔ آپ اسلام کے مذہبی ہیں، اور سنت سے اس طرح گریز فرماتے ہیں، کیا یہ عبرت و حیرت کا محل نہیں؟

آپ نے منافق کہہ کر مجھے سب سے ذلیل مسم کی گالی دی ہے، لیکن میں اس کے جواب میں آپ کی شان کے خلاف ایک حرف بھی نہ کہتا ہوں، کیونکہ میں آپ کی نظریں "معد" ہوں، اور آپ اپنی نظریں "مومن" ہیں، ایک "معد" اور ایک "مومن" کے معیارِ اخلاق کا یہ بین فرق عبرتِ حاضر

ہونے کا لائق مجھے دیا جاسکتا تھا، جس کے یہ معنی ہیں کہ آپ خاک کو نہایت ہی حقیر سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں آپ نے خاک کو کس علمی تحقیقات، یا کس روحانی سکائشے کی بنا پر اس قدر حقیر سمجھ رکھا ہے۔

اسلامی روایات کی روش سے ہمارے جدِ امجد حضرت آدمؑ بھی خاک کے پتے تھے، اور اسی وجہ سے جب شیطان کو سجدہ آدم کا حکم دیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ (آدم) انٹی سے بنا ہے، اور میں آگ سے، میں اس اثرات ہوں، اور کوئی اثرات، ادنیٰ کو سجدہ نہیں کر سکتا۔

خاک کی حقارت کے متعلق آپ میں، اور اہلسنی میں کس قدر وحدت خیالی ہے۔ اس پر غور فرمائیے۔

اب رہی آپ کی یہ نصیحت کہ میں مغرور ہوں۔ سو میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ آپ مجھے کس بنا پر مغرور تصور فرماتے ہیں۔ جو چیز آپ کے مشاہدے میں کبھی نہیں آئی ہے، آپ اُسے تسلیم کیونکر کر سکتے ہیں، اور جب سرے سے کسی بات کے تسلیم کر لینے ہی کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے تو اس بات کے باب میں ہندو نصاب کا دروازہ کیونکر کھولا جاسکتا ہے؟

میرے مددگار دوست، آپ کے اس نصیحت آئینہ عبرت انگیز مسعرے سے مجھے وہ لطف حاصل ہوا جو صرف اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب شاہِ صاحب "یا سائیں جی" جہلا کو مذاہبِ قبراہِ موت سے دھمکا دھمکا کر بھر خیرات وصول فرماتے ہیں۔ پیسے تو لفرہ لگا یا جاتا ہے؟

"خاک کا پتلا ہے تو، کل خاک میں مل جائے گا"

"خاک کا پتلا ہے تو، کل خاک میں مل جائے گا" اور پھر ہا با مولائیر بھلا کرے اور آخر میں کچھ اللہ کے نام پر۔

معاف فرمائیے، آپ کا لفظ دیکھتے ہی میں خطا کا معنون "سہانپ گیا تھا، اور اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے کاتب صاحب کس ذہنیت کے بزرگ ہیں، چنانچہ لفظ چاک کرتے ہی جب اس عرائض نویسانہ فقرے آپ کا دعویٰ باطل، فیصلہ سب کاتب خطہ مدراس پر نظر پڑی تو میرے اندازے کی پوری پوری تصدیق ہو گئی۔ اور پھر جتنا جتنا میں آپ کے مکتوب گرامی کو پڑھتا گیا۔ میرے اندازے کی تصدیق پر تصدیق ہوتی چلی گئی۔

سب سے پہلے آپ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے مدراس کا خریدار کا خطا لکھ کر اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں، گویا کہ خطا لکھ کر کے اپنے

کے اتحاد و ایمان کا ایک بنائیت درخشاں نمونہ ہے۔

کاش آپ کو محسوس ہو سکتا — کاش آپ غور فرما سکتے۔

اس کے بعد آپ مجھ سے "باناگ ذہل" عزم فرماتے ہیں کہ کانگریس

اسلام۔ اہل اسلام اور متدین اسلام کی بنی ہے۔ میں اس کے متعلق صرف

اس قدر عرض کروں گا کہ کانگریس ایک خالص سیاسی جماعت ہے، اسے

کفر و اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، اور نہ ہو ہی سکتا ہے — پھر بھی چونکہ

آپ دعوے کرتے ہیں کہ کانگریس دشمن اسلام ہے، اس لئے بار ثبوت آپ

کے ذمے ہے۔

اگر آپ یہ دلائل قوی کانگریس کی اسلام دشمنی ثابت فرمادیں گے تو

کم سے کم میں تو ضرور ہی آپ کی سیاسی ہیئت کر لوں گا۔

اس کے بعد آپ سحر فرماتے ہیں جناب بہرانی فرما کر اپنی کمال میں

رہے "شاید یہ آپ کے صوبے کا کوئی محاورہ ہے، اور غالباً اس طبقے کا

محاورہ ہے جسے عرف عام میں بازاری، یا سوتی کہتے ہیں۔

کیا آپ کے سے تعلیم یافتہ، مہذب اور سوسائٹی کے طبقہ اعلیٰ سے

تعلق رکھنے والے فرد کے واسطے یہ رکاکت ایکسلس کے واسطے بھی جائز

ہو سکتی ہے کہ وہ سوتیانہ بول چال، اور بازاری بولی سٹولی کو اپنی زبان

پر جاری کرے؟

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب کوئی طبقہ اعلیٰ کارکن، بازاری بول

چال کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے متعلق سیرت انسانی کے بناموں کو یہ

رائے قائم کرنا پڑتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں شرفاء کے

حلقے سے دور، اور بازاری حلقے سے قرب رہنے کے باعث سیرت کی ان

حسرتناک اور مہندی خامیوں میں مبتلا ہو چکا ہے جن سے تا دم مرگ اسے

نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد تو آپ نے اور بھی غضب کر دیا، اور بہت کھل کر سامنے

آگئے، یعنی آپ نے سحر فرمایا ہے کہ "دوست" اگر تم اس جوش جنوں میں

کپڑے بھاڑ کر اپنے عشرتکدے سے نکل آؤ "معاذ اللہ، شرافت کی زبان

پر اس قسم کے کلمے کیونکر چڑھا سکتے ہیں؟ حیران ہوں کہ آپ کے بارے میں

کیا رائے قائم کروں — یہ آپ کے بیچے سے کس چیز کی بڑا ہی ہے؟

اس کے بعد آپ نے میری نفیس "اور میری ہیئت کی گرائی پر طنز

فرمایا ہے، جس کا جواب نہ دینا ہی انسانیت معلوم ہوتا ہے۔

اور سب سے آخر میں آپ نے یوں گورہ افشانی فرمائی ہے کہ بہر حال

مختصر یہ ہے کہ اس خط کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ آپ بھی صادق

آتا ہے، اور آپ آپ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ نے اپنے لئے لکھا ہے؟ آپ نے

مجھے بچوں کی لڑائی یاد دلادی، آپ کا لب و لہجہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ اس

بچے کا ہوتا ہے جو زراعت نسلی سے تنگ آکر آخر کار اپنے حریف سے یہ کہنے

لگتا ہے کہ تو نے جو کچھ مجھے کہا ہے اللہ کرے سچی پر پڑے۔

اب اپنے مکتوب گرامی کا تجزیہ چند سطروں میں سن لیجئے۔

مجھے منافق "کہہ کر آپ نے اپنی غیر اسلامی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے،

"کمال میں رہیے" اور اگر —۔۔۔ نکل آؤ" لکھ کر آپ نے بازاریت و مروتیت

کا سٹاپ ہر کیا ہے، اور اب آپ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ نے اپنے لئے لکھا ہے سحر؟

فرما کر آپ نے ایک تھکے ہوئے غلط آلود بچے کی ذہنیت پیش فرمائی ہے۔

شرافت و بعیرت، اور قوت و حیات کی قسم میں اس بات پر بحث

حیران ہوں کہ ایک اعلیٰ طبقے کے تعلیم یافتہ اور بالغ انسان کی ذات میں

یہ "عیوب سرگازہ" کیونکر اور کس صورت سے جمع ہو سکتے ہیں؟

آپ مدعی توحید بھی ہیں، اور آپ کے دعوئے توحید کی موجودگی

میں یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ توحید کے آغوش میں عیوب کی یہ تثلیث

بیدار ہوئی تو کیونکر!

میں یہ جواب انتقام سحر پر نہیں کر رہا ہوں، کیونکہ انتقام میری غیرت

میں حرام ہے، انتقام کو میں شرارت، جہالت اور حماقت کا مجموعہ سمجھتا ہوں،

میرا اس مقام خاصہ فرسائی سے صرف اس قدر مدعا ہے کہ آپ اپنے بیچے اور

اپنے طرز بیان پر نظر ثانی فرمائیں، بے سمجھے بوجھے کسی کو گالی دے بیٹھے کی

عادت کی قباحت پر نمونہ سے دل سے غور کریں، اور مقدمات کو غلط طور سے

ترتیب دے کر غلط نتائج نکالنے کے رجحان کو ترک کرنے کی خوبیوں پر نگاہ

کریں۔

آپ خود ہی غور فرمائیں کہ اگر میں آپ کے مکتوب گرامی کے جواب

میں آپ کو بھی خدا خواستہ "منافق" یا "کافر" یا عذار کے لفظ سے مخاطب

کرتا تو آپ کے قلب کو کس قدر تکلیف پہنچتی — کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو

شخص کسی کو گالی دیتا ہے، وہ گویا غیر محفوظ طور سے اس کا اعلان کر دیتا ہے

اور کوئی معنی نہیں رکھتا، اور اسے ترک محبت سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

چونکہ تمام اعمال کی بنیاد ہوتی ہے نیت پر، اور میں جانتا ہوں کہ میری نیت بخیر ہے، اس لئے مجھے اس کا یقین ہے کہ آپ میرے اس جواب سے ہرگز کوئی بُرا اثر نہ لیں گے۔

آخر میں آپ کی آگاہی، اور اپنے ضمیر کی تسکین کی خاطر میں اس قدر اور عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے لب و لہجے سے میرے شعور و شائستگی کو جو صدمہ پہنچا ہے، میں اُسے سچے دل سے معاف کرتا ہوں۔

آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں نے معاف کر کے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، یا نعوذ باللہ آپ پر کوئی احسان کیا ہے، بلکہ اُسے یوں سمجھیں کہ میں نے معاف کر دینے پر مجبور تھا۔ ماحول و وراثت کی ذخیروں میں جکڑے ہوئے دردمند انسان کو معاف کر دینے کے سوا اور چارہ کار بھی کیا ہے؟

یقین فرمائیے اگر کوئی مجھ پر قاتلانہ حملہ بھی کرے، اور اگر میں اتفاقاً یا سخت جانی سے بچ جاؤں، تو اس حالت میں بھی نہایت خندہ پیشانی سے اُسے معاف کر دوں گا، اور معاف کر دینے کے بعد یہ خیال نہیں کر دوں گا کہ میں نے غلطی پر کوئی احسان کیا ہے، یا یہ کہ میں نے کوئی معرکہ اخلاقی سر فرمایا ہے، بلکہ میں یہ سمجھوں گا، اور میرا یہ سمجھنا قطعی درست ہو گا کہ میں نے مجبور انسانیت کے ساتھ انصاف کیا ہے، اور انصاف سے زیادہ کچھ نہیں کیا ہے۔

میں ہوں جناب کا نیا زندہ

جوش

وہ جوش جو ہر ہدایت کے سامنے ہر تسلیم خرم کر دینے کو روح انسانی کی سعادت سمجھتا ہے۔

کہ میں گالی کھانے پر آمادہ ہوں؟

برادرِ حسن، فرض کر لیجئے کہ آپ نے جو کچھ میرے متعلق لکھا ہے وہ سب درست ہے، اور میں ذاتی سخت گمراہ و منافق انسان ہوں۔ لیکن اُن تمام عیوب کے باوجود جو میری ذات میں ہیں، پھر بھی میں آپ کا بھائی ہوں۔ کیا آپ اپنے بھائی کو گالیاں دینا پسند فرماتے ہیں؟

اگر میں غلط راستے پر ہوں تو مجھے راہِ راست پر لانے کا لیونک نہیں، محبت سے سختی سے نہیں نرمی سے، اور نفرت سے نہیں بلکہ دلجوئی و تالیفِ قلب سے۔

آپ کے سامنے ایک ایسے شخص کی تابناک سیرت موجود ہے جسے بہتر انسان پر آج تک آفتاب نہیں چمکا ہے، یعنی محرمائے عوب کا لافانی فلسفی اور اسلام کا مقدس پیغمبر۔ وہ پیغمبر جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کسی کافر تک کو کبھی کوئی معمولی سا صدمہ بھی نہیں پہنچا۔ جو دشمنوں کے واسطے دعائیں کرتا تھا، اور غلطیوں کو معاف کر دیتا تھا۔ اور جس کی مبارک ہستی صرف سکین کے واسطے نہیں، بلکہ عالمین کے واسطے رحمت تھی۔ آپ ایک ایسے سراپا رحمت ہیرے کے مقلد ہوتے ہوئے یہ کیونکر گوارا فرماتے ہیں کہ آپ کے کسی خیال یا فعل سے کسی کے دل کو آزار پہنچے؟

میرے بھائی، اگر میرے کسی لفظ یا جملے سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو تو میں دستِ بستہ معافی چاہتا ہوں، میرا دل بغض و عناد سے پاک ہے میں نے جو کچھ لکھا ہے نیک نیتی سے لکھا ہے،

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میرے خط کے بعض حصوں میں غلطی کا عنصر آگیا ہے، مگر یقین فرمائیے کہ یہ عنصر غلطی، ایک نیک نیت سے بات کے علاوہ

بے پرووں کو دوسرے چاچا بننے کے واسطے  
سچی جانی ہے یوں وہ نیک نیت بن جائیں  
جس طرح انسان کی سیرت پر غصے کے  
شکر کیا کھائی ہیں غریب ظاہرِ جانیابی  
خاندانوں پر تازا ہے جس طرح تعمیم کے پیر  
نہیں دشتِ ناک عسکری کی اندھیری رانی  
آدمی کے قلب کو روہ کے دشتِ ناک پرانی

## وفاق ہند

(سلسلہ رفتار و وقت)

قانون ہند ۱۹۴۷ء کی دستاویز مکتبی کا باب وفاق، مائتداس سیاسی شہپارے کا "بیت الغزل" واقع ہوا ہے۔ جسے برطانوی سیاست پر کے ساز نو ازان اب مستقبل قریب میں اپنے فسون گرانہ ہجہ و آنگ بس پڑھنا چاہتے ہیں۔ اور اپنی ایک ایک تان سے ذوق آشنایان موسیقی انگلستان پر و بعد و قص طاری کر دینا چاہتے ہیں۔ لارڈ لوٹین اور لارڈ مونس (عرش لندن کے تازہ نریلان فرس ہندوستان) اسی مجوزہ تاشائے قیمر کے استیج کے نصب کرنے، اور اس تنظیم و منتر مغل کے توتق شہانہ و سائین کے شمار و اشتیاق کی پیائش کرنے کے لئے ہمارے ملک میں تشریف فرما ہونے ہیں!

اسے آمدت باعث آبادی ما!

لارڈ لوٹین ادا مائتد تہ زہم نے اک چلبک خطاب میں فرمایا کہ انھیں آج تک ایک ہندوستانی بھی ایسا نہیں بلا جو وفاق کے اصول کا مخالف ہو! — مُدَّت یا لارڈ صاحب! بس اسی طرح ہیں بھی آج تک ایک برطانوی ایسا نہیں بلا جو مقبول اصول وفاق، اور مزدور و سوائے عالم نظام ہندوستانی وفاق کو، فرہنگ سیاسی کے دستر اوقات سمجھتا ہو! اسے

مرحبا تفریک لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میری دلی ہے! کیا لارڈ لوٹین کے جیب و دامن میں اس سے زیادہ نظر فریب کوئی کیا پنچھڑیاں نہیں! — ہم حیران ہیں کہ ان طفل تسلیوں کے لہجے کے ساتھ جو اب غوطہ آب خرگوش لارڈ صاحب بالقاب، پنڈت جو ابرال ہنر و اور پنڈت پنڈت ایسے سامری شکن جنادریوں سے ملاتی ہوئے ہوں گے تو کیسے چران پا ہوئے ہوں گے! برواں دام بر مرغ دیگر نہ کہ غنقا را جند است آشیان!

اگرچہ در پردہ ایسے ایسے عقابوں اور شہبازوں پر دوسرے ڈالنے کی ریشہ دوانیاں جاری ہیں، تاہم ان عیان و ان شاطرا کا پیام اطمینان یہ ہے کہ ہم کسی سیاسی شن کے سفرین کر نہیں آئے ہیں! — اسی استغفر اللہ! کچھ نکلے ہیں بھلا کیسے یہ ریش مبارک میں!

"وفاق" برطانوی دیسہ کاری کا وہ قائل "حراب" لفاق و شفاق ہے

جس پر ہماری نرم ترین شکوہ سنجی یہ ہو سکتی ہے کہ یہ تو برائے "وصل" کردن آمدی؟ بابرائے "فصل" کردن آمدی! دُور بینان کا نگریں مُت سے جانتے تھے کہ مفرد برطانوی ہندی و فریت کا آخری خط وفاق "وہی ریاستیں ہوں گی! آیوان و الیان ہند اس شاہانہ سکندری کا گویا سنگ بنیاد تھا! یہ خشت اول بھی چندان رشتہ نہ رکھی گئی اتنا ہم برطانوی دولت مشترکہ اقوام کے خالادہ سلطانی کے قصر کا تھا اب اس دیرا بقبہ کو نگیل کے ادب ثریا "تک پہنچانے کے درپے ہے! مگر یہ ہے کس قدر ہلک فریب و فائے گل! قبل کے کاروبار پر ہیں خندائے گل! خوش فہم ترین انگلستان نے شاید سمجھا کہ کانگریس کی "ماہی بے عقل" نام ہندو صوبائی آزادی کی شہرت کے چوگے کو سح کانٹے کے نکل گئی! پس اب وقت ہے کہ "فیڈریشن" کا دام سخت "بھی جنش میں لایا جائے، اور حریت کے "سوز دل پروانہ" کو "کڑا اصلاح" ذہنت (Reform in mentality) کی "ہوس گیس" کے اندر سرد کر دیا جائے! اے

دلہ! یہ پاکلی دامان غنچہ می لرزد! مگر برطانوی مابین سیاسیات و معاشیات کو معلوم ہونا چاہیے کہ صوبیات کا تجربہ قانون ہند کا آخری ثمر شیریں تھا، جس کے بعد اس شجر اصلاحات کو اُڑ پلانے سے جو پھل جہڑے گا اس پر اقصیات کا قانون تقبیل حاصل "عائد ہوگا! پھر جبر و حکم کا استعمال، جاننا زبان ملک کے لئے انکا میں مطلوب پیام جنگ ہوگا! اے

عید نظارہ ہے شمشیر کا غریاں ہونا! "فیڈریشن" عبارت ہے ہندو مسلم مسابقت کے منقضی المیہ و کھیل کے بعد، برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ہندوستان کے درمیان رقابت کے اک دُور پرفتن کے افتتاح سے! ستم ظریفی یہ ہے کہ اس پنجہ کشی کشتی کا نام رکھا گیا ہے "مضافہ و مضافہ" اے

خون میریزند و خونہا میخو اہند! فیڈریشن کا نظام اپنے مجوزہ شرائط و ضوابط کی لطیف زبان حال میں، اک قلعہ بندی ہے، اک طوط برطانوی شطرنجی شہ، و الیان ریاست کے دنیائوسی استبداد، تعلقہ داران و زمینداران کی دہشت انگیزی، برطانوی سربراہی و ہندوستانی ہماجنی کی گلو گیری، انکاشا رُودا پنچسر اور سنجی



واحمد آباد کی یعنی حرفت کی زنجیر اٹگنی۔ اور دوسری طرہ قومی  
بیداری و نظر بازی، غلامان ریاستہائے ہند کی زنجیر جٹانی۔

کاشتکاران و مزارعین کی خواتین و استعمارت  
پیشگی، ہندوستانی محرومین و متروکین کی قوت لایموت طلبی، جمہوریت  
کی دستکاری کی بحالی و کاوش جانبری۔ کے درمیان : : : :  
ہندوستان کے سبیل فساد میں است:

پہلے پرنسپل اینڈ پرائیویٹ کے باہم یہ دیدنی قرآن السعید اس  
قسم کی سیاسی شادی ہوگی جس میں دہن خیر سے "برس پند ہر ایک  
سولہ کاسن" کی تصویر جمال ہے، اور جناب نوش، چشم بد دور، ہیں اک نود  
سالہ پیر فرقت کے پیکر معلول : : : :  
مبارک مبارک، سلامت سلامت !

لارڈ لوٹین، از دواچ سیاست کی نکاح خوانی کے کتنی ہی خوش  
المان قاضی، کیوں ہنوں، ۱۵ اور ۹۰ کے درمیان کی صلیح حبیب علانا قابل  
پل بندی ہے : : : :

مخوام زمانے کہ اس حور و شیں بے نقاد بہ سر پنجہ شست ریشیں !  
ہمارا خیال ہے کہ اس مسئلے کو اتنا تاریک و یکجہ ہی شاید لارڈ لوٹین  
نے پر یاگ کے لنگا جن کے منظم کے "اک سادھو" ہمارا ج سے دو دوشبند  
بول کر، اپنا غم غلط کرنا چاہا ! سادھو جی پور سے اہل جنت معلوم ہوتے ہیں !  
آپ نے روشن ترین میسر مدی کی مبارک ترین ہندوستانی تحریک "ہرین"  
کو "کھجک" کا سیاہ ترین فتنہ قرار دیا ! ہمارے دیوتا سر دپ سادھو جی  
پر اگر اتنی "بجودی" نہ طاری ہوتی تو کھجک کے سب سے کالے کھنک  
کے ٹیکے کی نشاندہی میں وہ اپنی اس غالی تاریک خیالی کے مقدم حق کو  
فراموش نہ کرتے ! : : : :

فتنہ سب سچ سہی قیامت کے لیکن آگے مہارسی قامت کے : : : :  
لارڈ لوٹین کے ہم سیاست لارڈ سیمونل کا ورد و سود بھی اک  
خاص مذاکرے کی بنا پر قابل ذکر ہے ! مسٹری، وائی، چنٹا منی نے لارڈ لوٹین  
(کے ازار کان رکن منگت لبرلزم) کی موجودگی میں انگلستانی لبرلزم کی  
جو تعریف بیان فرمائی اس میں شخصی ملکیت کو اس مذہب سیاسی کا "اول

کلمہ طیب" بتایا ! مگر یہ شاید ہندوستانی "لجھی دیوی" ہی کے مندر کا سنگ  
بنیاد تھا ! چنانچہ لبرل لارڈ سیمونل نے بقال فطرت چنٹا منی جی کو فوراً نمرہ دیا،  
اور اس اہم حقیقت کو بے نقاب کیا کہ "انگلستان کا جدید العہد لبرلزم اس  
در پرستانہ خود کامی کو اک لعنت یقین کرتا ہے ! بجائے اس کے وہ کھیل  
بیعت اعماعیہ میں معاشی توازن و مجلسی مساوات کا قائل ہے ! لارڈ لوٹین  
نے مزید فرمایا کہ لبرلزم کے عصری نظریے کی دوسری امریکن پریزیڈنٹ  
روز ویلٹ کا جہاد بخلت اکابر سرمایہ بھی "لبرلزم" ہی کا اک روشن فکر  
جلوہ ہے !

یہ سب کچھ کیا ہے اگر سوشلزم و کمیونزم کی، زیر نقاب جیلد شرعی،  
اک بیعت رموان نہیں ہے ! : : : : سیاست واقعات کی دنیا  
میں سوشلزم وہ مقبول و محبوب مشرب بنتا جاتا ہے جو "لینن" علی الدین کلمہ  
کا پرچم اڑانے والا ہے ! اکابر برطانیہ پھر کس منہ سے "سود ویت روس" پر  
تبرتی کرتے ہیں ! : : : :

منکرے بودن و ہرنگستان زمین !

## قطعہ

جیسے موڑ کی گریزاں روشنی سے راہ میں  
نصف لمحے کے لئے ظلمت پہ چھپا جاتا ہے نور  
سرمدی آلام کے مارے ہوئے انسان کو  
یو نہیں چھو جاتی ہے دم بھر کے لئے موجِ حشر

(دعوتِ نوح آبادی)

# ۱۹۳۷ء کی سیاستِ عالم

عبد الرحیم شبلی، بی. کام

زمانے کی عجیب تیزی ت گھوم رہی ہے۔ گزشتہ سالوں کی طرح ۱۹۳۷ء بھی گز گیا۔ لیکن اپنے پیچھے بعض ایسی یادداشتیں چھوڑ گیا ہے جو وقت کی ریت پر بنایت گہرا اثر ڈالیں گی۔

اس مضمون سے جہاں میرا مقصد ۱۹۳۷ء کے واقعاتِ عالم کا مختصر بیان کرنا ہے وہاں اس سے میری یہ بھی غرض ہے کہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ سیاستِ عالم کس مرحلہ تک پہنچ چکی ہے، تاکہ اُن کے لئے موجودہ منتشر اور عالمی اضطراب کے عوامل کا تجزیہ کرنا آسان ہو۔

## مخاصمتِ چین و جاپان

۱۹۳۷ء میں جاپان نے اپنے اس پروگرام کو قربان کیا کہ شمالی چین کے باغی صوبوں یعنی چاہار، سوئی جوآن، شان سی، شان ٹنگ اور ہونگسئی کو نانکنگ کی حکومت سے آزاد کر کے یا تو براہِ راست اپنے قبضے میں کر لیا جائے اور یا اُن کو خود مختاری دے کر اپنی کٹ پٹی بنالیا جائے۔ دراصل چین اور جاپان کی مخاصمت کوئی نئی نہیں ہے، سب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں جاپان نے کوریا کو مغنازعہ ذیہ علاقہ بنا کر چین پر ایک

مکمل فتح حاصل کی۔ پھر ۱۹۳۱ء میں ساہو منچورین ریلوے پر ایک بربازی کو یہاں بنا کر منچوریا میں اپنے اقدامات وسیع کئے۔ اور اب شمالی چین پر پورا تسلط جمایا ہے۔

چین پر جاپان کے اس جارحانہ اقدام کی وجوہات تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ جاپان کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے، انہیں وسائلِ خوراک اسی نسبت سے ترقی نہیں پاتے، اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ جاپان میں طریقہ فلاح ہندوستان کی طرح تاحال دقیانوسی ہے، اور آتش فشاںات عصریہ سے بالکل رہشناس نہیں ہوا، اور دوسرے یہ کہ جاپان کے لوگ ضرورت سے زیادہ قومیت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اُن کو کسی وقت غیر ملکی چاول، لکھنا پڑ جائیں، کوشش کی گئی تھی کہ میکسیکو وغیرہ کے چاول جاپان بھیجے جائیں، لیکن اُن کا غیر مقدم نہ کیا گیا۔

پھر حال جاپان کی آبادی ۱۹۳۷ء (آغازِ عصرِ جدید) سے اس وقت تک سہ گنہ ہو چکی ہے، لیکن وسائلِ خوراک تاحال وہی ہیں، اس وجہ سے جاپان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی مملکت کو وسیع کرے، اور کوئی قریب ترین علاقہ اپنے ساتھ ملحق کرے تاکہ ایک طرف تو اُس کی بڑھتی ہوئی آبادی کی کفایت ہو جائے اور دوسری طرف اُس کو اپنی مصنوعات کے لئے ایک نفع بخش منڈی مل جائے۔

اسی خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے جاپان کی یہ خواہش عرصے سے تھی کہ کسی طرح منچوریا کے علاقے پر قبضہ حاصل کر لیا جائے، یہ علاقہ زراعت کے

لئے اس مضمون کے لئے اگرچہ میں نے زیادہ تر انگریزی اخباروں اور امریکی اور برطانوی رسائل و جرائد پر انحصار رکھا ہے لیکن رسالہ جامعہ دہلی اور پرتاب لاہور کے بعض بنیاتی حقائق شذرات بھی میری رہنمائی کے لئے کم مفید ثابت نہیں ہوئے۔ شبلی

لحاظ سے نہایت اُمید افزا ہے، ابھی تک اس میں صرف آٹھ کروڑ ایکڑ زمین زیر کاشت ہے، اور قریباً چھ کروڑ ایکڑ ایسے غیر زراعتی موجود ہیں جن میں نہایت عمدہ کاشت ہو سکتی ہے۔

اس علاقہ کی سب سے اہم پیداوار مٹر ہے جس کی مختلف اقسام تمام یورپ میں انسان اور حیوان کی خوراک اور چارے کے لئے مستعمل ہوتی ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں چودہ کروڑ من غلہ بیاں پیدا ہوا۔ جو سب کاشت کے لحاظ سے پنجوہیا کے زمیندار کا۔ بہت مست ہے، لیکن اُس کی عمدگی اور فروختگی کا باعث جاپان کی تجارتی اور کیمیاوی تدابیر ہیں۔

گیہوں، آٹا اور چاول اس جگہ کی دیگر زراعی پیداواریں ہیں جو اگر کوشش کی جائے تو زیادہ مقدار میں کاشت کی جاسکتی ہیں۔ مثال میں ایک وسیع علاقہ ایسا ہے جو بھل ہی بھل ہے اور چوب کا بہترین محضین ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ علاقہ معدنیات کے لحاظ سے بھی بڑا نہیں، اس وقت جاپان اپنی تیل کی ضروریات ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ڈچ ایسٹ انڈیز سے پورا کرتا ہے، اور شینری وغیرہ بھی امریکہ اور برطانیہ سے منگواتا ہے، لیکن اگر وہ یہ تمام شے پنچوہیا اور شمالی چین سے حاصل کر سکے تو دول یورپ کے مقاطعہ کا اُسے ڈر باقی نہیں رہتا۔

اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنچوہیا اور شمالی چین کے ساتھ جاپان کی دلچسپی بجائے فوجی ہونے کے زیادہ تر تجارتی و صنعتی ہے، اگر آج ہندوستان اپنی روٹی کی برآمد جاپان میں بند کر دے، یا آسٹریلیا سے وہاں ذرہ بھر بھی اُنن نہ جائے یا تیل یا ربڑ دینے سے انکار کر دے، یا امریکہ اقتصادی لحاظ سے قطع تعلق کرے تو جاپان بالکل بے دست و پا ہو جائے، اسی خطرے کے ازالہ کے لئے جاپان اپنی مملکت کو وسیع کرنا چاہتا ہے، تاکہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ کافی بالذات رہے۔

جاپان کے خطرے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے اور وہ ایشیا میں وہی طاقت کا اصرار و اقتدار پذیر ہونا ہے، روس نے ۱۹۳۵ء میں ایک اقتصادی چنجال پروگرام بنایا تھا جس کی دوسرے وہ اپنے جدیدہ جدیدہ مشبہات ملکی کو یک دم بام زحمت تک پہنچانا چاہتا تھا، اور اس طرح اُس کی خواہش تھی کہ وہ نہ صرف اقتصادی طور پر خود مختار ہو جائے بلکہ اُس کے ذریعے

وہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرے۔ یہ اسکیم ۱۹۳۵ء میں مکمل ہوئی، اور اُسے سیاست کا خیال ہے کہ روس اب اس قدر محکم بنیادوں پر کھڑا ہو چکا ہے کہ اگر ساری دنیا بھی اُس کا مقابلہ کرنا چاہے تو اُس کو نقصان نہیں ہو سکتا۔ سب سے نزدیکی حکومت جس کو روس کی برصغریٰ طاقت کا خطرہ

ہو سکتا ہے وہ جاپان ہے۔ روس نے بعد ازاں دوسرا پروگرام شروع کیا تھا، جو ۱۹۳۵ء کے آخر میں ختم ہوا ہے، اور جس کی حیرت انگیز ترقی جاپان کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہی ہے، اُدھر روس نے ٹرانس سائبیرین

ریلوے کی پُرسری دوہری بنائی ہے، اس لئے جاپان کو ہر دم بھی فکر لگ رہی ہے کہ اگر روس کی تمام قاذوین مکمل ہو گئیں تو اُس کا کیا حشر ہوگا۔

مزید برآں جاپان کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ جاپان کو مشرق

بعید میں وہی استیلاات حاصل ہونا چاہیے جو جنوبی امریکہ میں ریاستہائے

متحدہ امریکہ کو حاصل ہیں، یعنی جس طرح دول یورپ نئی دنیا کے کسی

علاقے پر بغیر متحدہ امریکہ کی رضامندی کے قابض نہیں ہو سکتا، اور نہ

وہاں آراضی خرید سکتا ہے، اسی طرح حکومت جاپان کو بھی یہ اختیار مل

جائے کہ وہ مشرق بعید کے کسی علاقے میں یورپی طاقت کو داخل نہ ہونے

دے۔ شمالی چین کی فتح بھی اس اقتدار کو حاصل کرنے کی ایک تہید ہے،

اُدھر چین کی طاقت دو جماعتوں میں بٹی ہوئی تھی جو اب ایک

مشترک دشمن کے مقابلے میں محاذ قائم کر رہی ہیں۔ ایک چینی اشتراکی

جماعت ہے، اور دوسری جیانگ کائی شک کی جماعت کو من تانگ۔

پیلے تو یہ دونوں جماعتیں ایک ہی عین اور سن یاٹ سین نے چینی ہئیت

اجتماعی کے لئے جمہوریت، قومیت، اور اشتراکیت کے جو اصول سہ گانہ

مرتب کئے تھے وہ ان دونوں کا دستور العمل تھے، ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۶ء

تک یہ دونوں عناصر ہم آہنگ رہے، لیکن ۱۹۳۵ء میں اُن کے ایک

سربراہ اور وہ قائد جیانگ کائی شک نے شنگھائی کے ساہوکاروں سے

ساز باز کر کے ناکھن میں اپنی حکومت قائم کر لی، اور گیونگ کو یکسر ختم

کرنے میں ایٹری چوئی کا زور لگا دیا۔ کیونسٹ جماعت بہت کچھ دب

گئی۔ مگر کچھ دن بعد پھر اُبھری، اور فوکیان اور کیانگ سی کے صوبوں

میں اپنی سودیٹ حکومت قائم کر لی، اور اپنے زیر اثر کافی وسیع علاقہ کر لیا۔

حتیٰ کہ وہ ناکھن کی حریف حکومت سمجھی جانے لگی۔

باوجود اس رقابت کے جب سلسلہ میں جاپان نے چوریا پر یورش کی تو کیونسٹ جماعت نے اتحاد قومی پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر ناخن کی حکومت اپنی قوت کو برابر ان کی گوشمالی اور بدداری میں صرف کرتی رہی۔ یہ سرخ فومین قومی عورت کی خاطر جاپان سے اپنے طور پر لڑتی رہیں، لیکن ناخن گورنٹ ان کے منصوبوں کو خاک میں مٹانے پر تلی ہوئی تھی، چنانچہ سلسلہ میں اُس نے کیونسٹ سردار فائنگ کو گرفتار کر کے قتل بھی کر دیا۔

جدا زان کیونسٹوں نے ناخن گورنٹ پر جاپان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے لئے بہت زور دیا، اور تقریباً تمام چینی فوجان اور طالب علم بھی اس اتحاد کے پر زور حامی تھے، چنانچہ کائی شک نے غالب علموں کے مظاہروں کو بڑی سختی سے دبانے کی کوشش کی، لیکن اس کے غیر جانبدار لوگ اور بھی سحر یک اتحاد کے حامی ہو گئے۔

آہستہ آہستہ یہ تحریک بہت پھیل گئی۔ اور جنرل کائی شک کے حامی کو من مانگ بھی اُس کی موافقت میں نظر آنے لگے، اور بالآخر سلسلہ میں جاپان کے خلاف سب ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

جاپان کے کاروباری آدمی چین سے اٹھنا نہ چاہتے تھے، اور اسی وجہ سے اُنہوں نے سلسلہ کے ناگہانی انتخاب میں جنرل بلیاشی کی حکومت کو جو فوجی اقتدار کی نمائندہ تھی شکست دیدی۔ لیکن پھر بھی نئی وزارت میں فوجی عنصر کافی با اثر رہا۔ اور چونکہ برطانیہ یورپی سیاست کے جھبیلوں میں پھنسا ہوا تھا اور امریکہ کے لئے اکیسے میدان جنگ میں کودنا آسان نہ تھا، اس لئے جاپان نے سوچا کہ شمالی چین پر قبضہ کرنے کا ہی بہترین وقت ہے

اُدھر اتفاق سے، جولائی سلسلہ کو ایک معمولی سا حادثہ پیش آگیا، اور وہ یہ تھا کہ ہینکاؤ کی بین الاقوامی آبادی کے اندر تین جاپانی لاجوں پر آٹھ مرتبہ گولیاں چلائی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جاپانی مر گیا اور دوزخمی ہوئے۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا فیصلہ مخالف ملک پر قبضہ کرنے اور دنیا کو جنگ کی خوریز یوں میں مبتلا کرنے سے ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن ملکیت پرستی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے بے نیازی دھونڈا کرتی ہے، چنانچہ جاپان جو پہلے ہی پھرا ہوا تھا اس حادثے کو اصل سبب بنا کر شمالی چین پر حملہ آور ہوا۔ اور ایک جاپانی فوج پی نیگ کے شمال

مغرب کی طرف۔ ایک جنوب مغرب کی طرف اور ایک جنوب کی طرف بڑھی، مقصد یہ تھا کہ شمالی چین کے پانچ صوبوں پر جن کا مجموعی رقبہ چار لاکھ مربع میل اور آبادی ساڑھے سات کروڑ ہے اُس کا قبضہ ہو جائے۔ یہ علاقہ مندرجہ صفحہ نقشہ سے واضح ہو سکتا ہے۔

اس جنگ کو روکنے کے لئے حرب معمول دیگر اقوام نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے، لیکن ناخن دزدان چنہ کی جمعیت سے زیادہ کی توقع کیے ہو سکتی تھی، و دول تسہ کی کانفرنس کی گئی جس میں چند مذہب رکھے ہوئے ریزولیشنز پاس کئے گئے، لیکن نتیجہ وہی رہا۔

ملک بگ ویدم، دم نہ شہید! جاپان نے اس کانفرنس کا مقابلہ کیا اور اعلان کر دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی غیر ملکی مداخلت برداشت نہ کرے گا۔

آخر اُسے اپنے مقاصد میں کامیابی ہوئی، اور اس وقت اُس کے قبضہ میں شمالی چین کے پانچ صوبے آگئے ہیں۔ جو چین کی کل اراضی کا چوتھ حصہ ہیں، اس علاقہ میں چین کی ریلوں کا ۸۰ فیصدی، غیر آباد زمینوں کا ۸۵ فیصدی، لوہے کی کانوں کا ۸۰ فیصدی، جنگلوں کا ۳۳ فیصدی، اور تجارت کا ۸۰ فیصدی حصہ ہے، علاوہ ازیں اُس نے شمالی چین کا داخلہ ناخن بھی ختم کر لیا ہے، اور ابھی محلوہ نہیں کہ اُس کی گرسنگی ہوسنا کی کہا کہاں جا کر ختم ہو!

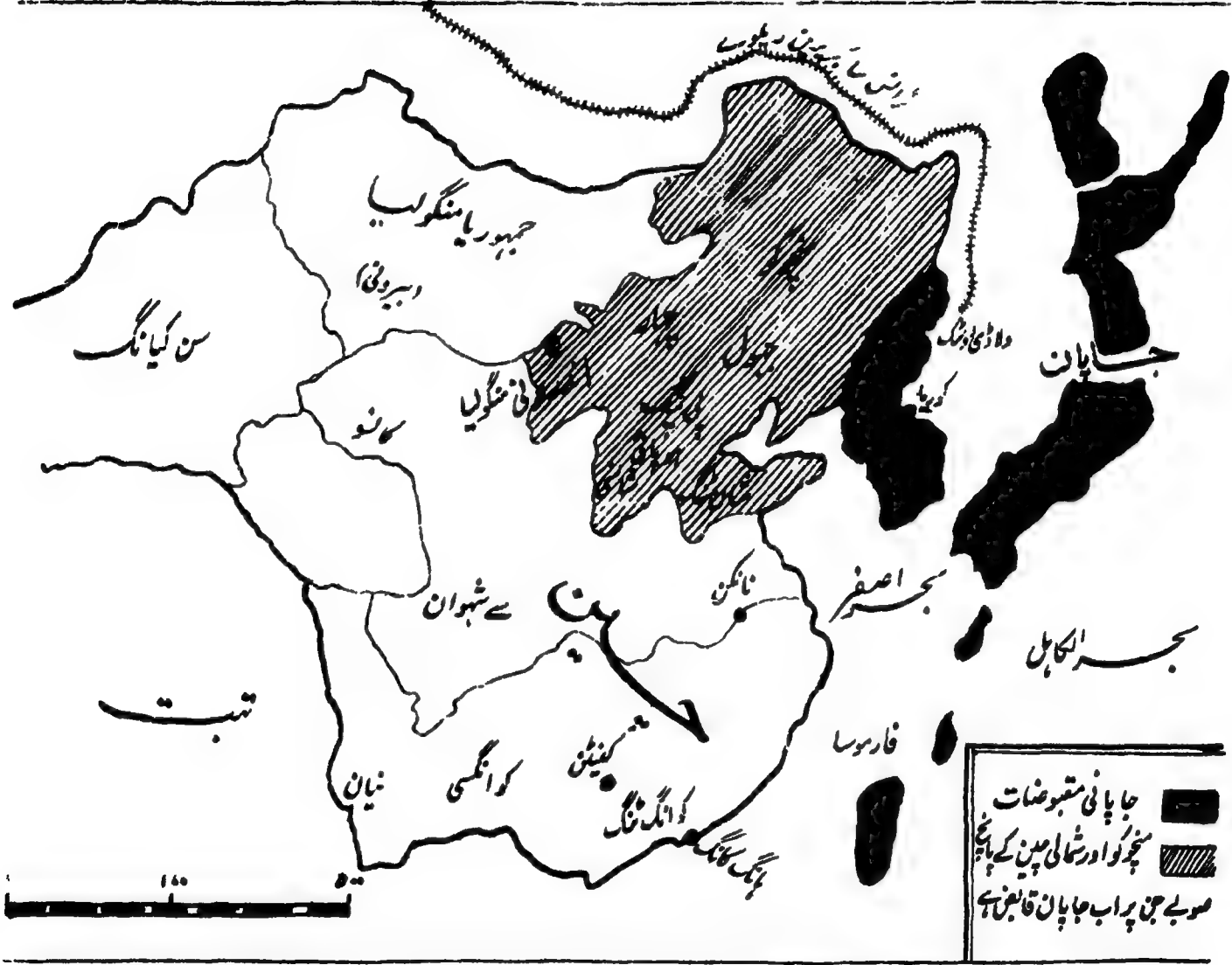
جاپان نے چین کے ارد گرد کے جزیروں پر فوج بھا کر باہر سے آنے والی امداد کو روک دیا، جس کی وجہ سے چین جاپان کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا۔

علاوہ ازیں جاپان نے شنگھائی کے بین الاقوامی علاقہ پر بھی تسلط جما لیا ہے، جس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ شنگھائی کی بندرگاہ جو اس وقت دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے جاپان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور اور اس کے ساتھ ہی وہ محصول جنگی جو یہاں سے حاصل ہوا کرتا تھا اب جاپان کو ملے گا۔

انگریز پہلے تو خاموش تھے، لیکن اب چونکہ اُن کے مالی مفاد معرض خطر میں پڑ گئے، اس لئے اُنہوں نے بھی احتجاج میں حصہ لیا، اور اصل بات یہ ہے کہ انگلستان نے چین کو کروڑوں پونڈ قرضے پر دئے ہوئے ہیں، اور اُن کو

اور جب سے چین پر منگولوں کا مختصر تسلط چودھویں صدی عیسوی میں ختم ہوا، اس پر ایک سناٹا سا چھا رہا ہے۔ خانہ بدوشوں کی سی زندگی ہے، مگر جذبہ دنیا کی نظر اس جانگلو علاقہ پر بھی سنی، ایک طرف اس نے اگر اس کو ہڑپ کرنا چاہا تو دوسری طرف چین کے دندان آؤ اس پر بستے، آخر کار جب ۱۹۱۱ء میں چین نے روس کو شکست دی تو اس نے اپنے

دھول کرنے کے لئے وہ چنگی کی رقم کا ۳۵ فیصد حصہ لے لیا کرتا تھا، اب شنگائی پر جاپانی قبضے کے عداوت معنی یہ ہیں کہ چنگی کی رقم بجائے انگلستان کے جاپان کو جایا کرے گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انگلستان کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ برطانوی سفیر نے اس باب میں پرزور احتجاج کیا، لیکن جاپان نے صفا کہہ دیا کہ اگر دوسرے مالک شرافت سے ہماری بات نہ مانیں گے تو بین الاقوامی



ہیت سے آدمی اس علاقے میں لاسائے، اور علی الخصوص اندرونی منگولیا کو چینی صوبوں میں اس ڈھوب سے شامل کر لیا گیا کہ اس کے باشندے سیاسی اقلیت بن کر رہ گئے۔ نیز چینی تاجروں نے یہاں سوہرہ پر پھیلایا اور قرض کے جال میں غریب منگولوں کو پھانس لیا۔ چینی نظام سے گھبرا کر منگولوں نے روس سے تعلقات بڑھائے۔

رقبہ کے معاملے میں ہمیں دور آزمائی کرنا پڑے گی، جب یہ حالت ہو تو پکارا ہوڑھا انگلستان کیا کر سکتا تھا؟ چین و جاپان کی محاصرت ۱۹۳۷ء کے دوران میں ایک اور اہم واقعہ یہ ہوا کہ اندرونی منگولیا میں ایک خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔ منگولیا کا موجودہ علاقہ چنگیز خاں کی وسیع سلطنت کا بچا کچا حصہ ہے

منافع پر اثر ہوا، اس لئے وہ برا فروخت ہو گئے اور جنرل سولا اور جنرل فرانکو کی سرکردگی میں انہوں نے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

اب چونکہ ایک طرف مزدور تھے اور دوسری طرف سرمایہ دار اس لئے فاشسٹ (اٹلی - جرمنی) اور شوکٹ (روس، فرانسیسی) حکومتوں نے بھی ان کی ہمدردی کو ناشر و ع کی، اور اپنے اپنے "والفیر اسپین" میں بیچ دے، اور اس طرح پر یہ مبارزات نصف خانہ جنگی نہ رہی، بلکہ بین الاقوامی محاربہ بن گیا۔

در اصل بات یہ ہے کہ اسپین میں بہت سی وہ چیزیں مل سکتی ہیں جو جنگ کے لئے ضروری ہیں، اور اس مقدار میں مل سکتی ہیں کہ نہ ایٹلایہ کو ہمیشہ میں نصیب ہوں گی۔ نہ جرمنی کو اپنی نوآبادیوں میں ملتی تھیں۔ مثلاً لوہا کثرت سے اوئڈو کے قریب، وگیو کے نواح میں اور باسک کے صوبہ میں دستیاب ہوتا ہے، صوبہ ہولی میں یورپ کی سب سے اچھی تانبے کی کانیں ہیں، المدن میں پارہ ملتا ہے، اور اُس کے قریب ہی بہت اچھا سیسہ۔ ان کے علاوہ بہت سی اور معدنیات اس جزیرہ نمایاں حاصل ہو سکتی ہیں۔ نقشہ حسب ذیل ہے۔



روس اور چین کے درمیان منگولیا کے متعلق یہ کھینچ تان جاری تھی کہ ۱۹۰۵ء کی فتح کے بعد جاپان نے بھی وہاں اپنا حق جتنا شروع کر دیا۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ جاپان بیرونی منگولیا پر اور روس مغربی منچوریا پر قابض رہے، جب جاپان نے بعد ازاں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا کر شروع کئے۔ تو چین نے منگولیا کی آزادی میں معتد بہ کمی واقع کرنا شروع کر دی اور قبائلی علاقوں کو اپنے باطنی اصولوں میں منہم کر لیا۔ لیکن چونکہ منگولیا کی آزادی سے جاپان کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا، اس لئے وہ منگولوں کو آزادی حاصل کرنے کی برابر ترغیب دیتا رہا۔ بالآخر ۱۹۱۱ء میں موقع پا کر اندرونی منگولیا نے اعلان کر دیا کہ وہ جاپان کے زیر سایہ ایک خود مختار ریاست بن کر رہے گا۔ اس سے جاپان کو کوئڈو، لوہا اور تیل حاصل کرنے میں آسانی ہوئی وہاں اس سے اُس کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ چین کے بالکل سر پر پہنچ گیا، اور روس کی یورٹ سے پناہ لینے کے لئے ایک درمیانی علاقہ ہاتھ آیا ہے۔ ہندوستان نے چین کے مظلوم ملک سے ہمدردی کی خاطر جاپان کو جاپانی مال کا مقابلہ لیا جائے، لیکن ہندوستانی روٹی کے جوابی مقابلہ کے خوف سے یہ سب بندھے نہ پڑا سکی۔

در اصل مقابلہ کی خاطر ضروری تھا کہ تمام مالک اس پروگرام پر عمل کرتے، لیکن افسوس ہے کہ قومی خود غرضیوں نے اس تجویز کو زیر عمل نہ لانے دیا۔ جاپان اپنی دولت کے لئے مرسر وغیرہ کی تجارت پر انحصار رکھتا ہے۔ پس اگر اقوام عالم متحدہ طور پر جاپان کا تجارتی مقابلہ کرتے تو اُس کو گھٹنوں کے بل گرانا چنداں مشکل نہ تھا۔

## اسپین کی خانہ جنگی

اسپین میں بیسے شاہی حکومت تھی، لیکن جمہوریت پسندوں کے بے پناہ جذبہ کے تحت شاہ انفانٹو کو تخت سے اتر جانے پر مجبور کیا گیا اور ملک میں لوگوں کی، لوگوں کے ذریعہ، لوگوں کے لئے حکومت قائم کر دی گئی۔ لیکن جب سے اشتراکی پارٹی برسر اقتدار آئی ہے ملک میں ایک خوشحیاں دور شروع ہو گیا ہے،

اشتراکی پارٹی نے مزدوروں کے اوقات کار کم کرنے اور اجرتیں بڑھانے وغیرہ کے پروگرام پر عمل کیا، لیکن اس کا چونکہ سرمایہ داروں کے

سلسلہ میں جرمنی اور اٹلی کی ایک مشترکہ کمیٹی نے ان ذخائر سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان دونوں حکومت سرماہ داروں کی سختی چنانچہ اٹلی اور جرمنی کو خوب مراعات دی گئیں۔ حتیٰ کہ فیصلہ کیا گیا کہ اسپین میں جرمن آب و وزوں اور ہوائی جہازوں کے لئے کیما دی طریق سے تیل بنا یا جائے اور ان کے مستقر بھی وہیں قائم کئے جائیں۔

لیکن آخر سیاسیات کا رخ ہٹا اور اسپین میں انقلابی جماعت کو اقتدار حاصل ہوا۔ چونکہ جرمنی اور اٹلی کو خطرہ پیدا ہوا کہ اس تبدیلی سے ان کا پروگرام کمٹائی میں پڑ جائے گا۔ اس لئے انہوں نے ملک میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی اور وہ بہت حد تک اس میں کامیاب ہوئے، چونکہ جرمنی کو اسپینی مراکش میں کچھ مراعات حاصل تھیں اس لئے جب جنرل فرنیکو نے بغاوت کھڑی کی تو شروع ہی میں اعلان کر دیا کہ مراکش کی تمام کالوں پر ہمارا قبضہ ہے۔ پرانی مراعات سب منسوخ کی جاتی ہیں۔ اور اٹلید میں ایک اسپینی نام کی کمیٹی قائم کی جو دراصل جرمنی ہی سستی اور مراکش کی تمام کالوں کا اُسے اجارہ دیدیا، جرمنی نے ان کالوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور وہاں سے کچھ لوہا لے جا کر اُس نے اسپین کو دھڑا دھڑا اسلحہ مہیا کئے، اور خود بھی اسلحہ سازی میں ترقی کی۔

علاوہ ازیں جرمنی نے گلیتیا کے ٹین اور ونگو کے لوہے پر بھی اپنا حق جالیا۔ اور ابھی ٹنگ سٹن اور وناڈیم کی کالوں پر نظر ہی سستی کہ اٹلیا کے رضا کار بھی اسپین پہنچے، اور ان کالوں کے علاوہ بعض دیگر کالوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

دیگر مالک نے اسپین کے معاملے میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا اور وہاں رضا کاروں کی برآمد کو روکنے کے لئے ایک عدم مداخلت کمیٹی قائم کی جو اسپین کے سوا مل کی نگرانی کرتی رہی اور جس نے اٹلی اور جرمنی کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اپنے رضا کار واپس بلا لیں۔

پہلے پہل تو مسولینی نے عدم مداخلت کمیٹی کے فیصلہ کی پروا نہ کی۔ لیکن جب فرانس نے دھمکی دی کہ اگر مسولینی رضا کاروں کی واپسی کے مسئلہ کو آسان نہ بنا دے گا تو اسے اپنی سپریمینز کی سرحد کھوٹا پڑگی۔ جس سے اسپین کی سرکار کو مالی اور مسلح امداد حاصل ہو سکے گی، اور جنرل فرنیکو کی کامیابی معرض خطر میں پڑ جائے گی، تو اُس نے وعدہ کر لیا کہ وہ

آئندہ اسپین میں کوئی رضا کار نہ بھیجے گا۔ اور اس فیصلے کے سوا اُس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا، کیونکہ اگر وہ فرانس کی دھمکی کی پروا نہ کرتا تو اسپین کی حکومت کو فرانسیسی امداد کا مقابلہ کرنے کے لئے اُسے باغیوں کو مالی امداد دینا پڑتی۔ لیکن اس کے لئے اُس کے پاس گنجائش نہ تھی، حبش کی جنگ نے اُس کا پیسہ ہی کچھ نکال دیا ہے، اور اب اُسے بجٹ میں بے درپے خسارے ہو رہے ہیں، اگر ششہ سال (سٹھ) اُس نے اس فیصلہ نیا ٹیس بھی لگایا تھا، اور گھائے کو پورا کرنے کے لئے دیگر ذرائع سوچے جا رہے ہیں، اندرین حالات مسولینی باغیوں کی امداد کیسے کر سکتا تھا، اور ان انٹرنیشنل کمیٹی کے فیصلے کو ماننے کے سوا اُس کے پاس کیا چارہ تھا؟

عدم مداخلت کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اسپین میں ایک کمیشن بھیجا جائے جو رضا کاروں کی صحیح تعداد معلوم کرے، مسولینی نے اس تجویز کو بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن جنرل فرنیکو نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا، مگر اس پر بھی دباؤ ڈالا گیا۔ اور مسولینی کی رضا مندی کے بعد وہ زیادہ دیر تک اس تجویز کی مخالفت نہ کر سکا۔

عام خیال یہ ہے کہ دونوں کی مخالفت کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ جتنی جلدی ہو سکے اسپین کے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کر لیا جائے، چنانچہ اس مقصد میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

تادم سحریر (وسط و سمبرٹ) یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اسپین میں غیر ملکی رضا کاروں کی صحیح تعداد کتنی ہے، لیکن جو کچھ اخباروں وغیرہ کی رپورٹوں سے ثابت ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت اسپین میں اٹلیا، جرمنی اور پرتگال کے سپاہی لڑ رہے ہیں، لیکن ان کو کسی طور سے بھی "والنٹیر" یا رضا کار نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ وہ باقاعدہ طور پر فوجی ہیں، ہاں اسی "والنٹیر" اگر آئے ہیں تو آرلینڈ سے، وہ جنرل اوڈونی کے ماتحت لڑ رہے ہیں، اور ان کی تعداد تین ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے، جرمنی کے قریب چالیس ہزار آدمی اسپین میں باغیوں کو امداد دے رہے ہیں، اٹلیا کے صحیح تعداد معلوم نہیں، لیکن روم کے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ اس وقت اسپین میں اٹلی کے چالیس ہزار "والنٹیر" لڑ رہے ہیں،

گیو ڈالبراک کے مقام پر لڑائی میں جو کاغذات ہاتھ آئے ان سے



معلوم ہوتا ہے کہ فاسٹ گریڈ کونسل نے پچاس ہزار ڈالٹر اسپین پیسے، اجادوں کے نائندوں کی رپورٹ ہے کہ اطالوی فوج کی تعداد دو لاکھ سے کم نہیں۔ حکومت اسپین کا یہ کہنا ہے کہ وہاں اس وقت کم از کم اتنی ہزار اطالوی سپاہی ہیں اس سے اب ہم کو دیکھنا ہے کہ اسپین میں حکومت کی طرف سے کتنے غیر ملکی رہنما کارڈز رہے ہیں، باغیوں کے اعلان کے مطابق وہاں کم از کم اڑتیس ہزار غیر ملکی ہیں، لیکن نائندہ کے نائندہ نے کہا تھا کہ وہاں میں اوپر پینتیس ہزار کے درمیان اشخاص ہیں۔ فرانس کے سرحدی افسروں کا بیان ہے کہ جب سے اسپین کی خانہ جنگی شروع ہوئی ہے، وہاں سے بارہ ہزار ڈالٹر گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر فرانس کو لیا جائے کہ تین چار ہزار آدمی بحری راستہ سے وہاں گئے اور دو ایک ہزار چھپ چھپ کر پونچ گئے تو بھی یہ تعدادیں ہزار سے زیادہ نہیں بنتی۔

اب سوال یہ ہے کہ ان غیر ملکی ڈالٹروں کو واپس کیسے بلایا جائے؟ اس کا فیصلہ عدم مداخلت کمیٹی کا مجوزہ کمیشن ہی کرے گا۔ لیکن فی الحال جبکہ اس بات پر ہے کہ آیا فریقین کے برابر برابر کے آدمی واپس لے جائیں یا اگر باغیوں کے پانچ حامی واپس لے جائیں تو سرکار کا صرف ایک، جرمنی اور اٹلی اول الذکر تجویز کے حامی ہیں، اور روس دوسری کا۔ اور دراصل سارے کے سارے غیر ملکی واپس بلانے کا صرف یہی طریق ہے کہ دوسری تجویز پر عمل کیا جائے۔

بھرم دہی کی دوسری صورتوں کو روکنے کا سوال ہے، اس کے فیصلے کے لئے بھی کمیشن کے فیصلے کا انتظار ہے۔

در اصل جب تک کمیشن کا فیصلہ صادر ہوگا اسپین کے تابلوتیں آخری منہ لگاڑی جا چکی ہوگی، دو بول عالم زیادہ تر باغیوں کی ہی حامی معلوم ہوتی ہے۔ جرمنی اور اٹلی نے تو جنرل فرینکو کی حکومت کو پہلے ہی منظور کر لیا تھا، اب انگلستان نے بھی فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ مفتوحہ علاقہ میں تجارتی سفیر مقرر کئے جائیں گے۔ جاپان اور دو تین چھوٹے چھوٹے یورپی ممالک نے بھی جنرل فرینکو کی حکومت کو منظور کر لیا ہے۔

بحر روم کا میدان کارزار

جب سے ایلطالیہ نے حبش کو فتح کیا ہے، اس کی بحیرہ روم میں طاقت

طاقت بڑھ گئی ہے، جو برطانیہ کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہی ہے کیونکہ سمندر اس کے لئے شہرگ کا حکم رکھتا ہے۔ مالٹا کا برطانوی مستعمر مسیحا صرف ۶۵ میل دور ہے، اور اس فاصلے کو ایلطالیہ کے گولوں سے لدے ہوئے ہوائی جہاز عرف میں منٹ میں طے کر سکتے ہیں۔ مالٹا کی بندرگاہ کا دہانہ بہت تنگ ہے۔ اس میں جہاز آسانی کے ساتھ آجا نہیں سکتے بندرگاہ کے اندر ان پر دشمن کا ہوائی بیڑہ بڑی آسانی سے حملہ آور ہو سکتا ہے، چنانچہ جنگ حبش کے موقع پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ برطانیہ مالٹا میں اپنا بیڑہ نہیں رکھ سکتا۔ اسی لئے وہ اسکندریہ چلا گیا، جہاں وہ اطالوی ہوائی جہازوں کی پونچ سے مقابلہ باہر ہوگا۔

یہ خطہ ابھی تک ذہن میں ہی تھا کہ بحیرہ روم میں آنے جانے والے جہازوں پر حملے ہونے لگے۔ صرف برطانیہ کے کوئی قبض جہاز ان حلوں کا شکار ہوئے۔ فرانس اس بحری قزاقی سے گھرا اٹھا، اور روس کا بھی ایک جہاز ترکی ساحل کے قریب ایک آب دوز کشتی کا نشانہ بن گیا، ترکی حکومت نے بیان کیا کہ کچھ دنوں سے ساحل کے آس پاس ایک آب دوز کشتی دیکھی جا رہی ہے لیکن اصل حملہ آور کا پتہ نہیں،

عدم مداخلت کانفرنس کی قراردادوں کی رو سے کسی مشکوک جہاز سے چمچر چھاڑنے کی اجازت نہ تھی، بلکہ اس کی اطلاع کانفرنس کو دینا پڑتی تھی۔

فرانس اور برطانیہ اپنے جہازوں کو خطرے میں دیکھ کر کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ایک کانفرنس بلانے کی تجویز کی، جو نیون (سوئٹزرلینڈ) کے مقام پر ہوئی، اور نیون کانفرنس کے نام سے موسوم ہے، ابھی کانفرنس کے انعقاد کا انتظام ہو رہا تھا کہ روس کے ساتھ مندرجہ واقعہ پیش آیا، روس نے ایلطالیہ کو مورد الزام ٹھہرایا، ایلطالیہ نے انکار کیا، روس نے اور زیادہ شد و مد سے الزام کو پیش کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایلطالیہ ناراض ہو گیا، اور اپنے حلیف جرمنی سمیت کانفرنس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ سمندری راستوں کی نگرانی کی جائے اور جنگی جہازوں کو اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ محلے کا جواب محلے سے دیں، اٹلی علیحدہ رہا۔ صرف فرانس اور برطانیہ نے دیکھ بھال کا تمام بار اپنے ذمہ



معنی یہ ہیں کہ اسپین اور فرانس کی مشترکہ حکومتیں صغیر پورپ سے ناپید کر دی جائیں گی۔ اور بہت جلد یہ ڈکٹیٹر روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سولینی، ہرٹلز سے انگریزوں کے خلاف امداد کا طالب تھا، لیکن ہرٹلز نے انکار کر دیا۔

ہادی النظر میں یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ وہ جرمنی جس کی سلطنت کا بیشتر حصہ انگریزوں نے لے لیا اور تجارتی لحاظ سے بھی اُس کو نقصان پہنچایا آج کس طرح انگریزوں کی حمایت پر کمر بستہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ جان لیں کہ جرمنی جس طرح بھی ہو سکے فرانس سے اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے اور انگریز خود بھی فرانس کی روز افزوں ترقی سے خائف ہیں تو ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی کہ انگریز آج کبلا جرمنی کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں اور جرمنی کیوں اُن کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔

اسی عمل کے پیش نظر لارڈ ہیلے فکس (سابق لاہور ڈائریکٹر) نے ہندوستان پر ہٹلز سے ملاقات کی، اگرچہ اس ملاقات کو بھی "ذاتی" اور "سچی" قرار دیا گیا، لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں، سمجھنا اور طبعہ جانتا ہے کہ اس ملاقات کے پس پشت بھی انگریز جرمن اتحاد کا نظریہ تھا، جو فرانس کی طاقت کو دبانے کے لئے اب ضروری ہو گیا ہے۔

پھر یہ قیاس آرائی بھی کی جاتی ہے کہ جرمنی "معاہدہ لوکارنو" کی بجائے ایک نیا معاہدہ چاہتا ہے، اور وہ بھی انگلستان کے ساتھ۔ دراصل جرمنی کا خیال ہے کہ بجائے اس کے کہ زیادہ ملکوں کے درمیان معاہدے ہوں بہتر ہے کہ صرف دو ملک آپس میں عہد و پیمان کر لیا کریں تاکہ نیپٹے میں آسانی رہے۔

## مواہدہ و موافقت

سیاسی ملاقاوتوں کے علاوہ ۱۹۳۷ء میں بعض موافقت و مواہد بھی کئے گئے جن میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ فرانس و ہسپانیہ (جرمنی) کاؤنٹ کیاؤ (ایلیا) اور سرسبروٹا (جاپان) کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کا مقصد تھا

لے لیا۔ اور فیصلہ کیا کہ اگر اٹلی شریک ہونا چاہے تو اُس کو ہر وقت اجازت ہے۔ بحیرہ روم کا مسئلہ حل کرنے کے لئے برطانیہ سرعت کے ساتھ اپنے جنگی پروگرام کو مکمل کر رہا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل ایلالیہ بھی غافل نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے بحری بیڑے کو دو گنا بڑا کر چکا ہے۔

برطانیہ کو یہ بھی خیال ہے کہ اگر بحرین بحال بحیرہ روم سے اُس کا اقتدار اٹھ گیا تو وہ افریقہ کے نیچے سے جو کر پرانا بکری راستہ اختیار کر لے گا۔ اس طرح اُس کا خیال ہے کہ تڑپ جی زیادہ نہ ہو گا۔ کیونکہ نہرو سوڈ کے محاصل جواب دینا پڑتے ہیں، اُس رستہ پر دینا نہ پڑیں گے۔ دوسرے فاصصے کی کمی رفتار زیادہ کر کے پوری کی جاسکتی ہے۔ تیسرے جنگ کے زمانہ میں بیہ کی جو رقم چڑھتی ہے وہ بھی بچ جائے گی۔ اگرچہ برطانیہ جہاں بحیرہ روم میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے، وہاں اُس کے ذہن میں متبادل راستے بھی ہیں۔

## سیاسی ملاقاوتیں

۱۔ ۱۹۳۷ء میں پورپ کے اکثر ممتاز سیاستدان اصرار دہ دہی باہمی ملاقاوت پر اسرار لکھنؤ اور سیم اعلانات کرنے میں مصروف رہے، ان میں سے اہم ملاقاوتیں ایک طرف سولینی اور ہٹلز اور دوسری طرف لارڈ ہیلے فکس اور ہٹلز کی تھیں۔

سولینی اور ہٹلز پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے، کیونکہ ہٹلز جرمن ازم میں یقین رکھتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن تمام ممالک کو جن میں جرمنی کے لوگ رہائش پذیر ہیں پریشیا کے سائے تلے لانا چاہتا ہے، لیکن سولینی یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے ہٹلز اور سولینی کا آپس میں تیل اور آگ کا تعلق تھا، لیکن واقعات کے موجودہ رجحان نے ان متخاصم ذہنیت کے مالک ڈکٹیٹروں میں اتحاد و یکجہالت کی روح پیدا کر دی ہے اور اسی وجہ سے ۱۹۳۷ء میں ہٹلز سولینی سے ملاقات کرنے کے لئے روکا گیا، اور گزشتہ سال ستمبر میں سولینی ہٹلز سے ملنے آیا۔

ملاقات کی نوعیت کو پوشیدہ رکھا گیا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ ان کے نتیجے میں روما اور برلن کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا ہے جس کی دوسرے پورپ میں بوشو ازم کا قلع قمع کیا جائے گا، اور اس کے دوسرے

کو آئندہ یہ تینوں ممالک مل کر دنیا سے روسی کیوزم کو ناپید کرنے کی کوشش کریں گے۔ دراصل اس مطلب کا ایک جہد نامہ ۱۹۳۷ء میں جاپان اور جرمنی کے درمیان ہوا تھا۔ لیکن اب اٹالیہ نے بھی اس میں شامل ہونا منظور کر لیا ہے۔

جس دن یہ معاہدہ ہوا اسی دن سازگھاڈا (ملاوی سنٹر لندن) نے اٹالیہ کے ایک اخبار میں لکھا تھا کہ اس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں گورادھی اور بیس لاکھ ٹن کے بحری بیڑے موجود ہیں۔ ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تینوں ممالک پُر امن نہیں رہنا چاہتے، بلکہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے وہ گولے اور بارود کا استعمال بھی بڑا نہیں سمجھیں گے۔

ایک اور معاہدہ جرمنی اور پولینڈ کے درمیان ہوا جس کی رو سے قرار پایا کہ وہ ایک دوسرے کے ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور اخلاق کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے۔ اس معاہدے کے ذریعہ جرمنی اپنے اوجہ لیفوں۔ روس اور زیکوسلوواکیا۔ کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ پولینڈ کی ایک سرحد پر روس ہے اور دوسری پر زیکوسلوواکیا۔ اور بہت ممکن تھا کہ روس زیکوسلوواکیا سے جرمنی کے خلاف کوئی ساز باز کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن اب یہ امکان بھی جاتا رہا۔

جرمنی اور پولینڈ کے اتحاد کی یہ میں ایک اور راز بھی ہے اور وہ یہ کہ جہد نامہ ورسائی کی رو سے جو نئی ریاستیں بنائی گئی تھیں ان میں ایک پولینڈ بھی ہے۔ اب جہاں پولینڈ کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی آزادی برقرار رہے وہاں فرانس کی بھی یہی مرضی تھی، اور اس مسئلے میں اس کی کچھ مالی امداد بھی کرتا رہا۔ لیکن جب ہر ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو اس نے تادان دینا بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس پولینڈ کی مالی امداد نہ کر سکا۔ اس سے پولینڈ کے لوگ برا فروخت ہو گئے اور کچھ اُنہوں نے سوچا کہ ہٹلر کے مقابلہ میں فرانس کی دوستی اُنہیں ہنگامی پڑے گی۔ چنانچہ اُنہوں نے فرانس کے متعلق اپنا نقطہ نگاہ بدل لیا، اور ہٹلر سے معاہدہ کر لیا۔ اس وقت فرانس کے ساتھ ان کا تجارتی معاہدہ ہے، لیکن وہ بھی برائے نام، کیونکہ ۱۹۳۷ء کے معاہدہ نے اسے بھی ناکارہ

کر دیا ہے۔

ایک معاہدہ اٹالیہ اور یوگوسلاویا کے درمیان ہوا۔ اگرچہ اٹالیہ کا یوگوسلاویا کے ساتھ وہی تعلق تھا جو جرمنی کا پولینڈ کے ساتھ۔ لیکن روس کے مقابلے میں اپنی قوت کو محفوظ کرنے اور وسطی یورپ میں اپنی سیاست کو مستحکم بنانے پر کھڑا کرنے کی غرض سے سو لینی کو یہ کراڈا گھوٹ پنپا پڑا۔ دراصل سو لینی بحیرہ ایڈریاٹک پر جو اٹالیہ اور یوگوسلاویا کے درمیان ہی اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے، اسی غرض کے لئے اس نے بعض بندرگاہوں پر قبضہ جمایا اور البانیہ کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا۔ اور اب اسی لئے یوگوسلاویا سے اس نے ایک معاہدہ کیا ہے، اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ برطانیہ وسطی یورپ میں اٹالیہ کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اور ریاست بلقان میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

وسطی یورپ میں اقتدار بڑھانے کے لئے سو لینی کی نظروں میں ممالک پر بھی ہے۔ چنانچہ اس نے مین پرنگاہ التفات ڈالنا شروع کر دی ہے، اور اسلام لازمی اور مسلم پر لٹوی کے ڈھونگ کے سایہ تلے اس پیشین بڑھا رہا ہے۔

پیش آمدہ جنگ کے خوف سے اسلامی ممالک بھی آپس میں رستہ اتحاد جوڑ رہے ہیں، چنانچہ ”معاہدہ سعد آباد“ اسی کا ایک شاخسانہ تھا۔ ترکی، افغانستان، ایران اور عراق نے آپس میں عہد کیا ہے کہ وہ سیاسی خطرات کے وقت ایک دوسرے کے درست دست ہوں گے۔ برطانیہ اس معاہدہ سے خوش ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مسلم ممالک اٹالیہ کے زنگے میں نہ آئیں گے۔ بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کا ہی ساتھ دیں گے، اور یہی چیز ہے جس کی اسے آج کل تلاش ہے۔

پھر جاپان نے بھی اٹالیہ سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ حبش سے روٹی لینے کی اجازت دے گا، اور اس کے بدلے میں وہ اس کی ہر ممکن امداد کرے گا۔ وسطی یورپ میں اٹالیہ نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ لیگ آف نیشنز کا مقابلہ کیا جائے، اور پرتگال، بلغاریہ، البانیہ، جاپان اور جرمنی کی مدد سے ایک عہدہ فیملائی لیگ قائم کی جائے۔

## تقسیم فلسطین

برطانیہ نے برسرِ اقتدار آتے ہی جرمنی سے یہودیوں کو نکالنا شروع کر دیا۔ اب ان کو کہیں سر چھپانے کی جگہ درکار تھی۔ مجبوراً وہ اپنے پرانے وطن فلسطین کی طرف راغب ہوئے۔ کچھ استعمار پسند انگلستان نے ان کی مدد کی۔ عرب پیسے ہی برطانوی انداز سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ان کو دبانے کے لئے یہودیوں کو ان پر مسلط کر دینے سے بہتر کوئی تجویز نہ تھی، لارڈ بالفور نے پیسے ہی اعلان کر دیا تھا کہ فلسطین یہودیوں کا گھر ہے، اور وہ یہاں آکر آباد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہودی دھڑا دھڑا فلسطین میں آنے لگے، عربوں نے جب دیکھا کہ ان کی قومیت پر کھڑا چل رہا ہے تو انہوں نے صدارتے احتجاج بند کی، معاملہ معروضی قوانین میں ڈالنے کی غرض سے برطانیہ نے ایک شاہی کمیشن مقرر کر دیا، جس کی وسط سڑک میں پورے ایک سال بعد رپورٹ شائع ہوئی۔

اس رپورٹ کی روش سے فلسطین کا ذخیرہ اور اہم ترین ساحلی علاقہ یہودیوں کو دیا گیا۔ عرب معمولی سے بنجر علاقہ کی طرف دھکیل دیے گئے اور بیت المقدس خود سفیر برطانیہ کی تحویل میں رہا۔

عربوں پر یہ کیا کم ستم تھا کہ ان کے ملک کے اس طرح سے جتنے بنجرے کر دیے جائیں۔ لیکن غضب ہالائے غضب یہ ہے کہ ساحل کا تمام عمدہ علاقہ ساری ذخیرہ زمینیں اور پھر خود قبضہ اولیٰ بیت المقدس کا شہر ان سے چھین لیا گیا۔ یہ ہے عرب کی ان وفا کشیوں کا صمد جو انہوں نے اپنیوں کو جھوڑ کر غیروں سے رواد رکھیں۔ خود شاہی کمیشن کا اعتراف ہے کہ جنگِ عظیم میں اتحادیوں کی کامیابی کو عرب اپنی مکمل آزادی سمجھے ہوئے تھے، اور یہی دلولہ ان کو جنگ میں ہمت دلا رہا تھا۔

اور حق یہ ہے کہ برطانیہ نے سر بہری سیکوہن کے ذریعہ شریف حسین سے یہ پختہ معاہدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد عربی ممالک کی جس میں نجد و حجاز، عراق و شام شامل تھے آزادی تسلیم کر لی جائے گی۔ فلسطین ترکی حکومت میں شامل تھا اس لئے لازماً اس کے معنی یہ تھے کہ فلسطین بھی آزاد ہوگا، لیکن فرانس کہ استعمار پسندوں کی پرانی سیاست کاہن آئی اور معاہدات حوالہ طاق نسیاں کر دئے گئے۔

شریف حسین کو جزیرہ عرب کی مکمل آزادی کا یقین دلانے کے بعد برطانیہ اور فرانس کے درمیان کچھ عہد و پیمان ہوئے، اور انہوں نے شمالی عرب یعنی شام و عراق کا علاقہ خفیہ خفیہ اپنے درمیان تقسیم کر لیا۔ بیت المقدس کے متعلق ہے ہوا کہ وہ ترکی حکومت سے عہدہ کر کے آپس میں سے کسی ایک اٹینی فرانس، برطانیہ یا روس کو دیدیا جائے۔

سلسلہ تک کسی کو اس معاہدہ کی اور خصوصاً حصہ دوم کی کافوں کان خبر نہ ہوئی۔ لیکن آخر گھر کے سیدی روس نے لٹکا ڈھکا دیا۔

اپنی دلوں یعنی نو سیر سلسلہ میں برطانیہ نے یہودیوں سے بات چیت شروع کی، اور اس کا نتیجہ اعلانِ بالفور کی شکل میں رونما ہوا جس میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی گھر تسلیم کیا گیا اور وعدہ کیا کہ انگریز ان کو دہائی آباد ہونے میں ہر ممکن امداد دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی فلسطین کی غیر یہودی آبادی کو یہ یقین دلایا گیا کہ ان کے مذہبی اور معاشری حقوق بالکل محفوظ ہوں گے۔



یہودی آبادیاں

رہائشیں

ایک طرف فلسطین میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے تو دوسری طرف جزیرہ عرب، شرق اردن، شام اور عراق میں برطانیہ کی اس حکمت عملی کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ برطانیہ کب تک گولہ و بارود کے ذریعہ عربوں کو شاہی کمیشن کا فیصلہ ماننے پر اصرار کرتی ہے۔

## معاهدہ مصر و برطانیہ اور اسکے بعد

۱۹۳۷ء میں مانسٹر کا نفرش کے فیصلہ کے مطابق غیر اقوام کو مصر میں جو مراعات حاصل تھیں وہ منسوخ کر دی گئیں۔ انگریزوں سے ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے وہ ہنر سوز پر کاذم میں برس تک مع اپنی فوج کے سلاطین رہیں گے اور مصر کو جمعیتہ الاقوام کا ایک قائمہ رکن تسلیم کر لیا گیا۔ اس فیصلہ کو کما حقہ ذہین نشین کرنے کے لئے ہم مصر کی تاریخ مراعات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

مراعاتی نظام کی ابتداء ترکی خلفا کے عہد میں ہوئی، جنہوں نے مخصوص سیاسی حکومتوں کو اپنے ملک میں بعض داخلی آزادیاں نوازش فرمائیں، پیسے تو یہ نوازشیں صرف تجارت تک محدود تھیں، لیکن جب عثمانی سلطنت کمزور ہو گئی تو ان حقوق کی نوعیت بدل گئی۔ ترکوں کی ہشمرست کے بعد ہر فاسخ قوم مراعات میں اپنے لئے ایک نئی دفعہ کا اضافہ کر دیتی تھی، اور حکومت کو اسے مجبوراً منظور کرنا پڑتا۔

بعد کو یہ حقوق صرف تجارتی ذریعے بلکہ عدالتی امور پر بھی حاوی ہو گئے۔ غیر ملکی لوگ اپنے مقدمات کے فیصلے کے لئے عہدہ عہدہ عدالتوں کا مطالبہ کرنے لگے، اور ان کی پشت پر ان کی حکومتیں ہوتی تھیں۔ اگر کوئی عثمانی حکومت کا فرد کسی غیر ملکی پر ہات بھی اٹھاتا تو اس کی حکومت کے بیڑے باب عالی پر دباؤ ڈالنے کے لئے آپیونچتے تھے۔ اس کے علاوہ عثمانی حکومت غیر ملکیوں کی رعنائندی کے بغیر نہ تو کوئی نئی اقتصادی پالیسی اختیار کر سکتی اور نہ کوئی ریل گاڑی تک بنا سکتی تھی۔

جنگ عظیم کے بعد خود ترکیہ میں تو یہ مراعات منسوخ کر دی گئیں لیکن چونکہ مصر اب ترکیہ سے عہدہ تھا، اس لئے برطانوی اقتدار کے طفیل نیل کا یہ فیضان بڑی فیاضی کے ساتھ جاری رہا۔ بلکہ اس میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ان مراعات کی مدت غیر محدود عرصہ کے لئے بڑھا دی گئی۔

مصر میں ایک طبقہ ان غیر ملکی تھکنڈوں کے خلاف تھا، لیکن فرمانروا

مسٹر لائڈ جارج نے بھی جو اس وقت برطانیہ کے وزیر اعظم تھے، اب کمیشن کے روبرو تسلیم کیا کہ یہودی رہنماؤں نے برطانیہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اتحادی فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن بنانے میں خاطر خواہ مدد کریں تو وہ اپنی تمام تر کوششیں اتحادیوں کی حمایت میں صرف کر سگے۔

پھر حال اگر فلسطین کی موجودہ تقسیم کی گئی ہے تو وہ برطانیہ کے ان سوا عہد و موافق کی بنا پر ہے جو جنگ عظیم کے دوران میں یہودیوں سے کئے گئے۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا وجہ ہے کہ انگریزوں نے یہودیوں کے معاہدات تو پورے کر دیئے لیکن عربوں کے موافقین کو درخور اعتناء نہ سمجھا تو اس کی وجہ ہم سوائے اس کے کچھ نہیں بتا سکتے کہ ملکیت حجازی کا بھی تعلق تھا۔

در اصل فلسطین کا ساحل بحیرہ روم کی ایک زبردست دیوار ہے جس پر برطانیہ کسی صورت میں بھی دست کش نہیں ہو سکتا۔ حیفا یہاں کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے، اور روز بروز اس کی اہمیت بڑھ رہی ہے، عراق سے تیل کے پائپ کی جولان فلسطین سے گزرتی ہے اس کا حزب بھی یہیں ہے، اور یہ فلسطین کی ریلوں کا مرکز بھی ہے۔ علاوہ ازیں برطانیہ نے ایک بروائی مستقر تہذیبیں بنا رکھی ہیں اور دوسرا حیفہ کی سرزمین پر قائم کیا جائے گا۔

الغرض فلسطین کی عسکری سیاسی اور اقتصادی اہمیت ایسی ہے کہ برطانیہ اس سے اپنا انتداب ہرگز اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو گا، اور

علی الخصوص اب جبکہ بحیرہ روم میں اس کے اقتدار کو ضعف پہونچ رہا ہے فلسطین کا ساحل اس کی اُمیدوں کا آخری ہمارا ہو گا۔

شاہی کمیشن کی رپورٹ سے عربوں میں قدرتنا ہیجان پیدا ہوا۔

اور وہ پیسے سے بھی زیادہ یہودیوں اور انگریزوں کا مقابلہ کرنے لگے، حتیٰ کہ مسٹر اینڈریو زیچی ان کے حصے سے محفوظ نہ رہ سکے، لیکن برطانیہ نے

فیصلہ کیا کہ عربوں کی اشتعال انگیزی کو نہایت سختی سے دبا دیا جائے، چنانچہ گورہ فوج نے اپنی طاقت استعمال کی۔ تمام فلسطین پر فوجی قبضہ ہو گیا

محس اعلیٰ توڑ دی گئی، اور اس کے ارکان قید و بند کی نذر ہوئے، ہر روز گزری جا رہی تھانسی لی جانے لگی، جس کے قبضہ سے آتشیں ہتھیار نکلتا

اس کو فوراً حوالہ دار کر دیا جاتا، اسی کشمکش میں مفتی فلسطین کو سب لگن پڑا۔

وہ فرانس میں پناہ گزین ہوا تو برطانیہ کے اشارہ پر نظر بند کر دیا گیا۔

ہیں۔ الجزائر پر اُس کا سو برس سے زیادہ عرصے سے قبضہ ہے۔ اس طویل مدت میں فرانس کی حکمت عملی یہ رہی ہے کہ اہل الجزائر کو اپنی زبان، مذہب، قومیت اور تمدن سے بگایا نہ کر کے انہیں حقیقی معنوں میں فرانس کا غلام بنا دیا جائے۔

اس تجویز کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اُس نے عربی زبان کی ترویج و تدریس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ نام نہاد "علماء" اور "صوفیاء" کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ تاکہ روشن خیال، نوجوان اپنے سنہ شدہ مذہب سے متنفر ہو جائیں اور نئی نسلیں مذہب سے عاری اور فرانسیسی تمدن کی دلدادہ بن کر نکلیں۔ جزائری عربوں کی قومیت کو فنا کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ جو جزائری اپنی قومیت کو چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کرتا اُس کے ساتھ خاص۔ مائتیں ٹھوکر کھتی جاتیں، جس کے دوسرے معنی یہ ہوتے کہ اب وہ بجائے اسلامی سرعلیت کا پابند ہونے کے فرانسیسی قوانین کے ماتحت آگیا ہے۔ اور اس طرح پر فرانس کا خیال تھا کہ اسلامی ثقافت اور عربی تمدن بالکل نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اہل الجزائر کو فرانسیسی بنانے کے لئے عیسائی مشنریوں سے کام لیا جائے لگا۔ اور جہاں اسلام کی تبلیغ کو روک دیا گیا وہاں عیسائیت کی ترویج کی گئی۔

اگر عامل یہاں تک ہی رہتا تو شاید الجزائر میں آج اتنی بے اطمینانی نہ پھیلتی۔ لیکن اس کے علاوہ فرانس نے ساحل کی زرخیز زمینیں عربوں سے چھین کر فرانسیسی آبادکاروں کو دے دیں۔ تجارت بندت و حرقت اور دولت آفرینی کے تمام ذرائع پر بھروسہ اور فرانسیسی قابض کر دیئے۔ اور جزائری ایک مزدور بن کر رہ گیا۔ ان سب باتوں کا ردِ عمل عزوری تھا جو اب "شورش" کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔

اسی طرح مراکش میں بھی ۱۹۱۲ء سے فرانسیسی اقتدار قائم ہے، وہاں اگرچہ "سلطان مراکش" نام کو باقی ہے۔ لیکن دراصل سب کچھ فرانسیسی ہائی کمانڈر کے ہات میں ہے۔

جنگ عظیم کے بعد اہل مراکش نے آزادی کے لئے کوشش کی۔ لیکن ان کو آپس میں لڑا کر اس تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا۔

مراکش میں دونوں کے مسلمان آباد ہیں، ایک نوعب ہیں

وقت کے سلسلے کسی کو دم مارنے کی حرات نہ ہوتی تھی۔ آخر اتفاق سے مصر اور اطالیہ کی آپس میں بھڑکائی۔ مصر نے اس نازک وقت سے فائدہ اٹھایا۔ ملک میں ہڑتالیں ہوئیں۔ طلباء نے مدارس چھوڑ دیے۔ گولی چلی، چند ایک مرے، نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے مصری جوشیلوں کو رام کرنے کی کوشش کی بسنے سے قبل والا دستور بحال ہو گیا۔ وفد پارٹی برسرِ اقتدار آئی۔ برطانیہ سے معاہدہ ہوا۔ منجانب سے کے بعد یورپی مراعات کا خاتمہ کر دیا گیا۔ برطانوی دخل اندازی بہت حد تک کمزور ہو گئی۔ اور مصر کو جمعیتِ اقام کا ممبر بنا دیا گیا۔

معاہدہ مصر و برطانیہ کے رواجِ رواں کا سنا پاشا وفد پارٹی کے لیڈر ہیں۔ لیکن ملک کے اکثر لوگ (خصوصاً طلبہ) اُن سے برا فز و خستہ ہیں کہ کیوں امتوں نے برطانیہ سے معاہدہ کیا۔ مکمل آزادی حاصل کیوں نہیں کی، چنانچہ وفد پارٹی کے خلاف شورش کر رہے ہیں۔ اداکل و ممبر میں سخاس پاشا پر ہزاروں شوشوں نے جو معاہدہ کے خلاف ہیں حملہ بھی کیا تھا۔ اور عام خیال یہ ہے کہ وفد پارٹی اب زیادہ دیر تک برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتی۔

شاہ فاروق جواب مصر میں حکمران ہیں عوام میں بہت ہر دل عزیز ہیں۔ سخاس پاشا کو اُن کی یہ ہر دل عزیز ہی ایک آنکھ نہیں سمجھتی، شاہِ بدوہ مسولینی اور ہٹلر کی طرح ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہے، لیکن بادشاہ اور عوام اسے یہ اختیار دینے کے خلاف ہیں۔

افریقہ میں مصر اگرچہ اب برطانیہ کا کٹ پتلی نہیں رہا۔ لیکن آپس کے جھگڑاؤں سے غیر اقام کو طعنہ زنی کا موقع دے رہا ہے  
اُدھر مسولینی لیبیا پر اپنی فوجیں اکٹھی کر رہا ہے۔ دادوی نبل پر قبضہ کرنے کی خواہش مسولینی کے دماغ میں اس قدر جا گزیں ہے کہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ مصر کا بھی کہیں وہی حشر نہ ہو جو آج سے ایک سال قبل حبش کا ہو چکا ہے اور اس طرح پردہ آسمان سے گر کر کجوریں اٹک جائے۔

## فرانسیسی نوآبادیات میں شورش

جب سے مسولینی نے حبش کو فتح کیا ہے شمالی افریقہ کے عربوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے، اور وہ آزادی کے لئے ہات پاؤں مار رہے ہیں۔

فرانس کے شمالی افریقہ میں مراکش اور الجزائر دو مشہور مقبوعات

## فرانس میں بادشاہت کے لیے پھینکی

نپولین کی گرفتاری کے بعد فرانس میں جمہوریت قائم ہو گئی تھی۔ مگر وہ چند ہی سال رہی۔ اس کے بعد نپولین سوم آیا۔ اس نے تمام دنیا کو فتح کر کے نپولین اول کی طرز حکومت بول کرنا چاہی۔ لیکن بد قسمتی سے اُن دنوں جرمنی میں ہمارے چانسلر تھا۔ جو نپولین سوم سے کہیں زیادہ مذمخ اور سستہ دماغ تھا۔ چنانچہ نپولین سوم کے خواب پریشان ہو گئے اور وہ انگلستان جاکر فوت ہو گیا۔

اس کے بعد حکومت جمہوری کا آغاز ہوا۔ جو آج تک قائم ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہاں ایسے اشخاص پیدا ہو جاتے ہیں جو اپنے آپ کو نپولین کی اولاد کہتے ہیں۔ اور تخت و تاج واپس مانگتے ہیں۔ چنانچہ ستمبر میں فرانس کے ڈیڑھ لاکھ فوجی گائی نے اعلان کیا کہ وہ فرانس کے اسی بادشاہ لوئی کے خاندان میں سے ہے۔ اس لئے تخت و تاج اُسے واپس ملنا چاہئے۔

علاوہ ازیں فرانس میں آج کل عام بے چینی بہت بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ سیاسی اور اقتصادی دو دنوں ہیں۔ ستمبر میں سٹیوکی کے مبینہ قاتل واقعہ ہوا۔ جس میں کئی وزرا بھی شامل تھے۔ آخر جب سازش کا انکشاف ہوا تو وزارت کو استعفیٰ ہونا پڑا۔ اُس وقت فرانس میں سٹر پارٹیمینٹ وزیر اعظم تھے۔ پہلے تو انھوں نے اس معاملہ کو دبانے کی کوشش کی۔ مگر یہ اتنا اہم تھا کہ دب نہ سکا۔ چنانچہ دوسری وزارت آئی۔ لیکن فاشسٹوں نے اس موقع کو ہات سے نہ جانے دیا، اور جی بھر کر سرکاری خلاف پروپیگنڈا کیا۔ بد قسمتی سے وہ حکومت پر قابض نہ ہو سکے۔ اُس وقت سے لے کر حزب اختلاف اور حزب المطلقین میں خوب لے دے ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالات نے بھی اپنا اثر کیا اور ان دو دنوں پارٹیوں کے اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

آج یہ حالت ہے کہ ایک سوشلسٹ حکومت برسرِ اقتدار ہے، مگر فاشسٹ برابراُس کو ناکام بنانے پر تھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس سال ایک سازش کا جو فاشسٹوں کی طرف سے کی جا رہی تھی انکشاف ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے لئے کئی ماہ سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ غیر ملکی امداد

جو زیادہ تر داخلی علاقوں میں اقامت گزیں ہیں اور دوسرے بربر ہیں جو اندرونی ملک اور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔

عرب بیشتر تعلیم یافتہ ہیں، عربی اُن کی مادری زبان ہے۔ لیکن بربر عربی زبان اور اسلامی ثقافت سے ایک حد تک بیگانہ ہیں، فرانس نے بربروں کو عربوں کے خلاف اُگس یا اور اُنہیں عربی زبان، اور اسلامی تمدن سے بالکل علیحدہ کرنے کے لئے اُن میں "بربری قومیت" کا خیال پیدا کیا۔ اُن کی آبادی میں عربی زبان کی درسگاہیں مندرجہ گئیں اور مسلمان و غلطوں اور مدرسوں کو بربروں تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ اب تک بربر اسلامی شریعت کے تابع تھے، لیکن فرانس نے شریعتی تعلیم منسوخ کر کے فرانسیسی قانون نافذ کیا، اور جزائر کی طرح عیسائیوں کو ملک بھر میں پھیلا دیا۔

ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مراکش میں بے چینی بڑھ گئی۔ ان "اصلاحات" کو نہ صرف عرب بڑی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ خود بربر بھی اُن کے خلاف ہیں۔

مراکش کی اس صورتِ حال نے اسپین کی غارتگری کی وجہ سے اور بھی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مراکش عرب دیکھتے ہیں کہ اُن کے پڑوسی اسپینی مراکش کے باشندے فرانکو کی فوج میں وھڑا دھڑ بھرتی ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ ہنوز فرانسیسی غلامی کی زنجیروں میں مقید ہیں، اور سرحدیں عربوں پر خاص غنا بات نوازشات کی بارش کر رہا ہے، جس سے مراکش کے عربوں کو اور زیادہ شہ لی ہے۔ شمالی افریقہ کے عرب ہر ہٹلر سے بھی متنق ہیں، کیونکہ وہ یہودیوں سے تنگ آئے ہوئے ہیں، اور ہٹلر کی یہودی دشمنی زبان زدِ حلائی ہے۔

یہ اہل چل صرمت مراکش اور الجزائر تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اثر ٹونس میں بھی ہے۔ وہاں کا مشہور رہنما عبد العزیز الثعالبی ایک عرب کی جلا وطنی کے بعد واپس ٹونس پہنچ چکا ہے اور ملک کی مردہ تحریک میں از سر نو جان پڑ گئی ہے۔

فرانسیسی حکومت نے ان جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک کانفرنس بلائی ہے۔

سننے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ دو سال کے بعد ہماری بات پر غور کرنے لگ جائیں گے۔ تین سال کے بعد وہ یہ بھی سوچنے لگ جائیں گے کہ اس مطالبہ کو کیسے پورا کیا جائے؟

جو لوگ ہرٹلر کی طبیعت کو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہرٹلر غالی ہاتھ بنانے والا نہیں بلکہ وہ نہایت عملی آدمی ہے۔ اُس نے اپنے ملک میں خاص اسی غرض کے لئے ایک محکمہ بنایا ہے جس کا انچارج برطانیہ کا جنرل سفیر وان رین ٹراپ ہو گا۔ اس محکمہ کا مقصد صرف نوآبادیات کی دہلی ہو گا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہرٹلر یا مسوینی اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے کیا ذریعہ اختیار کیا کرتے ہیں۔

اس وقت کئی ملک میں جو جرمنی کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں، اٹلی اور جاپان تو پہلے ہی اُس کے ہم آہنگ ہیں۔ فرانس کے فاسٹسٹ بھی اُس کے مطالبہ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ بیجیم کی ڈیگرل پارٹی اُس کے ساتھ ہوگی۔ پرتگال، آدھا اسپین اور پولینڈ کا کافی حصہ اُسے امداد دے گا۔

اب افریقہ میں بھی اُس کے حامی پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً ساؤتھ افریقہ کی حکومت کے وزیر سٹرن ڈالٹرن نے اس مطلب کا ایک اعلان بھی کیا تھا۔ پس جب بہت سے ملک اور لوگ جرمنی کی پشت پر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنا مطالبہ نہایت زور سے پیش نہ کرے۔

سننا جاتا ہے کہ لارڈ ہیلی فیکس نے ہرٹلر سے ملاقات کے وقت انگلستان کی طرف سے کہا کہ اگر جرمنی دس سال تک اپنی نوآبادیات کا مطالبہ نہ کرے تو اُس کے عوض انگلستان اسے مرکزی یورپ میں اپنی پہلی ملکیت مانگنے میں کوئی رکاوٹ حاصل نہ کرے گا۔ اس سے فرانس اور مرکزی یورپ میں قدرتنا تشویش بڑھ گئی، فرانس کے دو وزراء انگلستان گئے اور برطانوی وزراء سے ملاقی ہوئے۔ ملاقات کے بعد اعلان کیا گیا کہ دونوں ممالک کے مفاد یکساں ہیں۔ جس سے غلط فہمی بہت حد تک دور ہو گئی۔

## ملحکم کی غیر جانبداری

سارا کتبہ شہزاد کو ہرٹلر نے ملجم سے یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اُس کی غیر جانبداری کی قدر کرے گا۔ بلکہ اگر کسی اور ملک نے اس پر حملہ کیا تو

بھی بنیا ہوتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں کئی جگہ کاسٹیاں ہوئیں اور ہم ہسپول بشین گن وغیرہ بہت سا جنگ کا سامان برآمد ہوا ہے۔ ایک نقشہ مشرق وسطیٰ و زیر علم کے گھر کا بھی دستیاب ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ملی تھیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سازش ایک وسیع پیمانے پر مرتب کی گئی تھی۔ اس سازش میں حصہ لینے والوں کو لیکچرہ رڈزیا (نقاب پوش) کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی گرفتاریاں ہوئیں، جن میں مخدہ دیگر ملزمین کے فاسٹسٹوں کا لیڈر کرنل ڈی دلاک بھی تھا۔ اس شخص نے فرانس میں بعض خفیہ سوسائٹیاں بنائیں جن میں سے

اور

مشہور ہیں۔ ان کا کام بادشاہت کو واپس لانے کی کوشش کرنا ہے۔ فرانس میں مخالفین اشتراکیت کی بہت سی اکٹھیں ہیں۔ لیکن باوجود کوشش کے یہ اب تک مجتمع نہیں ہو سکیں۔ ورنہ شاید ان کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی۔

## جرمنی کا نوآبادیات کے لئے مطالبہ

جرمنی کئی سال سے زماں جنگ کی جھینسی ہوئی نوآبادیات کی دہلی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ لیکن جس شد و مد سے اُس نے یہ معاملہ شہر میں اٹھایا اُس کی مثال شاید کسی پہلے سال میں نہ مل سکے گی۔

آج سے پانچ سال قبل جرمنی کے سابق چانسلر وان پابن نے کہا تھا کہ معاہدہ ورسائی پر ہر صورت نظر ثانی کی جائے گی۔ اور اس میں یہ ترمیم ضرور ہوگی کہ جرمنی کی نوآبادیات واپس کی جائیں۔

اس کے دو سال بعد ہرٹلر نے کہا شروع کیا کہ عالمگیر امن کے لئے ضروری ہے کہ جرمنی کی نوآبادیات واپس کی جائیں۔ اُس وقت کسی نے بھی خیال نہ کیا کہ معاملہ کس حد تک پہنچنے والا ہے۔ لیکن ہرٹلر اور اُس کے رفقاء کی تعادیر کا موجودہ رجحان اقوام عالم کے لئے یقیناً فکر انگیز ہے۔

شہزاد میں ہرٹلر نے ایک تقریر کی جس میں صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم اپنی نوآبادیات کی دہلی کا مطالبہ کبھی بند نہیں کر سکتے۔ ہم اُسے ہر سال بلند سے بلند تر آواز میں پیش کرتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ دول عالم اُس کو سننے پر مجبور ہو جائیں۔ پھر اُس نے کہا، ایک سال کے بعد لوگ ہماری بات



وہ اس کی مخالفت کرے گا۔

سیاست یورپ میں مجیم کی حیثیت کو سمجھنے کے لئے یہ جانا چاہئے کہ یہ ملک فرانس اور جرمنی کے درمیان واقع ہے۔ بدیں وجہ جب کبھی بھی فرانس اور جرمنی کے درمیان جھگڑا اٹھتا ہے تو اس کا نقصان مجیم کو ضرور پہنچتا ہے۔ مجیم کو کئے۔ لوہے اور فولاد کا مشہور مخزن ہے۔ علاوہ ازیں یہ کتہ بشیدہ رحبت اور ردی بھی کافی مل جاتی ہے۔

یہ اس کی اس اہمیت کا ہی نتیجہ ہے کہ دنیا کی اکثر بڑی بڑی لڑائیاں اس کے میدانوں میں لڑی گئیں۔ چنانچہ وارلور۔ لودوینس۔ کورٹائی۔ بلینیم۔ اور پیرس کی جنگیں اسی جگہ پر ہوئی تھیں۔ پس اگر مجیم کو ہندوستان کا پانی پت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۱۹۳۷ء کے صلح نامہ کے مطابق مجیم کو آزادی حاصل ہوئی۔ وہاں کے رہنے والوں نے اپنی نازک پوزیشن کو جانچ لیا۔ اور انہیں محسوس ہو گیا کہ وہ دو زبردست ملکوں کے درمیان ہیں۔ اس لئے خیر اسی میں ہے کہ وہ غیر جانبدار رہیں۔ اسی نظریہ کے مطابق ۱۹۳۷ء تک وہ کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے۔

چونکہ مجیم کے انگلستان وغیرہ کے ساتھ معاہدات تھے کہ وہ اسکی غیر جانبداری کی قدر کریں گے، اس لئے جنگ عظیم کے موقع پر انگلستان نے فرانس اور جرمنی سے قول مانگا کہ وہ مجیم پر چڑھائی نہ کریں گے۔ فرانس نے صحبت وعدہ کر دیا۔ لیکن جرمنی نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کی اصل غرض مجیم کے راستے فرانس پر حملہ کرنا تھا۔ جب موقع آیا تو مجیم نے جرمن فوجوں کو اپنے ملک میں سے گزرنے کی اجازت نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی نے مجیم پر دھاوا بول دیا۔ اور اس کی حفاظت کے لئے انگلستان بھی جرمنی کے خلاف ہو گیا۔

جنگ کے بعد مجیم نے پھر اپنی غیر جانبداری کے لئے دیگر ممالک سے اقرار لیا۔ لیکن جب سے ہر ہٹلر برسرِ اقتدار آیا ہے۔ مجیم کے خطرات او بھی بڑھ گئے ہیں، اسی لئے اس نے ہر ہٹلر سے اپنی غیر جانبداری کی قدر کرنے کا معاہدہ کر دنا چاہا اور وہ اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر ہٹلر ایسا ڈکٹیٹر اپنے وعدہ پر قائم رہے گا؟

مجیم میں اس وقت جمہوری حکومت ہے، اور نومبر سے پہلے اس کا وزیرِ اعظم سٹروینز لینڈ تھا۔ اس جمہوریت میں ایک فاشسٹی پارٹی بھی ہے، جس کا لیڈر ڈیگزل ہے۔ یہ وینزلی لینڈ کا سخت دشمن ہے، اور ہر وقت اس کو گرانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ یہاں تک لذت آئی کہ سٹروینز لینڈ نے اس کے ساتھ ایک آخری فیصلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ انتخابات ہوئے۔ جس میں ڈیگزل کبھی طرح شکست ہوئی۔ لیکن ڈیگزل نے ہمت نہ ہاری۔ اور وینزلی لینڈ پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی وزارت کے ایام میں نیشنل بینک سے ۲۳۰۰ پونڈ سالانہ حاصل کرتا رہا ہے۔ پارلیمنٹ میں عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی۔ لیکن ڈیگزل کو صرف ۳۷ ووٹ ملے، اور وینزلی لینڈ کو ۱۳۴۔

اگرچہ وینزلی لینڈ کو بھاری اعتماد حاصل ہوا۔ لیکن اس نے ایسے ذمہ دار عہدہ پر قائم رہنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ اس نے اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔

استغنے کے بعد مجیم کے بادشاہ لیوپلڈ نے وین ڈر ویلڈ کو دعوت دی کہ وہ وزارتِ مرتبہ کرے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ پھر ہینری ڈی مان کو جو ایک اشتراکی ہے اور گزشتہ وزارت میں وزیرِ مالیات رہ چکا ہے۔ یہ عہدہ دیا گیا۔ لیکن لیبروں نے اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے اس کی وزارت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ بعد ازاں یہ کام ہیولرٹ پارٹلاٹ وزیرِ زرعیت کے سپرد کیا گیا۔ لیکن وہ بھی ناکام رہا۔ لہذا استوینز کی گئی کہ ایک مشترکہ وزارت قائم ہو لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ بعد ازاں سٹروینز پارک کو جو برسلز کا نفرنس کا صدر تھا وزیرِ اعظم بنایا گیا۔ لیکن اسے بھی کامیابی نہ ہوئی۔

اس کے بعد شاہ لیوپلڈ نے سوچا کہ بہتر ہوگا اگر چند دن تک اس مسئلہ کو نہ جھجھکا جائے تاکہ لوگ اطمینان سے اس پر غور کر سکیں۔ چنانچہ وہ پانچ روز کے لئے انگلستان چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر اس نے سابق لبرل وزیرِ سٹروینز کو ترتیب وزارت کا کام سپرد کیا۔ لیکن وہ بھی اپنی چند دن کی کوشش کے بعد ہار تھا کہ مجیم گیا۔ کیونکہ اشتراکیوں نے اس کی مخالفت کی۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ مجیم میں خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ وزیرِ لینڈ



اور اس مقصد کے وہ تعمیری پروگرام کا حامی ہے۔ چنانچہ اس نے پانچا  
اقتصادی پروگرام اسی غرض کے بنائے ہیں۔

روس میں موجودہ دور دہشت کے خلاف عام بے پنی پھیل  
رہی ہے اور لوگ آمریت سے اٹنا گئے ہیں۔ ان کا مطالبہ از سر نو منہا  
قائم کرنے کا ہے۔ اور کوئی بعید نہیں کہ کسی وقت موجودہ حکومت کو عات  
اناس کے اسی مطالبہ کے سامنے جھکنا ہی پڑے۔

## آئرلینڈ کا نیا دستور

آئرلینڈ مدت سے اپنی آزادی کے لئے کوشاں ہے۔ بدیں وہ  
وہاں کے واقعات ہندوستان کے لئے علی الخصوص وجہ دلچسپی ہیں۔  
جولائی ۱۹۳۷ء میں آئرلینڈ کے عام انتخابات ہوئے۔ ڈی ولیر  
اور ان کی گزشتہ وزارت کے اکثر اراکین پھر منتخب ہو گئے۔ لیکن انہوں  
یہ رہا کہ ڈی ولیر کی سیاسی جماعت "نیا نائفل" کو اتنی اکثریت حاصل نہ  
ہو سکی کہ وہ بغیر کسی دوسری جماعت کی امداد کے حکومت کا کاروبار  
چلا سکے۔

کل ۳۸ نشستیں تھیں، جن میں سے ۶۹ ڈی ولیر کی پارٹی کو ملیں۔  
اور باقی ۶۹ دیگر پارٹیوں کو۔ ڈی ولیر کو اپنی وزارت قائم کرنے کے  
لئے کسی دوسری جماعت کے نمائندہ کو ساتھ ملانا ضروری تھا۔ اور اسی  
جماعت سب معمول مزدور پارٹی ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن حسرت یہ رہی کہ  
پارٹی کو سیاسیات سے قطعاً کوئی شغف نہیں ہے، بدیں وہ جیسا کہ  
ڈی ولیر کی پارٹی زیادہ ویرنگ برسرِ اقتدار نہ رہ سکے۔ اور دوبارہ  
چناؤ لڑنا پڑے۔

عام انتخابات کے ساتھ ساتھ آئرلینڈ میں نئے دستِ بے اساسی پر  
قوم کی رائے حاصل کی گئی تھی۔ اور قوم نے بڑی بھاری اکثریت کے ساتھ  
اسے منظور کیا۔

اس دستور کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ اس میں بادشاہ یا  
سلطنت برطانیہ کا نام تک نہیں لیا گیا۔ اس دستور کی اہم دفعات کا  
خلاصہ یہ ہے۔

ملک کا نام EIVE ہو گا۔ ریاست کا حاکم اعلیٰ "صدر" کہلائے گا۔

ایک ہر دلعزیز آدمی تھا۔ لیکن وہ اپنے وقار کی خاطر مستغنی ہو چکا ہے۔  
ڈیگرل کا خیال ہے کہ وہ خود وزیرِ اعظم بنے گا۔ کیونکہ غالباً وہ  
جرمنی کی شہ پرناچ رہا ہے، لیکن سوال یہ ہے کیا اسٹراکی فرانس کے "فرٹ  
پارلر" کی امداد حاصل نہ کر سکیں گے؟

## اسٹیلن کی ٹرائل کی دشمنی

۱۳۷۷ء میں ہم ہر روز اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں کہ روس میں  
آج اتنے آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، اور آج اتنے آدمی پھانسی  
کے تختے پر لٹکا دیئے گئے۔

بات دراصل یوں ہے کہ روس کا موجودہ ڈکٹیٹر جوزف اسٹیلن  
لینن کے دستِ راست ٹرائل کی سخت خلاف ہو چکا ہے۔ اور ملک میں  
جو کوئی بھی اس کا حامی نظر آتا ہے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے،  
کہتے ہیں مرنے سے پہلے لینن نے اپنی بیوی کو دیکھا یا سے صاف  
الفاظ میں کہا تھا کہ میری وفات کے بعد اسٹیلن کو روس کا ڈکٹیٹر بننے  
دینا۔ اسٹیلن اس وقت کیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری تھا، جب اسے اس  
بات کا علم ہوا تو اس نے کر دیکھا یا کو کسی طرح درغلز کر تمام کفارات چھین  
لئے۔ اور لینن کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کے حامیوں  
کو جن جن کراپے ملک سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ ٹرائل اس کا رعب  
بڑا دشمن تھا۔ علاوہ ذاتی عناد کے ان کے درمیان اصولی اختلاف بھی  
تھا۔ چنانچہ جب اسٹیلن برسرِ اقتدار آیا تو اس نے ٹرائل کو نہ صرف غدار  
قرار دیا بلکہ جلا وطن بھی کر دیا۔ اس کے تمام اصولوں کو خلافِ قانون  
قرار دے دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹرائل کے حامی بھی روس میں زندہ  
نہیں رہ سکتے۔

ٹرائل کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ روس کا انقلاب زیادہ تر اسی  
شخص کا مہم جوئی منت ہے۔ چنانچہ اس کے حامی بھی کم نہ تھے۔ لیکن اسٹیلن  
نے ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر باہر نکال دیا اور فوراً تختہ دار پر چڑھا دیا۔  
اسٹیلن اور ٹرائل کے درمیان اصولی اختلاف یہ ہے کہ یہ  
چاہتا ہے کہ انقلاب مالگیری اور تمام ممالک بیک وقت اشتراکیت پسند  
بنادے جائیں۔ لیکن وہ پہلے روس کو کمیونزم کا مکمل نمونہ بنانا چاہتا ہے

قبول کر لئے گئے۔

جدید دستور اساسی کے پہلے تین ماہ میں چونکہ کانگریسیوں نے عہدے قبول نہ کئے تھے۔ اس لئے رجعت پسندوں کی عارضی وزارتیں قائم کی گئیں۔ جنہوں نے کانگریسی پروگرام کی نقیصے اتارنا چاہیں۔ لیکن قومیت پسندی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں ان کی بل منڈے نہ چڑھ سکی۔ اور جب کانگریسیوں نے قبول وزارت کا فیصلہ کر لیا تو انہیں مستعفی ہونا پڑا۔

پہلے کانگریسی منسٹری صرف چھ صوبجات میں بن سکی۔ لیکن بالآخر صوبہ سرحد میں بھی قائم ہو گئی۔ گو یا مشن میں کانگریس سات صوبجات میں برسرِ اقتدار رہی۔

کانگریسی وزارتوں کے سامنے بہت سا کام بڑا ہے جس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہی ان کی کامیابی یا ناکامی کا راز مضمر ہے۔ مثلاً بریکاری کو دور کرنا۔ تعلیم پھیلانا۔ شہری حقوق کی حفاظت۔ قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی۔ رعایا اور راجی کے درمیان بہتر تعلقات۔ گاؤں اور شہر کے درمیان بہتر حمل و رسل کے ذرائع۔ زمینداروں اور کسانوں کا جوہم ہٹا کرنا۔ دیہات سدھار۔ ترک مسکرات۔ اور صنعتی، تجارتی و زرعی ترقی کے وسائل سوچنا، وغیرہ

ظاہر ہے کہ ان سب کاموں کے لئے کثیر مقدار میں روپیہ درکار ہے۔ لیکن زرگری اور محمل وغیرہ کے شعبہ جات۔ مرکزی گورنمنٹ کے ہات میں ہیں۔ اسی طرح فوج اور بڑے بڑے افسروں کی تنخواہوں میں کاٹ کر کے جو بچت ہو سکتی تھی وہ بھی کانگریسی وزیروں کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر وہ قرعہ اٹھائیں تو اس کے لئے بھی اول تو وہی کا طریقہ مد نظر رکھنا ہوگا اور دوسرے اس باب میں بھی گورنار و گورنر جنرل کی خوشنودی شرط ہے۔

اس سلسلے اور بے بسی کے باوجود کانگریسی وزراء نے بہت کچھ کیا ہے اور اس کی قدر نہ کرنا محض تعصب داری ہے۔ مثلاً کانگریسیوں نے بیسیاں قیدیوں اور نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ اخباروں اور تقریروں پر سے پابندیاں اٹھائی گئی ہیں۔ ابتدائی تعلیم اکثر جگہ لازمی کر دی گئی ہے۔ ترک منشیات کے قوانین پاس ہو رہے ہیں۔ انڈیری مجسٹریٹ

اُسے قوم براہِ راست سات برس کے لئے منتخب کیا کرے گی۔ یہ صدر ڈیل یعنی دارالمنذوبین کے اجلاس طلب کرے گا۔ اُسے برخاست کر سکے گا۔ قوانین پر دستخط کرنے، سزاؤں کا معاف یا کم کرنا نیشنل آرمی کی اعلیٰ کمان اپنے ہات میں رکھنا وغیرہ بھی اُس کے فرائض ہوں گے۔

ڈیل کا انتخاب مناسب نمائندگی کے اصول پر براہِ راست ہوگا۔ ہر مائل بالغ کو حق رائے دہندگی حاصل ہوگا۔ سینٹ (ایا ایوانِ اعلیٰ کے ساتھ رکن ہوں گے وغیرہ ڈاک۔

## ہندوستان میں آئین جدید کا تجزیہ

مشن میں غیر مالک میں اور بھی بہت کچھ ہوا۔ لیکن چونکہ وہ ہیں تو قومی اہمیت یا عام نجسپی کا نہیں ہے، اس لئے ہم اُسے چھوڑتے ہیں اور اپنے دس کی طرف آتے ہیں۔

اپریل ۱۹۳۷ء سے ہندوستان میں نیا دستور اساسی نافذ کر دیا گیا۔ چونکہ انتخابات میں کانگریسی کثیر تعداد میں کامیاب ہو کر آئے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا انہیں وزارتیں قبول کرنا چاہئیں یا نہیں۔ اشتراکیت پسندوں کا خیال تھا کہ عہدے قبول کرنے سے ہم اسپر بل مشنیری کے کل پرنس بن جائیں گے۔ اور اسی طرح پروگرنسٹس ہمارے جنگ کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔

دوسری طرف اعتدال پسند یہ کہتے تھے کہ بالکل نہ ہونے سے کچھ تو بہتر ہے۔ ہمیں اپنے دس کی خدمت کا جس قدر بھی موقع مل سکے اُس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ نیز اگر ہم عہدے قبول کر لیں گے تو عوام کو کانگریس کی طرف زیادہ مائل کر سکیں گے۔ اور آئندہ ہمیں آئین جدید کے مشبہ فیڈریشن کو مسترد کرنے میں آسانی رہے گی۔

پھر حال اس بنگارے کے تصفیہ کے لئے کانگریس کا ایک خاص اجلاس بمقام دہلی منعقد ہوا۔ اور بہت کچھ لے دے کے بعد ہاتھ مل گانڈھی کا یہ اصول منظور ہوا کہ عہدے صرف اُسی صورت میں قبول کئے جائیں۔ اگر گورنر کانگریسی وزراء کے لائحہ عمل میں عدم مداخلت کا یقین دلا دیں۔ گورنروں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن آخر دالسر نے ہند نے کچھ گول مول سی تقریر کی۔ اور کچھ ہاتھ مل گانڈھی جھکے۔ اور آخر کار عہدے

کے جذبے اڑا دئے گئے ہیں۔ وزراء اور اراکین اسمبلی کی توجہوں اور معاونوں میں گرانقدر کمی واقع کی گئی ہے۔ اور ان کا شمار سادگی اور خوش اخلاقی قرار پایا ہے۔ مزید برآں پولیس کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ سبکدوش کے ساتھ محفوظ ماندگی بجائے غلامانہ سلوک کر دیں۔ نیز صنعتی، ذراعتی اور بیماری کو دور کرنے کا پروگرام زیر عمل لایا جا رہا ہے جس کو پیچھے کے لئے ظاہر ہے کہ ابھی ایک عرصہ درکار ہو گا۔

الغرض کانگریسی عسکرات میں کافی کچھ ہو چکا ہے اور بہت کچھ کے لئے تجاویز زیر غور ہیں۔ ان کی حالت کم از کم پنجاب، بنگال اور سندھ ایسے رجعت پسند صوبوں سے بہتر ہے۔ جہاں ابھی وزارتوں کا نشہ افسانہ غالب ہے کہ وزراء ملک اور عوام انسان کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔

آئین جدید کے نفاذ کے بعد ایک اور عزمی مسئلہ جو عوام کے سامنے لایا گیا ہے یہ ہے کہ آیا مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ اتحاد عمل کرنا چاہیے یا مسلم لیگ کے ساتھ۔

یہ تو ایک رائے کا سوال ہے، اس لئے اس مضمون میں اس پر

بحث نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اسلامیان ہند کو سامنے یہ مسئلہ بار بار رکھا جا رہا ہے، اور ستم ظریفی یہ کہ مولویوں سے بھی اس کے متعلق فتوے پوچھے جا رہے ہیں کہ شاید معمولی چوک کر کہیں کانگریس اور مسلم لیگ کا قرآن مجید اور احادیث و تفاسیر میں ذکر آیا ہو!

اکتوبر میں مسلم لیگ کا ایک سالانہ اجلاس مشرقِ جناح کی ذمہ داری لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں ایک تو نصب العین تبدیل کیا گیا، اور دوسرے وفاق کی سخت مخالفت کی گئی۔

دولوں عندیے اپنی ذات میں نہایت خوب تھے، لیکن کانگریس میں تنہا کے راستے میں کیا چیز مانے ہے، اس کا جواب اربابِ مسلم لیگ نے سوائے اظہارِ ذاتی پر خاش اور عناد کے ساحل کچھ نہیں دیا۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور انہماک کا خیال ہے، لیکن یہ بات ابھی قابلِ تصنیف ہے کہ کانگریس کی اکثریت اگر افراسیاحی محال اسلامی حقوق پر چھاپہ مار بھی دے تو مسلم لیگ علیحدہ رہ کر انہیں محفوظ کیسے رکھ سکیگی؟

## مسلمانوں کے رہبر

وہ آتے ہیں مسلمانوں کے رہبر  
جنوں پروردہ علم فرنگی  
اسی منزل پہ یہ پیدا ہوئے ہیں  
امارت جن کی بے ریا بت حق ہے  
سمجھے معنی توحید ان سے  
ذرا کہو ایسے حق بات ان سے  
کبھی انگریز کی خدمت میں عرضی  
نہ نکلیں عمر بھر کو سٹی سے اپنی  
یہی ہیں رہبر ان قوم حمید

نہ طاقت ہے نہ ہمت ہے نہ ایمان  
سیاست زادہ سرمایہ داران  
جہاں ٹکرائے ہیں انجیل و قرآن  
سیاست جن کی بے آیات فرقاں  
ذرا پڑھو ایسے دو حرف قرآن  
کریں گے تازہ یہ آئین مسلمان  
کبھی ہندو سے ہیں دست و گریباں  
جو دمکھیں خواب میں بھی تیغ عریان  
یہی ہیں پیرو فاروقِ دیشان

یہی ہیں مسلمانوں کے رہبر  
ہے کافر جو رہے اب بھی مسلمان

# گاندھی ازم اور سوشلزم

پندت جواہر لال نہرو

کانگریسیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے، اور اس سے اُن کی مراد ایک مضم کی انسانی ہمدردی ہے۔ سیاسی اصطلاحوں کا یہ مہم استعمال انہیں حضرات کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ بہت بڑے بڑے آدمی اُن کے سامنے برطانیہ کی نیشل گورنمنٹ کے وزیر اعظم کی مثال موجود ہے، میں جانتا ہوں گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں ہیں۔ اُنہوں نے معاشیات، اشتراکیت، بلکہ مارکس کے فلسفے پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں، اور اس پر دوسروں سے بحث اور تبادلہ خیال کر چکے ہیں۔ لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ اہم معاملات میں عقل و دماغ بجائے خود ہمارے کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے۔ ولیم جیمز نے لکھا ہے: ”اگر ہمارا دل نہ چاہے تو یقیناً ہمارا دماغ ہمیں کبھی قائل نہیں کر سکتا۔“ جذبات ہمارے تصور زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں، ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی، اصل میں جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے، جیسا کہ

گاندھی جی ایک عجیب محبوبہ اعداد ہیں، اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں، سا لہا سال سے میں اس سمجھ میں ہوں کہ آخر اس تمام محبت اور تعلق کے باوجود جو انہیں مغربوں کے ساتھ ہے وہ کیوں ایسے نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود ہی لوگوں کو غمناک بناتا ہے اور پھر انہیں کھٹکتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش و خروش سے تلقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی اور معاشرتی نظام کے حامی ہیں جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس نظام کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک مضم کے راجی فلسفے کے قائل ہیں، لیکن چونکہ راجی ریاست کا قیام ابھی بہت دور ہے اور اس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے وہ چاروں ناچار وہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے سے بدلنے پر انہیں جو اعتراض ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے۔ اس لئے کہ وسائل سے قطع نظر کر کے اس نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین مقرر کیا جاسکتا ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہو سکے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں۔ لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو انہیں کے ذہن میں ہے، اور اُن کی اشتراکیت کو سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں، جو بالعموم اشتراکیت کے نام سے مشہور ہے، اُن کی تقلید میں بہت سے متاثر

میں اپنے ایک پیام میں جو قدامت پسند اور اتحادی پارٹی کی سندہ انجمن کو جس کا صدر جیو میں ڈوننگ میں ہوا بھیجا گیا تھا۔ سر ریمزے میکڈونلڈ فرماتے ہیں: ”دماغ کی مشکلات ہر قوم کو متحد کرنے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں۔ یہی حقیقی اشتراکیت ہے۔ یہی حقیقی قومیت بھی ہے۔ بلکہ یہی حقیقی انفرادیت بھی ہے۔“

شہر پہنارنے کہا ہے انسان جو ارادہ کرے وہ کر سکتا ہے۔ مگر ارادہ اس کے اختیار میں نہیں :

جنوبی افریقہ کے ابتدائی دور میں گانڈھی جی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوئی جس نے انھیں بھید متاثر کیا اور ان کا سارا تصور زندگی بدل دیا۔ اس وقت سے ان کے خیالات ایک خاص بنیاد پر قائم ہو گئے ہیں، اور ان کا دماغ سچی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جو لوگ نئی تجویز پیش کرتے ہیں ان کی باتوں کو وہ بہت مبرور سکون اور توجہ سے سنتے ہیں۔ لیکن اس بھپی کے باوجود جو وہ اخلاقیات پر کرتے ہیں، کہنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے، وہ اس مضبوطی سے بعض خیالات پر قائم ہیں کہ ان کے علاوہ اور تمام باتیں ان کو غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے منہی معاملات پر زور دینے سے اس بڑے کام میں خلل پڑتا ہے جو ان کے پیش نظر ہے۔ جب انسان ایک بنیادی خیال پر رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسائل خود بخود ہم آہنگ ہو جائیں گے، اگر مقدمات صحیح ہیں تو نتیجہ یقیناً صحیح ہوگا۔ یہ میرے نزدیک ان کے خیالات کی اصل بنیاد ہے، وہ اشتراک خصوصاً مارکسیت کو شیے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ سترکیں تشدد سے وابستہ ہیں۔ طبقات کی جنگ کے الفاظ ہی سے ان کو تشدد اور لڑائی کی بو آتی ہے۔ اور اس لئے انھیں اس سے نفرت ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی ایک مقررہ حد سے بڑھنے پائے۔ اس لئے کہ بلند معیار زندگی اور فرمت سے اندیشہ ہے کہ لوگ پیش پرستی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہی کیا کم بڑھے کہ تنوڑے سے خوش حال لوگ پیش پرست بن گئے ہیں۔ یہ اور بھی برا ہوگا۔ کہ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ مسئلہ میں انھوں نے ایک خط لکھا تھا جس سے اس مضم کے نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک خط کا جواب تھا جو کونسل کی بڑی ہڑتال کے دامن میں ان کے پاس اٹھک تان سے خط آیا تھا۔ کفنے والے نے لکھا تھا کہ اس معاملے میں مزدوروں کو شکرت ہوگی کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور انھیں چاہیے کہ مضبوط تولید کا طریقہ استعمال کر کے اپنی تعداد کو کم کریں۔ گانڈھی جی نے اپنے جواب کے

سلسلے میں لکھا تھا کہ آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کانوں کے مالک حق پر نہ ہونے کے باوجود حجت جائیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ مزدوروں کے حد سے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہ مزدور کسی چیز میں بھی مضبوط نفس سے کام نہیں لیتے۔ اگر مزدوروں کے اولاد نہ ہوتی تو ان کے لئے ترقی کا کوئی محرک نہ رہتا۔ اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل پیش کر سکتے جس کا ثبوت آسان ہو۔ کیا ان کے لئے شراب پینا، جو اکیلنا، تبا کو پینا ضروری ہے؟ یہ کوئی جواب نہیں کہ کانوں کے مالک بھی یہی سب حرکتیں کرتے ہیں، اور پھر بھی غالب رہتے ہیں۔ اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تو انھیں دنیا کی ہمدردی چاہئے کا کیا حق ہے؟ یہی کہ سرمایہ داروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو۔ اور سرمایہ داری کو اور قوت حاصل ہو جائے؟ ہم سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کرو، اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ ہم انھیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں بہت بڑے پیمانے پر پیدا کر دیں؟

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فافہ کش انگریز کان کنوں، ان کی بیویوں اور بچوں کے اترے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے۔ جن کو میں نے مسئلہ کی گریبوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خفناک نظام کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو انھیں کچلے ڈالتا تھا۔ گانڈھی کے بیان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ ان کی مزدوری کم کر دی گئی تھی۔ اور وہ کام کرنے سے ہٹا دئے گئے تھے۔ بہر حال اس وقت میں اس سے کوئی بحث نہیں اور نہ اس سے عرض ہے کہ کان کن مزدور مضبوط تولید کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تجویز ہے۔

میں نے گانڈھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مزدوروں کے مسائل اور ان کے معیار زندگی کو بڑھانے کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ نقطہ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ داروں

لے مضبوط نفس اور نفس پرستی صنعتی اہم کے گانڈھی سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔

کہ انہیں کی سی زندگی بسر کرے اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کر لے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی سطح پر پہنچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعویٰ کر سکتا ہے تو میں یہ دعویٰ کرتا ہوں:

اس استدلال سے غالباً موجودہ زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا سرمایہ دار یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا۔ بجز اس کے کہ یہ بات محبوب اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کر لیں، اور اپنے تعلقات اور بلند تر معیار زندگی کی تلاش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کریں، جو ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کی چیزوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطہ نظر رکھتا ہے شاید کسی حد تک اس سے متفق ہو، اس لئے کہ یہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے ماضی سے وابستہ ہیں، اور ہر چیز کو ماضی کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں انہیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے، بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے، ان لوگوں میں جو نفسیاتی حیثیت سے ماضی سے وابستہ ہیں، اور ان میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں زمین آسمان کا فرق ہے، قدیم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ غریبوں کا وجود لازمی تھا۔ منشی سہروردت منہ آدمی اُس زمانے میں سماج کے رُوح رواں تھے، اور ان کا ہونا نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے اخلاقی معطلوں، مصلحوں اور اہل دل نے ان کے وجود کو جائز رکھا، لیکن اسی کے ساتھ انہیں یہ تلقین کرتے رہے کہ ان کے محتند ہانوں کا بھی ان پر کچھ حق ہے، وہ غریبوں کے امانت دار ہیں، انہیں خیرات کرنا چاہئے، چنانچہ خیرات کا شمار ان بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جن کی مذہب نے تاکید کی ہے، گاندھی جی بھی ہمیشہ اس نظریے پر زور دیتے ہیں کہ راجہ ہمارا بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار غریبوں کے امانتدار ہیں، ان سے پیسے بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آئے ہیں۔ پاپائے عظم نے یہ اعلان کیا ہے امیروں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ خدا کی طرف خد بخشن پر مامور ہیں۔ اور اس کی دولت کے خازن اور قاسم ہیں اور خود حضرت مسیحؑ نے غریبوں کی قسمت ان کے سپرد کی ہے۔ ہندو دھرم اور اسلام کا عام عقیدہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں جس کی تعمیل میں یہ حضرات مندر مسجد، دھرم شالے بنواتے ہیں، اپنی دافرو

کے نقطہ نظر سے بھی کو سول دور ہے۔ یہ اگر کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تعلیم آج ہر شخص کے کمانے پینے، رہنے پینے کا معقول بندوبست کر سکتی ہے، اور ان کے معیار زندگی کو بہت بلند کر سکتی ہے، بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے اس میں مداخلت نہ کریں، تو اس سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ لوگوں کے معیار زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قابل ہی نہیں۔ چنانچہ اشتراکیت سے جو امیدیں ہیں وہ ان کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں۔ بلکہ ان کے نزدیک سرمایہ داری بھر بھی ایک حد تک قابل برداشت ہے۔ اس لئے کہ وہ میٹل پرستی کے گناہ کو ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود رکھتی ہے، انہیں ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں۔ لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے بھرا رہے ہیں، اس کے یہ اتنی بڑی نہیں۔ اور پھر یہ ایک امر واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مکن ہے کہ میں یہ خیالات ان کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے۔ اور ان کی تقریر و تحریر میں بھی جو الجھن اور پیچیدگی نظر آتی ہے اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ ان کے خیال کی بنیاد ہی دوسری ہے، وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش اور فرصت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، بلکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں۔ بڑی مادوں کو ترک کریں، خواہشات کو کم کرتے رہیں۔ اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں۔ اور جو لوگ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کی مادی زندگی کی سطح کو بلند کریں۔ بلکہ خود ان کی سطح پر آئیں۔ اور مادی حیثیت سے ان کے ساتھ میل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطح زندگی کسی قدر بلند ہو جائے گی۔ یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اس بیان میں جو اُنہوں نے، اردو سیرسٹریکوشن کیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بے کار ہے۔ اس لئے کہ میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے جیسے پیدائشی جمہوریت پسند کے لئے یہ انگشت باعث شرم ہے، اگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو غریب سے غریب لوگوں میں کھپا دیا ہے جس کی یہ آرزو ہے

میں سے ماننے کے پیسے اور چاندی کے۔ اپنے عزیزوں کو خیرات کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہر بڑے نیک اور دین دار میں۔

دنیا سے قدیم کے مذہبی لفظ نظر کی ایک نمایاں مثال پاپائے عظمیٰ بویز و ہم کا "شہور فرمان" پریم لازم ہے، جو مئی ۱۹۱۰ء میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ جدید صنعتی حالات کا استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "غرض مصیبت ہنا اور تکلیف اٹھانا نواز ان کی قسمت میں لکھا ہے، انسان چاہے جتنی کوشش کرے۔ کوئی طاقت اور کوئی مذہب انسانی زندگی کو اس درد و الم سے نجات لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جو لوگ اس کے خلاف دعویٰ کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کو یہ امید دلاتے ہیں کہ انھیں۔ سب و الم سے نجات مل جائے گی، اور دائمی راحت و عشرت نصیب ہوگی۔ دھوکا دے رہے ہیں، اور سبز باغ دکھا رہے ہیں، اور ان کے یہ چھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کر دیں گے۔ انسان کی خلاص اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اس کی اصلی حالت میں دیکھے، اور ان مصیبتوں کا علاج کریں اور تلاش کرے۔"

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ یہ نہیں اور کا اشارہ کہ، صرف اس دنیا کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کی صحیح قدر کر سکتے ہیں۔ جب تک اس زندگی کا سناؤ نہ رہیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ جس حقیقت عظمیٰ کا سبق خود فطرت میں دیتی ہے وہی عیسائی مذہب کا عظیم الشان عقیدہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصلی زندگی اس وقت شروع ہوگی جب موجودہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ خدا نے ہمیں اس دنیا کی آئی جانی چیزوں کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ ان آسانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں، اس نے اس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلا وطنی کی جگہ بنایا ہے، نہ کہ ہمارا حقیقی وطن، روپیہ، پیسہ اور دوسری چیزیں، جنہیں لوگ اچھا اور پسندیدہ سمجھتے ہیں، خواہ ہمارے پاس افرات سے ہوں یا بالکل نہ ہوں، جہاں تک ہماری ابدی راحت و مسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں....."

یہ مذہبی طرز خیال اس قدیم زمانے سے وابستہ ہے جب موجودہ مصیبتوں سے نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی

کا ہمارا ڈھونڈنا چاہئے۔ لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے، اور انسان کی مادی خوش حالی کی سطح اتنی بلند ہو گئی جو زمانہ قدیم میں انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی، لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم پر مست ہیں، البتہ اب زیادہ زور چند مبہم روحانی قدروں پر دیا جاتا ہے۔ جن کے جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ کیونکہ عیسائی ہمیشہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے خیال میں مگن رہتے ہیں (یہ وہی زمانہ ہے جسے لوگ عہد مظلمہ کہتے ہیں) اور اسے عیسائیت کا عہد زریں سمجھتے ہیں۔ جب اولیا کا دور دورہ تھا۔ عیسائی شرمناک، اعلیٰ لڑائیوں کو جابجا کرتے تھے۔ اور گورنمنٹ کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہو رہے تھے۔ ان کے خیال میں یہ زمانہ "بچی عیسائی جمہوریت کا تھا۔ جو ہمیشہ وروں کی انجمنوں کے ماتحت ترقی کے اس درجے پر پہنچ گئی تھی جس پر نہ صرف اس سے پہلے کبھی پہنچ سکی اور نہ اس کے بعد" مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہد خلافت کی "اسلامی جمہوریت" اور اس دور کی حیرت انگیز فتوحات کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہد اور رام راجن اور مہا بھارت کے زمانے کی دھن میں رہتے ہیں اور رام راجن کا خواب دیکھا کرتے ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس عہد ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی، اور اسے بہت بھر کھانا اور زندگی کی ادنیٰ ترین ضروریات بھی میسر نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ چھوٹے سے حکمران طبقہ کو، فرصت اور فراغت حاصل ہو۔ لیکن جہاں تک زندگی کا لطف اٹھانے سے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ سوائے قوت لایوت کی جدوجہد میں لگے رہنے کے اور بھی کچھ کر سکتے تھے۔ اس شخص کے لئے جو بھوک مر رہا ہو کسی قسم کی تمدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں۔ اسے تو بس ایک ہی فکر ہوگی۔ کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے۔

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے۔ جن پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے اس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد قائم کر دی ہے، جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لئے



کہ یہی منہی ترقی سے فائدہ کی جگہ نقصان پہنچا ہے۔ ہیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے، اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی۔ اور اس سے زیادہ قدرتی درروحانی اعتبار سے جاری حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے۔ لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے اس وقت تو نظام جاگیر داری کو اور خشک کر دیا ہے، اور ہماری اشیاء کو حل کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ شدید بنا دیا ہے۔

لیکن یہ ہماری بدیسی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری اور مناسب نہیں رہا۔ امر کا طبقہ بالکل بیکار ہے۔ اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح بدیسی پیشواؤں کا یہ پرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہو گیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تمغین کی جائے، اور غریبوں کو قناعت کی، صبر و شکر کی، کفایت شعار کی اور نیک چلی کی۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل سے اچھی طرح نبٹ سکتا ہے۔ امیروں میں سے بہت سے لوگ صرف طور پر فطرت بن گئے ہیں اور ایک فطرتی طبقہ کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وسائل دولت ضائع ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام کو اور دولت آفرینی کو روکتا ہے، اور وہ طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے، یعنی ایک تو ان لوگوں کی بہت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں، دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا ہے، اور فاقی کرنے پر مجبور کرتا ہے، خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گزرا لکھا تھا "ان لوگوں کے سامنے جو سب کوں مرتے ہیں اور بے کار ہیں۔ خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے، یعنی کام کی اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت کر کے روٹی کھائے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ بغیر محنت کے کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔"

دنیا نے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کے قدیم طریقوں اور اصولوں سے کام لینا جب ان مسائل ہی کا وجود نہ تھا اور ان کا ذکر دنیا کی الفاظ میں کرنا محض اُلجھن پیدا کرتا ہے، اور

اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے، ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے، ایک زمانے میں غلام سہی اہلک میں شامل تھے، اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا، اس کے علاوہ جاگیر دار ہروہن کی شب عروسی کا، سڑکوں، مندروں، کشتیوں، ٹپوں، سفاد ماس کی چیزوں کا، زمین اور ہوا کا مالک تھا۔ جانور آج بھی پالنے والوں کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض ملکوں میں ملکیت کے حقوق قانوناً محدود کر دیئے گئے ہیں، جنگ کے زمانے میں برابر حقوق ملکیت میں درست انداز کی جاتی ہے۔ اہلک، زبرد وغیرہ میں صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ مثلاً کپنی کے حصے، اعتبار وغیرہ، جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے، رائے عامہ برابر جائداد والوں کے لامحدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے، اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے معمول لگائے جاتے ہیں، جنہیں ایک طرف کی مضبوطی چاہیے اور اس طرح مفاد عامہ کی خاطر حقوق ملکیت کم ہوتے جاتے ہیں۔ مفاد عامہ کا خیال پہلے پالیسی کی بنیاد بنتا جاتا ہے۔ اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفاد عامہ کے خلاف کوئی کام کرے۔ خواہ اُس کی غرض اپنے حقوق ملکیت کا تحفظ ہو، اور پُرانے زمانے میں تو اکثر لوگ حقوق ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے۔ آج بھی یہ حقوق صرف تنہا لوگوں کو حاصل ہیں، ہم مستقل حقوق کا ذکر بہت سننے آئے ہیں۔ لیکن آج کل ایک نیا مستقل حق اور تسلیم کر لیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندگی بھر محنت کرے۔ اور اپنی محنت کا سبب پائے، ان نئے نظریوں کی رو سے اہلک اور سرسائے معدوم نہیں ہو جاتے، بلکہ بہت سے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، اور ان کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جمع ہو جانے سے ان اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اُسے سماج اُن سے واپس لے لیتی ہے، گاندھی جی کے پیش نظر افراد کی باطنی، اخلاقی اور روحانی اصلاح ہے۔ اور اس کے ذریعے سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں، ان کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بڑی عادتوں اور لذتوں کو ترک کریں۔ اور پاکباز بن جائیں۔ وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب اور مباح کو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ لیکن ہے اس بارے میں اختلاف رائے ہو کہ



ان میں کون چیز زیادہ بڑی ہے اور کون کم۔ کیا اس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی نقطہ نظر سے سچی، اور اس سے زیادہ سماجی نقطہ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بدتر، لالچ، خود غرضی، زبردستی، افراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، طبوتوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کشمکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بے دروسی سے لوٹنا اور کھلنا، قوموں کی ہرانگ لڑائیاں ہیں، ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آفرین جھگڑوں سے اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی بدست سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستائے، اور جس کا عمل اس پر اٹنے سے پہلے جس میں طاقت ہو وہ چھین لے۔ اور جو رکھ سکے وہ رکھے۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر ذاتی جھگڑا پیدا کرتی ہے۔ اور سارا نظام انسان کی غارتگرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے، اور اُسے اُن سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات کو بھی ابھارتا ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے گہنے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے، کامیابی کے معنی یہ سمجھ جاتے ہیں کہ دوسروں کو نیچے گرا کر اُن کی جگہ لے لی جائے، جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے، ہمارے بہترین آدمی اُن کی طرف کھینچ جاتے ہیں، تو کیا گاندھی جی یہ امید کر سکتے ہیں کہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کر لیں گے؟ وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو متاثر کرنے میں انھیں موزور کامیابی ہوگی۔ لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی۔ اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گی۔ اُس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفہ اخلاق کا نہیں ہے، بلکہ آج کل کے عملی اور ضروری مسائل میں سے ہے، دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے، اور اس مشکل کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈکنس کے متکار کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں، کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا اور نہ منفعیانہ طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے کہ سرمایہ داری۔ اشتراکیت، اور اشتعالیت وغیرہ کے خراب پیوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں۔ اور اس

رہنڈی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین درمیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا۔ جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع ہوں گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے۔ علاج تجویز کیا جائے۔ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالت پر قائم نہیں رہ سکتے۔ یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو پیچھے ہٹنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں ہے، بلکہ گاندھی جی کا اشتراک کارروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہیں اُس محدود قومی معیشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف قوم اور قوموں سے بلکہ ہر گاؤں اور گاؤں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہو۔ بس قدیم زمانے کی سماج میں ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا، اپنا کھانا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی بہت ہی پست ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں۔ کیونکہ مستقل طور پر تو یہ چل ہی نہیں سکتی۔ بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا۔ اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گی کہ عسرت اور فاقے کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بید پست ہے۔ وہی معنوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے۔ لیکن اور دنیا کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں اُن سے قطعاً قلع کرنا باطل ناممکن ہے۔ اس لئے ہمیں ان مسائل پر بڑی دنیا کے نقطہ نظر سے محدود قومی معیشت کا کوئی سوال ہی نہیں، اور میں تو ذاتی طور پر اُسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

ہر سچہ پر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں۔ جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہیے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ ذہن انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں رد کی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس تبدیلی کے مخالف



دنیا کا سب سے بڑا رسمیں کا کیڑہ جو دیائے یاس کی وادی میں  
پایا گیا ہے۔ اسکی لمبائی بارہ فٹ ہے۔

•

1

1

1

1

میں۔ اگر سیاسی یا سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی غدارسی ہوگی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں، یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں، لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی نہ ہو جائے یہ انقلاب شکل ہی سے ہو سکے گا۔ اس لئے ان لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ ایک جمہوریت کی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیے، کہ ان لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیں۔ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ بہت بعید از قیاس ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کر سکیں گے، کھادی کی تحریک، یعنی ہاتھ سے کاتنا اور بننا جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے۔ ایک ایسی چم ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اور ہمیں قبل صنعتی عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے۔ اور ہمیں قبل صنعتی عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے، آج کل کے کسی اہم مسئلہ کو ان طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے، بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ بہرہ سہی میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور مارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا ہے، آئندہ بھی اس وقت تک پہنچا رہے گا۔ جب تک خود حکومت ذرعی اور صنعتی مسائل کا کوئی معقول حل نہ تلاش کر لے گی، جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جاسکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروڑوں بے روزگار ہیں، جن کا کوئی ریکارڈ نہیں، اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصے میں بیکار رہتے ہیں، حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے یا بے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک نہ کرنا نہیں کی ہے، اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تنویری بہت مدد کی جو بالکل بے روزگار ہیں، یا جو کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں، چونکہ یہ ترقی خود اپنی کوشش سے ہوئی ہے، اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی، اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے، مگر اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے،

وہ نفسیاتی تبدیلی ہے، کھادی نے کسی حد تک اس فیصل کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا، اس نے اوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو لوگوں سے قریب تر کر دیا۔ اس لباس کا پہننے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے، اوسط طبقے میں کھادی کے رواج سے سادگی آگئی ہے، خود نمائش اور بدنمائی کم ہو گئی ہے، اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس نے معاملے میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں، اور نہ سستی پوشاک پہننے میں ذلت اور شرم محسوس کرتے ہیں، بلکہ سچ پر چھنے تو یہ لوگ کھادی کے لباس کو خاصا باوقار سمجھتے ہیں، اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو اب بھی ریشم اور ساتھن پہن کر اتراتے ہیں، اپنی فوقیت کا احساس رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب لوگوں میں بھی یہ خودداری اور وقار کا احساس پیدا ہو گیا ہے، کھادی پہننے والوں کے بڑے جمعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کون غریب ہے اور کون امیر، اور اس سے برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ عام لوگوں تک پہنچنے میں کانگریس کو کھادی سے بڑی مدد ملی۔ اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھانے چاہتے ہیں۔ کھادی ہی نے رد کا ورنہ پہنے ان کی روک تھام صرف بدلی ہوئی خصوصیات لنگا سار کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی۔ اور جب کبھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگ عظیم کے زمانے میں تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ملوں نے کروڑوں روپیہ کھایا۔ سودیشی کی تحریک اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ملوں کو بڑی مدد ملی، لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب اتنی زیادہ نہیں بڑھ سکتیں، ان ملوں نے (اور جاپان نے بھی) کھادی کی ہر دلعزیزی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس قسم کا سوٹا کپڑا تیار کیا کہ اس میں اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل تھا، اگر اب کوئی غیر معمولی صدمہ پیدا ہو جائے، مثلاً جنگ چھڑ جائے، جس سے بدیشی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے تو غالباً ہندوستان کے ملوں کے مالک خیرہ اردوں کو اتنا نہیں لوٹ سکیں گے جتنا کہ ۱۹۱۷ء سے کئی سال تک لوٹتے رہے، کھادی کی تحریک اس کو روکے گی۔ اور کھادی کی تعلیم میں اتنی نمائش

ہے کہ تھوڑی سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی ایک ضمنی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے، تاکہ اس مدت میں جو ایک عظیم سماجی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی، اس سے کام چلا رہے، لیکن آئندہ ہماری اصل کوشش یہ ہوگی کہ ذرا عینی نظام کی از سر نو تنظیم کی جائے۔ اور صنعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ آرمی کے نظام میں دفع الوقتی کے لئے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں، اور طرح طرح کے کمیشن متعین ہوں، جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو اور وہ پھر اوپر سے چھڑوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظام راسخ دیکھتے ہی دیکھتے بگڑ رہا ہے، اور موجودہ صورت میں دولت کی پیدائش اور ترقی بڑے پیمانے پر متحمل طریقے سے کام کرنے میں حائل ہے، جدید ہند کے حالات کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا۔ چھوٹی چھوٹی زمینیں اسیوں کو بانٹنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ منظم طور پر امداد باہمی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ کم محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کو بھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے (جیسا کہ گاندھی جی کو اندیشہ ہے) زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی، باقی لوگوں میں سے شاید چھوٹی ٹھیکہ صنعتوں میں کھپ جائیں۔ مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی صنعتوں اور سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہو لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا بھی عنصر موجود ہے، یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام آرمی کو سہارا دے رہی ہے، اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نایاں فرق پیدا ہو۔ لیکن یہ رجحان اس میں بے حال موجود ہے۔ کسانوں یا کاشتکار زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا جو حصہ ملتا ہے، وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ جس پرست ترین سطح پر وہ پہنچ گئے ہیں اسی پر قائم رہ سکیں۔ اس لئے ان کو اپنی فیملی آمدنی میں

اعنائے کی اور صورتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں، ورنہ لگان یا مالگداری کی ادائیگی کے لئے اور قرض لینا پڑتا ہے، اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس سے زمیندار یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہو سکتا۔ اگر یہ ادب کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زائد محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہنری جارج نے اپنی کتاب "ترقی اور غربت" میں اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے اور بہت سی باتیں دی ہیں، جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے۔ اس سے ذریعہ طور پر ضرور فائدہ ہوگا، جس میں سے کچھ کم و بیش مستقل ہوگا۔ مگر زیادہ تر محض وقتی۔ اس سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی اور ہماری ہڈی کے بعض خوشنما نمونے جو مٹ رہے تھے محفوظ ہو جائیں گے۔ لیکن جہاں تک کہ اس کا متعدد کھلوں کی اور صنعتی نظام کی مخالفت ہے۔ اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ گاندھی جی نے حال میں "سپرکین" میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں "کھلوں کو رواج دینا اس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو، اور کرنے والے متورٹے ہوں۔ لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں، جیسا کہ ہندوستان میں ہے، تو یہ چیز مفرب ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں، فرصت کا وقت نکالا جائے، سوال یہ ہے کہ ان کے خالی وقت کو جو سال میں چھ بیسے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے، یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو بے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں وقت کام کی کمی کا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت آجروں کو کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں کرو۔ مثلاً مٹر کوں اور مکاؤں کی تسمیر، آبپاشی کی سکیم، حفظانِ صحت، طبی وسائل، صنعت و حرفت اور برقی قوت کی ترقی۔ سماجی اور تمدنی خدمات۔ تعلیم اور ان بیسیوں ضروری مشیبا

کی فراہمی جس کی لوگوں کو سخت ضرورت ہے۔ ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں۔ تب بھی کام ختم نہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک قوت کی خواہش نہیں بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو۔ اور سماج کی تنظیم منقاد عامہ کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوویت پونین میں اور چائے جو نقصان ہوں۔ لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے، ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بے کار نہیں ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے لئے کام کرنے کی اور تمدنی اصلاح و ترقی کی کوئی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کر دیا جائے ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے تو لڑکے مزدوروں اور بے روزگاروں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے۔ اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

گاندھی جی نے اس بات کی کوشش کسی قدر کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرنے اور ٹکلی میں اصلاح اور زرمیم کی جائے اور ان کی قوت پیدا بڑھائی جائے، یہ بھی تو اوزار اور کل کو ترقی دینے کی کوشش ہے۔ اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی دہشت ممکن ہے گھریلو صنعتوں میں بھی بجلی کی قوت سے کام لیا جائے لگے۔ آئرن منچ کی خواہش پھر منور ہو جائے۔ اور اس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہوگی جس کو ضرورت سے زیادہ پیداوار اور بے روزگاری کہتے ہیں۔ اگر وہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ لیا گیا تو وہ ان ضروری مادی اور تمدنی اشیاء کو بھی تیار نہیں کر سکتیں، جو ہیں اس وقت درکار ہیں۔ اور پھر وہ کلوں کے ساتھ مقابلہ کیوں کر کریں گی؟ کیا ہندوستان میں بڑی بڑی کلوں کے رواج کو روکنا مفید ہے۔ اور فرض کیجئے کہ مفید ہو تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بار بار یہ کہا ہے کہ وہ سرے سے کلوں کے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لئے ان کا استعمال موزوں نہیں۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا بنیادی صنعتیں مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں جو پیپے سے موجود ہیں مثالی جانتی ہیں؟

یہ بات صرف کی طور پر ناممکن ہے، جب ہمارے یہاں ریلیں، پل، نقل و حمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں، تو یا تو ہم یہ چیزیں خود پیدا کریں یا دوسروں کے محتاج رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی حفاظت اور مدافعت

کے وسائل ہمارے پاس ہوں تو ہمیں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ نہیں ہے۔ حقیقی معنوں میں آزاد ہے۔ اور نہ بیرونی محکمے کی مدافعت کر سکتا ہے، اب مشکل یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور تکمیل کے لئے دوسری بنیادی صنعتیں درکار ہیں، اور پھر کھپانے کی صنعت ضروری ہو جاتی ہے۔ جب یہ بنیادی صنعتیں قائم ہو جائیں تو پھر لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ غرض یہ سلسلہ کسی طرح روکا نہیں جاسکتا۔ اس لئے کہ نہ صرف بنیادی مادی اور تمدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے، جوں جوں بڑے پیمانے کی صنعت پھیلتی جائے گی جموٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں تو ان کے لئے پھر بھی کچھ موقع ہے۔ مگر نظام سرمایہ داری میں ان کی مطلق گنجائش نہیں۔ اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں، جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں جو بڑے پیمانے پر تیار نہ کی جاسکیں۔

کانگریس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوف زدہ ہیں، ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیوں بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی ہے۔ اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس میں کیا بُرائی ہے، کہ وہ کافی مقدار میں تیار کی جائے؟ کیا لوگ اس کو ترجیح دیں گے کہ خواہ ان کی ضرورت پوری نہ ہو۔ لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں تیار نہ کی جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ تقسیم دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور بھل ہے، ایک اور مشکل جس کا وہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے، کسان اس پر مجبور ہے کہ انہی چیزوں کی کاشت کرے جن کی بازار میں مانگ ہے، اور وہی منتیں

۱۔ ہر جنوری سنہ ۱۳۳۲ء کو سر داد لہجہ بھائی ٹیل نے احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے۔ ہم اپنے ملک میں وہ اتھری پیدا کرنا نہیں چاہتے جو مغربی ملکوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔

رکھے جو اور ملکوں میں ہیں قیمتیں گھٹتی بڑھتی ہیں۔ اور اس کا اپنا مقررہ نگران یا مالگذا رہی نقد کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح اس کو یہ روپیہ فراہم کرنا پڑتا ہے یا کم سے کم وہ اس کی کوشش منور کرتا ہے۔ اس لئے وہ ایسی چیز لوتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کر سکتا جن کی اس کو خود ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اور اس کے ہال بچے کم سے کم کھانے کے معاشے میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال میں اجناس خوردنی اور دوسری چیزوں کی زرعی قیمتیں بیکارگی گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسائوں کو خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں مجبور اگانے کی کاشت کرنی پڑتی ہے۔ باہر کی شکر معمول لگ جانے کی وجہ سے شکر کے کارخانے برساتی سینڈکوں کی طرح پیدا ہو گئے، اور گتے کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ لیکن بہت جلد رسد طلب سے کہیں زیادہ ہو گئی۔ کارخانوں کے مالکوں نے بڑی بے رحمیت کسائوں کو لوٹاؤ شروع کر دیا، اور گتے کی قیمت گر گئی۔

ان تمام امور اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتوں کی وجہ سے یہ مناسب ہے اور نہ ممکن ہے کہ ہمارے زرعی اور صنعتی مسائل محدود ملکی مصلحتوں کے مطابق حل کئے جاسکیں، اور یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کی ہے۔ ہم مہم اور جذبات انگیز فقیروں میں پناہ نہیں لے سکتے، بلکہ ہمیں زندگی کے واقعات کا سامنا کرنا ہے اور ان سے اور ان سے مطابقت پیدا کرنا ہے، تاکہ ہمارے تاریخ کی بساط کے شاطر بنیں۔ اس کے ہر بن کرنے رہ جائیں۔ پھر مجھے اس مجموعہ امندا یعنی گاندھی جی کا خیال آجاتا ہے، باوجود اپنی تیز فہمی اور مظلوموں کے جوش حمایت کے وہ کیوں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں۔ جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ

رہے ہیں۔ لیکن کیا ماضی کی راہ قطعاً مسدود نہیں ہو چکی ہے؟ ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف پڑانے نظام کے بچے کچے آثار جو ترقی کی راہ میں حاصل ہیں۔ مثلاً دیسی ریسٹیں، بڑی بڑی زمینداریاں اور قلعہ داریاں اور موجودہ سرمایہ داری کا نظام۔

ان سب پر اپنا دست شفقت رکھے ہوئے ہیں۔ کیا۔ امانت داری کے اس نظریے کو عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دئے جائیں۔ اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کو مفاد عامہ کے لئے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر سے بہتر لوگ بھی اخلاقی تکمیل کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقے سے اعتماد کیا جاسکے؟ افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی مشکل ہی سے اس بوجھ کو اٹھانے کے اہل ثابت ہوتے، اس کے علاوہ کیا دوسروں کے لئے یہ اچھا ہو گا کہ یہ شفیق مافوق الانسان ان پر مسلط کر دئے جائیں۔ لیکن دنیا میں نہ تو کوئی مافوق الانسان ہے نہ کوئی فلسفی بادشاہ، یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذاتی مفاد میں اور ان کے خیالات کے پھیلنے میں ساری قوم کا بھلا ہے۔ اس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے، جس کے نتائج ہر طرح ہلک ثابت ہوتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلے پر غور نہیں کر رہا ہوں کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے، اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کیونکر دور کی جائیں۔ جس سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے تشدد سے یا عدم تشدد سے، اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ بہر حال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کر لینا چاہیے، اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کر دینا چاہیے۔ جب تک سیاسی اور زرعی رہنما اس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے اور صاف صاف بیان

لے لے رہے ہیں لندن کی گول میز کانفرنس کے جسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا: سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگریس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان غم فاش کش غریبوں کی مانند ہے، جو ملک کے طول و عرض میں سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں یا ہندو ہند کے۔ جن جن گروہوں کی اغراض کانگریس کے نزدیک قابل حمایت ہیں۔ ان میں سب پر مقدم ان بے زبانوں کی فلاح ہے۔ اکثر یہ اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اگر سچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض ٹکرا جائیں تو میں بے دھڑک کہتا ہوں کہ کانگریس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروڑوں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کر دے گی۔

ہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ میں کیا ہوں۔ یہ بالکل ہبل بات ہے کہ قومی، بین الاقوامی، معاشی اور سماجی مسائل پر غور کرتے وقت افراد کی ذاتی حیثیت کو اہمیت دی جائے، وہی احباب جو مجھ پر اعتراض کرتے ہیں برابر یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے نہ کہ گنہگار سے، میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر سکتا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا جھگڑا ایک نظام سے ہے نہ کہ افراد سے۔ مگر ہر نظام بڑی حد تک افراد اور جماعتوں سے وابستہ ہوتا ہے، اور جو شخص نظام کو بدلنا چاہتا ہے اُسے اُن افراد اور جماعتوں سے وابستہ رہنا ہے یا انہیں ہم خیال بنانا ہے، اگر کوئی نظام اب ہمارے لئے مفید نہیں رہا اور ترقی کی راہ میں حائل ہے تو وہ سٹ کر رہے گا۔ اور جو طبقے اور جماعتیں اس سے وابستہ ہیں اُن کو بھی اپنی کایا پٹ کرنی پڑے گی۔ اس عمل تغیر میں جہاں تک ہو سکے تعلیف کے عنصر کو کم کرنا چاہیے۔ لیکن بد قسمتی سے موت ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو تکلیف پہنانا اور معاملات کا درجہ برہم ہونا ناگزیر ہے۔ پھر حال یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اتنی بڑی بُرائی کو اس دُور سے برداشت کرتے رہیں کہ کہیں چھوٹی چھوٹی بُرائیاں نہ اُٹھ کھڑی ہوں، یہ برائیاں تو پیدا ہوتی ہی ہیں اور اُن کا روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

ہیں کرتے۔ اس وقت تک وہ یہ توقع کیے کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے۔ یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کر سکیں گے جس کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات خود سب سے بہتر معلم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے اور اُن سے مناسب کام لینا ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم خود انہیں سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔ کبھی کبھی میرے احباب اور رفقاء میری باتوں سے چڑھ کر پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے کبھی کوئی کریم انفس رئیس، مخیر زمیندار، نیک منبت اور بامروت سرا یا داراب تک نہیں دیکھا؟ بیشک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں، بلکہ میں خود اُس طبقے سے ہوں جو زمینداروں اور دولتمندوں سے سیل جمل رکھتا ہے۔ میں خود ایک نونے کا بورژوا ہوں۔ اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی، اور اسی کے خیالات نے ابتدا میں مجھے متاثر کیا۔ بعض اشتمالیوں نے مجھے پتی بورژوا کہا تھا، اور بالکل ٹھیک کہا تھا، غالباً اب وہ مجھے اپنے گناہوں سے تو پھر کرنے والا بورژوا کہیں گے۔ لیکن

لے نیچے اوسط طبقے کا شہری

لے اوسط طبقے کا شہری

## دعا

جنوں فتنہ سامان و بیاک دے  
یہ دشت و جبل تنگ و تاریک ہیں  
مجھے ماہِ داخِسم کا ہمہ ازکر  
جو سو پر دوں میں حُسن کو دیکھ لے  
الہی گریبانِ صد چاک دے  
انہیں وسعتِ مہفت افلاک دے  
نظامِ محبت کا ادراک دے  
نظر پاک دے اور بیاک دے

ہر اک عید کو یہ سعادت کہاں  
جسے چاہے وہ عیشِ فتراک دے

مجید ملک



# سرمایہ داروں سے خطاب

اسے غلام عیش و عشرت و دود خواری تا بہ کے  
 آگئی سچیں بتا کیونکر درندوں کی یہ خور  
 دیکھ غافل بند ہونے ہی کو ہے باب حیات  
 ننہائے کیف بھر دے ظلم پر و رسا زمین  
 کچھ غریبوں کی بھی حالت کا تجھے احساس ہے  
 پسین سے سوتا ہے تو بستر پہ چادر تان کر  
 اس کی عسرت نے بنایا ہے تجھے سرمایہ دار  
 کوششیں کرتا ہے کیا کیا، انے دانے کے لئے  
 یہ ہے وہ سلطان جو مٹی سے لیتا ہے خراج  
 اس نے دامن کو زمین کے موتیوں سے بھر دیا  
 ایک تو ہے نشہ فرعونیت میں چڑ رہا ہے  
 تو ہے دولت مند اور یہ مفلس و نادار ہے  
 تیرے ارمائوں کے گلشن میں بہار آیا کرے  
 اس کی آنکھوں میں ہیں آنسو تیرے ہونٹوں پر ہی  
 وہ ترانگیں محل اور اس کا یہ چمپہ کا گھر  
 سرنگوں عسرت سے یہ، دولت پہ تو مغرور ہے  
 تیرے گھر میں روشنی بجلی کی آتی ہے لکڑ  
 کھا رہا ہے مست ہو کر تو پہاڑوں کی ہوا

اسے کرم نا آشنا سرمایہ داری تا بہ کے  
 لگ گیا ہے تیرے منہ منکوم انسان کا لہر  
 زندگی محبوب ہے تو سیکھ آداب حیات  
 لوح پیدا کر خدا کے واسطے آواز میں  
 فاقہ نش اہل وطن کا بھی تجھے کچھ پاس ہے  
 یہ ہے کس عالم میں تجھ کو کیا بھلا اس کی خبر  
 تو زمینداری کا مالک اور یہ مفلس کا شکار  
 ہر نفس روتا ہے دم بھر مسکراتے کے لئے  
 کھیت اس کا ناک ہے اس کا خزانہ ہے اناج  
 تنم ریزی کر کے قدرت کے حوالے کر دیا  
 ایک یہ بھائی ترا عسرت زدہ مزدور ہے  
 صاحب عزت ہے تو اور یہ ذلیل و خوار ہے  
 اس کی کشت آرزو کیا یوں ہی فرج ہا کرے  
 تیرے چہرے پر سرت، اس کے رخ پر تبسلی  
 تیرا قصر پر تکلف اس کا بوسیدہ کھنڈر  
 یہ مصیبت آشنا تو رنج و غم سے دور ہے  
 کام تاریکی میں دیتا ہے اُسے داغ جگر  
 مر رہا ہے ایک مفلس دیکھ بے آب و نذر

پاک صورت ہے تو کیا سیرت اگر ناپاک ہے  
 نف ہے اس جینے پہ ایسی زندگی پر خاک ہے



نے سوچا نہیں اور اگر سوچا بھی ہو تو عرف سوچا ہی۔

گاڑی چلی۔ دیر تک وہ کھڑکی سے جھانکتا رہا۔ پرانی یادیں اٹھتی چلی آ رہی تھیں۔ اگر میں کبھی واپس نہ آ سکا۔۔۔ یہ خیال پیدا ہوتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اتنے میں کسی نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ ”بھیا کھڑے کیوں ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔“ اس نے دیکھا تو پاس ہی بیٹھا ہوا ایک بڈھا اس کے لئے جگہ خالی کر رہا تھا۔ اُس نے آنسو روکے، اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

”کہاں جاؤ گے بابو؟ بڈھے نے سوال کیا۔

”کانپور“ یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر چپ رہا جیسے بڈھے کی طرف سے کسی سوال کا منتظر ہو۔ بڈھا چپ رہا تو اُس نے کہا۔ ”اور تم؟ بابا“

”بھیا ہیں تو فچھور اترنا ہے“ بڈھا یہ کہہ کر اس کے چہرے کو غزرتے دیکھنے لگا۔ ”ارے بابو یہ آنسو کیسے؟ کیا گھر چھوڑتے ہو معلوم ہوتا ہے؟ بھگوان تم کو جلد واپس لائیں۔ میں بھی جب پیپے پہلے لو کر سی اپنے نکلا تو بڑا دکھ معلوم ہوا۔ گھر والی کو روتا دیکھ کر میں بھی رو دیا۔ پر جی کڑا کر کے گھر سے نکل پڑا۔ دو سال بعد کوئی دوسرا روپے کا کر لٹا۔ گاؤں والے دیکھ کر ہنسا ہو گئے۔ گھر والی تو مارے خوشی کے رو پڑی۔ تب سے کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ کر پاس بھگوان کی آند سے دن بیت رہے ہیں۔ کانپور کیا لو کر سی کرنے جا رہے ہو؟

”ہاں بابا“

”محنت اور مہر سے کام کر دے تو انت میں آند ہی آند رہے گا۔ پیپے بڑے دکھ جھیلنے پڑیں گے۔ وہاں کوئی گھر و دار ہے یا بس پرانا ہی کے سہارے جا رہے ہو؟

”کوئی نہیں۔ بس اللہ مالک ہے۔“

”تو میں تباہ کسی مسجد میں ٹھہرنا۔ وہاں کے ملاکی کچھ خدمت کرتے رہنا۔ پڑ رہے بھری جگہ دیدیں گے۔“

یہ سوال زینت کے لئے کہ میں اپنی راتیں کہاں بسر کروں گا، بہت طویل تھا، اپنے بوڑھے ہم سفر کی رائے اُسے بہت پسند آئی، وہ اچھل پڑا۔ اس نے شکر یہ ادا کرنا چاہا۔ مگر الفاظ نہ سنے، زبان نے ساتھ نہ دیا۔ کچھ کہنا چاہتا مگر اٹک کر رک جاتا۔ بڑی کوششوں کے بعد

اس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا۔ ”یہ تو منیاک ہے۔“

وہ دیر تک چپ رہا۔ بڈھا کچھ سوچ رہا تھا، اور وہ بھی وہ اب پیپے کی طرح نا اُمید نہ تھا۔ اُس کا دل اُنکوں سے بھر گیا تھا۔ اُس کے دلخ نے اس کے سامنے خیالی تصویریں پیش کرنی شروع کر دیں۔ پہلی تصویر میں اُس نے اپنے آپ کو دیکھا کہ مغرب کی نماز کے بعد ایک مسجد میں بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا ہے۔ لوگ ایک ایک کر کے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مسجد خالی سے خالی ہو جاتی ہے۔ وظیفہ جلدی سے ختم کر کے وہ پیش نماز صاحب کے قریب پہنچتا ہے۔ اُن کو سلام کر کے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے، جو وہ بخوشی دے دیتے ہیں۔ وہ اُن سے کہتا ہے کہ قبلہ میں یہاں تلاش معاش کے سلسلے میں دور دراز کا سفر طے کر کے آیا ہوں۔ میرے لئے جائے قیام کا کوئی بندوبست نہیں۔ میری مالی حالت بہت اتر رہی ہے۔ اگر جناب اجازت دیں تو اس مسجد میں قیام کروں۔ جناب کی وقت فوقتاً خدمت کرتا رہوں گا، اور آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔

وہ اُسے بہت خندہ پیشانی سے اجازت دیتے ہیں۔ رات کا کھانا بھی اپنے ہی ساتھ کھاتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور وہ مسجد سے نماز پڑھ کر برآمد ہوتا ہے۔

دوسری تصویر جو اُس کی آنکھوں کے سامنے پیش ہوتی ہے ایک بل کی ہے کہ وہاں وہ ایک پھیر میں کھڑا ہے۔ پیپر کم ہوتی ہے اور خط و کوڑا ایک کوٹ پتوں پہنے ہندوستانی صاحب کے سامنے پاتا ہے، اُن سے وہ کسی مزدور کی جگہ کی درخواست کرتا ہے، اور وہ بخوشی قبول کی جاتی ہے۔ شام کو اُسے دن بھر کی مزدوری ملتی ہے۔ وہ شاداں و فرماں مسجد میں پہنچ کر مولوی صاحب کے آگے سر عقیدت جھکا دیتا ہے۔ وہ مسکین و آفرین کہہ کر اُس کا دل بڑھاتے ہیں۔

وہ آنکھیں بند کر کے اسی طرح کے خیالات کی خوابوں میں نشیمل کرنے لگا یہاں تک کہ فچھور کے آئین پر اس کا ہمدرد بڈھا بغیر اس کے شانے بلائے اُسے خیر باد کہہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھر سوجھیں۔ غنودگی زیادہ طاری ہوئی اور وہ بڈھے کی خالی کی ہوئی جگہ پر قابض ہو گیا۔ اب تک وہ بیٹھ کر سو رہا تھا، اب کچھ لیٹ کر اور کچھ بیٹھ کر سونے لگا۔ گاڑی جلدی۔ وہ اب بھی سو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کو کبھی کسی کھل جانا پڑتا، پھر سوجھ اُسے سونے میں مڑا رہا تھا۔

ساتھ ہولیا۔ دروازے پر پہنچ کر باوجود اوروں کو ٹکٹ دینا دیکھ کر وہ ٹکٹ دینا بھولا جا رہا تھا۔ ٹکٹ بکھڑنے جب بات پکڑ کر ٹکٹ؟ کہا تب اُسے ہوش آیا اور اس نے جیسے ٹوٹنا شروع کیا۔ جس قدر جلد نکالنے کی کوشش کرتا اتنی ہی دیر ہوتی۔ کئی بار ٹکٹ ہات میں آ کر چھوٹ گیا۔ بہت پریشان ہونے کے بعد ٹکٹ دے کر بچھا چھڑایا۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر وہ ایک ٹوٹ کو چل دیا۔

بغیر کسی ارادے کے وہ دیر تک چلتا رہا۔ دوکانوں پر باوجود دھڑکی کی تیز گرمی کے اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اُس نے ان سرنگھٹ عمارتوں، ان دوکانوں اور ان خریداروں میں خدا جانے کیا عجیب بات دیکھی کہ اپنے مقصد کو بھول کر دیر تک بازار میں چکر لگاتا رہا۔

دفعتاً اس کے کانوں میں اذان کی آواز آئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا کچھ دور پر ایک مسجد تھی۔ ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ نماز کے ساتھ ہی اپنے بوڑھے ہم سفر کا خیال آیا۔ مسجد میں داخل ہو گیا۔

مسجد کچھ آپ ٹوڈیٹ مٹر کی تھی، دھنوکے لئے تل لگے ہوئے تھے۔ وضو کر کے وہ ایک سجلی کے پتے کے نیچے آ بیٹھا۔ کچھ دیر ہوا کھائی۔ سنتیں پڑھیں، فرض میں شریک ہوا۔ نماز ختم کر کے ایک بزرگ کا بتایا ہوا وظیفہ صرف وقت گزارنے کے لئے پڑھنا شروع کر دیا۔

جب دو ایک نمازیوں اور پیش نماز صاحب کے علاوہ سب چلے گئے تب اُس نے اپنا وظیفہ ختم کیا۔ مولوی صاحب کا وظیفہ ابھی جاری تھا، وہ انتظار کرنے لگا۔

بہت دیر ہو گئی، مگر مولوی صاحب مصلے سے نہ اٹھنا تھے نہ اٹھے، جب انتظار کی تاب نہ رہی تو اُس نے باہر چلا۔ مغرب کی نماز کے بعد مکن ہے اُن کو بعد فرصت ہو جائے۔ اس نے سوچا۔ پتھر ہو گا کہ اسی وقت کہو؟ شام تک شہر کی سیر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت آ گیا، عصر کا وقت اسی سیر پالے میں جاتا رہا۔ مغرب کا وقت بھی نہ چلا جائے یہ سوچ کر اُس نے دن کی مسجد کو تلاش نہ کی، بلکہ ایک رہ گز سے قریب کی مسجد کا پتہ پوچھ کر وہاں پہنچ گیا۔ وقت ہو چکا تھا۔

نماز پڑھ چکا تو یہاں بھی انتظار کا منہ دیکھنا پڑا۔ مگر زیادہ دیر نہ لگی، مولوی صاحب مصلے سے اُٹھے ہی تھے کہ قریب بیٹھے ہوئے دو

ایک چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ اس کی فینڈ میں ایک آدمی داخل ہوا ہوا، کوئی کہہ رہا تھا۔ مولی صاحب اُٹھے۔ سونے کا وقت نہیں۔ اُس نے آنکھیں کھولیں تو ایک موٹے سے کالے صاحب کو کھڑا پایا۔ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اُن کے لئے جگہ خالی کی، اور خود ایک کونے میں دیک کر بیٹھ گیا۔ صاحب کے لئے اتنی جگہ کافی نہ ہوئی، وہ کھیلنے لگے اور وہ دیکھا گیا، دو آدمیوں کی اس قدر غنقر جگہ کی اتنی نامناسب تقسیم دیکھ کر ایک تیسرے مسافر نے رفیق کو اپنے پاس جگہ دے دی۔ گو وہ کافی نہ ہوئی مگر سبھی مثبت تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ ہیں تو صاحب مگر تیسرے درجے میں بیٹھ رہے ہیں اسوچے سوچے اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ بچے صاحب ایسے ہی صاحبوں کا خطاب ہے، معلوم نہیں اُس کا خیال کہاں تک درست تھا۔ اب تک تو وہ سو رہا تھا، اب اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے، منزل مقصود کے لئے اُس کا دل بے چین ہونے لگا۔ وقت کاٹنے کے لئے اُس نے قدرتی منظر سے لطف اٹھانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ زمین بھر اور سوکھی پڑی تھی۔ آسمان پر ہر ایک ایک لکھ رہی تھا، لطف آتا تو کس چیز کے دیکھنے میں۔

بے مبری بڑھتی جاتی تھی، وہ جلد از جلد کانپور کے اسٹیشن کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔ جب کبھی گاڑی کی رفتار کم ہوتی تو وہ ڈرتے ہوئے سر نکال کر دیکھنے لگا۔ گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر رُک جاتی۔ اُسے بہت عجیب لگا ہٹ معلوم ہوتی۔ کانپور پہنچنے کے لئے وہ اپنے کسی ہم سفر بچے سے کم بے تاب نہ تھا۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ مسافروں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ کانپور آ گیا۔ کانپور آ گیا۔ رفیق نے محسوس کیا کہ اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس نے اپنے سینے پر ہات دکھا۔ دھڑکن تیز ہو گئی، گاڑی اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ پلیٹ فارم سامنے آیا۔ اور گاڑی رُک بھی گئی۔ اُس کا دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ سب اُترنے والے اُتر گئے۔ وہ مبہوت سا بیٹھا تھا۔ آخر اُس کے بغل والے نے کہا تم کو یہیں اُترنا ہے!

”ہاں“ اس نے چونک کر جواب دیا۔ جاتا ہوں۔  
ڈلگے ہوئے قدموں سے وہ نیچے اُترا، اور جانے والوں کے



ہے، باوجود اسی میں بیٹھے ہیں۔

وہ بتائے ہوئے راستے پر ہولیا۔ دفتر کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔  
باپو—جن کی خیالی تصویر اس نے ایک ہندوستانی "مصاب" کی بنائی تھی۔  
"نیکل پنڈت" دھوتی باندھے کڑی برہمن تھے، اُسے دیکھ کر بڑے کیا چلے؟  
"ذکر کی تلاش میں آیا ہوں؟"

"معاذ کیجئے آپ کے لائق ہمارے پاس کوئی کام نہیں۔ یہ کہہ کر وہ  
کچھ لکھنے لگے۔

رفیق جرت سے ان کا منہ تک رہا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سمجھ میں  
نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ کچھ کہنے کے لئے لب بلی ہی تھے کہ "پنڈت نا باؤ نے اُسے  
گھورا — جیسے پولیس والا کسی مشتبہ ملزم کو — اور وہ سر جھکائے جدم  
سے آیا تھا اُسی طرف چلا گیا۔

اور شام کو اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ گنگا میں ڈوب کر ایک  
نوجوان نے خودکشی کر لی۔

پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتا رہا۔ اس نے  
دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور ایک طرف کو چلے جاتے ہیں۔ قیافہ کہتا ہے کہ یہ  
مزدور ہیں، اور اسی کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ اس نے ان سے کچھ پوچھا  
چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک  
سرخ خاں سیٹی بجنے لگی۔ غالباً اسی کارخانے میں۔ اس نے لوگوں کو جلدی جلدی  
بڑھتے ہوئے دیکھا۔ شاید یہ کام پر پہنچ جانے کی سیٹی تھی۔

اس نے دیکھا کہ موقعہ نکلا جا رہا ہے بہت کڑے اوروں کے ساتھ  
ہو لیا۔ ایک دروازہ دکھائی دیا کہ جانے والے اسی پر کھڑے تھے۔ قریب  
پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہر آدمی سے ایک ٹکٹ طلب کرتا  
ہے۔ اور اُسے لے کر اُسے اندر جانے دیتا ہے۔ مجبوراً وہ رک گیا جب  
سب اندر داخل ہو چکے تو اس سے پوچھا کہ یہاں ذکر کی مل سکتی ہے؟  
"مزدوری کیجئے لکھا؟"

جو یہی ہے؟

چوکیدار نے اپنے ساتھی سے کہا "انہیں باپو جی کے پاس پہنچا دو؟"  
ساتھی نے سوچا کہ پتہ بتا دینا بہتر ہے، اور بولا "اوہر چلے جائے۔ وہاں دفتر"

## یادِ دوست

زمین سے آسمان تک غلّتوں کی حکمرانی ہے  
فضائے وہر میں تاریکیاں کروٹ بدلتی ہیں  
سیہ ناگن کے آگے گل چراغِ بزمِ عالم ہے  
ہر اک برگ و شجر پر سنناہٹ کا تسلط ہے  
بسا ناب و گل پر اک جو دکیف طاری ہے  
مگر تو ہے کہ ایسے میں بھی محکویا داتا ہے  
لشیں شانوں پہ ڈالے لیے شب کی جوانی ہے  
ہوائے نند میں خاموشیاں بہیم محبت ہیں  
تجلی کو اکب سر بسر مصروفِ ماتم ہے  
عدا میں جمینگروں کی جھنجھناہٹ کا تسلط ہے  
جہاں میں نیند کی دیوی کا فیض عام جاری ہے  
سرور و کیف بن کر میرے دل پر چھائے جاتا ہے

مری بزمِ تخیل میں تری تصویرِ رقصاں ہے  
مری تاریک دنیا تیرے جلوؤں سے فروزاں ہے

# ملقین قفس

ہم قفس رو نہ بہت شکوہ صیا و نہ کر  
میں سمجھتا ہوں کہ تو عیش گستاں سے ہے دُور  
پھلی آزاد یوں کا وہیاں جب آتا ہے تجھے  
چھپے یا جب آتے ہیں گستاں کے تجھے  
تھا کبھی پھولوں کے جھڑٹ میں تسن تیرا  
شاخ نکل پر کبھی کٹی سنی جوانی تیر سی  
سب یہ سب یہ بجا سب یہ سب یہ سب یہ سب  
میں نے مانا کہ قفس تیرے لئے ہے جنبا ل  
زندگی خاک تری بارغ میں ہوتی سنی بسر  
رو ز پڑتا تھا تجھے اک نہ اک افتاد سے کام  
خوف شاہیں سے نکلتی سنی نہ آواز تری  
کسی گوشے میں لگائے تھا کوئی جال کہیں  
آشیا نہ تھا تو وقت اُجڑنے کے لئے  
کبھی عمر صبر کبھی اندھی سے تھا بالاسحبکو  
پیٹ کی فکر میں عالم تھا پریشانی کا  
رات دن کام تھا محنت سے مشقت سے تجھے  
غور کر غور کہ یہ کبھی کوئی آزادی ہے  
اب یہاں دیکھ کہ ہے کس قدر آرام سے تو  
نہ یہاں برق کا کھٹکا نہ خزاں کی کاہش  
باد و باراں کے مصائب کی تجھے فکر نہیں  
نہ یہاں جال کا دھڑکا ہے نہ شہباز کا ڈر  
وانے دانے کے لئے اب نہیں زحمت سمجھو  
نہ مشقت ہے نہ محنت ہے نہ حیرانی ہے

آہ و وحہ ضبط کی برباد نہ کر  
تجھ کو اس قید بلا سے ہے رہائی منظور  
ہجر اجاب تمن سخت ستاتا ہے تجھے  
خواب آتے ہیں نظر نبل و رساں کے تجھے  
اور اب خانہ صبا و ہے مسکن تیرا  
اب ہے محبوب قفس زمزمہ خوانی تیری  
پھر سبھی بیکار ہے اس طرح سے رہنا تراست  
پھر سبھی جو امن یہاں ہے وہ ہے گلشن میں بحال  
نستوینار رخ و نیا غم تھا تجھے آٹھ پہر  
جو پگھلیں سے کبھی فطرت صیا و سے کام  
ہر گھڑی تاک میں تھا چکل شہباز تری  
کوئی بیٹھا تھا کترنے کو پر و بال کہیں  
جسم نازک پہ ترے تیرے پڑنے کے لئے  
کوئی جز برق نہ تھا تو چھنے والا سمجھو  
کبھی دانے کا تھا خلیان کبھی پانی کا  
کوئی مطلب ہی نہ تھا عیش فراغت سے تجھے  
مجھے حیرت ہے کہ تو کس لئے فریادی ہے  
ملقین کلفت صیا و و غم دام سے تو  
چمن سے گوشہ عزت میں ہے بے رخ خلش  
صر و خار کے آلام کا یاں ذکر نہیں  
نہ یہاں تیر و کمان و قدر انداز کا ڈر  
بن گیا ہے قفس اک آہِ رحمت سمجھو  
پھر سبھی نالاں ہے جو تو یہ تری نادانی ہے

شکر کر میری طرح کاٹ دے آنام سے دن  
ور نہ گزریں گے بہت کلفت و آلام سے دن

# افسانے کی تشکیل

مولینا ادا وصاری

واقعات کے تاثر کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ کرداروں کی مناسبت، افسانہ کے اجزاء کے تناسب، واقعات کے مناسب مدارج، اور زاویہ بیان، سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

عمل تشکیل کے دوران میں افسانہ نگار کو یہ امر ہر وقت اپنے سامنے رکھنا پڑتا ہے کہ افسانے کا مقصد اعلیٰ کم سے کم ذرائع سے واحد تاثر پیدا کرنا ہے؟ اس اصول کے پیش نظر وہ ہر اس جزوی چیز کو جو پلاٹ میں شامل کی جاتی ہے۔ چھپے خوب اچھی طرح ہنظر امتحان دیکھتا ہے کہ آیا یا فسانے کے لئے ضروری ہے یا نہیں؟ آیا اس سے افسانے میں کوئی حقیقی اضافہ ہوتا ہے یا نہیں؟ اور آیا اس جگہ کے لئے بالکل مناسب رہے گا یا نہیں جو اس کے واسطے افسانے کے پلاٹ میں نکالی گئی ہے۔

ہم نے اوپر کم سے کم ذرائع کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ نگار افسانے میں کم سے کم مزدوری کردار رکھے۔ کم سے کم واقعات دکھائے اور کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ محدود جگہ میں افسانہ تیار کر دے۔ اگر دو کرداروں سے کام چل سکتا ہے تو تین کردار استعمال کرنا بے ضرورت ہے۔ اگر تاثر کی تخلیق کے لئے صرف ایک وقوعہ درکار ہے تو افسانہ نگار کو اسی ایک وقوعہ تک رہنا چاہیے۔ اگر ایک ہی مقام پر افسانہ تمام ہو سکتا ہے تو اسے کئی مقامات پر پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر حالات، کردار، واقعات وغیرہ میں زیادہ سے

تشکیل: افسانہ تعمیر کی جزئیات متعین کرنے کا نام ہے۔ افسانے کے حسن اور پختگی کا جتنا دار و مدار پلاٹ کی عمدگی پر ہے اتنا ہی تشکیل کی خوبی پر بھی ہے۔ جس طرح پلاٹ میں معمولی سی خامی رہ جائے پر تمام افسانہ خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تشکیل میں نقصان باقی رہ جائے تو افسانے کے اجزاء کی مناسبت اور اس کے وقار میں فرق آ جاتا ہے۔ خاک تیار کرنا اگر ایک فن محفل ہے تو خاکے میں جزئیات آرائی کرنا بھی ایک اسٹ ہے۔ تشکیل افسانہ کے خاکے میں جزئیات کی جگہ متعین کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس میں افسانہ کی جزوی باتوں کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ موسم۔ کمرے کے دروازے۔ کھڑکیاں وغیرہ بہت ہی معمولی معمولی چیزیں تشکیل کے وقت زیر غور آتی ہیں۔ تشکیل کو پس آؤ یا محل جو سمجھنا درست نہیں بلکہ کہنے سے قبل افسانے کے پلاٹ میں جن معمولی معمولی باتوں کو دخل کرنا ضروری ہوتا ہے ان کے تعین کو تشکیل کہا جاتا ہے۔ ہر جزوی بات کے وجود کے جواز میں وجہ ڈھونڈی جاتی ہے۔ ہر فقرہ، ہر حادثہ یا ہر وقوعہ، ہر کردار، ہر بیان، ہر قول کے متعلق یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا وہ حدت تاثر سے ہم آجگ ہے؟ اور آیا اس کو وہ مناسب جگہ مل گئی ہے یا نہیں، جہاں وہ زیادہ سے زیادہ موثر ثابت ہو گا۔ اجزاء اس طرح ملائے جاتے ہیں کہ افسانہ کی عمارت میں سہدا پن پیدا نہیں ہونے پاتا ہر جزو و اتنا ضروری اور بر محل معلوم ہونے لگتا ہے کہ اگر اسے اس کی جگہ سے ہٹا لیا جائے تو افسانے میں کسی بات کی کمی نظر آنے لگے۔ تشکیل میں معمول



زیادہ کفایت شعاری برتنے وقت ایک بات فراموش نہیں ہونی چاہیے۔ وہ بات یہ ہے کہ افسانہ کی فایت زیادہ سے زیادہ موثر طریق پر پڑھنے کے لئے ذہن نشین ہو جانی چاہیے اگر تاثیر کے حصول کے لئے کفایت شعاری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے تو افسانہ نگار کو چاہیے کہ بے تکلف اس سے دست کش ہو جائے تشکیل کے معاملہ میں ایک بڑا اہم حل طلب مسئلہ افسانہ نگار کے سامنے یہ ہوتا ہے کہ حصول تاثیر اور کفایتی ذرائع کے درمیان توازن کیونکر قائم کیا جائے۔

ہر افسانہ میں چند کردار ایسے ضرور ہوتے ہیں جو پلاٹ کی حرکت کے لئے ضروری نہیں ہوتے، مگر تشکیل کے لئے ضروری عناصر کا حکم رکھتے ہیں انہیں معاون کردار کہتے ہیں کیونکہ ان سے پلاٹ کو نشو و نما دے کر افسانہ کو تکمیل تک پہنچانے میں مدد ملتی ہے، اکثر انہیں تقابل کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ مرکزی کردار کی بعض اچھی یا بری خصوصیات اور بھی اجاگر ہو جائیں۔

اگر مرکزی کردار غیر معمولی کیرکٹر کا مالک ہوتا ہے تو امدادی کردار عام رجحانات کے حامل دکھائے جاتے ہیں تاکہ مرکزی کردار کی غیر معمولیت اور بھی زیادہ نظر آئے، اگر مرکزی کردار کے کیرکٹر میں بد خصالی زیادہ ہوتی ہے تو اس کے مقابل نیک امدادی کردار رکھ کر اس کی لطینت کی خرابی کو اور بھی چمکا دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات ایک کردار کو دوسرے کردار کی فضائے بعید یا اسکا پس منظر اپنے مقابل کے کردار کی خصوصیات کو اگر وہ روشن ہیں تو روشن کر دیا جاتا ہے اور اگر تاریک ہیں تو تاریک کر کے دکھاتے ہیں۔ کبھی اس پس منظر کے مقابل ایک کردار کو صرف ناپا جاتا ہے، یوں بلند ترین روشنیاں اور عمیق ترین تاریکیاں پڑھنے والے کے سامنے لائی جاتی ہیں۔

تاہم کرداروں کا تنہا مصروف تقابل ہی نہیں ہے یہ اصول کہ زیادہ سے زیادہ کفایتی ذرائع برتنے جائیں، اس امر کا معقنی ہوتا ہے کہ وہ ادبی طریقوں سے بھی ایک دوسرے سے اس طرح پیوست کئے جائیں جیسے کپڑے کے تالیق دوسرے سے چسپاں کر دئے جاتے ہیں، کیونکہ ان کی پورگی سے افسانہ کی تشکیل کا عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

بعض اوقات معاون کرداروں میں انفرادیت بالکل نہیں ہوتی،

وہ صرف پس منظر کا کام دینے یا فضا پیدا کرنے کے واسطے پیدا کئے جاتے ہیں ایسی صورتوں میں ان کی تخلیق اور تفسیر پر کوئی خاص توجہ صرف نہیں ہوتی۔ یا تو ان کی ایک جگہ ہی جھلک دکھادی جاتی ہے، یا صرف اوپری طور سے تذکرہ کر دیا جاتا ہے یا ان کا ایک ہلکا سا عکس دکھا دیا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں اضافی کردار صرف جزئیات کی تکمیل کے لئے لائے جاتے ہیں کبھی ایک کہانی بیان کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا خود کہانی کے واقعات میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ غرض صد ہا طریقوں سے امدادی کرداروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر افسانہ کی جدا گانہ ضرورت ہوتی ہیں۔

بعض اوقات افسانے میں ایک معاون کردار کا اس لئے بھی اضافہ کر دیتے ہیں کہ اس سے نفس مضمون کو تقویت پہنچتی ہے، مثلاً مرکزی راہد کی خصلتوں کو واضح تر کرنے کے لئے مولینا نیاز فقہوری نے شہید آزادی میں حیدر رضا کا کردار پیش کیا ہے۔

کرداروں کا واقعات سے قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے اب ہمیں افسانے کے وقوعات کی طرف توجہ کا رخ پھیرنا چاہیے۔ افسانے کا یہ اصول ہے کہ ہر جہز کسی نہ کسی طرح افسانے کے عمل اور اس کی حرکت کو آگے بڑھاتا ہے اور افسانے کو اس کے متعینہ انجام سے قریب تر کر دیتا ہے۔ اس سے ایسی جزئیات ہیا ہوتی ہیں جن سے افسانہ مکمل ہوتا ہے۔ اپنی جزئیات کے صحیح انتخاب اور مناسب استعمال پر بڑی حد تک افسانہ کے تاثر کا دار مدار ہوتا ہے۔

وقوعات کے تین مصنف ہیں۔ مثال سے کسی چیز کو واضح تر کرنا۔ عمل میں تیزی پیدا کرنا۔ اور جذبات کی اُکساہٹ کا سامان ہیا کرنا۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک افسانہ میں وقوعات کا ایک مصنف ظاہر ہو۔ ہر کہانی میں عمل اور جذبات ایک ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اس لئے عمل کے وقوعات اور جذباتی وقوعات اکثر پہلو بہ پہلو یا ایک دوسرے سے وابستہ دیکھے جاتے ہیں۔

مثالی وقوعات بہت کم دیکھے میں آتے ہیں اور وہ افسانہ کے لئے بنیادی طور پر ضروری بھی نہیں ہوتے وقوعات عمل البتہ افسانے کے لئے جان کا حکم رکھتے ہیں۔ جذباتی وقوعات کو اس طرح ترتیب

دینے سے کہ وہ وقعات کے درمیان آجائے ماضی کے مفصل کن تسلسل کو توڑا جاسکتا ہے۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہمارا محسوس کو اگسٹے اور مدہم کر دینے سے آیا افسانے کے وحدت تار کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

ایک سولی سی مثال سے اس سوال کا تشفی بخش جواب دیا جاسکتا ہے۔ فرض کر دو ایک شخص پہاڑ پر چڑھ رہا ہے۔ وہ منظر چہاڑ کی چوٹی سے نظر آسکتا ہو اس کو اسی وقت نظر آئے گا جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے گا۔ مگر اس دوران میں ہی تو جب وہ اوپر کی طرف گامزن ہے جہاں تپاں اُسے ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو اُس کی نظروں کے لئے حجت نظر نہ ثابت ہوں گی، بالکل ہی صورت افسانہ کی ہے۔ جذبات کی ہر تادہ اکس ہٹ ڈاؤ یہ نظر کو وسعت دیتی ہے۔ مگر حالات کا پورا نظارہ افسانہ کے نقطہ عروج پر پہنچنے کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے، عمل کے لحاظ سے افسانہ برابر اپنے ارتقائی منازل طے کرتا رہتا ہے۔ اتمام منازل نقطہ عروج ہی پر ہوتا ہے۔ درمیان نازک لمحات شاہراہ ارتقا پر سنگھمائے راہ بن جاتے ہیں۔ ہر نازک گھم اپنے پیشرو کی نصیب کسی قدر بلند تر سطح پر ہوتا ہے۔

افسانے کے ان نازک لمحات کے درمیان محسوس میں کوئی کمی واقع نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ (تلازمہ قائم رکھتے ہوئے) یہ ضروری نہیں کہ ہر بار کسی بندی پر پہنچنے سے قبل ایک شخص کسی دادی میں اترے۔

دوسرے نمائندہ کا وقوعہ یعنی مثالی وقوعہ بھی ذہن ہی سے اپیل کرتا ہے۔ تھریجی مثالوں سے افسانہ کی چمک دمک بڑھ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مثالی وقعات سے صرف افسانہ کے واقعات کی گہرائی تک پڑھنے والے کے ذہن کو لیجانا مقصود ہوتا ہے۔ واقعات کو مجسم کر کے وہ انہیں زیادہ واضح شکل دیدیتے ہیں۔ اکثر اس طرح کسی کردار کی سبھی تشریح کر دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی افسانہ کے موضوع پر سبھی مثالی وقعات سے نئی روشنی پڑ جاتی ہے۔ ان کے ذریعے پڑھنے والا موضوع تک بالکل ایک نئے راستے سے پہنچتا ہے۔ اس طرح ایک اضافی واقعہ کے علم میں آجانے سے تاثیر و اثر میں بچا اضافہ ہو جاتا ہے۔

جذباتی وقعات کا واسطہ افسانہ کے عمل کو ترقی دیتے ہیں۔ وہ افسانہ کی فضا بناتے ہیں۔ اُسے ایک مخصوص رنگ دیتے ہیں اور پڑھنے والے میں جذبہ ہمدردی برانگیختہ کرتے ہیں۔ اُن سے کیفیات کی تخلیق بھی کی جاتی ہے۔ کبھی

کبھی ان سے کہانی میں فوری مزاج کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ان وقعات کا صرف کچھ بھی جو اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جہاں تک وحدت تار کا تعلق ہے یہ اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں۔ ہر چند جذباتی وقعات تنہا بھی وجود پذیر ہو سکتے ہیں۔ مگر عموماً وہ عمل یا مثال کے وقعات سے منتہی کر دئے جاتے ہیں۔

افسانے کی تشکیل کے دوران میں یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ عمل کردار اور فضا کو مناسب اثر بخش جائے۔ مگر اس میں شدت نہ ہو۔ کسی وقوعہ کے بیان، یا کسی کردار کی تصویر کشی میں بہت سی جزوی اور غیر اہم تفصیلات دی جاسکتی ہیں۔ اُن کا صرف صرف یہی ہوتا ہے کہ تاثیر میں گہرائی پیدا ہو۔ مولانا نیا ز مخپوری نے داستان حسن و عشق کے خونی درق میں جو عتیق فانی گائتر سے ماخوذ ہے قلوبطرح کا کردار پیش کرتے وقت درجنوں جزوی اور غیر اہم تفصیلات پیش کی ہیں اسی طرح قلوبطرح کے عمل کی فضا بڑی مرتعش پیش کی ہے۔ شاید اس سے مصنف کی غرض قلوبطرح کا شاہانہ پس منظر پیش کرنا ہے۔ برخلاف اس کے رادعا میں کردار نگاری کو بہت کم گنجائش دی گئی ہے، یہاں عمل پر زیادہ زور ہے اور جس حد تک ضروری ہے کردار کی تصویر بھی عمل کی جھانکیوں میں ہی سے دکھائی گئی ہے۔ کبھی کبھی نمایاں کردار یا عمل اور بھی زیادہ نمایاں بنانے کا یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے کہ افسانہ نگار صرف چند تصریحی الفاظ لکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ مین اُس وقت جب پڑھنے والا تفصیلات کا متوقع ہو، بیانی اختصار سے پڑھنے والے کی توجہ فوراً کردار یا عمل پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

تخلیق اثر کے لئے بعض اور ذرائع بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ قلم دیکھا ہو گا محفل سماع میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کو کسی خاص شعر یا مصرع پر وجد آ جاتا ہے تو موسیقار اسی کو بار بار دہراتے ہیں، اور اس کے اثر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ہر بار جب پسندیدہ شعر یا مصرع دہرایا جاتا ہے صاحب وجد کے دل و جگر میں ہلک سی اٹکتی ہے۔ بعض افسانوں میں بھی یہی کھٹکا استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکن افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو جو افسانہ نگاری کا مادہ آدم سمجھا جاتا ہے اس ترکیب کا بڑا دلدادہ اور بہت خوگر تھا۔ مختلف افسانوں میں یہ ترکیب مختلف طریقوں سے استعمال کی جاتی ہے بعض دفعہ نفس موضوع پر زور دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہی اشارات



کوئی ایک زاویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

۱) ایک ایسا شخص جس کا افسانہ سے قریب یا دور کا تعلق نہیں ہے افسانہ بیان کرتا ہے۔ یہ ڈھنگ بہت قدیم سے مروج ہے۔ اس میں چند خامیاں ضرور ہیں۔ یعنی بعض اوقات بیان اور اصلیت کے معاملہ میں افسانہ میں ٹھیک آجاتی ہے مگر اس ڈھنگ سے پڑھنے والوں کو ایک بڑی آسانی یہ رہتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو مختلف مقامات پر اور مختلف اوقات میں ہو رہا ہے اس ڈھنگ سے وہ دلوں میں چھپے ہوئے خیالات اور پوشیدہ رجحانات سے بھی باخبر ہو جاتے ہیں اور کسی صورت حال یا کردار کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس بیانی زاویہ سے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ ہر کردار کو بے لاگ اور غیر جانبدارانہ طور پر پیش کیا جاسکے۔ پڑھنے والا اس زاویہ سے بیان کئے ہوئے افسانوں میں اپنی تمام توجہ واقعات پر مرکوز کر دیتا ہے، اور بیان کرنے کے وجود کو بالکل فراموش کر جاتا ہے۔ بعض افسانوں کے لئے یہ غیر جانبدارانہ زاویہ بیان ناگزیر اور لازمی ہوتا ہے۔ وہ اس ڈھنگ کے سوا اور کسی ڈھنگ سے بیان ہی نہیں کئے جاسکتے۔

۲) کوئی ایسا شخص افسانہ بیان کرتا ہے جو خود واقعات میں

حصہ دار رہ چکا ہے یا جس نے افسانہ کو وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے، اس ڈھنگ سے واقعات کے بیان میں بہت صفائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی زبان سے کسی واقعہ کو سننا دیا دہ پسند کرتے ہیں جو یا تو حادثہ میں شریک تھے یا اس وقت جبکہ حادثہ وقوع پذیر ہوا ہو وہاں موجود تھے۔ اس صورت میں افسانہ بیان کرنے والا ہمارے ایک واقعہ کار کی سی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور افسانہ اصل معلوم ہونے لگتا ہے بالخصوص ایڈوینچر (

کے افسانہ مرکزی کرداروں کی زبان سے بیان کر ڈالے جاتے ہیں تو بہت ہی زیادہ لبریز اصلیت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ البتہ ان صورتوں میں جب ایڈوینچر کا انجام خزانہ ہو یا ایڈوینچر کا انجام ہیرو کی موت پر ہوتا ہو۔ یہ ڈھنگ بیکار ہو جاتا ہے۔

افسانہ عمل میں یہ ڈھنگ زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ مگر افسانہ کردار کے لئے یہ بہت غیر موزوں اور نامناسب ثابت ہوتا ہے

صورتوں میں ترتیب وقوع توڑ دی جاتی ہے اور افسانہ نگار اپنے اوپر انھیں ترتیب دیتا ہے۔ کسی واقعہ کو جو ترتیب وقوع کے لحاظ سے آگے ہونا چاہیے پیچھے کر دیتا ہے اور کسی کو جو پیچھے دکھانا چاہتا ہے آگے لے آتا ہے۔ تاہم اکثر و بیشتر افسانوں میں ترتیب وقوع کے مطابق واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

اکثر افسانوں کو ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے یا تو ایک طویل سطر لکھ کر یا ایک حصہ کو دوسرے حصے سے جدا کر دیتے ہیں یا نقطہ یا پھول وغیرہ درمیان میں لاکر فاصلہ پیدا کر دیا جاتا ہے یا (۱) (۲) (۳) وغیرہ سے فرق ڈال دیتے ہیں۔ ہر چند بعض مستند افسانہ نگاروں کے افسانوں میں اس وضی کی تقسیم نظر آتی ہے۔ مگر فی اعتبار سے اس تقسیم کی معقولیت کا کوئی حوالہ نظر نہیں آتا۔ اس صورت میں جب منظر میں مکمل تبدیلی یا سلسلہ خیالات میں مکمل انقطاع ہو اس قسم کی تقسیم قابل درگزر ہے۔ ایسی جگہوں پر فرق ڈالنے سے افسانہ کی مجموعیت پر برا اثر نہیں پڑتا۔ برخلاف اس کے اگر اس تقسیم سے مقصود صرف مختلف زمانوں کو جدا جدا کر کے دکھانا ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے افسانہ کی حرکت پر برا اثر پڑتا ہے اور اس وقت یہ تقسیم نہ صرف بیکار بلکہ خلاف قاعدہ بھی ہوتی ہے۔

مختلف زمانوں کے وقوع کا عام طور پر ایک فقرے یا چند الفاظ سے تجویزی ظاہر کیا جاسکتا ہے اور اکثر افسانوں میں اس کی بھی حاجت نہیں ہوتی کیونکہ وقوع کا فرق ظاہر کرنا ضروری ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اگر کوئی افسانہ ابواب میں تقسیم ہوئے بغیر ہی تحریر ہو سکتا ہے تو اسے ابواب میں تقسیم کرنا سخت غلطی ہے بلکہ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ جن کہانیوں میں وقوع ظاہر منظر معلوم نظر آتا ہے وہ بھی ایسا کرنے سے باعتبار حرکت کمزور پڑ جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ پڑھنے والے کے ذہن کو دم لینے پر مائل کرتی ہیں۔ اگر افسانہ طویل تر تھا تو واقعات کا فاصلہ طے کرنے پر مصر نہیں ہے تو وہ پڑھنے میں گھبراہٹ کیوں محسوس ہوں افسانہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور جو افسانہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پڑھا جائے وہ وحدت تاثر کا حامل نہیں ہو سکتا اور نہ پڑھنے والے کے ذہن پر واحد تاثر مرتسم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر افسانہ نگار کے سامنے یہ بھی ایک حل طلب سوال ہو اگر تانہ کہ افسانہ کو کیا شکل دی جائے یعنی کس قسم کا بیانی زاویہ لیا جائے۔ ہم اس طریقہ اس منزل میں بہترین رہنما ہوتے ہیں۔ عموماً ذیل کے بیانی زاویوں میں سے

چونکہ مرکزی کردار اپنی ذاتی صفات اور خصوصیات کو خود اپنی ہی زبان سے واضح کرتا ہوا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، اور جب ایک کردار اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے ظاہر ہوا فسانہ بے لطف رہتا ہے۔ اس لئے اگر فسانہ کردار میں بیان کا یہ ڈھنگ اختیار بھی کیا جاتا ہے تو اس طرح مرکزی کرداروں کی جگہ معائنہ کردار کی زبان سے فسانہ بیان کرایا جاتا ہے۔ اس طرح کردار نگاری کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے اور واقعات کی وضاحت کا بھی۔

(۳) بعض اوقات ان لوگوں سے جو فسانہ کے واقعات میں حصہ دار رہے ہیں خطوط کے ذریعے فسانہ بیان کرایا جاتا ہے یا ڈائری میں واقعات کے اندراج سے فسانہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ طریق بہت کم استعمال ہوتا دیکھا گیا ہے، اور اس کا استعمال بہت دشوار بھی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ خطوط میں عموماً جہاں تہاں کی درجنوں باتیں ہوتی ہیں اگر مخاطب اور صاحب مکتوب میں بے تکلفی ہے یا دوسرے لفظوں میں فنی احتساب اُن کی اس وضع کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔ ان خطوط میں کوئی ایسی بات درج نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی اعتبار سے فسانے کا جز بننے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، اور پھر اس پابندی کے ساتھ ہی خطوط میں اصلیت کی جھلک بھی ہونی چاہیے۔ خطوط کے ذریعے فسانہ بیان کرنے میں ایک مزید دشواری یہ ہے کہ فسانے کی تدریجی ترقی اور دلچسپی قائم رکھنی مشکل ہوتی ہے۔ اگر کل خطوط ایک ہی شخص نے لکھے ہیں تو ہر خط میں یہ بھی ظاہر کیا جانا ضروری ہوتا ہے کہ گزشتہ خط کا مخاطب نے کیا جواب دیا۔

ڈائری کا یہ طریقہ بھی اسی قسم کی مشکلات کا حامل ہے، خطوط تو پھر حال کسی نہ کسی مخاطب کو خطاب کر کے لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں ضرور کچھ نہ کچھ دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر ڈائری کا طریق اس لحاظ سے اور بھی زیادہ غیر دلچسپ ہوتا ہے، کیونکہ تنہا ایک ہی شخص ڈائری لکھتا ہے، اور جو کچھ لکھتا ہے کسی کو خطاب کر کے نہیں لکھتا۔

(۴) ایسی صورت میں جب فسانہ بیان کرنے والے نے فسانہ کسی دوسرے سے سنا ہو تو وہ فسانہ در فسانہ ہو جاتا ہے۔ پیچہ دو تین ہیرو میں ایک قسم کا بیانیہ تعارف ہوتا ہے اور پھر یہ دکھایا جاتا ہے کہ ایک شخص (عام طور پر بہت اصرار کے بعد) ایک کہانی شروع کرنا ہے جو اس نے اپنی جگہ کسی سے سن رکھی ہے یا جس کے واقعات اس کی

موجودگی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں یا جس میں وہ خود بھی بطور معاون کردار یا مرکزی کردار شریک رہا ہے یہ طریق اور بھی کئی طریق سے استعمال ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ طریق بیان بہت ہی قدیم ہے، اٹلاوی زبان میں "بوکاسیو" کے درجنوں افسانے اس طریق پر ہیں۔ انگریزی زبان میں چامس نے اس طریق کو کئی کئی طرح استعمال کیا ہے۔ ہماری اردو زبان میں تیر امن دہلوی نے چار درویش اسی پیرائے میں لکھا ہے۔

یہ کہنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ فسانہ کا کمال یہ ہے کہ پڑھنے والا اُسے اصل سمجھے۔ تشکیل کی تمام جزئیات کو اس طرح آراستہ کرنا چاہئے کہ وہ سنی بر اصلیت معلوم ہوں۔ اثر اسی وقت ہوتا ہے جب یہ پڑھنے والا فسانے کو اس قدر اصل سمجھنے لگے کہ اُسے شبہ ہو جائے کہ یا تو یہ واقعہ کہیں ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ اگر پڑھنے والے کو فسانہ نہ پڑھتے وقت یہ محسوس ہونے لگے کہ اُسے "ابن فریبی" کا شکار بنا یا جا رہا ہے تو وہ متغیر ہو کر فسانہ ہاتھ سے رکھ دے گا۔ بعض اوقات اپنی دلچسپی کی بنا پر دیو پری کے فسانے بھی اصل معلوم ہونے لگتے ہیں، اُن میں بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ قوت تخیل ان لوٹ ہو جاتی ہے، اور بند و زلفوں کی طرح اُن کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ پختہ عمر کے لوگ طبعاً دیو پری کے افسانوں میں اتنی دلچسپی نہیں پاتے جتنے بچے۔ اس کی ایک صریح وجہ ہے، محسوس حقیقتوں کی سنگین دنیا سے تادیر تعلق رکھنے کی وجہ سے پختہ عمر کے لوگوں کی قوت تخیل کم ہو جاتی ہے۔ خیالی دنیاؤں میں پہنچ جانے کی قوت اُن میں نہیں رہتی۔ انھیں دیوؤں کی لڑائیوں۔ اژدہوں کے مارے جانے، اور دیو لڑائیوں کے ذریعے جانے میں چنداں لطف نہیں آتا۔ کیونکہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس حقیقی دنیا کے دیوؤں کا جن سے دن رات واسطہ پڑتا ہے اسی دنیا کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا جانا ہمارے لئے زیادہ مفید اور باعث دلچسپی ہے۔ پختہ عموں کے مرد اور عورتیں دونوں اپنی اس قابلیت پر فخر کرتے ہیں کہ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کہ ایک ہوائی قالین آیا اور وہ شہزادے کو اڑا کر پریوں کی حسین سر زمین کی طرف لے گیا، انھیں مجہول اور بے معنی معلوم ہوتی ہیں، جب تک انھیں یہ خیال رہے گا کہ فسانہ خیالی واقعات پر مبنی

ہے اور اس کا سنگین حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اس محسوس کے ساتھ کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اور یہ بھی اس وقت جب وہ پڑھنے پر آمادہ ہوں اچانچہ حقیقت پسند انسانہ نگار صرف اپنی واقعات پر اپنے افواہ کی بنیادیں رکھتے ہیں جو نہ صرف حقیقی معلوم ہوں بلکہ کسی بحث کے حقیقی نتیجہ بھی کہنے جائیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسانہ ہو ہو زندگی کا چرہ ہو نہ چاہئے جا بکدست سنگتراش جس طرح اپنے تخیل سے پتھر کے ایک ٹکڑے کو ایک دل کش اور حسن صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک ماہر فن انسانہ نگار ایک حقیقی واقعہ کو زبان اور خیال کے رنگ و سہ کر کچھ بنا دیتا ہے وہ واقعات کو حقائق کے بھوم میں سے جدا کر کے ان پر اپنے تخیل کا جامہ دو کرنا ہے اور دیکھتے دیکھتے میں وہی سنگین، بے برگ و گیاہ اور خشک واقعات سچائی اور حسن کے ایک دل آویز مرقع کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

کبھی کسی شخص کے کیر کیر کے کسی قابل طور پہلو کو اہمیت دے کر اتنا بلند کر دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا ایک لمحہ کے لئے گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اتنی سی غیر اہم خصوصیت کو دار کو بھی اس قدر سن آموز بنا یا جاسکتا ہے۔ کبھی کسی ایک واقعہ کو اس کے جزوی عناصر سے علیحدہ کر کے کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جو لوگ اس پر غور کرتے ہیں۔ ان کے دلوں پر چرچسکی

لگتی ہے، غرض کسی چیز کو دبایا جاتا ہے کسی کو اُسبھارا جاتا ہے اور حقیقی واقعات کو حقیقی رکھتے ہوئے بھی ایسا بنا سوار کر پڑھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جاتا ہے کہ انہیں انسانہ نگار کی ژرف نگاہ اور علمائے تخیل کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

مگر یاد رہے کہ حقائق پر تخیل کا غرور سے زیادہ گہرا رنگ چڑھانے سے ان کے اثر میں کمی ہو جاتی ہے۔ حقائق اپنی سچائی کے اعتبار سے ادل آخر حقائق ہی رہتے ہیں۔ مگر وہ موثر نہیں ہوتے۔ انہیں تاثیر کا حامل بنانے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ ان کا رشتہ وہی نہ کسی ایک چیز سے لگایا جائے جو عام انسانی تجربہ سے ڈانڈے ملائے ہوئے ہو وہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جس سے عام انسان واقفیت رکھتے ہوں۔

انسانہ میں اصلیت کی جھلک پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انسانہ نگار خود کو دو قوعات اور طول طویل بیان کا پابند کرے۔ ایسی جزئیات بھی جو انسانہ میں جا بجا منتشر کر دی گئی ہوں موثر ہوتی ہوں۔ جانے وقت اور وقت کے جزوی اشارات سے بھی انسانہ میں اصلیت کی جھلک پیدا ہوتی ہے۔ کردار کے منہ میں بھی ایسے فقرے رکھے جاسکتے ہیں۔ جو انسانہ کو واقفیت کا رنگ دیدیں حقیقی واقعات یا ہنگامی ساخت کی طرف کبھی کبھار ہلکا سا اشارہ کر دینے سے بھی اصلیت جھلکنے لگتی ہے۔

## ہمو

نہ نیکشوں کا وہ گلشن رہا، نہ لالہ رہا  
نہ کوئی دفتر آداب کا رہا نسخہ  
نہ سوز و ساز کا قائم رہا مقولہ کوئی  
نہ اہل عیش کے وہ دلغریب سخن رہے  
نہ زاہدوں کا وہ ڈہر ہزار سالہ رہا  
نہ کوئی مصحف انداز کا سالہ رہا  
نہ علم و عقل کا باقی کوئی مقالہ رہا  
نہ اہل درد کا وہ جاں گداز نا رہا

حرم کیف میں تاریخ رنگاں بن کر

رہا تو حضرت ساقی کا اک پیالہ رہا

بجوش ملیح آباد

# اے نیند بس اب آجا

منس کی کمائی ہے، قیدی کی رہائی ہے کچھ وصل نہیں ظالم۔ یہ شام جدائی ہے

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

جبتی ہیں مری آنکھیں بلکیں ہیں شہر گویا اُستنا ہے دھواں دل سے ہے آپ نظر گویا

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

یکساں ہے کرم تیرا۔ جب سائے زمانے پر پھر کیوں اُتر آئی ہے، اک میرے ستارے پر

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

ہر سانس کے پہلو میں پیکاں ہے کھلتا ہے ہر لحظہ کھلتا ہے۔ ہر آن کھلتا ہے

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

حراں کا یہ عالم ہے، خاک اُڑتی ہے سینے میں جینا ہے جو نام اس کا، کیا لطف ہے جینے میں

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

تکلیف ذرا فرما، احسان ترا ہو گا ہوں بند مری آنکھیں۔ افسانہ سنایا

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

تو بالمش و بسترے، میں خاک پہ سوؤں گا آرام تجھے دوں گا، انعام تجھے دوں گا

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

ہے میرے شبتاں میں، خاموشی و تاریکی سامان ہے راحت کا، اور سحر ہے پھولوں کی

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

اب بھی جو نہیں آتی، آ، تجھ کو دکھا دوں گا ہے عکس مرے دل میں، جن چاند کے ٹکڑے کا

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

آرام کا دشمن ہے، اور جانِ منسا ہے میں جس کا ستایا ہوں، دل جس نے ستایا ہے

اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا



# پیام اقبال اور کشاف

رازی

جون۔ جولائی ۱۳۸۷ء کے کلمہ میں جناب کشافؒ کا ایک مضمون بعنوان اقبال اور پیام اقبال شائع ہوا ہے جس میں اسٹون نے علامہ اقبال کے خلاف یہ جرم عظیم مایہ کیا ہے کہ اسٹون نے اپنے شاہین خیل کو وطن پرستی کے قصص سے نکال کر عالمگیر انسانیت کی فضا کے لپیٹ میں بال کشا ہونے کی احادیث کیوں دی ہے۔ صاحب مضمون نے وادین کی کثرت سے جس طرز آمیز لب و لہجہ اور طعن و تشنیع کی بھرمار سے جس رکاکت کا ثبوت دیا ہے، وہ کسی طرح بھی اس تین موضوع کے شایان شان نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب فن تنقید نگاری کے مبادیات سے بھی نا آشنا ہیں، اور ان میں ہندو نفس موضوع اور ذاتی جذبات کو الگ الگ رکھنے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے تو یہ مضمون چنداں التفات کے قابل نہ تھا، لیکن چونکہ اسٹون نے مسند ایسا چھیڑا ہے جو آج اسلامی نقطہ نگاہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے مزدوری سمجھا گیا کہ جناب کشافؒ نہیں، تو کم از کم کلمہ کے حلقہ میں جن لوگوں کی بصیرت تعصب کی نذر نہیں ہو چکی ان کے سامنے حقیقت بے نقاب کر کے رکھ دی جائے۔ تاکہ سعید رو میں اس قسم کی ابد فریبیوں کے شکار ہونے سے بچ سکیں، چونکہ جناب کشافؒ کا مضمون علامہ اقبالؒ کی شاعری کے متعلق نہیں بلکہ اس پیغام کے متعلق ہے جو وہ ملت اسلامیہ کے نام سے رہے ہیں اس لئے اس مضمون کے جواب میں بھی علامہ موصوف کی شاعری نہیں بلکہ ان کے پیغام سے ہی بحث کی جائیگی۔

اس ضمن میں چونکہ بعض واقعات کا ذکر مزدوری ہو گا، اور واقعات میں نام لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان مقامات میں کسی شخص کی ذاتی مخالفت متصور نہیں، موافقت ہے تو اصولی، اور مخالفت ہے تو اصولی۔  
جناب کشافؒ کو شکایت ہے کہ ”اسلام کی دلبستگی سے ان کے دماغ اقبالؒ کے اسلوب میں مزید وسیع و دامانی پیدا ہوئی چاہئے تھی، اور برادران وطن کی طرف سے بجائے شکایت ہائے رنگین کے پرجوش تر خراج تحسین وصول ہونے کے اسباب پیدا ہونے چاہئے؛ لیکن گزارش یہ ہے کہ علامہ (یا ایک مسلمان) کی یہ وسیع و دامانی ہی تو برادران وطن کے لئے شکایت ہائے رنگین کا باعث بنتی ہے۔ آپ جب تک اپنی نگاہوں کو بھارت مانا کے مندر کی چار دیواری تک مقید رکھئے، جب تک آپ اس کنویں کے مینڈک بنے رہئے، برادران وطن آپ سے راضی، آپ کے خدا سے راضی۔ لیکن جو اپنی اپنے نگاہوں کو وسعت دی اور اس کنویں کے باہر خدا کی مخلوق کو بھی انسانیت کا درجہ دیا۔ یہ منہ لبور کے بیٹھ گئے، اور اس میں دراصل ان کا قصور بھی نہیں، جو قوم نوبع انسانی کو چاروں دروں میں تقسیم کر چکی ہو اور ان چار دروں کے باہر کے انسان ان کے نزدیک ٹیکش ہوں، جو قوم اپنے ملک کی چار دیواری کو ہی اقصائے عالم کے حدود تصور سمجھتی ہو، جس قوم کو اپنے ملک سے باہر ایک انسان بھی ایسا نہ لے جو زبان۔ مذہب۔ تہذیب، تمدن۔ معاشرت میں ان سے مائلت رکھتا ہو۔ اس قوم میں وسعت نظر پیدا کیے ہو سکتے ہوں۔“



اور چونکہ وہ خود ایسے تنگ نظر واقع ہوئے ہیں اس لئے وہ اپنی لوگوں کے خوش ہوتے ہیں، خود ان جیسے تنگ نظر ہوں۔ اقبال یا ہر وہ مسلمان جس کی نگاہ کے سامنے قرآن ہو۔ ان حضرات سے خراج تحسین کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ وہ قرآن جو اسے یہ پیغام دے کہ "مستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔" اور جو فطرت کی عالمگیر مدت کو یوں بے نقاب دیکھے کہ "ہو خورشید کا شپکے اگر ذرے کا دل چیر پ"۔ باقی رہا یہ کہ اقبال نے وہ طریق عمل کیوں نہ اختیار کیا جس سے برادران وطن کی تحسین حاصل ہوتی تو معاف بفرمایا۔ بے طرز عمل کی اقبال (یا کسی بے مسلمان سے تو توقع نہ کیجئے کہ وہ برادران وطن، یا دنیا میں کسی انسان کی مدح و تحسین کی خاطر ایمان فر دینی کر دے۔

برو این دام را پیش دیگر نہ  
کہ عتقار بلند است آشیانہ

جناب کثافت پھر فرماتے ہیں کہ اقبال نے اپنی اس وسیع المشرب کو اپنے داعیات کا رنگ دے کر اسلام کے نام سے پیش کر دیا۔ مجھے علم نہیں کہ کثافت صاحب مسلمان ہیں یا غیر مسلم جس انداز سے انھوں نے اولیاء اعظام اور انبیاء کرام (علیہم السلام) کے نام لکھے ہیں اس سے تو وہ مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان ہیں تو اسلام سے اس قدر ناواقفیت موجب تاسف ہے۔ انھیں اتنا بھی علم نہیں کہ جو پیغام علامہ اقبال دے رہے ہیں وہ یکسر قرآن کی تفسیر ہے۔ ان کے اپنے داعیات قلب اور ذہنی رجحانات نہیں ہیں۔ اس کے متعلق ذرا وضاحت سے آخر میں عرض کیا جائے گا۔

پھر فرماتے ہیں کہ اقبال نے جو کہا ہے کہ "ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے" جو پیر بن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔ وہ بودیچ کی جارحانہ قوم پرستی کو تو ایسا کہہ سکتے ہیں جس کا صحیح نام قیصریت اور جہانگیر ہے۔ ہندوستان کی قوم پرستی کے خلاف انھیں ہرگز ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس قوم کے منصوبے یہ ہوں کہ ہندوستان کی نو کردار آبادی کو یا تو ان کے اندر جذب ہو کر رہنا ہوگا یا کہیں ہجرت کر جانا ہوگا۔ جو اس قدر کثیر آبادی کے مخصوص تمدن، کچھ (ثقافت) تہذیب کو یکسر مٹا دینے کا تہیہ کر چکی ہو۔ جو قوم ایک اچھی خامی رائج الوقت زبان

کو محض اس لئے بدل دینے پر مصر ہو کہ وہ زبان قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اور جس کے لئے ترکیب آزادی کا قلم اعلیٰ علم۔ پورا یہ سورج وغیرہ کے منصوبے چھوڑ کر محض اس بات کو اپنا نصب العین حیات بنالے کہ اردو کی جگہ ہندی۔ ہندوستانی، ملک کی زبان ہو جائے، پھر جس قوم کے قلوب کا ترجمان مسلمانوں کے تمدن۔۔۔ ثقافت کے متعلق اس قسم کے حقارت آمیز الفاظ استعمال کرے کہ یہ پھندے دار لٹری اور لکھڑے پا جائے کے سوا اور ہے ہی کیا، تو فرمائیے کہ اس قوم کا استیلا جارحانہ قوم پرستی یا قیصریت نہیں تو اور کیا ہے۔ ذرا ان اہنسا کے پوجاریوں کے بازوؤں میں قوت آجائے دیکھو، پھر دیکھئے کہ یہ قوم پرستی کیسا پیر وپ بدلتی ہے۔

پھر اقبال کے خلاف یہ سنگین جرم عائد ہوتا ہے کہ وہ یہ آرزو کیوں رکھتا ہے کہ میں حجاز میں مردوں۔

بس یہ ہے اصل سبب اقبال کے خلاف بغض و عناد کا۔ ان کو یہ گلہ نہیں کہ اقبال کو ہندوستان سے محبت کیوں نہیں، بلکہ یہ احساس نہیں لینے ویتا کہ اُسے حجاز سے محبت کیوں ہے۔ اقبال کے خلاف "حُب علی" نہیں بلکہ بغض معاویہ "کام کر رہا ہے۔ اقبال حجاز میں مرنا چاہتا ہے کہ اس کے نزدیک حجاز ہی وہ خطہ زمین ہے جہاں کسی کو نزع انسانی کی چیز دستیوں سے پناہ مل سکتی ہے اور جہاں کی خاک کے ذروں میں آسودہ ہونے سے اضطراب و تشویش میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ باقی رہا یہ کہ اس خاک پاک (ہندوستان) میں اتنے اتنے بڑے اکابر اسلام استراحت فرما رہے ہیں "توفرصت کے وقت کبھی اُن بزرگان اسلام کے حالات پڑھئے اور دیکھئے کہ انھیں خاک حجاز سے کس درجہ عشق تھا، باقی رہا دل کا معاملہ، سو یہاں پنچک مجھے پھر شبہ ہونے لگا کہ جناب کثافت شاید غیر مسلم ہیں، کیونکہ یہ باور کرنے کے لئے دل مانتا ہی نہیں کہ اقبال کے خلاف لاکھ اعتراض کئے جاتے۔ لیکن ایک مسلمان اُن کے اس جذبہ کی تحقیر کس طرح کر سکتا ہے کہ "آرزو دارم کہ میرم در حجاز" جس شخص کو دشت حجاز سے اس قدر نفرت ہو۔ خدا نکرے کہ وہ پردہ اٹھ جانے کے بعد مسلمان نظر آئے۔ اقبال اُو ان کے ساتھ ہر ایک مسلمان کا قلب ریگستان عرب کے ذروں سے وابستہ ہے، اور یہ محض جذباتی چیز نہیں بلکہ عقلا بھی یہی ہونا چاہیے، کہ جو قوم اپنے مرکز سے جھوٹ جاتی ہے، فنا ہو جاتی ہے۔

اور پھر کیا میں جناب کثافت سے پوچھ سکتا ہوں کہ بھارت ماتا کا مندر بنانے کے لئے بناؤں ہی کیوں تجویز کیا گیا ہے! مہی یا پشاد میں یہ مندر کیوں نہ تعمیر ہوا۔ یہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا دیویتی دواہ ویدوں کے استھان میں جا کر کیوں بنا۔ یہ سب کچھ جناب کثافت کے نزدیک مین ایمان اور دشت حجاز سے محبت کفر۔

میری نگاہ شوق پر اس درجہ تختیاں

انہی نگاہ شوق کی کچھ بھی سزا نہیں ہے

پھر فرماتے ہیں کہ "ہاں یہ دہی حسب وطن تھا جو محمد عربی کی زبان پر مین ایمان تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ حب الوطن میں ایمان۔ حدیث کی کوئی کتاب میں آیا ہے۔ جانیے اور اپنے ساتھ تمام وطن پرست علماء کو بھی بلائیے اور پھر ثابت کیجئے کہ یہ کوئی حدیث ہے قاتلوں بڑھانک ان کس قدر صداد قلین، جس شخص کی مذہبی واقفیت کا یہ حال ہو کہ وہ ایک عربی کے چلنے کو حدیث سمجھ بیٹے، اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ تامل و سخن گفتہ باشند۔۔۔۔۔ ہاں، ایک بات جناب کثافت نے البتہ پتہ کی کھی۔ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم نے شب ہجرت میں فرمایا تھا کہ لے لے مجھے تو بڑا عزیز تھا۔ لیکن کیا کروں تیرے فرزند مجھے تیرے دامن میں رہنے نہیں دیتے۔" اقبال کو کب ہندوستان عزیز نہیں۔ وہی ہندوستان جس کے متعلق وہ شاعر میں نہیں۔ بلکہ شاعر میں کہتا ہے کہ۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراز چشم ہمہ و پروں ہے اسی خاک سے روشن یہ خاک کہ ہے جس کا خرف ریزہ ورنہ لیکن باریں ہمہ اگر وہ آج ہندوستان کی خاک کے بجائے دشت

حجاز میں پناہ ڈھونڈتے ہیں تو یہی کہتے ہوئے کہ اسے بھارت ماتا مجھے تو بہت عزیز ہے، لیکن تیرے سورا پوت یہاں کسی ملکیش کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے؟ اگر جناب کثافت واقعات کو اپنی رنگین عینک سے نہ دیکھتے تو اس واقعہ ہجرت میں، جسے وہ وطن پرستی کی تائید میں پیش کر رہے ہیں۔ وطن اور دین کی صحیح صحیح پوزیشن نظر آ جاتی۔ واقعہ ہجرت ہی نے تو بتایا ہے کہ اگر کبھی ہمارے دین اور وطن میں آویزش ہو جائے۔ اگر وطن کی سنہری زنجیریں ہمارے دین کی آزادی چھیننے پر آمادہ ہوں، تو اس وقت اگر تم اپنے دین، یعنی اپنے مخصوص تمدن، مخصوص تہذیب کے تحفظ کا

یاد نہ رکھتے ہو تو بجائے اس کے کہ وہاں یہ کہہ کر کہ ہمارا کوئی مخصوص تمدن، کوئی مخصوص تہذیب نہیں۔ یہ کہہ کر کہ ہاں حضور! جیسا آپ فرماتے ہیں ہم پیے بندھی اور اور بعد میں مسلمان ہیں۔ ذلت کی زندگی بسر کرتے۔ اس وقت قرآن تم پر فرض کر دیتا ہے کہ ایسے وطن کی خاک کو پائے استخار سے ٹھکرا کر اللہ کی وسیع زمین میں نکل جاؤ کہ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔ اگر کثافت صاحب کے سامنے کہیں "تلاش حق" کی بجائے قرآن کریم ہوتا تو ان کو نظر آ جاتا کہ اس وقت جب کہ قرآن کریم نے ہجرت کا حکم دے رکھا تھا جس مسلمان نے اس وطن واپس نہ چھوڑا اس کے متعلق کسی کیسے سخت وعیدیں آئیں مسلمانوں کو کس طرح حکم دیا گیا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہمارا کوئی واسطہ نہیں جن پر شاید وطن کی محبت دین کی عزت کے مقابلہ میں غالب آگئی ہے۔ یہ ہے جناب کثافت! قرآن کریم کی تعلیم۔ اب خود فرمائیے کہ اس تعلیم کے حامل جناب نبی اکرم۔ کیا یہ ایشاد فرما سکتے تھے کہ "حب الوطن من ایمان"۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ اقبال کو یہ نہ سمجھو کہ وہ ایک بے خطر شاعر ہے، نہیں وہ ایک عظیم الشان خطرہ ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال (یعنی وہ پیغام جو اقبال مسلمانوں کو دے رہا ہے، اور جسے دوسرے عقلموں میں قرآن کہا جاتا ہے) ایک عظیم الشان خطرہ ہے۔ آج ہی خطرہ نہیں، ازل سے خطرہ چلا آ رہا ہے، اور اب دیکھ خطرہ رہے گا۔ لیکن یہ خطرہ ہمیشہ کسی بولہ بولہ و بوجہل کے لئے ہے کسی صدیقی و فاروقی کے لئے تو کوئی خطرہ نہیں۔ پتہ نہیں جناب کثافت یہ خطرے کی گھنٹی کن کی طرف سے بجا رہے ہیں۔ ذرا کھل کر بات کیوں نہیں کرتے۔ اقبال بھی ایک بڑا خطرہ ہے، ایسا خطرہ جیسا دربار فرعون کے ساحروں کے لئے عرصاً عظیم خطرہ تھا، یا جیسے جگدہ غزوہ کے لئے تیشہ خیل خطرہ تھا۔

پھر اپنے دعوے کے ثبوت میں کثافت صاحب فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ اتنا خطرناک ساحر ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم جیسے قوم پرست کا ایمان زندگی کے آخری لمحوں میں چھین کر لے گیا۔ اور آج مسٹر محمد علی جناح کی آنکھوں پر بٹی باندھ کر اسے بھی اپنے پیچھے لگا لیا۔ غنیمت ہے کہ آپ نے اتنا تو مان لیا کہ اقبال جو یہ کہتا ہے کہ۔

در دشت جزین من جبریل زبوں مید

یزداں کبد آور، اسے بہت مردانہ

وہ کاجوں کے بیکار لونڈوں کو اشتراکیت کی مزحوم جنت کے چھلاوے دکھا کر پیچھے نہیں لگاتا۔ شیر کبھی چوہوں کا شکار نہیں کرتا۔

پھر ارشاد ہے کہ: اقبال میں ایک غالی قسم کا ثقافتی تعصب پایا جاتا ہے: یعنی وہ اگر اسلام، مسلم، ملت اسلامیہ، اسلامی تمدن وغیرہ پر لکھتا ہے تو جذبہ تعصب کے ماتحت لکھتا ہے۔ کون سمجھائے کہ حضور! تعصب اور مصیبت میں بڑا فرق ہے۔ اقبال جو کچھ لکھتا ہے اسلامی مصیبت کے ماتحت لکھتا ہے جو عین اسلام ہے، روح اسلام ہے، ایک قابل فخر جذبہ ہے۔ تعصب اسے کہتے ہیں کہ جس میں عدل کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے اور دوسرے پر ظلم روا رکھا جائے۔ اور جو اقبال قرآن میں یہ کچھ پڑھتا ہے کہ:-

لا یجبر منکم مشران قوم | کسی قوم کی دشمنی بھی نہیں اس بات پر آمادہ نہ کروں  
الا لقد لو | اعدا لو | کہ تم عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔ ہمیشہ عدل کرو  
وہ تعصب کے کبھی قریب بھی آ سکتا ہے۔

اس کے بعد کثافت صاحب ذرا مکمل کیجیے ہیں، اور اپنے اصلی رنگ میں آنا شروع کیا ہے۔ فرماتے ہیں: شاعر ملکیت ہے کہ دو چیزوں میں سے ایک کو مزور و خیر باد کہہ دے، یا اپنے مذہب کو یا اپنے مسلک شاعری کو، دونوں سے وابستہ رہنا غرض و منافقت کا ایک نہایت غیر شاعرانہ نیز ایک نہایت غیر دیندارانہ سمجھن مرکب ہو گا۔

اب بات ہوئی ناٹھیک۔ اب پتہ چلا نا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اس قسم کی شاعری جو مذہب کی نیت پر حزی می جائے جناب کشان اور ان کے ہم نواؤں کو مبارک، جنہیں پتہ ہی نہیں کہ مذہب کہتے کس کو ہیں۔ اقبال نے تو دنیا کو دکھا دیا کہ ایک مسلمان جب روح اسلام کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے تو کس طرح ادب، شعور، فلسفہ، حکمت، سیاست، اس کے پاؤں چومتی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک دلچسپ بحث آتی ہے جس میں نہایت بندہ انگلی

کے ساتھ اعلان ہوتا ہے کہ اقبال جب ملت اسلامیہ کو تحفظ کا پیغام دیتا ہے تو وہ دوسروں کی قوتوں سے ڈرتا ہے۔ وہ جب اپنے کچھ کو الگ رکھنے کی تجویزیں کرتا ہے تو اس نے کہ اسے خوف ہے کہ دوسروں سے مل کر یہ کچھ کچھ فنا ہو جائے گا اگر وہ اپنے اسلامی کچھ کو مضبوط سمجھتا تو پھر ایسے اختلاط سے ڈرتا کیوں!

جناب کا نامحاذ مشورہ سر انگلیوں پر۔ غالب ایسے ہی موقعہ کے لئے کہہ گیا ہے کہ:-

ہوئے تم دوست جس کے اسکا دشمن آسمان کیوں ہو  
بندہ نواز: اقبال اپنے تمدن، کچھ۔ مذہب کو اس لئے الگ نہیں رکھنا چاہتا کہ اسے ڈر ہے کہ یہ مقابلہ میں آکر بھٹک جائے گا۔ بقا و تعلق کے قانون کے ماتحت طاقتور سے دب کر فنا ہو جائے گا۔ وہ تو اس تمدن کو خدا کا آخری پیغام قرار دیتا ہے کہ جب تک اس کا خدا زندہ ہے یہ تمدن بھی زندہ رہے گا۔ وہ تو اس تمدن کو سخت سے سخت چٹان کے ساتھ ٹکرا دینے کے لئے تیار ہے۔ نہیں! وہ تو زندگی ہی اس ٹکرا دینے میں سمجھتا ہے، اس کی تعلیم تو یہ ہے کہ

میارا بزم بر ساحل کو آں حساب | نوائے زندگی کا فی زم خیز اُست  
بدر یا غلط و با محوش در آدین | حیات جاوداں اندر ستیز اُست  
لیکن اسے ڈر اس بات کا ہے کہ جو سینے آج اس تمدن و تہذیب

کے حامل ہیں ان کے قلوب میں وہ جذبہ ایمان نہیں ہے جو اس تمدن کی حفاظت کے لئے سرکٹانے کے لئے اُنہیں تیار کر دے۔ تہذیب و تمدن کی حفاظت ان کے حاکمین کی قوت ایمانی کے مطابق ہو کر کرتی ہے۔ وہ ڈرتا اس لئے ہے کہ اس تہذیب و تمدن کا مدعی روٹی کے ٹکڑے کے عوض ہتھ کے چند نعرہوں کے عوض، برادران وطن کی تحسین و مدح کی خاطر، اپنی اس متاع گراں بہا کو بلا درغی بیچتا جا رہا ہے۔ وہ اس لئے ڈرتا ہے۔ نہ کہ اپنی متاع کے کمزور و کا سہ ہونے کی وجہ سے ڈرتا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ:- پھر اگر ہم میں کچھ جان ہے تو دوسروں کے ساتھ ٹکٹا ملنا نقصان وہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل بجا ارشاد ہے۔ لیکن رونا تو اسی کا ہے کہ ہم میں وہ جان نہیں رہی جس سے اس تمدن کی حفاظت کر سکیں۔ جان ہوتی تو پیٹے ہندی بعد میں سلمان کا ہندو نواز نعرہ بلند کیوں ہوتا۔ جان ہوتی تو اچھا بدلا سلام عظیم چھوڑ کر یہ ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت کیوں کیا جاتا۔ اقبال بھی جان پیدا کرنا چاہتا ہے، اور جب تک جان پیدا نہیں ہوتی خطرہ کی آگ میں کودنے سے روکتا ہے۔ دل میں ضلیل کا سا ایمان پیدا کیجئے پھر دیکھئے یہی اقبال آپ فرد کی آن میں اپنے ہاتھوں و مکمل دیتا ہے یا نہیں!

بالکل بجا کہ آج کثیر تعداد ہندو ترجمان القرآن کو اپنے محبوب و محرم

ملائے کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کشتی کا الہامی بھی تو اسی ابراہیم کا  
لکھا ہوا ہے، کسی ہندو کے گھر سے اس کا بھی تو کوئی پرچہ نکال کر بتائیے ترجمان  
القرآن کو ہندو محض پڑھتے ہی نہیں بلکہ اس کے اقتباسات کے ترجمے بھی اپنی  
:ہاں میں شائع کرتے ہیں۔ اگر آپ نے بات بھیڑی ہے تو آئیے یہ داستان  
بہی سنئے جانیے کہ یہ کس جذبے کے ماتحت ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے  
ترجمان القرآن میں سارا اور اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے  
کہ نجات و سعادت محض اسلام کے ساتھ ہی وابستہ نہیں بلکہ ہر ایک مذہب  
کا پرستار خدا پرستی اور نیک عمل کی زندگی سے ایسے ہی نجات حاصل کر سکتا  
ہے جیسے کوئی دوسرے مذہب والا۔ ترجمان القرآن جلد اول کی اشاعت  
کے متواتر عرصے بعد ہمارا گاندھی جی نے دہلی کے جامعہ اسلامیہ کے  
ہال میں لکچر دیا اور اس میں فرمایا کہ میں ایک عرصے سے خیال کرتا تھا کہ اسلام  
نجات کو محض اپنے نیک ہی محدود نہیں رکھتا ہوگا، بلکہ دوسرے مذاہب  
کے اتباع میں بھی نجات کا قائل ہوگا۔ لیکن مجھے اس خیال کی تائید نہ ملتی تھی  
اب جو مولانا آزاد نے ترجمان القرآن لکھا تو اس سے میرے خیال کی ذرہ  
تائید ہو گئی۔ چنانچہ ہم نے ان کی اس کتاب کے ضروری حصوں کا ترجمہ  
گجراتی میں بھی شائع کیا ہے، اور اس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان جب  
غیر مذاہب میں تبلیغ اسلام کرتا ہے تو اس بنا پر کہتا ہے کہ وہ نہیں نجات  
کا راستہ بتائیں۔ حالانکہ نجات تمام مذاہب میں یکساں ملتی ہے۔ لہذا مسلمان  
کی تبلیغ محض ایک آڑ ہے۔ ورنہ وہ دراصل اس پہلے اپنی لغو اور بڑھانا  
چاہتا ہے، اور یہ یکسر سیاسی غرض ہے۔

اب سمجھے آپ کہ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کو کیوں ہندو اپنے  
محبوب و محترم مطالعے کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے وہ ثابت یہ کرتے  
ہیں کہ مسلمان تبلیغ میں مذہب کی آڑ لیتا ہے۔ ورنہ اس کا مقصد محض سیاسی  
ہے۔ ہندو اگر اپنا تمام زور اس بات میں صرف کر دیں کہ کسی طرح اجموت  
اقوام مردم شماری کے رجسٹر میں اپنا نام ہندوؤں کے خانے میں لکھوائیں تو  
یہ تمام سماجی مذہب اور انسانیت کی ہمدردی کہلائیں۔ اور اگر مسلمان دوسروں  
کو صراطِ مستقیم کی طرف لانا چاہے تو یکسر سیاسی غرض قرار دی جائے۔ یہ ہیں  
آپ کی وطنیت و قومیت کے مظاہرے۔

آپ کو خالد بن ولید کا یہ قول تو یاد رہا کہ اگر میرے گھوڑے کے  
سم ذرا درست ہوتے تو پھر اور تاشا دکھاتا۔ لیکن یہ واقعہ آپ کو کیوں  
یاد رہنے لگا تھا کہ جب یہی خالدؓ حضرت عمرؓ کے سامنے شامیوں کے  
لباس میں آئے تو اسے عظیم انسان فاتح اعظم، بطل حرب کے علوم تربیت کی کوئی  
پردہ نہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہہ دیا کہ خالد ابھی سے اپنے شاعریت  
کو ترک کر کے غیروں کی وضع قطع اختیار کر لی۔ اور اس وقت تک ان سے  
بات ہنسی کی خبک وہ عربی لباس میں سلتے نہیں آئے۔ کیا خیال ہے آپ  
کا کہ اس پہنڈے دار لڑکی، اور کھڑے پا جائے کے سحر کا، کہ جسے آپ کے  
قوم پرست ایسے فخر سے اچھالنے پھرتے ہیں، حضرت عمرؓ کی بارگاہ سے کیا  
جواب ملتا: یا اگر خالدؓ گاندھی لڑ پی پیئے ہاتھ باندھ کر نکلا کرتے ہوئے  
سامنے آتے تو ان سے کیا سلوک ہوتا؟

اس کے بعد اقبال پر اعتراض ہے کہ وہ کیوں مذہب کا مخالف کہیں ہے  
حالانکہ یہ وہ نظریہ ہے جس کے زیرِ طاعت فرشتے زمین پر پہلی جنت ارضی قائم  
ہوئی۔

اشتراکیت دنیا میں ایک عرصے سے موجود تھی، کسی قوم پرست مسلمان  
کو خیال نہ آیا کہ اس جنت ارضی، اس فردوسِ گمشدہ سے جہنمِ ذرا بہند  
کو متعارف ہی کر دیں، لیکن اب جو وعدہ رکھا مگر نہیں بیکار، جو انوں کے پہلے  
کا ایک کھوپڑے دوس سے لے آئے تو یہ حضرات بھی لگے اشتراکیت کا گیت  
گائے۔ اقبال کو اشتراکیت پر اعتراض یہ ہے کہ برساتِ شکم وارد اسکا  
اس کے جو اب میں جناب کثافت کی تحقیق انہی سنئے اور جی بھر کر وار دیجئے،  
فرماتے ہیں کہ اگر ہی طعن ہے تو یہ تو براہِ عمل سنگین تر جہورت میں جناب  
صدیق اکبرؐ کے مسلک پر پڑتا ہے: کیوں کہ انسانوں نے زکوٰۃ نہ دینے والوں  
کے خلاف جہاد کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ عقل کی کوئی نہ کوئی آخری حد ضرور ہوتی ہے۔ لیکن  
میرا خیال ہے کہ حالت کی کوئی آخری حد نہیں ہو سکتی۔ اور جناب صدیق اکبرؐ  
کے اس عمل سے اشتراکیت کی سند لانا اس کی زندہ دلیل ہے۔ فرماتے  
ہیں کہ: ”ہاں سا نا نظام اسلام ہی زکوٰۃ — شکم — پر ملتا تھا زکوٰۃ  
اور شکم کو مراد سمجھنا یا تو اس بات کا آئینہ دار ہے کہ جناب کثافت اقبال  
کے مساواتِ شکم کے ٹکڑے کی سمجھ ہی نہیں، یا انہیں پتہ ہی نہیں کہ زکوٰۃ

کیا ہوتی ہے۔ درنہ زکوٰۃ کو مساوات شکم کہنا اگر قرآن کا معنی اڑانا نہیں تو اور کیا ہے۔ حضور زکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کی جائیداد اور اموال کو اس کی ذاتی ملکیت سمجھائے۔ اور اس ملکیت میں اختلاف مدارج کو جائز رکھا جائے اور اس کے بعد ان مالکان جائیداد و اموال سے ذریعہ زکوٰۃ بطور ٹیکس وصول کیا جائے۔ یہ ہے اسلامی نظریہ زکوٰۃ۔ سبھا فرمائیے کہ اس کو روس کی اشتراکیت یعنی مساوات شکم سے کیا تعلق ہے

اب آئیے آپ کو ایک جھٹکا اس اقبال کی دکھاؤں جس کے خلاف جناب کشاف نے اس قدر زہر اگلا ہے۔ کشاف صاحب ہندوستان کی تحریک آزادی کے مداحوں میں سے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ تحریک وہ ہے جس کے متعلق ابھی تک یہی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس کا بالآخر نصب العین کیا ہے۔ آج تک کوئی شخص براہِ راج کے معنی بھی متعین نہیں کر سکا۔ اس کے برعکس اقبال کو دیکھئے کہ کس قدر واضح الفاظ میں غلامی کی لعنت کے خلاف جہاد کو تپا ہے۔

اقبال سب سے بڑا شکوہ جو خدا سے کرتا ہے وہ یہ ہے، ج

لیکن مجھے پیدا کیا اس دلیں میں تو نے

جس دلیں کے بندے ہیں غلامی پر رضا مند

پھر وہ محکوم و آزاد کا فرق کس قدر دشمن لیکن پُر زور الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزاد کا ہر لمحہ پیامِ ابدیت محکوم کا ہر لمحہ نئی مرگِ مہاجرات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

وہ ایسے مذہب اور ایسے مدعیانِ مذہب کو جو مسلمانوں کو غلامی پر رضا مند

بناتے ہیں، دور سے سلام کرتے ہیں، وہ لوگ جو

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پر رضا مند

تاویل مسائل کو بناتے ہیں بیساز

دوسری جگہ لکھتے ہیں

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناص ہے کتاب

کہ سکھاتی نہیں قوموں کو غلامی کے طریق

دیکھئے وہ کس حسرت و تاسف سے یہ جملہ کرتے ہیں کہ

یورپ کی غلامی پر رضا مند ہو آؤ  
محبکہ تو مجھ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہر  
وہ محکوم کے الہام کو بھی درست نہیں سمجھتے۔  
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے  
غارت گرد اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز  
حتیٰ کہ

ہو اگر قوتِ فرعون کی در پر وہ مرید

قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلمہ الہی

اب ظاہر ہے کہ جب علامہ اقبال آزادی کا ایسا کھل کھلا درس دے رہے ہیں تو وہ ہندوستان کو کیسے غلام دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تو نہیں سکتا کہ مسلمان آزاد ہو جائیں اور ہندوستان غلام رہے۔ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے اور مسلمان غلام کا غلام رہے، اور جو تیرہ برادرانِ وطن کے ہمارے سامنے ہیں ان سے یہ شبہ یقین کی حد تک پوچھا رہا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان کے آقا کا نام بدل جائے، اور اس جدید غلامی میں اس کی یہ حالت ہو جائے کہ اپنے مخصوص تمدن و مذہب کی الگ حیثیت بھی قائم نہ کر سکے۔ علامہ اقبال یہ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایسی آزادی کے تخیل کو دامِ فریب سے نیاؤ وقت نہیں دیتے۔ وہ آج بھی برلا کہتے ہیں کہ

ملا کہ جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

وہ ہندوستان میں صرف سجدے کی آزادی نہیں چاہتے،

بلکہ اسلام کی آزادی چاہتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام کی آزادی

اس روش سے تو حاصل نہیں ہو سکتی جس پر آپ کی قومیت پرستی، تحریک

آزادی کے علمبرداروں کے جلو میں بیسے چلی جا رہی ہے

یہ تو تھا جناب کشاف کی غلط فہمیوں کا ازالہ؛ لیکن میں تو اس

قصے کو بہت مختصر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے چال چال اقبال دکھائی

اُس سے مفہومِ پیامِ اقبال ہے، اور میرے نزدیک یہی پیامِ اسلام ہے!

تو اب مسئلہ ماہِ الترائی یہ رہا کہ آیا اسلام، یعنی قرآن، موجودہ قومیت

پرستی اور اشتراکیت کا نمونہ ہے یا مخالف؟ اس مسئلے میں جناب کشاف



(۳) جناب رازی کو باوجود صاحب الامرار ہونے کے معلوم نہیں کہ کثافت مسلمان ہیں یا غیر مسلم؟ — لیکن ہو تو کیونکر ہو؟ اس کے لئے ضرورت تھی کثافت کے نام کے اعلان کی، اور اس کی ترکیب بھامیں "عربی" یا کم از کم "فارسی" الفاظ کی؛ مہربوں صدی کا مسلمان تو "نام" سے پہچانا جاتا ہے، بلکہ "نام" سے؛ حضرت "رازی" کو یہ رمز کو "غیر مسلم" بتا سکتا ہے کہ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ اَلَا سَمَاءٌ تُنَبِّئُكُمْ بِهَا تَنْخَعُونَ لَهَا تَجَاءِدُونَ مَا اَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ

(۴) جناب رازی کی اگر ان ساری روایتوں اور تعبیروں کو قابل اعتماد فرض بھی کر لیا جائے تب بھی غالب اور فیصلہ کن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہندوؤں کی "تخلیف" ہے یا مسلمانوں کی "خوفزدگی"؟ جذب کرنے یا ہجرت کر جانے کا مطالبہ کرنے کا معاملہ اس قدر مکروہ و مستحکم نہیں جس قدر کہ جذب ہو جانے یا ہجرت پر مجبور ہونے کا اندیشہ شرمناک ہے! — راز "مستثنایان" حقیقت کا اسلام، اور ایسا لڑہ بر اندام! — آپ جو اہل ہندوؤں کو اس سے خوفناک تر پہنچا کر سکتے ہیں، لیکن مردی و مہرگی آپ کو اپنی ہی قسب و سب سے ہم پہنچانی پڑے گی! —

گر خدا داری، زغم آزاد شو از خیال بیش و کم آزاد شو؛ ہرگز "مصلحت" نہیں دہشت شرک را در خوف مغروریدہ! (۵) "رازی" صاحب انوس ہے کہ بالکل مفلحان جذبات اور دین الہیہ کی دلوں میں پہ گئے؛ خانہ ساز "رمز و راز" کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا؛ اچھا فرمائیے جناب، کیا یہ "خاک" حجاز ہی نہ تھی جس کی افتادہ یہ تھی کہ؛

"ابھی" در دشت خویش از راه رفت از دم او سوز الا الشرف رفت؛ پھر کیا یہ "گفر زار" خاک "تار" ہی نہ تھی جس کی ایمان پروری کا یہ ماجر امتحان ہے

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے؛ جو انان تاری کس قدر صاحب نظر نکلتے؛ غیر ہندوستان کس عشق جاز سے کس کو پر خاش ہو سکتی ہے؛ خود محبوب "عرب" کی الفت ہند کی ہم کو فراموش ہی ہو گئی ہے؛ تیر عرب کو آئی غنڈی ہوا اچھا ہے؛ میرا دین وہی ہے، میرا وطن وہی ہے؛

حجاز و حرمین کی عقیدت میں "حاجیانہ" رطب الساقی، ہمیں خوف ہے کہ بڑا ارزاں اسلام ہے

حاجی بڑے کعبہ رواں، کیں رو دین ارست

خوش میرو، اما رہ مقصود نہ این ارست!

"دیہ وں کے استخوان" پر کیا طعن ہے، جبکہ آپ کے ہاں بھی ارض القبر

والا ایسا ہی اک کلمہ سحر موجود ہے؛ کثافت "اقبال" کی آرزوئے شہادت فی الحجاز کے ساتھ اتنی غیر ہمدردی کرنا نہیں چاہتا تھی کہ خود اقبال مد فونیت ہند کو "تاقیارت زنجیری" بت خانہ" سے تعبیر کر کے بے شمار اولیاء و انبیائے آسودہ خاک ہند کی ارواح صبل کی ناقابل برداشت بے ادبی کا ٹمٹک ہوتا ہے؛ شاید ہم "رازی" صاحب کو یہ بات نہیں سمجھا سکتے کہ کوئی خاک ہند کسی سیت کی "شفاعت" نہیں ہو سکتی، بلکہ خود مدفن، مد فونوں کے تقدس سے نقصان ہوا کرتے ہیں! —

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشت خم رکھ دیں

جہاں ساغر شلک دیں چشمہ زمزم نکلتا ہے!

"رازی" پر کثافت کے ایمان و اسلام کے بارے میں بار بار نکلن لہجہ

خیر ام کی کیفیت کا نزول ہوتا ہے؛ کس کو خبر ہے کہ جس دن رازی صاحب کثافت کے اسلام پر ایمان لائیں گے خود کثافت اپنے ایمان سے مشکوک ہو جائے گا!

کرتے ہیں "نقیبہ" اگر مذمت تیری کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری پردہ کر دیں وہ گر نصیب اعدا! رکھ یاد کہ حالت نہیں اچھی تیری! (۶) یہاں حضرت "رازی" نے ایک محدث کی قبا اور دھلی ہے؛ ہیں

اس نزاع لفظی میں کوئی امرار نہیں کہ "حب الوطن من الایمان" کوئی حدیث نبوی ہے یا نہیں، تاہم اتنا ضرور ہے کہ جناب "رازی" اگر اس معاشے میں کوئی نقد راوی ہیں تو ہمارے اس تسامح میں بعض اکابر علم و ادب، ملک شریک ہیں؛ مسدب عالی ذیہ شعر قابل حوالہ ہے کہ

یہ تفاقد کو یا کہ حصہ اسفین کا

کو لب الوطن ہے نشان سوسن کا

تاہم جب آنحضرت کی زبان صدق کے کو وطن عزیز فرماتی ہے تو خود بھی کیا کم معنی خیر ہے؛ "خود" رازی" صاحب اس کو اک پہنے کی بات کہتے ہیں



ساری ارض مقدس اور جزیرۃ العرب ان "ہنگوڑوں" کو پناہ دینے سے اپنا دامن تنگ پائیں گے؛ عرب و شام و فلسطین آج سر سے کفن باندھے ہوئے مجاہدین اسلام کی لالہ زار چادریں ہیں۔ وہ جناب رازی کی سرکردگی میں ہندوستان سے فرار کرنے والی ہندی مسلمانوں کی "فوج طفر مویج" کا خیر مقدم کرنے سے اپنے کو معذور پائیں گے! اللہ اللہ مسلمان بھائیوں کے "عفا کرنا ہر" کا جلوس شجاعت مانوس! یہ

جو میدان سے بھاگوں بعد اضمحنام!

تو رستم ہو آکر مقابل نہ سام!

پھر اس ذہنی خیرگی اور قلبی دہشت زدگی میں یہ حقیقت فراموش ہونے لگتی ہے کہ اسلام میں غایت درجہ فوق العادت "امیر مبنی اسٹیٹ" کا اک چارہ کار ہے، اپنے ہول دل کے مظاہرے کی کوئی دینی تفریح نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، باصدا ہزاروں ناخو استہ، وطن عزیز کو تحریک ہجرت کے سلسلے میں خیر باد کہہ دینے کا فقیہی استنباط اگر یہی ہے کہ یہ وطن "سٹرک ہونے کے ساتھ ساتھ" مردود بھی ہو گیا۔ تو داعی انجام کو تو کہہ منگد کے ساتھ خانہ کعبہ بھی چھوڑنا پڑا تھا، اب اسی بے پناہ نفقہ فی الدین کے تحت اگر یہ سلسلہ بھی استخراج لیا جائے تو کون سا مطلق مانع ہے کہ وطن کے قیام کے تکلیف دہ ہونے کی صورت میں "بریت اللہ" کو بھی دور سے سلام اک سنت پیغمبر اسلام ہے! — کیا جناب رازی! اک مسلمان سے یہ بھی سعادت انجام دلا کر، علامہ اقبال کی زبان میں اسے یہ دعوت جنت دیں گے کہ

دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی!!

رازی بن جانے اور راز آشنائے حقائق اسلامی ہونے

میں بڑا فرق ہے! یہ

رازی درون پردہ زکشا و کثرت پرکس

کیں عالی نیرت "رازی" عالی مقام را!

(۴) "رازی" صاحب یہاں اقبال کے پیام کا "طلبل بلند بانگ" بڑے دور سے پیٹتے ہیں! معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت خاتم النبیین نے الہامی "ہم احمد" (مذکورہ صحت سابقہ) پر چڑھ کر صاحب قادیانی نے ڈاکا ڈالا۔ اسی طرح مولانا جلال الدین رازی کی مشنوی معنوی کے لقب

کیا قبول اقبال! وطن کا سب کبیر حبیب خدا کو "ہیت ہی محبوب" ہو سکتا تھا! ہمارا خیال ہے کہ حب الوطن من الایمان "اسی حقیقت کا اک دوسرا پیرایہ اٹھا ہے! جب اسلام میں "ہمسائے" کے حقوق کی وسیع دامانی و دوڑی رسی کا یہ حال ہے کہ بروایت صحابہ کرام "ہمسائے" کے مثل رکن خاندان نہ وراثت میں شریک کر دئے جانے کی توقع تنزیل شریعت کے دوران میں کی جا رہی تھی، تو وسیع وطن کی ہمسائیگی "کبریٰ کے" خالص اسلامی مقصدیات کی کچھ کم نہ ہونے چاہئیں! آخر یہ اسلامی ثقافت کی فضا ہی تو تھی جس میں حب الوطن من الایمان کا مقولہ خود رو پیدا ہو گیا! ایسے اہم و عظیم معاملے کو "ٹاپا" "روایت و روایت" کے پچاک میں چنسا دینا حضرت "رازی" ہی کی طرح کے کسی غیر محرم معتمد "کا" "شغل بدل" ہو سکتا ہے! از خلیب و دینی گفت را و

با صغیف و دشا و مرسل کارا و! (اقبال)

پھر سر زمین وطن میں اگر کچھ خطرات ہوں بھی تو خود یہ خطرات قبل احترام ہونے چاہئیں، نہ خود "وطن مالوت" مستوجب برہیز ہو جائے! اس اندیشہ و الفت میں اک تو اذن ملحوظ رہنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ! دھڑ بڑوس میں پنا کھر کا، اور آمادہ ہجرت مسلمان اپنے اہل عیال کو چھوڑ دیو اور پھاند، "مہاجر فی سبیل اللہ" ہو گیا! نظام اسلام کا ادارہ ہجرت ایسے ہول دل کا مسکاب ترک و فرار نہیں! ہمارے مسائل دینی سے ایسا مظانہ "لعب" رازیوں "ہی کے لئے اک وجہ تفریح ہو سکتا ہے، کسی مرد مسلمان کے لئے قابل فخر نہیں اسے

گردن بنہ گر ختم بود رستم زال!

سنت بنہ گرد دست بود جام سٹے!

ہم اس سے انکار کرتے ہیں کہ خدا نخواستہ "ہندوستان میں اسلام کو ایسا کوئی لرزہ برانداز خطرہ و پریشانی "رازی" صاحب کو اسلام کے خطرے اور دور افتادہ اسلام مسلمانوں کی ذاتی بزدلی میں فرق کرنا چاہیے! اگر آٹھ کروڑ مسلمانان ہندو "دوسے چند ہندو مسخرات سے ایسے وحشت زدہ ہوں گے کہ" "سیاں زلزلہ کے" ایران و ترکستان میں جا کر دم لیں گے، اور ستر آٹھ "سٹے بنے ہوئے" "عین و حجاز میں ایک ایک گوشہ قبر" مانگنے لگیں، یہ تو خفت ہے کہ



قرآن در زبان پہلوی — پرستان اقبال دستبرد کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس جائے بزرگ کو اقبال کی "اسرار خودی" و "مربوبہ مخدوم" کی "قامت بہتر" پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں! — ہم ان گویا ہان چہت کو کچھ "مدعی سرت" کا اقبال و اعتراض بھی سننا چاہتے ہیں! مگر اقبال اور ڈاکٹر اقبال کے تقابل پر خود اقبال کا اعلان گوشگزار فرمائیے!

باز بر خوام ز فیض "پیر روم" و "نیر سوسہ" اسرار معلوم جان او از شعلہا سرمایہ دار من فروغ یک لعل شعلہ شہرارا! اینہد جناب رازی کے ادعا میں اقبال کے منہ پر یہ شعر بھی کھٹا ہے کہ

در دشت جنوں من جبریل ز دیوں عیدے  
یزداں کمنہ آدر اسے ہمت مردانہ!

اقبال کے "عصائے کلم" اور "تیشہ خلیل" کو "رازی" صاحب اگر اقبال ہی کی زبان سے سن لیتے تو اچھا تھا! اقبال شاید اپنے اپنی "تخمین گوئے ناشناس" سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

نہ سلیقہ تجھ میں کلم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا  
میں ہلاک جاؤ سامری، تو قتل شیوہ آدری  
مرا بیش غم، مرا شہد سم، مری بود نفس مدم  
ترا دل حرم، گر دجہم ترا دین خزیدہ کا فری! —

یہ دل و دماغ، بوجہ دل و لب کے لئے بھلا کیا خطرے کا باعث ہو سکتا ہے! اور اس کے اندر حضرات صدیق و فاروق کی خوش نظری کے لئے کون سی ادائے جمال و شانِ جلال موجود ہے؟! ع

جائی! چلافت میزنی از پاک دامن؟! —

جناب رازی کی "گوگو" کو اب شاید معلوم ہو ہو گا کہ "کشاف" کیسی دشمنانہ گفتگو کرنے کا اہل ہے، اگر اسے "پوست کندہ گوئی" کی خطرناک تھدی کی جائے!! ع

آں زمین باشم کہ رو بہ جنگ مینا پشت من!

"اشتر اکیٹ کی ضرورت جنت" اور "کالیوں کے بیکار لونڈوں" کے بد مذاق و ارزاں طعن مکن کیا واقعہ ہے کہ "کالج کے کبھی کے نکالے ہوئے پیرانہ نابالغ" کو پر گینڈا بازانہ قلم فرسائی کی فتوحات کی جنت "نقد"

بجٹنے میں بڑے فاتحکار ثابت ہوئے ہوں لیکن مطلق شکم اور گھٹناں دباؤں اب دیا وہ دن اپنے لئے یہ کامجیاں مقدربہیں رکھیں! ع

ہے تو کچھ اکلڑا ہوا بزمِ حرفان کا رنگ

اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے!

(۸) تعصب ہو یا "عصبیت" اک شاہِ لبشریت اور اک ترخانِ القرآن

کو ہر دوسے مالادہر تر ہونا چاہئے ہمارے الم "رازی" صاحب مناسب ہو کہ

اس حدیث نبوی کی تفسیر فرمائیں کہ لَئِنْ مَتَّعْنَا مَنْ دَعَا إِلَى الْعَصْبِيَّةِ!!

علامہ اقبال کی زبان پر آیات قرآن کی مسلسل تلاوت کے مفروضہ فیضان کو رازی

صاحب نے کچھ ایسے لہجہ ادعا میں بیان کیا ہے کہ گویا اُن کی ذرا اعتقاد ہی

حضرت اقبال کے متفق ہیں یہ باور کرنا چاہتی ہے کہ کَانَ خَلْقَهُ الْقُرْآنُ

الغرض "عصبیت" اور اسلامی!! قرآن میں سجائے اس کے "حمیتہ الجاہلیہ" کی

ترکیب آئی ہے!

(۹) کثافتِ مجیشہ سے کھلا ہوا ہے، پر وہ داری و راز داری اگر

ہوگی تو رازی میں! ہاں کوئی شاعری کو "ذہب کی قیمت میں" نہ خریدے،

لیکن ذہب بھی شاعری کی قیمت میں خرید نہیں جاسکتا! اقبال کا موقف

یہاں ایسا پایا جاتا ہے کہ "مذہب بن بلین بلین ذلت! لا الٰہی ہولاء"

ولا الٰہی ہولاء! — ہر عہد جدید کی ارتقاء یافتہ شاعری تو عین

وسیع المشرب دین الفطرۃ، اسلام، ہی کی ہمسفر واقع ہوئی ہے! بچے

کہ اقبال جب دو سروں کو مایوس کرتا ہے "توشعہ اسلام" کی غلط تفسیری

پہچے کرتا ہے! آخر ٹیگور بیک وقت ایک بین الاقوامی شاعر اور ہندو

ذہب کی "دشوا بھارتی" (حکمتہ آفاق) کا عالمگیر مفسر کس طرح ہے! اعلیٰ

شاعری اور اک دین حق کا پیام ہم آہنگ ہو جاتے ہیں! ان من الشعر

لحکمتہ وان من البیان لیسوا!

(۱۰) رازی صاحب اس "سرخفی" کو فاش کرتے ہیں کہ جب تک

خدا نے اسلام زندہ ہے، تمدنِ اسلام پائندہ رہے گا۔ تاہم چند ہی طرہ

کے بعد یہ فقہانِ حافظہ "عارض حال" ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں کہ ہندو

تمدن کی حفاظت اُن کے حاکمین کی قوتِ ایمان کے مطابق ہوا کرتی ہے!

— ہمارا مشورہ ہے کہ چہ "رازی" صاحب، "بعیت علامہ اقبال

اسلام کی بقا کے فریضے کو خدا اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کے

کسی ریاضیاتی اصول تناسب کو متعین فرمائیں! بصورتِ اہم حقوق و فرائض،  
مکن ہے خدا اس ذمہ داری کو مسلمانوں کو تفویض فرمائے، اور مسلمان  
بفوائے "علائے تو بہ لغائے تو" اس عطیہ الہی کو بنام اللہ جل شانہ  
واپس بہہ کر دیں! — ہمیں مرزا غالب مرحوم کا وہ واقعہ یاد آ رہا ہے  
کہ جب وہ ایک دفعہ ریاست راجپور گئے تو تین چار روز تک تو اناب  
صاحب نے التفات نہ فرمایا، اور اُس کے بعد شاہانہ شکار کے لئے غیر  
و خگاہ تیار ہونے شروع ہوئے! اناب صاحب نے روانگی کے وقت  
میرزا صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "اچھا میرزا صاحب! فی اللہ! تھوڑا  
بندہ! — غریب غالب کی زبان نے اس ستم ظریفی کی یوں داد  
دی! جو حضور کی مرضی! مگر خدا نے تو مجھے آپ کے حوالے کیا تھا، آپ  
اُن مجھے خدا کے حوالے فرماتے ہیں! ح" **گماں برند کہ ایں بندہ را خدائے غیبت!**

"جذبہ ایمان سے ویران" اسلامی سینوں کے علی الرغم "تغاف" **اسلامی**  
مجاہد غاویں اور قبرستانوں میں اسی شان سے زندہ و  
پائندہ رہ سکتی ہے کہ مسلمانانِ درگور مسلمانانِ درکت اب — پھر  
یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ہندوستان کے فرزندانِ توحید کی تجدید ایمان  
کی رسم سعید میں ہندو کس طرح حائل ہیں؟ اسے  
"رازی" از دستِ غیر نالہ کند  
"سعدی" از دستِ خویشین فریاد!

۱۱) "رازی" صاحب چلیخ فرماتے ہیں کہ "تشیہ" کا اہل ہل بھی تو  
کسی ہندو کے گھر سے نکال دیجئے! — ہم ہنایت ناچار و مخوم ہو کر  
جواب دیتے ہیں کہ "حب رازی" صاحب نے پہلے ہی سے ۲۵ کروڑ  
ہندو ہندوستان کے ایک ایک گھر کی "خانہ تلاشی" سے لی ہے، اور  
اہل ہل کے دورِ اول کا اک پڑھ کہیں نہ پایا تو اب ہیں اس حجبوئے  
مکر کی بیسوز محنت میں کیوں ڈالتے ہیں؟! مگر کہیں ایسا ہو کہ اس  
عظیم الشان کمیشن تحقیقات میں جو حکومت ہند کی سی، آئی اڈی، نے شاید  
"رازی" صاحب کی سرکردگی میں انجام دیا، ہم آپ سے دہ صد قسطنطین  
خانہ تلاشی، طلب کر بیٹیں! "فاقوا مبدھا نکمہ، ان کنتھ صاقدین!"  
— واللہ، یہ اسلام کی کتنی بڑی برکتی ہے کہ ہاتھ لگا دھمی کو اس کی

کسی وسیع الشرحی کائنات و اعتراف ہو! اور مولانا ابوالکلام کی تفسیر القرآن  
کے اجزاء کا ترجمہ و اشاعت گجراتی زبان و علاقے میں کیا جائے! اگر دنیا  
محض "خدا پرستی و نیک عملی کی زندگی" پر قائم ہو جائے گی تو پھر میر غلام بیگ  
"نیرنگ" و غیر ہم کے شعلِ تبلیغ کے لئے کیا رہ جائے گا! کیسی مصیبت ہے کہ  
اب لوگ صرف خدا کے پرستار اور نیکوکار ہو کر رہ گئے، اور مسلمان  
ہوں گے! اللہ اللہ! ربانیت اور عملِ صالح میں ایک طرف، اور  
"رازی" و "نیرنگ" کے "اسلام" میں دوسری طرف، کتنا لا علاج "تضا و تواضع"  
ہوئے! "رازی" صاحب! "خدا پرستی و نیک عملی پرستار" آپ کو کسی پراسرار  
و ناگفتہ بہ "چیز بعینہ" راز اپنے "دار البینوں" میں سینہ بہ سینہ، ان تو  
مسلموں کو متعین فرمائیں گے، جس کا ذکر ابوالکلام کی تفسیر اسلام میں نہیں ہے۔  
— کیا ہم اس پر اتنے فقرے کا اضافہ کریں کہ "و کونکیر الموصوفہ"؟

(۱۲) چشم ماروشن و دل ماشا و! آپ مسلمانانِ کو خالد بن الولید  
بنے دیجئے، آپ کی پھندے وار لڑائی، اور آپ کے اُنکے پاسجائے کے  
تحفظ کی ضمانت ہم کرتے ہیں! بشرطیکہ آپ اسی پر مصر ہیں کہ  
جو کھلو تاجھے دکھایا تھا توں گی تو وہی!

(۱۳) ہم نے بار بار یہ قماش دکھایا ہے کہ جو خوش عقیدہ بزرگ  
اقبال کے قرآن زبان پھوسی و ہندی پرٹے ہوئے ہیں، وہی اس کی  
اہم ترین "سورتوں اور آیتوں" سے بے خبر ہیں! آئیے اس ساری نزاع  
میں قولِ فیصل اقبال ہی کی ایک نلک کو بنائیں! "مربہ کلیم" کے اس "مدعے"  
"رازی" جگر تمام کے سہیں۔

قوسوں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ علوم **میسو دہیں روس کی یہ گرجی افکار**  
اندیشہ ہوا شوخی افکار **محبوب**  
انسان کی ہوس نے جھٹیں رکھا تھا چھپا **فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بنیاد**  
قرآن میں جو غلط زن لائے مردِ سال **نکلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار**  
جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک **اندک کرے سمجھو عطا جدت کو دار**  
آپ نے دیکھا، مساواتِ شکم کا جو کلمہ تنقیر، اقبال نے کمال **اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نودا**  
مار کس کی "شریعت معاشی" کے سقن اپنی شاعرانہ معراج کی روایت — **آئی اڈی، نے شاید**  
جاوید نامہ — میں استعمال کیا تھا اُس کا خیال وہ کتنے مغلوبانہ اعتراف **"رازی" صاحب کی سرکردگی میں انجام دیا، ہم آپ سے دہ صد قسطنطین**  
سے کھینچا پڑا! — اندک اندک عشق درکار آمد و بجائے دار!

شریعت میں ۲ فیصد کی شرح زکوٰۃ اس قدر ایمان کی تکمیل کا معیار نہیں جس قدر کہ کفر سے بچنے کا کترین حید ہے: یہ گویا ۳۰ فیصد ہاسنگ ٹکن کا ستر ڈکلاس ہے۔ ۱۰۰۰۰۰ فیصد والا۔ آرزو اسکو نہ بنیں! چالیس روپیہ میں ایک روپیہ صنعت الایمان کی جس اک اشک ٹپٹی ہے، معاشی مقام سبقت و عزت کے نشاندہ، حضرت ابو بکر و عمر و علی و عبدالرحمن بن عوف و ابو ذر غفاری کے ہی تاریخی اسوہائے حسنہ ہیں! ادنیٰ ترین مذاہب میں بھی خود کا نام شخصی ملکیت "اک ننگ سمجھی گئی ہے! دینی نعمات معاشی میں کم از کم امانت داری" کا تصور پایا جاتا ہے! آج مساجد و مدارس و کتب خانے یکساں اس کے منکر ہیں۔ اور اشتراکیت اس بین الاقوامی فتنہ ارتداد کا مین قدرتی رد عمل ہے! اپنے مرشد اقبال ہی کی ربانی اس الیہ کو سنیے!

خواجہ ازخون گمزدور ساز و لعل ناب ورجائے دہ خدایان کشت و تہان ناب  
انقلاب! انقلاب! انقلاب! انقلاب! انقلاب!

شاہ شہر از رشتہ تسبیح صدر مومن مدام ہندوان سادہ دل مارہ بین ذلتاب  
انقلاب! انقلاب! انقلاب! انقلاب! انقلاب!

در کلیہ ابن مریم را بہ دار آویختند سسطنے از کبتہ ہجرہ کردہ بام اللہاب  
انقلاب! انقلاب! انقلاب! انقلاب! انقلاب!

(۱۴) ممکن ہے انڈین نیشنل کانگریس نے کوئی شاعرانہ نکتہ انقلاب نہ تراش ہو، لیکن اس کا نصف قرن سے زیادہ کا محاذ آزادی و قربانی و بدون کسی سیاسی و معاشی و مجلسی نظریے کی اساس کے نہیں ہو سکتا! باقی بری بی بات کہ کانگریس نے اتنی "سخن فروشی" نہیں کی جتنی کہ اک شکم سیر بوزر شواہ شاعر کے لئے ممکن ہے تو اس راز کا حل شاید جناب رازی کو اک سچے قرآنی شاعر (حمید الدین فراہی) کے اس شعر میں مل سکے!۔

خروش و جوش کہ مینی بہ و عظیم منفی شہر  
زستی است کہ در تہائے اذقاف است!

ہندوستان کے جہاد آزادی کو بالفعل تو خون سرخ کی ضرورت ہے۔ قبل اس کے کہ اس سیاہ روشنائی کے رشحات کا وقت آئے جو ہندوستانی انقلاب کا مستقبل کا متصل لائحہ عمل معرعن تحریر میں لائے!۔

آن راز کہ در سینہ ہنہاں ست نہ دخط ست  
بزدار تو ان گفت بہ منبر نتواں گفت!  
ہم حیران ہیں کہ غلامی کی سیاسی زندگی کے سایہ تاریک میں کوئی جلت یا امانت اپنی حقیقی آزاد، تخلیقی کلچر کا خواب بھی کس طرح دیکھ سکتی ہے!۔

نما کہ جو ہے ہند میں بحدے کی اجازت  
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!  
ثنا فت و متدل کا کیا ذکر، غلام کی تو وحی و الہام بھی اکت قابل استغفار و سوء شیطانی ہے!۔

حکمر کے الہام سے اللہ بچائے  
غارت گروا قوام ہے وہ صورت جنگیز!  
اقبال کے کھلے کھلے درس آزادی کی "پہنچی جھپی اخلاقی زبونی" خود اُپنی ہی کی ربانی سنیے!۔

اقبال بڑا آپڈیشک ہے سن باتوں میں سوہ لیتا جو  
گفتار کا وہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

(۱۵) رازی صاحب کے ہاں چلیجوں کی کوئی کمی نظر نہیں آتی!۔ داعی نابالغی کی یہ جھنجھکار بہت بدنام ہے! اگر آزادی قوم پرستی اور اشتراکیت قرآن سے ناقابل اثبات ہیں، تو غالباً قرآن، غلامی و ملت فروشی، سرمایہ واریت اور قمار و شیت کا پیامبر و علم بردار ہو گا! — بلاشبہ قرآن سے بڑھ کر کوئی محبت نہیں۔ لیکن یہ امر اسبھی تصدیق طلب ہے کہ آیا واقعی حضرت رازی چودھویں صدی کے قرآن ناطق واقع ہوئے ہیں!؟ رازی صاحب پوچھتے ہیں کہ آپ کو مسلمان کہنا کا کس حد تک حق پہنچتا ہے!۔ عرض یہ ہے کہ جسد سے مسلمانیت کے امتساب کا حق جناب رازی و امثالہم کو پیوستہ، ہم خود بلیب ظلم اس تسمیہ و حق سے دستبردار ہو گئے!۔

سخن کو تہ مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است اما  
ز ننگ زاہد افتاد ہم بکار فرما جا ایہا!  
(کشتان)

## ہندوستانی قومیت

اقوام عالم کے زوال و عروج کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ ارتقاء سیاسی نام ہے اتحاد قومی کا یعنی جب تک عوام کی فرسودہ ذہنیوں کو بدل کر ان میں سیاسی شعور نہ پیدا کیا جائے۔ قومیت کی روح چھونک کر ان کے سینوں کو نہ گرمایا جائے، انقلاب کے دروازے کھٹکھٹائے نہیں جاتے، اور نہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں۔

جنگ آزادی کی راہ میں ہندوستان کی مجلس قومی (کانگریس) کی لازوال قربانیاں اور عوام سے براہ راست رابطہ اتحاد پیدا کرنے کی ان تنگ کوششیں اس وقت عوام کے جمود و غفلت کو دور کر کے ملک میں بیداری کی فضا، ہمارا کر چکی ہیں، لیکن فرقہ پرستی ہندوستانی قومیت کی راہ کا بھاری پتھر بنی ہوئی ہے۔ ہندوستان کا موجودہ دور صرف عوام کے سیاسی شعور کی بیداری کا دور ہے، جس میں اطمینان بخش مرکزیت نہیں پائی جاتی۔ لیکن مستقبل اپنے آغوش میں ایک ایسے ذریعہ ہمد کی پرورش کر رہا ہے، جو قومیت کا عنوان پاسے لگائے گا۔ گیند سو کم کی تبدیلی بتا رہی ہے کہ اختراق و انتشار کی یہ بدلیاں بھی بہت جلد چھٹ جائے والی ہیں، اور قومی اتحاد و یکجہتی کے آفتاب کی منیا پاش کر نہیں سوادار ہو کر آزادی کے خوش انجام انقلاب کا دامن جگمگا دینے والی ہیں۔

اس صحبت میں ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں حائل ہو رہے ہیں؟ لیکن یہ بحث یہاں سے شروع نہیں ہوتی

## نعمان شاغل بھوپالی

بلکہ اس مسئلہ کا عمل تلاش کرنے سے قبل ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوم کس طرح بنتی ہے؟ اور قومیت کیا ہے؟ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مختصر طریقہ پر پہلے اس کو سمجھ لیا جائے۔

## اجزائے قومیت

بعض علمائے سیاست کا خیال ہے کہ قیام قومیت کے لئے چند اجزاء بہت ضروری ہیں، مثلاً وحدتِ زمان، وحدتِ نسل، اور وحدتِ مذہب وغیرہ، لیکن دنیا کی موجودہ تاریخ قومیت کا جواب اس کے برعکس ہے، یعنی ان تمام باتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو تعمیر قومیت کے لئے لازمی اور اساسی کہی جاسکے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اور اسی قسم کے نام امور کسی گروہ یا ملک کے لئے قیام قومیت میں زیادہ سے زیادہ معاون ہو جائیں۔ لیکن حقیقت و اصلیت نے ان کو کوئی تعلق نہیں۔

کیا تمدن دنیا میں کوئی ایک جگہ بھی ایسی ہے جہاں صرف ایک نسل کے لوگ آباد ہوں؟ ان کی زبان ایک ہو؟ اور مذہب وغیرہ بھی ایک ہی رکھتے ہوں؟ اور کیا ایسے ہی مختلف اجزاء کے ساتھ قریب قریب تمام ممالک قوم نہیں بن چکے ہیں؟ اگر کہیں زبان ایک ہے تو مذہب میں اختلاف ہے، کہیں مذہب ایک ہے تو زبانیں ایک سے زیادہ ہیں اور کسی جگہ یہ دو زبان باتیں ہیں تو نسل ایک نہیں ہے۔

ہوتے ہوئے بھی قومیت کا رشتہ سب سے زیادہ مقدس رشتہ سمجھا جانے لگتا ہے۔ اور یہی چیز آگے چل کر ان کی سیاسی، مذہبی، اقتصادی و معاشرتی ترقیوں کے لئے سنگ میل بنتی جاتی ہے۔

## جرمنی اور امریکہ کی قومیتیں

انیسویں صدی عیسوی سے پہلے جرمن قوم کیا تھی؟ تمام ملک چھوٹی چھوٹی متعدد ریاستوں میں تقسیم تھا۔ جن میں کوئی وحدت قومی نہیں پائی جاتی تھی۔ اور آپس میں چشمک بھی رہتی تھی۔ ان ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور ریاست پروسیا تھی، جرمن قوم کی ترقی کا ٹرسنس اول پرنس ہسارک اس انتشار کو اجتماع میں بدل دینے کا سب سے زیادہ آئندہ تھا۔ ان مختلف گروہوں کو ایک مرکز پر لانے کا خواب ایک مدت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دور بین نظروں کے سامنے آنے والی ہلاکت و تباہی پوری عریانیوں کے ساتھ کھڑی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ ملک کا یہ انتشار و داخلی نزاع جرمنی کو کمزور کر کے کسی دوسری طاقتور قوم کو ان پر مسلط کر دے گا۔ اس لئے وہ چاہتا کہ یہ مختلف کڑیاں کسی تیز بھتی میں تپ کر ایک مضبوط زنجیر بن جائیں اور اس کے نزدیک جرمنی کے اس داخلی اتحاد و تنظیم کی صحیح تعبیر جنگ تھی، چنانچہ اس نے مختلف طریقوں سے فرانس کو بھر کا کر جنگ کے اسکانات پیدا کر لئے اور مشرق میں پوری جرمن قوم کے لئے جنگ کا مشترک خطرہ سامنے آگیا، جس کے دغیہ کے لئے پورا ملک ایک مشترک خیال و وحدت بقصد کے زیر اثر تنظیم کی ایک صف میں آگیا، جرمنی کے نظام اجتماعی و ارتقادی میں آج جو اتحاد و قومیت نظر آ رہا ہے وہ نتیجہ ہے اسی مشعل کی جنگ کا جو صرف و ابیہ سیاست ہسارک کی پیدا کردہ تھی، امریکہ نے جب تک اپنی قومیت کا جھنڈا بلند نہیں کیا، کسی طرح برطانوی غلامی سے نجات نہیں پائی، لیکن جب اُس نے قومیت کا ہتھیار سمجھالا تو غلامی کی تمام کڑیاں ایک ایک کر کے کاٹ کر رکھ دیں۔

## تعمیر قومیت کی دو بنیادیں

غرض قومیت، دفاع و حفاظت کا دوسرا نام ہے جو کہ دو بنیادیں

مقرر و یوآرپ۔ غیرہ میں مختلف مذاہب کے پیروں کی اپنی قومیت بنا چکے ہیں، انگلستان اور امریکہ میں زبان انگریزی استعمال کی جاتی ہے، حالانکہ دونوں الگ الگ دو قومیں ہیں، اور نسل و مذہب کے مختلف اجزاء سے مرکب ہیں۔ پھر سویٹزر لینڈ میں جرمن، فرانچ اور توسین زبانیں بولی جاتی ہیں، اور نسل بھی ایک نہیں ہے، لیکن کیا اس بنا پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ سویٹزر لینڈ کے باشندے ایک قوم نہیں ہیں؟ اسی طرح یوگوسلاویا، کناڈا اور مشرقی یورپ وغیرہ میں متعدد جگہ اختلاف نسل و مذہب پایا جاتا ہے۔ جدید ترکی قومیت کی زبان ایک ہے، اور مذہب و نسل ایک سے زیادہ ہیں، مگر کیا یہ اختلافات اُن کی قومیت کا راستہ روکے ہوئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ تمام امور جزوی اور فرعی ہیں، اور حقیقت و اصلیت ان کے علاوہ کچھ اور ہی ہے۔

## اصلیت و حقیقت

پھر وہ اصلیت کیا ہے جس کے بغیر کسی جگہ کا کوئی گروہ قوم نہیں بن سکتا؟ وہ اہم اور بنیادی اصلیت اتحاد و خیال اور اشتراک بقصد ہے۔ جس کو واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی ملک کے لوگوں کا ایک دوسرے کو ہم قوم سمجھنا اور سیاسی مقاصد میں ایک ہو جانا ہی قوم بنانا ہے، خواہ وہ مذہب، زبان اور نسل وغیرہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں ہوں؟

یہ وحدت قومی زیادہ تر اُس وقت ابھرتی ہے جب ملک کے تمام باشندوں کے لئے خطرہ مشترک ہو، کیونکہ یہ اصول ہے کہ جب سیلاب آتا ہے یا کوئی اور بلا نازل ہوتی ہے تو جنگل کے تمام جانور اس کے دغیہ اور اپنی پناہ کے لئے تمام درندگی و بہیمیت کو بھول کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی ملک کے لئے خطرہ مشترک ہو تو اس کے دفاع کی خاطر تمام داخلی نزاعات ختم ہو جاتے ہیں، ملک کا انتشار و اختلاف سرٹ کر ایک مرکز پر آجاتا ہے۔ سیاسی مفاد و قومی نصب العین میں اشتراک و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے، اور کل افراد اپنے کو قوم کا ایک فرد سمجھنے لگ جاتے ہیں، پھر یہ ایک مرتبہ وحدت قومی کے نشے سے سرشار ہو کر کسی قومیت پر اس منہ و باریکی کو توڑنا گوارا نہیں کرتے، زبان و مذہب و غیرہ میں اختلاف

میں وجود میں آتی ہے، یا تو خطرہ جنگ کے دفعہ کے لئے اور یا اجنبی حکمرانوں کے پنجہ استبداد سے رہائی پانے کے لئے۔ جس کی بہترین مثال جرمنی، امریکہ، فرانس، اٹلی اور پولینڈ وغیرہ ہیں۔ بغیر قوم بنائے کسی ملک نے نہ تو ترقی کی ہے اور نہ غلامی سے نجات پائی ہے۔ اور تخلیق قومیت کے لئے نہ کسی طرح کی فلسفیانہ مویشگافی کی ضرورت ہے، نہ قومیت کی نفسیاتی تخیل کی بلکہ غلامی کی ذلت اور پستی کے ادبار کا احساس ہی تعمیر قومیت کا سنگ بنیاد بن جاتا ہے۔

### ہندوستانی غلامیت اور قومیت

ہندوستان غلام ہے، اور جب کسی ملک کی غلامی پر ایک طویل مدت گزر جاتی ہے تو لوگوں کے دلوں سے احساس قومیت فنا ہو جاتا ہے۔ اور علمبردارانِ حریت کے لئے احساس قومیت کی بیداری میں سخت مشکلات ہو جاتی ہیں، کیونکہ ملک کے باشندے فرقہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو کر پنجہ استبداد کی گیرائی کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بناتے رہتے ہیں، بالواسطہ معاونت کے خوگر ہو جاتے ہیں۔

اجنبی اقتدار اپنے مقبوضات کے لئے سب کچھ گوارا کر سکتا ہے لیکن اس کو کسی عنوان برداشت نہیں کر سکتا کہ غلاموں میں قومیت کے عناصر تشکیل پائیں، چنانچہ مختلف مملکتوں سے ملک کے داخلی اتحاد پر کاری عزیمت لگائی جاتی ہے، جس سے فرقہ دارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں، اور قومیت، جو ملک کے لئے بہترین ریڑھ کی ہڈی کے ہے، ہر جگہ سر ہٹتی ہو جاتی ہے۔ اجنبی اقتدار کے زہر سے غلاموں کی ذہنیت اس درجہ سموم ہو جاتی ہے کہ وہ فرقہ پرستی کو ہی اپنی تعمیریات کا مٹا من سمجھنے لگتے ہیں، اپنے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی غرض تمام مسائل حیات کا تصفیہ فرقہ دارانہ اصول پر کرنے لگتے ہیں، اور ملک و قوم کی یہی تخریب، قوائے استبداد کی تعمیر بن جاتی ہے۔

غلام ذہنیت اتحادِ قومی کے مفاد سے تو منکر نہیں ہوتی، لیکن اپنے لئے یہی چیز اس کو سب سے زیادہ ناممکن نظر آتی ہے، اس کو حسبِ بہولاء ہواست یا ردا باجائے تو وہ خود بخود اپنے لئے بعد از دنیا

مشکلات گھرا کر خوفزدہ ہو جاتی ہے "وطنیت" "قومیت" "داخلی اتحاد" "قومی اتفاق" یہ تمام الفاظ محکوم فرقہ پرستی کو سفید کاغذ پر چھپے ہوئے بیت اچھے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کی دنیائے عمل میں ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں رہتی، گویا قومیت کا راگ ان کے نزدیک ایک ستم کی روحانی شاعری ہوتا ہے جس سے مرث تغریج طبع اور گرمی محفل کا کام لیا جاسکتا ہے۔ پھر ان خود غرض سیاسی رہنماؤں، ریاکار اخلاقی مصلحوں اور جاہل مذہبی سندھنوں کی اس شوم نصیبی اور اخلاقی موت پر تو ماتم کی سچی کوئی گنجی نش نہیں رہتی جبکہ وہ تشکیلات قومیت کو "اصول انسانیت" "قواعد اخلاق" اور "تعلیم مذہب" کے بھی خلاف بتلا کر اس پر بحث و عمل کو "انسانی" "اخلاقی" اور "مذہبی جرم" قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان بھی برطانوی اقتدار کے زیر اثر، افتراق و انتشار کے ایسے ہی دور سے گزر رہا ہے۔ مجلس قومی کی سعی قیام قومیت کو، غلامانہ ذہنیت ہندوستانی حالات کے سفاکی خیال کرتی ہے، کیونکہ اس سر زمین پر آریں منگول، افغان، عرب وغیرہ مختلف نسل کے لوگ آباد ہیں مختلف معاشرتی ہیں، متعدد مذاہب ہیں اور آؤ، ہندی، گجراتی، بنگالی، سندھی، پنجابی وغیرہ لاقعد و زبانیں بولی جاتی ہیں، حالانکہ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ دنیا کے اندران میں سے کوئی ایک چیز کسی حیثیت سے بھی، تعمیر قومیت میں حاصل نہیں ہوتی، اس موقع پر یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ روس بھی مذہب و معاشرت اور زبان و نسل کی بوقلمونی کے سمانہ سے ہندوستان ہی کا نمونہ ہے، کیونکہ وہاں اسلام، مسیحیت، بدھ مت وغیرہ مذاہب ہیں۔ منگولین، چینی، عربی، روسی وغیرہ نسلیں آباد ہیں، اور عربی، روسی، فارسی، ترکی، چینی وغیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جب یہ تمام اختلافات روس میں قومیت کے اجراء بن سکے ہیں تو ہندوستان میں اجراء قومیت کیوں نہیں بن سکے؟

### مذہبی تعصب

پھر وہ کونسی رکاوٹ ہے جو ہندی قومیت کو ابھرنے سے روکتی ہے؟ ادنیٰ تدبیر سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کا مذہبی تعصب ہے! میں نفس مذہب پر حملہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری مراد مذہبی تعصب و تنگ نظری سے ہے، یہاں کے باشندوں

## اسلامیان ہند اور وقت کی ضرورت

سب سے زیادہ حیرت و تعجب تو اسلامیان ہند پر ہے جن کے مذہب نے نہ صرف اہل وطن سے حسن سلوک اور حب وطن کی بار بار تاکید کی ہے بلکہ انسانیت اور وطنیت کا وہ بلند ترین نصب العین پیش کیا ہے جو دنیا کے تمام مذاہب و اقوام کے لئے تعلید و عمل کا نمونہ ہے۔ ایک بچہ مسلمان کے لئے چرچیت انسان ہونے کے تمام کردار معنی وطن ہے اور دنیا کے تمام باشندے اُس کے اہل وطن، لیکن انسانیت و اخلاق کا یہی سب سے بڑا علمبردار جب سرزمین ہند پر نمودار ہوتا ہے تو بجز نادر و روزہ کے انتساب حب وطن اور بین الاقوامی اخلاق کے تمام مذہبی اصول فراموش کر دیتا ہے، جو مذہب کے غایت اصلی اور ایمان کی بنیادیں ہیں۔ افسوس! ہندوستان نے چند رسوم کے ادا کرنے کے بعد مسلمان ہونا تو جان لیا، لیکن انسان ہونا نہیں جانا۔ حالانکہ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ "اسلامیت" و "انسانیت" دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں، اسلام دنیا کو چند رسوم کا پابند بنانے کے لئے نہیں آیا، بلکہ انسان بنادینے کے لئے آیا تھا۔

مذہبی تنگ نظری و عصبیت نے ہر جگہ قومیت کی راہ میں روڑے اٹھائے ہیں، ترکی جب تک تنگ نظر تلاؤں اور جاہل موفیوں کے ہاتھوں کیلتا رہا اس کی قومیت کے رخنے بڑھتے گئے، ہر اصلاح و تہجد کے خلاف بغاوت کی جاتی رہی۔ ہندی قومیت بھی فی الحال اسی جیل و عصبیت کا شکار ہو رہی ہے اور ترکی کی طرح ہندوستان کو بھی اب خود ساختہ و جاہل مذہبی رہنماؤں کے اقتدار کو جلد از جلد ختم کر دینے کے لئے ایک مصطفیٰ کمال کی ضرورت ہے تاکہ مذہبی تعصب و تنگ نظری کی اس چٹان کو کاری ضرب سے پاش پاش کر کے قومیت کو ابھرنے کا موقعہ دیا جائے۔ جس کے بعد انقلاب اور آزادی کی منزل کچھ زیادہ دور نہیں رہ جائے۔

## اطلاع

چونکہ رسالہ کیم ہر انگریزی پینے کی سہی تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اس لئے یہ سہی نہ چھوٹنے کی اطلاع ۱۰ تاریخ تک بھجوبینی چاہیے ورنہ بعد میں تعمیل نہیں کی جاتی۔

پر غلط طریقے پر مذہبی رنگیت چھایا ہوا ہے اور جیسا کہ یہاں کے بعض قوم پرست علماء سیاست کا خیال ہے: اس کی وجہ مرث یہ ہے کہ ہندوئی عوام کی ذہنی تربیت اب تک بجائے قومی اور سیاسی بنیادوں کے ہر فرقے کے متعصب و تنگ نظر مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر ہوتی رہی ہے، اور وہ ہر چیز کو اسی عینک کے دھندلے شیشوں کی مدد سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، غفلت اور سنگٹھن، تبلیغ، ارشاد صحیح، گائے اور بگا، مسجد و مندر، اذان و ناقوس، اس قسم کی سحر کیس خالص مذہبی ہونے کے باعث عوام کے تعصب و جوش مذہبی کو جس قدر جلد برا بھلا کر دیتی ہیں اس جوش و دلچسپی کا عشرہ شیریں قومی سحر کیوں میں نظر نہیں آتا۔ "اسلامیت" و "ہندویت" کا مسلم بھرت ہندو و ہندوبہ "ہندو زبان" ہندی زبان" یہ اور اس کی قسم کے تمام مسائل جو اس وقت ہندوستان میں قیام قومیت کے اہم مواقع سمجھے جا رہے ہیں، درحقیقت باطنی فردوسی و غیر اہم ہیں، اور اصل محرک صرف مذہبی تعصب ہے، جس کے زیر اثر یہ تمام سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ زبان کا مسئلہ جو اس وقت سب سے اہم بنا ہوا ہے اور جس سے ہندوستانی قومیت پر کاری ضرب لگ رہی ہے، یہ بھی باطنی طے ہو سکتا ہے، اگر مذہبی عصبیت کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

جاہ پسند و فرقہ پرست لیڈروں اور تنگ نظر و متعصب مذہبی پیشواؤں نے اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر عوام کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر کے ہر گروہ کو دوسرے سے بھگانا ہی نہیں بنایا، بلکہ بھگانے کے علاوہ مذہب کے نام پر ان کے مابین نفرت و عداوت کی تبلیغ بھی حاصل کر دی ہے، حالانکہ تعصب و تنگ نظری اور نفرت و عداوت کو روج مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اور کوئی مذہب بجز وسیع القلبی، خدمتِ خلق، اور ہندو مذہب نفس کے، وحشت و ہیبت، درندگی و خوشخواری کی تعلیم نہیں دیتا۔

جب مختلف مذہبی فرقوں کا سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ہر طرح کا مفاد ایک ہی سرزمین سے وابستہ ہے تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مذہبی واداری کے علاوہ ان میں قومی اور وطنی ارتباط کے رشتے کو بھی ہیبت زیادہ نسبت و استواری حاصل ہوتی، لیکن واضح رہا کہ یہاں مذہبی رد و اداری ہے، نہ قومی وطنی ارتباط کا علاقہ۔

# آج کچھ کھایا نہیں

شام آئی، واں کھٹے باب حرم درہائے دیر  
تازگی سے رُوح کی کلفت بدنے کے لئے  
جانفراہرات، بادِ سرد اٹھلائی ہوئی  
آسمان نیلگوں پر کالی کالی بدلساں  
بخششِ موسم سے سخی مناک بادِ برشگال  
نکار خانِ سیمبر تھے موڑوں میں یوں رواں  
اہلِ ذرستے قیمتی ملبوس میں نیسے ہوئے  
ہو کھلوں میں ہر طرف اک شورِ ناولوش تھا  
الغرض ہر شے میں سخی اک دلکشی اک زندگی  
سخی زمیں سے آسمان تک تازگی ہی تازگی

ناگہاں اک ناتواں مزدور آیا سامنے  
مگجے کپڑے شکستہ دلوے، پہرہ اداس  
دست و پاشل چشم و ابرو ضعف میں ڈوبے ہوئے  
دفتا کا بنا، رُکا، بھٹرا، بھٹرا کر گر پڑا  
سر میں چوٹ آئی، لہو زخموں سے جاری ہو گیا  
یہ تماشا دیکھنے دو چار بے فکرے بڑے  
کوئی یہ کہنے لگا یہ ہے شرابی کی سزا  
کوئی کہتا تھا کہ شاید یہ ہے مرگی کا اثر  
چند لمحوں تک وہ بیہوشی کے عالم میں رہا  
یہ ہوا کیا؟ ایک نے پوچھا جو بیٹھا تھا قریں  
وہ تقاہت سے یہ بولا: آج کچھ کھایا نہیں



# گستاخ شیطان

وجاہت علی سندیلوی بی اے

آدمی ہوں، آپ دعا کریں۔

مولوی صاحب - انشاء اللہ۔

معتقد - حضور اب تو فاقے کرتے کرتے جان پر بن آئی ہے، اب

آپ ہی کچھ زور لگادیں۔

مولوی صاحب - (ہاتھ اٹھا کر) رازق تم پر اپنے رزق کے دروازے

کھول دے۔

معتقد - حضور میں نے خود خدا سے سجدہ مانا مگر، بہت نذر و نیاز

کی، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

مولوی صاحب - واسطے کی ضرورت ہے۔ اُس محبوبِ حقیقی کی بارگاہ

عالی تک ہر کدومہ کی تلوڑی ہی رسائی ہے (بارگاہ کی عظمت و جلال

کے خیال سے مولوی صاحب کو ایک جھرجھری معلوم ہوئی، اصل جلالہ

معتقد - میں نے سمجھا کہ شاید خدا صرف امیروں کی دعا سنتا ہے

جو پلاؤ زرد سے پرندہ نیاز دلا سکیں۔ جو اپنی عاؤں کی قبولیت کے لئے

بزرگوں کے وسیلے حاصل کر سکیں۔

مولوی صاحب - (تیز ہو کر) خاموش، یہ کیا لہر کھیتے ہو۔ خدا تو

ہر ایک کے لئے ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

معتقد - پھر وہ غریبوں کی سنتا کیوں نہیں؟

مولوی صاحب - دیکھو تم انرا ایمان سے خارج ہو رہے ہو، ہاں

یہ اُس کی مشیت میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ اُس نے ہر ایک کی

صبح کا پہانا وقت تھا، رات کی گری سے دینک جاگی ہوئی۔ دینا

ابھی خاموش تھی اور سو۔ بج کی پہلی کرنیں شرماتی لجاتی ہر بلندی کی پیشانی

چوم رہی تھیں۔ نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر مولوی ابن القدوس صاحب

اپنے مکان کے کٹاؤہ سخن میں ایک قالین پوش ہو کر یگانہ دیکھ کا ہمارا

لئے حق کے سیٹے میٹھے کش کیٹے رہے تھے، اپنے محبوب کی بارگاہ میں حاضر

ہونے کے بعد وہ ایک عجب سکون و کیف سے سرشار تھے، اس وقت

دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز وہ اپنے سینے میں کچھ ایسی مٹنڈک محسوس کر رہے

تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں دل کے عوصن ایک برف کا ڈھیلہ

دھڑک رہا ہے، حق کے سیٹے میٹھے خوشگوار کش مولوی صاحب کی انگلیں

بند کئے دیتے اور وہ کچھ ایسا لطف محسوس کرتے گویا جنت میں حوریں اُن

کے ہاتھ پیر اور سر دبا رہی ہیں۔

آہٹ ہوئی۔ مولوی صاحب نے سر جو اٹھایا تو ایک بڑا

ڈاڑھی والا معتقد جس کے معصوم جہرے سے خشوع و خضوع کی شعاعیں

نکل رہی تھیں، نہایت مودبانہ ایک روپیہ نذر لئے ہوئے کھڑا تھا۔

”اس کی لین ضرورت ہے، کہہ کر مولوی صاحب نے اذراہ

غز باپروسی نذر قبول کر لی۔ اور روپے کو تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ معتقد نے

مولوی صاحب کے ہاتھ پیر جوئے اور اُن کے پاس ہی زمین پر بیٹھ لیا۔

مولوی صاحب - کیوں کہے آئے کیا کام ہے تمہارا۔

معتقد - حضور میں بہت ہی گھٹا ہوں، اور بہت ہی غریب

تقدیر بنائی ہے، اور اُسے ہر ایک کا جدا جدا امتحان مقصود ہے۔  
 معتقد۔ تو پھر جو کچھ تقدیر میں ہے وہ پٹ نہیں سکتا۔  
 مولوی صاحب۔ (جو شہادت سے اپنی وارسی پاز کر) نہیں کہیں نہیں۔  
 معتقد۔ تو پھر آپ لوگ دعائیں کیوں مانگتے ہیں۔  
 مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) تم جاہل ہوا سے سمجھ نہیں سکتے؟  
 معتقد۔ انسان وہی کرتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے؟  
 مولوی صاحب۔ بیشک خدا تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پنہ تک ہل نہیں سکتا۔

معتقد۔ تو پھر ہمارے گناہ پتے ہی سے ہا، ہی قسمت میں کیسے ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب۔ بیشک  
 معتقد۔ اور جو کچھ ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے اگر وہ ہم نہ کرنے تو ہم خدا کی حکم عدولی کرتے۔  
 مولوی صاحب۔ حکم عدولی کے کیا معنی۔ خدا نے حکم بغیر ہم کچھ کہی نہیں سکتے۔

معتقد۔ پھر ہمارے گناہوں کی سزا کس کو ملے گی؟  
 مولوی صاحب۔ تم کو اور کس کو؟  
 معتقد۔ میں نے تو جتنے گناہ کئے ہمیشہ مجبور و ناجار ہو کر کئے۔  
 مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) چپ رہو تم۔ بڑے آئے وہاں مجبور و ناجار ہو کر گناہ کرنے والے۔

معتقد۔ پھر آخر کیا فائدے کرتے کرتے مر جائیں، مذہب روٹی دیگا۔  
 مولوی صاحب۔ روٹی خدا دیتا ہے۔ صبر کرو۔ شکر کرو۔ ہر حال میں اُس کے سامنے سب تسلیم خرم رکھو۔ ہر بات میں اُس کی نصیحت پر قائم رہو۔  
 معتقد۔ (خفے میں) مرے کو سب ہی مارتے ہیں۔ مذہب غریبوں کو یہی سکھاتا ہے کہ بس صبر کرو، شکر کرو۔ مذہب امیروں کو کیا سکھاتا ہے؟  
 مولوی صاحب۔ یہی کہ صبر کرو، شکر کرو۔ غریبوں سے ہمدردی کرو۔  
 معتقد۔ تو بس مذہب امیروں کے لئے ہے، جو صبر و شکر کر سکتے ہیں۔  
 مولوی صاحب۔ لافنت اللہ، کیا کہنے ہو تم۔ مذہب تمام خلق اللہ کے لئے ہے۔

معتقد۔ غریب کا مذہب تو روٹی ہے، آپ کے قانون میں چوری ناجائز اور بھوکے کے قانون میں چوری جائز ہے، آپ کے قانون میں صبر و شکر اور بھوکے کے قانون میں چین جھپٹ۔  
 مولوی صاحب۔ مذہب سب کے لئے ایک ہے۔

معتقد۔ او، یہی اس کی کمزوری ہے۔  
 مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) دو۔ ہر تم شیطان۔ بھکانے چلے ہو بھوک، مذہب و فکر شیطانی شفعے ہیں، جن سے مذہب کی طرف سے شک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ نلاٹھے ہیں!

معتقد۔ (طعنے سے) جی نہیں آپ تقلید و تعصب سے اپنی مذہبی بنیادیں مضبوط کرتے رہے!

معتقد نے بڑے خطرناک طریقے سے مولوی صاحب کی ڈاڑھی کو گھورا۔ مولوی صاحب کچھ سمجھ گئے اور فوراً چمچ اٹھے۔ آنکھ مل گئی، اس کے سینے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی، حقہ جل چکا تھا۔ مولوی صاحب آنکھ ملنے ہوئے آنکھ کھڑے ہوئے۔

بھگوت شیطان درغلانے چلا تھا ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے باپ و دادا کے مذہب پر قائم رہا۔

مولوی صاحب نے احتیاطاً تکیہ اٹھا کر دیکھا کہ شاید نذر کار روپ اُس کے نیچے ہو، لیکن وہ گستاخ شیطان اپنے ساتھ ہی لیتا چلو گیا تھا۔  
 دیکھی نہ آپ نے بے ابائی!!

فکھہ  
 بنو یحییٰ کا سلسلہ جادو پر کجا اب  
 پیر پری بابا اس مشہور سبز چادر پہننے والے  
 وقت اگر صبح میں کوئی غم جانتے ہوئے  
 - زندوں سے پیتے تھے تھی بے ہوشانہ نگاہ -  
 (راجپوت)

# طوائف سے خطاب

اے طوائف! اے حسین راہِ ظلم رنگ و بُو  
 ہیں گنہگار تیرے لب سے نوش میں  
 تو کہ ہے تاریک و صبیہ دامنِ آفساق پر  
 معصیت کے دلوے پہناں اداؤں میں تری  
 بے حجابانہ بھی تو جلوہ گر ہے بام پر  
 اور کبھی تاریک خلوت میں نظر افروز ہے

کس قدر بیزار ہے اپنی انسانیت سے تو  
 سیکڑوں فتنے مچاتے ہیں تری آغوش میں  
 برق بن کر کوندتی ہے خرمنِ اخلاق پر  
 بیوفائی کی جفاکاری و فادوں میں تری  
 برق سنس سنس کر گراتی ہے دلِ ناکام پر  
 جس جگہ ہے تو غرض اک برقِ عالم سوز ہے

دل کو دام کیسے بچاں میں کس لیتی ہے تو  
 یہ تری نازِ آفرینِ قہر کی تہید ہے  
 قابلِ لعنت ہے تیرا غم بھی تیرا عیش بھی  
 شاہکارِ اطمین کی صنعت کا تیرا ہست و بود  
 اور جہنم کی حیس، یوہی نظر پرور چٹیل  
 راج ہے ظلم و ستمگاری کا تیرے دلیں میں

بے وفاناگن گھلے بل بل کے دس لیتی ہے تو  
 شام جس کی شام غم ہے، تو وہ صبح عید ہے  
 نوش میں اپنے چہرے رکھے ہیں تو نے غیش بھی  
 عالمِ انسانیت کو ننگ ہے تیرا وجود  
 نوجوانی سیکڑوں کی مٹ گئی تیرے طفیل  
 موت کی رہبر ہے گویا زندگی کے بھیس میں

منہجی ہے تو سرِ بازار اپنی زندگی  
 زلفِ مشکیں کی سیاہی، عارضِ زیبا کا نور  
 آنکھ کی مستی، شرہ کی تیغ، ابرو کی کسلاں  
 ہمنامی کی تنہا، خود نمائی کی ترنگ  
 منہجی ہے اپنا جون، منہجی ہے اپنا راز  
 جذبہٴ انسانیت کی عصمت و پاکیزگی

زندگی، یعنی شباب و شوق کی تابندگی  
 قد کی رعنائی لبوں کا رس، محبت کا سرور  
 جسمِ نازک کی بچک، کیفِ آفریں انگڑائیں  
 کسنی کی شوخیاں، اُسنی جوانی کی اُنگ  
 اپنی فطرت کی بلندی، اپنے دل کا سوز و ساز  
 اور انسانیت کا جو ہر روح کی دوشیزگی

تیری فطرت خود ہی تجھ سے برسرِ پکار ہے  
 رحم کر اپنی طبیعت پر کہ وہ بیزار ہے

# مقارِ وقت

## کانگریس اور لیگ!

نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بہتر تعلقات کی بحالی کی پھر اک سلسلہ جنماتی ہوئی ہے جسے معمولی سابق اس مرتبہ بھی پیام صلح کے ابلاغ کا سہرا پندت جواہر لال نہرو ہی کے سر پہ: نزاع پسند و جدل شیوہ مسٹر جناح کو یہ فتح اور عالی ظرف و آشتی طلب بہتر کو یہ شکست، مبارک ہو! بیا کہ ماسپر انداختیم گر جنگ سرت!

جواہر لال ماسر انداختہ اندر دم کا جری قلب مر و بیدار ہے اور نرم کی دل گد اخستہ شمع محفل! سے مصافحہ زندگی میں سیرت فولا و پیدا کر نسبتان محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا! الغرض خاک و وطن کی بین الملل کشیدہ تعلقات کی فضا میں چنگاریوں کے ساتھ اگر کچھ کلیاں بھی چلیں تو وہ بھی لعل و جواہر ہی کے پنجہ مرجان کی گلریزی سے! ح

خالی اس عقدہ ہم اذروئے نگار آخشد! نواب صاحب چغتاری اور نواب محمد اسماعیل خاں صاحب اور متحد دیگر اکابر مسلم لیگ نے کانگریس پریسیڈنٹ کی اس شاخ زیریں کو اسی طرح فدا کیا جیسا کہ قبل جزاء الاحسان الا احسان کا شیریں تقاضا تھا: رہا نیدی مرا از شہر لیگی جو پیو دی پیایے جام مے را! لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہر دو موصوف العذر نواب صاحب مسلم لیگ کی سیاسیات کے نہ مخفی گوشوں سے واقف ہیں نہ لیگ پریزیڈنٹ نے وکیلانہ ہمتکنڈوں میں رواں: چنانچہ اول الذکر بزرگوں نے پندت جواہر لال نہرو کے پیام محبت و اخوت کا جواب اُس کی قدرتی صدائے بازگشت کی صورت میں دیدیا، اور مسٹر جناح کے فن گریز سے کام نہ لیا جس کا اک شاہکا خود پیرمناں نے اپنے بیان کج مع زبان میں پیش کیا ہے! ح

## ادارہ کلمہ

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی! چنانچہ مسٹر جناح نے سر اسید ہو کر سب سے پہلے اک جہلت کی ضرورت کا اعلان کیا، اور دوسرے یہی پیونج جانشکی اک شرط ماقبل کا: کیا سچ ہم ایسے ہی پیدا در واقع ہوئے ہیں کہ اگر ناگہانی طور پر ہم سے کوئی جارے مطالبات پوچھے بیٹھے تو ہم اپنے حواس بجا کرنے کے لئے اک پورے ہفتہ عشرے کا وقت مانگیں! اور اک بصیرت نفس و ثبات عقل جواب دینے کے لئے پہلے اپنے گھر پیونج جانا ضروری قرار دیں! کیا مسٹر جناح اپنے مشہور ہندوستان نہ انکات اسی طرح بھول گئے جس طرح کہ پریزیڈنٹ وکسن اپنے شہرہ افات (Fourteen points) نذر قعر واداسنی کر چکے تھے! ہم لیگ پریزیڈنٹ اور سبھی کے رجز خوان کارزار عداوت و گھبرائی کو ان کی حاضر و ماضی اور بدیہ گوئی پر مبارکباد دیتے ہیں! اچھی حبس سے!

کیا آل انڈیا مسلم لیگ کا سالار کارواں اور اسلامی ہندوستان کے سیاسی و ثقافتی مستقبل کا محافظ و صورت نگار اُس معضلہ خیز و قابل رحم خود فراموشی کی نظیر واقع ہوا ہے جس کا انگریزی پیرایہ انہار یہ پایا جاتا ہے کہ وہ خود نہیں جانتا کہ وہ۔۔۔ کیا جانتا ہے!۔۔۔ حضرت جناح کے لئے اب شاید یہ مقام فنا و فراموشی کچھ زیادہ دور نہیں کہ سے

ہم دہاں میں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی! قربان جائیے مسٹر محمد علی جناح کے اس قول کے کہ کانگریس ہی بتائے کہ وہ ہمسالوں کو کیا دینا چاہتی ہے؟ گو یا خود ہمارا کوئی مطالبہ یا تقاضا نہیں جو کچھ ہے آپ کے عطیہ و داد کا معاملہ ہے! بالفاظ دیگر راضی برضا سائین کے حقے کا تعین بھلی کی خیاضی کا طرف ہے! کیا یہی ہے مشہور زبوں مسلمان ہند کے ان علم الاثن و بلند بانگ مطالبات و تحفلات کا جن کی تکرار و تہنیت ہزار بزرگ علم ہند کو سنا رہا ہے، اور جن کے دروسے مسٹر جناح کا سینہ اسلام آئینہ انی مقبب آتشہ بنا رہا ہے! سے

بیت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرہ خون نکلا؛  
 کہا جاسکتا ہے کہ خود پنڈت ہنر و ادب باب کا نگریں کے لئے بھی تو  
 مسلم لیگ کے مطالبات و شکایات اسی طرح اظہر من الشمس ہو سکتے تھے۔  
 لیکن اُدھر سے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نیشنل کانگریس نے اپنے سالانہ  
 اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۴۷ء میں ان سب چیزوں کی، منہ شے دانہ کے، اپنے  
 مشہور و معروف اعلان حقوق اساسی میں تسلیم و ضمانت کر دی ہے۔  
 جس کے بعد بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے ایک شخص یہ سمجھنے سے اپنے کو قاصر و  
 عاجز پاتا ہے کہ اب کیا رہ گیا ہے جس کے بارے میں اک عہدیدہ میثاق کی گفتگو  
 ہے؟۔۔۔ لطف یہ ہے کہ پنڈت ہنر و ادب کی طرح غضبناک و غناک، تشنہ و گرسنہ  
 مسٹر جناح کے لئے بھی آخر کار یہ اک رازِ سرستہ ہی ثابت ہوا کہ لیگی مسلمان  
 کیا چاہتے ہیں؟۔۔۔ اور جس پر وہ جہانتا گناہ سہی سے اپنے حافطے کے تازہ  
 کئے جانے کے لئے استدعا کرتے ہیں؟۔۔۔ بڑا مزہ ہو اگر گاندھی جی، مسٹر جناح  
 کے دماغ کی لوحِ سادہ کے سامنے اپنا کبھی کا۔۔۔ بلیک جیک پیش کر دیں؟  
 غریب جناح کو اس پر کال آفت جواہر نے آخر کس شش و پنج میں گرفتار کر دیا؟  
 پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی تبادلاً، کہ ہم سبتلا میں کیا؟  
 تاہم کانگریس پر پریذیڈنٹ کا یہی اصرار ہے کہ ہاں مسٹر! بتائیے کہ آپ  
 کیا چاہتے ہیں؟ جناح بالآخر اک دور کی کوڑی لاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ  
 اگرچہ کانگریس کے بظاہر ممکن قلب بیانات مجھ پر پوشیدہ نہیں، لیکن میں  
 اس موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ کانگریس کو وہ شہ نشین حاصل  
 ہو گئی ہے کہ وہ اس مہم کے ترجم خسران کے سے اعلانات کو اقلیتوں کے سامنے  
 اُن کے لئے منظر ہائے آذاد ہی کی شان سے پیش کر سکے!۔۔۔ کیا ہی دو گونہ  
 رنج و عذاب ہے! بیوتار و آبرو باختہ ہندو جہاں بھاکا کوئی حقیر و ناچیز نہ کہ  
 اگر کسی کوئی گزشتہ کی ذل کا مستعبانہ کھ کھدیتا ہے تو بھگت و ان چند بیوہ و  
 دُور اذکار حروف کے تلفظ کے اسلامی ہندوستان کا سارا مہیب مستقبل متزلزل  
 ہو جاتا ہے! لیکن جب ملک و وطن کی غلیظ ترین سیاسی ترجمان، اور پورے ستا  
 عوسجاتِ مملکت ہند کی فرمانروا قومی جماعت انتہائی ممکن متانت و احاس  
 اہمیت کے ساتھ اک ہر گیر اعلان حقوق شہریان کانگریسی ہندوستان کرتی  
 ہے تو وہ اک پزیرش کے برابر وقت نہیں رکھتا!۔۔۔ گویا تم بحیثیت دشمن کے  
 ہر لٹاک تو ہو، لیکن بطور دوست کے پشت چاہہ قطعاً نہیں! ج

حیران ہوں مر بی سداں کو کیا ہو!۔  
 شکل یہ ہے کہ مجبوریت معاہدہ کانگریس ہی قوم ہند کی طرف سے مجوزہ  
 صلح نامہ پر دستخط ثابت کرے گی، لیکن اگر مسٹر جناح، ہار ایٹ لکے دار العدل قانون  
 میں ایسی ہی مردود الشہادت واقع ہوئی ہے تو اس کا اک تحریر ہی میثاق بھی کس  
 کام آئے گا؟۔۔۔ ابھی تک مسٹر جناح ہی فرمایا کرتے تھے کہ برطانوی حکومت  
 اور کانگریسی جماعت کے علاوہ مسلم لیگ بھی سیاست ہند کا اک عنصر ہے،  
 لیکن شاید اُن کی لارپورٹ کی تازہ ترین نظریہ ہے کہ مسلم لیگ کو، ہموادگیر  
 نظر نہیں آتا!۔۔۔ اللہ اللہ، لمن الملک المیوم! اللہ الواحد القہاد!  
 کانگریس پر پریذیڈنٹ اس مہم کی باخود گرفتاریوں اور رجز خوانیوں  
 اور بلند بانگ لیل لڑائیوں پر بجز اس کے کیا کہہ سکتا ہے کہ ج  
 رُو تو خوش باش کہ ماگوش بہ الحق مذہم!  
 مسٹر جناح نے تانا شاہی کالوں سے پنڈت جواہر لال کے پیام الفت  
 کی سماعت کی ہے! پنڈت جی کے الفاظ آغاز خطاب ہی میں یہ ہیں کہ ہم اقلیتوں  
 کے قلوب میں نفوذ اعتماد کی خاطر مددِ عدل سے متجاوز بھی ہو جانے کے لئے  
 تیار ہیں!۔۔۔ تاہم جناح کو ہنر و ادب کی اس جگہ داری و دلداری کی مطلق قدر  
 نہیں ہوتی، بجائے اس کے وہ پنڈت کے متعلق تو بہ و انا بت کی گفتگو کر کے  
 اک متقیانہ لذت نفس حاصل کرنے کے ورپے نظر آتے ہیں! ہم بیٹی کے ان  
 حضرت ذوالجناح کے کرشمہ مغلوب انقلابی پر ایمان لاتے ہیں، لیکن ان سر  
 پرستانِ اتفاق و اصلاح سے بادب پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر ج  
 تو یہ فرمایاں چرا خود تو بہ کتر ہی کسند؟  
 پنڈت ہنر و ادب نے اک نہایت درد مندانه شکوہ رنگین کیا تھا کہ مسٹر  
 جناح کی مدد میں اور جو چاہے ہو، لیکن کوئی دستاورد ادا تو نہیں ہے!۔  
 عہدہ جو جناح کو دیکھنے کے اتنی سی بات پر تنگ گئے! فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ لکھ  
 کانگریس پر پریذیڈنٹ نے اپنے سارے بیان کو خراب کر لیا!۔۔۔ اللہ اللہ  
 یہ نازک مزاجی اور زود رسخی! ہم پنڈت جی کو مشورہ دیں گے کہ وہ جلد جلد اس  
 شعر کی تکرار کریں کہ:۔۔۔  
 از شکوہ نبس کلم کہ دل یار نازک است خُئے کرشمہ نازک و بسیار نازک است!  
 مسٹر جناح کو پنڈت جواہر لال کا پیام مصالحت و مفاہمت سننے ہی اپنا  
 گھریا دیا، گویا اُن کو یہ گھبراہٹ بزم اک اعلان جنگ کی طرح مسرور ہوئی!

مگر خیر نہ تہ نہ اپنے بول زدہ حریف کئے تا بخاند باید در ساندہ کا انتقام  
حجت بھی قبول کیا؛ لیکن بی بی پشکر بھی جناب جناح کے ہوش و حواس بجا ہوئے؛  
سمجھوتے کے چیلنج تھا پہلا جواب جو انہوں نے دیا اس کی غایت یہ معلوم ہوتی  
ہے کہ معاملہ صاف صاف گفتگو کے کھلے میدان سے سازشی رازہ نیاز کے  
منہج گوشوں میں منتقل ہو جائے؛ مسٹر جناح کا فرمودہ ہے کہ ہندو مسلم مسئلے  
کی عصمت اخبارات و جرائد کے کوچہ و بازار میں رُسوا کی جانے کی چیز نہیں،  
جناح کی پردہ نشینی اور چوہاہر کی میدان داری میں کتنا تفاوت راہ واقع  
ہوا ہے؟

بنا دھن کہ بند و نقاب در خلوت بہ راز عشق کہ آید برہنہ در بازار  
بزم خاص کی اس سینہ بہ سینہ گفت و شنید کے آخر معنی کیا ہیں؟ یہ امر  
محتاج بیان نہیں کہ مسٹر جناح انگریزی کی اس اخلاقی مشل سے واقف ہوں گے  
کہ کوئی ایسا کام نہ کرو جسے تم چھپانا چاہو! — ہاں کھیا میں گڑا چھوڑنا  
مردانِ بیباک کا شیوہ نہیں؛ کیا مسٹر جناح کو یہ اندیشہ عارض حال ہے کہ اگر  
نذاکراتِ مسلح، سر میدان ہوئے تو مسلم بیباک اس بات کے اعتساب کا موقع  
پائے گی کہ مسٹر جناح عامہ مسلمین کے کیا مطالبات و مقاصد پیش کرتے ہیں،  
اور کس پیرس غربائے ملت کے حقوق کی وکالت سے کس طرح جہدہ برآہوتے  
ہیں؛ ظاہر ہے کہ ان محرومانِ اذلی کے لئے کاؤنسل کی نشستوں، اعلیٰ کاری  
منصب کی تفسیروں، صوبہ جاتی وزارتوں کی شرکتوں کے قصبہ ہائے نام نہیہ کوئی  
درمان درو نہیں ہیں، لیکن ان کے جو مطلوبات و ضروریات ہیں وہ خواہیں  
قوم کی دولت و ریاست کے لئے جانتان ہیں — پھر عین یہ وہی چیزیں  
ہیں؛ فیصل کا ٹکڑا جس کی عمر دار ہے؛ اب مبغوض و مطعون ہندو کانگریسیوں  
کی طرف سے عام ہندوستانی خلق اللہ کی سیاسی و معاشی نجات کی حزن  
و حکایت کا چھپرنا، اور جناح و چھتراری کی بارگاہوں سے وزارتوں کی  
داد و ستد کے مول تول ہونا، ایسے عبرت انگیز ماجرے ہوں گے جن کا بے نقاب  
تناش مسلم عوام پر شدید ترین خطرات سے ابریز ہو گا؛ پس یہ امر ناگزیر ہے  
کہ پاک بلٹ فارم کے گرجنے والے، اسلامی حقوق کے دکلائے مطلق، اپنے  
شرمنگ راز ہائے درون پردہ پر اک گہری نقاب پڑی رکھنا پسند کریں؛  
و اعظاں کیس جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بہ خلوت می روند آن کا دیگر می کنند  
پس کیا تعجب ہے کہ جب پنڈت ہنر و نے راز ہائے سینہ گداز کے حامل

جناح آئندہ کو کولکارا کہ بولو کیا مانگتے ہو؟ تو ان کی گفت زدہ زبانیں اک  
پراسرار تخیلہ لب کرنے لگیں؛  
عقل بیانہ جو سپر انگند درم گرفت در عرصہ کوشش غم کرد راستے؛  
ہماتا گاندھی کی طرف سے تجاویز پیش کئے جانے کا استعنا جس کی  
اثر آفرینی مسٹر جناح نے کی ہے، یہ بھی اک دھچپ مافی الضمیر کی غماز نظر آتی ہے؛  
کیا یہ گاندھی جی کے ہاتھ سے ان کا موعودہ بلیک جیک سمیتانے کی اک رائے  
پسند آ رہی ہے؟

برنابائے حرفی خندہ می آید مرزا!  
پہر حال مسٹر جناح کے "نقاط چار دکانہ" کا سارا تخم دفتر اک لوح  
سادہ "بن کر رہ گیا ہے؛ انہیں مطلق یاد نہیں رہا، کہ وہ کیا چاہتے ہیں، وہ  
ہر راہگیر سے چاہتے ہیں کہ ان کا حافظہ تازہ کر دے؛ بالآخر وہ گاندھی جی  
سے اپنی آرزو وابستہ کرتے ہیں، اور بے تکلف کہتے ہیں کہ  
دست بکش جانب ز نسبیل ما مرحبا بر قوت ہا زوئے تو!  
مسٹر جناح کی ایک شکایت والند کہ بڑی قابل ہمدردی ہے؛ یعنی  
صوبہ جاتی حکومتوں کی کانگریسی وزرا، توں میں مسلم لیگی اُمراء و عمائد کا نہ لیا جانا؛  
جہاں جہاں ارکان لیگ و ذراہ بنائے گئے ہیں وہاں "فتہائے لیگ" کے  
فیوے کی رو سے انہیں اک سیاسی ارتداد "پر مجبور کیا گیا ہے؛" میناق کانگریس  
پر دستخط کرنے کی یہی تعبیر حکمائے لیگ کرتے ہیں؛ لیکن کانگریسی کا مینہائے  
وزارت کا تعمیر و اصلاحی و تخلیقی پروگرام، خدمت خلق کا مبارک عنوان رکھنا  
ہے؛ اگر اس کی تائید اور تعاون بھی کوئی سیاسی معصیت ہے تو اہل کانگریس  
کو لاابان و راجگانِ سل لیگ کی پاک دامنیوں کی مطلق ضرورت نہیں؛  
اذ آن گنہ کہ نشے رسد بغیر چہ پاک؟

سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ امر شرمناک ہونا چاہیے کہ وہ  
کانگریس بیچ "کو قبول کرنے کے معاملے میں کسی ترغیب و تلقین کے ضرور مند  
ہوں؛ کانگریسی حکومتوں کا لائحہ عمل خدمت خلق، اک "ضالۃ المؤمن" انگیز  
متابع نمونہ ہے، جس پر اسے بیک نظر لبیک کہنی چاہیے؛ کیا اصلاح و بہات  
تعمیر شوارع، چاہ کئی، دستگیرچی قرضداران، پشت پناہی کا شکاران، تعلیم  
بانخان، انب و مسکرات وغیرہ وغیرہ ایسی نامشہ فی عنایتیں ہیں جن کے لئے  
وابستہ ہمدردی و امداد رسانی ہونا، ناقابلِ بخشش اسما ہے؛ گویا اک سرنگی

کونسی جی کا یہ اک الٹا کھڑا ہے کہ وہ ایسے معاصد شومہ و کاروبار بھونچے  
میں اک فریق بنے!! ع

ہیں کہ ان کے بڑی دی ویا کہ پیوستی!!

ارکان و اعیان سلو لیک، اور عوام کا انعام سے یہ ذلت آفرین ہر شکی  
عامتہ انسان کی خدمت ہم کریں گے تو سیکڑوں روپیہ ہمارا کرائے کی کوٹھیوں اور  
لاکھوں روپے کے مصارف تعمیر سے بنے ہوئے تصور و محلات کے حتماً آٹنا کے اندر  
و ادیش دے کر ثقافت اسلامی کے نوزوں کی بقا کا اہتمام کون کرے گا!! یہ  
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حالت مست، بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بندہ ابھی  
عوام! — اتنے غمناک! ان کو کون اشراف نہ لگا سکتا ہے!! پھر بتائیے  
کہ کانگریسی مخبروں کی یہ گمراہ گری کیوں کر معاف کی جاسکتی ہے کہ مسلمان عوام ان  
میں بیداری و حقوق طلبی کی تحریک کا پرچم کھول چکے ہیں!! یہ ناشدنی کینے  
جب جاگ جائیں گے تو جناح و محمود آباد کے صیڈ بول کیسے رہیں گے!! پس  
کانگریس کا فزائش "شعبہ رابطہ عامہ سکین" کا برلیگ کے لئے اک ساد  
موت، بلکہ اک نفع صورت سے کم نہیں! لہذا اس شعبے کا اقبال، مسلم لیگ کے  
ساتھ فتح باب گفت و شنید کی اک شر و عظیم ہے! طمبر دار عوام کانگریس اپنے  
درد و سوز کو شکم سیر و فٹل نا آشنا رہا باب لیگ کے سامنے بجز اس رجز اقبال  
کے اور کن کلمات میں بے نقاب کر سکتی ہے:

خواجه از خونِ رگِ مزدور ساز و خیلِ ناب و ز جفائے وہ خدایا یانِ کشت و بہقانِ خزا  
الغلاب! الغلاب! الغلاب! الغلاب!!

حکومت پرست اصحاب لیگ کو وزارتوں میں داخل ہونے کا کتنا شوق

ہے، اور ع

اُن ہم سبھی غمزہ مردم شکار دوست!

تاہم کانگریسی جماعت و وزراء کے ساتھ اک جدید ہندوستان کی تعمیر  
کا سنگ بنیاد رکھنے کے کام میں ہاتھ بٹاناک سے کم اقدانے آئین و شرافت  
تھاجس کی توقع نہ کر گئے مسلم لیگ سے کی جاسکتی تھی۔ مگر نہیں، یہ بزرگ قواب  
صاحب جھٹاری اور لڑا باب محمد یوسف ہالقا بہ بن کر قصر وزارت میں سریر  
آرائے حکومت ہونا چاہتے ہیں! یا بد مذاق پنڈت پنٹ اور رہبان مزاج  
راجہ گوپال چارنیر کی طرح "عوش وزارت پر سبھی چاراند بیگارت کی اذلی بد بختی  
کی رُسوائی پیش کرنا چاہتے ہیں!!

ماہر تو آفتابِ حُسن از لیسیم فرزندِ ایم آدم و حوا را!!  
ایسی غاصب از آہنگ صدا بن کر یہ حضرات کانگریسی ساز و دھارت  
کے پردوں میں گھٹ چاہتے ہیں! تاکہ موجودہ فضا کے ملک کی گھبراہٹ سعادت  
کو اک سامع خواش شور و شتابِ تخریب میں منتقل کر دیں! — لیکن ع

سہاد! اس مجھ لیا رب غم از باد پریشانی!  
پنڈت ہنرو نے مسٹر جناح کے بے سرو پا بیان پر فرمایا کہ لیگ پر بڑی  
کا موقف ناقابلِ فہم ہے! — لیکن اس شکل آفرینی کے لئے پنڈت جی کو اپنا ہی  
ممنون ذوق ہونا چاہیے! سوال یہ ہے کہ آخر ہر چیز قرین عقل اور مطابق منطق  
کیوں ہو!! فرقہ پرست و ہنسیت، اختلاف و داعی کی بدترین قسم ہے! دراصل ان  
لوگوں کے دل بدنیت ہوتے ہیں! اس بد اندیشی کو نبھانے کے لئے انہیں اپنے  
دماغ کو لامحالہ معقول بنانا پڑتا ہے! یہ

اچھا ہے دل کے پاس پہا سہا بن عقل! لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے!  
تاہم یاد رہے کہ فرقہ پرست، فرقہ پرست بھی نہیں ہوا کرتے! بقول پنڈ  
جواہر لال کے "مخلصانہ فرقہ پرستی کی تسکین ممکن ہے! بلکہ فرقہ پرستی کے منتشر اجزا  
کو ہم آہنگ و ملحق کر کے ہم اک مربوط و مضبوط قومیت کا پیکر ڈھال سکتے ہیں! —  
لیکن ہیبت کہ متعارف فرقہ پرستی انہی ہی بُرائی پر قائم نہیں، حقیقت نفس الامری  
یہ ہے کہ ہمارے متعارف فرقہ پرست دراصل "خود پرست" واقع ہوئے ہیں! جب  
راژ ورون پردہ یہ ہے تو آپ اُن کی آڑی ترچی چالوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں!  
وہ ملت پروردی کی عبادتِ قبا پہنکر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور ہم اس ہر وہ  
سے دھوکا کھا کر ان کے نقاب کی پرفرب بافت ہی کو اُن کے روئے زیبائے  
اصلی خط و خالِ فرض کر لیتے ہیں! لیکن پھر سوائے اس برائے نام تلاش کے کوئی  
دوسری چیز ان کے ادھاسے مطابقت نہیں کرتی، اور ہم ان ہر وہیوں کے  
ایک ایک سوانگ پر انگشت بدندان رہ جاتے ہیں! اُن کے سانپ کے سٹے  
ہماری گرفتِ ذہن میں آتے ہی نہیں! اُن کا ایک ایک قول و فعل اک حبیبانِ  
جانستان ہے! یہ

بلائے جاں ہے غالب اسکی ہر بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا!  
ہمیں معلوم ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے مسلمانوں اور وطن کی تمام  
دوسری اقلیتوں کے حقوق و مصالح کی پیش از پیش ضمانت اپنے "مشو حقوق"  
میں کر دی ہے۔ مگر یہ تو ان جماعتوں کی داد دی ہوئی، ان جماعتوں کے

خود ساختہ لہڑوں کو کیا کاٹا؟۔۔۔ جب تک آپ ان ڈولوں کو ان کی  
"دستوری" نہ دیں گے وہ یہ سودا نہ بنے دیں گے! پولٹیکل خائف ہوں کہ یہی  
نکاح ہوتے ہیں، اور وہ بھی اتنے ہی غوطہ خیز و بیدار ہوتے ہیں جتنے کہ مسجد  
کے قضا،۔۔۔ جنہیں صرف اپنے صوفے مانڈے سے کام ہے، مردہ جنت میں  
ہائے کے دوزخ میں!

"راجندر جٹا میثاق کی طرف، ایک ملن دشمن اساس مناجت کی  
حیثیت سے، موت دے جانے پر شرمندہ علی جناح نے جو: شاد و فریاد بھی  
عدالتی منطق کا ایک دلچسپ نمونہ ہے! جناب قانون پناہی فرماتے ہیں کہ  
"یہ ایک بہانہ عظیم ہے کہ میں نے کبھی اس مجوزہ معاہدے کو قبول کیا؛ میں نے  
اس کے شرائط کو تسلیم کیا کہ اسے پیش کر دینے کا صرف وعدہ کیا تھا،  
بشرطیکہ دوسری طرف دکھائے کانگریس عام ہندوؤں اور سکھوں کو اسے  
منظور کر لینے کے لئے رو بہ راہ کر لیں، جو وہ نہ کر سکے!"

یہ کتنی سرد ہر اور گریز آئینہ گفتگو ہے! جو لوگ اجمیرین و نازک ترین  
جہات قوم و وطن کے ساتھ یہ سلوک روا رکھ سکتے ہیں، ان سے ان مشکلات  
میں کسی دستگیری کے ہم پہنچنے کی آرزو ہم نے وابستہ کی ہے؟

ہم کو ان سے وفا کی ہے! مسید جو نہیں جانتے وفا کسب ہے!  
مذا شاد ہے کہ یہ مقدسین اپنے اعماق قلب میں اس اٹل و ثقیف  
کا ورد کیا کرتے ہیں کہ خدا نہ کرے کہ فریق مقابل کبھی آمادہ صلح ہو!۔۔۔  
اس سے سسل لڑوں کا کام تو ہو جائے گا، لیکن ہمارا؟! مقدمے کا "راضی نامہ"

اک نزاع پیشہ اور گنہگار خزانہ فیس وکیل کے لئے حکم سزائے موت سے کم  
نہیں! حضرت جوش نے چند ہی روز اصرار پر اشادات میں لکھا تھا کہ  
"اگر کانگریس کے ارہاب صل و عقد نے کبھی امتحان ہی ان "بیگیوں" سے کہہ

دیا کہ جو ممکن مطالبات و تحفظات چاہے لے لیجئے، اور پورا اطمینان دل  
حاصل کرنے مشترک میدان جنگ آزادی میں ہمارے دوش بدوش اتر آئے  
تو آخر الذکر بزرگ نہ بغلیں جھانکے لگیں تو میرا ذمہ:۔۔۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ مردان لیگ کی آزمائش کا وہی روز بد آگیا! پنڈت جواہر لال  
لاکھ کہا کریں کہ ہم مسلمانان ہند کی اقلیت کے قلوب میں اعتماد نفوذ کرنے  
کے لئے مدد و عدل سے بھی آگے جانے کے لئے تیار ہیں، لیکن لیڈران کو

اس سے کیا؟! ان لئے اول الذکر وعدہ "اتنا خوش آمد نہیں جتنی کہ

ثانی الذکر وعید" (دراہم شرکت مقدمہ محاذ جھٹ پرٹش اسپر بیڈم!)  
وحشت خیز ہے!۔۔۔

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اپنے شیخ ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے!  
لڑاب صاحب محمود آباد و لڑاب صاحب چٹاری، اور بر ملا لڑی  
قیصریت کی صف مخافین میں اتار دیا!۔۔۔

منہ کرتا ہے مجھے یار کے گھر جانے کو؟ ہاں صبا آگ لے اس ترے سمجھانے کو!  
چنانچہ کانگریس پر بیڈنٹ کے آخری ملن اتمام حجت کی پیش بندی  
بھی یار لوگوں نے جلدی جلدی کر لی۔ حضرت فخر الملتہ کی تیغ ذوالفقار۔

اخبار دیندار۔۔۔ لکھتا ہے کہ مسٹر جناح کے سارے نقاد چار و گیارہ  
پر بھی اگر ہر تصدیق و توثیق ثبت کر دی جائے تب بھی مسلمان کے درد کا دوا  
نہیں ہوتا!۔۔۔ جب تک کہ ہندوؤں کے دلوں میں ان کی بدخواہی موجود

ہے، اور ان کی زبانوں پر "بندے ماترم" کا نعرہ!۔۔۔  
آپ سمجھئے؟ اب یہ سودی مرض، مایوی لالی و ہم کی زبونی تک متجاوز  
ہو رہا ہے جس کی دوا، مشہور طبی مقولے کے مطابق "افلاطون کے دارالشفائیں

بھی نہیں!۔۔۔ اللہ اللہ ان فرزند ان حیدر و جگر گوشگان خالد نہکا  
بول دل! ادھر کسی کانگریسی نے عادت کینٹ میں آکر "بندے ماترم" (سلام  
علی ام البنات) کی گھانا گنج و عقیدت فرزند ہی بندی، اور ان افلاطون

محمود غزنوی و نادر شاہ افشار نے ایران و تورمان میں جا کر دم لیا!۔۔۔  
ذرا شرم کر دے مسلمانان ہند!۔۔۔  
جس باپ کے بیٹے ہو بڑا نام ہے اُس کا

کہلاتے ہو دنیا میں تم اسلام کے فرزند!  
ہیں خوف ہے کہ اب چند ہی دن جاتے ہیں کہ "مسلم ثقافت" کے یہ  
امانت داران اہل کانگریس سے یہ فرمائش کریں گے کہ "مسلم" ہیں استیجا

و آبدست بوا دیا گئے، اس لئے کہ ہاں سبھائی ہندوؤں نے جو یکسر مسلم  
کش و اسلام سوز و غما پیہا کر رکھی ہے اُس میں ہم علمبرداران تہذیب اسلامی  
کے نازک دست و ہاڑو کے لئے ان شعار شریعت کا بلا امداد انجام دینا

دشوار ہو رہا ہے!۔۔۔  
تفت بہ جمعیت تو، تفت بہ پریشانی تو!  
اُت کُند غیر تبسم بہ مسلمان تو!  
(۱-۱۸)



تک زمانہ امن کے پرسکون نظم و نسق کو اک دور مارشل لا میں منقلب کر دینا  
— اس عذاب کی تاب خود فاسٹ ڈکٹریٹروں کے آہنی اعصاب  
بھی کب تک لاسکیں گے؟

گرم تاکے مہاندیس بازار؟!

”فاسٹرم“ عبارت ہے دیواستبداد کی اُس آخری پا کو بی سے جس کے  
بعد ہی وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ دے گا۔ اور عیسائی حکومت ملبردارانِ جمہوریت  
معاشرتی کے سپرد کر دے گا! ع

خوش بود کہ اس آمد و خوش بود کہ آل رفت!

(۱) فلسطین: اس ملک پر برطانوی سیاست کی وسیع کاری  
اک اور افسوس پڑھنے کی قسمت آزمائی کر رہی ہے۔ سابقہ مامورِ کمریشن  
کی بلند ہانگ روئے داد کے تقویم پارینہ ہو جانے کے بعد، خیر سے اک اور کین  
مزید مطالعہ حالات اور بہتر ”تدبیر امر“ کے لئے بھیجا گیا ہے! کیوں نہ ہو! قیصر  
کا لہجہ مکرو فریب کہیں خالی ہو سکتا ہے! — تاہم یاد رہے کہ نوخیز  
وائٹش ریز مہابدین ”ارمن صلاح الدین“ جموٹ کی اس پوٹ کو بھی اپنی  
بے پناہ سنگینوں سے پارہ پارہ کر کے رہیں گے، اور فلسطین کے مسئلے  
کا آخری حل یہی ہوگا کہ برطانوی ”ملبردار“ اور یہودی ”در اندازی“ بیک  
بینی و دوگوش اس ارض مقدس سے رخصت ہو جائیں، مگر اُن کا کیشن  
پر نشین، جہاں ناخواندہ کی طرح، اس خاک پاک پر نازل ہوتا رہے! ع  
مرا بخیر تو اُمید نیست، شر مر سال!

(۳) چین و جاپان: چین اگر جاپان کے سیلاب  
عسکری کو روک نہیں سکا ہے، تو جاپان کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہو اے  
کہ وہ غلیم چین کے پیکر مہیب کو بیک لقمہ نکل جائے، اور بیک گردش معد  
اُسے مہم و جزو جسم بنائے! یہ معرکہ بہ تمام آثارِ ظہار اک طولانی آدیزش  
بننا نظر آتا ہے! چین نے اپنی وسیع دامانی کے ساتھ، اپنے دست و بازو  
کی سبھی متواری عسلا بت کا ثبوت دیا ہے۔ ماضی قریب کے متعدد میدانوں  
میں اُس نے نہ صرف خاصی استقامت پیش کی ہے بلکہ بعض مفتوحہ مقامات  
و استحکامات کی بازیافت کا کارنامہ نادر بھی انجام دیا ہے، جاپان  
اس قضیہ نامرضیہ کی بلائے بید رہاں کو محسوس کر رہا ہے، وہ اس جنگ  
کو کم از کم ۱۹۳۹ء کے انتقام تک طوالت پذیر ہوتا دیکھتا ہے! سپر جنگ

## میر و ہند!

اے رومانیہ، یورپ میں فاسٹ مشرب سیاست کا تازہ مریہ بنا  
ہے، اور اپنے عقیدہ جیت کے ساتھ ہی، اس سلسلہ عالیہ کے شجرہ غیبیہ کے سارے  
انگل و سلسل اس کے اندرونی نظم و نسق کے ایک ایک شعبے اور سر رشتے  
کو باز بخیر کر رہے ہیں! ”فاسٹرم“ کا حروج، جدید انہد سیاست عالم میں  
قومی زندگی کی ایک خاص منزل سے گزرنے کی موڑ کی افتادہ ہے، جمہوریت  
جب تک امراد و خواص کی بہتر تعلیم و تعلیم اور عامۃ الناس کی پسماندگی و خود  
فراموشی کے نتیجے میں، اول الذکر خانہ شریف کی ”خانہ الی جاگیر“ بنی رہی،  
وہ اس جمہوریت سے تقریباً ملوکیت و امارت ہی کی طرح، لطف بھی اٹھلتے  
رہے، اور سیاسی فیاضی کی نیک نامی سے جی بہرہ ور رہے! گویا ع  
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے لڑا بٹا!

تاہم بالآخر عوام پر سے پردہ غفلت اٹھنا تھا! لیکن اس لمحے کے  
ظہور کے یہ معنی تھے کہ اہل دولت و ریاست کے سخت و تاج، نیز اُن کی خست  
و تاراج یہ دروزن خدائیاں بیک گردش ایام تہ و بالا ہو جائیں! اس بہت  
انگیز انقلاب کی وہ با سانی تاب نہ لاسکتے تھے! وہ گویا اپنی جان بچانے  
کی سنگینی سے دوچار تھے، اور گھبرا کر ہر ممکن تدبیر، جائز و ناجائز، پر اتر آئے،  
سارے نظام نیابتی کا قلع و قمع، پارلیمنٹ و بلدیات کا بزل، تسمی شہری آزادی  
کی مضبوطی وغیرہ وغیرہ وہ تعدیال ہیں جو جو حکومت و لذت طبقہ خواص اس  
مرحلہ نازک پر عامہ قوم پر توڑ دیتا ہے! — اور یہی ہے شانِ نزولِ فاسٹرم! ع  
رومانیہ کو فاسٹرم کے یہ سارے عطیات و برکات آنا فاضل لگے ہیں،

اور ع

## گرنستاتی بستم میر!

لیکن واضح رہے کہ فاسٹرم، خواص و امرا کی قوت کی کوئی مانٹش  
نہیں ہے، اُنکی کمزوری کی غمازی ہے! اس مصنوعی نظام قہر و جبر کے یہ معنی  
ہیں کہ ملک کے جمہور کے آزاد ووٹ کے ایوانِ عدل سے یہ لوگ معزول ہو چکے  
ہیں! اور اب سیاست ملکی سے خارج البلد ہوتے ہوئے، سرحد ملک پر  
دو بارہ در اندازی کے لئے دھڑکنا مٹتی کر رہے ہیں! مگر یہ سینیہ زوری  
کب تک؟ سارے ملک کو میدانِ جنگ میں تبدیل کر دینا، اور سالہا سال

کے ایک ایک شب، روزگار کا بارِ معارف جیسا کہ شکن بننے والا ہے اُس کا اندازہ کچھ اس بات سے کھینچ کر تازہ جا پائی میزانیہ میں صرف مطالبات جنگ کی مدگزشستہ سالوں کے پورے پورے مجبوت کی میزبان گل کے برابر واقع ہوئی ہے! ع

ابتدا سے عشق ہے روتا ہے کیا !

ایک چیز اس ڈرامے میں اسٹیج کی نئی تعمیر و ترتیب کی پیامبر بن کر آئی ہے! چین کے جدید مارعنی مستقر حکومت، چیون لیونگت، براہِ چینی

کو یہ ہے: سہ

اگر صلح خواہی، سخا بہیم جنگ

دگر جناب جوئی، نہ بینی درنگ

(۱-۱-۲)

## شاعر

محبت کی نظر ہوں میں، حدیثِ محبت ہوں میں، اثرِ محبتے فغاں مجھے  
سکوتِ شام صحرائیں، تلاطمِ زارِ دریا میں  
میں اک شوریدہ سر ہوں، ہست ہر دُح ازل مجھ میں  
مری جادو بیانی آنکھ کے جادو جگاتی ہے  
لیا کرتی ہے فطرت ہر جگہ، کارِ زباں مجھے  
نگاہِ نازِ جاناں سکیٹی ہے شوخیاں مجھے  
متاعِ دل ہے بازارِ محبت میں گراں مجھے  
ہو اجب تیز چلتی ہے تو اٹھتا ہر دھواں مجھے  
میں اک بانگِ درائے کارواں ہوں یعنی شاعر

بتائید نظر ہوں، ترجمانِ حالِ دل طسری

زبانِ دانِ محبت، مانگ لیں میری زباں مجھے

محسوس طسری، بکلتہ

# یہ نظر کس کے لئے ہے؟

اے نگیں جاناں! یہ نظر کس کے لئے ہے؟  
 اے زہرہ جبینوں کے لئے پیک بہریت؛  
 اے تجھ کو بے عمر مری شامِ بلا کی  
 اے سایہ کاکل میں جھمکتے ہوئے عارض  
 اے قامتِ بالا و بلند، اے قدموزوں  
 اے دیدہء فہ پرورد اے زکس مخمور؛  
 اے عارضِ ناشتہ و رُوئے عرقِ آلود؛  
 اے تحفہ فدا چشمِ خورشیدِ جہاں تاب  
 اے زانوئے کونین کی دیر سینہ تمنا؛  
 اے حُسنِ رُبخ روشن و اے جلوہء کاکل؛  
 اے تیرے قدم پر سرِ خوبانِ سدا فراز  
 اے گیسوئے آشفہ و اے کاکلِ برسم  
 اے خود سے اُلجھتی ہوئی بدستِ جوانی  
 یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شہر کس کے لئے ہے؟  
 پیغامِ بستی و ظفر کس کے لئے ہے؟  
 یہ زلفِ رستا تاجِ کس کے لئے ہے؟  
 ظلمات میں یہ آنکھ کس کے لئے ہے؟  
 یہ سرو، یہ شاخِ گلِ تر کس کے لئے ہے؟  
 چھلکا ہوا یہ ساغرِ زکس کے لئے ہے؟  
 یہ شہدِ شبنم، یہ شکر، کس کے لئے ہے؟  
 رُخ پر تیسلم کا اثر کس کے لئے ہے؟  
 قرباں تری زلفوں کے یہ کس کے لئے ہے؟  
 یہ ہوشِ ربا شامِ سحر کس کے لئے ہے؟  
 یہ نازیہ و زویدہ نظر کس کے لئے ہے؟  
 یہ عمرِ سیاح و خضر کس کے لئے ہے؟  
 ہر سالس میں یوں نذر و زبر کس کے لئے ہے؟

اے شوخ! کبھی جوش سے اس نظم کی ضد پر

یہ پوچھ کہ تو خاکِ بسر کس کے لئے ہے؟

# عروسی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس کے ترتیب دیا گیا مگر اشتہار میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام مخفی شکایات کا ہر موسم میں واحد علاج ہے مخصوص ازکار رفتہ فائدہ اٹھائیں، اسلئے کہ ارزاں تجربہ ہے اس کے ساتھ چار چیزیں مومی، نباتی، کلیدی، لعلی اور ہمراہ ہیں جن کی تفصیل اور ترکیب استعمال خربدار پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سیٹ عروسی کا ہفتہ بہر کو کافی ہوتا ہے جس کی قیمت صرف ایک دو پیہ پنڈہ آنہ مقرر ہے علاوہ محصول ڈاک۔ اکثر تین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔

صاحب فرمائش نام دپتہ صاف و خوشخط تحریر فرمائیں

شفاف خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

# ناظرین سالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ کلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادباء کے حوصلے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو نظر رکھ کر لکھی گئی ہوں

اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ماضی اور حال کے شعراء اور ادباء کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ بکفایت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں۔

کلیم بک ڈپو، جیتی نو اس نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے فرمائش کئے



# کلی

کا بہترین سامان  
کفایت کے ساتھ  
Porcelain  
Factory  
Bangalore

جہلی کا سامان — پانڈاری اور ارزائی

انسولیٹر، سوکچ، روز وغیرہ یعنی بجلی کے چینی مٹی کے ساز و سامان کے باب میں اس کی کوالٹی سب سے اہم چیز ہے اور گورنمنٹ پریسلین فیکٹری مائے سوارم منگلور کی بنائی ہوئی چیزوں میں یہ خوبی ہے کہ وہ عالی و ماخ انجینئروں کے علم اور

تجربے کا پتھر ہوتی ہیں

گورنمنٹ پریسلین فیکٹری

مائے سوارم، پوسٹ آفس منگلور

اس کے پڑھنے سے انکھوں کا بھلا ہوگا

[illegible]

مار کے ذونایاب تحفے

شمس سنگار میسر

رشکاب مینیر (پتھوں مینیر)

ہر ایک کو ہونے سنگ میڈلسٹ فریوم زامر سر قائم شدہ ۱۸۹۰ء



# ادبی ذریعہ

ٹاک بھر کے جاوونگارادیوں اور شعرا کے بہترین افکار مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار

۸۲ ولادیزافسانے مضامین اور خطبے

۸ ہفت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے، علاوہ محصول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے (۱۵ روپے) مع محصول ڈاک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجیے

مینجر رسالہ ادبی دنیا لاہور

# ہمایوں

## بھنگرہ میرا میل

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سیاہ اور راز کرنے، گرنے سے روکنے، بچانے  
کرنے، جلد سے جلد نئے بال اگانے اور بالوں کا اجڑہ پیدا کرنے میں کامیاب  
تجربہ شدہ اور بے نظیر دوا ہے، خواتین کے لئے بے پنا اور نئی چیز ہے ہم  
اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ عرض کریں گے کہ آزمائش کے لئے اولاً مرث  
ایک ہفتہ استعمال کے لئے تنگا یا جائے، اور استعمال سے قبل اپنے بالوں کی لمبائی  
ناپ لی جائے پھر چند روز کے بعد جانچ کی جائے، اتنا کافی ہے کہ ہمارا اشتہار  
غلط ثابت نہ ہوگا اور تحریر کے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔  
بایں خیال کہ ہمارا دوا اپنا اشتہار خود ہی فی اس حال قیمت لاگت کے  
برابر رکھی ہے، قیمت فی ادھا ۱۲ روپے اور متن ادھے عارٹونے کی شیشی ۵ روپے  
نئے کاپڑے۔ انڈین اسٹور، بریلی

- (۱) ہمایوں۔ اتنا پابند وقت ہے کہ جزوی شدت سے لے کر (جب یہ جاری ہو رہا تھا) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی اور مصافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدہ مثال نہیں مل سکتی۔
- (۲) ہمایوں۔ آریبل جسٹس میاں محمد شہین صاحب ہاتوں مرحوم جج بانیکوٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کا۔ و باری مصلحت مد نظر نہیں رکھی جاتی۔
- (۳) ہمایوں۔ کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں فحش اشتہارات، عواہل تصاویر، اور مخرب اخلاق مضامین اور فلموں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں، یہ رسالہ بلاخطر خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔
- (۴) ہمایوں کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (اکن) بیرسٹریٹ لا کے قابل ہاتھوں میں ہے اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہاتھوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذب توجہ ہوتا ہے۔
- (۵) ہمایوں کے مضامین محض پُر از معلومات ہی نہیں ہوتے، بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہاتھوں آپ اپنی نظیر ہے،
- (۶) ہمایوں۔ محبت زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔
- (۷) ہمایوں میں ملی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق بنیاد پرست اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔
- (۸) ہمایوں۔ ملک کے محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔
- (۹) ہمایوں کے کاغذ۔ کتابت، لطافت، اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔
- (۱۰) ہمایوں کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی ذائد قیمت نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے، مع محصول ہے

خاکسار میجر رسالہ ہمایوں لاہور

# پیغمبر اسلام

خواجه دو چہاں سرور کائنات حضرت  
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت  
اور رسالت پر شاعر انقلاب جٹ  
بیچ آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ  
جس کی رفعت و عظمت کے سامنے  
قصر کفر سرنگوں ہوتا ہے، ثنوت  
پیغمبری کے باب میں اس لافانی  
شاہکار کے انوکھے استدلال  
دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے  
ہیں اس کے اثری الہامات سے  
دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا  
ہے، اس کے دلائل قاطع کے سامنے  
ادراک منطقی چھٹنا بھول جاتا ہے  
شاعر انقلاب پر جب ایک ہر شاعر  
کا عالم طاری ہوا اسی وقت انمول  
نے یہ نظم کہنا شروع کر دی۔ عالم  
بجو دی میں چار روز کی ریاضت  
شاد اور کیسوی قلب سے جو کچھ  
حاصل ہوا صرف وہی صفحہ قرطاس  
پر تحریر کیا گیا، جب تک یہ نظم  
مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے  
نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ خلوت  
سے باہر تشریف لائے۔

قیمت مہینہ آٹھ آنے  
کلیم بکڈ پوریا گنج دہلی سو منگلا

## ”الطُفُّ دِيب“

پتہ: محکمہ اردو، سکریٹریٹ لاہور

۱۹۳۸ء کا شاہکار

آسمانِ ادب کے افق پر ستارہ صبح کی تابانیاں لئے ہوئے  
پوری شان کے ساتھ ہویدا ہو گیا ہندستان بھر کے آتش فزا  
شعرا کی بلند پایہ نظمیں آپ کی روح پر انبساط طاری کر دیگی۔

ایک ہی پرچے میں، بیک وقت

مسکراہٹیں اور آنسو..... تقبے اور آہیں..... مسرت اور غم

معرکہ آرا علمی و ادبی مقالات

دلتواں اور دل گدازا فسانے، دمان آفریں اور کیف افزا ستر خیز اور بہار آفریں دشت انگیز اور دشت زرا

آپ دیکھیں گے

سانا نے کاہر مضمون، ہر فسانہ، نظم ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے  
مشرق و مغرب کے مشہور مصوون کی شاہکار تصویریں

جواپ کے دل و دماغ پر جس کی کیفیت طاری کر دیں گی

ساز جہازی ضخامت ۵۰ صفحات، ان مقام جویر کے باوجود قیمت صرف ایک روپے

گمناپ سانا اور ضخیم لوسا نہ ہر ہفت سال کرنا چاہتے ہیں آج ہی تین روپے چار آنے (سہ) بھیج کر خریدار بن جائیے

رسالہ کلیم کے لئے ہر جگہ ویانستدار اور محنتی اکیٹوں کی ضرورت ہے



## نقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی  
کی وجد آفرین نگاروں کا مجموعہ  
(۱) نگار خانہ (۲) نظمیات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) نسیم  
بر نظم اپنی جگہ مکمل، مرتب اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس  
کے سحر کن نغمے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے  
ایک خاص سرور کا باعث ہوئے ہیں  
لکھائی، چھاپائی، نقشبند اور ویدہ زیب ہے  
قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (پچاس) مجلد دور روپے (غار)  
کلمہ بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰، وریا گنج دہلی سے منگائیے

## شاعری راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین  
اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے، جنہیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو  
اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔  
سرت رات بدست رات راز و نیاز کی رات انتظار کی رات  
اندھیرائی چاندنی رات جوانی کی رات تصورات کی رات  
اقدمات کی رات جدائی کی رات اشکوں کی رات برسات کی رات  
ربودگی کی رات بچہ دہی کی رات سرشار رات بھگی ہوئی رات  
تصورات کی رات بچپن رات پیان ناگن کالی رات

قیمت صرف آٹھ آنے  
کلمہ بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰، وریا گنج دہلی سے منگائیے

## شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی  
(کی بی بی)  
پر جوش اور کیف اور نظموں کا مجموعہ  
جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلامی شان و حریت کے طوفان کھول  
دینے والے واقعات، بادۂ سر جوش کی سرستیوں اور گلاب فطرت کے  
روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتا  
شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطلوب کلام سے متبرج  
کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما کردہ پوش سے آراستہ ہے  
قیمت صرف تین روپے (تین)

کلمہ بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰، وریا گنج دہلی سے منگائیے

## سوشل

حضرت جوش ملیح آبادی کے نام مطلوبہ اور غیر مطلوبہ کلام سے منتخب کئے  
سوشل  
دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے  
باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو  
اپنی پسند کے ملیں گے  
جیسا ساز، کاغذ، کتابت، طباعت و بدہ زیب، سرور و خوشنما  
ہر شاعر کی تصویر سہی ہے  
قیمت صرف چار آنے

کلمہ بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۰، وریا گنج دہلی سے منگائیے

۲۲

جل جَلان

# جمیلان

جریانِ حیات اس سے بہتر کوئی دوا نہیں۔ جریان  
کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ رتہ بہ رتہ  
بہت کمزور کر دیتا ہے اور تمام اعضائے جسم پر  
ہوجاتے ہیں۔ جریان نیا دوا پانا جیسلان ہر  
سال میں اس کی شہرت ثابت ہوتی ہے قیمت  
شیشی ۲۵ ساقس چار روپے آٹھ آنہ

نہجیون

مَسْحُ الْمَلِكِ كَيْفَ خَلَّ جَبَّارُ الْعِظَمِ كَأَخَاصِ عِظَمِهِ  
طَاقًا وَرَتَدَ رِجْلَيْهِ كَيْفَ بِرُكْبَتَيْهِ مِنْ بَرْهَكَ  
جَاؤَ كَامُوسٍ ضَالِعٍ نَهْ كَيْفَ

عبدالمجید

اُن لوگوں کیلئے  
جو اپنے ہاتھوں کی  
مٹی خراب کر چکے  
ہیں اور غلط کاریوں  
نے انھیں کی قابل  
نہیں بن رکھا ہے۔

طلا عجب نئی نندگی  
 کا حکم کتابت و محضو  
 کی گئی۔ لاغری کو دور  
 اور کوتاہی و دور بانی  
 ہے۔ اور رول سے  
 ماحقہ ناسر فانی ہو کر  
 نیز نور طاقت حاصل  
 مئی ہو قیمت شیشی  
 ماشا عاروے

طزو وداشرا

یہ ظالم لوگوں  
کیسے ہو۔ جن میں  
سستی اور جوش  
کی کمی پائی جاتی ہے  
اس کے استعمال  
سے پہلی رات میں اثر  
ظاہر ہوتا ہے مسلسل  
استعمال سے کمزوری  
شے سنی۔ رگ او  
جھول کی خرابیاں  
دور ہو جاتی ہیں۔  
نہایت مفید چیز ہے  
قیمت شیشی ایک  
شہ بارہ آئے۔

ان خوبیوں کے مقابلہ میں قیمت بہت کم ہے یعنی

ان خوبیوں کے مقابلہ میں قیمت بہت کم ہے یعنی

۴۰ قرص کی قیمت

سات روپے آٹھ آنے

نوٹ:- پہلے ایک قرص صبح دو۔۔۔ کے ساتھ کھائیں جب عادت ہو جائے تو روزانہ دو قرص استعمال کریں +

حَبِ مُرْسَاكُمُشْكٰی

یہ گولیاں وقت پریشانی سے بے فنی ہیں سرعت کی  
شکایت بالکل دور ہو جاتی ہے۔ تمام مغیر صحت  
کی چیزوں سے پاک ہیں۔ اپنی بدولت ان لوگوں کی  
حیاتی کمزوری کی وجہ سے آدھ خود کشی وقت  
سرخلا خواہ کامیابی حاصل کی وقت  
لاگونی ایک ٹوپہ

قرص عجیب

آج تک دنیا میں گزرتا احکام کی اس سے بہتر  
دوا دریافت نہیں ہوئی۔ عرصہ دراز کی شکایت چند  
خوارکوں میں جاتی رہتی ہے۔ رقت و سرعت بھی ملے  
کرتی ہے۔ ایسی کمی دوا ہے کہ سو فی صدی  
کامیاب ہوتی ہے قیمت شیشی ۱۲  
قرص بارہ آنے۔

کتابخانه مرکزی و اسناد خطی و چاپی

فون ۵۵۴۴

ما منام ترور بمبئی  
مدیرہ نگر

مردوں کا سچا خیر خواہ !

قیمت: - فی پرچہ ۴ - سالانہ ۲۰ - ایکٹ بھوکہ نمونہ طلب فرمائی جو کہ بیان کی تفصیل کے مطابق

فیچر: اہنامہ تنویر - قرڈ ساحلی سٹریٹ - بمبئی ۵۷

زیرِ اداس

(۱۲) نقیضہ رسوم کی عمارت پر حربتِ فکر و آزادی خیال کا پھر براہِ راست نکلے گا۔  
(۱۳) ہندو مسلم انسانیت میں گراہنے اتحاد کے ذریعے سے ایک زندہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈال دیں۔

(۴) اور ہندوستان۔ غلامی کے طوفانی لہجے  
کو جس سے شیطان تک پناہ مانگتا ہے، اپنی  
گردن سے اتار کر بیسٹک دے۔

پہلی فرصت میں کلیم کے خریدار بن جائے

پتہ یہ ہو  
مینجر سالہ کیم جنتی نوازش دیبا گنج دہلی

آپ اپنی تجارت کو ترقی دینا چاہتے ہیں

تو رسالہ کلیم میں ضرور اشتہار دیں

# ایک نفیس مزاج ہمارا

نے اپنے صدرِ عظم سے کہا، دنیا بکے ہر چار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر تم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے  
 بہترین خوشبو منتخب کر سکوں،  
 مثال کشمیر، جنت نظیر، سوزر لینڈ،  
 مرغزاروں میں گل چینی کی گئی،  
 سفر کے بعد ہمارا فی کے حضور  
 خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی  
 کہ ہمارا فی کی خوشن سانس لگا ہوں  
 خواہش کے پورا نہ ہونے سے  
 کر دیا، ہمارا جہ کو فکر و انگیر ہوا

تعمیل حکم کے لئے فردوس  
 شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش  
 جب سب پھول دُور دراز  
 میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی  
 اس قدر مر جھائے ہوئے تھے،  
 کو تکلیف ہوئی، ہمارا فی اس  
 ملول رہنے لگی، کھانا پینا ترک  
 اور روز راز سے مشورہ طلب کیا،



ہر تم تشرخانہ نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو ہمارا فی کا شباب رفتہ

ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لے واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

تازہ ترین تصنیف

جنون و رعب

رباعی کی مجموعہ رباعیات

رباعی، تمام اصناف سخن میں وہ تہا رنگین، عمیق اور نفسیانہ صنف ہے جو عظیم شعراء کی مشاقی کے نقطہ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ اور کسی شاعر کو اس وقت تک حقیقی رباعی گو شاعر کا پر شکوہ خطاب نہیں مل سکتا، جب تک کہ اس کی بے پناہ جنون پرور تخیلی قوت بند ہوتے ہوئے حکمت و بصیرت کے آسان سے ہمہ دش نہیں ہو جاتی، بدبخت ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رباعی بھی ہر چہ گیر و غلطی علت شود کے نعرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، یا رانِ طلیعت نے بزمِ خود، یہ سمجھ رکھا ہے کہ رباعی نام ہے رباعی کی بحر وں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا، اور بس۔۔۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رباعی شاعرانہ مطالبے شاعرانہ تفکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینی خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی سچ تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔ اگر آپ کے دل میں اکثر یہ متنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوا ہوتا تو آپ کا یہ اولین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں جنون و حکمت کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاض قدرت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں ایک خیام پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اس کی قدر نہ فرمائیں۔ آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک فیئر جیرلڈ مل گیا تھا جس نے اسے ایک ذندہ قوم سے روشناس کر دیا تھا لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مردہ اور غلام ہے، اور غلامی کو مرثیہ ہی نہیں کہ کوئی فیئر جیرلڈ نہیں ملا کرتا، بلکہ خود اس کی قوم بھی اس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے تیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون و حکمت مندرجہ ذیل ابواب پر منقسم ہے، (۱) معارف (۲) خرابات (۳) حسن و عشق (۴) پیرانِ سالوس (۵) متفرقات

قیمت صرف تین روپے ————— علاوہ محصول ڈاک

نیچر کلیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۴ دریاں گنج دہلی



مطلع



میر جو شریع آبادی

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا

تازہ ترین شاہکار

# فکر و شاعر

نقش و نگار اور شعلہ و شبنم کے بعد یہ شاعر انقلاب کا تیسرا محبوب کلام ہے جس میں بالکل نئی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ یہ تمام نظمیں نباضِ فطرت اور حساس شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں، ایک ایک شعر میں مسائلِ حیات اور دنیا کے رنگارنگ واقعات پر ایسا رنگین تبصرہ کیا ہے جس کی تشریح و تفسیر دفترِ دہلی میں نہیں سمجھ سکتی اور بیان کی شگفتگی و شادابی پر ہزاروں چمن نثار ہیں، شاعر انقلاب نے اپنے پیغام کے ذریعے اپنے مخاطب کو فکر کی ہیچ دریچہ گھاٹیوں میں بٹکتا ہوا اچھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ اسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے، مانگ کو سمجھوں میں نہیں ڈالا ہے، بلکہ سازِ دل کے تاروں کو بھی چھڑا ہے اور ان سے وہ موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالم وجد طاری ہو جاتا ہے۔

کتابت، طباعت، کاغذ نہایت اعلیٰ ہے، سائز بڑا، صفحات ۱۲۵ سرورق خوشنما رنگین، کتاب مجلد ہے، اور

قیمت ایک روپیہ

اپنے  
منیر کلیم بک ڈپو، جنتی نو اسٹریٹ، دریا گنج، دہلی

—

—

—

—





بَنَام قُوَّت وُجْہَا

# کلاں

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا

قوت سے ملے مجھ کو صد حیف یہ حکم

سالانہ چندہ چھ روپے

ششما چندہ تین روپے اٹھ آنے

منظور شدہ

ڈاکٹر انیم

اگر کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا

پہروں کو سنائے جاتر انہ اپنا

ستہ ماہی چندہ، دو روپے

قیمت فی پرچہ، نو آنے

ریاستہائے میوہ پٹیاں وحید آباد دکن

نمبر

فہرست مضامین بابتہ ماہ مارچ ۱۹۳۸ء

جلد

| نمبر | مضمون نگار                              | مضمون                        | نمبر | مضمون نگار | مضمون                               |
|------|-----------------------------------------|------------------------------|------|------------|-------------------------------------|
| ۲۲۲  | جناب میرا دین خان صاحب غفری             | انگریز لادہ اور انڈینس       | ۱۶۸  | ۱۴         | اشارات                              |
| ۲۲۵  | جناب قوم صاحب پچھلی شہری                | پیارو پڑے پلو (نظم)          | ۱۵   | ۱۵         | چون چو آری                          |
| ۲۲۶  | جناب محبوب مالدین خان صاحب غوری         | دھوکا                        | ۱۶   | ۱۸۵        | نہ ہبہ دار کے دتہ علی انگریز کا نظر |
| ۲۲۹  | جناب عطار اشرف صاحب پالوی               | سچی نامشکور                  | ۱۷   | ۱۹۱        | ایک خط                              |
| ۲۳۳  | جناب مجید امجد صاحب بی اے               | پہی دنیا (نظم)               | ۱۸   | ۱۹۳        | ہندی اردو کے سوال کا محض و نظم      |
| ۲۳۴  | جناب اواراشد صاحب ہشتنگری               | دیوار چین پر ایک طائر کا نظر | ۱۹   | ۲۰۴        | اسے چاند (نظم)                      |
| ۲۳۶  | جناب غفری صاحب فرشتہ شفیق ناصر لائل پور | الطاف شہدی کی شاعری پر نظم   | ۲۰   | ۲۰۵        | شیطان کی حکومت                      |
| ۲۴۱  | جوشن بیچ آبادی                          | اشعار (نظم)                  | ۲۱   | ۲۱۱        | عربیہ                               |
| ۲۴۲  | جناب مرزا محمد اشرف صاحب آماری          | شہید محبت                    | ۲۲   | ۲۱۲        | مردود و قص (نظم)                    |
| ۲۴۸  | جناب الطاف شہدی صاحب                    | نار و دیان (نظم)             | ۲۳   | ۲۱۳        | پیشانی                              |
| ۲۴۹  | ادارہ                                   | رقبہ وقت                     | ۲۴   | ۲۱۵        | تعلیم و ہیات                        |
| ۲۵۲  | ادارہ                                   | نقہ و نظم                    | ۲۵   | ۲۱۹        | محبت اور جہنم کی لذت                |
| ۲۵۷  | مشہرین                                  | اشتہارات                     | ۲۶   | ۲۲۱        | نوائے جمعی (نظم)                    |

(جوشن بیچ آبادی پر نثر و پلہ سترے محبوب المصطفیٰ برنی پرنس دہلی میں چھپوا کر دفتر سادھم دیا گیا بہرہ جینی لاس سے شائع کیا)

مُلَیْ

اور یہ حقیقت دس ہزار آنتابوں اور بیس ہزار مانتابوں سے زیادہ روشن ہے کہ کوئی راعی، اپنی رعیت کے کسی فرد کو اس وقت تک خطا میں دے سکتا جب تک کہ فیروجنی مطالبے کے بعد اسے حق الیقین کی حد تک اس کا علم نہیں ہو جاتا کہ جس شخص کو خطاب دیا جا رہا ہے وہ شخص یہ وطن فروش، اور اور زاد فدا رہے، اور اس حد تک وطن و زاد

میں نو، پی کے ایک شہر میں رات کے وقت پہنچا، جہاں یہ معلوم ہوا کہ کئی ستر جناح کا جلوس نکلنے والا ہے، چنانچہ صبح ہوتے ہی میں اس سرگ پر پہنچ گیا، جدھر سے جلوس نکلنے والا تھا۔

وہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو میں نے یہ دیکھا کہ ہندوؤں کی دوکانیں بند ہیں، اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہندوؤں نے محض اس خوف سے دوکانیں نہیں کھولی ہیں کہ کہیں ارباب جلوس اُن پر حملہ کر کے اُن کی دوکانیں نہ لوٹ لیں، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہندو، مسلمان سے، اور مسلمان ہندو سے کس درجہ خوفزدہ بنا دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ آدمی جس سے ڈرتا ہے، اُس سے محبت نہیں کر سکتا، اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سبھا یوں اور لیگیوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے دہشت زدہ بنا دیا ہے تاکہ اُن کے درمیان محبت کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔ میں ابھی اس مسئلے پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے پکار کر کہا کہ آج جواہر لال اور جتندھ مر گیا ہے، اُن کی لاشیں تھوڑی دیر میں گزرنے والی ہیں۔

یہ سنکر مجھے جس قدر صدمہ ہوا اُس کی شرح نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ لیگ نے مسلمانوں کے پاک نطنوں کو کس قدر جی بھر کے ٹکڑ بنا دیا ہے اور ایک جواہر لال اور پیا در قوم کو زیادہ پیادہ بنانے کے عوض، انہیں بکس عورتوں کی طرح برا بھلا کہنے اور کوسنے کی عادت میں کس چالاک کے ساتھ مبتلا کر دیا ہے۔

اس حقیقت سے آپ مجھ سے کہیں زیادہ واقف ہوں گے کہ کوسنے والے کی ذہنیت کیا ہوتی ہے، اور کوسنے والا طاقت سے کس درجہ محروم ہوا کرتا ہے۔ اور کوسنا تو یہی ہے جو اپنے میں شدت کے ساتھ بیچارگی و ناپاقتی محسوس کرتا ہے۔ بہادر آدمی تلوار کے ذریعے سے دشمن کا کام تمام کر دیتا ہے، اور بڑول چونکہ تلوار پکڑ نہیں سکتا، اس لئے کوس کوس کر ہی اپنا جی ٹھنڈا کر لیتا ہے۔

خدا را حضرت اقبال کو خبر دو کہ مسلم لیگ نے اُن کے شاہین بیچے، کو اب اس قدر بڑول بنا دیا ہے کہ "داغ" پر حملہ کرنے کے عوض، اب اُسے بد دعائیں دینے لگا ہے، حالانکہ شکار اُس کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

خدا رہے کہ حکومت کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر اپنی تمام قوم، اپنے تمام خاندان، اور اپنے تمام بال بچوں کو ترجیح کر کے بھی چھٹا نہیں سکتا، اور چھٹانا تو بڑی بات ہے وہ حکومت پر تمام گھبراہٹ قربان کر کے مختصر محسوس کر سکتا ہے۔ اور کیا آپ کو معلوم نہیں کہ "ہندو سبھا" اور "مسلم لیگ" میں انہیں خطاب یافتہ "شہرنا" کو اقتدار حاصل ہے؟ اور کیا آپ ان کشنڑوں اور گورنروں کے لاڈلوں، ان ڈپٹی کشنڑوں اور ڈپٹی کلکٹروں کے چہیتوں، ان تحصیلداروں اور تھانیداروں کے جگر گوشوں، اور ان بید کاٹھنوں اور جہر آسیوں کی آنکھوں کے تاروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ اعراض کے ہند سے، یہ تن آسانوں کے غلام، اور یہ نوٹروں، بہریوں میں کروں بدلنے والے گوشت کے سانس لیتے ہوئے سرے کو تھڑے اپنے ٹاک کے واسطے کوئی قربانی کر سکیں گے، اور آزادی کی جنگ میں آپ کا ہاتھ بنانے کا خواب تک دیکھ سکیں گے؟

اگر آپ کے دل میں ان خطاب یافتہ حضرات اور ان خطاب یافتہ حضرات کی بنائی ہوئی "ہندو سبھا" اور "مسلم لیگ" کی طر سے، ادنیٰ سا بھی خشن بین موجود ہے تو میں آپ کو مزہ دے سکتا ہوں کہ سندرجہ ذیل دو باتوں میں سے ایک تو غور ہی آپ کے اندر موجود ہے، یعنی یا تو آپ کے دل میں کوٹ ہے، یا آپ کی عقل میں فتور ہے۔

اگر نصیب دشمنان آپ کے دل میں کوٹ ہے، تو میں بیچارہ کیا مبتلا رکھتا ہوں، اگر آسمانوں سے بھی آوازیں آنے لگیں گی کہ "ہندو سبھا" اور "مسلم لیگ" ایک سرب و فریب ہے، پھر سبھی آپ نہیں مانیں گے، اور خدا ہی کی قسم کہ پھر سبھی آپ نہیں مانیں گے۔

اور اگر آپ کی عقل میں فتور ہے، لیکن کامل فتور نہیں ہے تو میں آپ سے مایوس نہیں ہوں۔ کیونکہ ان دونوں جماعتوں کا فریب اتنا کھلا ہوا ہے، اندر ان دونوں جماعتوں کے مداری اس درجہ برہنہ ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے آج نہیں تو کل ضرور یہی اتفاق فرمائیں گے۔

لگے ہاتھوں ایک جلوس کا حال سن لیجئے جس کے دیکھنے کا ایک ہفتہ ہوا کہ مجھے شرم حاصل ہوا تھا۔ یہ جلوس چونکہ لیگ کے "قائد اعظم" اور لیگی مسلمانوں کے "مختار ملت" حضرت جناح کا تھا۔ اسی وجہ سے میں اس موقع پر اس کا تذکرہ نامناسب نہیں سمجھتا ہوں۔



نفس ہے ہمارے بزرگوں پر کہ وہ سیاسی رات کے بارہ بجے  
ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور خوش قسمت ہیں ہم کہ ہماری رات دھل  
چکی ہے، اور سو می کا کائنات رات کے تین بج کر آگے کی طرف بڑھ چکا ہے  
اور بھنگی ہوئی رات کی وہ پاؤں تلے والی خاک ہو اُن

شکستہ ہیں کہ وہ  
مرد وہ اسے دل کے سبب جاننے می آید  
کہ زانغاں خوشش بڑے کسے می آید

## شاکر رخصت

تجسس رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے  
وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش، الاماں  
وہ مرا عشق گل افشاں، رشتہ برپا، حیف حیف  
وہ شبِ غم سے مری آنکھوں میں سُرخ، الغیاء  
وہ مرے اطوار میں اندازِ سیلِ بے پناہ  
وہ جدائی کی ہوا کے تند جھونکے، دوائے غم  
اس طرف اُلجھی ہوئی موجِ حیاتِ کفِ نفس  
اس طرف تاریکی شامِ مریضانِ کہن  
یاں چکنے ہی پہ برقِ نالہ و روافس  
وہ اُداسی، وہ فضا کے گریہ سا ماں بائے ہائے  
وہ ترے چہرے پہ موجِ برقِ دباراں، ہائے ہائے  
وہ ترا حسنِ جواں، سرورِ گریباں، ہائے ہائے  
وہ پسینے سے ترے رُخ پر چراغاں، ہائے ہائے  
وہ تری آواز میں آثارِ طوفان، ہائے ہائے  
وہ جوانی کا چراغِ زیرِ داماں، ہائے ہائے  
اُس طرف مکہرے ہوئے گیمے تاباں، ہائے ہائے  
اُس طرف اندوہِ صبحِ سوگواراں، ہائے ہائے  
واں برسے ہی پر ابرِ چشمِ حیراں، ہائے ہائے

ہائے ہر اک تارِ نظر، زنجیرِ پائے عافیت  
یاں لبوں پر خُشبو آؤ تنک جاں، وانصیب  
حسرتِ دیدار، یاں ہر آن بیتاب و شدید  
یاں لرزتا ساغر و برعزم و تہمت، الحذر  
یاں کفِ پاچوم لینے کی بچھی سی آرزو  
میں سراپا سازِ عشرت، اور رہیں بزمِ غم  
تمناتے دلولوں کی آگ، اور تیرا جگر  
کا کھلوں کی چھاؤں میں اور رُوئے رنگیں، الاماں  
وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت، وائے شوق  
اللہ اند آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا  
جوشِ ہیرا دل ہوا جاتا ہی ویراں، ہائے ہائے  
اے فغاں برب تر غم، اے خزاں برکف پہارا  
جوشِ تیرے دل کی ویرانی کے قرباں، ہائے ہائے

# مشق

اٹھا ساغر، کہ انساں کُشتہ آلام ہے ساقی  
 نہ جانے نوعِ انساں کیوں اہل سے خوف کھاتی ہو  
 حقیقت کیا سمجھ میں آ سکے اشیائے عالم کی  
 سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر  
 عداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے  
 اُدھر یہ قول، ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی  
 اُدھر تکمیل دیں گا ہو چکا ہے دعویٰ محکم  
 اُدھر شدت کے ساتھ اعلانِ ہر اتمامِ نعمت کا  
 کہا جاتا ہے مجھے زندگی، انعامِ قدرت ہے  
 شکایت کیا کسی خوں ریز جنگیز و ہلا کو کی  
 عمل کا رشتہ ہے جب دستِ ماحول و وراثت میں  
 یہ برابط ہے، یہ فے، آگے خدا کا نام ہے ساقی  
 اہل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی  
 فقط اک شکل ہے ساقی، فقط اک نام ہے ساقی  
 کہ اب تک نوعِ انساں بندہ ادھام ہے ساقی  
 دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی  
 ادھر اب تک وہی ابھام کا ابھام ہے ساقی  
 ادھر ایسا تھا جیسا خام، اب تک خام ہے ساقی  
 ادھر ہر سانس اب تک نہ ہر کا اک جام ہے ساقی  
 سزا کیا ہوگی اُس کی، جس کا یہ انعام ہے ساقی  
 خود اپنا دل ہی جب خوں یز و خوں آشام ہے ساقی  
 تو پھر کیوں آدمیت مُوردِ الزام ہے ساقی



جسے کہتے ہیں غُفِ عام میں تخلیقِ انسانی  
یہ کس آغاز کی سعی زبوں انجم ہے ساقی

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی  
جہاں موج ہوا تک مُرغِ زیرِ دام ہے ساقی

تہنّم اک بڑی دولت ہے، میں بھی اس کا قایل ہوں  
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

جسے اربابِ مذہب باوہ توحید کہتے ہیں  
وہ آبِ صاف بھی افشردہِ اصنام ہے ساقی

خروشِ گر یہ ہی حال نہیں غہائے پنہاں کا  
یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کُہرام ہے ساقی

لڑکپنِ ضد میں روتا تھا، جوانی دل کو روتی ہے  
نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی

متنا میں جگاتی ہیں، ناکامی سُلّاتی ہے  
نہ اپنی صُبح ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی

بڑی دریا دلی کے ساتھ ہر خونِ ریز طاقت کو  
شہیت کی طرف سے اِذنِ قتلِ عام ہے ساقی

یہ کس کی مہرِ ہنیت ثبت ہے گیتی کے سینے پر  
کہ ہر ذرہ ازل سے لرزہ بر اندام ہے ساقی

ادب کو اس خراباقتی کا جس کو جوش کہتے ہیں

کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوشِ ملیح آبادی

# مذہب اور اس کے اجتماعی اور انفرادی اثرات

## نظر

جاتا ہے۔

مذہب خالص منقوی شے ہے، اس میں شیرازہ بندی کی قوت یا صحت اسی وقت تک ہے جب تک لوگوں کی خیالی آزادی کو مقید رکھا جاسکے۔ مذہب کی مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ذاتی صورت کو کبھی قائم رکھا جائے، اور عقول کو دخل نہ دیا جائے، اس کے تمام خلاف عقل کو ہات پر ایمان کامل ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ مذہب کی پشت پر حکومت بھی ہو، جب مذہب کے ساتھ حکومت باقی نہیں رہتی تو مذہب میں پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ مذہب میں اصلاح کے نام سے نئے پڑنے لگتے ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے خیالات کے مطابق باروک ٹوک نئے نئے فرقی پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ مذہب کی پابندی ہوتے ہوئے حکومت ہاتھ سے نہیں جاسکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا سبب ہمیشہ مذہبی ترقی یا انحطاط نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض حکومت مذہب کا ساتھ دیتی بھی ہے تب بھی آزادی رائے کو کب تک سلب رکھا جاسکتا ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع کی توسیع، دوسری قوموں کے ساتھ سیل جول، دنیا میں علوم و فنون کی ترقی، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ بتدریج ذہن و فکر کو روایات کے بارے سے سبکدوش کرتی رہتی ہیں۔ اور منقولیت کا ظلم بالآخر ٹوٹ کر

مذہب کا تعلق چنانچہ اخلاق سے ہے وہ باطل انفرادی شے ہے لیکن محض اخلاقیات کا نام مذہب نہیں ہے۔ علاوہ اخلاق کے مذہب میں مخصوص عقائد اور رسومات بھی شامل ہیں۔ ان عقائد اور رسومات کے متعلق ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ سر دست ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان عقائد اور رسومات کی مختلف لوگوں میں کیسا نسبت ان کی اجتماعی قوت کا باعث سمجھی جاتی ہے، کیونکہ مذہب کی کیسانیت اتحاد اور اشتراک مقاصد کی ایک صورت ہوتی ہے۔ یعنی مذہب مشترکہ مقاصد کی ایسی شکل ہے، جو تمام ملکی اور ملی استیذات سے بالاتر ہوتی ہے اور مذہبی برادری کا دائرہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے (خصوصاً تبلیغی مذاہب کی صورت میں) اور ان لحاظ سے خیالی طور پر یہ دائرہ مادی تعصبات سے بری ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مذہب ہمارے کچھ کا جزو و غلط ہے۔ چنانچہ مذہب کا فنا ہونا ہماری قومی زندگی کی فنا کے مرادف خیال کیا جاتا ہے۔ اور اہل مذہب کا خیال ہے کہ ہماری اجتماعی قوت کا انحطاط مذہب کے انحطاط کا نتیجہ ہے۔ ہم آج اسی خیال کو تنقیدی نظر سے جانچنا چاہتے۔ قومی زندگی کے انحطاط اور ضعف کا سبب زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ افراد میں اجتماعی متاعد کے لئے ایثار اور قربانی کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ مذہبی بے اعتنائی نہیں ہوتی، کیونکہ مذہب کا تعلق زیادہ تر عقائد اور عبادات سے سمجھا

رہتا ہے۔ اور مذہب کی اجتماعی قوت اس کی مقبولیت ہی میں منحصر ہے۔ انسان کو خیالی آزادی ملی اور مذہب میں انفرقہ پڑا۔ پھر مذہب بجائے لوگوں کو متحد کرنے اور ایک مرکز بر لاسنے کے انشاء اور فساد کا باعث ہو جاتا ہے۔ اور اس کی اجتماعی حیثیت فنا ہو جاتی ہے۔

ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ مذہب مخصوص معتقدات اور رسومات سے عبارت ہے۔ اور معتقدات میں سب سے اہم اور بنیادی عقیدہ خدا کا ہے، دوسرے حیات بعد الممات کا عقیدہ اور غنی کی سزا اور جزا۔ ان عقائد کے ماتحت مختلف قسم کی عبارتیں اور رسومات ہیں۔

ہم سب سے پہلے معتقدات کو لیتے ہیں۔ پہلا عقیدہ خدا کا ہے۔ یعنی ایک ایسی عظیم شان اور فوق العادت ہستی کا وجود جو کائنات سے ماوریٰ ہے۔ ایسی ہستی کے اثبات کا مسئلہ ہنوز عقدہ لایحل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس کے ذریعہ اس کا ثبوت ہم پہنچا نہا عبث ہے۔ کیونکہ سائنس عالم ظاہری ہی سے سروکار رکھتی ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا عالم باطنی جو حواس اور ادراک سے ماوراء ہو، اس کا وجود دوسلئے ایک مفروضہ شے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو ذرائع فطرت نہ اور ادراک کے عطا کئے ہیں اور ان کی وساطت سے جو کچھ ہم معلوم کر سکتے ہیں اس کے علاوہ کسی چیز کا فرض کرنا اگر باطنیت ہے تو باطنیت محض ایک واہمہ ہے۔

ظاہر اور باطن کا امتیاز غلط نہیںوں کا موجب رہا ہے۔ سائنس ہر اس چیز سے سروکار رکھتی ہے جس کی اثر اندازی کا کسی طرح سے اندازہ ہو سکے، اور یہی وجود کے معنی ہیں۔ سائنس وجود کی ظاہری اور باطنی کیفیات کی تحقیق کرتی ہے۔ چنانچہ ذرہ کی اندرونی ساخت کا جو اس نے حال میں بتا لگا یا ہے وہ یقیناً اس کی باطنی تحقیقات ہی ہے۔ مثلاً ذرہ میں مراکز اور ان کے گرد برق پاروں کی مختلف فاصلوں پر گردش اور اس میں تھلا کا ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اگر باطنیت سے مطلب ایسی شے ہے جس کا ادراک حواس کے ذریعہ نہیں بلکہ عقل کے ذریعہ ہو، تو ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی اس ترقی یافتہ زمانے میں سائنس کے ذریعے علمی انشاء ہوئے ہیں وہ سب عقل ہی کی رہبری کا نتیجہ ہیں ورنہ محض حواس کے ذریعے جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جو قدیم زمانے کے لوگوں کو معلوم تھا اور آج بھی بے علم لوگوں کا علم حواس ہی تک محدود ہے، ہمارے نزدیک

ظاہری اور باطنی کا سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ ایک اور مثال سائنس کے باطنی تعلق کی علم النفس ہے۔ یعنی دماغ کے ظاہری افعال کے باطنی پیو۔ غرض تجربہ اور شاہدہ موجودات کے علم کے لئے ناگزیر ہے، اور اگر کوئی ایسا وجود ہے جو عالم محسوس سے ماوراء ہے تو اس کے وجود ہونے کا سیاق کم از کم انسان کے علم و فہم سے بالاتر ہے، جس کو بجا طور پر ناقابل علم کہا جاتا ہے۔ سائنس کسی بات میں طبعیت کی مدعی نہیں ہے۔ اور جس طرح کسی بات کا قطعی انکار غیر سائنٹیفک چیز ہے۔ اسی طرح بغیر کافی ثبوت کے اس کو تسلیم کر لینا بھی ویسا ہی غیر معقول سلک ہے۔ جو سائنس کی نظر میں ایک ناروا تحکم سے کم نہیں۔

ایک قدیم اور عامیانه طریقہ استدلال اس باب میں یہ چلا آ رہا ہے کہ مصنوعی چیزوں میں سے کسی شے کی مثال دے کر یہ سمجھایا جاتا ہے کہ جس طرح لازمی طور پر اس کا کوئی معائنہ ہے، اسی طرح کائنات کا بھی کوئی معائنہ ضروری ہے۔ لیکن مصنوعات کی مثال قدرتی چیزوں پر منطبق نہیں ہوتی۔ یہ دو لڑائی طرح کی چیزیں جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے۔ اپنے مفہوم میں بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں، اور اس لئے جو بات ایک نے متعلق ہوئی جاسکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسری کے متعلق بھی صادق آئے۔ مصنوعی چیزوں میں بنائے جانے کا مفہوم اور تصور لازمی طور پر، جو درجہ ہے۔ قدرتی چیزوں کو مصنوعی مان لینا گویا عین اسی بات کو فراموش کر لیا ہے جو معرض بحث میں ہے۔ سمجھت میں محض صورت نری ہوتی ہے۔ مادہ بنا یا جاتا ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ کوئی چیز دراصل فنا نہیں ہوتی۔ صرف اس کی صورت و شکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کی مخصوص افادیت، اثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے اصل کائنات حادث نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے۔ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کسی چیز کی توجیہ اگر فوق العادت ہستی یا قدرت مداخلت کے ذریعے کی جائے تو عقل سلیم اس کو باور نہیں کرے۔ قدرتی چیزوں کی توجیہ قدرت ہی کے ذریعے ہونی چاہیے، مثلاً۔ سیب ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے۔ اگر اس کی توجیہ یہ کی جائے کہ زمین یا پری توڑ کر زمین پر پھینک دیتے ہیں تو یہ عقل سلیم کے نزدیک جائز نہیں۔ البتہ اگر کشش ثقل کے ذریعے اس کی توجیہ کی جائے تو عقیدہ ہو جاتا ہے۔ قدرتی چیزوں کے متعلق یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ فلاں پر

اور اس کی شخصیت کا تصور بہت قدیم ہے، جو کئی ہزار دہائیوں کی صورت میں اب تک چلا آ رہا ہے، اور سب سے بڑے ایک دیوتا کا تصور بھی اسی ذہنیت کی ارتقائی صورت ہے۔

اس زمانے میں جب کہ علمی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قوت اور مادہ دو علیحدہ علیحدہ اور غیر جنس چیزیں نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا بلکہ وہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تو ایسی صورت میں قوت کے عمل کے لئے کسے ذات کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ قوت خود اپنا عملی آپ ہے، بہر حال کائنات سے ماوراء خدا کا تصور بے معنی ہے۔

خدائی تصور کی ابتدا انسان کے اس دور سے ہوئی جب کہ ذہن انسانی عالم فطرت میں تھا۔ وہ فطرت کے عظیم اثران مظاہر کی توجہ نہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ ان کو فوق الحدت ہستی سے منسوب کرے۔ مینا کی جگہ، پھاڑ اور دریا اس کو مرعوب کرتے تھے، اور اس کی بچا رگی اور غم کا اعتراف پریش کی صورت اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ آج تک بھی قدیم مذاہب میں درخت، پتھر اور دریا کی پوجا ہوتی ہے۔ فطرت کے یہ ہولناک مناظر گرم ممالک میں عام تھے۔ اس لئے مذہب کا چرچا ان ہی ممالک میں زیادہ رہا۔ مذہب کا تو ہم پرستی کے ساتھ تعلق ہونے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آج تک بھی چاروں جہات زیادہ اور علم کی روشنی کم ہے، وہاں مذہب کا دور دورہ زیادہ ہے۔ مذہب ایک غبی چیز ہے اور غبی چیزوں کو تاریکی میں زیادہ فروغ ہوتا ہے، کیونکہ تصورات کے لئے اس حالت میں زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔

دوسرے عقیدہ حیات بعد المات کا ہے۔ اس عقیدے کا انحصار بھی اس مفروضہ پر ہے کہ روح جسم سے کوئی علیحدہ چیز ہے جو عارضی طور پر جسم سے مل جاتی ہے اور اس کے فنا ہو جانے پر خود باقی رہتی ہے، لیکن جس چیز کو روئے یا حیات کہا جاتا ہے۔ وہ جسم ہی کی ایک مخصوص استرابی کیفیت یا حالت کا نام ہے جو ناعم حالات میں رونما ہوتی ہے۔ یہ طبعی چیز ہے۔ چنانچہ وہ مادی اثرات سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً تازی ہوا۔ عمدہ غذا وغیرہ سے وہ خوش ہوتی ہے اور برعکس چیزوں سے وہ منفرد ہوتی ہے۔ روح کا مزاج جب خراب ہو جاتا ہے تو ادویات سے اس کی اصلاح کی جاتی ہے۔

ہوتی ہے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ اس کو کون کرنا ہے۔ کشش ثقل یا کھربائی یا برقی قوت کے متعلق یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ان کو کس نے بنایا یا پیدا کیا۔ یہ سوال مصنوعات ہی کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ جو چیزیں نہیں ہوتی اُس کے پیدا ہونے کا بھی سوال نہیں ہوتا۔ وہ خود بخود ہے، جس طرح خدا کے اسنے والے خدا کے متعلق کہتے ہیں۔

غرض زیادہ سے زیادہ جہات خدا کے وجود کے متعلق کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک عالمگیر قوت کائنات میں کام کر رہی ہے جو اصل کائنات ہے، اور اسی کا نام خدا ہے۔ مگر اس صورت میں اس کا کائنات سے علیحدہ یا اور ہونا منسور نہیں ہو سکتا۔ کہ جاسکتا ہے کہ قوت کائنات میں شامل ہے۔ وہ ذات جس کی قوت ہے کائنات سے ناچار ہے مگر ذات سے مراد ایسا وجود ہے جو صفات یا کیفیات کا محل یا قوت کا ماخذ ہو۔ یعنی کوئی (Concrete) چیز جو عارضی یا مستقل طور پر از خود قائم رہ سکے۔ دوسرے الفاظ میں ذات لازمی طور پر کوئی مادی چیز ہونی چاہیے، کیونکہ ذات اور صفات کا اصلی فرق مادی اور غیر مادی کا ہوتا ہے۔ بعض لوگ۔ روح کو بھی محل قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ بات خود متنازعہ فیہ ہے کہ روح کوئی علیحدہ وجود ہے یا نہیں جس کی بحث ابھی آگے آنے والی ہے، اور جو چیز متنازعہ فیہ ہو اس کو مثال کے طور پر یا اصل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ غرض ذات کے تصور میں مادہ کا عنصر ہونا ضروری ہے۔ اور وہ کائنات سے ماورائی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں مختلف قوتوں کو جن مختلف ذاتوں سے منسوب کیا جاتا تھا، وہ دیوتا مختلف مادی پیکر رکھتے تھے۔ کسی کے متعدد سر ہوتے تھے، اور کسی کے پیشانی پر ہاتھ پاؤں وغیرہ۔ یہ چیز چاہے دوسرے نقطہ نظر سے کتنی ہی مضحکہ خیز معلوم ہو مگر اس میں خیالی مطابقت ضرور تھی۔ ذات کا ایسا تصور جو غیر مادی ہو اس عام خیال کے منافی ہے۔ جو ذات کے تصور پر عبور کرتا ہے صفات کے لئے ذات کو اسی لئے ماننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ صفات غیر مادی ہونے کی وجہ سے از خود قائم نہیں ہیں، اور ایک مادی وجود کو بطور محل کے چاہتی ہیں، اور اگر ذات بھی کوئی ایسی ہی غیر مادی چیز ہو تو ذات کا اقتضا پورا نہیں ہوتا۔ پھر صفات کے درجے سے آگے بڑھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ چنانچہ قوت کو کسی ذات سے منسوب کرنے کا تخیل

حیات کی مخصوص شان جو اس کو غیر ذی روح چیزوں سے متماثل کرتی ہے نہویا بالیدگی ہے، اور کون نہیں جانتا کہ بالیدگی کے لئے غذا اور کار ہے، چنانچہ مسلسل فائدہ کشی کی حالت میں روح ختم ہو جاتی ہے۔

اگر روح کوئی فرضی چیز نہیں ہے اور وہ وہی چیز ہے جو اجسام میں پائی جاتی ہے۔ تو روح کا جسم سے علیحدہ تصور نہیں ہے جس طرح کیفیات غیر مادی ہونے کی وجہ سے اپنے وجود کے لئے ایک محل چاہتی ہیں جس طرح صفات کے لئے ذات کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح روح کے لئے جسم کا ہونا ضروری ہے۔ جان کے ساتھ جاندار کا تصور لازمی ہے۔ اگر کہا جائے کہ روح معض زندہ کی کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے کچھ زیادہ چیز ہے تو وہ زیادہ چیز نفس یا ذہن کا عنصر ہے، جو دماغ کی مخصوص ساخت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ موجودہ بحث میں روح سے مراد وہ شے ہے جو جاندار کو بے جان سے تمیز کرتی ہے، جو انسان، حیوان اور نباتات میں مشترک ہے، اور یہ لازمی طور پر طبعی چیز ہے، یعنی ایک استہزاجی کیفیت جو جسم ہی سے متعلق ہوتی ہے، اگر جسم کے علاوہ سے بیک آن ٹکڑے کر لئے جائیں تو وہ بھی ختم ہو جاتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ متفرق ٹکڑے اپنی اپنی جگہ پھرنے میں روح کا رد ہونا اور زائل ہو جانا طبعی نظام کی صلاحیت یا تخریب کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ جسم سے کوئی علیحدہ چیز ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسی چیز میں یکجہانیت اور اتفاق۔ اتحاد اور اتصال کیونکر ہو سکتا ہے، جو مختلف نفس ہوں، جو بنیادی اور اساسی طور پر مختلف ہوں۔ جن میں کوئی شے اصلاح و مشترک نہ ہو، بلکہ بعد الشترقین ہو۔ کیا کوئی ایسی مثال اس دنیا میں موجود ہے جہاں دو چیزوں کا اختلاف اصلی اور حقیقی ہو اور ان میں اتحاد یا اتصال پایا جائے۔ جو چیزیں بھی مثال کے طور پر پیش کی جاسکیں گی، ان میں یہ بات ضرور مشترک ہوگی کہ وہ مادی ہیں۔

بے جان مادے اور جاندار اجسام کی قدیم تفریق یا (non-sentient اور sentient) کی حد فاصل جدید علمی تحقیقات کی روش سے زائل ہو چکی ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ مادہ اور حیات ایک ہی چیز کی ارتقائی منزلیں ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ اغلب ہے کہ نفس بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، یعنی انسانی زندگی نباتی زندگی اور حیوانی زندگی کے سلسلے کی ترقی یافتہ صورت ہے، اس کے قوائے عقلی اس کے مادی دماغ کی مخصوص ساخت

اور ترکیب کا نتیجہ ہیں، اور یہ دماغ خود حیوانی دماغ کا ارتقا ہے، اور یہ تمام سلسلہ قرین قیاس بھی ہے، ورنہ کائنات کی ہدایت کے لئے بے شمار مختلف چیزیں مانتی پڑیں گی، اور اس کثرت و ہجوم سے عقل سلیم گریز کرتی ہے۔ اس حاکم مسئلے کے متعلق ہم حکیم کی دسبر کی اشاعت میں مسئلہ جبر و اختیار کے تحت میں مفصل بحث کر چکے ہیں، جس کا اعادہ یہاں ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

تیسرے عقیدہ عاقبت کی سزا اور جزا کا ہے۔ یہ حیات بعد الممات کے عقیدے کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے اس کی علیحدہ بحث کی ضرورت نہیں۔ مگر بعض مذاہب میں سزا اور جزا کے عقیدے کی توجہ تشریح کے ذریعے کی گئی ہے، اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر خاموشی سے گزر جانا ایک ناگوار کوتاہی ہے۔ تنازع کے بوجہ ہر انسان کو متعدد بار جہنم لینا پڑتا ہے اور بے شمار زندگیوں میں سے گزرنا ہوتا ہے، اور ہر آئندہ زندگی کی نوعیت گزشتہ زندگی کے اعمال کے لحاظ سے ہوتی ہے، گویا ہر ایک آتما اپنے کمزوریوں کی سزا اور جزا اٹھانے کے لئے متعدد جسم اور دنیاوی زندگی اختیار کرتی رہتی ہے، تا آنکہ نجات حاصل ہو جائے۔

اس نظریے کی واقفیت ہمیشہ تشویش برپا رہے گی۔ کیونکہ عام طور پر انسانوں کو اپنی گزشتہ زندگیوں کی یاد مطلق باقی نہیں رہتی۔ شاید وہ دور جو کبھی کوئی مثال اس قسم کی سننے میں آتی ہے تو وہ نہ تو قطعی طور پر قابل وثوق اور نہ اس مسئلہ کی حمایت کے لئے کافی۔ کیونکہ آیات و آدیسوں کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو بلا استثناء گزشتہ زندگی کی یاد ہونی چاہیے خصوصاً جب کہ نفس یا روح فنا نہیں ہوتی، یہ کہنا کہ چند در چند وجہات سے ہر انتقال کے بعد گزشتہ یاد باقی نہیں رہتی، ایک ایسا عذر ہے، جس کو خوش عقیدگی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس سے مسئلہ کی صداقت میں فرق نہیں آتا تو ہم کہتے ہیں کہ آخر اس صداقت کا اور ثبوت ہی کیا ہے، بظاہر یہ مسئلہ بنی نوع انسان کی طبعی عدم مساوات کی اخلاقی توجہ کے طور پر اختراع کیا گیا ہے، کیونکہ انصافاً فطرت کی یہ عدم مساوات ناروا ہے۔ مگر اول تو طبعی قوانین کے عمل کی اخلاقی توجہ تلاش کرنا مذہبی تعصب ہے۔ دوسرے خود اس توجہ میں بھی نا انصافی باقی رہتی ہے، کیونکہ کسی کو ایسے اعمال کی سزا دینا جن کے ارتکاب کا

اُسے مطلق علم نہیں، نہ تو اخلاق اور انصاف اور اہل اس کا کوئی فائدہ، کیونکہ ہم اپنے گناہ کی نوعیت سے مطلع ہی نہیں ہوتے۔ یہ کہنا کہ علمی کی بنا پر اعمال کے لازمی نتائج سے بچ نہیں سکتے۔ سر اسرہٹ دھرمی ہے، کیونکہ جس چیز کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے اُسی کو فرض کیا جا رہا ہے۔ سوال اصل میں اعمال کے کرنے یا نہ کرنے کا ہے، ان کے نتائج کا نہیں ہے۔ نتائج کے مسئلہ میں جو اندھی مکافات معمر ہے وہ فطرت کے طبعی قوانین کے عمل کے مقابلے میں کوئی بہتر حل پیش نہیں کرتی، اور اس نے طبعی قوانین کے ہوتے ہوئے اس سے قانون کے اختراع کی کیا ضرورت ہے، جب کہ ہماری دشواری بدستور باقی رہتی ہے۔

عقائد کے بعد مذہب میں عبادات کا درجہ ہے، عبادت کا تعلق خدا کے بنیادی عقیدے سے ہے اور اس عقیدے کے بطلان کی صورت میں عبادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ عبادت بہر حال اچھی چیز ہے۔ اگر خدا نہیں ہے تو ہمارا اس سے کیا حرج ہے، اور اگر خدا ہے تو یہ چیز آئندہ زندگی میں کام آنے والی ہے، اور اس لئے اس کے نہ کرنے سے کرنا بہتر ہے۔ لیکن یہ بھی ایک روحانی خوش عقیدہ کی ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ اگر خدا ہے بھی تو ہماری عبادت سے اس کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔

اہل مذہب میں عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ خدا ہماری عبادت اور قربانی سے راضی ہوتا ہے ورنہ اس کا قہر نازل ہوتا ہے ہم دعاؤں کے ذریعے ہونے والی باتوں کو روک سکتے ہیں، اور عبادت کے ذریعہ خدا کو راضی کر کے اپنی کار براری کر سکتے ہیں۔ گویا عبادت ایک ترکیب خوشا ہے۔ اور قربانی ایک مٹم کی روش، جس کے ذریعے خدا کو بہلایا اور پھیلایا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں میں اگر کوئی مفاد منظور تھا تو اس کا تعلق انسان ہی سے تھا، یعنی عبادت سے فرد تنہا پیدا ہو، اور قربانی سے ایشیا رکاجہ پر پردہ پوش پائے، اور ان اخلاقی صفات سے بنائے جنس کو فائدہ پہنچے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ نتائج کے لحاظ سے بجائے فائدے کے اکثر اور بیشتر نقصان پہنچتا ہے۔ عبادت کرنے والوں میں بجلئے رواداری کے ابانے جنس کے ساتھ تعصب پایا جاتا ہے، اور جو شخص جس قدر مذہبی جوش رکھتا ہے اس میں اُسی قدر تنگ نظری دیکھنے میں آتی ہے۔ بلا ماشار اللہ عبادت کے طریقوں میں خفیت سے اختلافات

پر آپس میں کٹ مرنے والی بات ہے۔

اس کے علاوہ مذہبی ذہنیت کے آدمیوں میں آزادی فکری منقود ہوتی ہے یورپ میں جب تک حکومت میں کلیسا کا اقتدار رہا، ترقی نصیب نہیں ہوئی، ہر ایک علمی تحقیق جو بائبل کی تعلیم سے اختلاف رکھتی تھی گردن زدنی تھی۔ علوم و فنون کی ترقی کے لئے آزادی خیال لازمی شے ہے۔ مگر مذہب اس کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھنے نہیں دیتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مذہب کو کیا حق قائم رکھنے کے لئے حکومت درکار ہے، اور اگرچہ اس طرح اس کی مرکزیت قائم رہتی ہے اور اجتماعی قوت ضائع نہیں ہونے پاتی۔ مگر حکومت کے فنا ہوتے ہی اجتماعی کاشمیر ازہ بکھر جاتا ہے جس اجتماعیت کی بنیاد لوگوں کی آزادی رائے کو سب کر کے رکھتی جائے وہ کب تک قائم رہے گی۔ ہمارا مقصد اس تمام بحث سے یہ بتانا تھا کہ مذہب کے دونوں پیلوں یعنی اجتماعی قوت اور انفرادی اصلاح یا اخلاقی حالت قابل اطمینان نہیں۔ نہ اس کی مرکزیت موثر اور دیر پا ہے، نہ اس کے ماتحت انسانی اخلاق صحیح معنوں میں اخلاق کہلانے کا سہی ہے۔

اشتراک مقاصد کی بنیاد کسی ایسے اصول پر ہونی چاہیے جو کسی حالت میں شکست نہ کھائے۔ اور ایسی چیز کسی گروہ کی اقتصادی ضروریات ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ مذہب کو اقتصادیات سے ازلی مخالفت ہے، صنعت مذہبی توہمات ہمیشہ اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے۔ اقتصادیات کا تعلق انسان کی مادی ضرورتوں سے ہے اور مذہب کا تعلق (ہنام ہناد) روحانی ضرورتوں سے، جن کی تشریح کی جا چکی ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ مذہب ابتدائی طور پر جن ممالک میں شروع ہوا، وہاں قدرت کی فیاضی سے پریت اور تن کی ضروریات اور زندگی کی عام کشش شدید نہ تھی۔ مثلاً ہندوستان میں گنگا اور جمنہ کا علاقہ اپنی سرسبزی و شادابی کے باعث جنت نشان تھا اور یہی مذہب کا گہوارہ تھا۔ جن ممالک میں زندگی کی کشش زیادہ ہے وہاں مذہب برائے نام ہے۔

مذہب کی حمایت میں اس کی انفرادی حیثیت کے متعلق ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ حکومت کے قوانین اور ضابطے انسان کی پرائیویٹ زندگی کی اصلاح سے ہمیشہ قاصر رہے ہیں۔ یعنی اس کی اخلاق کی درستگی کا ذریعہ نہیں لے سکتے، اور اس لئے تہذیب اخلاق کا ذریعہ مذہب ہی ہو سکتا ہے اس

معنی یہ ہیں کہ جب تک دنیاوی حکومت اور سیاست کے علاوہ ہر جگہ عناصر و ناظر معبود اور اس کے سامنے آئندہ زندگی میں اپنے خضیف ترین اعمال بلکہ غیبتوں اور ارادوں کی جوابدہی اور اس کی عقوبت پر اعتقاد نہ ہو۔ انسان کی پرائیویٹ زندگی کو درست نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ بیشک انسان کے ابتدائی دور اور قرون وسطیٰ میں مذہب کی اہمیت اور اس کی حضرات و کارکردگی کا احترام ناگزیر رہے اور قدرت کے ارتقائی عمل نے اسی واسطے مذہب کو اس وقت رونما کیا۔ اس زمانے کے لوگوں کا ان باتوں پر صدق دل سے اعتقاد بھی تھا اور ان کو ایسے محرکات کی ضرورت بھی تھی۔ لیکن جہاں جہاں انسان پر انفرادی حیثیت سے وہ دور گزر چکا اور ہندوب و مدن جب اس درجہ پر پہنچ گیا جہاں نیکی کا ارتکاب یا بدی سے اجتناب کے لئے مخصوص یا تحریف کے محرکات سے انسان بے نیاز ہو جائے۔ اور نیکی کو نیکی کی خاطر اختیار کیا جائے اور بدی سے انسان کی ہند فطرت خود بخود متنفر ہو، اور مدنیت کے بڑھ جانے سے انفرادی اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار ان کی سوشل اہمیت کی بنا پر قرار پائے تو ایسے دور میں مذہب قدوق ماضی کی ایک یادگار اور سلف کا تبرک بن کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا کام کر چکتا ہے، اور اس کا دور ختم ہو لیتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ کسی دور میں کسی جماعت کے تمام افراد کی حالت تہذیب کے لحاظ سے مساوی درجہ کی نہیں ہوتی۔ اس لئے مذہب کی ضرورت یا عدم ضرورت کا سوال اجتماعی نہیں ہونا چاہیے بلکہ انفرادی ہونا چاہیے۔ تمام افراد کو ایک ہی لائسنس سے ہانکنے کی کوشش کرنا ایک خطا ہے۔ مذہب کو اجتماعی سرگرمیوں کے لئے مرکوز بنانا کوئی استحکام اور محفوظ پالیسی نہیں ہے، جب زندگی کی کشش زیادہ شدید ہو تو مذہب کا وعظ کہنا ایک بے وقت کی راگنی ہے۔ اگر کہا جائے کہ مذہب خاص طور پر ایسے ہی وقت کام آنے والی چیز ہے، وہ عسرت اور تنگی معائب اور آلام کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے اور مادی یا دنیاوی احتیاج کو حقیر اور عارضی سمجھ کر اس کی طرف سے استغناء پیدا کر کے ایک اعلیٰ اور مستقل روحانی نعم البدل کے لئے راضی کر کے دنیا اور اس کی آسائشوں کو ٹھکرانے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیکن سوالی اس حالت کے برداشت کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو رفع کرنے اور بہتر بنانے کا ہے۔ اور مذہب جیسا کہ بتایا جا چکا ہے دنیاوی

امور سے ٹھپسی اور سرکار نہیں رکھتا۔ بلکہ رکاوٹ ہی پیدا کرتا ہے۔ اس کے بشمار منوعات و لواہی، اس کے قہمات اور سب سے زیادہ اس کا آزادی فکر و خیال کو مقید رکھنا یہ سب چیزیں اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل ہیں آزادی فکر کے بغیر علوم و فنون کی ترقی معلوم، یورپ میں صنعت و حرفت کی ترقی مشینوں کے دور سے شروع ہوئی۔ اور مشینوں کا دوران علم و فنون کا نتیجہ تھا جو نشاۃ الثانیہ سے شروع ہوا جب کہ کلیسا کی گرفت سے آزادی ملی۔ آج بھی دنیا میں وہ ممالک جہاں مذہبیت زیادہ ہے، یعنی اقتصادی، سیاسی اور تمام دیگر مقاصد پر مذہب مقدم سمجھا جاتا ہے، وہاں چہالت زیادہ ہے اور صنعتی ترقی مفقود ہے، ایسے ممالک عموماً زراعت پیشہ ہیں یا (Pastoralism) یعنی مویشی پالنے کا شغل۔ کہتے ہیں، ان کی تجارت بھی عام اشیاء ہی تک محدود ہوتی ہے۔ وہ صنعتی ممالک کے لئے ایک لقمہ ہیں اور جو متحرک ہیبت و دولت پیدا کر سکتے ہیں، وہ دیگر ممالک کی نذر کر دیتے ہیں، مگر اس مغنی میں بھی اپنے مذہب کے خیال میں مگن ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود جو کبھی جا چکی ہیں ہندوستان جیسے ملک میں ہم مذہب کو ترک کرنے کی صلاح نہیں دیتے، کیونکہ مذہب یہاں کی آب و ہوا میں ہے اور علوم و فنون اور تہذیب و مدن کی ترقی کے لحاظ سے یہ ملک بہت پیچھے ہے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مذہب کو اجتماعی حیثیت نہ دی جائے، اس کو خالص انفرادی یا شخصی چیز سمجھنا چاہیے، اس طرح اس کی پبلک حیثیت رفع ہو کر خالص پرائیویٹ یا شخصی حیثیت باقی رہے گی، اور اس حیثیت میں بھی جہاں تک ہو سکے اس کے عبادت اور پرستش کے پہلو پر زیادہ زور نہ دیا جائے، بلکہ تہذیب اخلاق کے پہلو پر زور دیا جائے جو کام کی چیز ہے، اگرچہ خیالی طور پر عبادت گذاری تہذیب اخلاق کے منافی نہیں ہے بلکہ اس کی مدد و معاون ہے، اور شاید اخلاق ہی کے استحکام کے لئے مصلحتاً عبادت پر ابتدائے زور دیا گیا ہو، اور عبادت کو قائم کرنے کے لئے حیات بعد المات اور آخرت کی سزا اور جزا اور ایک بزرگ و برتر ہستی کے سامنے جوابدہی کے عقائد کی تعلیم دی گئی ہو، لیکن اولاً جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان چیزوں کی کوئی عقلی اساس (rational basis) نہیں۔ دوسرے یہ کہ عقائد و عبادت کے







رکھ کر میں نہایت درد آمیز لہجے میں محبت کے معصوم نغمے سنایا کرتا۔ اس حال میں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے۔ جھپکیاں بندھ جاتیں، اور آواز ٹک جاتی۔

دلغزب کیفیات، روز و شب کے جذبات انگیز لہجہات تہناری محبت کی دھنیزگی کو کس طرح چھپڑا کرتے تھے۔ کالی کالی گٹھائیں جس وقت کائنات کی ہر شے کو شرابور کرتی تھیں تو میری نگاہ کس داد خواہی بے چارگی کے ساتھ کلیوں کی آغوش میں تہناری طلعت ڈھونڈنے میں مصروف رہتی تھی، یہ عین مصروفیت آہ ممکن ہے ہمیں باور نہ ہو، میرے لئے کتنی مبارک تھی۔ وہ پیاری پیاری شکایتیں ————— دوری کے بارے جب میری روح دہلی جاتی تھی تو دل میں خدا معلوم کتنی معصوم بدگمانیاں پیدا ہوتی تھیں، تمہیں تصور میں سامنے رکھ کر اپنے گلہ آشنا لبوں سے اپنی جھپٹیوں کی داستان کہتا۔ تم سکرا دیتیں اور میں روٹھ جاتا۔ ————— ممکن ہے قدرت کے لئے یہ ایک تماشہ ہو۔ لیکن میری شبائے دراز تو اسی میں کھوئی ہوئی ہیں ————— جی چاہتا ہے، کاش وہی دن پھر واپس آجائیں، اور میرے جذبات تہناری بے قرار تناؤں سے عہد و بیان لیتے رہیں ————— اُن رے تنہا کی رومان آفرینیاں!

وہ دن نہ رہے، وہ حکایتیں نہ رہیں۔ لیکن آج بھی اگر تہناری تحریر آنے میں دیر ہوتی ہے تو میں وہ تصویر جو سامنے والی میز پر چوکتے میں رہتی ہے، اٹھا کر دیکھتا ہوں، تاکہ تہنارا وہ صبح چہرہ جو ستوڑی دیر کے لئے کسی کو ہر شے بھول جانے پر مجبور کر دے، میرے دل میں کوئی بدگمانی پیدا نہ ہونے دے۔ اور میں وہ سب کچھ بھول جاتا ہوں جو کبھی یاد نہ رکھنے کے لائق ہے۔

رو برو اس کے گیا میں اس قدر مدت کے بعد  
اس کا کیا غم اُس نے ادنیٰ سی عنایت بھی نہ کی  
مجھ کو تو صرف اس کا شکوہ ہے کہ اُس نے مجھے جوش  
اتنے دن تک دُور رہنے کی شکایت بھی نہ کی  
(جوش)

اس سرزمینِ حسن و عشق میں اپنا رخنوں سے نگار و خوباں دل لے کر پھینکا۔ میں تم سے قریب تھا اور بہت قریب۔ لیکن اُن اے شوق کی کار فرمایاں! میرا تنہا سا دل و معرکے لگا، اور دماغ مغفل، میں اس وقت چاہتا تھا کہ اپنی پیشانی تہنارے قدموں پر جھکا دوں، اور نہایت مسرت کے ساتھ اس دنیا کو آخری بار خیر باد کہ دوں۔ لیکن اُن یہ ہونا تھا ہوسکا، اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوسکا۔ کہ آنسو کے قطرے میرے افسانہ محبت کو مکمل کریں، اور میں اپنی تڑپوں کی دیرانی پر آنسو بہانے کے لئے چھوڑ دیا جاؤں۔ میں وہاں تین روز ٹھہرا آہ! یہ مجھ سے پوچھو کہ موہم پیار میں جب نگہش میں کسی ٹبل کے نفیس پردہ ڈال دیا جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے!

مجھے معلوم تھا کہ وہ سنگ و جس کا شوق زیارت کو سوں دور میری ہراسن کے ساتھ قلب کو بے مین جات بخش رہا تھا۔ اب صرٹ چند قدم کے فاصلے پر آگیا ہے۔ کہ میں اپنی خوش الفت کا اعلیٰ ترین ہندیہ تہناری بارگاہِ نازیں پیش کروں، اور پھر افسانہ ہے کہ اسے لے کر تم جو چاہو، کرو، میں اپنے اندر مسرت کی ایک بے پناہ لہر پیدا کر کے ضربِ نفس ہو جاؤں، اور پھر کبھی زندہ رہنے کی تمنا نہ کروں، لیکن اُن رے جمال یار کی سحر آفرینیاں! میں جا جا کر لوٹ آیا، آرزوئیں مہل مہل کر رہ گئیں، آنسو اُٹا اُٹا کر آئے اور بیکر زخار پر نشاں چھوڑ گئے، دل کی کلی کھلی اور پھر مرجھا بھی گئی۔ اب میں وہاں سے واپس آنے پر مجبور کیا جا رہا تھا، اس حال میں کہ تہنارے دید کی بے تاب تناؤں کو شوق کی حد سے گزر کر حسرت آلود بنا لوں۔ میں وہاں سے واپس آیا، آہ یہ اب پوچھتی ہو کہ دن کیونکر گزرے، اُن وہ میرا کہن کا مبارک زمانہ جب کہ میں نے یہ اپنے لئے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ نفس کی آمد و شد تہناری یاد ہی تک قائم ہے تہناری یاد ہی تک اور تم حیات کے لئے واحد مقصد۔

اتنی طویل مدت اور اس قدر صبر آزمایا! مجھ سے پوچھو کہ صبح و شام کی

# ہندی اردو کے سوال کا محض نظریہ

اور شمالی ہندی کی اصلی زبان  
(جو ترقی پسند اردو ہندی کی دوسری کانفرنس منعقدہ الہ آباد میں ۱۹۲۷ء میں کوڑھا گیا)

تمام ہندوستان میں چند سال سے ایک ایسی تڑپ پیدا ہوئی ہے جس کی مثال کچھ سو سال میں نہیں ملتی۔ ملک کی یہ تڑپ چونکہ غیر ملکی استعمار سے نکلنے کے لئے ہے، اس لئے ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور اپنی مثال آپ ہے، ایک طرف آزادی خواہوں کی دلدل انگیز کششیں ہیں کہ ملک کو آزاد کرائیں، دوسری طرف غیر ملکی استعمار اور اس کے لائق اوصاف ہیں، جو ایسی ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں، جس سے آزادی خواہوں کو اپنے مقصد میں ناکامی ہو، اور وہ ایسے مختلف فیہ مسائل پیدا کرتے ہیں جس میں لوگ الجھ کر رہ جائیں۔ کہیں حقوق کے تعینے کا سوال ہے، کہیں مذہبی تحفظ کا عمل ہے، انہی مختلف سوالات میں سے ایک سوال کچھ عرصے سے زبان کے متعلق چھڑ گیا ہے، کہ ملک کی زبان اردو ہوگی یا ہندی؟ رفع شر کے طور پر زبان کے لئے ایک مشترکہ نام یعنی ہندوستانی اختیار کیا گیا۔ لیکن مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ بہت سے رجعت پسندوں کو ہندی ادب کی ہستی خطرے میں نظر آئی اور نعرہ لگایا گیا کہ ہندوستانی کے معنی ہی ہندی کے ہیں۔ جس پر اردو زبان کے بھی خواہ ایک ساتھ جلا آٹے کو اردو زبان کو فنا کرنے کی یہ سازش ہے۔ اور پھر ہندی اور اردو کی بحث چھڑ گئی، جس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس بحث اور اس کے ہنگامے میں بڑے بڑے مستند وطن پرست

پتے ہوئے صاف صاف نظر آئے۔

زبان کے مسئلے پر آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور گو یہ مضمون سبھی خالصتاً سند زبان پر ہی ہے، لیکن اس مضمون میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ عوام کا مسئلہ ہے، خواص کا نہیں ہے، اور وہ ادبی زبانیں جو اردو اور ہندی کہلاتی ہیں شاید ہی کبھی انہیں سے کوئی زبان عوام کی زبان بن سکے۔ لیکن اس وقت تک دولوں نہیں ہیں، بلکہ عوام کی زبان وہ زبان ہے جو دریائے ستلج اور دریائے نرہ کے درمیانی ملک کے ان دیہات میں بولی جاتی ہے جو صوبہ جات پنجاب اگرہ وادوہ، ہریانہ، بہار اور راجستھان میں واقع ہیں، اور یہ وہ زبان ہے جو اپنے متصل علاقوں کی زبانوں یعنی گجراتی، پنجابی اور مرہٹی سے بھی بالکل غیر مانوس نہیں ہے، چونکہ اس کے بولنے والے زیادہ تر دیہات میں ہی رہتے ہیں، اس لئے اسے شمالی ہندی کی دیہاتی زبان کہنا چاہیے، گو شہروں کے رہنے والے اسے گوارا یا گنوروا کہتے ہیں۔

اس زبان کی طرف اگرچہ آج تک کسی نے سہول کر بھی توجہ نہیں کی ہے، لیکن وہ از خود ادبی شان آہستہ آہستہ پیدا کرتی رہی ہے، ہنر مند کتا ہیں اس زبان میں لکھی گئی ہیں، جن میں دیہاتی گیت، منظم قصے، سنج و غیر

ہیں، یہ کتابیں زیادہ تعداد میں دیوناگری خط میں چھپی ہیں، فارسی رسم الخط میں بھی چھپی ہیں، مگر نسبتاً کم۔ اب تک دیہاتی شاعری زیادہ تر مذہبی فقوں قومی سٹور ماؤں کی داستانوں اور عشق و محبت کے قصص تک محدود تھی لیکن حزب سے سیاسیات نے دیہات کا رخ کیا ہے، دیہاتی گیتوں اور سنجوں نے بھی انقلابی اثرات کو قبول کیا ہے، روزمرہ کی تکلیف وہ زندگی میں تبدیلی کی آرزو جدید دیہاتی شاعری میں صاف صاف جھلکتی نظر آتی ہے، بالخصوص وہ بارہ ماہ، قومی آہنا، اور سنج جو گزشتہ انتخابات میں دیہات میں بنائے گئے، ان کو سنکر ہمیں بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ دیہاتی شاعری جس انداز سے آگے بڑھ رہی ہے وہ نہ کہیں اردو کو نصیب ہوا، اور نہ ہندی۔

دیہاتی زبان کی سب سے زیادہ کتابوں کا جہاں تک تعلق ہے، وہ سب کی سب سوائے چند کے شاعروں کے کلام یا سانگ وغیرہ کی صورت میں ملتی ہیں اور نشر کا حصہ کلیتہً بنزیر عفو کے ہے، لیکن یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جس قدر دیہات کے باشندوں میں نئی زندگی پیدا ہو رہی ہے، اس کی کاس احساس کیا جا رہا ہے اور اگر ہم ملک کے حالات اور مقتضیات کا بخور مطالعہ کریں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ یہ گنوار وہ زبان قلمی ایک روشن مستقبل کی مالک ہونے والی ہے،

اس زبان کی سب سے نمایاں خصوصیت جو اس کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہے یہ ہے کہ اس میں تمام وہ فارسی اور عربی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں، جن کو ہندی ادیب جان بوجھ کر ترک کر رہے ہیں، اور اسی طرح تمام وہ ہندی الفاظ بھی بکثرت ملتے ہیں جن کو تیر و محالی کی جانشینی کے مدعی اکثر اردو زبان سے خارج کر چکے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس استدلال کے ثبوت میں ہم ذیل میں چند نمونے پیش کریں۔

منقول از قصہ نہال و س

راج کنور نہال دے اپنی ماں سے چپا باغ میں جا کر جھولنے کی اجازت

لیتی ہے۔

دن تجوں کا آیا اُس دن  
مخوں میں بولی کنور نہال  
ماتا آج تیجوں کا رواج ہے  
میں تو جھولن جاؤں گی چپے باگ

ماتا بولے بیٹی سے کب کہے  
خجول پڑ رہا ہمارے محل میں  
اُوا بلائے سب سکھین کو  
باہر بیٹی جھولن مست نا جائیو  
لے جانے توئے ہمارے نچی ہووے  
پرست سمجھائی کنور مانی نہیں

پہنچنا چھپے

چار گھڑی کے بھائی بیچ میں  
جمن باغ و کیو کھل رہا  
جوتی، چپا، موتیا، موگرا  
جب تو مان کو بلائے کنور نہال دے  
خجول نکال دے پہنا مری کٹی  
چاروں طرف باگ میں جھول پڑ گئے  
کوئی گادے اپنے بھائی بیر کو  
کوئی کاشن چپتی مٹری گائے رہی  
ایک اُور جھولیں بننے باسنی  
ایک لگ جھولیں کاشنہ کھتری  
بچ بچ جھولا کنور نہال کا  
طرح طرح کی ہالی چھپی بولتی  
یہ ہار تھا بھائی اب یہاں رہا  
برگ چھپ گیا لوٹ پڑا سلطان سنگھ  
جب جا پہنچا چھپے باغ میں  
دروازے پے گیا بیٹا رجوت کا  
ایڑ لگا دی نر سلطان نے  
اسٹی اندھیاری باؤلی  
اندھی سا آیا ہینہ خجول پڑا  
گھور اندھیرا ہو گیا چپے باگ میں

باغ میں

کوئی چھپے باغ میں بنی جانے  
اس میں جھول پھلے ہیں بے شمار  
گل شبو گل لالوں پر کھلی ہار  
مری ایک سنے ناما ن بات  
بی بی جھول پیر پے دیکھ ڈال  
جب جھولن لگیں پھنسیوں جات  
کوئی بارہ ماہ کی جھنگا ر  
کوئی گادے چپا ہارے میو ہار  
کوئی ایک لگ جھولیں گوجر جات  
کوئی ایک لگ جھولیں پھنسیوں جات  
کوئی اودا جھولتا رہی لگائے  
کامن کوئیل سی رہیں جھنگار  
سلطان کا اب ترسنو حوال  
کید گدھ کو یعنی سرٹ لگائے  
گھوڑا سلطان نے دیا بڑھائے  
پھاٹک دینا بند دکھائے  
گھوڑے نے کوئی اجاٹ دیوار  
بھائی گرجن لاگا جب آساں  
سنھی پڑن لگی پھو ا ر  
جئے دن کی رے دن کی ہو گئی رت

۱۔ ایک ہندو ہزار سے دن سے روز سے باغ سے ہمارے سے تجھے سے ہماری سے خاک سے محل لالہ سے حینہ سے طرت سے ذات سے بچوں سے پھلے راگنی، گائے سے  
تفصیل تکرہ سے احوال سے ہرن سے دمن لگائے۔ سے اندھیرا کرمات سے دلی۔

پہلے برسیں ننھی ننھی بوندیاں  
سب ری سکیاں داں سے بھاگ گئیں  
اک ناٹھیری چھپے باغ میں  
گھوڑے سے اترا بیٹا رجوت کا  
ایکہ سرمائی کنور نہال دے  
گھونٹ کھولے سبز کان سے  
رت گھرا دے گوری اچلی باغ میں  
س راجا کی ہو تم ہستری  
کئے بیاہی کئے کنواری ہو تم بھلا  
کنواری ہوں مہر ہے رت چھڑو  
اتنی شکر کنور کیس کہے  
اتنی ڈی تو کنواری کیوں رہی  
کے تیرا پتا کنگال ہے  
کیا کہیں بٹہ تم کو لگ گیا

پھر برسوں لاگا گولا دھار  
سب نے یعنی جمبول اُتار  
داں اٹلی رہ گئی کنور نہال  
اور رانی نہال پہ پہنچا جائے  
جب سر پر رکھ دینی پھرنگی دھال  
ہنس ہنس کے پوجن لاگے مات  
کہوں پیاری میں یہ دھرم کی بات  
پیاری ہم کو دھکے بھیدتائے  
تب لوٹ کے بولی کنور نہال  
مرے تن سے مت نا لگدو ہات  
مری ایک سنو نا کا سن بات  
پیاری بچ تہ دیمو مال بتائے  
ہنس کے تہا بھتی اوجھی نر سال  
رانی بچ چا مو ہے دیو بتلائے

کب سے راجا ہوا چندیل کب سے ہو گیا گدی دار  
نوکریے راجا ہے چند کا دو چار پٹن کا سردار  
کھائے کھائے ٹکڑے گدھ فتوح کے وہ آجے میں نہیں سنا  
پڑے برابر وہ راجا کے دہشت کرے ہماری نائے  
راجہ پر مال کی ہیاوری

بولاراج بھجراج سے اب تم سنو بنا بھل رائے  
بھاری راجا ہے کانسو کا تم پر وار نہ بھیل جائے  
باتہ بچی میں ناحق ڈالاسو تے ناٹ کو دیا جگائے  
جہم گھارے گنگا پر اب رہا ٹھکانا نائے  
تھوڑا شکر ہے جیسے کا اور دشمن کا بہت سوائے  
گجراج کی چھٹیوں میں زندہ ایک بچ گیا نائے  
اتنی شکر چندیل سے بھجراج نے کہا پکار  
دھرم نہیں ہے رجوتوں کا جو لڑنے سے کریں انکار  
سیس بنا رہے گا کندھے پر لوہا کرتا رہے ہمارے  
لکھت جھوڑ کر نہیں بھاگوں گا چاہے جان رہے یا تبا  
کھانڈالے لیا اندر دھانڈا جس پر چھہ اٹکل کی دھار  
چھوڑا اسرا چند گائی کا دولوں ہاتھ لیں تو اُ  
داں سے چل کر زن میں آیا اور چھتری کا سنوبیان  
جہاں پہ ہاستی گج راجہ کا بھجراج دہاں پہنچا آن  
ایڑھ لگائی جب گھوڑے کو اور ہاستی سے دیا بلانے  
پھپھی ٹاپ رہیں دھرتی میں دوہو دے پر پہنچیں جائے

(ماخوذ از سوانگ چھیلی بھٹیاری مصنفہ نیتوداس میرانپور (مظفرنگر)

جواب رنگا چار

اکبر شاہ دہلی بے تخت بڑا گل جا  
اس کے دھورے باولی جہاں اک چنپل رہتا

(ماخوذ از آہا مصنفہ مشرولالی ساکن ضلع میرٹھ)  
بھجراج اور گجراج کی لڑائی  
جہاں پڑ پڑے چندیل کے داں گجراج ٹھہرا جانے  
بھاری راجہ گدھ کانسو کا جس کی کوئی برابر نائے  
ایکٹے فوج پڑی موہبہ کی اُگلے پڑے بھنگیے رائے  
بولاراجا کانسو والا اور بھجراج سے کہا سائے  
کون دیس کے تم راجا ہو اپنا حال دیو بتلائے  
بھجراج بولاراجا سے اب تم سنو بھنگیے رائے  
گڑھ جیسے کا راجہ بھٹی جس کا نام چندیلے رائے  
اتنی بات سنی راجہ نے سرکھی کئی بدن میں چھائے  
بولاراجہ جب لگا رہا تہ میں لی تلوار سنبھال  
مگر موہبہ اک لہستی ہے جہاں گجراج کرے پر مال

لہ لی سے شرفائی سے رکھ دی لہ کیا؟ سے مجھے سے لگاؤ سے تہاری سے دھرتی سے سرخ سے لڑان۔ گڑھ سے لکھا کر سے ظلم سے لڑا سے سر سے  
مناعت سے زندگانی سے مٹاڑ سے قریب سے عورت حسین

میں اب آؤں بوجھ ذرا اتنے رہ ٹھیرا باندی لوں بڑائے حال سب کہنڈی تیرا  
جواب رنگا چار کا

دو ہا

رانی چڑھ بھن میں دیکھن لگی پیار اتنے میں پورن آگیا گھوڑے پر اسوار  
چو بولہ

گھوڑے پر اسوار دیکھ رانی چھائی ہو کے گری بیہوش گری دھرتی پائی  
اڑ گیا سارا رنگ جڑی چہرے کھائی ہو کے بچن تپتی باندی کو بلوائی  
جواب رانی کا باندی سے

دو ہا

باندی تو سن تجھے کون ہے یہ اسوار ذرا مت ناکرے دیر تو جلدی لاؤ پکار

چو بولہ

جلدی لاؤ پکار ذرا مت دیر لگا دے راجہ ہے یہ کون مرے من صورت بھاد  
بن دیکھے نہیں چمن گیا مرا لچا دے باندی مت دیر کرے ہلا کر کیوں نہیں لاؤ

(ماخوذ از سانگ نل دن مصنف علی بخش ساکن مڈاوڑیا لاٹ)

جواب راجہ کارانی سے

چو بولہ

بھوجن سبکدوش نے دیا کہ مخمیری ندی پر پائی  
رانی تجھے ترسی دیکھ اس مالک نے بھجوائی  
تم ان دونوں بھون لو میں ہنا کر آ جاؤ پی نہیں  
جلو صبر کرو من سوچ کے ہمارے ایک ایک بٹ آئی

دیکھا سنو دن دلہان لگا کے پریشہ سے دھیان

جواب رانی کا

چو بولہ

ایک ایک بٹ آؤ تو تو کروں بھون کے تیار  
ندی پر مردہ جل رہا سو دھنک رہی انگار

کیا کروں اسی میں بھون لوں میں بنا آگ لاچا میں ان کو بھونتی تم جلدی آ جاؤ سردار

لے ذات سے ٹھنڈا دن سے خبر لے حضرت سے تمام سے خدمت سے تنہا سے نسل سے شادمانی خوشک سے بگڑے نام رانی کا تلے مہائی سے ڈیوڑھی دردناک سے اندر سے ندی سے پڑھ

چو بولہ  
جہاں چنل اک رہتی نار جات بھٹاری نام چھیلی  
جو بن میں سبشار نار کی دو نوں آنکھ کھیلی  
جمن شہزادہ اُس نے موہا بولی بول رسیلی  
ہر دم پاس راگتھی اپنے نہیں جانے دیتی دہلی  
ملکتالی

گھبر جھرت پہ آئی سہمی دھلی دکھوائی  
پایا نہ جمن شہزادہ اہلکار سردار ہلا کر کیا تھکاؤ

جواب نانی کا

دو ہا

کھڈت سنہرے مل گئے دھن میری سرکار  
نیگ دیگ رہیو فتح سدا حکم کھجست ر

چو بولہ

سدا حکم کھجاست پھلے گی پو توں پس پائی  
حاکم ہو سردار دواریر پڑیو روز بد معائی  
سلطنت ہزاروں کوس میں تیری رہیو تیغ سوائی  
دوسر درگاہ تاک راج رہے یوں کہتا سن نانی

(ماخوذ از سانگ پورن مل مصنف رام لعل ساکن نواح پٹی)

سوال پنڈت کا دربان سے

دو ہا

ہم پنڈت سے دیس کے دیکھا شہر امتحان کس راجہ کا راج ہے سن تو ڈیوڑھی بان  
کس رانی کے محل میں ہم کو نام بتانا گرہ ہورت گھڑی لا بوجھ یہاں کی پانا

جواب دربان کا پنڈت سے

سیالکوٹ یہ شہر ہے سن بھٹی کا راج ان اولادے کے محل میں سن بیرہا راج

دو ہا

سیر بیرہا راج رہے ڈیوڑھی پر پہرا بن رانی کے حکم کام نہیں بھٹیر تیرا

راگنی رانی کے مچھلی سونے کی  
مچھلی خاصا سونے دی ارچا دکھیا کی سنیوری  
مچھلی سونے چلی نہ کوئی میرے ساتھ  
نا جاؤں کیسے مجھے پتہ پر مشر کے ہاتھ  
مچھلی خاصا سونے دی ارچا دکھیا کی سنیوری  
مچھلی گھیرتی آگ میں میں نے مرگٹ کے پاس  
پڑی جتا میں نہیں رہی تو مجھے نہ کھان کی آس  
مچھلی خاصا سونے دی ارچا دکھیا کی سنیوری

چو بولہ جھل کے راجہ کا

تکھرائے من میں ہم پونچھت ترے من کی بات  
ناکھوئی بات بھاروں تو سن لے ہماری بات  
نچل نہ رہے شہر میں کہتا سچی بات  
کون بہتا رو نام ہے کون بہتا رہی بات

پیارے ہم جھل کے راؤ، دکھیا اپنا ورد بتاؤ  
جواب رانی کا

بات بات مٹی میں مٹی رہا نہیں چڑھوں  
میں اشرافیہ دھرتی مچھلی گھیر گیاں بھول  
اس بھل بیا بان میں ڈولوں ڈول ڈول  
وارث میرے نہیں تو ہوں دھرتی کی بھول

میرے سن پر دیسی بات کہیے چلو بہتارے ست

(اخوذاذ سات پالی ایک گنڈا سا)  
جواب کوئی کا

دوہا

ایک ہریانے دیں میں بڑا ہے جہری بول  
سات پالیوں کا پیار تھا، چلے گھر سے ڈانگر کھول

چو بولہ  
چلے گھر سے ڈانگر کھول جھل میں اودھم مچاتے  
آتے جاتے مانس چھڑیں نہیں وہ وحشت کھاتے  
جو کوئی پکڑے ان کو چاہا، نہیں ہاتھ کسی کے آتے  
چھڑ کر بن ہیں مرد بیرے راگ عشق کے گاتے

ایک سال  
ایک سنیو ان کا راستہ، چلے گھر سے اپنے ایک گنڈا

لجی درانتی ہاتھ میں کرپ کی پتی دھار شیشہ آگے دھریا سپر کر لیا سنگھار  
ٹیک

جب چلی کھیت ہے نارستی جو بن میں متوالی  
جس کا سا باہن ہار رہا، ڈانڈے سنہلی بالی جھارا

پھر جوئی پھٹے کے تیار، سیاہی آنکھیاں میں گھائی  
سختی جو بن میں متوالی

جو کوئی اُس کی طرف لکھا دے، عاشق بن مارا مر جا دے  
جب نکلی گھرتے باہر ناگنی جوں بئی سے چالی

سختی جو بن میں متوالی  
جب بیانی سختی بن ٹٹن کے، بیڈھب پیر دھرے گن گن کے

کر رہے آپس میں تکرار، پھٹ گئے رستے میں پالی  
سختی جو بن میں متوالی

پالین نے آگ گھیر لیا رے، کیوں ہم سے نہ پھر لیا رے  
ایک بڑے دھوا دھول دیا رے، سینکڑوں چائے لگی

جب چلی کھیت سے نارستی جو بن میں متوالی  
جواب پالیوں کا

دوہا

آسا کر کے آگے چاہے چھایا گھر چاہے دھوپ  
بیشک چالی جائے تیں ایک بچا دکھا کر دے

نہ عمن سے عزت سے ڈالی سے کھانے سے پچھتے ہیں تہ راجہ یا سردار سے بنا دے آسان سے زمین تہ شوہر، ایک تہ بے چین، بے راہ تہ گھڑیہ، گوالیا، چرواہا تہ مراد حسینہ، قاندن تہ نہری  
لے مویشی تہ آدمی تہ عورت تہ آب تہ جھگڑا، آٹا تہ لی تہ تیز تہ ہل تہ باد تہ جھوم تہ پن کرتے ڈالی، لگائی تہ دیکھے تہ ٹکرائے، مل گئے تہ جی پانی کی، گوالیہ تہ ساتی  
تہ ڈال تہ تو سے دھ

کے

699

مارنا عمر میں اُترتی رہے اٹھائے برس پسند ہواں

راگنی

منا کے مہر جن، ساروا، تنجیکو و معارول جی

ہر دے آن بھر ادے بھائی، بھر دھل میں کچھ سناٹی تو ہی آخرے میں بھائی

من کی شکست کاٹ چرن میں سس نواؤں جی

جس نے تیرا سمن کیا، جیسی پہنچ کر پرچہ دینا، میں نے آکر اسے تیرا لینا

مار دیا جہاں جہاں نغمہ پارتی نے، تیرے ہنسنے کے قبول کتروں

گناہ نورے انگلی چہاں

جواب گنڈا سے کا

ہر سناح کو تیرا سہارا، عیسیٰ خاں نے بچن اُچارا، کھلے سانگ بھر پور ہمازا

فرخ نگر میں بیٹھ سبوانی تجھے مناؤں گی

وہ

پرنارسی ہوں تیں برسی مت اپنی سے کرلو پیار  
عشق بڑا اس جگت میں جھٹ جیاں سنیں گھر بار

۱۰۰

مرث کرے ہات نیواڑے

گنڈا ساہو۔ ہر دے بری عشق کی مار، مت کرو میرے سے تم یار

سُوں پُنی میں دھار کٹا رے کی

مت کریئے بات نیواڑے کی

پانی :- میں مرجیہ نگاہیں گھوٹا کر کے منہ اوپر کی اوٹ  
تیس مار رہی تھی چوٹ دھگڑا رہی تھی

مت کرئیے بات بنواڑے کی

گنڈا سا۔ میت کر دی میرے سے میل، عشق ہوتا ہے بُرا کھیل

سوں کچیا بیل بنگھاڑے کی

مرت کریئے ہات پٹوڑے کی

مندرجہ بالا نمونوں کے پیش کرنے سے ہمارا ایک مقصد تو وہی ہے

کہ اس زبان میں فارسی عربی و ہندی کے الفاظ بہت کثرت سے ہیں، یہ

اور بات ہے کہ تلفظ سے اُن کی شکلیں بدل جائیں، جیسے پنجاب کے ادیب

اپنے کلام اور مضامین وغیرہ میں وہ عربی و فارسی الفاظ اسی طرح لکھیں

جس طرح وہ بولتے ہیں تو بعینہ اسی طرح ان کی شکلیں بھی یہی نظر آئیں گی

اس صورت میں اہلین تعلیق کو تنگ اور محفل کو مافیل " لکھن پڑے گی

۱۔ یہ ہے نرم، مازک سے جیٹی سے تڑپے بے وقوف سے لاکے سے سر سے آتی ہوئی ہے چھاتی کو تلہ بخیر (نظر) پاتی (احقر) سے پرانی عورت سے ہوتی ہیں تلہ ماتے سے کیا ہے

فساد ہے مہاؤں کا تلہ گندہ تلہ آزار پر وہ تلہ ہے تلہ دو عالمی تلہ ہوں تلہ کچھ تلہ سبغالیو، پورے کجبو تلہ دہم نکالی کر شیبہ دور کر کے، گندگی بنا کر تلہ قدم تلہ تلہ کا تلہ

تہ نتیجہ دیا کہ سہارا کے لیا کہ شہوت کے نگرانی کے بغیر کہ خوبصورت ہمیں کہ درخت ۔





یقیناً ان اشعار سے ہم اس نتیجے پر نہیں آتے کہ دیہاتی شاعری کے لیے بیان کئے ہوئے نولوں اور سیر و محالی کے اشعار میں زبان کے محاذ سے صرف اس قدر فرق ہے کہ جو ایک دیہاتی اور شہری کی روزمرہ میں آج بھی ہے، لیکن وہ ایسا فرق نہیں جس سے کوئی یہ کہہ سکے کہ یہ دو مختلف زبانوں کا کلام ہے۔ مگر کیا اقبال اور دوسرے شعرا کے کلام کو دیہاتی زبان سے وہی نسبت باقی رہ گئی ہے جو سیر و محالی کے کلام کو ہے۔ چنانچہ چند اشعار حضرت اقبال کے بھی ملاحظہ ہوں۔

کبھی اسے حقیقت منظر نظر آلباس میں مجاز میں  
کہ ہزاروں سجدے تراپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں  
تجھے کیا بتائیے ہم نشین ہیں موت میں جو مزارِ بلا  
نہ ملاحسح و خضر کو بھی وہ نشاطِ عمر دراز میں

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یا رہو نکا  
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا  
دیوارِ مغرب کے رہنے والوں خدا کی بستی دکان نہیں ہے  
کھراچے تو سمجھ رہے ہو وہ اب ذرا کم عیار ہوگا

محل ایسا کیا تعمیر عوفی کے تخیل نے نقد جس پر حیرت خاں سینا و فارابی  
فضائے عشق میں تعمیر کی اُس نے نوا ایسی میسر جن سے آنکھوں کو ہیں ابتکاشِ شگفتہ  
فغانِ نیم شب شاعری کا گوشہ ہوتی ہے گراں ہے شب پرستوں کو کھڑکی آسمان تابی  
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیگ جہاں پیا خضر جس کی پیروی میں ہے مانند سحر رنگِ بیا  
کہ رہا ہے مجھ سے اے جو بوائے امرِ اراذل چشمِ دل و ابو تو ہے تقدیرِ عالمِ بجا  
حضرت اقبال کے ان اشعار سے ہم فوراً اس نتیجے پر نہیں آتے کہ کتنی  
کوشش کر رہا ہے کہ عام فہم سلیس زبان میں اظہارِ خیال کر کے خود عوام کی زبان کو  
شستہ اور پاکیزہ بنانے کے بجائے طبقہ خواص کی زبان کو کبھی ادبِ عوام سے  
بالکل دور ایک علیحدہ طبقہ بن گیا ہے، عوام کی زبان سے دور کیا جائے، لیکن  
یہ کوششیں ہرگز خوش آئند نہیں ہیں، وہ وقت بہت جلد آئے گا جب عوام  
و خواص میں اقتصادِ یک رنگی کے سبب معاشرتی برتری اور تفوق کا غنا  
ہو جائے گا، تو اس وقت طبقہ خواص کی وہ سب یادگاریں بھی ناپا جو اب تک  
جو عوام سے اُن کو دور کئے ہوئے ہیں۔

سے کوئی ٹیلا اگر ایسا اونچا کہ آتی ہو داں سے نظر ساری دنیا  
چڑھے اس پہ ہر اک خردمندِ دانا کہ قدرت کے دھل کا دیکھے مناشا  
تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ  
کہ عالم کو زیر و زبر پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں جہن و داں بہت نمازہ تر صورتِ باغِ رضواں  
ہیت اُن سے کمتر ہے سر سبز خداں بہت خشک اور بے تراوت مگراں  
ہیں لائے گو برگِ دبار اُن کے پورے  
نظر آتے ہیں ہو ہزار اُن کے پورے

پہر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر  
ہیں تازگی کا کہیں نام جن پر ہری ہلنیاں جھڑ گئیں جن کی جل کر  
ہیں بھول، پہل جن میں آنے کے قابل  
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں آگ کا کام کرتا ہے باراں جہاں آگ کے دیتا ہے زوایاں  
ترد و سے جو اور ہوتا ہے دیراں نہیں راس جس کو خزاں اور پیداراں  
یہ آوازِ پیہم دہاں آرہی ہے  
کہ اسلام کا باغ ویراں بھی ہے

اگر کان دھر کر شنیں اہل عبرت تو سیلوں سے لے تا بے کشمیر و تبت  
زمین، ٹوکھ، بن، بھول ریت اور پریت یہ فریاد سب کر رہے ہیں جہسرت  
کہ کل فخر تھا جن سے اہل جہاں کو  
لگا اُن سے عیب آج ہندوستان کو

گڈریے کا وہ حکم بردار گشت کہ بھیرلوں کی ہر دم ہے رکھوال کرتا  
جو ریلوئیں ہوتا ہے پتے کا کھٹکا تو وہ شیر کی طرح بھرتا ہے بھیرا  
جو انصاف کیجے تو ہے ہم سے بہتر  
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

ایک غزل کے یہ دو شعر بھی سنئے۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب پہ رہی ہے گنگا  
کچھ کہو تو جو انوں آئنتی جو انیاں ہیں  
عم و ہنر بڑوں کے گرم میں ہوں تو جائیں  
مگر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

انہیں دیہات میں نہ بھری زندگی گزارنے والی اور موجودہ تمدن کی بجلی کے پاؤں میں پس جانے والی مخلوق کی زندگی سے کسی قسم کا ہمدردانہ تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے ہمارا ادب زندگی کی حقیقتوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا، جب وہ کسی آتے جاتے کی زبان سے وہ مصائب جو دیہاتی اور مزدور بھری آبادی میں گزرتے ہیں سن لیتے ہیں، تو وہ اب اپنے ادب کی شان کو قائم رکھتے ہوئے اُسے اپنے ادب میں داخل کرنا چاہتے یعنی نظم یا نثر کے عوالم میں اُس کو لکھتے ہیں، اور اس طرح جس ادب کی بنیادیں تصنع اور فرضی باتوں یا حیات مابعدیات کے فلسفے پر رکھی گئی ہیں اُس میں ڈھان چاہتے ہیں، مگر نہیں ڈھال پاتے۔

بہت ممکن ہے کہ ہمارے اکثر ادیب کہیں کہ سہل بخاری اُن کے بس کی بات نہیں ہے اول تو مادتا دوسرے اس لئے کہ اُن کے ادبی خیالات کو ادا کرنے کے لئے دیہاتی سے ملتی جلتی سہل زبان میں گنجائش ہی نہیں ہے، اور اُن کی بلند خیالی کے لئے یہ زمین و آسمان بالکل ناک ہیں۔ لیکن یہ دونوں اعتراض قطعاً جاہلانہ ہیں، وہ ذرا ظفر کا مندرجہ ذیل سمجھن کا مطالعہ کریں۔

بہ دنیا ہے ادھٹ گئی ٹی پگ نہ بہت پھیلاؤ جی  
اتنے ہی پھیلاؤ کہ جس کے سُکھ سے دُکھ نا پاؤ جی  
اس دنیا کے جتنے دھندے، سگرے گورکھ دھندے ہیں  
اُن کے پسندے جانے پڑو تم یا میں نہ اُجھاؤ جی  
جس کا راج کا کرنا کھن تم میں اپنے جانتے ہو  
اُس کی دیا سے بج وہ سمجھو اتنا نا گھبراؤ جی  
سُندھ بدھ دی کرتار نے تم کو سوچ سمجھ کر نا کچھ  
ایسی کرنی مت کرنا جو کر کر پھر پکپٹ دُ جی  
کہئے بھولا نہ اُس کو ظفر جو صبح کا بھولا سا بچ کو لے  
چھوڑ کے سبرے جھکڑے اپنا رب سے دھیان لگاؤ جی

اگر یہاں درشاہ بادشاہ کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اس زبان میں شعر کہہ سکیں جن کی روزمرہ اُس سے قطعاً مختلف تھی، نیز اُس زمانے کے مسالوں کی زبان پر آج سے کہیں زیادہ فارسی اور عربی زبان اور تخیل کا اثر تھا اور پھر انہوں نے ملکی زبان میں شعر کہنے کی کوشش کی اور بہت حد تک

ہمارے ادیب خواہ وہ اردو کے ہوں یا ہندی کے اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اُن کا پیدا کردہ ادب بڑی حد تک ماضی میں بادشاہوں راجاؤں اور غیر ملکی استعمار کے مقرر کردہ جملہ داروں کی چوکنٹوں پر بند ہے کرتا رہا ہے اور زمانہ حال میں بھی وہ بہت بڑی حد تک اپنی کاخادہ ہے، لیکن شہنشاہی اور سرمایہ داری نظام کی قوت فوراً کم ہونی شروع ہو جاتی ہے جب عوام میں سب سے قوت پیدا ہونا اور بڑھنا شروع ہوتی ہے، ہمارے ملک کے عوام میں قوت پیدا ہونی شروع ہو گئی ہے، اور وہ دن دور نہیں جبکہ وہ اپنے کمال کو پہنچے گی، اور شہنشاہیت اور اُس کے سارے خوشہ چین رتبہ غلط کی طرح مرٹ جا میں لگے۔

اس لئے اگر ہم اپنے ادب سے محبت ہے تو ہمیں لامحالہ اپنے ادب کو عوام سے قریب لانا چاہیے جس کا میرے خیال میں صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم اس دیہاتی زبان کو اچھی طرح پڑھیں سمجھیں اور خود سہل زبان میں لکھیں جب اس ادب کا تعلق عوام کے مسائل زندگی سے ہو گا تو کوئی وجہ نہیں کہ دیہاتی زبان میں خود بخود ایسی سلاست اور شستگی پیدا ہو جس سے اس کا بھد اپن دور ہو جائے، اور ہمارے اردو و ہندی کے جٹ آزاد مار لیونل کا جھگڑا بھی نہ ٹٹ جائے۔

یہ سبھی تو ہمارے اردو و ہندی ادیب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ جو ادب انہوں نے پیدا کیا ہے وہ صرف ہندوستان کے ۳۰-۴۰ فیصدی تمدن انسانوں ہی کے لئے ہے، اور پھر اس ادب میں جس فلسفے پر بار بار خیال آرائی کی جاتی ہے، وہ ممکن ہے کہ کوئی باطنی حقیقت ہو، لیکن اس زندگی کی ظاہری حقیقتوں سے اس کا دور بھی واسطہ نہیں ہے، مثلاً تقویٰ وغیرہ۔ اور پھر ان کے متعلق استعمار سے اور تشبیہیں سبھی اُن خیالی مفروضات یا آنے والی زندگی کے حقائق کی اولادیں ہیں،

ظاہر ہے کہ ۷۰ فیصدی اُن عوام کا جن کو ہم نہ گھنٹے بھوک پیسی، بیماری اور شہقت کے متعلق فکر کرنے اور سوچنے میں گزرتی ہے، آنے والی زندگی جنت، دوزخ، لوک، پرلوک کے متعلق سوچنے کے لئے ایک لمحہ بھی فرصت کا نہیں ملتا، اُن کا اس ادب سے قطعاً نظر زبان کی اجنبیت کے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ادب مناسدہ ہے اُن انسانوں کا جو عوام سے دور متعلق، انسانوں میں آج تک رہے ہیں، اور ہمیشہ رہنا چاہتے ہیں،

اور آخر کار اس کا مطلوب چھوڑ کے درخت کے نیچے اُسے سوتا ہوا پاتا جاتا ہے۔ چھوٹکا کا درخت رنگستانی علاقوں میں ببول سے ملنا جلتا ہوتا ہے جو کمال میں بہت پھلتا ہے، اب دیوے چھوٹکا سے مخد اب ہو کر ایک دو ہا کتی ہے۔

دو ہا

جنگل کے رے چھوٹکا ترسی جزا جانیو پاتال  
تو نیچے ڈھولا ملا، تو پھلیو کال دو کال  
"یعنی اسے جنگل کے چھوٹکا تیری جڑیں پاتال تک جانی نصیب ہوں  
تیرے نیچے ڈھولا جی مل گئے۔ خدا ستمے ہمیشہ قحط دے قحط پہن پہن نصیب  
کرے؟"

میوات کا تیسرا شاعر لکھتے موضع کیر کا ضلع گورگاندہ کا رہنے  
والا ایک المیہ شاعر ہے۔ لیکن اس کا کلام بالکل ہمارے المیہ شعرا سے  
مختلف ہے۔ اپنے باپ اور بھائی کے مرنے کے بعد کہتا ہے۔

دو ہا

بھائی مرے تو بل گئے، تیار مرے پت جانے  
مندر سوتا جانیو رے کھٹے جادون مر جانے  
"یعنی اگر بھائی مرتا ہے تو خاندان کا زور ٹوٹ جاتا ہے، اور  
اگر باپ مرتا ہے تو خاندان کی آبرو کم ہو جاتی ہے، لیکن اسے لکھتے ہیں  
دن ماں مر جانے تو ساری دنیا انسان سمجھو؟  
بیٹا عالم سکرات میں ہے بے قرار باپ کس طرح اس کا اٹھار  
کرتا ہے۔

دو ہا

تختہ تو ڈھیلے ہوئے چرخن لاگی کبیل  
گدھ کے گھیرا ہو گئے رے کھٹے کوئی پیر دوپہر کے ہے ڈھیل  
کہتا ہے کہ تختہ یعنی جسم تو ڈھیلا ہو چکا اور کیلیں ڈھیلی ہو کر بولنے  
لگی ہیں (یہ اشارہ سالن کی آواز کی طرف ہے) اسے لکھتے قلعہ گھر چکا ہے  
اور پیر دوپہر میں سر ہونے والا ہے۔  
آخر قلعہ سر ہو جاتا ہے۔

نئی نویسی پڑھی، سٹڈے بڑے انگار، اہرن میں کھرکا نہیں بنے کد کے گئے اٹھار

اس میں کاسیائی ہونی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج اس پیر زبان میں شعر نہ کہا جائے  
جس میں فارسی عربی الفاظ کی بھی آمیزش ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ دیہاتی زبان سے ملتی جلتی صاف زبان میں بلند  
پردازی کی گنجائش نہیں۔ اس کا جواب ہم چند دیہاتی زبان کے بلند خیال شعرا  
کے مندرجہ ذیل کلام سے دیتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے ہمد کا میواتی شاعر سعد آفند جو موضع اکیڑہ ضلع  
گورگاندہ کا باشندہ ہے۔ اپنے مدوح چک مل میو کے جو دو کرم کی کس  
اندا میں مستائش کرتا ہے۔

دو ہا

اندز کی اور چک مل کی نبت نبت کیجے آکس  
اندز برے چار بیٹے چک مل برے ہارہ ماس

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں دو مختار ہیں اندز بارش کا دیوتا اور دوسرا  
چک مل جن سے ہر دم امید رکھنی چاہیے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ اندز  
صرف چار بیٹے برستا ہے اور چک مل کی بارش جو دو کرم بارہ بیٹے پہنچتی ہے،  
عیون میو ضلع گورگاندہ کا دوسرا میواتی شاعر ہے جس نے ڈھولا  
کو نظم کیا ہے۔ ڈھولا جی مل کے بیٹے کی شادی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکی تھی  
کے راجہ کی لڑکی مارو سے ہو چکی تھی مگر ابھی گونا (یعنی وداع) کی نوبت نہ  
آئی تھی کہ ایک مالی کی لڑکی ریوے سے عشق ہوا اور بڑی خوشامدوں اور  
قول و قرار کے بعد شادی بھی ہوئی۔ ریوے کے عشق میں مدتوں ڈھولا جی  
اپنی اصلی مانگ کو بھولے رہے۔ آخر جب دھیان آیا تو ریوے سے چوب پر  
پھل ولس کی راہ لی۔ ریوے جو خود ڈھولا جی پر فریفتہ تھی ڈھولا جی کے تعاقب  
میں اُن کے اونٹ کے نقش پا پر روانہ ہوئی، شدت کی گرمی نے آخر بہت  
پست کر دی، اب شاعر اس کے منہ سے یہ دو ہا کہلواتا ہے۔

دو ہا

فیروں تو سن سے نہیں، روؤں تو لاج بھی مردوں  
پیا پیارے کے کعبہ کی میں چن چن گو د ہی بھروں  
یعنی چٹاؤں تو وہ سن نہیں سکتے، روؤں تو شرم آتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ  
کہ پیا پیارے کے نقش پا کی مٹی سے ہی چن چن کر گود بھروں؟  
اس کے بعد جذبہ شوق پھر بہت بندھاتا ہے، اور وہ پھر چل پڑتی ہے

کہتا ہے کہ سبھی یعنی جسم سر و جو چکا، اور وہ آگ جو اسے گرم رکھتی  
سختی سمجھ چکی ہے، اہرن (یعنی نفع) میں اب کبھی تم کی کھٹ کھٹ کی آواز  
نہیں آرہی ہے۔ خدا جانے لوہار کتنے عرصے سے جا چکے ہیں؟  
حسنو کھتولی صنم مغلہ نگر کا شاعر جس کی کندلیاں بہت مشہور ہیں،  
دلی آ کر حق خریدتا ہے۔ جناحی میں تادہ کرتا ہے، اب ذرا اس کی واردات  
کئے،

دلی شہر سے حق لینا پیسے دینے مٹھنی مہر  
جناحی میں گولٹا دیا حق نیچا دو لڑی پر  
آگ ڈھال کے کوئے بندے لٹ اٹھی بے نیوہ  
حق کہے کھدا مر جانے اب کے حق پھر بھی مہر  
دوسری کندلی مٹنے۔

آدمی رات نگر پر آئی تو بھی بیتی جاتی ہے  
حسنو کہے کھدا مر جانے موت بھی تو آتی ہے  
برق کا شاعر گرد مہرک داسے حق کو بڑا سمجھتا ہے اس کی وجہ یہ بیان  
کر کے افسوس کرتا ہے کہ چٹ نہیں سکتا۔

نکلے سے خدمت گئی تو نیم دم مر گئے چھوٹ  
ناج بچ تبا کو لینا گئی تپنے کی مٹھوٹ  
گئی تپنے کی مٹھوٹ آگ کو گھر گھر ڈوٹے  
جا گھر جا دے وہی نارسیڈا کر بوٹے  
کہیں گرد مہرک رائے کرم کے سُرکا  
جان جائے تو جائے جسمی چھوٹے حُکما

یہی شاعر ایک اور کندلی میں بیان کرتا ہے، کہ خواہشات کی  
غلامی موت کی نشانی ہے۔

آگ لگی تن جو ان میں تو دوں لاگی مٹجائے دوں لاگی بجائے تو جیسے کاپڑ کی کٹی  
جون مانس جل جائے رہے پنجر کی ٹٹھی کہیں گرد مہرک رائے ارے تل میرے خنٹا  
وہ تل کیسے جیویں جن کو بت بیل پے مٹتا

کہتا ہے کہ تن جو ان (وہ درخت جس کی لکڑی آگ کو بہت جلد پکڑتی ہے)

میں اگر آگ لگ جائے تو بجالوں، لیکن خواہشات کی آگ کس طرح بجھاؤں، جو  
گوشت پرست جل جانے کے بعد بھی رہتی ہے، اسے میرے دوست، آگ کیسے بجیتے  
ہیں، جن کے دل میں ہر وقت خواہشات پیدا ہوتی رہتی ہیں؟  
موضع انکھیر ندرج دہلی کا شاعر انت لال مندرجہ ذیل سخن میں شاعرانہ  
استعارات سے کسانوں کے دردناک مصائب بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پریشیر  
کے متعلق یہ خیال کہ وہ ہماری ان مصائب سے خلاصی کرے لگا اس وقت پیدا  
ہوتا ہے جب ہمیں مایوسی ہر طرف سے ہوجاتی ہے، اور کسان اس وقت بھی مشتبہ  
ہی رہتا ہے

بکھن  
ٹیک۔ مرے ہم کیوں نا دکھیا دین کساں

جب چوڑے دھکے بادل مہاسے اوپر اُمنڈ رہے  
کوئی برا نہیں جو انھیں ہٹا دے، اُمنڈ اُمنڈ رُکھنڈ رہے  
گرج گرج کر شور مچا دیں سن سن کر ہم ذرا ن گئے  
دھکے رُوپی اولوں نے بچے سے پتا موت ہم مر ن گئے  
جب کوئی نہیں سہارا دیکھے، دھیان بری کا دھرن لگے  
شاہ یہ رکھتا کرے ہمارے دین بندھو بنگو ان

مرے ہم کیوں نا دکھیا مرے دیں کسان  
اس کلام سے جو مٹتے ازخوارے ہے، ہمارے ادیب اندازہ لگا  
ہیں کہ سہل نگاری بلند خیالی کے لئے روک نہیں بن سکتی آخر تیر و معانی کے لئے  
بھی تو وہ روک نہ بن سکی۔ ہیں یہ مکرر عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ  
جو ادب طبقہ خواص کے لئے مخصوص کیا جا رہا ہے اندیشہ ہے کہ اس کا اثر  
بھی وہی نہ ہو جو مقبضات کے ڈوم ڈھار یوں کا ہوا ہے کہ آج جب دولت  
اُن کے جھانوں کے ہاں سے رخصت ہو گئی ہے اور وہ غریب ہو گئے ہیں  
تو وہ سچا سہی بھیک مانگتے در بدر پھر رہے ہیں اور کوئی اُن کا پرسان  
حال نہیں۔

سید مظہر بی فسرید آبادی

منی آرڈر بھیجئے والے اصحاب اپنا پورا نام و پتہ منی آرڈر فارم کی کون پر ضرور لکھ دیا کریں

# اے چاند!

اے چاند تیرا چہرہ کیسا اتر رہا ہے؛ تجھ پر بھی کوئی شاید بیدار کر رہا ہے  
 ماندے تھکے مسافر، عازم ہے تو کہاں کا سنان رستوں سے تنہا گزر رہا ہے  
 نقش قدم نہیں ہے، یہ رنگِ ناتوانی؛ ہے آفریں کہ پھر سب گرم مفسر رہا ہے  
 کرنیں نہیں ہیں تیری، ہیں آنسوؤں کی لڑیاں بکھرا رہا ہے موتی اور دل بکھرا رہا ہے  
 بے خواب تیری آنکھیں ہیں منتظر کسی کی محوِ خبر رہا ہے گوبےِ خمیر رہا ہے  
 خاموشیوں میں تیری گفتار کا ہے عالم کس کا جمالِ رعنا پیشِ نظر رہا ہے  
 عاشق ہے تو بھی شاید میری طرح کسی پر محزونِ دل گرفتہ جو رات بھر رہا ہے

آ، تیرا غم بٹاؤں، مجھ سے نہ بدگیاں ہو

میں تیرا راز، اں ہوں، تو میرا راز داں ہو

تیرے دیار میں بھی کیا جرم ہے محبت وہ جان کے ہیں دشمن جو دل کا مدعا ہیں  
 معدوم ہے وہاں بھی کیا رسم و لنوازی آزا کے ہیں درپے جتنے بھی ذلّ با ہیں  
 خواہش تو یہ کہ اُن سے کوئی کرے محبت دل لے چکے تو ہر دم آما دہِ جفا ہیں  
 ابر و کا یہ اشارہ، ہم تیرے، تو ہمارا آنکھیں نہ پھر ملائیں، اس درجہ بے وفا ہیں  
 یا شوخیاں کہ جن سے شوخی پناہ مانگے یا مثلِ غنچہ یکسر اک پیکرِ حیا ہیں  
 دیکھو تو اُن کو دیکھو، چاہو تو اُن کو چاہو خوش چشم و خوش ادا ہیں، پر تہر ہیں بلا ہیں  
 سمجھے ہوئے ہیں خوبی، عاشق کا دل دُکھانا اس طرز اس ادا کے تیرے بھی آشنا ہیں

غمِ آشنائے دل ہے، سن لے مرافقا

دُکھ درد کی کہانی، بیدار کا فسانہ

اے چاند تیرا چہرہ کیسا اتر رہا ہے!

اثر لکھنوی

# شیطانی حکومت

م - ح

شیطان تاج کیا فی سر پر کئے سوتیوں میں گندھی ہوئی ردا دوش پر ڈالے  
نہوا ہوا۔ طاغوت نظریں جھکائے۔ جھکی ہوئی کالوں کی طرح ڈوہرے ہو گئے  
پھلپھلیاں، گھینا گھرے، ساریاں، پائینچے اور محاکوں گھنٹوں کے پاس سے  
دولوں ہاتھوں کے سہارے پھیلا کر انڈے پر بیٹھے والی مرغیوں کی طرح، زین  
دوز ہوئیں، اور شہنشاہ کے گردن ہلا کر سلام لینے پر سنبھل کر کھڑی ہو گئیں، انہیں  
نے تخت پر بیٹھے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھ جانے کا حکم دیا، اور  
سب گردن جھکائے، اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

طاغوتوں میں سے ایک حمد کے چہرے سہر پر بال ہی بال تھے، مگر جس  
کی چند یا سیکڑوں برس کے مڑے کی کھوپڑی کی طرح سہید و صاف تھی، اُنھوں  
کھڑا ہو گیا،

شہنشاہ نے پوچھا: "وزیرِ اعظم، کیا نام ملک کے عائد واکبر و حکام آگئے؟"

اُس نے دست بستہ عرض کی: "جہاں تباہ! رب حاضر ہیں!"

شاہی حکم ہوا کہ ایک ایک کر کے رپورٹیں پیش کی جائیں۔

وزیر نے سب سے قریب والے اعلیٰ کی طرف دیکھا، اس نے اپنی

جگہ سے عہدہ ہو کر پیچے تو شہنشاہ کو ایک سجدہ تعظیم کیا، پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

لبخند و کجمنش ہوئی: "کہو تمہارے ممالک کی کیا حالت ہے، لارڈ ڈیول؟"

لارڈ ڈیول نے میموئی انداز سے گلا صاف کر کے کہا: "جہاں تباہ! مجھے خوف

ہے کہ جو خبریں سنائے والا ہوں، اسے جہاں تباہ مسرت سے سن سکیں گے:

مملکت تاب کے چہرے پر ہلکی سی شکن پڑ گئی، سارے دربار کی ہر چیز پر سیاہی

شیطانی و۔ ہار جا ہوا تھا، یورپ و ایشیا، امریکہ و افریقہ، روم و  
شام، چین و جاپن، ہر جگہ، ہر ملک اور ہر خطے کے اعلیٰ اور طاغوتوں کے  
عائد واکبر، افسار و امرا، لیڈر اور گورنر کسی ذرنگار پر بڑی رعوت و تجتر  
سے تمکین تھے، کسی کا چہرہ ہاسٹی کا سا تھا تو کسی کا سور کا سا اور کسی کا بھالو کا سا  
تھا تو کسی کا گدھے کا سا۔ مگر بائیں شکل و صورت ہر ایک مرغی زین بناتا تھا، افس  
و حریر زیب جسم، الماس و گہر زینت دست و گلو!

ان سے تھوڑی بلندی پر، مگر بائیں مقابل حسین سے حسین مر جبینوں  
کی رفتار و رفتار مٹتی تھی، ہر ایک کی آنکھوں میں ہلا کی لگاوت، ہر ایک کے لبوں  
پر سحر کن مسکراہٹ اور ہر ایک کی بوٹی بوٹی پھرکتی ہوئی، غمزہ واداپس پشت  
کھڑی مروجہ جنبانی کر رہی تھیں، اور نفسانیت و بوالہوسی لبوں میں ہستادہ خطر  
پاشی میں مشغول تھیں۔

نیچے بیٹھے ہوئے طاغوت اسٹین لپھائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور  
اشاروں ہی اشاروں میں جان نثاری کا لہجہ دلاتے تھے۔ مگر وہ ان کا ہیولی  
دیکھ کر کبھی طنز سے ہنستی، کبھی شرم سے آنکھیں مارتی اور کبھی حقارت سے اپنا  
سین ٹھیکٹا دکھا دیتی تھیں!

اتنے میں بیچ میں سب سے بلندی پر رکھے ہوئے سونے کے قمر صغ  
تخت کے پیچھے کا زرتار پردہ ہلا۔ حاجب نے قین باریعینا کارنگا جی فرش  
پر عصا مارا۔ پھر کراؤ دوی، نگاہ رو برد، خداوند زمین و زمان حضور شاہ عاجزا  
سارا مجمع سر و قد تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ پردہ ہٹا اور آب انجابت۔

سی دوڑ گئی، حکم ہوا: تم بیان کرو لاٹو ڈیلول، اپنے غزوہ کی قسم میں ناخوش نہ ہو گا۔  
لاٹو ڈیلول نے عرض کیا، اور اُس کی لرزتی ہوئی آواز اس کے  
دل کی دھڑکن کا پتہ دے رہی تھی۔ جہاں تباہ! ان ممالک محروسہ سرکاری  
میں جن کی نگرانی ضلالت مآب نے مجھے عطا فرمائی ہے، یعنی انگلستان و فرانس  
دوسرے ریلینڈ و سوڈن و ڈنمارک میں ہمدردی و اخوت کا مادہ روز بروز  
بڑھتا جا رہا ہے، سر رہا یہ دار اور مزدور کی جنگ کم ہوتی جاتی ہے، اور ان  
میں ایک خاص خواہش امان و سلامتی کی پیدا ہو گئی ہے، اُن کے جمہور کا  
یہ خیال ہوتا جا رہا ہے کہ صلح و آشتی ہی میں فلاح و بہبود ہے، چنانچہ یہ  
لجھجور اور لغو خیالات و رجحانات اس قدر تیزی سے پھیلنے لگے ہیں اور  
کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فوجوالوں کو اس طرح اس ماحول کا خوشامد  
بنانے جا رہے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضورؐ کی وہ قسم جو ضلالت مآب  
نے اغوائے بنی آدم کے بارے میں ابد الابد تک کے لئے کھائی تھی، اب کل  
کے زمانے میں کیونکر پوری کی جاسکے گی۔ عا لیجا! آپ کا یہ گرگہ باروں  
دیدہ ننگوار یہ عرض کرنے میں اپنی شبکی نہیں سمجھتا کہ فتنائی نامرافقت کی  
وجہ سے اُس کے ہاتھ یا دُل پیول گئے!۔

شیطان کا آتشیں چہرہ غصے سے سیاہ ہو گیا، کمرے بھر میں تابی پھیل گئی اور ساری تختیاں خوف سے جھنبھانے لگیں، مہر عبدینوں میں سے ایک صاعقہ کی طرح چمکی اور لارڈ ڈویل کے پاس شہاب ثاقب کی طرح آکر گری۔ اب انتخابات نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ آنکھوں میں چمک، لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی، ہال میں روشنی پھیل گئی۔

وہ تغلیف جھاک کر بولی "عالیجاہ! لارڈ ڈیول واقعی بوڑھے ہوئے، اب یہ بچوں کی طرح ذرا ذرا سی باتوں سے ڈرنے لگے ہیں، ان کے دماغ سے سوچے کا مادہ اور سمجھنے کی صلاحیت بالکل اسی طرح غائب ہو گئی ہے، جس طرح سوڈا وائر کی کھلی بوتل سے جھاگ کا فور ہو جاتی ہے۔ مگر چنانچہ میں فرانس میں موجود ہوں، اور جب تک وہ خطہ مینوسواذ میری نگرانی میں ہے، میں اس ملک کے باشندوں کو کبھی بھی یکدل ہو کر کام نہ کرنے دوں گی۔ ایک تو عیش و نشاط کا وہ بازار گرم رہے گا کہ وہاں کے مرد و عورت کبھی زندگی کے مسائل پر سنجیدگی سے غور ہی نہ کر سکیں گے، دوسرے ان کے جذبات ہمیشہ اتنے براجمخت رہیں گے کہ وہ آپس میں اتحاد و اتفاق کی فضا

ہی نہیں پیدا کر سکیں گے! عالیجاہ! میں نے اب کچھ انتظام کر رکھا ہے کہ وہاں کے مدبرین لاکھ کوششیں کریں، مگر انکی کامیابی کا مہینہ کی اوسط عمر تین چار ماہ سے زائد نہ ہو سکے گی! بھلا وہ لوگ جو اُسے دن اپنی سلطنت کے سر پر طرح طرح کی ٹوپیاں پہناتے اور اُتارتے ہوں اُن سے مایوس ہو جانا کوئی عقلمندی ہے!

ایک اور پرسی اپنی جگہ سے اُسکرتخت شاہی کے سامنے اٹھاتی ہوئی آئی اور بڑے دلرباانہ انداز سے بندگی کر کے بولی: "عالیجاہ! خاص انگلستان کی نگرانی میرے ذمہ ہے۔ میں سبھی اپنی بہن عقل کی دیوی کی رائے سے اتفاق کھلی رکھتی ہوں۔ فرانس تو فرانس، ہمیں انگلستان سے سبھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اس کے پاس ایک چوتھائی دنیا ہے، اور اس میں بہت سے ایسے حصے شامل ہیں جہاں ہمارے ہی منشا کے مطابق حکومت ہوتی ہے! خود انگلستان میں قدامت پسندوں کا دور دورہ ہے، اور یہ جماعت کالے گورے مشرقی اور مغربی کے امتیازات سے باز نہیں رہ سکتی! اس لئے اس سے مایوس ہونا نہ تو قرین عقل ہے اور نہ نتیجہ فہم و فراست! بس سرکار عالی اس سے سمجھ لیں کہ چارہ ہی دن ہوئے کہ اُنھوں نے اپنے محبوب ترین بادشاہ کو محض اس بنا پر تخت سے اُتار دیا کہ وہ ایک مطلقہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، جب تک اسی طرح کی قدامت پسندی انگلستان میں باقی ہے اُس وقت تک انگریز ہمارے پنجہ فولادی سے نہیں نکل سکتا!"

شہنشاہ مسکرا کر بولا: شاہنشاہ! ہم جہانم دونوں نے تصویر کا دوسرا  
 رخ پیش کر کے ذرا اُمید دلائی کہ مابعدِ ولایت کے ننگخواروں میں اب بھی شوجہ  
 بوجہ کے لوگ موجود ہیں۔ ورنہ تمہارے افسر لارڈ ڈیول نے تو بالکل مایوس  
 ہی کر دیا تھا۔

لیڈی تیلی ڈی بیہ بولیں جہاں تباہ! اسی لئے تو بہن عقل کی دیوی  
نے ان کو پوڑھا کہا۔۔۔۔۔ لارڈ ویلنگٹون اب کھاکر بات کاٹ کر بولا  
”ضلالت پناہ! یہ جو کریاں معمولی مسلم باقوں پر جاتی ہیں، یہ صحیح بتائی نہیں  
کر سکتی ہیں! میں نے جہاں تباہ سے بالکل صحیح عرض کیا ہے کہ بڑا خطرہ ہے!  
حضور میں دو امور کی طرف سرکاری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، ایک  
تو یہ کہ انگلستان میں وہ جماعت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو نوآبادیات  
و مقبوضات کو حکومت خود اختیاری دینا پسند کرتی ہے، چنانچہ مالی ماحد  
ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ ڈومنین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، گناڈا،

لارڈ ڈیول نے جبکہ کرحس ہاتھ سے تلوار ملی تھی اُس کو چوم لیا۔ پھر وہ بولا "میں ضلالت انتساب کے اس اعتماد کا حد درجہ منہن ہوں اور حضور عالی کو یقین دلانا ہوں کہ شیطانی قدرت میں جتنی تدبیریں، چالیں، عیاریاں اور مکاریاں ہیں میں اُن سے کام لینے سے اپنے مالک میں ہازنہ آؤں گا؟" شیطان مسکرایا، اس نے گورنر کے منجھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ دیا، پھر لارڈ ڈیول پیچھے ہٹ کر اپنی کرسی پر اور شیطان اپنے تخت پر بیٹھ گیا۔



وزیر نے آواز دی ہز کیلنٹ کیٹن فورٹ:-

۔ عالی جاہ: سال رواں میں مالک محرمہ اٹالیہ، جمنی و اسپن، میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے ہمیں کسی قسم کی کوئی مایوسی ہو، اٹالیہ میں آزادی معدوم ہے۔ جسٹس کے ساتھ بیہانہ سلوک میں کوئی کمی نہیں، اور جب تک ہمارے دوست فیضوں کی حکومت ہے، ہر لمحہ ہیں نئی طرح کی کامیابیوں کی امید ہے۔ اسپن کی خانہ جنگی اور خاندان بربادی پورے زور و شور سے جاری ہے، نسل انسانی کے انقطاع اور انسانیت کے مٹانے کی کوشش روز افزوں ہیں، خون انسانی سے برابر ہونی کھلی جا رہی ہے، اور ہماری ہر طرح سرخروئی ہے! اب رہا جرنی تو وہاں کے باشندوں کے آپس کے اتحاد و اتفاق، نیز علم و عقل سے بڑا خطرہ تھا، مگر وہاں یہودی و آریہ کے سوال نے ہماری کامیابی کے ہیئت سے امکانات پیدا کر دیے، اور ہم نے ان مواقع سے خوب خوب فائدے اٹھائے، چنانچہ تمام ایسے لوگوں کو جو اقلیم علم و ادب پر حکمرانی کر رہے تھے ملک سے جلا وطن کر دیا، اور جرنی کو ہمارے خاص مالک، اٹالیہ اور جاپان کا حلیف بننے پر مجبور کر دیا، میں شاہ جم جاہ کو اپنے مالک کی طرف سے اطمینان کئی دلاتا ہوں، آدم کا خدا لاکہ چاہے مگر ابھی صدیوں تک ان مالک کی ارواح ہماری ملکیت خاص رہیں گی! شیطان نے خوش ہو کر کہا: مرحبا! مرحبا! ایں کارا تو آید و مردواں جنیں کشتہ!

وزیر اعظم نے پھر کھڑے ہو کر آواز دی: کامریڈ سٹینسکی!

ایک سو کھاسا عفریت جس کے چہرے کی قطع بالکل روسی بھالوسے ملتی تھی اٹھ کر کھڑا ہوا، اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا: جہاں تباہ مجھے خطرہ ہے کہ میری رپورٹ لارڈ ڈیلوں کی رپورٹ سے بھی زیادہ ناپسند کی جائیگی۔ میں عالی جاہ کی طرف سے مالک روس، سائبیریا، ترکستان و بلقان وغیرہ میں نمائندہ ہوں۔ مگر سرکار والا بتا رہا ہے کوئی دل خوش کن خبر گوش گزار کرنے سے معذور ہوں۔ سرکاری ملکیت کے اس خطے کے سب سے بڑے حصے میں سرمایہ داری اور امانت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اور انسانی دماغوں نے ہمیں شکست دینے کی ہر صورت اور ہر تدبیر اختیار کر لی ہے، مذہب، ظاہر و باطن جو ہمارا سب سے مضبوط اور مستحکم قلعہ تھا اور جس کے اندر چھپ کر ہم نے اب تک بڑے سے بڑے دشمن کا مقابلہ کیا ہے وہ روس میں بالکل سار کر دیا گیا، ان

میں آپس کی مروت، اخوت و خلوص روز افزوں ترقی پر ہے مساببات کا خیال اس قدر خطرناک طور پر پھیل گیا ہے کہ مجھے بھی اپنے نام سے ہنزادے کا شاذاً لقب نکال دینا پڑا اور اُس کی جگہ پر کامریڈ کا سا حقیر و ذلیل لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہی حالات رہے تو مستقبل قریب میں یہ تمام مالک ہمارے ہاتھ سے بالکل نکل جائیں گے.....!

شیطان نے گہرا کر پوچھا: تو نے اُس کے اسناد کی کوئی تدبیر نہ کی؟ کامریڈ نے کہا: جہاں تباہ! مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں کر رہا ہوں اور میں عالی جاہ کے سامنے اس کا اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی اسکیموں میں کیتان فورٹ سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے! یہ کہتے کہتے وہ کیتان کی طرف دیکھ کر ذرا سا جھک گیا، کیٹن نے بھی نصف قد سے کھڑے ہو کر اس عظیم کا جواب دیا۔

کامریڈ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: مگر ضلالت نسب! میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور و فکر کے لئے کابینہ کا ایک خاص جلسہ حضور کی ذاتی صدارت میں جلسہ سے جلد منعقد کیا جائے۔ تاکہ تمام ہیروؤں پر بحث کر کے حریت و مساوات کی اس ہر کو روکنے کے لئے کوئی موثر اقدام کیا جاسکے۔

شیطان نے وزیر اعظم کی طرف دیکھ کر کہا: اچھا آج بارہ بجے کابینہ کا جلسہ ہوا!

وزیر اعظم تعظیماً جھکا اور اُس نے ایک کاغذ پر یہ حکم نوٹ کر لیا۔ پھر وزیر اعظم نے آواز بلند بکارا: "مسٹر ڈالر!" ایک لمبا سوکھا سا عفریت کھڑا ہوا، اور اُس نے سخت کے سامنے تعظیماً جھکنے کے بعد کہنا شروع کیا: جہاں تباہ! کامریڈ سٹینسکی کی رپورٹ کے بعد غالباً میری رپورٹ حضور کے لئے حد درجہ خوش کن ہوگی، حضور کے اس ادنیٰ ترین خادم نے مالک امریکہ کے دلوں پر اس طرح قبضہ کر رکھا ہے کہ چاہے دنیا کے سارے مالک سر تابی و روگردانی کی حثارت کر بیٹھیں، مگر جو مالک اس غلام کو سپرد کئے گئے ہیں ان کو اس طرح کی سر تابی کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ان مالک کے ہر شعبہ زندہ گی کو جو سر زریں رنگ دیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے آدمیوں سے لے کر بڑے سے بڑے قائدین تک ہر ایک میری ہی خدمت اور میری ہی محبت میں

جاتے ہیں جن کا ذکر حقیر نے اپنے مالک کے سسے میں کیا ہے :

مسٹر ڈالر کا چہرہ سُرش ہو گیا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیں کامریڈ سٹینسکی اُٹھ کھڑا ہوا، اور کہنے لگا۔ عالی جاہ! مجھے ڈالر کے خیالات سے اتفاق ہے لارڈ ڈیل نے جس خطرے کا اظہار کیا ہے وہ یقینی امریکہ میں موجود ہے، مگر میرے لائق دورت مسٹر ڈالر نے اس طرح دلوں پر سکھ مارا ہے کہ سارے جذبات اخوت و مساوات و حریت بجائے ہیں نقصان پہنچانے کے خاص ہمارے آلہ کار بن کر رہ گئے ہیں۔ اور حضور اس کا یقین رکھیں کہ مستقبل قریب میں ہی نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بھی امریکہ کی ساری جنگیں محض تجارتی جنگیں ہوں گی اور اس کا مقصد انسانیت کا فروغ نہ ہو گا، بلکہ صرف حصول زرا دار اپنے لئے منڈیاں بنانا۔ کامریڈ اپنی جگہ پر مسکرا کر اور لارڈ ڈیل غل اور منفعل ہو کر مچھٹ ہو گئے۔

”مسٹر ڈالر نے جوش سے کہا: حضور! کامریڈ کی تقریر کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ مالک امریکہ میں سرکاری فتح کا ذمہ دار ہیں اور حضور کے اقبال سے ابھی صدیوں ہماری ہی فتح ہو کر رہے گی!“

شیطان نے خوش سو کر کہا۔ شا باش! شا باش! محکوم ہی جیتے، دے تیر پسند ہیں۔

مسٹر ڈالر نے جھٹک کر سلام کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

وزیر اعظم نے کھڑے ہو کر، آواز دی ہنر کینسی نصیحت پاشا:

ایک عفریت اُٹھ کر کھڑا ہوا، جس کی صورت باطل بلڈاگ کتے کی ہی تھی، اُس نے تعلیم سے دُسرے ہو کر کہا۔ اب الٹ باطلین! میں حضور کی پرورش سے مغربی ایشیا کا حاکم ہوں، سالی رداں کی رپورٹ میں سوائے افسوسناک وانا کے بیان کے اور میں کچھ نہیں پیش کر سکتا۔ میں بیت خائف ہوں کہ میں سوائے ایک خاص امید کی جھلک کے، جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا اور کوئی امید اپنے مقاصد کی تبلیغ کی نہیں پاتا ترکی میں مصطفیٰ کمال کی پالیسی، ایران میں رضا شاہ پہلو کی پالیسی، مصر میں سخاس پاشا کی پالیسی ہمارے اقتدار کا سرسراہ خاتمہ کر رہی ہے، پھر یہ جو اسلامی مالک میں اتحاد و اتفاق کے ميثاق و معاہدے ہو گئے ہیں انہوں نے ہماری کارروائیوں پر ضرب کاری لگا دی ہے، اخوت اسلامیہ اور عام ہمدردی کا خیال بڑھتا جا رہا ہے، اکثر نہ ہی پیشوا جو ہمارے خاص آلہ کار رہے ہیں، روز بروز ان تمام مالک میں شک کی نظروں سے دیکھے جانے

سرشار ہے۔ کہنے کے لئے ان مالک میں حریت و آزادی، اخوت و مساوات سب کچھ ہے۔ مگر میں سرکار کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب میری محبت کے نتائج ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں صرف دو باتیں مثلاً پیش ہیں۔ ان مالک ہم دوسرے میں صرف دو شہروں کی عام زندگی پر غور کرنا کافی ہو گا۔ ایک تو شکاگو، دوسرے سین فرانسسکو، اگر ان دونوں شہروں کے واقعات قبل کی فہرست تیار کی جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا، کہ حصول زر کی ہوس میں جتنے خون امریکہ کے ان دو معمولی شہروں میں ایک سال کے اندر کئے جاتے ہیں اتنے اس مدت میں مشرق و مغرب کے اکثر پورے پورے مالک میں نہیں واقع ہوتے، دوسری بات جو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنے والا ہوں وہ ان مالک کے حبشیوں کی حالت ہے، حضور سے پوشیدہ نہیں کہ ایک زمانہ میں ہمارے کردہ کا ایک بیت بڑا دشمن اس نام نہاد و جہوریت کا صدر ہو گیا تھا اور اس نے غلامی کے سے ذریعہ مسلک کا خاتمہ کرنا چاہا، اول تو حضور کے اقبال سے ہم نے ایک خانہ جنگی کے ذریعہ اس مسئلہ کو اتنی طوالت دی کہ لاکھوں جانیں گئیں، اور پھر جب ہمیں شکست ہو گئی تو ہم نے سفید فاموں کے دلوں میں جذبہ عناد و حقارت کو اس طرح شعل کیا کہ وہ ایک خفیہ انجمن۔ کلکلو کلاں کے نام سے قائم کرنے پر مجبور رہے۔ حضور کے خادم کو اس بات کا فخر ہے کہ وہ انجمن اب تک اپنی پوری طاقت کے ساتھ قائم ہے۔ گو حبشی غلام کے لفظ سے نہیں یاد کئے جاتے مگر حقیقت میں سفید فام قومیں انہیں غلاموں سے بدتر سمجھتی ہیں، اور کلکلو کلاں والے ان سے بالکل اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں جس طرح کاسلوک شکا جی جنگی جانور کے ساتھ کرتے ہیں، جہاں تباہ! میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ مگر سرکار کو اس کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جب تک اس ناچیز کا ساتھ ان مالک والوں کے دلوں پر ہے اُس وقت تک آدم کے خدا کی ساری قوتیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں!“

لارڈ ڈیل نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر لرزتی ہوئی آوازیں کہا۔ حضور عالی مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست مسٹر ڈالر نے غالباً اس دربار کی فتنائے متاثر ہو کر تصویر کا صرف ایک ہی رخ پیش کیا ہے وہ اس عام جذبہ ہمدردی و انسانیت و مساوات کو نظر انداز کر گئے جو جدید امریکہ میں روز بڑھتا جا رہا ہے اور جس سے اسی طرح کے خطرات پیدا ہوتے

”سادن کے اُن داتا ہمارے رپورٹ سرکاری اقبال سے فتح ہی فتح کی ہے۔ ہمارے پوربی ایشیا میں سرکار ہی کا راج ہے، ہم نے چین میں آگ لگا رکھی ہے۔ روزانہ کئی ہزار آدمی مارے جاتے ہیں، جوان عورتیں، بیوہ، باور چھوٹے بچے قیم ہو رہے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا مذہب ہے اپنا پر مود و حرمان، تبت میں آج تک سب سے بڑا لالچ نہیں ہو سکا ہے، اپس کی رز کشی جاری ہے، اور ایشیا کا تاج ہندوستان تو خاص اپنا گھر ہے، وہاں کی سرکار تو ہماری اسلیم کی پابندی ہے۔ البتہ کچھ خطرہ ایک ٹوکے سے بننے سے

قطع  
 تیلانی چھلیوں کی شیشیوں سے جس طرح  
 سطح پر تالاب کی لپٹنے میں ملتے بار بار  
 لپٹ نہیں دل کی لڑائی ہم کے ہاتھوں ہر نفس  
 میری خبر میں رہتی تھی تھکتا ہے غبار  
 چلتی

# خیام

## مدن مراری لال سکینہ

اب رہا فخر جبریل کا انگریزی ترجمہ اس کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب عطار اللہ صاحب نے شاید بہت ہی سلی نظر سے اس کو دیکھا ہے وہ اس قدر سخت الفاظ کا جبریل کا ترجمہ سب سے زیادہ بھل اور ناقص ہے۔ استعمال کرتے، حیرت قویہ ہے کہ وہ جبریل کے ترجمے کے بھل ہونے کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ جبریل نے ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ خیام کے خیال کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے، وہ شاید نہیں جانتے ہیں کہ ایف زبان کی تصنیف کے ترجمے دوسری زبان میں جو کامیاب ہوئے ہیں، وہ ترجمے کے اسی بڑے اصول کے ماتحت کہ مترجم مصنف کے خیال کو اپنی زبان میں ادا کرے، اور یہ اصول اس وقت تو بالکل ناگزیر ہوتا ہے جب مترجم کو ایک غیر زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں ترجمہ کرنا منظور ہوتا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ فارسی زبان کے شعر کا ترجمہ صرف اردو زبان ہی کے شعر میں ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ لفظی بھی ہو اور اہل شعر کے اثر کو جیت لے سکے۔ اس لفظی ترجمے کے سخت اصول کو دوسری زبانوں کے مترجمین پر عائد کرنا غلطی ہے، جناب عطار اللہ صاحب کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ ”یہی وجہ ہے کہ یورپ نے خیام کو خوش آواز کہا، ورنہ اگر صحیح معنی میں ترجمہ ہوتا تو شاید اسے وہ مقبولیت نہ حاصل ہوتی جو اس وقت ہے“ مگر ان کے کہنے کا انداز یہ ہے کہ گو یا فیئر جبریل نے خیام کے ساتھ بڑی بے انصافی کی جو اس کو ایک مائوس شکل میں اپنے وطن والوں کے سامنے پیش کر دیا، اگر جناب عطار اللہ صاحب کا یہ خیال کہ فیئر جبریل نے خیام

جناب عطار اللہ صاحب پادری کا معنوں جو رباعیات خیام کے ترجموں کے متعلق حکیم کے اگست نمبر میں شائع ہوا ہے میری نظر سے گزرا، معنوں کا خاص متعدد جناب آغا ظفر علی بیگ قزلباش شاعر و ہوی کے رباعیات خیام کے اردو ترجمے کی تشریف ہے۔ جناب آغا شاعر کے ترجمے کی خوبیوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ممکن ہے جس کا جناب عطار اللہ صاحب کا خیال ہے کہ وہ رباعیات خیام کے سب سے بڑے مترجم کہے جانے کے مستحق ہوں کیونکہ وہی ہر ہے کہ جتنا ہر اعتبار سے اچھا ترجمہ ایک فارسی شعر کا اردو زبان میں ہو سکتا ہے اتنا اچھا کسی دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا، لیکن ایسی حالت میں کہ جب دنیا کی تمام زبانوں میں متعدد ترجمے رباعیات خیام کے ہو چکے ہیں بغیر کسی تحقیق کے جناب آغا شاعر کو رباعیات خیام کا سب سے بڑا مترجم کہنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ جناب عطار اللہ صاحب نے شاید اتنا کافی سمجھا کہ اگر وہ فخر جبریل کے انگریزی ترجمے اور جناب کاشی پریاگی کے اردو ترجمے کو گرا کر دیکھ دیں تو جناب آغا شاعر کا سب سے بڑا مترجم ہونا ثابت ہو جائے گا۔ جناب کاشی پریاگی کا اردو ترجمہ جس کے متعلق جناب عطار اللہ صاحب کا خیال ہے کہ ”وہ بہت مشہور ہے“ میری نظر سے ابھی تک نہیں گزرا، لہذا کوئی رائے زنی نہیں کر سکتا، البتہ ان کی دو رباعیاں جو جناب عطار اللہ صاحب نے اپنے معنوں میں نقل کی ہیں ان سے جناب کاشی پریاگی کے ترجمے کے ناقص ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

سے متاثر ہو کر کبھی گئی ہیں جو صرف تخلص کے ایڈٹین میں موجود ہیں ۲  
رباعیوں میں خیام کی جھلک پائی جاتی ہے، ۳ رباعیاں عطار کی رباعیوں  
کا ترجمہ ہیں، اور ۴ رباعیاں خیام کی رباعیوں سے متاثر ہو کر کبھی گئی  
ہیں، مگر حافظ کا رنگ غالب ہے۔

جناب عطار اللہ صاحب ایک رباعی کے متعلق جس کا ترجمہ فیئر جیرلڈ  
نے کیا ہے لکھتے ہیں کہ جیرلڈ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ رباعی خیام کی نہیں،  
بلکہ کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مولانا روم کی رباعیات میں پائی جاتی  
ہے یہم یہ نہیں کہتے کہ اس رباعی کا مولانا روم کی طرف منسوب ہونا نامکن  
ہے، مگر جناب عطار اللہ صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ فیئر جیرلڈ  
نے اپنے ترجمے کے واسطے ایک قدیم رباعیات خیام کے نسخے کی مدد لی  
تھی، جس کی تاریخ کتابت ۷۹۶ھ ہے، اور جو ایک مدت سے آکسفورڈ  
کی بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس نسخے میں یہ رباعی نمبر ۱۲۱ پر  
پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ یہ رباعی دو اور رباعیات خیام کے قدیم  
نسخوں میں موجود ہے، جو پیرس کے کتب خانے میں محفوظ ہیں، اس کے  
علاوہ ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ خیام کی کسی رباعی کا کسی دوسرے  
شاعر کی رباعیوں میں مخلوط پایا جانا ہی محض اس امر کی کافی دلیل کس  
طرح ہو سکتی ہے کہ وہ خیام کی رباعی نہیں ہے!!

کو ایک گڈی ہوئی شکل میں پیش کیا ہے تو مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے،  
اس وقت میرے سامنے سر و تخلص آدھو داتا رڈ پٹی فائنٹل سکرٹری ایچ  
ای ۲ سچ نظام گوڈنٹ کامرہٹی زبان میں ترجمہ رباعیات خیام کا موجود ہے،  
اس میں مترجم نے خیام کو خالص ہندی لباس میں پیش کیا ہے، مثلاً جہاں خیام  
دنیا والوں کو اسے دوست و خطاب کرتا ہے وہاں مترجم خیام کی بات کو  
کرشن کے منہ سے اُودھو کو سنانا ہے، جناب عطار اللہ صاحب شاید  
اس قسم کے ترجمے سے تو نفرت ہی کریں گے، کیونکہ داتا ر صاحب فیئر جیرلڈ  
سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ گئے ہیں، میرے خیال میں ان دونوں ترجمین  
نے اپنی اپنی زبان کے لئے بڑی خدمت کی ہے، انھوں نے ترجمے کی غرض  
کو سمجھ کر کام کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے تبغ نضر جناب عطار اللہ صاحب کا یہ خیال  
بھی تو غلط ہے کہ جیرلڈ کی ایک رباعی بھی ایسی نہیں ملے گی جسے خیام کی  
رباعی کا صحیح ترجمہ کہا جاسکے، انگلستان کے مشہور محقق ایڈورڈ ہیرن  
ایلن نے فیئر جیرلڈ کی رباعیوں کا خیام کی رباعیوں سے مقابلہ کر کے یہ بات  
ملے کی ہے کہ فیئر جیرلڈ کی ۱۰۱ رباعیوں میں سے ۴۹ رباعیاں خیام کی  
رباعیوں کا لفظی ترجمہ ہیں، ۴۰ رباعیاں ایسی ہیں جن میں خیام کی ایک  
سے زیادہ رباعیوں کا مفہوم شامل ہے۔ ۲ رباعیاں خیام کی اُن رباعیوں

## سرود و قص

سرود و قص کو مسلم پر کر رہے ہیں ہر سام  
علوم دیں میں ہیں ہر چند وہ بلند مقام  
جہاں میں جبکہ مسلمان کو تھے ہزاروں کام  
کبھی تھا غور طلب صلح و آشتی کا پیام  
کبھی تھی فکر مداد اے خاطر سیر ایتام  
ہے انقلاب زمانہ سے دشمنوں کا غلام

غضب ہے آج بھی اپنے میمنستانِ جلیل  
خبر نہیں ہے بچاروں کو اس حقیقت کی  
یہ چیزیں شرع میں جائز نہ تھیں مگر اس وقت  
کبھی تھی قلعہ کشائی بھی عصف آرائی  
کبھی تھی کام روائی کبھی تھی عدل گری  
لیکن اب کہ وہ مردِ جہاں کشا و عظیم

سرود و قص سے دل کو اگر نہ بہلائے

تو کانٹے کیے غلامی کے تلخ و سست ایام

# پشیمانی

وجاہت سندیلوی بنی اے

ہم لوگوں کی دوستی اور محبت کو اپنی خوش تنگیمی نگاہوں سے نہ دیکھ سکے گی، کیا ایسا نہ ہوگا؟ نہیں ضرور ہوگا عذر، ابھی میری زندگی کے، جوانی کے، بہت سے چھلے دن اور بہانی راتیں باقی ہیں۔

طلعت نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ اور انگڑائی لیتے ہوئے پاس ہی ایک صوفہ پر بیٹھ گئی، اُس نے اپنے ننھے سرخ ریشمی رد مال سے اپنی پشیمانی کا پسینہ پونچھا اور آنکھیں پھاڑ کر ان کو روشن بنانے کی کوشش کی۔

اب مجھے کیا فکر ہے؟ کچھ نہیں، لیکن..... میں پریشان کیوں ہوں۔ میرا دل دھڑکنے کیوں ہے۔ میں اس کی دھڑکن روکوں گی۔ میں قہقہہ لگاؤں گی، میں پانچ بجائوں گی۔ میں گھاؤں گی مجھے فکر کیا ہے؟ کیا میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہو۔ کیا میں اپنی کمزوری پر نادم ہوں؟ شاید ہاں، لیکن؛ لیکن؛ اس دہائی چاندنی رات کی داستان تو میری کتاب زندگی میں سنہرے الفاظ سے لکھی ہوئی ہے۔ شباب کے مستلحات کی اُس یاد کو تو میں اب بھی اپنا رب سے زیادہ عزیز خواہ سمجھتی ہوں، کیا میں ان..... لمحات کو واپس حاصل کر کے لئے اپنا سب کچھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ کیا میں نادم ہوں، نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ کیا میرا ضمیر مجھ کو ملامت کرتا ہے؟ ان فردوسی میٹھ کے لمحات کے لئے تو میرا دل چلا جاتا ہے! پھر میں کیوں پریشان ہوں۔ پھر کیوں میرا دل دھڑکتا ہے! کیا گناہ کے خوف سے؟ کیا میں نے گناہ کیا؟ نہیں میں نے گناہ نہیں کیا! میں نے قربانی کی! میں نے کس کا گناہ کیا! میرے گناہ سے کسی کو کیا نقصان پہونچا؟ میں نے قربانی کی، قربانی اُس کے لئے! آہ کاش کہ میں اس کے لئے

جائزوں کی شام کی بڑستی ہوئی تار کی تھی۔ سائے چمن میں درختوں عجیب ستارٹا جھایا ہوا تھا۔ بڑستی ہوئی سیاہی میں وہ کھپتے معلوم ہوتے۔ صلی ہوئی گھر کی میں طلعت ایک سبز چادر اوڑھے کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں بجلی کی روشنی خشن کے اس شہکار کے قدم چوم رہی تھی، اور کمرے کی بیت سی قہجی اور خوبصورت اشیاء اور سامان چمکا چمکا کر اس کو بظور نذر عقیدت پیش کر رہی تھی، طلعت تنہا تھی، اور اپنے خیالات میں غلطی!

وہ سوچ رہی تھی، گنجان باغیچے کی بڑستی ہوئی تار، یہ کی زیادہ سیاہ تھی۔ یادہ تاریکی..... جو اس کے سینے میں بھٹی تھی!!! آج نسیم کیا کہہ رہی تھی، وہی پان والی کا قصہ، کیا اُسے معلوم ہے۔ نہیں..... شاید..... وہ مجھے بنا رہی تھی؟ اچھا نے مجھے کیوں گھر کی دی۔ وہ پہلے تو کبھی اس طرح بات بات پر خفا نہ ہوتی تھیں؟ لیکن اُنھیں کیا معلوم کسی کو کیا معلوم؟ یہ میرا خوف ہے، میں بہادر بنوں گی، میرے راز سے کوئی نہیں واقف؟ کوئی کیوں واقف ہونے لگا؟ کیا اُس نے کسی سے کہدیا؟ کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ راز صرف میرے ہی سینے میں محفوظ رہے گا! اگر وہ خود کسی سے کہدے؟ تو کیا میں انکار نہیں کر سکتی؟ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ آسمان بھٹا پڑے، زمین شق ہو جائے، سمندر اُمتڈ پڑے، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا، وہ میرا ہے، بالکل میرا! اس کا کاروبار دو دہائیوں میں ختم ہو جائے گا۔ پھر وہ میرے پاس آجائے گا۔ آجائے گا! آجائے گا! آجائے گا! پھر میرا شباب اس کے آغوش میں چمکے گا! وہ میرا ہوگا میرا! ہم اندھی سوسائٹی کو دکھانے کے لئے شادی کر لیں گے بس پھر چڑیں

سے کیوں جھینپوں۔ میں اُس کی کانٹھوں سے کیوں؟ کیوں؟ اپنا چہرہ زرد کر لوں۔  
میں اُس کے بے سخی مسخرے کیوں نہ جھپاؤں۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں نے ٹھیک  
کیا! اچھا کیا! خوب کیا! پھر میں کیوں چور بنوں، کیوں نہ بانیگ دہل اعلان  
کردوں، میں نے ایسا کیا! اور خوب کیا، اچھا کیا! لیکن، لیکن میں جانتی ہوں  
میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں۔۔۔۔۔ آہ! میں کیا کروں؟

چار ماہ گزر گئے:

وہ نہیں آیا! کیوں نہیں آیا؟ اُس نے کھا ہے وہ جلد آئے گا، لیکن  
کب؟ آہ! اُسے نہیں معلوم میں عنقریب ایک معصوم گھنگار کی ماں بننے والی ہوں۔  
آہ بھر کیا ہوگا؟ سب مجھے پوچھتے ہیں کہ میں اس قدر دُلی کیوں ہو گئی ہوں۔  
منوم کیوں رہتی ہوں نسیم پوچھتی تھی کہ میں نے پیٹ پر یہ کیا ہانڈو رکھا ہے؟  
آہ جب اُن کو معلوم ہوگا تو پھر! کیا ہوگا! تباؤ! تباؤ! میں کیا کروں گی!!  
طلعت! چنچ! اٹھی۔

میں کیوں نہ کہدوں۔ سب سے کہدوں، چنچ! چنچ! کہدوں، کوٹے  
پر چڑھ کر کہدوں! لیکن کیا میں کہہ سکوں گی۔ آہ! یہ میرے گلے میں کیا ٹھسا  
جاتا ہے۔ میرا دل کیوں تھک رہا ہے، میں کما ہوتی کیوں ہوں!!

۔ میں آخری دفعہ اُس کی تصویر تو سینے سے چٹا لوں یہ کہہ کر طلعت  
نے ایک تصویر اپنے سینے سے چٹالی، اُسے آنکھوں سے لگایا، اور ایک  
پڑجوش بوسہ دیا۔

اسٹول پر کھڑے ہو کر چپت سے لٹکا ہوا ہینڈا اُس نے اپنے گلے  
میں پہن لیا اور پیر سے اسٹول زمین پر گرادیا۔

چند سکند میں اس کا نازک خوبصورت جسم ترپنے لگا۔ جوانی کی  
موٹ کی تڑپ اور حسین آنکھوں کا حیرت بھرا قسم!!

طلعت کے دماغ میں آخری خیال یہ تھا "کاش کہ میں سوسائٹی سے  
نہ ڈرتی!!"

## ضروری اطلاع

خط و کتابت کرتے وقت اپنا چٹ نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجے۔ (منیجر)

ادب سے قربانی کرتی! گناہ سے میں نہیں ڈرتی، لیکن، لیکن، ہاں شاید میں اُس  
چڑیل سوسائٹی سے ڈرتی ہوں، اس کی کیسی کیسی سخی خیر اشتباہ آمیز نگاہیں مجھ پر  
پڑتی ہیں۔ کیا اُسے میرا راز معلوم ہے! میں اُسی سے ڈرتی ہوں، اُسی چوڑ  
چڑیل سے!!

آخر میں اس سے کیوں اس قدر ڈرتی ہوں، اپنے گناہ کے باعث؟  
لیکن میرا گناہ ہی کیا ہے؟ کیا جیسا میں نے کیا دلیا، سوسائٹی کی کوئی اور لڑکی  
نہ کرتی۔ وہ سہائی رات اور وہ تنہائی! وہ کتنا خوبصورت تھا۔ اس نے کیسے  
میرے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا، اور اپنے آغوش میں مجھے کھینچ لیا، کھینچ لیا، بھیج لیا،  
اُٹ اُس کے گرم خوبصورت خوشبو دار سینے سے میں کس اطمینان سے جھٹکتی۔  
میں نے ساری دنیا ٹھکرا دی، اور اپنا سب کچھ ان چند لمحات نیش پر تنج  
دیا۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ کوئی اور کیا کرتا! کیا دنیا کی کوئی عورت اس وقت  
اس کو ٹھکر سکتی تھی!

ابا جان، دورے پر گئے تھے۔ اتنی اور سب نیچے تھیں، میں نے اپنا  
کوٹھا اندر سے بند کر لیا وہ پاس ہی کے دروازے سے باہر سے آگیا!  
تنہائی، جوانی، چاندنی رات!!

گناہ! میں نے ہرگز گناہ نہیں کیا، میں ہرگز نادم نہیں، میں پھر  
دہی کرنے کو تیار ہوں۔ میرے پسینہ کیوں نکلتا ہے۔ میرے ہاتھ پیر کیوں  
ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں، اُس بُدھی کھڑکٹ بد صورت  
کوڑھی چڑیل سے جس کو سب سوسائٹی کہتے ہیں، جو صرف بنی ہی ہے اس  
کہ کزردوں کو ڈرائے دھمکائے، اور طاقتوروں سے عصمت فروشی کرے!!  
عصمت! کیا میں عصمت فروش نہیں؟ عصمت ہے کیا؟ صرف کٹوارا پن، یا  
خیالات کی پاکیزگی۔ میں کنواری نہیں رہی؟ لیکن کیا میں نے اپنی عصمت  
کھو دی، لیکن کیا میں نے سمجھ بوجھ کر ایسا کیا؟ یا میرے اللہ میں کیا کروں!  
میرا دل کیوں گھبراتا ہے؟ میرا سینہ لرزتا کیوں ہے؟ میں کیوں نہ  
علن پھاڑ پھاڑ کر سوسائٹی سے کہدوں، مجھے اس سے محبت تھی، وہ میرے  
لئے دیوانہ تھا، ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے میں فنا کر دیا۔

ہماری جوانی، جوانی، شادی کے ڈھکوسلے کا انتظار نہ کر سکی، ہم ایک ہو گئے  
ایک!! اور زندگی بھر ایک ہی رہیں گے، فساد کی چڑیل سوسائٹی کو جو کچھ  
کہتا ہو کرے! وہ میرا کیا کر سکتی ہے؟ تجھ نہیں۔ میں اس کی چڑھات ٹھٹھاتی



# تعلیم دیہات

محمد ضیاء الاسلام بی۔ ایس۔ سی۔ پی۔ ایس

تعلیم دیہات کا مسئلہ ہماری ترقی کے نقطہ نگاہ سے اتنا ضروری ہو گیا ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے کہ اس پر ہر اس شخص کی توجہ ہونی چاہیے جو دیہات میں اس تاریکی کو جو عام لوگوں پر طاری ہے دور کرنا چاہتا ہے اور اس طرح ہمارے دیہات کے بھائیوں کو قومی زندگی میں وہ حصہ دینا چاہتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں، اور جو ملک کا قافلہ ان کو دے چکا ہے، لیکن جس کو وہ شاید ابھی تک صحیح طور پر استعمال کرنا نہیں جانتے۔

آج کل سمولی گاؤں میں عموماً پرائمری درجہ چار تک کے اسکول ہیں، اور بڑے گاؤں میں مڈل اسکول ہیں جو ڈسٹرکٹ بورڈس کے زیر انتظام ہیں۔ ان مدرسوں میں، ہندی، اردو اور جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے، کہیں کہیں ورزش اور کچھ کمین شلٹ بال یا بالی بھی رائج ہیں۔ نیچر اسٹڈی بھی کسی مدرسہ میں داخل نصاب ہے تعلیم کتابوں کے ذریعہ دی جاتی ہے، جو تقریباً ہر سال بدلتی رہتی ہیں، اور جن کے چناؤ میں عموماً ذاتی اغراض و مقاصد اور ذاتی تعلقات بڑا حصہ رکھتے ہیں۔ دستکاری، زراعتی تعلیم اور فارمنگ وغیرہ ایک فیصدی اسکولوں میں بھی داخل نصاب نہیں ہیں، دیہات میں جو تعلیم عموماً دی جاتی ہے اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ زندگی کے شعبوں میں کارآمد نہیں ہوتی، اور نہ دیہاتی زندگی کے شعبہ نصاب تعلیم میں داخل ہیں۔ اس طرح جو

میں اس معنوں کا کچھ مد آل انڈیا، ریڈیو دہلی، ایشیائے، اور دیگر شہر کو نشر کیا گیا تھا۔

فیلج درمیان میں حائل ہے وہ بہت وسیع اور خطرناک ہے پھر موجودہ تعلیم سے بچوں میں تعلیم کھینچ پیدا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد درجہ چار تک بھی نہیں پہنچتی اور درمیان میں ہی مدرسہ چھوڑ کر گھر مٹی جاتی ہے، طرز تعلیم کے غیر دلچسپ ہونے کا دوسرا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اسکول سے نکلنے اور دیہاتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مدرسوں میں جو پڑھا لکھا تھا وہ رفتہ رفتہ دماغ سے زائل ہو جاتا ہے، اس کی ذمہ داری کچھ تو طرز تعلیم پر ہے اور کچھ ان ذرائع کے میسر نہ ہونے پر جن کی وجہ سے جو تعلیم مدرسوں میں ملتی ہے ان کی تکمیل گھر پر ہو سکے۔ بچوں میں نہ کتب خانے ہیں نہ اخبار مل سکتے ہیں، اس لئے ان لوگوں کی دیہاتی زندگی اور تعلیم میں کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کم از کم ۲۰ فیصدی ایسے لوگ جنہوں نے درجہ چار بھی پاس کر لیا تھا دس بارہ سال بعد حساب کتاب نہیں لکھ سکتے اور اپنے لگان وغیرہ کا حساب بھی پڑوسی یا اسکول کے ماسٹر صاحب سے لکھواتے ہیں۔

گاؤں کے مدرسوں کے استاد بدستہ سے بہت سمولی قابلیت کے ہوتے ہیں۔ اس میں ان بچا پروں کا تو کوئی قصور نہیں، لیکن ان کا اثر ہماری دیہاتی زندگی پر غلط خواہ طور پر اچھا نہیں پڑتا، ان کی دماغی نشوونما اگر ہوتی بھی ہے تو بہت سمولی، ان میں عام طور پر نہ ولولہ ہوتا ہے نہ جوش۔ جس نفا میں وہ رہتے ہیں وہ اس کی ذمہ دار ہے، نہ ان میں قوت عمل ہوتی ہے نہ جوانی خیال جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں کے مدرسہ جن میں زندگی کی تڑپ پائی جانی



چاہئے ان میں نیم مڑوہ دماغ ملتے ہیں۔ پچاس مدرسوں میں شاید ایک پُر جوش استاد مل سکے۔ ٹرینڈ استادوں کا اب نمبر بڑھ رہا ہے، لیکن ٹرینڈ استادوں میں بھی وہ بات نہیں پائی جاتی جو دیہاتی تعلیم کے لئے ضروری ہے یعنی جوش عمل اور تخیل۔ جو بڑے بزرگ ان کو ملتی ہے وہ ان کو کتاب میں پڑھانے کے لئے شاید زیادہ موزوں کر دیتی ہو، ورنہ اس کے علاوہ اس کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوتا۔

ہم تعلیم بالغان کی طرف تو کبھی متوجہ ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوئے بھی تو مشکلات ایسی حائل رہیں کہ تعلیم بالغان کی کوئی اسکیم قابل عمل نہیں ہو سکتی۔ دیہات میں لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی توجہ دینا بھی باطل غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، لیکن ترقی دیہات کی ہر اسکیم میں اس مسئلہ کو جو متنازعیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی لڑکیاں بچوں کے ساتھ اسکول جاتی ہیں، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ مدرسہ چھوڑ دیتی ہیں، اور اس کے بعد ان کو تعلیم جاری رکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔

انتظامی معاملات میں بھی وہ ترتیب نہیں ہے جو چھوٹی چاہیے۔ مثلاً استادوں کا تقرر ظاہر میں کسی خاص اصولوں پر ہو لیکن عموماً اس میں سفارش ذاتی تعلقات اور مذہبی تعصب کو بہت دخل ہوتا ہے، استاد بھی دل پر بڑی کی سیاسیات کا شکار ہونے رہتے ہیں اور پارٹیوں کے آل کار بنائے جاتے ہیں۔ تبادلو کی تلواریں ان کے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے جس کی وجہ سے نہ تو کوئی اسکیم پورے طور پر کارگر ہو سکتی ہے اور نہ اسکولوں میں ذاتی اثر جس کی مدد میں ضرورت ہے، کام میں لایا جاسکتا ہے۔ پھر دیہاتی اسکولوں کی فعلی پالیسی عموماً ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خود اس کی ضروریات سے ناواقف ہیں۔ اور جو لوگ اس سے واقف ہیں ان سے تعاون عمل کے خواہشمند نہیں۔ اس پالیسی کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے کہ تعلیم پر باوجود لاکھوں روپیہ صرف ہونے کے دیہات میں جو حالت دس سال قبل تھی اب بھی صورت حال اس سے زیادہ دل خوش کن نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے کہ ترقی و اصلاح دیہات صحیح معنوں میں ہو سکے اور ہمارے بھائی جو دیہات میں رہتے ہیں اور ہمارے لئے اتنی محنت سے کاشتکاری مبرا کرنا کام کرتے ہیں ان کو کبھی ہماری طرح معاملات سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں ملے دینے کی صلاحیت پیدا

ہو جائے، اور وہ بھی اپنی تعلیم سے اپنی زندگی کو بہتر اور زیادہ کارآمد بنا سکیں۔ اس کے لئے ہم کو طرز تعلیم میں تبدیلی کی لازمی ہے، نصاب تعلیم میں تبدیلی ضروری ہے، اور استاد بدلتے بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنا طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کی تبدیلی۔

پہلا قدم لڑکے لڑکیوں اور بالوں کے لئے ایک ابتدائی تعلیم کا لازمی قرار دیا جانا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ترقی دیہاتی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہو تو ہم کو بالوں کو بھی تعلیم دینا اور ان کو گاؤں کا کارآمد رکن بنانا لازمی ہے۔ اسی طرح لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دینا گویا ترقی دیہات کے سسٹم میں ایک خاص ضرورت انجام دینا ہے، لڑکے لڑکیوں اور بالوں کے لئے ابتدائی تعلیم کو ضروری بنانے کے واسطے کافی بہت کی ضرورت ہے، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ترقی و اصلاح دیہات کا کوئی پروگرام بغیر ابتدائی تعلیم کے جبر یہ اور لازمی قرار دئے جانے کے ممکن ہی نہیں ہے، امید ہے کہ جو صوبے بھی گرام سدھار کو ایک زندہ اور کارآمد اسکیم کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں ان کو بہت کر کے یہ کام کرنا باطل ناگزیر ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ اس بات کو ناپسند کریں، لیکن مخالفت اگر ہوگی تو دفعتی ہوگی اور تھوڑے عرصے میں ختم ہو جائے گی۔ یہ کام جتنا بڑا اور عظیم الشان ہے اس کو دیکھتے ہوئے ابتدائی جبر یہ تعلیم کو کوئی دشوار یا وقت طلب امر نہیں سمجھنا چاہیے۔

حکمر بند وستانی میں یا اس زبان میں جو ملک کے عہدہ علیحدہ حصول میں بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہو دئے جانے کے متعلق تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ مادری زبان میں تعلیم ابتدائی دئے جانے کے خلاف شاید ہی کبھی کوئی آواز بلند کی گئی ہے۔ طرز تعلیم میں — Direct method Practical کی بڑی کمی محسوس کی جاتی ہے، گرام سدھار کی تعلیمی اسکیم میں Practical اور Direct method کے علاوہ کوئی اور طرز ہی استعمال نہیں کیا جاتا چاہیے۔ ہر سرکل میں اسکول کے ساتھ ایک چھوٹا سا فارم ہل اور چھانے ہوئے سے عملی تعلیم دی جاسکے گی، اور تعلیم کے عملی اور پریکٹیکل اصول کام میں لئے جاسکیں گے جس سے تعلیم کی بنیادیں مضبوط اور یادگار ہو سکیں گی۔

بالوں کے لئے چھ چھ ہفتہ کی سجاوٹ خواندگی بنانا ماہرین تعلیم کا فرض ہے اور آبادی میں ایک صاحب جن کا نام سر اگر وال ہے، اور پنجاب میں مولائیں

در پینہ نہیں کریں گے۔ گورنٹ ان لوگوں کو کچھ تنخواہ تو دے گی ہی، اس کے علاوہ گھاؤں والوں سے بھی امداد کی ضرورت ہوگی۔ استاداؤں کو رہنے کے لئے مکان گھاؤں والوں کو خوشی سے دینا چاہئے۔ جہاں تک ممکن ہو گھاؤں میں ایسے استاداں بھیجے جائیں جو خود تو بالغوں اور لڑکوں کی تعلیم کی طرف توجہ دیں اور ان کی بیویاں عورتوں اور لڑکیوں کو پڑھائیں اس طرح روپیہ بھی کم خرچ ہو گا۔ اور استاداؤں کو اساتیاں بھی میسر آئیں گی۔ عورتوں کی تعلیم میں غلے کے حکام کی تعلیم یافتہ بیویاں بہت کچھ حصہ لے سکتی ہیں۔ اسی طرح سیدی سادی ہندوستانی میں لکھی ہوئی پڑاؤنٹیں شاعروں سے مدرسوں میں پڑھوائی جاسکتی ہیں، اور لوگوں میں اس طرح جوش عمل پیدا کیا جاسکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم کو استاداؤں کی زیادہ عزت کرنا ضروری ہے، استاداؤں کو نیچی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ ان کا احترام کرنا چاہئے، اور اس طرح ان کا رتبہ جس کے وہ ہماری قومی زندگی میں جاز طور پر حقدار ہیں ان کو دینا چاہئے۔ اس سے بہتر طبقہ کے لوگ کام کرنے کے لئے آمادہ ہوں گے، اور اخلاق کی صحیح تعلیم اسکول کے علاوہ لوگوں کو ان سے مل سکے گی۔ نصاب تعلیم ایسا بنانا چاہیے جس سے دیہاتی لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اچھے کاشتکار اور اچھے کواں واسے بن سکیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم ایک خاص عمر تک تو ساتھ ہی ہو سکتی ہے اور اس کے بعد علیحدہ علیحدہ۔

لڑکیوں کے اسکول میں ہندوستانی زبان، حساب، جغرافیہ پڑھانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دستکاری، سوت، سفائی، مویشیوں کی نگہداشت، تجارتی کاروں اور علاج، کھاد اور کھیتی کے متعلق معلومات، لڑکیوں کی فارینگ، فرسٹ ایڈ، قانون آرمی وغیرہ نصاب میں داخل ہونا چاہئے۔ یہ نصاب نہیں ہے کہ ایک دم لڑکوں پر اتنا بار ڈال دیا جائے۔ نصاب تعلیم جب تیار کیا جائے تو ہمیں یہ تمام معنایں اور اس قسم کے دیگر معنایں جن سے گھاؤں والوں کو فائدہ پہنچ سکے ضرور سمجھانے چاہئیں۔ تاکہ اسکول سے فارغ ہو کر وہ کھیتی بہتر طریقہ سے کر سکیں، اور اس طرح زندگی اپنے باپ دادا سے بہتر اور زیادہ آرام سے گزار سکیں۔ لڑکوں کی عمر اور درجے کے مطابق یہ معنایں ان کو پڑھائے جائیں اور جو جوں جوں وہ بڑے درجے میں پہنچتے

اور سی پی میں پیپر یا میں اس قسم کی اسکیمیں وضع کی جا رہی ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی مکمل لڑا سی اسکیم ایسی بن چکی ہے جو عام طور پر رائج ہو سکے، لیکن جو کام اب تک کیا جا چکا ہے وہ کافی امید افزا ہے، اب ہمارے ماہرین تعلیم کو سبائے علمی معائنہ پر تکتے ہیں، تعلیم کے ہیچ در ہیچ سائنس پر بحث کرنے کے چھ چھ ہفتہ کی زمینی سکیمیں وضع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اپنی تمام تر توجہ اس طرف مبذول کرنی چاہئے۔ اگر ہمارے ماہرین تعلیم اس طرف توجہ کریں تو ایسی اسکیمیں بن سکتی ہیں جو دیہات میں اب اتنی تعلیم کی صورت میں بالغوں تک پہنچائی جائیں، تاکہ ان کو سودی لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ رکھنا آجائے، ایسی اسکیموں کی ضرورت اس لئے ہے کہ گھاؤں کے ہاں م۔ اور عورت سوتلے ہی عرصہ میں اس قابل ہو جائیں کہ ان کو ذرا عتی معاملات کی تعلیم دی جاسکے۔

بالغوں کے مدرسوں میں تفریح اور تعلیم دونوں ہونے چاہئیں تاکہ بالغ مرد اور عورتیں آسانی سے ابدائی تعلیم کے مراحل طے کر سکیں، ان کو دیر نہانا عذاب نہ معلوم ہو بلکہ شوق سے شام کو مدرسوں میں جا کر تعلیم بھی حاصل کر سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تفریح بھی ہوتی رہے۔

یہ سوال باقی رہتا ہے کہ استاداں کہاں سے ملیں گے، اور یہ سوال اپنی خاص نوعیت کی وجہ سے بہت ہی اہم ہے، اگر اسکیم صوبہ میں بھی رائج کی جائے تو ہزاروں استاداؤں کی ضرورت پڑے گی، آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بنکاری پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے بہت لوگوں کو پریشانی ہے، ان اسکیم کے چلانے کے لئے استاداں اس طبقہ سے لئے جائیں گے۔ اس سے بیکاری بھی کم ہوگی اور ترقی دیہات کے لئے ہم گھاؤں کو تیار بھی کر سکیں گے، کیونکہ جب ملک گھاؤں والے یہ سمجھیں کہ گرام سدھار کی اسکیموں کا کیا مطلب ہے تب تک وہ ان پر عمل نہیں کریں گے اور اگر بادل ناخو استاداں محض ان سے اس پر عمل کیا بھی تو وہ جوش اور دلدادہ اس میں نہ ہو گا جس کے بغیر ترقی دیہات کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کا دیہات کے مدرسوں میں کام کرنے سے ایک طرف تو گھاؤں والوں کا حوصلہ بڑھے گا، وہ اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ ان کے شہر میں کارپنوں والا سبائی ان کے ساتھ دلی ہمدردی کرنا چاہتا ہے اور دوسری جانب تعلیم کا تمام ماحول بدل جائے گا۔ تعلیم یافتہ بیکار لوگوں کو اس اسکیم میں کام کرنے سے قربانی کرنی پڑے گی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اس

جائیں زیادہ معلومات ان کو دی جاسکتی ہیں، لڑکیوں کی تعلیم میں کچھ تو اوپر کے مضامین اور ان کے علاوہ کچھ اور

*Domestic Economy*

*Hygiene*

*Domestic Science*

*First Aid*

*Maternity and Child-care.*

بھی پونے چاہئیں جس کی ضرورت پر کچھ لکنا حاصل معلوم ہوتا ہے۔

*Domestic Economy, Hygiene,*

*Domestic Science, First Aid,*

*Maternity and Child-care.*

جس میں گاؤں کو مرکز بنا کر ہر مرکز پر ایک ایک ماہ رہ سکتے ہیں اور وہاں ان شعبوں میں تعلیم دے سکتے ہیں، اس کے علاوہ بالغوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا، ہم یہ تو چاہتے ہی ہیں کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں مرد اور عورت ہو کر بہتر اور زیادہ کارآمد زندگی بسر کریں، لیکن اس کے ساتھ ہی ہم سوجوہ پود کو بغیر پانی کے نہیں چھوڑ سکتے۔ تعلیم بالغان کے سائنٹیفک اصولوں پر ہم کو کاربند ہوتا ہے، اور ان سے فائدہ اٹھانا ہے، اول تو ایسی اسکیم تمام بالغ مردوں اور عورتوں کے مدرسہ میں عمل میں لانی جائیں اور اس کے بعد اوپر کا کورس آہستہ آہستہ ان کو پڑھا یا جائے۔ یہ ایک دن کا کام نہیں ہے، لیکن طرز تعلیم کو زیادہ موثر اور دلچسپ بنانے سے لوگ خود بخود

ان مدرسوں میں آئیں گے اور تعلیم حاصل کریں گے۔ بالغوں کے مدرسے رات کو چلنے چاہئیں اور ان میں ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر لگا کر دن بھر کی خبریں، موسم کا حال اور زراعت کے متعلق کارآمد باتیں ان کو بتلائی جانی چاہئیں جس سے ان کی عمومی تعلیم بھی ہوتی رہے گی اور ان کا دائرہ معلومات وسیع ہوتا جائے گا۔

تعلیم دیہات کی اسکیم کو جتنا مستحکم بنایا جاسکے اتنا ہی اس سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ کچھ روپیہ تو گورنمنٹ سے ہمیشہ ملتا رہے گا اور کچھ روپیہ لوکل بورڈس سے، روپیہ ملنے کے یہ دو ذریعہ ہی ہیں، لیکن ان کے علاوہ ہم چاہتے ہیں کہ مغلوں کے زمانہ کا پرانا دستور جس سے سجدوں اور مندروں کو زمینیں دی جاتی تھیں وہ دوبارہ رائج کر دیا جائے اور ہر سرکاری کچھ زمین بطور معافی اس سرکل کی تعلیم دیہات کے کام کے لئے دیدی جائے، اس کی تمام آمدنی سرکل کے مدرسوں میں تعلیم ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ دستکاری کے مدرسوں کی بنائی ہوئی چیزیں گورنمنٹ کو لازمی طور پر خریدنی چاہئیں، اور یہ روپیہ مدرسوں میں تعلیم کے لئے دینا چاہیے، ان چیزوں کو بازاروں میں بیچنے کا کام گورنمنٹ ایجنسیاں کر سکتی ہیں، اور یہ کوئی مشکل امر معلوم نہیں ہوتا۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ تعلیم دیہات کی اسکیم کا ہے جس پر عمل کرنے سے ہمارے گاؤں والے، اپنی بھلائی اور بُرائی کی باتیں سمجھ سکتے ہیں، اور ایک بہتر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے، لیکن کرنے کے قابل ضرور ہے۔

جنگلات کو لایم پی جاتا ہوں  
سے لے کر نام پی جاتا ہوں  
زینا جی نے غار کے چابی جی  
جانب میں جام پی جاتا ہوں

رات جا اور چاند چھبر کے  
چشم بیکار سے آ رہا ہے نظر  
جی رہے لگا روشت غفر  
جی رہے لگا روشت غفر

# محبت اور جسمانی لذت

فاتح اگر کریم، جہاں برہم نہ

"نہیں میرے دوست، اس کا ذکر نہ کرو، تم مجھ سے اس چیز کے عذاب جو مجھے اس سے نفرت اور کراہت ہے، یہ تو ایسا ہے گویا عذابِ کبوتر کا خدا پر میں ایمان لیتی ہوں۔۔۔۔۔ ہر نفس شے کے ساتھ ایک زہرہ چیز کا تعلق پیدا کر کے اُسے ستیاناس نہ کر دینا چاہیے، خدا نے ہمیں محبت عطا کی جو دنیا کی مقدس ترین شے ہے، لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ ہمارے لئے ضرورت سے زیادہ حسین اور عمدہ ہے، اُسے ہماری گناؤں، شرمناک حیوانی بغاوت پر آمادہ کر دینے والی حیسیات کا خیال آگیا، چنانچہ اس نے اُنھیں طرزِ طور پر پیدا کر دیا کہ ہماری جسمانی ناپائیاں اُن کے ذریعے سے خارج ہو سکیں، اس نے ان حیسیات کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ہم محبت کا ذکر بھی شرمندہ برے بغیر نہیں کر سکتے اور محبت کی باتیں کرنی چاہیں تو وہ سرگستی کے پہیچے میں فی پڑتی ہیں۔ اور وہ جو دہشت ناک حرکات ہم کر بیٹھے ہیں وہ شرم و حیا کی پوٹ ہے۔ اور چاہے یہ چھپی ہی رہے، لیکن یہ ہماری روحوں میں مسافرت پیدا کر دیتی ہے اور آنکھوں کو نہانت سے جھپکا دیتی ہے، اخلاق اسے حقارت سے دیکھے، قانون اس کی مذمت کرے، پر یہ اپنی تکمیل تاریکی ہی میں کرتی ہے گویا یہ کوئی مجرم ہے۔

مجھ سے ایسی بات پوچھو کہی نہ کہنا! ہرگز نہ کہنا!

مجھے نہیں معلوم میں تم سے محبت کرتی ہوں یا نہیں، ہاں اتنا جانتی ہوں کہ ہمارا فریب مجھے مسرور کرتا ہے، ہمارے نگاہیں مجھ پر اثر کرتی ہیں اور

مصنف  
تموچاں

مترجم  
صادق انیسری، ایم اے

ہماری آواز میرا قلب پیار سے جھکارتی ہے جس دن بھی میں نے اپنا جسم تمہاری خواہش کے مطابق تمہارے حواسے کر دیا۔ تم میرے لئے محبت نفرت بن جاؤ گے اور وہ نازک زنجیر جو ہر دونوں کو جکڑے ہوئے ہے ٹوٹ جائے گی۔ ملاں ازیں رسوائی کی ایک وسیع فیلڈ بھی ہمارے درمیان حائل ہو جائے گی۔

آؤ، ہم ایسے ہی رہیں جیسا کہ اب تک رہ چکے ہیں، اور۔۔۔۔۔ اگر تم چاہو تو مجھ سے محبت کئے جاؤ، میں نہیں اجازت دیتی ہوں۔

ہماری رفیق عینی ونو

"محترمہ، مجھے بھی اجازت دیجئے کہ میں آپ سے صاف صاف الفاظ میں کچھ کہہ سکوں، یعنی میں اپنے ایک ایسے دوست سے بغیر تصنع کے گفتگو کروں گا۔

مجھے بھی نہیں معلوم کہ میں آپ کو چاہتا ہوں یا نہیں۔ مجھے تو اس کا یقین صرف اُس چیز کے بعد ہو گا جس سے آپ کو کراہت ہے۔

انتہائی شفر اور دہشت کا احساس تو صرف اُسی وقت ہوتا ہے جب کہ ہمارے خون کی دیوانگی نے ہمیں وقتی بوجان کی ڈگر پر لا ڈالا ہو، لیکن اگر وہ عورت ایک ایسی ہستی ہے جسے ہم نے ہزاروں میں سے منتخب کیا ہے وہ بے حد دل کش ہونے کے علاوہ اس قابل ہے کہ اس کے حامل کرنے کی آرزو کی جائے (جیسا کہ آپ میرے لئے ہیں) تو پھر محبت کی جسمانی لذت لابی ہو جاتی ہے، مکمل، اور غیر محدود مسرت کا سرچشمہ۔

یہ جسمانی لذت، اسے قانون، محبت کا ثبوت ہے، اگر یہ جذبہ پرجوش

ہم آغوشی کے بعد فنا ہو جائے تو بیشک ہم اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہے ہیں لیکن اگر یہ اور زیادہ ہو جائے تو ہماری محبت یقیناً سچی ہے !

ایک فلسفی نے جو اپنے اصول پر خود کار بند نہیں، ہمیں فطرت کے اس دام سے خبردار کیا ہے، اس کا قول ہے کہ فطرت زندگی میں تنوع چاہتی ہے اور اس لئے کہ وہ ہم کو بہت نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے مجبور کرتی رہے اور ہم اس کے دام میں پھنسے رہیں، اس نے محبت اور لذت کا جو گلا اس میں لگا دیا ہے وہ کہتا ہے جیسے ہی ہم اپنے آپ کو اس کے سپرد کر بیٹھتے ہیں اور وقتی جنون سر سے اتر جاتا ہے، ہم پر فطرت چھا جاتی ہے، کیونکہ ہم اُس حال کو جس نے ہمیں پھانس لیا تھا سمجھ جاتے ہیں اور اُس مستور آگے کے لئے راہ راہ کو جان لیتے ہیں جس نے باوجود ہماری فرزانگی کے، ہمیں اُس لمحے میں عقل و ہوش سے محروم کر دیا تھا۔

اور یہ سچ ہے، اکثر ایسا ہی ہوتا ہے، بعد میں ہم خود ہی نفرت کرتے ہیں۔ مگر فطرت نے تو فتح پائی اور ہمیں ہماری مرضی کے خلاف اُس فعل پر آمادہ کر لیا جو فطرت چاہتی تھی۔

ہاں، میں اُن سرور و حشیا نہ بوسوں سے واقف ہوں جو اجنبی لبوں پر دے جاتے ہیں اور جذبات سے موداں نگاہوں سے بھی جو کسی نے اُن سے پہلے دیکھیں اور نہ بعد میں دیکھ سکیں۔ المختصر میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو ہمارے دلوں پر چر کہ لگا دیتا ہے۔

لیکن اگر محبت کے صحاب نے دوائی ہستیوں کو گھیر لیا ہو، اس طرح کہ وہ مدت دراز تک بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کا تصور کرتے رہتے ہوں، اگر جدائی اُن کو شب و روز تڑپاتی رہتی ہو، محبوب کی چاہت اور اس کی سکواہٹ ہر وقت اُس کے پیش نظر رہتی ہو، اگر تنہائی میں وہ ایک دوسرے کے سوا کچھ اور سوچ نہ سکتے ہوں تو کیا پھر بھی یہ قدرتی نہیں کہ آخر کار آغوشیں داہ جو جائیں، لب ایک ہو جائیں اور جسم و اصل جائیں؟

کیا ہمیں پیار کرنے کی آرزو کبھی نہیں ہوتی؟ مجھے بتاؤ، کیا لب لبوں کو نہیں پھارتے اور کیا وہ نظریں جو ہماری رگوں تک میں سرایت کر جاتی ہیں انتہائی اور ناقابل ضبط آرزو مند کیا برا نگینہ نہیں کر دیتیں؟

تم جو کہتی ہو کہ یہ ایک حال ہے۔ شرمناک حال! چلو یہ سچ ہی ہے۔ لیکن اس میں حرج کیا ہے؟ میں بھی یہ جانتا ہوں، مگر اسے برا نہیں سمجھتا،

فطرت نے اپنی عیاری چھپانے کے لئے ہمیں محبت عطا کر دی ہے تاکہ ہم اپنی مرضی کے خلاف بھی۔۔۔ افزائش نسل پر مجبور ہو جائیں۔ اگر تم پسند کرو تو آؤ ہم اس محبت کو اپنا کر ذرا بہتر بنالیں۔ علوی اور مثالی! بلکہ جتنا کچھ فطرت ہم کو سکھا سکتی ہے اُس سے ذرا زیادہ ہی کر گزریں۔ یاد رکھنا محبت کا لمس ایک بیش بہا دھات کی طرح ہے جو ابھی ابھی کان سے نکالی گئی ہو۔ آؤ تو اس پر محنت کر کے ہم اس کو نکھلی کر دیں۔ اُس ہستی کی چھٹی ہوئی مرضی کو دھیان میں لائے بغیر جسے تم خدا کہتی ہو، آؤ خاتون ہم اسے اس کی تمام حیوانیت، انانیت اور اس کے کرہ سے کرہ یہ شکل سمیت مثالی بنادیں۔

آؤ عشق کی اُس جسمانی لذت سے، جو ہم میں سنسنی پیدا کر دیتی ہے، ہم اس طرح محبت کریں جیسے ہم پرانی شراب اور خوشبو دار پھولوں سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں جسم سے یقینی محبت کرنی چاہیے، کیونکہ یہ خوبصورت ہوتا ہے، گورا، سڈول، شیریں! لبوں اور ہاتھوں کے لئے باعث لذت!

محترم۔ شرم کا سبق معلم اخلاق کے لئے اور احتیاط کا سبق ڈاکٹر دلا کے لئے چھوڑ دیجئے، اور اُن جھوٹے شاعروں کی بھی پروا نہ کیجئے، جو ذہن میں مبتلا ہونے کی وجہ سے رعوں کے پاک اتحاد اور روحانی مسرت کے گیت گاتے ہیں، اور نہ اُن لٹاؤں کا کچھ خیال کرنے کی ضرورت ہے جو احکا و اداہم کی دھمکیاں سناتے رہتے ہیں، آئیے ہم محبت کی اس جسمانی لذت کی قدر کریں جو ہمیں مدہوش کر دیتی ہے، دیوانہ بنا دیتی ہے۔ مکرور کر دیتی ہے، تنکا دیتی ہے اور شادابی بھی بخشی ہے، جو خوشبو سے زیادہ سرور آگیاں، نیم سے زیادہ ہلکی اور زخموں سے زیادہ تیز ہے، جو مردوں کو سر بسجود کر دیتی ہے اور جس کی بدولت وہ ہر پادشاہ فعل کر گزرتے ہیں۔

آؤ ہم محبت کریں۔۔۔ لیکن قانع، مناسب اور جائز نہیں بلکہ ایسی جو طوفانی ہو، جذباتی ہو، اور قید و بند سے آزاد۔ آؤ ہم بغیر کسی چھٹی کے اس کی جستجو کریں اور اسی میں اپنی زندگی ختم کر دیں۔

محترم۔ نیچے میں آپ کو ایک ایسی حقیقت سے آگاہ کئے دیتا ہوں جو آپ کو کناہوں میں نہیں ملے گی۔۔۔ اس دنیا میں خوش و خرم عورتیں صرف وہی ہیں جن کے گرد و پیش محبت کی جسمانی لذت کی کمی نہیں، ان کی زندگی میں تفکرات اور تکلیف دہ خیالات نہیں ہیں۔ ان کو کسی شے کی آرزو ہی نہیں ہوتی، ایک اور بوسے کے سوا جو ایسا ہی شیریں اور تسلی بخش ہو جسب کہ پہلا۔



# الفریڈ لارڈ ٹینسن

عظیم الدین خاں عظمیٰ

(ٹیکسپیر اور ٹینسن کے) نام سے ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہے۔ لیکن ٹینسن کے نام سے ابھی ہمارے کان زیادہ آشنا نہیں ہیں۔ ہندی میں تو اس کا مختصر سا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن اردو زبان میں ابھی اس کی کمی ہے، میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اردو میں اس کا نام و نشان نہیں ہے۔ ہے لیکن دُعا ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ٹینسن کی زندگی کا ایسا خاکہ کھینچا جاتا ہو کہ ناظرین کے سامنے ایک تصویر آجائے۔

الفریڈ لارڈ ٹینسن، انیسویں صدی کا ممتاز انگریزی شاعر، فنونِ شاعری کے ایک گھاؤں سا مہرِ بانی (میں ۴ مارچ ۱۸۳۹ء کو پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ٹینسن کے اس خاندان سے تھا جو ابتدا میں ڈومیش (تھے) اور انگلینڈ کے شمالی حصہ میں سکونت پذیر تھے، اس کا باپ ڈاکٹر جارج کلیٹن ٹینسن)

(سامرِس ہائی کا پادری تھا، اور اس کی ماں کوئٹہ) کے پادری کی لڑکی تھی۔ شاعری میں تین سال کے بعد اسکول کی گفتِ زندگی سے شگاف آکر گھر واپس آیا اور اپنے والد بزرگوار سے جو ریشمن خیال اور تعلیم یافتہ آدمی تھے سات سال تک تعلیم حاصل کی۔ فروری ۱۸۶۲ء میں اس کا داخلہ ٹرنٹی کالج (کمبرج میں ہو گیا، جہاں اس نے تین سال تعلیمی سلسلہ جاری

رکھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم سے اُسے خاص دلچسپی نہ تھی، وہ سکون اور سہرت کا جو پاتا تھا، لیکن اُسے درس کی کتابوں میں نہ پاسکا۔ اس کی ذہانت سے ہمیشہ کو یہی اُمید تھی کہ وہ یونیورسٹی کا ایک ہونہار طالب علم ہو گا، لیکن سوائے ایک سنہرے تختے کے جو اس نے ٹیکسٹ (کلمے میں یونیورسٹی کے چانسرز سے بطور انعام حاصل کیا تھا، اور کوئی امتیاز کا خصوصیت نہ حاصل کر سکا۔ لیکن اس کی زندگی کا قیمتی زیور اور اس کی شاعرانہ زندگی کے ساز کا درست کرنے والا اسی کیمبرج کی چہار دیواری ہی میں ملا۔ اس کی تعلیم کا حاصل آر تھربری، سلیم کے دوستانہ تعلق ہی میں پہنچا تھا، ان کے دوستانہ تعلقات کو بھی پانچ سال ہوئے تھے کہ سلیم (کو موت کی خاموش غمباز سونا بڑا۔ اس سنہرے زمانے کے ختم ہوتے ہی ٹینسن کی زندگی میں ایک غمیراں انقلاب آیا۔ اس کی رگ رگ سے پُر درد و غم نے جاری ہو گئے۔ ان کے دوستانہ تعلقات کافی مضبوط تھے، اور ۱۸۶۲ء میں ٹینسن کی چھوٹی بہن امیلی) ہیکم سے منسوب ہو گئی۔ ۱۸۶۲ء میں دو لڑکیاں یورپ کا سفر کیا۔ دوسرے ملک کے تمدن، تہذیب اور قدرتی مناظر کا جو گہرا اثر ٹینسن پر پڑا اس کی شاعری سے نمایاں ہے۔ فروری ۱۸۶۳ء میں اس کا باپ سخت بیمار پڑا اور ٹینسن کو سفر سے واپس بلایا، اسی سال مارچ میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور ٹینسن کو کیمبرج سے قطعِ تعلق کرنا پڑا۔

حصہ لیکن شروع کیا جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہو کر ملک میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ ایک آرٹن (جو ٹینس کی سب سے زیادہ مقبول نظم ہے، ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی، جس کو اس نے صرف دو ہفتہ میں لکھا تھا، اس کی شہرت ملک میں اس قدر پھیلی کہ چاروں طرف سے لوگ اس کی ملاقات کو آتے ان لوگوں سے بچنے کے لئے اس نے ایک قلعہ زمین ۱۹۵۷ء میں بمقام بمبئی (تذیب لیا اور ایک مکان بڑا کر موسم گرما میں دہلہ ہا کرتا ۱۹۵۷ء میں وہ گنہگار کے مرعہ میں منبلا ہو گیا اور اس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ نئی نظموں کی ترتیب اور نئے بحر میں اشعار کہنے کی اس نے کافی کوشش کی، لیکن صحت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اس سے محنت نہ چھٹی تھی اور آخر کار ۱۹۶۷ء میں اس دارفانی سے رخصت ہو گیا۔

## ٹینس کی اندرونی زندگی

لوگوں کا عام خیال ہے کہ شعرا کی زندگی عوام سے مختلف ہوتی ہے یعنی ان میں چند اخلاقی غامضیاں، جنون، برہان، وحشت یا اس قسم کی لغو چیزیں ہوتی ہیں۔ کسی حد تک تو یہ خیال صحیح ہے مکن ٹینس کی زندگی عوام کے اس خیال سے بالکل آزاد ہے۔ اس کی شاعری اس کی زندگی کا سچا آئینہ ہے، جس میں اس کے اندرونی جذبات کا صحیح عکس پڑتا ہے۔ ایک شخص کی بیرونی زندگی اتنی دلچسپ نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی اندرونی زندگی کا مطالعہ ہوتا ہے، کیونکہ ایک انسان کا کیریکٹر اس کے تمام اوصاف اور خامیوں کا راز اس کے جذبات میں پنپا ہوتا ہے، ٹینس کی بیرونی اور اندرونی زندگی میں ایک خاص مطابقت ہے یا یوں تصور کیجئے کہ دو ساز ہیں جن میں سے ایک ہی قسم کا نغمہ نکلتا ہے، اس کی پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ اس مطابقت میں فرق نظر آتا ہے اور وہ لمحہ ہیلم کی موت ہے، اس کے علاوہ اس کی تمام عمر ایک سچے انسان کی صحیح تصویر ہے۔

اس کے اخلاق کی سب سے بڑی خوبی صداقت تھی، اس کی گفتگو اور عمل اس کے ضمیر کی سچی ترجمانی کرتے تھے، تصنیف سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ بہت ہی باحس اور کم سخن آدمی تھا، اس کا دل بچوں کی طرح دنیا کی آلائشوں سے پاک تھا، اس کی طبیعت خلوت پسند تھی اور خاص خاص احباب سے

والد کے انتقال پر لوگوں نے اسے ایک گر جا کا پادری مقرر کر دیا ستمبر ۱۹۳۳ء میں دیتا سے اس کے دوست ہیلم کی موت کی خبر آئی، اس غمناک واقعہ سے اسے بڑی تکلیف ہوئی، جس سے وہ قریب دس سال تک بالکل خاموش رہا، لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید اس کے شاعرانہ جذبات بالکل منہ ہو گئے، لیکن اس دلگداز واقعہ سے اس کے ذہنی قوت کی پرورش علم کے دامن میں برابر ہوتی رہی، اور اپنے خیالات کو قلمبند کرتا رہا، جس میں علم کے پروردگروں کے ساتھ مسرت اور امید کا بھی ترانہ وجود تھا، آئندہ کی وہ قیمتی لڑیاں جو اس نے ماقم یار میں پر دہنی تھیں، ۱۹۵۷ء میں ان سیموریم کے نام سے انگریزی ادب کے حوالہ لیا، جو انگریزی شاعری میں صداقت اور محبت کا ایک مایہ ناز شہسپارہ ہے ۱۹۵۷ء صرف اس کی شاعرانہ زندگی کے سب سے اہم تھا، بلکہ اس کی شادی بھی اسی سال ہوئی تھی اور دردمسور تھا (

کی موت پر ملک الشعراء کا سہرا بھی اسی کے سر رہا۔ ۱۹۵۷ء میں اس نے ٹیوٹنہم میں سکونت اختیار کی اور ملک الشعراء کی حیثیت سے ملکی خدمت میں بھی حصہ لینے لگا۔ قوم پرستی اور حب الوطنی کے سیٹھے راگ وہ ہمیشہ سناتا رہا۔ حب الوطنی پر اس نے جو نظمیں کہی ہیں اس میں ڈیوک آف ویلنگٹن کی موت پر جو نظم لکھی گئی اور ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی سب سے زیادہ متاثر ہے۔

اسی زمانہ میں اس کی زندگی میں ایک نیا انقلاب ہوا اور وہ دنیاوی ہنگاموں سے گھبرانے لگا، پرسکون زندگی کی تلاش میں ماہ نومبر ۱۹۵۷ء میں فرنگہ رڈ میں جو جزیرہ وائٹ پر واقع ہے چلا گیا، وہاں جانے سے اس کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ دنیا سے قطع تعلق کر لے اور اپنی قیمتی خدمتوں سے ملک اور ادب کو محروم کر دے بلکہ اس کا یہ خیال تھا کہ تبدیل آب و ہوا اور دیہات کی زندگی سے اس کے جذبات سے شگفتہ ہوں گے اور ملاقاتیوں سے چٹکارا پا کر شاعری کی خوبصورت پہلکاری کو محنت کے ساتھ رنگ رنگ کے پھولوں سے آراستہ کر سکے گا۔ ۱۹۵۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹری کی ڈگری دی۔ اور اسی سال ماؤڈ (

شائع ہوئی ۱۹۵۷ء میں  
آسٹس آف دی کنگ کا پہلا



ہو رہے تھے، مینین کو بھی ملکی کاموں میں حصہ لینا پڑا، لیکن وہ اپنی تعلیم کو علی بابا نہ پہناتا بلکہ ملک کی ضرورت، آزادی، خلافت، حب الوطنی اور عورتوں کے حقوق کو اپنی نظموں کے ذریعے لوگوں کو سناتا رہا۔ وہ ترقی کا خواہاں تھا لیکن انیس اگر اس نے خود حصہ نہیں لیا تو سبھی لوگوں کو ترقی کے راستے دکھاتا رہا، اس کی حب الوطنی انگلینڈ کی بیادری اور ملکی فتوحات ہی تک محدود رہی، وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ انگلینڈ کی فوج کافی مضبوط ہو اور دوسرے ملکوں کو فتح کر سکے۔ اس کو سلطنت جمہوریہ سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، وہ ہمیشہ امراء کی سلطنت کا خواہاں تھا۔ غربت کا نقشہ اس نے اپنی نظموں میں بہت کم کھینچا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے غریبوں کا زیادہ خیال نہیں کیا۔ عورتوں کے حقوق، ان کی تعلیم کا اس نے کافی چرچا کیا، جس کی شہادت نظم "شہزادی" سے ملتی ہے۔

### مینین بحیثیت شاعر

مینین فطرت حقیقت اور انسان کا سچا مترجم تھا اس کے خیالات اور تصور کی پاکیزگی قابل تحسین ہے، اس کی نکتہ شناس نگاہوں نے فطرت اور زندگی کا ہر پہلو سے گہرا مطالعہ کیا تھا، جس کی جھلک اس کی شاعری میں نمایاں ہے، بچوں کی بھولی بھالی زندگی سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک آرڈن (میں کہیں اور زندگی کے ہر ذینہ کو اس تسلسل سے دکھلایا ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔)

### اسلوب بیان

کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ دو طرح سے کیا جاسکتا ہے ایک تو اس کے کلام کی ترتیب اور دوم مواد میں غیر فانی صداقت اور ترتیب میں موزونیت کا ہونا ضروری ہے مینین میں یہ دونوں خوبیاں بیک وقت پائی جاتی ہیں، اس کے کلام میں محاورہ اور الفاظ کے ساتھ ساتھ واقعات اور جذبات کا پہلو بھی مد نظر رکھا گیا ہے، اگر وہ روزمرہ پر زیادہ زور دیتا ہے تو دوسری طرف انسان کی ہستی اور زمانہ کی نیلگیوں کا بھی خیال ہے اس کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی ہے، سکتی جو اس کے طرز اور مواد دونوں میں پائی جاتی ہے، دقیق اور سہم موضوع سے وہ ہمیشہ پرہیز کرتا، تشبیہ استعارہ سے بھی کام لیتا ہے، لیکن اسی حد تک کہ موزونیت، صداقت

نہایت اخلاق سے متا تھا، اس کا دل بہت ہی نازک اور پرورد تھا، غیبت اور شکایت سے اسے سخت الجھن ہوتی تھی، زندگی، اور انسان سے اسے بڑی دلچسپی تھی اور وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ انسان اپنی زندگی مسرت اور آرام سے گزار دے وہ اپنی نظموں کے ذریعے سے خوبصورت زندگی کا نقشہ پراپریشن کرتا رہا۔ ہر انسان میں کسی نہ کسی قسم کی خامی ضرور ہوتی ہے، مینین بھی انسان ہی تھا اس میں بھی چند خامیوں کا پایا جانا ضروری تھا، نقادوں سے وہ بہت خوفزدہ رہتا تھا، اکثر وہ متفکر اور غمزدہ رہتا، اس کے دل میں طرح طرح کے مہم خیالات ملتے جلتے تھے وہ خود پریشان ہو جاتا، لیکن اس کے علم اور تفکر میں بھی اُسید کی جھلک رہتی۔

### مینین اور مذہب

مینین کی زندگی، خیالات اور کارناموں پر سب سے زیادہ اثر مذہب کا پڑا، اس کی ہر نظم میں مذہب کا پر تو ضرور نظر آتا ہے اور اس لحاظ سے اسے ایک مذہبی شاعر بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ کسی مذہبی اہم یا پادری کی طرح مذہب کے دقیق مسائل پر لکھ رہا تھا یا مذہبی جھگڑوں میں حصہ لیتا تھا بلکہ اس کی شاعری اور جذبات میں مذہب کا جوش اور عقیدت موجود تھی، یہ جوش اور عقیدت اس کی شاعری میں مضامین کے تابع ہوتے تھے، جس قسم کا مضمون ہوتا وہ سیاسی مذہبی جوش یا رنگ رہتا۔ اس کی شاعری مذہبی جھگڑوں سے پاک ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو اس کی شاعری کو ممتاز کر دیتی ہے۔ فن شاعری میں اگر معمولی جھگڑوں اور مذہبی تعصب سے کام لیا جائے تو وہ فن ناظر (آرٹ نہیں کہا جاسکتا۔ شاعری کا فن)

(محبت، صداقت، حسن، مسرت، اور اُمید میں پہنا ہوتا ہے مذہب کے معمولی جھگڑوں میں، صحیح معنوں میں مینین کسی خاص مذہب کا پیروکار نہ تھا، لیکن خدا کا معتقد تھا اور خالق و مخلوق کے راز سے بھی واقف تھا۔)

### مینین کا سیاسی نقطہ نظر

ہر شاعر اپنے زمانے کا مصور ہوتا ہے اور جو رنگ اس کے ماحول کا ہوتا ہے وہ خود اختیار کرتا ہے اور اپنے شاعرانہ انداز میں لوگوں کو سناتا ہے مینین انیسویں صدی کا شاعر تھا، جب کہ انگلینڈ میں طرح طرح کے انقلاب



چینیوں نے پشپور کے وقت ناگن کے جس پہل کو آڑا تھا اسے بھیت نامہ درست کر کے چھپائی  
فوج شہر میں داخل ہو رہی ہے۔



دوسرا دلی قائم ہے اور حسن کلام کو نقصان نہ پہنچے، وہ اپنے کلام کو طرح طرح کے زیورات اور رنگ برنگ کے پھولوں سے مزین کرتا، لیکن شوخی کے پہلو سے اصل دور رہتا تھا، اس کے کلام میں اتنی صفائی ہے کہ زندگی کے ہر پہلو پر غور کرتے برے بھی کسی کو خیالات کے تسلسل سے بھٹکنا نہیں پڑتا۔ انسان اور فطرت کے عمومی جذبات کی سچی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے کہ گویا کسی عمومی چیز کو کھجایا جاتا ہو اور دور اور تعین کا کہیں نام تک نہیں، قدرتی مناظر کے پیش کرنے میں اسے بیرونی حاصل تھا، اس کی تحریر میں ایک خاص شان پائی جاتی ہے، جو وطن سے کسی طرح کم نہیں، اور یہ شان ایسی ہے جس سے اس کے قلب کی صفائی، اس کے کلام کی صداقت، اس کے خیالات کی بلندی کا انہار ہوتا ہے۔

## بہادر و بڑے چلو!

بہادر و بڑے چلو کبھی نہ پیچھے تم مہو رہے یہ بات دھیان میں نہ فرق آئے شان میں وطن میں رہ کے قید ہو چلو چلو بڑے بڑھو بڑے بنو جہان میں کمی نہ آئے آن میں

بہادر و بڑے چلو

بہادر و بڑے چلو

وطن پر اپنی جان دو

وطن پر اپنی جان دو

بہادر اور مرد ہو کمی نہ جہد میں کرو نہ آنے پائے دل میں غم خدا کا تم پہ ہے کرم دکھا دو اپنے جوش کو بگڑ گئے ہو اب بنو کہ تم ہو اشرف الامم جہلہ میں پاؤ گے ارم

بہادر و بڑے چلو

بہادر و بڑے چلو

وطن پر اپنی جان دو

وطن پر اپنی جان دو

ہیں ہے محض شاعری

یہ نظم قوم ہے کھری

دکھا دو شان جیدی

سکھاتا ہے بہادری

قوم محبہ شہری

وطن پر اپنی جان دو

بہادر و بڑے چلو

## دھوکا؟

### محمد حسام الدین خاں غوری

کی ایک ہر دور گئی اور جب جنازہ نکلا تو کون بے درد ستاحس کی آنکھوں میں آنسو نہیں چمک رہے تھے۔ دینا ناتہ نہایت ہی رقیق القلب تھے، وہ کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ آہ! آج ہزار ہا غریب ان لئے رورہے تھے، آنکھوں سے عقیدت و محبت کا دریا بہہ رہا تھا، لیکن دینا ناتہ کو اس کی پروا نہ تھی۔

دینا ناتہ کا قتل ایک ممتاز سب حیران تھے، اور ان کے قتل کے جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی، پولیس کی تحقیقات میں صرف اتنا ثابت ہوا کہ دینا ناتہ کے قتل سے کوئی ایک ہفتہ پہلے مٹی والا آباد میں آئی۔ وہ یو لائن کی طرح ہلکی ہلکی باتیں کیا کرتی تھی، اس کی معصوم اور دلکش صورت اور قابلِ رحم حالت پر لوگوں کو ترس آ جاتا تھا، کوئی کھانا کھلا دیتا، کوئی پیسہ دو پیسے دیتا، اسی طرح اس کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

دینا ناتہ کے قتل سے ایک دن پہلے زمیندار کی بیٹی پر تمباکو اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس نے مٹی کی ساڑھی جو تار تار ہو چکی تھی بدلوادی، وہی نیلی ساڑھی قید میں بھی اس کے جسم پر تھی، اس سے زیادہ کوئی بات معلوم نہ ہوئی، مٹی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس نے دینا ناتہ کو کیوں قتل کیا؟ یہ ساری باتیں کوئی نہیں جانتا تھا، گو اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ مٹی دیوانی ہے۔ اور اس نے حالت دیوانگی میں یہ حرکت کی، لیکن تعجب ہے ڈاکٹر نے عدالت میں بیان دیا کہ اس کے حواس بالکل درست ہیں۔

مٹی اس کا نام تھا، اس میں ایک ایسی کشش تھی جو دیکھنے والوں کو زبردستی اس کی طرف کھینچ لیتی تھی، ایک مرتبہ اس پر نظر پڑ جانی تو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا، اور بار بار دیکھ کر سبھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے، سالو لارنگ، گتالی چہرہ، دراز ناک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں صدیوں کا غم پوشیدہ معلوم ہوتا تھا، تپتے ہونٹ، کشادہ پیشانی اور لاغر جسم جو شاید کبھی گداز ہوگا۔

اس بچل کا مقدمہ چلایا گیا تھا، لوگوں کا خیال ہے کہ مٹی نے حالت جنون میں ڈاکٹر دینا ناتہ کے سینے میں چھرا بھونک کر انھیں ہلاک کر ڈالا۔ تین سال ہوتے ہیں کہ دینا ناتہ کا تبادلہ الہ آباد میں ہوا۔ وہ ایک کامیاب اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے، انھوں نے اس قلیل مدت میں جو شہرت و ناموری حاصل کی وہ شاید ہی کسی ڈاکٹر کو نصیب ہوئی ہوگی۔ وہ غریبوں کے سچے ہمدرد و شریف اور نیک نفس انسان تھے، مجھے بھی دو چار مرتبہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، ان کی باتوں میں کچھ ایسی صداقت اور علامت ہوتی جو مخاطب کے دل کو مسخر کر لیتی تھی، انھوں نے شادی نہیں کی تھی، اور یہ عجیب بات تھی کہ جب کوئی اُن سے شادی کا تذکرہ کرتا تو وہ نہایت انسرودہ و طول ہو جاتے تھے۔ گزشتہ دہائیوں میں انھوں نے غریب کسانوں کا جس قدر دلچسپی کے ساتھ مفت علاج کیا تھا اس سے ہر شخص کو ان سے دلی عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ شہر کا بچہ بچہ اُن کے نام سے واقف تھا، ان کی موت پر سارے شہر میں غم

سختی بالآخر میرے یہاں لڑکا پیدا ہوا، اور میں کچھ عرصے تک مسرت و انبساط میں ڈوبی دنیا سے بے خبر رہی۔ اس عرصہ میں وہ گھر سے بالکل بے پروا ہو گئے تھے، اس لئے مجھے خود محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی، بل سے عیحدہ ہونے کے بعد ایک بد بخت آوارہ گرد کی طرح گلیوں میں گھومنا اور شراب پی کر سڑکوں پر سونا ان کا مشغہ تھا، کبھی بھولے جھکے گھر آتے تو شراب کے لئے عجب ہی سے پیسے مانگتے، اگر کبھی میرے پاس ہوتے تو میں انہیں دیتی ورنہ مجبوراً انکار کرنا پڑتا، مجھے ان کی حالت پر رحم آتا تھا، وہ کبھی کبھی جب میں پیسے دینے سے انکار کر دیتی تو مار پیٹ بھی کرتے تھے، یہ بات اب مجھے بالکل یاد نہیں رہی کہ کتنے دن اس طرح گزرا۔

ہمارے پڑوس میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی رہتے تھے ان کا نام معلوم نہیں کیا تھا۔ جوان اور خوبصورت تھے۔ ہر روز شام کو میرے گھر پر سے گزرتے، اس وقت میں مزدوری سے واپس آکر یا تو رات کا کھانا بکاتی رہتی یا بچہ کو سنانے میں مصروف رہتی۔ وہ میری طرف ہمدردی کے انداز دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ دو تین مرتبہ میرے بچہ کو شاید انہوں نے مسایا بھی لادیں۔ لیکن چند روز بعد ان کی نیت خراب ہو گئی۔ مجھے ان کا ایک خاص انداز میں دیکھنا اور سکراناز ہر گز نہ تھا۔ اس لئے میں نے ان کی مسایاں لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف دیکھتے نہ تھے اور شاید ہی کبھی میرے گھر پر سے گزرے ہوں گے۔ بہر حال مجھے ان کے اس طرز عمل سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ایک مرتبہ میرے شوہر سہل تین بیٹے لاپتہ رہے بالآخر ایک شب جب وہ گھر واپس آئے تو انہیں شدت کا بخار تھا، میرے خدا! ان کی صورت کس قدر عجیب ناک ہو گئی تھی بیان نہیں کر سکتی۔ تین دن بھر وہ بیہوش رہے انہیں اس حالت میں چھوڑ کر میں مزدوری کو نہ جاسکتی تھی، تیسرے دن ان کی حالت ذرا سنبھلی، انہوں نے روٹی مانگی۔ لیکن میرے پاس ایک پائی نہ تھی، اٹا کہاں سے لاتی، خود مجھے متواتر تین دن سے فاقہ کرنا پڑا تھا، آج بچہ بھی صبح سے دودھ کے لئے بلبل رہا تھا، لیکن دودھ کہاں سے آتا؟

رات کو بچہ کی طبیعت یکایک خراب ہو گئی۔ وہ شدت بخار میں کراہنے لگا، اس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا، اس کی حالت دیکھ کر میرے ہوش گم ہو گئے، کچھ شجاعتی نہ دیتا تھا، کیا کروں کیا نہ کروں، میرے شوہر نے

جب مٹی کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو عدالت میں تماشائیوں کی کثرت سے تل، صحن کی جگہ نہ رہی، سارا شہر اُمنڈ آیا تھا۔ مٹی عدالت میں لائی گئی۔ تماشائیوں نے اس کو حیرت سے دیکھا۔ وہی دربا چہرہ تھا۔ لیکن اس سے کسی کو ہمدردی نہ تھی، اس کے معصوم دل کش چہرے میں دینا ناتہ ناخون جھاک رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے تھے اس پر آواز سے کہے جا رہے تھے۔ ہر طرف سے لعنت و طعنت کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، لیکن مٹی گویا بے حس تھی، اس نے عدالت کے رو برو اقبال جرم کر لیا، لیکن وجہ کے تعلق کسی قسم کا بیان دینے سے صاف انکار کر دیا۔ شہادتیں پیش ہوئیں، کافی ثبوت موجود تھا۔ پھانسی کی سزا یقینی تھی، فیصلہ کے لئے تاریخ پیشی مقرر ہوئی۔ لوگ مٹی کو پھانسی پر دیکھنے کے منتظر تھے۔ لیکن عدالت میں مٹی کے طرز عمل اور ان حالات کی وجہ سے جو مقدمہ کی سماعت کے دوران میں ظاہر ہوئے مجھے اس سے خاص تجسسی پیدا ہو گئی۔ میں نے اس سے ملنے کی اجازت حاصل کر لی پیسے تو اس نے میرے ساتھ بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بالآخر میرے اصرار پر اپنی داستانِ حیات سنانے پر راضی ہو گئی۔

”اچھا تو سنو، مٹی نے کہنا شروع کیا: میرے باپ کی کہانی!..... میں سری نگر میں رہتی تھی، میرا شوہر مل میں سمولی آسامی پر مامور تھا، ہم غریب تھے اور عسرت میں اپنی زندگی گزار رہے تھے، مجھے اپنے شوہر سے محبت تھی۔ میں انہیں دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ ساتی، جی چاہتا کہ ایک پل کے لئے بھی ان کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دوں، ان کو خوش رکھنے کے لئے اپنی املاکی کو کششیں مرن کر دیتی۔ مختصر یہ کہ ان کو اپنے دل کے مسدود کا دیوتا بنا کر پوجتے تھے۔ اسی طرح دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے زمانہ گزرتا گیا۔

لیکن یہ بات عجیب تھی کہ میں جس قدر انہیں پیار کرتی تھی، اسی قدر وہ مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ عرصہ تک میں نے اپنے دل کو اس بات سے تسلی دیتی رہی کہ آدمی ہر چیز اپنی خواہش کے مطابق حاصل نہیں کر سکتا، بہرہی ان کی سرد دہری بعض وقت میرے لئے پریشان کن ثابت ہوتی لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں تو میں سب کچھ قبول کر گئی اور اس وقت کے خواب دیکھنے لگی جب بچہ گود میں ہو گا اور ان کی طرف سے محبت کی جو کمی ہے وہ پوری کر دے گا۔

لیل و نہار گزرتے رہے، میری امیدوں کی دنیا نہایت وسیع ہو گئی

پریشانی کو دیکھ کر کہا۔

”تم جا کر اپنے پڑوس کے ڈاکٹر کو بلاؤ، میں بچے کو سنبھالتا ہوں۔“

بسکڑ میں ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی، اس وقت شاید رات کے

دس بج چکے تھے۔ راستہ باطل سنان تھا، جب میں ڈاکٹر کے دروازے پر

پہنچی تو ڈاکٹر صاحب برآمدے میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔

میں کچھ کہے بغیر میز چیلوں پر چڑھ گئی۔ میری آبرٹ پا کر وہ چونکے اور پھر

حیرت سے مجھے دیکھ کر بولے: ”کیوں مٹی؟ تم یہاں، اتنی رات گئے، کیا بات

ہے؟“

میرا نام اُن کو کس طرح معلوم ہوا تھا، میں نہیں جانتی اور نہ اس وقت

مجھے ان کی زبان سے اپنا نام سنکر کوئی تعجب ہوا۔ شاید میں نے اس پر

غزربہ نہیں کیا، میں جواب دینا چاہتی تھی، لیکن آواز حلق میں پھنس ہی

تھی۔

”میرا بچہ ڈاکٹر صاحب میرا بچہ بیمار ہے، ذرا آپ مل کر دیکھئے“ میں

اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ ستوڑی دیر تک میری طرف دیکھ کر کچھ سوچتے

رہے۔ پھر اٹھ کر اندر کمرے میں چلے گئے اس وقت شاید مکان میں کوئی نہ تھا،

وہ اکیلے تھے، وہ اپنے کمرے کے اندر ہی سے بولے۔

”ہاں تو مٹی تمہارے بچے کو کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب اس کا جسم کو تک کی طرح دھک رہا ہے۔“

میں نے غم سے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”اچھا میں ابھی چلتا ہوں، آج سردی بہت ہے تم اندر آ جاؤ۔“

میں کمرے میں چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرا

دل دھڑکنے لگا، اُن کی آنکھوں سے شہوانیت ٹپک رہی تھی۔ میں وہاں سے

بھاگ جانا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اس وقت میری روح کانپ

گئی، شدت خوف سے میرے حواس معطل ہو گئے، کچھ کہہ نہیں سکتی، اس کے

بعد کیا واقعات پیش آئے اور میں کب تک ڈاکٹر کے کمرے میں رہی کچھ یاد نہیں لیکن

جب کمرے سے باہر نکل آئی تو معلوم ہوا کہ میں گناہ کی دنیا میں دھکیل دی گئی ہوں، ایک

غریب عورت کے پاس اس کی عصمت ہی سب سے زیادہ قیمتی شے ہوتی ہے جس

کے ہمارے وہ زندہ رہتی ہے جب وہی اُس سے چھین جائے تو پھر اس کے

پاس کیا رہ جاتا ہے۔ آہ اسی گناہ کی رات کو میری زندگی برباد ہو گئی۔

جس وقت میں کمرے سے باہر نکلی تو میرے شوہر بچہ کو لیے دروازہ

پر کھڑے تھے۔ ان کا سارا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ آنکھوں نے مجھے دیکھ کر کہا،

”اس وقت کیا کر رہی تھی مٹی۔ منتنا بے ہوش ہو گیا تو میں گھبرا کر

یہیں لے آیا ہوں۔“

میں چاہتی تھی کہ اپنے بچہ کو گود میں لے لوں، لیکن ایسا معلوم ہوا

کوئی پیچھے سے کھینچ رہا ہے اور کہہ رہا ہے ”گھٹکار عورت اس معلوم کو ہاتھ نہ

لگا۔“ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، اور میں دیوالوں کی طرح بھاگی، میں

بھاگ رہی تھی اور میرے کانوں میں آواز آرہی تھی ”مٹی، مٹی، جیسے جیسے آواز

آتی تھی میں اور زور سے بھاگتی جاتی تھی۔ اس کے بعد کچھ معلوم نہیں کیا ہوا۔

کہاں کہاں بھٹکتی پھری، لیکن جب یہاں پہنچی تو ایک دن وہی ڈاکٹر مجھے

نظر آیا جس نے میری زندگی کو برباد کر ڈالا تھا، میرا خون کھولنے لگا اور میں نے

اسی وقت قصائی کا چھرا لیکر ڈاکٹر کے سینے میں بھونک دیا، بس اس کے

بعد جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

یہ کہنے ہوئے مٹی کے چہرے پر ایسا لمحہ کے لئے فاسخا نہ مسرت کھیل

گئی لیکن بیت جلد پھر افسردگی غالب آ گئی۔

میں نے کہا، لیکن تمہارے لئے اپیل دائر کی جائے تو امید ہے کہ تم

بچ جاؤ گی۔“

مٹی نے اعتراض کیا ”لیکن قید میں سسک سسک کر مرنے سے بچاؤ

کے تختہ پر مرنا کہیں بہتر ہے۔“

مجھے اس کا کوئی جواب نہ سوچا۔ مٹی یکایک سر اٹھا کر بولی۔

”صرف ایک بات مجھے ڈکھ دے رہی ہے، ممکن ہے میری آنکھوں

کو دھوکا ہوا ہو اور یہ ڈاکٹر جس کو میں نے قتل کیا وہ ڈاکٹر نہ ہو جس نے میری

زندگی برباد کر دی۔“

## کیم کا مطالعہ

آزادی، دُحُریت و مساوات کا جذبہ پیدا کرتا ہے

# ”سعی نامشکو“

عطارد اللہ پالوی

میں لا کر حضرت شوق نبوی کے اس قول پر مہر توشتی ثبت کرنا چاہتے ہیں کہ  
”کس نیک غلط العالم فصیح را در جواز غلط العوام آئند و فرستے در  
ہر دو قسم نہ انکار نہ از بے خبری“ غلط العالم ”غلط العوام را مستحق لغت  
پندارند“

اس بات کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ نے تحقیقی اصلاح ”مطبوعہ قدیم دگیا“ کے  
ختم ہوتے ہی ایک اعلان شائع فرمایا ہے جس میں فرماتے ہیں کہ  
”جون، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۶ء اور اگست ۱۹۵۷ء کے قدیم کی  
مزدورت ہے، اگر کچھ صاحب کے پاس یہ چاروں نسخے یا ان میں  
کوئی بھی ہو اور اسے وہ برادرانہ طور پر یا قین دینا چاہیں تو مجھ کو  
اطلاع دیں نہایت ”مشکور“ ہوں گا“

پیر کیف اردو زبان میں لفظ ”مشکور“ کے معنی ”شکر گزار“ متعلق ہونے کے  
متعلق حضرت رضا قاسم نے مختلف قسم کی بحثیں کی ہیں، سب سے پہلے رسالہ اردو

ذیل کا مضمون ”کچھ قدیم“، ”آواز پہلوئے ہونے“ ہے، مگر اس سے میری  
مراد عاشق و لقا جناب رضا قاسم صاحب کی تنقید نہیں بلکہ اس کے ذریعہ  
محض یہ اصلاح مد نظر ہے کہ (۱) اردو زبان کے مقتدر و آئندہ رہائی  
کو وہ مضامین نہ عنایت فرمائے جائیں جو ایک مرتبہ کسی ”مکرر  
رسالے میں شائع ہو چکے ہیں کیونکہ اس سے رسالے کی قدر و قیمت کم  
ہو جانے کا اندیشہ ہے (۲) لفظ ”مشکور“ کو معنی ”شکر گزار“ یا کس  
”غلط العوام“ لفظ کو صحیح و مستند تسلیم کرانے کی منہ کر کے زبان کو  
مجروح نہ کیا جائے۔ عطارد اللہ پالوی

رسالہ ”عظیم“ (دہلی) کے ”نومبر نمبر“ میں منظرِ نور کے مشہور اہل قلم جناب رضا قاسم  
صاحب مختار کا ایک مضمون بعنوان ”تحقیقی اصلاح“ شائع ہوا ہے، جو اردو زبان  
سے متعلق ہونے کی وجہ سے خاص طور پر قابل ذکر اور لائق مطالعہ ہے۔ صاحب  
موصوف کا یہ مضمون سب سے پہلے رسالہ ”قدیم“ (دگیا) کے اپریل نمبر ۱۹۵۷ء  
میں میری نظر سے گزرا تھا، اب اس مرتبہ ”عظیم“ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں  
شبہ نہیں کہ بعض مفید مضامین ایسے ہوتے ہیں، جن کی افادہ حیثیت یا غیر  
معمولی پسندیدگی اُسے کئی بار شائع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اور وہ ہر  
مرتبہ شائع ہو کر کچھ نہ کچھ فائدہ بھی پہنچاتے ہیں، مگر جہاں تک میں نے غور کیا  
”تحقیقی اصلاح“ میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آئی جو اس کی مکرر اشاعت  
کو قابل تحسین قرار دے۔ بجز اس کے کہ صاحب موصوف لفظ ”مشکور“ کو ”شکر گزار“  
کے معنی میں زبردستی تسلیم کر کر ایک ”غلط العوام“ لفظ کو ”غلط العوام“ کی صفت

لئے ”غلط العوام“ اس غلطی کہتے ہیں جو عوام اپنی خیالات و بے علمی کے سبب کرتے ہیں، اور ان کی  
وہ بات قابلِ پسند نہیں خیال کی جاتی، مثلاً ”شکر“ کے معنی میں ”مشکور“ ”زہریلے“ کے معنی میں ”مسموم“  
شبہ کرنے والے کے معنی میں ”مشکور“ ”سلاک“ کے معنی میں ”سوک“ وغیرہ وغیرہ (عطارد اللہ)  
”غلط العوام“ اس غلطی کو کہتے ہیں جو عام لوگ جان کر کے بھی کرتے ہیں یا بالفاظِ دیگر  
وہ غلطی جسے بالاتفاق تمام زبان دانوں اور مستند ادیبوں نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہو۔  
مثلاً ”ادائیگی“ ”مختگی“ ”مارنگی“ وغیرہ وغیرہ (عطارد اللہ)



بابت ماہ جنوری ۱۹۳۸ء کا ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے ثبوت میں غلطی واقع ہوئی۔  
حقہ قارورہ اور ریل وغیرہ کی مثالیں پیش کی ہیں، اور آتش مرحوم کی اس بحث  
کو پیش کیا ہے جو "المضاعف" اور "بکرم" وغیرہ کے متعلق "آب حیات" سے  
نکل کر سینکڑوں جگہ نقل ہو چکی ہے، اور ان سب کے بعد مولانا شبلی نعمانی  
مرحوم کی وہ عبارت نقل کی ہے جس میں مولانا مرحوم نے "شکر گزار" کی جگہ پر "شکور"  
لکھ کر لفظ مشکور پر بحث کرنے والوں کے لئے ایک شاہراہ تیار کر دی ہے،  
لہذا آئیے ان دلائل کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ حضرت رضاقاسم کے وہ نقل  
کس حد تک درست ہیں۔



حضرت رضاقاسم صاحب کی بحث کے تین اجزاء حسب ذیل ہیں، اور  
ہیں دیکھنا یہ ہے کہ ان تینوں کا تجزیہ ہمیں کس نتیجے پر پہنچاتا ہے۔  
(۱) اردو زبان میں اکثر و بیشتر ایسے الفاظ نظر آتے ہیں جو اپنی زبان  
سے علیحدہ ہو کر اردو میں باطل دوسرے معنوں میں مستعمل ہیں اور وہ صحیح تسلیم  
کئے جاتے ہیں۔

(۲) لفظ مشکور بھی اُن ہی الفاظ کی طرح اردو میں شکر گزار کے  
معنی میں مستعمل ہو گیا ہے، اس لئے اسے غلط سمجھنا غلطی ہے۔  
(۳) مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اسے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

## پہلی بحث

اردو زبان نام ہے ایک ایسی زبان کا جو تمام زبانوں کے مختلف  
الفاظ سے مل کر بنی ہے۔ لیکن جب ہم دوسری زبانوں کی تحقیق کرتے ہیں  
تو ان میں بھی غیر زبانوں کے بیشتر الفاظ ایسے ملتے ہیں جو مفہوم، تلفظ اور  
تجاک کے ساتھ ساتھ صورت نقل میں بھی بدل گئے ہیں۔ اس لئے اردو زبان  
میں بھی جو الفاظ دوسری زبانوں کے آئے ہیں، وہ یقینی بدل گئے ہیں اور  
یہ بھی قطعی درست ہے کہ اکثر و بیشتر الفاظ محض غلط طریقے پر اردو میں مستعمل  
ہو گئے ہیں۔ مگر الفاظ الفاظ میں فرق ہے، چنانچہ خود مختار صاحب موصوف  
نے اپنے معنوں "ہماری زبان" میں لطافت زبان کے تحت فرمایا ہے کہ  
"جن الفاظ کو خواہ وہ کسی زبان کے ہوں اردو نے اپنا لہجہ  
وہ صحیح مانے جاتے ہیں، اسی کا نام لکھائی زبان ہے جس کو پرکھنے

کے لئے دہی اور لکھنؤ کی زبان مستعملی جاتی ہے۔"  
ایسی صورت میں مختار صاحب موصوف کا صرف غلط الفاظ کی چند  
مثالیں پیش کر کے یہ کہنا کہ جس طرح وہ صحیح تسلیم کئے جاتے ہیں اسی طرح ہر وہ  
غلط لفظ صحیح ہے جو اردو زبان میں رائج ہو گیا ہے، صحیح اور نشی بخش نہیں ہے  
صاحب موصوف نے تو صرف چار پانچ ہی مثالیں پیش کی ہیں، حالانکہ اردو  
زبان سے ہزاروں الفاظ ایسے پیش کئے جاسکتے ہیں جو اصل زبان سے علیحدہ  
ہو کر اردو میں باطل دوسرے معنوں میں مستعمل ہیں۔ مگر چونکہ اُن کا شمار غلط الفاظ  
میں ہے لہذا وہ اُن الفاظ کے مقابلے میں نہیں پیش کئے جاسکتے جو "غلط العوام"  
کے تحت میں آتے ہیں۔ بلکہ بقول پروفیسر تاجو فصحا اور سندھ ادب کا استعمال  
سندھیت و فصاحت ہے۔ جو لفظ ماہرین زبان کے لٹریچر میں استعمال ہوا  
ہے، وہ صحیح ہے اور جو لفظ استعمال نہیں ہوا، وہ پیر حال غلط رہے گا چاہے  
اُس کی صحت میں آسان و زمین کے قلابے ہی کیوں نہ ملا ڈالے جائیں۔

## دوسری بحث

مختار صاحب موصوف کی دوسری بحث یہ ہے کہ لفظ مشکور بھی  
اور غلط الفاظ کی طرح اردو میں یعنی "شکر گزار" استعمال ہوتا ہے لہذا وہ  
اس معنی میں اب عربی نہ رہا، بلکہ اردو بن گیا اور وہ اس معنی میں صحیح ہے جو  
اردو زبان میں رائج ہو چکا ہے۔ پھر آگے چل کر عبد الاحد پر اعتراض  
کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"تعب یہ کہ قابل اصلاح کارنے معلوم کن اصولوں کی  
بن پر لفظ مشکور کا استعمال زبان اردو میں احسانند کے معنی  
پر غلط ٹھہرایا ہے۔"

لہذا بہتر ہو گا کہ اُن اصولوں کو بتانے کے عوض اردو زبان کے  
نامور شاعر ادیب حضرت علامہ عیش امروہوی کا وہ قول نقل کر دوں جو  
رسالہ شاعر (آگرہ) کے دسمبر نمبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے اور جس میں بتایا  
گیا ہے کہ لفظ مشکور کا استعمال "شکر گزار" اور "شکر" کے معنوں میں  
کیوں اور کس طرح غلط ہے۔ وہ ہو ہذا:-

"ایک صاحب جو ادب اردو میں نمایاں مرتبہ رکھتے ہیں انھوں  
نے ایک خط میں مشکور یعنی شکر گزار استعمال کیا، اس پر جناب

یہاں ابکرا بادی نے اعتراض کیا۔ اس اعتراض کے جواب میں  
انہوں نے وجوہ ذیل پیش فرمائے۔

۱۔ شکوہ یعنی شکر گزار اردو زبان کا تصرف ہے۔ اس کے اہل  
معنی تو ہیں وہ جس کا شکر ادا کیا جائے۔ مگر اردو زبان میں اگر  
معنوی تغیر ہو گیا ہے جیسے۔

الف۔ تو یہ کہ عربی میں تو اس کے معنی کچھ اور ہیں مگر اردو میں  
قبر کا تو یہ اور بھی معنی پر مشتمل ہے۔

ب۔ حقہ عربی میں ڈبے کے معنی پر ہے، اردو میں قلیان کو  
کہتے ہیں۔

ج۔ سرور عربی میں خوشی کے معنی میں ہے اردو میں نئے کے معنی میں  
د۔ ریل انگریزی میں پڑی کو کہتے ہیں۔ اردو میں پٹری پر  
چلنے والی گاڑی کو۔

جس طرح ان تمام الفاظ میں اردو نے معنوی تغیر کر لیا ہے  
اسی طرح مشکور یعنی شکر گزار کو بھی سمجھنا چاہیے۔

(۴) ممنون و مرہون یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر شکر سے بہت  
پہلے ارباب علم و اہل قلم نے اسی کا استعمال فاعلی معنی میں کر لیا  
ہے اور اب کسی کو اس سے اجنبیت نہیں رہی۔

(۵) تخطوہ شعلی مرتبہ محمد امین صاحب زبیری مطبوعہ آگرہ  
خط نمبر ۳ میں ہے: آپ کی تکلیف فرمائی کا بہت مشکور ہوں؟  
عربی میں تین باتیں ہیں جن سے مشکور کہہ سکتے ہیں اردو میں صحیح  
تغیر پایا گیا ہے۔

## میری گزارش

میرے دو میں ممنون اور مرہون کہہ کر فرمایا کہ شکر سے بھی پہلے اہل علم نے

لے ثبوت میں وہی سب مثالیں دی گئی ہیں جو حضرت رمضان قاسم نے پیش کی ہیں۔ اس نے عجیب  
و غریب ثبوت کہہ جن سے بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ کیا حضرت رمضان قاسم صاحب ہی  
یہاں صاحب کو جواب دیا تھا؟ ممکن ہے کہ اور کوئی صاحب ہوں، اور یہ صرف اتفاق ہو (ملاحظہ فرمائیے)  
لے تیسری سے مراد علامہ عیسیٰ ہیں۔ احتیاطاً عرض کیا گیا۔ (ملاحظہ فرمائیے)

انہیں فاعلی معنی میں استعمال کیا ہے۔ بالکل بے بنیاد بات ہے،  
اگر کوئی ممنون کے معنی منت گزار سمجھ لے تو یہ اس کی سمجھ کی  
غلطی ہے۔ مرہون کے معنی بھی گرد کرنے والے کے آج تک  
کبھی اردو میں مستعمل نہیں ہوئے۔ لوگوں نے اسی غلط قیاس  
سے، صو کا کہا یا کہ جب یوں کہنا صحیح ہے کہ میں آپ کا ممنون  
ہوں تو یوں کہنا بھی صحیح ہو گا کہ میں آپ کا مشکور ہوں۔ حالانکہ  
اول فقرے کے معنی میں یہ وہ ہوں جس پر آپ کا احسان ہے اس میں  
معنوی مراد و مطلب صحیح رہتا ہے۔ مگر دوسرے میں معنی غلط مراد ہر جہت پر

### تصرف کی بحث

اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا لفظ مشکور یعنی شکر گزار اردو زبان کا تصرف  
ہے؟ یعنی اس کو اردو سمجھ لینا چاہیے یا نہیں اور اس پر تصرف یافتہ  
ہونے کے شرائط کا انطباق ہوتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر آئندہ لفظ  
لفظ اور تصرف فیہ کو پہچاننے کے لئے چند باتیں مقرر فرمائی ہیں تو  
یافتہ لفظ کی شناخت یہ ہے۔

۱۔ کہ اسے قبول عام حاصل ہو، یعنی عام لوگ بھی استعمال کرتے ہوں  
اور عام لوگ بھی کسی کو اس سے اعتراف نہ ہو۔ عام لوگوں سے مراد  
خواہ وہ اشخاص ہیں اور خاص لوگوں سے مراد صاحبان علم و فضل۔

(۲) اس کی تقلید متقول نہ ہو یعنی کسی نے اس کو غلط نہ ٹھہرایا ہو۔  
بہت سے اہل علم بھی کسی قاعدے سے ذہول، غفلت یا اور کسی  
قریب کہا جانے کی وجہ سے کسی لفظ کا اشتقاق غلط کر بیٹھے ہیں،  
یا کسی لفظ کو اس کے معنی سے متجاوز کر کے استعمال کر لیتے ہیں، جیسے  
لفظ ثقاہت کہ ثقہ کو دیکھ کر بنا لیا، اور اس بات سے ذہول ہو گیا  
کہ ثقہ عربی میں کوئی مادہ نہیں ہے، ثقہ تو وقت کی ایک عملی حیثیت ہے۔  
عرب وقت کے وزن کے لفظوں میں اول کی داؤ کو آخر میں ت بنا کر ثقہ  
ہیں ثقہ کو مادہ سمجھ کر ثقاہت مصدغہ ذہول کی وجہ سے ہے غلط  
شبلی بھی ثقاہت لکھ گئے ہیں۔ سہول سے انہوں نے مشکور بھی لکھ

لے اس میں شبہ نہیں کہ ثقاہت ثقہ سے بنا لیا گیا ہے اور اردو نے قاعدہ غلط ہے  
شبلی کے علاوہ بھی اکثر لوگوں نے لکھا ہے۔ مثلاً جگر مراد آبادی فرماتے ہیں۔ ع  
عشق معصوم صفت حسن ثقاہت دشمن

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے



”شکورہ بھی اس موقع پر یقیناً غلطی سے لکھا گیا، ورنہ سارے خطوط میں یہی ایک جگہ کی تخصیص کیوں ہے؟ بہر کیف آخر میں صرف اسی قدر کہنا ہے کہ ”شکورہ کو معنی ”شکر گزار“ صحیح تسلیم کرانے یا باور کرانے کی سعی نامشکور اردو ادب کے لئے حد درجہ نقصان دہ ہے۔“

کیا ہے تو اس کے متعلق اد پر ہی بحث ہو چکی ہے۔ اس لئے مزید ضرورت نہیں۔ البتہ اس قدر ضرور کہنا ہے کہ مولانا موصوف کو سبوں چوک سے سرسرا پاک سمجھنا بڑی نادانی ہے، شبہ کی مروجہ نے اپنے ان ہی خطوط میں ”اے“ کو اکثر موقوف پر ”اکی“ لکھا ہے جو قطعاً غلط اور خلاف اتفاق چھوڑے، اس لئے

## یہی دنیا

آنسوؤں کے تیل سے جلتا ہے الفت کا چراغ  
اہل دولت کی غلامی، جھڑکیاں اور ذلتیں  
”سیم و زر کے دیوتاؤں کے یہ قسمت غلام  
موت کی پاتے ہیں شیدا یا باطل سے سزا  
لفظ آزادی جو آتا ہے کسی کے ہونٹ پر  
سولی کی رستی کو ہنسر چومتے ہیں نوجواں  
نوج کرکھاتے ہیں جس کی بوٹیاں مذہب فروش  
جس طرح سڑتے ہوئے مردار پر مردار خوار  
فیکٹری کی چمینیوں سے جس طرح نکلے دھواں  
چومتی ہے رو کے بیوہ گال سوتے لال کے  
جس جگہ کانٹوں سے زخمی ہیں گلوں کی ٹکھڑیاں  
اور نوتاؤں کے کتوں کو حسیں پوشش ملے

عشق پیتا ہے جہاں خوتا بہ دل کے ایاغ  
جس جگہ لکھی گئی ہیں حسن کی تقدیر میں  
جس جگہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں مدام  
جس جگہ حق بات کہنے والے مردانِ خدا  
گھورتے ہیں جس جگہ ظالم کٹاریں سونٹ کر  
جس جگہ حب وطن کے جذبہ سے ہو کر طپاں  
جس جگہ انسان ہے وہ پیکر بے عقل و ہوش  
جس جگہ یوں جمع ہیں تہذیب کے پروردگار  
جس جگہ اٹھتی ہے یوں مزدور کے دل سو فغاں  
جس جگہ سرا کی ٹھنڈی شب میں ٹھہرے ہونٹ  
جس جگہ اشکوں سے تر رہتی ہیں معصوم آنکھڑیاں  
جس جگہ دہقان کو رنج محنت و کوشش ملے

تیرے شاعر کو یقین آتا نہیں، رب العلاء!

جس پہ تو نازاں ہے اتنا وہ یہی دنیا ہے کیا

# دیوارِ چین پر ایک طائرانہ نظر

انوار الشد، غمگین، ہشتنگری

دیوارِ چین دنیا کے سات عجائبات میں سے کیوں نہیں ہے؟

یہ ایک سوال ہے جس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ پتیرے مورخوں نے بال کی کھال نکال کر اس رازِ سرستہ کے کھولنے کی کوشش کی ہے اور اس نیچے پر پہنچے ہیں کہ چونکہ اس انتخاب کا سہرا عہدِ متوسط کے اُس گروہ کے سر ہے۔ جو مغرب کے دامن میں پھلے تھے، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے دیس کی چیزوں پر دوسرے دیس کو ترجیح دینا اس فی خفا کے خلاف سمجھا ہو گا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد نوعِ انسان اپنے دیس کے خار کو بھی پرائے دیس کے گلزار پر ترجیح دینے میں دریغ نہیں کرتا۔ ایک معقول وجہ اور بھی ہو سکتی ہے ممکن ہے کہ ان حضرات نے اپنے انتخاب کا معیار مشاہدہ پر رکھا ہو۔ اور دوسری کی وجہ سے دیوارِ چین کا تذکرہ ہی ہل چھوڑ دیا ہو۔

الغرض یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ دیوارِ چین کی شان اور عظمت اس بات کی سفارش کرتی ہے کہ اسے بھی دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جادے۔ ورنہ اس حقیقت سے انکار کرنا آفتاب پر خاک اڑانے مصداق ہو گا۔

چین بہت قدیم زمانے سے تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے، اس کے دامن میں وہ صاحبِ قرائ پچھلے پچھلے جن کے سامنے بڑوں بڑوں کی وال نہیں گئی، ان میں سے ایک نامور تاجدار شی ہنگٹی گزرا ہے، یہ چین کا وہ حکمران ہے جس کے سر پر اودیت کا تاج رکھا گیا اور جس نے ایک ایسی عظیم الشان

سلطنت کی بنیاد ڈالی کہ دو ہزار برس کے دوران میں کوئی بھی اس کا ایک بال بیکا نہ کر سکا۔ اُس کے شاندار دور کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کو شاہِ ہفتِ اقلیم و ہفتِ کشور کہیں تو بے جا ہونگا۔ سکندر اور دارا کو اُس کے در کا دربان مٹیرا میں تو انصاف پروری سے بعید نہ ہو گا۔ مورخین اس شاہِ نامدار کی تعریف میں ایسے رطب اللسان ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اُس کے شاندار دور کا ذکر کئے بغیر دنیا کی تاریخ غیر مکمل رہ جاتی، بلکہ اُس کی ناک ہی کٹ جاتی۔

القصد باوجود اس شان و شوکت جاہ و منصب اور کرد و فر کے اس شاہِ بلندِ اختر کو یہ خیال دامگیر ہوا، کہ انسان آخر کہاں سے آیا کس لئے آیا اور اُس کا انجام کیا ہو گا؟ ان تصورات میں ہمد تن محو ہوا، آخر کا جب کچھ بن نہ آئی تو دنیا بھر کے بچوں کے جمع کرنے کا حکم دیا، ایک جمِ غیر بچوں کا حاضر دربار ہوا یہ مسئلہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا، کئی دن تک غور و خوض ہوتا رہا۔ تاریخوں کا دقیقہ دیکھا گیا۔ گزشتہ انسانوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا گیا، اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا ایک سراب ہے، انسان فانی ہے، اس دنیا سے دوں میں کوئی انسان کتنا ہی بلند اقبال کیوں نہ ہو ایک دن موت کا مزہ ضرور چکھے گا۔ یہ سنکر بادشاہ کے حواس باختہ ہو گئے اور مہیا ختہ پوچھنے لگا کہ میرا کیا حشر ہو گا؟ تمام بچوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ شاہِ عالی منزلت! تیری موت قوم ہٹو کے ہاسٹوں ہو گی۔ یہ اُس وقت چین کی شمالی سرحد پر رہتی تھی۔

سکونت رکھا۔ اس خیال سے کہ کسی طرح بھی موت کے فرشتے کو میری قیامگاہ کا پتہ نہ چھے۔

قسمت کا پٹا دیکھئے کہ جب اُس کی موت کا وقت آتا ہے، تو خود اس کا بھائی دوران سفر میں اُس کو قتل کرتا ہے، وہ موت کا شکار ہوتا ہے۔ دیکھتا ہے مگر دنیا کی کوئی طاقت اس کو بچا نہیں سکتی۔ انسان کی زندگی کیا ہے، پانی کا ایک بلبل ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا، اور غائب۔ بچ ہے اور باطل بچ گیا؟ یہ کہ "اِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَعْتِدُّ مَوْتًا"۔

بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اُس نے اپنے والد کی موت پر وہ کام کئے کہ اگر انہیں مجنونانہ انداز سے تعبیر کریں تو صحیح نہ ہو گا۔

بادشاہ مقتول نے اپنی موت سے پہلے زمین کے نیچے ایک بہت بڑا تہ خانہ بنا یا تھا۔ عام ہیئت باطل زمین کی طرح تھے۔ یعنی کہیں پہاڑ اور کہیں دریا بنائے تھے۔ جوت آسمان کی طرح باطل نیلے رنگ کی بنائی تھی، اور اُس میں ایک ترکیب سے ستارے لٹکے تھے۔ جن میں قدرتی ستاروں کی طمن چمک مک موجود تھی۔ کہیں کہیں مرم تیاں نصب کی گئی تھیں۔ سنا ہے ان کی روشنی سو برس کے لئے کافی تھی۔

بادشاہ کے جانشین نے کافی مال و زر بادشاہ مرحوم کے ساتھ قبر میں دفن کیا، اور اپنے والد مرحوم کی روح کو خوش کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔

ہاں ایک تعجب، انگیز بات۔ دیکھی۔ وہ یہ کہ جب سچ کوئی آدمی اس تہ خانے کے اندر سانا۔ اُس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ اس صحت سے کہ اس کا راز کسی پر افشا نہ ہو۔ یہ دیوار چین کی تختہ داستان تھی جو کہ آج دنیا کے لئے عبرت ہے۔

## ضروری اطلاع

ہر شہر میں رسالہ کیم کے لئے ویاستدار اکھنڈ کی ضرورت

یہ سُنتے ہی بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ شالی سرحد کو قوم بھڑ سے خالی کرایا جائے، اور اُن کے جو افراد ملک چین میں ہیں اُن کو نوار کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ملک چین کے چاروں طرف حصار بندی کی جاوے تاکہ کسی بھی طرح انسان کو چین پر دھاوا کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ فرمان شاہی بجالایا گیا۔ ہزاروں افراد قوم بھڑ کے بڑی بے دردی اور بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ بڑے بڑے گھرانے، تم کہہ سہ بن گئے۔ لگی کوچوں میں خون کے دریا بہنے لگے۔ ایک جان کو بچانے کے لئے نہ معلوم کتنی جانیں لی گئیں۔ جب قوم بھڑ کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا تو فیصل کی تعمیر شروع ہوئی۔ ملک چین کی، فیصلہ آباری نے اس کے بنانے میں حصہ لیا، جہنوں نے انکار کیا۔ اُن کی ہڈیاں فیصل کے اندر چُن دی گئیں۔ خانہاں برباد کئے گئے۔ اُن کے بچوں کو تہ تیغ کیا گیا، الغرض ایک کوہ پیکر دیوار بنا ہوئی جس کی ایٹ ایٹ انسانوں کے خون پسینے سے جھی ہوئی ہے۔ جس کی بنا و اُن گنت انسانوں کی خواہجہ بن چکی ہے، ایک جان کو بچانے کیلئے لاکھ لاکھ جانوں کا خون کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔ ایک کشت زار کو سرسبز کرانے کے لئے ہزاروں کانپا مال کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ ایک نخل تنہا کو بار آور کرانے کے لئے ہزاروں کو بکلی کے نذر کرنا کہاں کی شرافت ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دیوار مجسم مرتع ہے اُن انسانیت کش اور دلخراش واقعات کا تبیین سن کر دنیا خون کے آئینہ رو چکی ہے۔

یہ دیوار بحر چین کے قریب سے شروع ہو کر وسط ایشیا تک پہنچی ہے۔ اس کی کل لمبائی ڈیڑھ ہزار میل اور چوڑائی میں فٹ اور سو ٹائی انچا ہے۔ ڈیڑھ چھ گز ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے سو سو گز کے فاصلے پر ایک ایک برج بنا رکھا ہے، اس دیوار کی اونچائی نشیب و فراز، دریاؤں اور پہاڑوں پر یکساں کھی گئی ہے۔

بادشاہ نے موت کے ڈر سے نہ صرف یہ کام کیا بلکہ اپنے بچاؤ کے لئے خوراک، ایک، عظیم اٹن عمارت کے بنوانے کا حکم دیا۔ سات لاکھ مزدور روزانہ کام میں لگے رہے۔ چند دن کے اندر اندر ایک شاندار محل تیار ہو گیا۔ جس میں بے شمار کمرے تھے، بادشاہ روزانہ جدا جدا کمروں میں

# الطاف مشہدی کی شاعری پر ایک نظر

خلیق قسرتی، منشی فاضل، لاہور

ابتداءً آفرینش سے لے کر انسان اپنی گونا گوں قوتوں کی وجہ سے ممتاز اور ممتاز رہا ہے۔ انسانی فکر کی بلندی پرواز سے ہزار ہا اختراعات کیم علم سے عالم وجود میں آئیں۔ لاکھوں محیر العقول کارنامے انسانی دست و بازو کے مرہون احسان ہوئے اور کرداروں ایجادات نے ذہن آدم کے لامحدود قنون پر ہر تصدیق ثبت کی۔ علی الخصوص عہدِ حاضرہ، دماغ انسانی، کی جولانیوں کا اکل مرتبہ ہے۔ آج عصر آدمی کے فکام ہیں، بے پردہ بال انسان ہنایت شائے و شوکت سے ہوا میں پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سمندر دوں کے سینوں کو چیرتا ہوا اُن کی اعنہا گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ دقت نظری اور بلوغِ فکری کا یہ عالم ہے کہ سہلوں، ہتھوں اور سہلوں کی ہدایت یکمباتی و ترکیبی معلوم کی جاتی ہے۔ مگر بالآخر ایک نقطہ ایسا آ جاتا ہے جہاں سائنس اور فلسفہ کی گہرائیں حاصل اور بے سود نظر آتی ہیں۔ ایک سائنس دان یہ دیکھ سکتا ہے کہ پھول کی تخلیق اور انکی تدریجی نشوونما میں کون کون سی قوتیں کام کرتی ہیں؛ فلسفی مادہ اور ترکیب عالم پر سیر حاصل بحث کر سکتا ہے، لیکن گل کی نگہبخت اور پیار عالم کی دلاویزی کو محسوس کرنا یا اُس سے محفوظ ہونا یہ سائنس دان اور فلسفی کے بس کا ہوگ نہیں۔ اس منزل پر عقل انسانی، اور اور انکی پشروی کو رک جانا ہوتا ہے، اہل سے آگے ہا مکاں کی منزلوں میں قدرت کے اندرون دل میں جانے کے لئے، ترقی فصول و جرات رندانہ مچا ہے۔ جو شاعر میں غمر ہوتی ہے۔ اگر سائنس اور فلسفہ ہیں صنوع عالم کے نقوش کا ہری کو دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ تو شاعر کا

شاعری فی الاصل، دل کا غم، دل کی زبان سے بیان کرنے کا نام ہے۔ جسے قدرت اس قوت سے متصف کرتی ہے شاعر کے نام سے پکارا جاتا ہے، اور چونکہ شاعر دل کی کیفیات کا ترجمان ہوتا ہے، اس لئے اُسے عام آدمیوں سے عزت و وقار اور تعلیم کے مدارج میں غمٹ کر لیا جاتا ہے۔ کسی قوم کے تمدن، اخلاق اور ادب کے ارتقا میں شاعر کی ساعی کو بہت زیادہ دخل ہے، بلکہ بیشتر شاعر اس تعمیر کا معمار ہوتا ہے، اور اس کا کلام وہ بنیادیں ہیں جن پر قومیت کا عظیم انسان قصر تعمیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی اثرات کے زیرِ نظر حضرت جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں کہ ”شاعر اپنی صدی کی بہترین تصنیف ہے“ شاعر کا کلام اپنے زمانے کا بہترین آئینہ ہوتا ہے جس میں دنیا اور واقعات عالم کا انعکاس پوری آب و تاب سے چمکتا ہے، اور حقیقت میں انکھ اُس آئینہ میں سے تاریخ عالم اور تعمیر آدم کے مآخذ کا تجزیہ کر سکتی ہے۔

اس کے علاوہ شاعری بذاتِ خود تخیلات اور احساسات کی زبان ہوتی ہے۔ چنانچہ ہرنٹ کا مقولہ ہے کہ ”شاعری تخیل و جذبات کی زبان ہے“ بظاہر تو یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے، لیکن معنوی اعتبار سے اس کی جامعیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چار لفظوں کا مجموعہ ایک ایسا بیج جو ہے جسے شاعری کی تشریح، پر حاوی سمجھنا چاہیے، کیونکہ الفاظ جب جذبات اور تخیلات کے ترجمان بن کر شعری صورت میں شاعر کی زبان سے نکلے ہیں، تو وہ واقعہ سامع کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں، اور یہی شاعری کی جامعیت قرار لیتا ہے۔

ہماری توجہ کو بزمِ عالم کی اصل خوبصورتی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ چنانچہ ایک بچے کی رنگت، پھول کی نکھت اور نزاکت، پھل کی لطافت، حسین اور مستقیم چیز کی عادت، یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جو دماغ کی آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہی دنیا ہے، جہاں شاعر اور صرف شاعر ہی پیدا ہو سکتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جہاں مباحث علمی، اور تحقیقی فلسفہ و سائنس میں دماغ کی کارفرمائی ہے۔ وہاں غم و الم، عشق و محبت، سرور و انبساط کے لطیف جذبات محض شاعر کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ انہی امور کے ماتحت میں قائدِ شباب جناب الطاف تہدی کے کلام پر دو نظریوں کے تحت روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔  
الف۔ شاعر کی تکنیکی اور جذباتی دنیا۔  
ب۔ شاعر کی فنی اور وطنی شاعری۔

سب سے پہلے ہیں یہ دیکھنا ہے کہ شاعر کچھ کہتا ہے، داتھی جذبات سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔ یا تقلید اور تخیل ہی میں اپنا فرض پورا کر رہا ہے۔ دورِ حاضر میں غزل کے خلاف بہت کچھ کہا جاتا ہے، اور چونکہ فنی نقطہ

انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لئے لوگ عمرنا۔ جذباتی شاعر کے نہیں بلکہ علمی پیغمبر کے منتظر ہیں۔ لیکن بائیں غزل ہی ایک ایسی چیز ہے، جو روح انسانی کے آئینہ، اور عابدہ تاروں کو لرزادیتی ہے، جو حسیات لطیفہ کو بیدار کرتی ہے، جو دل کو بر ماتی ہے، اور روح کو تڑپاتی ہے، اس کے علاوہ اساتذہ اور متقدمین نے اس میدان میں وہ وہ جولا نیاں دکھائی ہیں کہ کسی نوجوان شاعر کا اس پامال زمین میں قدم رکھنا بلکہ ہر ناممکن نہیں تو شکل منور نظر آتا ہے۔ مگر جو طبیعتیں فطرتاً بیدار اور حساس جذبات کی مالک ہوں وہ لازماً اس میدان میں خوش طبع کو دوڑاتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے نوجوان شاعر حضرت الطاف شہید بھی غزلیں کہتے ہیں، اور ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جذبات و احساسات کا ایک مواج دریا ہے جو شاعر کے قلم سے اشعار کی صورت میں بہے چلا جاتا ہے۔ شری بے ساختگی، عشق کی خود داریاں، جو ان عشق کے لوانا لایہی ہیں، جو الطاف صاحب کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

شاعر حقیقت میں بہت کچھ ہی نہیں سمجھتا ہے، اور اپنی ان قوتوں کا اُسے احساس بھی ہے۔ چنانچہ الطاف صاحب کہتے ہیں کہ  
نظر میں تڑپتے ہیں جلو سے ہزاروں میں چاہوں تو ہر کوہ کو طور کر دوں

بتا کر تھیں دل کی شانِ محبت ابھی پیار کرنے پہ مجبور کر دوں!  
محبت کی شان، اور اُس کے نتیجے میں یہ بے ساختہ خود اعتمادی شاعر کی منزل کو بہت رنج کر رہی ہے، ہاں اُس شاعری کو جس کا عشق سلی اور خاکی ہوتا تھا، ایک اور جگہ فرماتے ہیں، اور خوب فرماتے ہیں کہ  
گر می باز در محشر ہے ہمارے جنگ میں محفلِ عالم کو تڑپائیں گے اپنے رنگ میں  
واقعی شاعر کی سہمی سے سبھی کچھ ممکن ہے۔ شاعر قوم کا دبدبہ بنا، اور زبان گو یا ہے۔ قوم کا جسم تمام و کمال اس کے قبضہ اختیار میں ہے، محفلِ عالم کو جس طرح چاہے تڑپائے اس کے لئے ہار نہ ہے۔

تو یہ اور تو بہشکنی، اکثر بیشتر شعرا کا موضوع کلام رہا ہے۔ اساتذہ سے لے کر مبتدیانوں تک نے اور متقدمین کے عہد سے لے کر آج تک ہر اُس شخص نے جس پر شاعر ہونے کا الزام لگایا گیا، ضرور اس مضمون پر طبع آزمائی کی، لیکن جس بے ساختگی اور لا اُبالیہ انداز سے الطاف صاحب نے اپنے اکثر اشعار میں اس مضمون کو نبھایا ہے۔ وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے، کہتے ہیں کہ  
ویرِ میناں پر ڈھونڈتا ہوں مری ٹوٹی ہوئی تو بہ کہاں ہے  
اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض شعرا نے اس مضمون میں کافی وقت خیال اور زبردتِ فکر کو کام لیا ہے۔ لیکن جناب الطاف کا یہ شعر بھی واقعہ پوری کیفیات کا حامل ہے، ٹوٹی ہوئی تو بہ کو ڈھونڈنا اور وہ بھی ویرِ میناں پر۔ اس تجاہلِ شاعرانہ کے صدقے۔

ابتداء سے آج تک سنتے آئے ہیں کہ شاعر اپنے "اُن" سے بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں، اور بعض اوقات مواقع بھی پیدا ہو جاتے ہیں، مگر جراتِ سخن سکوتِ مطلق اختیار کر جاتی ہے۔ اور سپر ہیپارگی کا اعتراف کر دیتے ہیں لیکن حضرات اس حقیقت نفسِ لامری کو پہلے ہی پا جاتے ہیں۔ چنانچہ میر تقی میر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

کہتے تو ہو یہ کہتے وہ کہتے جو وہ آتا سب کہنے کی باتیں میں کچھ بھی نہ کہتا  
مگر الطاف اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے بھی اس بیپارگی کا اعتراف کرتے



ہوئے یہ یقین رکھتے ہیں کہ شاعر کی خاموشی نے وہ سب کچھ اُن سے کہہ دیا ہے جو کہا جانا چاہیے تھا۔

مجھے کہنا ہے جو کچھ اُن سے الطاف وہ میری خاموشی سے خود عیاں ہے  
تشنہ کو بے نقاب کرنے میں شاعروں کو بیت سی تکلیف اور مصائب کا خوف دامن گیر رہتا ہے، بجلیاں چلتی ہیں۔ آنکھیں خبرہ ہو جاتی ہیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، مگر الطاف کے تاثرات ان سب سے زلزلے اور بے نظیر ہیں۔ اُن کا محبوب اپنی بے حجابی میں دنیا بھر کی تباہی کا سامان بنیں رکھتا، ہاں اُن کے لئے بیت کچھ رکھتا ہے۔ کہتے ہیں۔

حسن کو بے نقاب کون کرے دل کی دنیا خراب کون کرے  
اہل نظر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاعر کے احساسات کس قدر پاکیزہ اور نازک ہیں: دل کی دنیا خراب کون کرے، کس قدر صبح اور واقعاتی کیفیات کا حامل مصراع ہے۔

اور ایک دما کی شان بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دعائیں مضطرب ہیں عاشق مضطر کی آہوں میں

دعائیں کر دہیں جتنی ہیں شاعر کی نگاہوں میں

آہیں تو اکثر آسمان پر زلزلے بجا کرتی رہی ہیں لیکن شاعر کی نگاہوں میں دعاؤں کا کردہیں لینا ندرت خیال کی انتہا ہے۔

جفاؤں اور وفاؤں کی اہمیت پر شعرائے زمانہ نے سیر حاصل بخشیں  
کی ہیں اور کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا، جو تعریف سے بچھا ہو۔ لیکن ہمارے نوجوان شاعر نے بھی اپنے آزاد رنگ میں اُن کے متعلق ایک شعر کہا ہے۔  
اور تب تک ہے کہ کافی کہہ جاؤ۔

ان کی معذرت اور اوّل کو بھانپت ہوئے۔  
ان کی معذرت اور اوّل کو بھانپت ہوئے۔  
ان کی معذرت اور اوّل کو بھانپت ہوئے۔

ایک غزل کے چند اشعار ہیں۔

وہ آئیں گے، امید ہے، ہر رستہ  
نہ جائے: بس راہ سے ہوئے نکلیں  
ہر ایک شعر سبائے خود جامع اور مکمل ہے۔ علی الخصوص پہلا شعر شاعر کی امید اور اُس پر یکسی کا کتنا صوبہ نقشہ ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر کی لطیف

کیفیات کا اندازہ کچھ اہل دل ہی خوب لگا سکتے ہیں۔ "دیار محبت میں سجدے بچھا دیں" بولتا ہوا مصراع ہے۔

دو فورہ دوسے جب بھکیاں سی آنکھیں ہر ایک زخم کے لب پر مر افسانہ تھا  
داستان محبت کی ہمہ گیری اور روداد و الفت کی عالم نائی کا کیا دلغریب لیکن پُر اثر طریقہ ہے۔

میں کہ بیان کیا جا چکا ہے الطاف صاحب ماشاء اللہ ایک نوجوان شاعر ہیں، اور غزل میں براہ راست اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں ہزار شوخی بھی۔ لیکن محبت کی تقدیس سے نا بد نہیں ہیں، انہیں اس امر کا خوب احساس ہے، کہ محبت کی پاکیزگی اہم ترین چیز ہے، اس پر انہیں فخر ہے، اور سجا فخر ہے، کہتے ہیں۔

فرشتوں کی فطرت سے پاکیزہ تر ہے جسم کسی کا ہماری جوانی  
اپنی جوانی اور کسی کے جسم کی تعریف کتنی لطیف اور عظیم الشان ثابت کی حامل ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے۔

زبان تنہا گئی تو محبت کا قصہ سنا پڑا آنسوؤں کی زبانی  
واقعی محبت کا قصہ، زبان اور صرف زبان کی قوت بیانہ کے

بہس کی بات نہیں۔ یہ آنسوؤں کی زبان کے ذریعہ ہی اختتام پذیر ہو سکتا ہے۔

پسینہ آگیا کالی گٹھاؤں کی حبیبوں پر  
جو اُن شالوں پہ لی زلفوں نے متوالی کی انگریزی

کالی گٹھاؤں، اور زلفوں، کا تعلق مشہور اور عام ہے، مگر اس عام خیال کے اظہار میں بھی جس ندرت اور ارتقائے خیال کا اظہار الطاف صاحب نے فرمایا ہے۔ وہ یقیناً قابلِ مدد وادہ ہے۔ شعر کیا ہے الفاظ میں جان بھر دی ہے، زلفوں کی متوالی انگریزی۔ سبحان اللہ۔ بے نظیر ٹکڑا ہے اور کالی گٹھاؤں کی حبیبوں پر پسینہ، اپنی خوبصورتیوں کا خدہ ہی بیان ہے۔ کلام کی خوبصورتی میں تشبیہ اور تشبیہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان سے شاعر کے خوبصورت اور دقیق احساس کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ

متقدمین کے کلام میں التزاماً ان اصنافِ سخن کو جگہ دی گئی ہے۔ بلکہ ہر ایک شاعر نے اس میدان میں اپنے معصروں سے گئے سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے، اور دورِ حاضرہ میں چونکہ ادبِ اردو کے دامن میں ہر ایک نئے اور ہر ایک جن کے گہبائے شگفتہ سما گئے ہیں۔ جامِ مشرق میں بادِ مغرب

عالم میں سرمایہ اور مزدوری کی ایک حشر زاجگ چھڑی ہوئی ہے، سرمایہ داروں نے ایک ایسا متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے جو شب و روز بالواسطہ یا بلاواسطہ مشرق اور مغرب میں غریب اور مزدور کو تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آج دنیا کی ہر طاقت اپنی مخالفت اور مخارب قوتوں کو پس دینے کے لئے کار پر ہے۔ گردن افلاک اب صرف ستم رسیدہ عشاق اور غمزہ بھور دلوں کے لئے ہی بلائے جان نہیں، بلکہ ہر وہ بستی اپنے بقا اور احیا کے لئے سرگرم عمل نہیں، یقیناً زود یا بدیر اس چرخ کے نیچے مٹ جانے والی ہے۔ مغربی ممالک میں چونکہ یہ دونوں قوتیں یعنی سرمایہ داری اور مزدوری بالقابل اور بلاواسطہ صفت آرا تھیں۔ اس لئے انہیں جلد ہی اس اٹل عداقت اور روشن حقیقت کا احساس ہو گیا کہ اگر قومیت اور وطن کے لئے کوئی نئی اور عظیم الشان بنیاد رکھی جاسکتی ہے تو وہ لازماً ان دونوں ہستیوں میں سے ایک بستی کی تباہ شدہ بنیادوں پر ٹھہری کی جاسکے گی، چنانچہ تمام ہستیاں میدانِ عمل میں اُتر آئیں، اور اس کا نتیجہ وہ عالمگیر اقتصاد اور کبھی جنگ ہے جس کے بے پناہ شعلوں سے آج ہر خطہ کے دامن امن کو اپنی پٹیوں میں لے لیا ہے۔ ہندوستان محکوم ملک تھا اس اپنی تباہی اور سرمایہ داری کی خوفناک سجاوید کا ایک مدت کے بعد علم ہوا، کیونکہ

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساکھ  
مگر بالآخر ہندوستان محکوم کے خوابیدہ قسمت اور خفتہ بخت  
ان لوگوں کو بھی اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام تمدن  
کا قیام محض غریبوں کی شکستہ ہڈیوں کی بنیادوں پر ہی ہو سکتا ہے جس  
کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بے کس انسان نے فرطِ اہم اور کثرتِ رنج سے  
دروناک چیخ ماری، اور ہندوستان بھر کے غریب کدوں سے الامان،  
الامان، کی صدا میں بلند ہوئی شروع ہو گئیں، مزدور کے اس دروت  
تکملانے والا کون شخص تھا، ہاں! یہ وہ انسان تھا، جس کے دل میں قدرت  
نے سارے جہاں کا درد، مغمم کیا ہوا ہے۔ اور وہ شاعر ہے، شاعر  
کی دوبریں اور حقیقت شناس نگاہوں پر سب سے پہلے یہ صداقت  
واضح ہوئی، اور اُس نے بیتاب ہو کر اپنے محکوم لیکن بے حس بھائیوں کو  
تھنجوڑنا شروع کیا چنانچہ نوجوان شعراء کا ایک طبقہ قدرت نے ایسا

بھی سوچ دیا۔ لڑ بچہ کے اختلاط کی وجہ سے خیالات میں ہم آہنگی بھی پیدا ہو گئی  
ہے۔ اس لئے خیالات کے طریقِ اظہار میں وسعت اور طرزِ تحریر میں جدت متذکر  
امور کا لازمی نتیجہ ہیں۔ چنانچہ عبد حاضر کے شعرا کے کلام میں یہ رنگِ ہنایت  
نمایاں اور واضح ہے، اب تشبیہات کی دنیا انہیں فرسودہ اور کہنہ بناؤں پر  
آباد نہیں، بلکہ وسعتِ مطالعہ اور اختلاطِ خیالات کی وجہ سے اس جنم میں  
نئی نئی ٹھکانوں کی جاتی ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی۔ جگر مراد آبادی،  
فانی بدایونی ایسے حضرات کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید  
شاعری میں تشبیہات و تمثیلات نے بالکل نئے اور ہنایت دلاویز طور سے  
جگہ حاصل کی ہے۔ جناب الطاف نے اس صنفِ سخن میں خوب ملیح آزمائی  
کی ہے۔ اور ایسی ایسی نادر تشبیہیں پیدا کی ہیں کہ شاعر کی قوتِ مشاہدہ کا ہر  
صاحبِ ذوق کو اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر میں جناب الطاف  
کے کلام میں سے چند ایک قطعات پیش کرتا ہوں۔ اہل نظر اُن کے محاسن کو  
خود دیکھ لیں گے، میں نہیں چاہتا کہ مزید تشریح کی کوشش میں اُن کی اہل  
دلاویزی کے ضائع ہونے کا باعث بنوں۔ فرماتے ہیں۔

سایہ افکن ہے فضا پر آج دیوالی کی شب  
جگمگاتے ہیں درو دیوار پر دریں چراغ  
رات کے پچھلے پہر جیسے وطن کی یاد سے  
مسکراتے ہیں کسی مجبور کے سینے کے داغ

گاری ہے ایک ٹیپے پر کوئی آتش نوا زمزموں سے پڑ رہی ہیں یوں بھاسلیں  
بسترِ ناکام الفت کو و فورِ درد سے جس طرح گردیں شکن آلود شب کو کوئی

آ رہی ہیں یادِ غربت میں وطن کی صحبت گرہے ہیں اشک میری آنکھ سے بے اختیار  
دفعہ جیسے ٹپک پڑتے ہیں چشمِ ابر سے جلیوں کے باتھ سے گوندھے ہوئے اشکوں کا  
دوشیزہ صبح کے نمونوں سے متاثر ہو کر ٹپکتے ہیں

دانش تالوں سے یوں معمور ہے ٹھنڈی ہوا

جیسے کچی نیند میں ہلکی سی بارش کی صدا  
اب میں حضرت الطاف شہیدی کے کلام کے اُس مختصر مضمون کی طرف  
آتا ہوں جس نے انہیں عصرِ حاضر کے دوسرے شعراء سے تمیز کیا ہے۔ آج اٹھ

پیدا کر دیا۔ جس کے ہاتھوں شاید مزدور کی تباہ قسمت کا احیا خدائے تعالیٰ کو منظور ہے۔ ان شاعروں نے مزدوروں کی بے لواز زندگی کا تجزیہ کیا، اور دنیا کے سامنے ان مناظر کو پیش کیا۔ ان واقعات کا اعادہ کیا، جن کے ذریعے سے سرمایہ دار اپنی بے پناہ اور بے گیر قوتوں سے غریبوں کی غناں خراب بنیادوں پر اپنے محلوں کی تعمیر کر رہے ہیں۔

محبیب بات ہے کہ یہ تمام شاعر سرست نوجوان ہی نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر و بیشتر شعر نویس ابن زمین ہیں، اس ضمن میں اگر حضرت جوش ملیح آبادی کا ام گرامی پیش کیا جاسکتا ہے تو پنجاب کے مایہ ناز نوجوان شاعر حضرت الطاف شہیدی بھی خاندانی رئیس اور ایک مرفہ احوال سادات کنبہ کے رکن ہیں۔ بلند معاشرتی اور مصلحتی حیثیت کے مالک ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے مزدور اور غریب کی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کچھ اس درجہ حقائق پر مبنی ہے کہ شاعر کی قوت احساس اور مشاہدہ کی داد دینا پڑتی ہے۔

”شریک زندگی کے نام آخری پیغام“ آپ کی ایک نظم ہے۔ ابتدا ہی میں بیمار شہر ہر کی غریب الوطنی اور بے چارگی کا نقشہ کچھ اس درد انگیز انداز سے کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والا بے قرار ہو جائے۔ فرماتے ہیں: ”سے شریک زندگی، لے واقف رہا دالم آج وہ شوہر ترا غربت میں ہے وقف ہم جس کے تلوں کو گلوں کی پتیاں زنجی کر رہی بستر کی جس کو سولیں سونے زوہں آج وہ بکس زمانے کا ٹکڑہ کرتا ہوا بیمار ہے سوئے منزل سسلیاں بہر تلوں اس کے بعد آپ بیمار عالم کی خزاں انجالی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے

ہیں: ”تجد کو تیر کی گئی میں بوگی کا واسطہ“ ”بکسی کی بھاری بھاری کا واسطہ“ ”حسن کی معصوم آہوں کی مسم دیتا ہوں میں“ ”عشش کی پڑ بول راہوں کی تم دیتا ہوں میں“ ”بھول جانا مجھ کو بس یہ آخری پیغام ہو“ ”اس جیل میں چند روزہ کا یہی انجام ہے“ ”یہ کتاب سہتی فانی کی اک تفسیر ہے“ ”خواب جو دیکھا ہے میں نے اسکی یہ تعبیر ہے“

شاعری اور مصوری ادب لطیف کی اہم ترین علمبردار ہیں۔ شلو کا مقام نسبتاً بلند ہے، وہ الفاظ میں رنگ ہی نہیں، جان پیدا کرتا ہے، الفاظ کی ترکیب اور بندش ہی سے وہ کام لیتا ہے کہ دل و دماغ مناظر و مشاہدے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ حضرت الطاف کے کلام میں یہ خصوصیت ہے کہ واقعہ

اور منظر کو اس دلآویز طور پر پیش کرتے ہیں کہ سننے والا بے اختیار ہوا جاتا ہے، آپ کی ایک بڑی شہور نظم ”وصیت“ ہے۔ نظم میں کیسے کہوں، اور اس کے علاوہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا مثلاً ”انوارات کے لحاظ سے ایک اکمل نظم ہے۔“ ”واقعاتی اور علی دنیا میں کو بس ریل“ جو پکار پکار کر اہل کارواں کو دعوت دے رہی ہے کہ زندگی اور اس کا خط مسلسل حرکت اور پیہم عمل کا نام ہے، ”الطاف خا“ نے اس نظم میں سرمایہ دار کے غفرت نظر چہرہ سے اس طرح نقاب کشائی کی ہے کہ سرمایہ داری اپنی پوری نفرت آفریں اور کراہت خیر شکل میں انکلوں کے سامنے آجاتی ہے، اس کے علاوہ مزدوری اور غربت، بے چارگی اور بے کسی کی ترجمانی کرنے کا حق بھی کامل طور پر ادا کیا ہے۔ نظم میں ایک مزدور کے گھر اس کی تصویر کا نقشہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”

چشم عبرت! آدھکڑوں میں تجھے وہ نہیں چوتی ہے جس کی چوٹ کو فرشتوں کی جبین خشک ٹکڑا بھی چہاں مزدور کو حال نہیں ہے ہوئے جس کے رنگیں اہل دلی آتیں آہ! یہ اس شیر دل مزدور کی تصویر ہے جس کے ہاتھوں رحمتوں کے باب کی زنجیر دینا سے عمل میں مزدور کی اس سے جامع تعریف کیا ہو سکتی ہے؟ جس کے ہاتھوں رحمتوں کے باب کی زنجیر ہے“ اس کے بعد غریب الوطن مزدور کی بھری کو بستر علات پر دکھایا گیا ہے۔

”سوم بر باکی شب بھی ہوئی ہے کاٹا“ ”سورہا ہے خامشی کی گود میں ساز حیات“ ”اک حمید جس کا شوہر گھر سے کوسوں دور“ ”اپنے بکس لاڈلوں کو دیکھ کر رہ جاتا ہے“ ”چہرہ افسردہ تن نازک علات کا شکار“ ”دم لبوں پر اور آنکھوں میں کسی کا اشعار“ ”شعلہ ناہ دم میں سینہ بریاں کا داغ“ ”بھکیوں پر آ رہا ہے زلیست کا دھندلا چرنا“

اس کے غم انگیز واقعات بیان کرتے ہوئے مزدور جمیل کی وصیت تحریر فرماتے ہیں جو اشعار کے پردے میں مظلوم کی زندہ تفسیر ہے۔ جمیل کی زبان سے سرمایہ دار غربت کی روح فرسا باہم آویزی بیان کی گئی ہے، اور دلی مزدور کی جس طرح ترجمانی کی گئی ہے وہ کچھ الطاف صاحب ہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں: ”

”اے ہوا! لے تیر کی بخت، لے پر غم فضا“ ”جب سنبھالیں ہوش یہ معصوم دل نام خدا“ ”ان سے کہنا کہ گئی ہے یہ وصیت مال نہیں“ ”اہل دولت نے تلایا خاکِ ذلت میں ہیں“

”زور بازو سے بدل دو گردش ایام کو“ ”نوح کو زلفت میں لپٹے ہوئے منام کو“

کھنچ لو ان مصیبت کاروں کی بیانی کا نور توڑ کر کھدو ذرو دولت کے بندوں کا نور  
ٹھوکروں سے سیم دزر کے بت ملا دو غائب تب مسرت کی چمک ہو دیدہ ناک میں  
کپنے پائی تھی یہیں ناک وہ کہ شمع زندگی موت کے سہم جو نکلوں سے الجھ کر رہ گئی  
بیت طویل نظم ہے۔ میں اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔

شاعر فطرۃً آزاد ہے، اور مادر وطن کو آزاد دیکھنے کا آرزو مند۔ اس کی  
تلاش اس کے لئے ہے۔ جو مردہ اجسام میں روح حیات پہنچ دیتے ہیں، الطاف  
ہند سی مزہ اور ارغوم کو دعوت دیتے ہیں کہ

ہر شے میں آ توڑ کر کھدو غلامی کی کند ڈال آزادی کے سداں میں ترقی کا سمند  
آ، بدل میں اٹھ کے ہندی کی غلامانہ دوش اکچل میں دزر کے بندوں کو کہ مٹ جائے بخش  
آ، کہ سفاکانہ فطرت ہی کو کریں ختم آج

آ، کہ دنیا سے مٹ ڈالیں جفاؤں کا راج

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

ہی ہو گا منجہ کسوں کی آہ وزاری کا کہ ٹکڑے ہو کے رہ جائے گابت سراہ دلی کا  
ماتی عبوس دیکھتے ہیں۔ دلی کے غم داندوہ کے ساتھ ساتھ اسوہ حسین  
علیہ السلام پیش نظر ہے۔ مسلمانوں کی بے بسی اور ریاکاری کو دیکھ کر تڑپ  
اُٹھتے ہیں۔ برلا کہتے ہیں

لب پر حسین! طوق غلامی گلے کی زیب اسلامو! خدا کو بھی دینے لگے فریب؟  
مذہب ہمارا خام ہے ایمان خام تر رونا نہیں حرام ہے، بہنسا حرام تر

شاعری جزوِ ریت از پتھیری صبح نہیں اُٹھ ہے۔ چنانچہ الطاف خود  
ایک نظم - تعارف - میں تحریر فرماتے ہیں۔

ہنسنے والے، غفلت شاعر سے تو واقف نہیں، تیری آنکھوں میں بھی یہ تلکنت ہے بعض  
میری تحریروں میں بکلی اُگ کا طوفان جو دزر کے بندوں کے لئے جو موت کا ساہا ہے  
مور کا جن مرے افکار کی قندیل میں قدیموں کا قص میری مغل تمکین میں  
مصیبت زادے، بکتر کر ترے توڑ دکھائیں ٹھوکروں سے سیم دزر کے بت کا سر چوڑھائیں

اس نوجوانی ہی میں الطاف کے کلام کو مقبولیت عام کے بلند مدارج  
مائل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ مدت سے ملک کے فن زجرائد، شاہکار - زمانہ، حکیم  
معارف، رومان، ہائیوں، ادب لطیف میں اُن کا کلام ہمیشہ التزام سے  
شائع ہوتا ہے۔

مجھے علمِ ودون، اور اُس کے نظریات میں اپنی میمانگی اور بیجاریگی کا کائنات  
احساس ہے، اور مسرت ہوں کہ جناب الطاف کا کلام میں نے تنقید کی اس روشنی  
میں دیکھنے سے پہلے ہی کی ہے، مگر یہ ایک سادہ حقیقت ہے کہ جو پیغام پنجاب کا  
نوجوان شاعر اپنے اشعار میں ہیں دے رہا ہے، اُس پر قوریت اور وطنیت کی  
بلند ترین عبارات کو قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور وقت آنے والا ہے کہ الطاف کا کلام  
نوجوانوں کے لئے شعل راہ ہو گا جس کی روشنی میں ملک اپنے پاکیزہ مقاصد  
اور منازل مقصود تک پہنچ سکے گا۔

## انتظار

جس طرح لے خن خود میں، نبض کاہ و مرج کوہ روز و شب اک لرزش پیہم سے رہتے ہیں دو چار  
کاہ کے دل میں مچتا ہے بفکر رنگ و بو تابش خورشید و موج باد و باران کا شرار  
کوہ میں فرط خوشی سے ناتراشیدہ مسن ڈھونڈتے ہیں بُت تراشوں کی نظر دیوانہ وانا

یو نہیں میرے مضمل جو ہر مرے افسردہ عزم  
تیرے ہلکے سے تبسم کے لئے ہیں بے قرار

## شہیدِ محراب

مسنون بہ نام نامی مخلص سید محمود علی طرزی

سستی مرکب ہے رست اور آتی سے ۔ رست مراد ساتھ اور آتی سے مراد یہ یا اس کی۔

گو یا سستی ہونے والی یہ کہتی ہے کہ یہ میری محبت کا مرکز۔ میری زندگی کا گہوارہ مادہ۔ میرے تخیل کا سکن۔ صرف یہ رہا ہے اور یہ میرے ساتھ اور میں اس کے ساتھ ابد الابد تک رہیں گے۔  
"سستی سچی محبت کی یادگار ہے"

اس کے بعد زمانے نے اس کو خود غرضی سے جاری رکھا۔ عورت نرم دل اور محبت والی ہستی ہے۔ عورت کو اکثر سچی اور ناقابلِ برداشت محبت ہوا کرتی ہے۔

عورت کو قدرت نے جو مادہ سچی اور مستحکم محبت کا دیا ہے وہ مردوں میں کم پایا جاتا ہے۔

عورت محبت کی بنو کی۔ محبت کرنے والی۔ محبت کی غلام اور سب کچھ بیان تک کہ خود اپنے کو محبت کی خاطر فنا کر دینے والی ہے۔

جب سے سستی کی رسم جاری ہوئی آج تک کبھی نہیں سنا کہ مرد بھی اپنی اُس لطیف ہستی کے ساتھ جیسے وہ نہ صرف ہر چیز سے بلکہ خود اپنے سے اعلیٰ اور برتر کہتا رہا ہے۔ سستی ہوا ہو:

محبت کے انتہائی شریف جذبے سے متاثر ہو کر بہت سحر پاکہ زبانِ محبت

## میرزا محمد اشرف تاتاری

نے اپنے کو اپنے محبوب کے ساتھ ختم کر دیا ہے۔ مگر۔ اس کے بعد اس شریف جذبے کو خود غرضی مردوں نے دم بنایا۔

اس رسم کی تکمیل کے ساتھ ایک طرف تو اپنی اور اپنے خاندان کی فحشی عزت و اہستہ تھی، اور دوسری طرف مظلوم بیوہ سے نجات پانے کا جذبہ بھی کار فرما تھا۔

اس رسم کو جبراً بھی ادا کرایا جاتا تھا۔ اگر ادا نہ کی جاتی تھی تو اس مظلوم کو ایسی حالت۔ ایسی صورت۔ ایسی زندگی اور ایسی طرزِ معاشرت میں رکھا جاتا تھا کہ وہ اور اُس کی دیکھنے والیاں اُس زندگی پر موت کو ترجیح دیتی تھیں۔ شادی اور خوشی کے مواقع پر اُس کی شرکت تو کہا اُس کا نظر پڑ جاتا تھا کہ محسوس خیال کیا جاتا تھا، ۲۴ گھنٹے صرف ایک وقت اُجا ہوا کہ اُس کو دیا جاتا تھا، کسی خوشی کا خیال کیا ہنسا تک اُس کے واسطے منع تھا، بال جو عورت کی محبوب زینت ہوتے ہیں۔ جڑے کاٹ دئے جاتے تھے۔ موٹے جھوٹے معمولی ایک دو کپڑے سال بھر کے لئے اُس کو دیرے جاتے تھے کہ خود دھو کر پہن لیا کہ۔ کسی بچے کو اُس کے پاس جانے کی اجازت نہ ہوتی کہ ایسا نہ ہو کہ اُس کی بڑی شہرت کا پرتو اس بچے کی آئندہ زندگی کو تباہ کر ڈالے۔

اس طرح اس کی دیکھنے والیاں اس زندگی سے خوف لکھتیں، اور وقت پرستی ہو جانا بہتر جانتیں۔

الغرض سستی کا شریف جذبہ رفتہ رفتہ خالص محبت کے انجھارے

کوسوں دور ہو گیا، اور خود غرضی کی تکرار گاہ بن کر رہ گیا۔  
شہنشاہ اکبر نے اس رسم کو ایک مذنب روکا، اس کے بعد پٹش گور  
نے اس کو قانوناً بند کر دیا۔ اچھا کیا، اور بہت اچھا کیا۔ کیونکہ یہ فعل اب جذبہ  
محبت کا فعل شاہی رہ گیا تھا، در نہ مجبوری کا فعل تھا۔ مگر اچھی چیز فنا نہیں  
ہو سکتی۔ اُس پر چاہے کتنا ہی گرد و غبار یا خود غرضی کی کچھڑ ڈال دی جاوے  
مگر کبھی نہ کبھی جب صبح جذبات کا زور جوتا ہے تو نمایاں ہو ہی جاتی ہے۔

کلمہ میں ۲۰ یا ۲۱ سہی سہی کا واقعہ محبت کے دربار میں نہیں  
اسی پر ہمیشہ رونق افزا نظر آیا کرے گا۔ اس خیال سے کہ پسماندگان کے  
اخلاقی نقطہ نظر سے اُن کے نام لینا مناسب نہیں، نام اور جگہ بدل کر واقعہ  
من و عن لکھا جاتا ہے۔ رامیش کی بیوی رام دیوی کا واقعہ بھلا یا نہیں جانتا۔  
رامیش چند۔ ڈھاکہ کا رہنے والا الین لے پاس پولیس میں  
بھرتی ہو گیا، ۲۶ سال کی عمر تھی کہ رام (راما دیوی) سے جس کی عمر ۲۰ سال  
تھی شادی ہو گئی۔ رام کی تعلیم یوں تو زیادہ نہ تھی مگر گھر کے کام کاج خط  
پتر لکھنے، اخبار پڑھنے، کہانی کی کتابیں پڑھ لینے کے لئے کافی تھی۔

فسانہ اکثر پڑھتی، اُس میں سندی اور حافظہ کے اشعار کا ترجمہ  
پڑھا، ان کا چمک لگا اور بچھے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کے کلام کا ترجمہ  
پڑھتی اور لطف لیتی۔

شادی کے بارے میں اُس کا تخیل اُس زندگی کا تھا جس کی فنا  
میں اُس کا خیالی شوہر اُس کے خیالات کی ترجمانی کرے، جو خیالات اور  
بذات اُس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں پیدا ہوں وہ اُن کا ذکر  
کیا کرے۔ رامیش کا زمانہ ابتدائی زندگی میں ذرا عاشقانہ گزرا تھا۔ اُس  
کے دوستوں میں ہری شنکر، یعقوب علی اور امر لال خصوصیت رکھتے تھے،  
ان تینوں کی رنگین طبیعت نے رامیش کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور  
ان چاروں کی محبت کا اصلی رنگ جب یہ سب جمع ہوتے تب معلوم ہوتا۔  
رامیش ایک فرم میں اُس وقت نوکری تھا اور ایک جگہ پڑھایا کرتا  
اس طرح انہی دو پیشہ کے قریب کھینچا لیا، اور اس ظاہری محبت کی ٹیپ ٹاپ  
میں خرچ کر دیتا۔

رامیش کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اپنی داشتہ پر ہر طرح اعتبار کرتا  
تھا اور اُس کو وفا کا پتلا اور خلوص کا نمونہ جانتا تھا۔ مختصر یہ کہ ایک دن

اُس نے جب وہ خلاف وقت کمرے پر چلا گیا، اور اپنے ایک دوست  
کے ساتھ اپنی داشتہ کو مرنے لگا دیکھ لیا۔ اُسٹی جوانی، جوانی کا غرور  
اس پر ہر طرح کا اعتبار، اس واقعے سے رامیش پر بہت اثر ہوا، اور  
عورتوں کی طرف سے بدظن ہو گیا۔

مگر اُس کے بعض مخلص احباب نے سمجھایا اور کہا کہ وہ اپنی بیوی  
سے محبت کرے۔ رامیش کا وہاں اُس کی امید کے خلاف خیر مقدم ہوا تو  
اُس کے احساسات میں حرکت ہوئی اور اُسے اب محسوس ہوا کہ اُس کی  
شریک زندگی اور اُس کے بد اخلاقی کے زمانے میں بھی اُس کی ایسی ہی منتظر  
بہتی تھی جیسی آج ہے۔ اُس کو یاد آیا کہ وہ اگر کبھی رات کو سو یا نہ بچے  
گھر گیا ہے تو اُس کی بیوی نے ہنسنے کا خیر مقدم کیا ہے، اور بغیر کسی  
ظن یا شکایت کے اُس کو آرام پہنچایا ہے۔

اُس کو اب خیال ہوا کہ اگر وہ ساری رات گھر سے باہر رہا ہے  
اور صبح کو خود نادم سا آیا ہے جب بھی اُس کی بیوی خندہ پیشانی سے  
پیش آئی ہے اور ہر ممکن خدمت کی ہے۔

ان خیالات کا اثر اُس پر روز بروز بڑھتا گیا، اگرچہ مردانہ  
تکبر اور شوہرانہ برتری کا یقین اپنے تصور کے بعد بھی مذمت کی شکل  
سے اجازت دیا کرتا ہے۔ مگر ایک دن جب وہ بنگ پر لٹا ہوا اپنے  
سلوک اور اس نیک بیوی کے برتاؤ پر غور کر رہا تھا کہ اُس کی بیوی  
آئی اور یہ کہہ کر کہ آج آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں پیر دبانے لگی۔  
شریف جذبات کا جام لبریز ہو چکا تھا، اُس میں حرکت ہوئی  
اور جھلک گیا، اٹھا اور بیوی کو برابر بنگ پر بٹھایا اور دوتی ہوئی  
آنکھوں سے اُس کو دیکھا، اور ہاتھ جوڑ کر کہا "میری محبت کی دیہی مجھے  
معاف کر دے۔"

راما: یہ آپ کیا کرتے ہیں، آپ نے میرا کیا تصور کیا، یہ تو میرے  
کرموں کا پھل تھا کہ اتنے دن اور رات مجھے آپ کے انتظار میں رہنا پڑا۔  
آپ تو جو آج ہیں وہی پیسے بھی تھے۔

رامیش: نہیں میری دیہی نہیں، میں نے تو بہت ظلم کیا ہے۔ آج  
تمہارا عبرت ناک محبت مجھے نادم کر رہے ہیں۔

راما: اس داسی کی بھی یہی آرزو ہے کہ آپ اپنے چروں میں کھیں،

ہے پرمیٹو زیری کر یا کم ان کے ہاتھوں جو۔

رامیش۔ ایسا نہ کہو۔ تم کو کون جو۔ مجھے اب خبر ہوئی گھر کے سونے کو میں نے سٹی میں ڈال رکھا تھا۔ اور نہیں پچھا تھا۔ رامیش اب بتا رہا ہے اور ہمیشہ ہٹا رہی رہے گا۔

راما۔ یہ میرے بھاک۔ اس سے زیادہ اور کوئی نعمت میرے لئے نہیں ہو سکتی۔

غرض دونوں گلے لگے لگے۔

راما کے یوں تو کئی بچے ہوئے۔ مگر زندہ کوئی نہ رہا۔

رامیش پوس میں ذکر ہو گیا تھا، اُس کا تباہ و برباد ہو رہا تھا، جہاں کئی سال تک دونوں خوش و خرم رہے۔

رامیش کو ایک دفعہ سرکاری کام سے دو ایک دیہات میں جانا پڑا اور وہاں دس روز رہا۔ پانی وہاں کا بہت خراب تھا۔ رامیش بخار سے کرا رہا تھا۔ ضروری علاج کیا گیا۔ رامیش کو آرام تو ہو گیا مگر بخار۔ آنکھیں دھوئیں آہی جاتا تھا۔ اس دوران میں پھر رامیش کو ایک رات دن بخل میں رہنا پڑا۔ جہاں پانی میں بھیگ گیا۔ اور سردی لگ گئی۔ اور بخار پھر آنے لگا۔ اس مرتبہ ۲۲ روز برابر بخار رہا اور سامانے ہر ممکن خدمت کی۔ خدا خدا کر کے رامیش کو آرام ہوا اور سامانے کھٹا کرائی اور برہمن کھلو اسے۔

یوں دیکھنے میں تو رامیش اچھا تھا۔ مگر حرارت اُس کو آتی رہتی تھی اور جھینے میں ایک دو مرتبہ بخار بھی ہو جاتا تھا۔ کمزور بھی ہو گیا تھا۔ اور بھوک بھی کم ہو گئی تھی۔ مگر کام کی زیادتی کے سبب اُس کو فرصت نہیں ملتی تھی۔

آخر مجبور ہو کر رامیش نے چھٹی ٹی اور گھر جا کر علاج کیا اور بظاہر ہر طرح اچھا ہو گیا۔ اب رامیش کا اتھرو میڈیٹی پور کے قریب ایک قصبے میں ہوا۔ وہاں کی بھی آب و ہوا خراب تھی۔ اگرچہ سامانے بہت احتیاط کی۔ اور پانی گرم کر کے پلاتی۔ مگر رامیش اچھا نہیں رہتا۔ اور کوئی نہ کوئی تکلیف محسوس کرتا رہتا تھا۔ اس طرح دو سال سے زیادہ ہو گئے اور رامیش کم و بیش بیاہی رہا کرتا تھا اور جب ذرا زیادہ محنت کام میں کرتا زیادہ بیمار پڑ جاتا تھا۔

آخر مجبور ہو کر پھر چھٹی ٹی اور ڈھاکے جا کر علاج کیا۔ اگرچہ کم و بیش چار مہینے ہو گئے مگر آرام نہ ہوا۔ اور کمزوری بہت زیادہ ہو گئی، سب کی صلاح سے رامیش اور ساما اور رامیش کی ماں ایک بہن اور بھائی کھلتے گئے کہ وہاں

جا کر علاج کریں۔

راما اگرچہ بیمار نہ تھی۔ مگر بالکل سفید ہو گئی تھی اور ہر لمحہ رامیش کے پاس رہتی۔ اور خدمت کرتی تھی۔

کھلتے میں اگرچہ دوا مختلف علاج کئے۔ مگر مرض میں بجائے کمی زیادتی ہی ہوتی تھی۔

آخر ایک روز کھلتے کے بڑے ڈاکٹروں کو بلا دیا اور اُن سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹروں نے بخوبی اور بغور معائنہ کیا۔ اور متفقہاً یہ کہا کہ مریض کا ایک حوت کا پھیپھڑا اگل گیا ہے اور دوسرا زخمی ہے۔ علاج کرو اور احتیاط رکھو۔ ممکن ہے کہ آرام ہو جاوے۔ اور ایک نسخہ تجویز کر دیا، جس کا استعمال کیا گیا، مگر مریض کو فائدہ نہ ہوا۔

پھر ایک ماہ کے بعد دوبارہ اور دو بڑے ڈاکٹر بلائے گئے اور انہوں نے بخوبی دیکھ بھال کر مرض کو لا علاج بتایا، اگرچہ اس کی احتیاط کی گئی کہ ڈاکٹروں کا فیصلہ راما کو نہ معلوم ہو۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس نے بھی سن لیا۔ راما کی حالت خود ہی گری ہوئی تھی اور وہ ہر وقت رامیش کی خدمت کرتی تھی۔ یہ سنکر اُس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔

راما چند روز چپ چاپ رہی اور کھانا اور سونا اور کم ہو گیا۔ رات کو رات کے کسی حصے میں شوہر سے بات چیت کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ایک شب جب سب سو رہے تھے اور اُس روز رامیش ظاہر بہت بہتر معلوم ہوتا تھا، بیوی میاں میں اس طرح گفتگو ہوئی۔

راما۔ اس وقت ہم سے چھوٹے والے سنار میں بھوک یہ وقت ملا ہے کہ میں تم سے دل کی باتیں کر لوں۔ میرے جسم اور جان کے مالک اس دنیا میں ہوتا رامیرا ساتھ جلد ختم ہو جاوے گا۔ پرمیٹو سے ہم دونوں دعا کریں کہ اگلے جنم میں پھر آپ کو اور مجھ کو ایک دوسرے سے ملا ہوا رکھے۔

رامیش۔ ہاں مجھے اپنی زندگی کی اب امید بہت کم ہے، میرے بعد میں جانتا ہوں کہ تم کو بہت تکلیف ہوگی۔

راما۔ راما کی زندگی ہمارے ساتھ وابستہ ہے۔ راما اُس وقت کے لئے زندہ نہ ہوگی کہ آپ کو اپنے سانسے جاتے ہوئے دیکھے۔ راما کے مالک راما کی نظر میں فقط آپ ہیں۔ سن لیجئے کہ راما میں یہ طاقت نہیں کہ اُس وقت کو اپنی نظر سے دیکھ سکے۔ جب آپ اُسے چھوڑ کر جا رہے ہوں گے اور



آپ کی واپسی کی مجھے اُمید نہ ہوگی۔

رامیش۔ یہ سب دنیا کا معمول ہے۔ میں اگر تم سے پیسے چاہا ہوں تو تم میرے بعد آؤ گی۔ میں تمہارا وہاں انتظار کروں گا۔

راما۔ نہیں۔ میرے پرہیز۔ یہ نہیں ہوگا، بلکہ میں تم سے پیسے چاہوں گی۔ اور تمہارا وہاں انتظار کروں گی۔

رامیش۔ ایسا خیال کرنا گناہ ہے اور گناہ کرنے سے ہم دونوں بھڑک جائیں گے۔

راما۔ پرمیشر دل کا حال جانتے ہیں۔ دل آنکھوں نے دیا ہے، اور اس دل میں تمہارا دنیا (چراغ) جلا رہا ہے، اس کی روشنی میں میں زندہ ہوں۔ اگر وہ روشنی بجھ جائے گی تو میں اندھی ہو جاؤں گی۔ تم کو نہیں دیکھ سکوں گی، اور جب تم کو نہیں دیکھ سکوں گی، میرا صبر۔ میرا فرا۔ میرے ہوش۔ میرے حواس کچھ نہ رہیں گے، اور اس طرح رو کر سانس لینا یا نہ لینا میرے لئے دونوں برابر ہیں۔ میرا دل کمزور ہے۔ میں اتنے بڑے صدمے کی برداشت نہیں کر سکتی۔ روتے ہوئے پیارے۔ میرے دل۔ روج: میں نے جو تمہارے تصور کئے ہیں ان کو معاف کر دیجئے تاکہ ان کی سزا بھگتنے کے لئے تھوڑے دن بھی میں تم سے الگ نہ رہوں۔

رامیش۔ پیاری راما، یہ کیا کہہ رہی ہو۔

راما۔ پیارے وہی جو میرا دل بھلا رہا ہے۔

رامیش۔ پیاری راما۔ ایسی باتیں نہ کرو جس سے تم کو اور مجھ کو تکلیف پہنچے۔

راما۔ آج باوجود آپ کے منع کرنے کے میں ان جذبات کو جنہوں نے مجھ میں تسلیم کر لیا ہے، روک نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ میری اس گفتگو سے صدمہ پہنچے گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اب کوئی صدمہ آپ کی زندگی پر اس نوجوہ مرض سے زیادہ بڑا اثر نہیں کر سکتا۔ بس میرے پیار سے اس سے پہلے کہ ہم دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے سے الگ ہوں میرے دل کے احساسات جو آج تک آپ کی محبت اور محبت بھرے پرتاؤ سے پرورش پاتے رہے ہیں، ان کو سنائیے۔ وہ میں نے آپ کو رنجیدہ کیا ہے، دکھ دیا ہے۔ تکلیف پہنچائی ہے، اور آپ نے ان کو میرے برداشت کیا، اپنی لونڈی، اپنی داسی کی یہ آخری تھوڑی سی محبت بھری تکلیف بھی برداشت کر لیں۔

رامیش۔ راما، میری راما، جو تجھے کہنا ہو کہہ لے، کہ تیری آواز محبت بھرے سورگ سے آئے ہوئے سینے سینے سر ہوا کرتے ہیں۔ محبت کی دیہی۔ رامیش کی زندگی، میں بھی اس آخری منزل میں تیرے سرے نمونوں کے ٹھننے کا مشتاق ہوں۔ کہو:

راما۔ تمہارے چوڑوں میں پر نام کرنے سے پہلے، میں تمہارا سہنا دیکھا کرتی تھی۔ جب میں تمہائی کی راتوں میں اپنے ہونے والے مالک کا تصور کرتی تو مجھے یہ نظر آتا کہ ہرے بھرے جنگل میں جس میں میں تمہا ہوں اور اپنے پر تیم کا انتظار کر رہی ہوں پیچھے سے تم آجاتے اور مجھ کو پکڑ کر سنا گدگداتے اور اپنی پریم بھری آواز سے مجھے بے چین کر دیا کرتے۔ میں چلا جاتی تم ساتھ ساتھ رہتے، جہاں کہیں گرا یا او سنا نیچا راستہ پڑ جاتا تم مجھے پار کر دیا کرتے۔

تم مجھ سے کہا کرتے کہ میں دل کا گیت گائوں۔ میں گاتی، تم میری آواز اور الفاظ سے متاثر ہوتے۔ کبھی خود روتے، کبھی مجھے بھی رلاتے۔ تم جب اپنے کام پر چلے جاتے میں تمہیں دیکھا کرتی۔ دن دن صبر میں پریم کا رس پی لیتی کر گزار دیتی۔ اور جب تم آجاتے تو ہم تم ساتھ کھانا کھاتے۔ میں تمہارے غصے سے اس طرح ڈرتی جیسے کوئی دیوتاؤں کے جھلک ڈرتی ہو۔ مگر نہیں، میری پریم کی دنیا: تم نے تو مجھ پر کبھی غصہ ہی نہیں کیا، جب میں تم کو غور سے دیکھتی تو میں اپنے کو دلہن بنے اور ہنستے ہوئے پاتی۔ میں دیکھتی تھی تم اوس ہرے بھرے باغ میں مجھ سے دور ہو جاتے، اور جب مجھ کو بلاتے تو میں ددڑ کر کبھی ٹھیکر ٹھیکر کبھی تیز کبھی آہستہ جاتی۔ تم مجھ کو گلے سے لگاتے، اور میں اپنے کو تمہارے دل میں پاتی، کیسا اچھا دل۔ کیسے آرام کی جگہ میں اُس نرم نرم سمجھنے پر سرد رخسار غنودگی میں پڑی رہتی، میں تم میں جذب ہو کر سبھی تم کو اپنے اندر پاتی۔

یہ سب امیدوں کے خواب تھے، میں جب ہوش میں آتی تو ذوق گھبراتی، کہ ایسا ہنوکہ یہ خواب خواب ہی ہو کر رہ جائیں۔ مگر نہیں۔ میرے پریم جب تم مجھ کو اپنے آئے تو میرے لئے وہی تحفہ لائے جس کو میں خواب میں دیکھا کرتی تھی۔ تم نے اگر میری تنہائی کی زندگی کو علی بنادیا۔ دو برس تک تم نے مجھے وہ پریم کے دس بھرے گھونٹ پلائے کہ مجھے ہر چیز میں پریم ہی پریم نظر آنے لگا۔ اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ ہم پریم کی شان دنیا میں رہتے ہیں،



اور یہ دنیا کبھی بھی ختم ہونے والی نہیں۔ پریم کی دنیا، جس میں میں رہتی تھی، مجھے میری ملکیت نظر آنے لگی، اور میں اپنے کو وہاں کی ملک جاننے لگی۔ پرتا کو میرا غرور نہیں بھا با۔ اور مجھے آگاہ کرنے کہ تم سے تھوڑے دن کو الگ کر دیا، آپ خوبکو بھول گئے۔ مگر میرے ہر دے میں آپ جیسے رہے ہیں۔ آپ کو اپنے پاس دیکھتی اور آپ سے باتیں کیا کرتی، پھر چٹاک جاتی اور یہ معلوم ہوتا کہ آپ مجھ سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ میں روتی اور پرانا سے آپ کے آجانے کی منتی کرتی۔ بہت کون میں بسا کر جب بہتیم دور رہا اُس کا مزہ بے چین سلف میں بھی مل گیا۔ میرے مالک جب پھر آپ اس لوندی کے پاس آئے تو میں نے اپنے میں پہلے سے زیادہ پریر پایا۔ ہاں سچ ہے خوشی کا مزار سچ کے بعد، ٹاپ کا مزار اجداد بننے کے بعد، پریم پریم سے الگ ہو کر پھر اپنے اصلی رنگ میں آجاتے ہیں، اور پھر مجھے سرو اور شانتی ملتی۔

تھاری بیماری کو میں باری نہیں سمجھی تھی، میں تو یہ جانتی رہی کہ پرانا دیکھ رہے ہیں کہ میں تم سے کتنا پریم کرتی ہوں۔ جب کلکے آنے لگے تو مجھے وہم اور دوساں نے تانا شرع کیا، میرا دل کمزور ہوتا گیا۔ مجھے سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ میرے ہاتھ پیرنجے جواب دینے لگے، اور ہر وقت مجھے خوف رہنے لگا۔ میں یہ کس سے کہتی، آپ کے علاج اور اُس کے نتیجے سے میں مایوس ہوتی گئی۔ میری ماں سپنے میں میرے پاس آئیں اور مجھے بہت تسلی دی اور کہا کہ بیٹا تو رنک نکر تو اور تیرا بچہ ساتھ رہیں گے۔

راما کی امید، میں اس سپنے سے اور گھبرائی اور کچھ نہ سمجھی کہ اب کے جو ڈاکٹر لوگ آئے اور جب جانے لگے تو دروازے کے پاس بیٹا سے کہا کہ علاج بیکار ہے اور رامیش بہت سے بہت ایک ہفتے کا ہمان ہے جو مانگے سو دو۔ دو اہم لکھ دیتے ہیں یہ پلاتے رہنا۔

یہ سب میں نے دروازے کے برابر کی کوٹری میں کھڑے ہو کر سنا۔ میں جانتی تھی کہ ڈاکٹر دن سے دروازے کے پاس اصل مالی پوچھا کرتے ہیں۔ مجھے سب نے چھپایا اور کہتے ہیں کہ اچھے ہو جائیں گے۔

میرے سوا میری سب امیدیں اب ختم ہو گئی ہیں۔ آپ اُس بجھے والے چراغ کی مانند ہیں جو مہک کر روشنی دے رہا ہے۔ میری زندگی کے چراغ

تھنا دیا (چراغ) بجو جاوے گا۔ تم جو آج ایسے ہوشیار ہو، یہ مرن کا دور ہے اس کے بعد پھر تم نہیں سمجھو گے، تھنا را یہ دیا بجھ کر میرے ہر دے کو مال کو ٹھہری بنا دے گا۔ میری روشنی اب یہی کم ہو گئی ہے، اور کم ہو رہی ہے۔ میں اس کم روشنی میں بھی تم کو اپنے سے جدا ہوتے نہیں دیکھ سکوں گی، مانا نے سچ کہا ہے کہ ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔

راما نے اتنا کہا اور رامیش کے پیر پکڑائے اور کہا کہ اس اپنی اسی کے گناہ معاف کر دیجے کہ میں آپ سے دور نہ ہو جاؤں، اور پیر دبانے لگی۔ رامیش۔ راما، میری راما، میں مزدوروں لگا، اور ہم تم پر لوک میں بھی ساتھ رہیں گے، مگر آج تو میں اچھا ہوں۔ اگر اس طرح اچھا رہا تو جلدی ہم ڈھاکے چلے جائیں گے۔

راما۔ پرانا کرے کہ آپ جلدی اچھے ہو جاویں۔ مگر ڈاکٹر لوگ بھی پریشہ سے انسان کی زندگی کا علم لے کر آتے ہیں۔ سب نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے، اور مجھے جو کچھ کرنا ہے اب کر لوں۔ مجھے کرنا ہی کیا ہے، آج رات ان اندھی ہونے والی آنکھوں سے آپ کو جی بھر کے دیکھنا۔ اپنے گناہ اور قصور معاف کرانا، اس کے بعد آپ کا انتظار کرنا، میرے مالک، کہو کہ اپنی اس داسی کے قصور معاف کر دے؟

رامیش، قصور میں نے کئے یا میری راما تو نے، اچھا میں نے بھی کئے اور تو نے بھی۔ میں دل سے اپنے پریشہ کے سامنے معاف کرتا ہوں اور تو بھی مجھے معاف کر دے۔

راما۔ ایسا نہ کہو، داسی کے مالک، لوندی کے آقا، اس راما کے حاکم آپ نے جو بھی کیا درست کیا، آپ کو اُس کا حق تھا، آپ مالک تھے، آج بھی ہیں، اور آئندہ بھی ہوں گے، آپ کا کوئی فعل قصور یا شکایت نہیں، ہو سکتا، ہاں مجھ داسی کی لغزش، قصور ہو وہ معاف کر دیجے۔

رامیش۔ میں جو بھی تھا یا ہوں اس کا ذکر نہیں۔ تیری زندگی میں سب یا ہوا میں، اور میری زندگی میں یہی ہوئی تو راما۔ زبان سے کہہ کہ تو نے بھی معاف کیا۔

راما۔ میرے مالک، داسی حکم کی بندی ہے، آپ کا حکم ہے۔ میں کہوں کہ میں نے بھی معاف کیا، یہ آپ کے حکم، آپ کے اشارے۔ آپ کی مرضی کی منتظر، آپ کے پریم میں خوش راما، عرض کرتی ہے کہ یہ

سر تاج۔ میری خوشی کے سرچنے۔ میرے پریم کے سوتے۔ معاف کیا، معاف کیا۔  
یہ کہہ کر رام رامیش سے لپٹ جاتی ہے، اور دونوں اس قدر  
روتے ہیں کہ غشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ محبت، سچی محبت، سچے پریم کے  
مہذبات دونوں کے ہونٹوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

راما یہ کہتے ہوئی کہ میرے نام میں اپنے پریمی رام کا انتظار کرو گئی،  
نیچے بیٹھ جاتی ہے۔

رامیش کی ماں آ جاتی ہے اور دیکھتی ہے کہ رامیش کی آنکھیں سرخ ہیں،  
ماں۔ کیوں بیٹا، طبیعت کیسی ہے۔  
رامیش، اچھی سوتی اور اچھی ہے۔

ماں۔ بہو! اتنا بوجھ جو رہی ہے، رات بھر جاگی ہو، جاؤ تم بھی  
ذرا ہاتھ پیر سید سے کر لو۔

ماتا۔ جو حکم، اُسٹی، رامیش کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور  
چلی گئی۔ دن معمولی طرح گزرتا رہا۔ دوپہر کا کھانا سب نے کھایا، اور  
رامیش بھی کل سے بہتر رہا۔

کھانے کے بعد راما آئی، رامیش کے سامنے کھڑی ہوئی، موقع  
پاکر ہاتھ جوڑے، آنسو آنکھوں سے گرے، اور لبوں سے ہرے پر پیغام دیا  
اور چلی گئی۔

### سستی!

سوڑی دیر کے بعد سامنے کی بند کو کھڑی سے دعوای نکلتا نظر  
آیا۔ سب اس طرف دوڑ پڑے۔ معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے،  
دروازہ توڑا تو دیکھا کہ

راما نیم جان پڑی دم توڑ رہی ہے۔ کپڑے سب جل چکے ہیں۔  
نیل جو بدن پر جا بجا رہ گیا تھا اب بھی جل رہا ہے۔

بس ایک کھرام بچ گیا، مرقی ہوئی راما کو کپڑا اڑھایا اور اٹھا کر  
رامیش کے برابر کمرے میں لے جا رہے تھے کہ رامیش اُٹھ بیٹھا، اور اس  
ماتم کا سبب پوچھا، پہلے نہ بتایا، پھر مجبوراً بتانا پڑا۔ رامیش مسر ہوا کہ  
اُس کو سستی ہونے والی کے درشن کرادو، جب نہ مانے تو منہ کی اور کہا  
کہ وہ خود کھسکتا ہوا جاے گا۔ مجبوراً دم توڑتی ہوئی راما کو اُس کے چنگ  
کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

پریم بھری نگاہیں پریم سے مل گئیں، اور راما نے دم توڑ دیا۔  
رامیش نے مرنے والی کو حور سے دیکھا، رویا، ایک سچی ماری، ہنگ پر  
اُچھلا، راما کے پاس گرا، عزیز و اقربا دوڑے۔  
رامیش مر چکا تھا۔

یہ خبر بھی کی طرح سارے نکلنے میں دوڑ گئی۔

رامیش پولیس سب انسپکٹر ایک نامعلوم ہستی جو نکلنے میں علاج کرنے  
آئی تھی، اُس کے دروازہ پر ٹہر کے معززین کا مجمع ہے۔  
راما کی لاش کو پوسٹ مارٹم سے معاف کرا لیا گیا۔

ایک ارستھی پر دو لاشیں، ایک دوسرے کے پیلوں میں ایک کا نہ دوسرے  
کے سامنے لے جا رہی ہیں، جو سنتا ہے ساتھ ہو لیتا ہے۔

گھاٹ پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع سینکڑوں سوڑیں، سینکڑوں گڈیاں  
کھڑی ہیں۔

دربا کے کنارے عندل کی لکڑیوں میں تپتی ہوئی ارستھی دکھائی دے  
رہی ہے، جس پر ایک محبت کا شہیدائی، دوسری پریم کی دیوانی، شلوں اور  
دھویں میں ایک دوسرے سے پٹے اڑتے ہوئے دوسری دنیا میں چلے گئے!

نکلتا  
بشک ہو کر سائیکل کی نہیں رہی جب اس  
حالتِ اشجار یوں اس وقت ہوئی جب  
چلے گئے انکوں میں گدگی دیکھ کر غم سوال  
آج کل کیا ہے غم نہ مرنے سے نفیس کرینا  
(پیش)

# نان وایسان

نان کی مضرب سے ہے وجد میں سازِ حیات  
نان کی قوت سکھاتی ہے جوانی کو غرور  
نان دیتی ہے ہر غیرت کی دہریں اک کو  
نان دیتی ہے سبق قوم و وطن کی حباہ کا  
نان کی مہربانی سے ہوتا ہے جوانوں کو سرور  
نان سینوں کو عطا کرتی ہے ایسی زندگی  
نان سے ہوتی ہیں روشن مشعلیں ایشا کی  
نان ہی رُخ پھیرتی ہے گردشِ افلاک کا  
نان اسنا کو عطا کرتی ہے وہ رنگیں شباب  
نان دیتی ہے جوانی کو وہ پر شوکت وقار

الغرض لازم ہے اتنی نان جینے کے لئے

جس قدر ملاح لازم اک سفینے کے لئے

دورایاں نام ہے اُس قوتِ موہوم کا  
جو بنا دیتی ہے انسانوں کو اس درجہ حقیر  
جو چمپا کر پیٹ کے بندوں کو اپنی آڑ میں  
جو بدل کر راہبر کا روپ دیتی ہے فریب  
جو بہن کر لیڈر می کا معصیت آلودہ بھینس  
ہی ہانستی ہے جو غریبوں کو خدا کے نام پر  
چھین لے جو نوجوانوں سے جوانی کا خمار  
سورماؤں سے کرے جو بزدلی کو ہسکار  
گردلوں کو جو جھکائے سیم و زر کے پاؤں میں

ایسے ایماں کو ہمارے دور سے لاکھوں سلام

ہو رہی جو جس سے اپنی زندگی گانی تک حرام

لے مزدور کی گائی

# زقاروق

اداسہ

## خطبہ صدارت صدر کانگریس

اے بوسجاش چندر بوس کا پریذیڈنٹس، بنگالی ذہانت، ادبیت، جوانانہ جوش و لولہ، پامردانہ عظمت و استقامت۔ مجھ پر اندازہ فکر و بصیرت، سیاست و وسیع انٹیلیجنس، بالائے نظریہ، نظریہ اندازہ زندگی و عمر و زندگی، نظریہ بلاکسٹ و عورت، استلاء و استقبال آزمائش، کانگریس کا ایک دلنوازا سیز ہے، ہم اس تاریخی نطق سیاسی کا مقصد و جملہ صفحاتِ حکیم پر وطن کے جہاد آزادی کے آئندہ نمونہ کے لئے ثبت لئے دیتے ہیں۔

نہایت بابو نے اپنے انتخاب کو کانگریس کے نوجوان طبقے کی خدمات کو ایک نراج عسین کی پیشکش سے تعبیر کیا، اور دعا کی کہ کاش وہ اس منصب مندے سنگین و سنگین مقصدیات سے عہدہ برآ ہو سکیں! اُنہوں نے آغاز گفتگو شریعتی سرپرستی کی ہندو، مسزنگڈیش چندر بوس، ڈاکٹر سرت چندر چٹرجی، اور شری ہر چندر ناتھ (شہید متاثرہ جوعی) کی وفات حسرت آیات پر قوم کی طرف سے اظہارِ اور وقوریت کیا۔ موزالہ کر فرزند وطن کے متعلق صدر کانگریس کا یہ جملہ کلام بصیرت افروز اور برکت آور تھا کہ وہ ایسی رحمت مآب حکومت ہے جس کے سایہ عاطفت میں اس سرزمین کے بہترین دل و دماغ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس نوجوان و شہل پیران سچہ کارہ خلیب نے رومہ الکبریٰ، خاندانِ عثمانیہ، سلطنتِ مغلیہ، مملکتِ موریہ کے عبرت انگیز عروج و غروب کیا ایک انظارِ طائرہ پیش کیا، اور لایزال و لم یزل ہونے کا زعم باطل رکھنے والی برٹش ایسپائر اور اس کے طاقتوں اور مفتحوں کو ایک صدائے غفلت شکن رسیدی! یہ پیرایہ:۔۔۔

نہیں کن زکبر و ناز کہ دیدست روزگار چین قبائے قیصر و تخت بکلائے کئے! مقرر نے اب مخصوص طور پر نام ہندو برطانوی دولت مشترکہ اقوام کی ساخت و بنت کی طرف اپنی نظر جانزہ مرکوز کی۔ اُنہوں نے اس پر

”سہان منجی کے کبے کی سبھی چٹ کی، اور بتایا کہ وہ اس درجہ اک اجتماعِ عین واقع ہوئی ہے، نیز اس کے گرد مشکلات و خطرات کا ایک ایسا بانٹا حلقہ محاصرہ زن ہے کہ اس نے مستقبلِ قریب میں اس ”مثیل رومائے غلطی“ کے سقوط و انقراض کو ایک تقدیر مبرقہ بنا دیا ہے! نجات کی تنہا ممکن سبیل یہی ہے کہ برطانیہ اپنے اندرون خانہ ”سوشیلیٹ“ بجائے، اور سواحلِ انگلستان سے باہر کی وسیع تر حدودِ سلطنت میں اقوامِ آزاد کا ایک رضا کارانہ وفاق بن جائے! اس صورت میں انگلستان کے طبقہائے امارت و سرمایہ و حرفت کو اپنی فرعونیت و قارونیت کو خیر باد کہنی پڑے گی! سوال یہ ہے کہ خداوندانِ لندن، اس ”ذبحِ عظیم“ کی تاب نہ لاسکیں گے؟ اسے ترکِ عنہم بھی کم نہیں سوزِ جہیم سے۔ مومن، غمِ مال کا آغ ز دیکھنا! ”پنٹ ڈالو اور راج کر“ کے سارا جی حربے کے استعمال میں بلاؤی قیصریت نے تاریخی طور پر اک عظیم، نظریہ طولی کا ثبوت دیا ہے، تاہم جو موجودہ نفسِ بسا با شطرنج سیاست کا ہے، اس کی بنا پر اب نظریہ پیش نظر ہے کہ اُلجھا ہے پاؤں یار کا ذلعت و راز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا! ہندوستان میں ہندو و مسلمان، فلسطین میں عرب۔ یہودی۔ مصر میں فاروق و وفد، اسپین میں سیکینکا و میدرو، یورپ میں فرانسی و جرمنی، مشرقِ بعید میں چین و جاپان، ہندوستانی وفاق میں وائیان ریاست و علمبردارانِ کانگریس کی متقابل و متضاد جماعتوں کے درمیان انتخاب اس کے لئے اک دو گونہ رنج و عذاب بن گیا ہے! اس ہمہ گیر عقدہ لائیکل کا حل اک معجزہ سے کم ہوگا! بصورتِ دیگر وہ حبیبِ مملکت گردن کر برا میں اڑ جائے گی جس پر ماتِ رائے آفتاب غروب نہیں ہوتا! اُرنینہ، بحرِ ارم، مصر، فلسطین، ہندوستان اور بحیرہ چین، سلطنتِ برطانیہ کے خطرے کے نقاط ہیں! آج قدیم انگلستان کی ”ملکہ بھر“ کو جدید اٹلی کے سیماں ہوائے اک اندیشہ عرفانی سے لرزہ بر اندام کر رکھا ہے!

برلانیہ غلطی کا علم قوت و ہیبت اک قصہ ماضی بن رہا ہے۔

ہمارا وطن ہندوستان بھی اپنی فریبی تن اور اپنی ناپید اکہار ۳۵ کر رہے بھی ستاد آبادی سے اپنے ہی لئے اک کرشکن باعظیم بنا ہوا ہے۔ تاہم اگر اس صحرائے قح و ق کے بیرون از شمار منتشر ذرے آپس میں متصل و متحد ہو جائیں تو وہ اک بے پناہ ہمالہ بن جاسکتا ہے۔ انشا اللہ ایسا ہی ہو گا۔ برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ہندوستان کی مصنوعی حد فاصل ہمارے سید باب عزم سے جلد منہدم ہو جائے گی اور ریح امیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک!

اقلیتوں کے مسئلے کا نیشنل کانگریس نے قرار واقعی حل کر دیا ہے۔ کراچی کا "اعلان حقوق" اک شایان اعتماد و اطمینان "نشور آزادی" ہے۔ فرقہ دارانہ تقسیم نامہ حقوق کو کانگریس ہنگامی طور پر گوارا کرتی ہے۔ لیکن خالص قومی و جمہوری خطوط پر، بعد فرقہ ہائے متعلقہ کی رائے و رضائے، وہ اس داخلی وطنی قضیے کے اک جامع و مانع حل کے لئے برابر کوشاں رہے گی۔ مسلمانوں کے معلوم مسئلے کو اس کی نظر میں قرار واقعی اہمیت حاصل ہے۔ پھر حال کانگریس کی طرف سے کسی وطنی اقلیت کے دل میں کوئی دایمہ خوف نہ رہنا چاہیے۔ بعد حصول آزادی، ملک میں جس سوشلسٹ نظام حکومت کا بروئے کار آنا اغلب نظر آتا ہے۔ وہ مظلوم و مفلوک الحال اقلیتوں کے لئے اک نعمت غیر مترقبہ ہو گا۔ اچھوتوں کی مہتوریت اور سوختہ بھٹی بھی مستقبل قریب میں اک فراموش شدہ خواب خوشاک بن جانے والی ہے! ع

کر و صبر آتا ہے اچھا زمانہ!

معرکہ حریت کا یہ مخصوص طریقہ جنگ قرین معلومت ہوتا ہے کہ حساب و فزیت سے الگ رہ کر اک آر پار لڑائی لڑی جائے، اور ساتھ ہی وقتاً فوقتاً قلعہ حکومت پر عارضی دغل با پاکر عوام کی، انقلاب کے لئے تربیت و تقویت کی جاتی رہے!

برطانوی تعلق کے متعلق یہ ہے کہ ایک دفعہ تو ہماری ضربات حریت طبعی یہ ایسا کئے گا کہ تسمہ لگانہ رہے گا، لیکن پھر جب مغرور انگلستان کا تنقیہ دماغ ہو جائے گا تو ہم آرتھینڈ کی طرح اُسے دعوتِ مصاحبت و مساوات دیں گے! س

اگر جنگ جوئی، نہ مینی درنگ و مصلح خواہی، نہ خواہم جنگ! کانگریس ہندوستان کی موجودہ و مستقبل کی سیاسی، تعلیمی، تفسیری، اور مستقل نظم و نسق کی تاریخ کا اک دائم و قائم ادارہ رہے گی! وہ امریکن کانگریس کا متضنی بنے گی، تاہم وہ سوویٹ روس کی بالٹیک ڈاکٹریٹر شپ کی صورت نہ اختیار کرے گی! اس کی سلسلہ جمہوریت پسندی اور پارٹیزان رواداری پس تشویش کے خلاف کافی ضمانت ہو گی۔ بعد فتح جنگ آزادی ملک کی ملکیت و حکومت کا بار اُسی کے دوش پر پڑے گا! وہ مولویوں اور مختلف مذہبی فرقوں کی مقامی آزادی اور معلوم مذہبی فرقوں کے شخصی قانون و آزادی غمیر کی کافی گنجائش و حاشیہ حفاظت رکھ کر، اک مضبوط و مربوط طوم کزی حکومت قائم کرے گی، ملک کی بیرونی مداخلت کا قرار واقعی بندوبست کرے گی، اک عام روح پرور قومی نظام تعلیم کے قیام اور اک مشترک رسم الخط کے اجراء سے، اور ہوائی جہاز، ٹیلیفون، ریڈیو، فلم، اور ٹیلیوژن کے یکسانیت اور آلات و وسائل کی تمام ممکن خدمات کے فائدہ اٹھا کر سارے ہندوستان کو اک متحد، متفق، یک رنگ، ہم آہنگ، بنیان مرموص میں منتقل کر، یا جائے گا۔

قومی زبان کے متعلق شجاش بابو نے فرمایا کہ تعارف ہندوستانی بنے وطن کی "سان عمومی" کا منصب حاصل کر لیا ہے، اردو اور ہندی اسی تلقی قومی کے دو لب و لہجے ہیں، اور فارسی خط اور ناگری انچھڑاس کے دو مختلف الوضع پیرا بن! تاہم اگر اردو اور ہندی دونوں کو خیر با کہہ کر لاطینی رسم الخط کو اختیار کر لیا جائے تو بین الاقوامی بشری تعلیم و تعلم، مبادلہ خیالات، اور اک مشترک آفاقی تمدن و ثقافت کی نشوونما کا وہ بڑا بے بدل آکر ہو گا! ترکی کا اقدام اس بارے میں بڑا مجتہدانہ اور دلیرانہ ہے، اور وہ ہم سے داد و تقلید دونوں کا طالب ہے! لاطینی کی اصنیت کا عذر بڑا خود فراموشانہ تسلیم کرنا پڑے گا، اس لئے کہ موجودہ جمالیات عام کی صورت میں ملک کی بزم غنیمت آبادی کا سواد اعظم خود اردو اور ہندی سے بھی علنا آتن ہی ناواقف ہے جتنا کہ لاطینی سے نا آشنا! اور اک جدید رسم الخط کی سوز و نیت و افادیت کا معیار اپنی عوام الناس کی آسانی یا دشواری ہے۔

ہندوستان جنت نشان کی آبادی اک ہجر و خمار و دریائے مراح

واقعہ برقی ہے! اور ہر سال کے بعد اس انسانی اوقیانوس میں ۳ کروڑ نفوس کے اضافے کی شدت کی سوجا اٹھتی رہتی ہے! مادہ ہند کی بدنام خواری (دیواری) کے ساتھ ساتھ یہ برخورداری ایک ناقابل رشاک برکت ہے! ملک میں موجود زمینداری کا نظام فرسودہ، بعد از وقت، اور مصیبت آفرین ہے! زمین اصولاً بچکان زمین و خدام زمین (کاشتکاروں) کو تفویض کر دینا چاہیے، اور کھیتی باڑی کو بل پٹی سے نکلنا خاص کر اعلیٰ و عالیٰ قیامی اصول و مسائل کے سپرد ہو جانا چاہیے!

وسیع تر اور عمیق تر اقتصادیں سنگ ملک کا حل یہ ہونا چاہیے کہ اعلیٰ فنی کمیشن تحقیقات کی قراردادیں تفتیش و کاوش کے بعد، ایک آل انڈیا اسٹیٹ برقی حکومت کے ایک ارتقا پسند محکمہ زراعت و فلاح و حرفت کی سربراہی میں، ایک ہم تعمیر و پیدوار کا علم کھولا جائے! یہ جامع و شہسختی اسکیم روس کی خجالہ اور وہ سالہ سنجیزوں کے ہنچ پر ہونی چاہیے۔ اس میں مقامی اور ذیلی اور وقتی طور پر دیہاتی حرفتوں کے احیاء اور ان سے استفادے کی کافی گنجائش ہوگی، البتہ مستقبل کا مستقل منصوبہ بند نظام حرفت، آب مشین، ہی کے محور پر اور اسی کی کار فرمائی سے قائم ہو سکے گا، اور سر انجام پائے گا!

کانگریسی سرشتہائے نظم و نسق کو پولیس اسٹیٹ کے شرمناک تصور اور تعامل سے بالاتر ہونا چاہیے! "سرکاری حکام تحقیقی مہم میں پنکاج خدام نہیں!"

نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ اس وقت کے جاری معرکہ آزادی کا جنگی اسٹاف ہے، اور مستقبل کے ہندوستان کی وطنی حکومت کی عجایب و زناد! اسے اپنے ہر اقدام اور منصوبے میں اپنا ہی منصب جلیل مد نظر رکھنا چاہیے! ڈی وکیر کی سابقہ متنازع حکومت کی مرکزی تنظیم اور مقررگی و فنڈ پارٹی کی جمعیت تنقید یہ کی نظریں ہمارے لئے شمع راہ ہونی چاہئیں!

مجوزہ فیڈریشن کو کانگریس ایک کیسر قاطع و ناطق انداز میں مسترد کر چکی ہے! کانگریسی منصب انھیں میں اس کا نعم البدل نامزدہ پہلی ہے! عسکری حکومتوں میں قبول مناصب، غنیم کے بعض مورچوں پر قبضہ کر لینے کی قبیل سے تھا، لیکن آئین ہند کا باب وفاق اک باب اتفاق ثابت ہوگا! یہ پرنسز اور پراونسز کو باہم دست درگیاں کرنے کا ایک منصوبہ مشہور ہے، وہ ذرا ذرا

کا ایک شرمسہ نہیں رکھتا، وہ ہندوستان کے دو حصوں کے درمیان اک داخلی مدنی جنگ کو چھیڑنے کا فتنہ بیدار ہو گا، اور برطانوی قیصریت و سرمایہ داری و حرفت و تجارت کے دام بخت کو گلوگیر تر کرنے کی ریشہ دوانی! اس میں دلیان ریاست کو ان کے حصہ رسدی حق سے گھیس دیا دھا از ۳۳ تا ۴۰ م فیصد کی متحدہ ہم آہنگ نیابت — عطا اک حاکمانہ و آمرانہ اکثریت! — دی گئی ہے! برطانوی مصالح سیاسی اور منافع تجارتی پوری طرح قلعہ بند ہیں! اور ہندوستان کی ہر جست آزادی اور معاشی تعمیر کی ہر جنبش پر اک قدغن عائد! وہ مرکز کے موجود الوقت آئین سے بھی زیادہ تنگدامن ہے، اور تمام و کمال اک قدم معکوس ہے!

سلطنت ہند کا فوجی بجٹ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۳۶ء فیصد خزانہ عامہ پر حاوی ہے! ریلوے اتھارٹی اور ریزرو بینک کے نام سے چند اور محفوظ مالی قلعے ہیں جو وفاقی اقتدار سے خارج کر دئے گئے ہیں! حکومت خود اختیاری کا قلب، مالیات واقع ہوا ہے! فیڈریشن نے اپنے مجوزہ آئین کے سینے سے یہی قلب نکال لیا ہے! "وفاق" کی جو تدابیر امر کی گئی ہے اس میں تقسیم حقوق کا وہ فیا خانہ اصول صرف کیا گیا ہے جو کبھی اساس بناتھا، اس خانگی ہمارے کا کہ

از صحن خانہ تا لب بام از آن من در صف خانہ تا بہر آواز آن تو! آئندہ تربیت سیاسی و تعلیم جماعتی کے متعلق جدید صدر کانگریس نے یہ قیمتی مشورہ دیا ہے کہ عام پنکاج مزدوروں، اور کسلاؤں کے دل باؤل حبسوں کے اہتمام و انتظام کے لئے تربیت یافتہ والنسٹروں کا ایک زبردست لشکر تکیہ ہونا چاہیے، خود قومی رہنماؤں کی برآورد کے لئے مستعد دل و دماغ اور دست و بازو کے ہونہار نوجواں بھی، اگر مزدور سالکان طریق کے سامنے ڈالوئے ادب نہ کریں، تب سچا اک اہم قومی ضرورت کی فراہمی عمل میں آئے گی!

مزدوروں اور کسلاؤں وغیرہ کی جماعتیں اگر نیشنل کانگریس کے عظیم حادی بریک آرگنائزیشن کے زیر سایہ لگا جائیں تو بہت مبارک اور قریب مصومت ہو گا۔ انھیں کانگریس کے اقتصاد دست و بازو ہونا چاہیے، در آخالیکہ کانگریس ان سارے اعصار و جوارح کے لئے اک مشترک دلی و صبر بن جائے، بہر حال موجودہ برخود غلط "حریف" جلد از جلد باہم حریف

دوستو! آل انڈیا نیشنل کانگریس بھی ہمارا آخر کار مبادیہ ہے، کانگریس کے اندر دایاں بازو اور بائیں بازو ہو سکتا ہے، لیکن قوم کے سارے تہذیب و علم و ادب کا وہ تاریخی طور پر قلب لشکر رہی ہے! آج حالات کا ایک ناگہانی پلٹا اپنے چشم و ابرو سے اُسے پھر میدان کارزار کی طرف دھک دے رہا ہے! مادرِ وطن کا کوئی غیور فرزند و دختر اس لمحہ نازک میں اس سے یقیناً یوفائی کا مجرم نہ بنے گا! ہماری جنگ ہندوستان کی آزادی ہی کے لئے نہیں ہے، ہمارے جہاد کا مقصد اعلیٰ تہذیبی و بشریت کی حریت و سعادت ہے! — ہندو ماترم!!

## چین

جاپانی حملے نے اپنی عنان توجہ اب جنوبی چین کی طرف موڑی ہے! اس خطے کا سیاسی و حیاتی مرکز کینٹن ہے! اہل کینٹن یعنی تجارت کے سربراہکار ہیں، اپنے سواحل پر مشرق و مغرب کی بحری و سیاسی طاقتوں کے اختلاط سے وہ سیاسیات کی وسیع کاریوں سے خوب آشنا ہو گئے ہیں! ان میں جنگی قابلیت و استقامت کی بھی معتد بہ تربیت ہوئی ہے! جدید الہد چین کے دل و دماغ کا سینہ و سرکینٹن ہی واقع ہوا ہے! سن یاٹ سین (چین کا گاندھی!) کو ولادت کینٹن ہی کی خاک پاک نے بخشی! ۱۹۱۱ء کے انقلاب چین کا پرچم اسی جگہ سے بلند کیا گیا! کینٹن ہی وارشل چیانگ کا ٹیٹیک کے عساکر کا مستقر بنا، جب کہ انہوں نے جنوبی چین پر یوفا کی اور وسطی چین میں بمقام نانکنگ اپنا پایہ تخت قائم کیا، کینٹن اک کم و بیش آزاد ریاست کا دارلصدر رہا ہے، اور آج تک سن یاٹ سین کی سگوندہ تحریک جمہوریت و مساوات و قومیت کے باقیات و المعاصات کی تبرک گاہ سمجھا جاتا ہے، اب جاپان اسی کینٹن کو اپنے جنگی عزائم کا ملبہ نظر بنا کر گویا چینی سیاسی زندگی کے آخری سرچشمے کو خشک کر دینا چاہتا ہے۔ امریکہ و برطانیہ و فرانس یا دم بخود ہیں، یا دور از کار ٹائیں ٹائیں کر رہے ہیں! (۱-۱-۴۷)

## یورپ

یورپ میں جو سیاسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے وہ پُرست کنڈ

بن جائیں! تہذیبی تاریخ کا سبق غایت درجہ قیمتی ہے! ششہ کے اکتوبر والے تہذیبی انقلاب کو مزدوروں، کاشتکاروں، اور سپاہیوں کے متحدہ محاذ نے ہی ممکن بنایا تھا!!

ہمارے بین الاقوامی تعلقات سید اہم اور خیر خیر ثابت ہو سکتے ہیں! مصر کی موجودہ آزادی، احرار مصر کی صرف اُس نظر بازی و دبدبہ درسی کا عطیہ ہے جس سے انہوں نے بحرالروم کی برطانوی ایٹلاوی کشیدگی کو سبناپا، اور ایک گولی چلائے بغیر موجودہ انگریزی مصری معاہدے کی فتوحات حاصل کیں! اہل آئرلینڈ کا یہ بُد براہِ مقولہ مشہور ہے کہ انگلستان کی ایک سنگین مشکل آئرستان کا ایک ذریعہ موقع ہے!

جاپان پر پوچھنا ابھی بنایت ضروری ہے، مالکِ غیر میں ہندوستان کے ہمدردوں، ہوا خواہ اخباروں، ہندوستانی طالب علموں اور تاجروں، ہندوستانی تاریخ و تمدن کی ترجمان ہندوستان فلموں اور ہندوستانی آرٹ کی نمائشوں کے ذریعے بین الاقوامی دنیا کی تعلیم یافتہ رائے عامہ میں ایک انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے، پر اس دروغ کو بھی بے فروغ کر دے گا کہ ہندوستانی لوگ نیم و شبوں کی اک منتشر قوم ہیں، اور انگریزوں کا وہاں قیام از بس ضروری ہے! — بیرون ہند ہمارا اولین حلقہ آشنائی و شناسائی افغانستان، ایران، چین، نیپال، برما، اور سیلون ہونا چاہیے، دور تر ممالک میں یورپ و امریکہ کے بعد وٹکی و جنوبی امریکہ بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں! خود انگلستان کی جدید نسل اور طالب علموں کا طبقہ عموماً ہندوستان کے خلفاء کی سبکدوشی کا شکار ہے!

ہمارے سیاسی اسیروں کا معاملہ اک بے پناہ اپیل اپنے اندر رکھتا ہے! پُر ایمان شباب اور تروتازہ رعنائی کے نئے نئے گل سرسبد ہیں جو تازہ ترین ہندوستان کی روح کش تاریکیوں کے لئے وقف ہو گئے! جو لوگ رہا ہوئے ہیں ان کی حالت بھی کم حسرت ناک نہیں۔ وہ تبِ دق کی گرفت میں چپے ہوئے اپنے زندانوں سے نکلے ہیں، جن کا خیر مقدم ان کے عزیز واقارب نے دل گداز آنسوؤں سے کیا ہے! کیا ہم انہیں یہ شکوہ کریں کرنے کا موقع دیں گے کہ

مری تربیت پر سب روئے، نہ روایا اک وہنگیں دل  
قیامت ہے کہ دو آنسو نہ چشم یار میں آئے!



زبان میں یوں ہے کہ براہِ علم کی گرسند قومیں وہیں کی شکم سیر سلطنتوں سے خوانِ نیفا پر اپنا حصہ مانگ رہی ہیں! جرمنی سلطنت میں اسی یورپین جوع الارض کے اک شدید دورے کے پڑنے پر اٹھ کھڑا ہوا تھا؛ مگر سوتے اتفاق سے وہاں لینے کے دینے پڑ گئے؛ جنابِ عظیم میں شکست کی ضرب سے سنبھلنے کے بعد اب وہ اپنے معدے کے عینِ حلا کو اک درد گانہ بلاؤٹی سے پُر کرنا چاہتا ہے، اور اگر ایک طرف انگلستان سے اپنی غبط شدہ نوآبادیات کا غالب ہے تو دوسری طرف ولسی یورپ و مغربی روس کے خطوں پر دندانِ آذیتز کئے ہوئے ہے؛ بعد یہ اٹلی "اس" گرسنگی زمین کا دوسرا زمین ہے؛ مگر وہ سر دست جیش کا بڑا شکار مارنے کے بعد اپنے شکم کے اندر عموماً سکون پا رہا ہے، اور اسپین کی خانہ جنگی کی اشتعال وہی سے صرف چاشنی اور چٹنی کی سی تفریح بعد طعام محال کر رہا ہے؛ لیکن جرمنی ہنزدک

میسو دوست افشانی و پا کو بی سے اپنے کو تنکا تار رہا ہے؛ نتیجہ یہ ہے کہ اب اُس کا جنون نقطہ بحر ان کو بیخ گیا ہے؛ اب اُس نے اسی سیریا پر دست اُٹھ کر کے شاید اپنی مر کو ز خاطر نیم بزن و بکیر کا آغاز کر دیا ہے؛ اٹلی بدستور اُس کا پشت پناہ ہے؛ اور بوقتِ ضرورت اُس کی گیر و دار میں اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار؛ ہنگر و سوئٹنی کے شیر و پنگ نے فیل برطانیہ کو لرزہ بر اندام کر رکھا ہے، اور سسٹریٹن، انگریزی وزیر خارجہ کا تازہ ترین ڈرامائی مصفیٰ اسی خطرناک ماحول کی اک افتاد ہے؛ ہنگر کی تلخ تر زوایاں اور تیز تر صدقہ خوانیاں "المعاف ہیں؛ اور سست رگ اور پروٹیسٹ باز انگلستان سے بزبانِ حال خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ

مجھے اتنے عندلیبِ نوحہ گر تو دیکھتی کیا ہے؟  
بڑی مدت میں سیکھا ہے نقال نے با اثر ہونا!

(۱-۱-خ)

## میر افرض

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو میں مسلمانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، مسجدوں، مدرسوں، یتیم خانوں کے لئے اُنے دن چندہ اور امداد طلب کی جاتی ہے جس میں استقامت حضرات دل کھول کر اپنی فیاضی کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اس معاملہ میں شکایت اور شک کا اظہار بھی ہوتا ہے اگرچہ اہل کرم اس معاملہ میں زیادہ حُسنِ ظن رکھتے ہیں پھر بھی شکایات کہیں کہیں بجا طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

میری آبائی بستی موضع صالح پور میچ میں بے علم اور اسلامیات سے نا آشنا لوگ ایک مدت سے جہاں مغلی ونگدستی کے شکار ہیں وہاں بے علمی نے بھی اُپر تسلط جا لیا ہے۔ بے علمی اور سائلِ اسلامی سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں کے باشندوں میں یہ خام خیالی بھی ہوئی تھی کہ اپنے بچوں کو پڑھانا لکھانا بڑی بد شگونی ہے، یہاں جو پڑھتا ہے وہ سرسبز نہیں ہوتا یہ جاہلانہ خیال ابھی تک وہاں کے اکثر لوگوں میں باقی ہے، اس بنا پر میں جبکہ کسبِ معاش کی غرض سے اپنے وطن سے دور رنگون (برما) میں پڑا ہوں، اپنے ہمسایوں اور اہل وطن کے لئے علمی خدمت کیسے کر سکتا ہوں پھر میری اتنی حیثیت نہیں کہ میں وطن والوں کی تعلیم کا ذاتی طور سے بندہ بست کر سکوں، اس لئے میرا فرض تھا کہ میں براہِ راہِ اسلام سے درخواست کروں کہ اس موقع پر چھات اور خام خیالی کے گڑھے سے نکالیں، چونکہ میرے موضع میں ایک شریف اور تعلیم یافتہ بیوہ رہتی ہیں اُن کو علمی ذوق اور مسلمان بچوں کی تعلیم کا شوق ایسا ہے کہ وہ موضع کے بچوں اور بچیوں کو ایک جگہ جمع کر کے جس کی موجودہ تعداد ۲۷ ہے پڑھاتی ہیں، اس بات کو میں نے پہلے پہل جناب سید نفی شاہ صاحب نقوی سے کہا اور انھوں نے اذراہِ اسلامی ہمدردی اُن بیوہ محکمہ کو پانچ روپے ماہوار دینے کا وعدہ فرمایا اور پانچ روپے انھوں نے ساقہ عائشہ خانم بیوہ ولی محمد خاں مرحوم کے نام محض علمی کفالت کے لئے روانہ بھی کر دیئے، اگر اسی طرح اہل غیر حضرات بھی توجہ فرمائیں تو صلہ صاحبہ جو ادارت اویس گوتشرلیف اور پردہ نشین ہیں، اُن کے گزارے کی صورت بھی جو جائے گی، ادا کیا اسلامی اسکول جس کا نام مدر کثیفہ نظامیہ میں نے تجویز کیا ہے وہ چلتا رہے گا جس میں مسلمانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ہوتی رہے گی، جو صاحب ذر نقد سے امداد کرنا چاہیں وہ انھیں محکمہ کے نام سے حسبِ ذیل پتہ پر روپیہ روانہ کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔

پتہ یہ ہے۔ عائشہ خانم بیوہ ولی محمد خاں صاحب مرحوم۔ موضع صالح پور میچ۔ ڈاک خانہ روناہی۔ ضلع فیض آباد۔ یوپی

المخلص۔ عبد الرزاق خاں نظامی فیض آبادی، ایجنٹ اخبارات رنگون (برما) ۱۶ فروری ۱۹۳۲



# تقدیر

(۱-۱-خ)

جوش و آزاد ہمارے اردو ادب کی تاریخ جاریہ میں اک مشترک برزخ  
بہم پہنچاتے ہیں! ان دونوں کی ذات میں قدیم و جدید شاعری نے ایک دوسرے  
کو وہ پیامِ اجنبیت نہیں سنایا کہ ”ہذا لفرق بینی و بیک“ بلکہ ان کی باہمی محبت  
نے اک ترجیح البحرین کا ساما جوا پیش کیا ہے۔ انتہا یہ کہ بعض مواقع میں تو  
مشترک تو من شدی میں یہ دونوں شاعرانہ رد میں اک واحد دل و دماغ اور  
متحد زبان و قلم بن کر سخن سنج ہوئی ہیں۔ حیدر آباد دکن کے معاصرانہ قیام کے  
ایام میں دونوں کی اک مشترک غزل سلسل کا اک دلچسپ اور یادگار مقطع یہ ہو رہا ہے

آج ساتھی کمی نہ رہنے پائے

پینے بیٹھے ہیں جوش اور آزاد!

حضرت آزاد کی زیر تنقید و تظہیر، طلعتِ حسن کے دونوں رخساروں کا  
مشاہدہ، یا طبعیتِ حسن کی دونوں اقسام کی تفحیم پیش کرتی ہیں! حسن  
کے اس جمال و جلال میں عملاً کوئی فرق نہیں! صبح

ناہید بغیرہ کشت و مرغِ بقیہ!

حسن کی اسی قاہری و دلبری کو جوش اس طرح بیک وقت دعوت  
دیتے ہیں:۔

کمال لیتے ہیں ظالم دلوں کو سینوں سے

خدا بچائے نہ پھر بھی مجھے حسینوں سے!

آزاد بھی اصول و حقیقتِ حسن کے اس تہر و تہر کے کیساں قتل ہیں۔ لیکن میں

(۱) حسن کے دونوں رخ: ”متوسط کتابی تقطیع، ۲۲ صفحات حجم، کاغذ و  
کتابت و طباعت پاکیزہ و عمدہ، ناشر محمد زاب علی خاں باز، پتلا: کاشانہ  
باز، بازار گھانسی، حیدر آباد دکن، قیمت ۳۰/-  
حضرت آزاد انصاری اردو کے مشہور بزرگ سن او کہنہ مشق استاد غزل  
ہیں لیکن ان کی شاعری نرسودہ غزل گوئی، ہی تک محدود نہیں، وہ عہدِ حاضر کی  
جدید الطرز نظمیں پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی پیری  
صرف جسمانی معنی میں صبح ہے! روحانہ اک شاب سدا بہار واقع ہوئے ہیں  
وہ مجدد شعر الہند مولانا حالی مرحوم کے ارشد ملامذہ میں سے ہیں، اور اپنے استاد  
معظم ہی کے اس زندہ دلانہ معجزے کی ایک نظیر کے صبح

رہتے ہیں جو چال پیری میں جوانوں کی طرح!

آزاد اک نادر نوعیت کی ہستی نظر آتے ہیں۔ وہ نفسی طور پر بڑے حساس  
ہیں، ذہنی طور پر بڑے آزاد خیال، اور اپنے تنقیدی مذاق میں بڑے روادار  
اور وسیع الشرب و درپیشین کے شعراء میں ان سے زیادہ شرح صدر کے ساتھ  
کوئی ”شاعر انقلاب“ کا قدردان و ثنا خواں نہیں۔ اور خود جوش کا معاملہ  
بھی، باہر نعرہ زنی انقلاب و شباب، اس پر تحریف پیکر کے ساتھ کچھ اس قسم  
کے ہے کہ

آں دل کہ دم نہ دوسے از خود جو اناں

دیرینہ سال پیسے برفش بیک لگا ہے

ان کی بالابندی کی پوری ہم قامت کہی جاسکتی ہے، اگر ان کی بلندپرسیانی تالیاں  
وہم کناس انگھوں، اور ان کے حسرت و درست طلبوں کو بھی ان کے سر پہ دھلیے  
کے اجڑا میں لے لیا جائے تو شاید اک محل مرتضیٰ ان کی شخصی سیرت اور شاعرانہ  
جوہر کا صورت پذیر ہو جائے گا۔ ان کا جسم ان کی جان کا اک نادور ترجمان معلوم  
ہوتا ہے۔

مسٹر مہر لال صاحب قیاد وسیع المشرب انسانی تہر و محبت اور حقیقت پس  
نہم و فکر کے نور و منیا سے قابل واد حد تک بہرہ یاب ہیں۔ وہ زہدِ یل و یل اور  
مست است، جوش کے غلغلا و دستوں اور دلدادوں میں سے ہیں، ان کے اس  
تو شیرازہ گلہ ستہ سخن پر شاعر انقلاب کا دشاں کتاب، تعارف اسی ہمعصر  
عمری کا مطلب ہے۔

جناب قیاد کے زیر ذکر انتخاب منظومات پر نئی انفرادیت اور ادبی اخلاص  
بخطِ ملی لکھا ہوا ہے۔ وہ مختلف مغاہرِ فطرت اور مناظرِ بشریت سے دوچار  
ہوئے ہیں اور ان کے مطالعہ و تاثیر نے اپنے رنگ خاص میں اپنے نقوشِ قدم  
ان کے رشحاتِ قلم کی لوح پر چھوڑے ہیں۔

”فاتحہ الکتاب“ ہی میں ہم نوجوان شاعر کو تسرِ سجود پالتے ہیں، چند کلمات  
”والسجد واخریب“ ملاحظہ فرمائیے۔

اے چراغِ آرزو! زم زمی کے شباب  
لے گیا زینکشان زینتِ ناب سے فروش  
لے گیا دست و پنجو، مائلِ غریب فروش  
میں تہا لہجہ کے سوز و جذب کا ماہر فروش  
دل کو دھنسنے اٹھیں منگے نئے شاعر بنوں!  
خلو ج سحر و دلی نظم کی محراب معرفت میں ان کے روحانی رکوع و خشوع کو  
دیکھئے:-

عبادتِ سحری میں جھکا دلِ شاعر

اب ایک وجہ کی منزل کو، منزلِ شاعر

ساعتِ صبح کی دعوتِ سیر کی دل نشیں اثرِ فریادیں سنئے!

چمک رہے ہیں اور جگمگا رہے ہیں راستے  
قدم قدم پر آئینے دکھا رہے ہیں راستے  
سکوت کی زبان کو ملا ہے ہیں راستے  
لو آؤ سیر کو چلیں.....!

صبحِ نو روز کی شبِ ماقبل کے چشمہ حیدر اس کو قدم رنجہ فرمائی کی کسی قابل  
بھدروی دعوت ہے:-

ہیں مرے واسطے وہی باتیں قصہ غم، فراق کی باتیں

کی تو نصورت بٹائے گزیر کی مسلسل دعوت غالباً اس لئے دے رہے ہیں کہ  
مشہد جن میں ان کا کوئی شریک و ہم نہ ہے۔ اس پیام کی علتِ غائی غالباً یہ ہے کہ  
نشو و نصیب دشمن کہ شود ہلاک تغیت سر دوتاں سے مت کہ تو خبر آزمائی  
حسن کے تاریک نے کی ان بھلوں کو دیکھئے، اور یہی کہ کیا ہمارا نیک غلط ہو کہ ان فی ذلک نشو و  
حسن کو پیچھے ڈرو دیکھا بعد ازاں کل گھو دیکھا آخر آخر نہ دیکھا بھاگ بھاگ خوش و بھاگ!

لعلِ جادو فن کو نہ چاہا جدیدِ افکن کو نہ چاہا

دشمنِ جان دشمن کو نہ چاہا بھاگ بھاگے حسن کو بھاگ!

چنانچہ حسن دل نوا رنگی بارگاہ میں باریاب ہونے کے بعد وہ ہمہ دست  
کے کفر سے مارنے لگتے ہیں اور ”بروانہ جزا“ غم و حرم و دیرندانہ والی علی الاطلاق  
ملائے عام اس طلبی حسن پرستی کی دیتے ہیں۔ چنانچہ:-

حسن کو نفرت کفر کفر روناخت کفر کفر!

ایسی حرکت کفر کفر چاہ ہر اہل حسن کو چاہ

~~~~~

اہلِ ادا ہو، کوئی ہو! ماہِ لقا ہو، کوئی ہو

بٹ ہو، خدا ہو، کوئی ہو! چاہ.....!

~~~~~

حسن میں فرد و دال ہو غیرتِ حور و عیال ہو

اب وہ ملک ہو، شیطانی ہو! چاہ.....!

~~~~~

حور ہیں پر کیا موتوں دیو لعلیں پر کیا موتوں!

ایک ہیں پر کیا موتوں چاہ.....!

~~~~~

۲۷، نوپر مشرق، مجموعہ منظومات جناب قیاد فتح آبادی، مجلد متوسط  
کتابی قامت، ضخامت ۴۰ صفحات، مع عکسی تصویر صاحب تصنیف، قیمت ایک  
روپیہ۔ ملنے کا پتہ جگند لال سوئی، کٹرہ کرانا، پھانگک مش خاں دہلی۔

مسٹر مہر لال سوئی قیاد فتح آبادی ایم۔ اے کے مجموعہ کلام کی یہ ایک پاکیزہ  
و خوش سلیقہ جلد ہے جس پر تنقید کا خوشگوار فرض آج ہمارے حصہ میں آیا ہے۔

جناب قیاد اک نوجوان، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اور بیدار دل انسان ہیں۔ وہ  
اک گرائڈ فیل پیکر واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی فطرت بلند اور ان کی وصفِ خیال

تاجکے شیخ و برہمن تاجک و یر و حرما

”تعلیم اسلام کو مقطع کے اندر خوب ہی دریا در کوزہ کیا ہے۔“

آجاد چھیرتی ہوئی سارے سرور و کیف  
آجاد پھر جب کائے ہوئے چشمِ نیم باز  
آجاد اک بدل کو نہیں تابِ انتظار  
آدابِ عشق سے نہیں واقف اگر ہمیں  
میں آجاد جن کے مد و جزرِ تخریب و تباہی کا آکٹ منظر :-

میں آجاد و شراب کی دنیائے ہوئے  
نظروں پر اک حجاب کی دنیائے ہوئے  
حد سے گزر چکا ہے نگاموں کا انتظار  
پھر بھی مجھے ہے حس کے وعدوں کا انتہا

بیٹھا ہو گشتی جگر پاش پاش پر! آئینوں میں اپنی صابیل طوفاں کو دیکھئے!  
 بوندوں کے ساز کی سامعہ نوازی و سحر کاری ملاحظہ کیجئے!  
 نہ خم ہو گیت یا بد گیت کیف ہو نہیں سہ الہی رے ہوشیہ عجب عالم یہ شام کی چرخوں سیاہی  
 ہوا زلزلے کی ہر مخالف خدائے کامیاب کے ہیں ٹھہر جائے تو سن وقت یہ عام تجاہد ہے  
 تفسو و عشق، ذریعہ آفت و فدا سر کے تھما مردانہ و قربانی عاشقانہ پر  
 اک محمد و بانہ داد:-

محبت میں ہیں وہ آزادیاں جو مل نہیں سکتیں  
 ملانے سے بھی بنیادیں جنوں کی مل نہیں سکتیں

”شاہکار صانعِ عالم“ کے دو آخری عناصر ترکیبی بننے کے قابل ہیں :-  
 ۱۔ کیش کی تاب مقناطیس ہے اور مانگی سرکشی ابلیس سے  
 ۲۔ سب کو فطرت نے بہم پہنچا دیا اور اس کو نامِ عورت کا دیا  
 ”گمراہ و دغاغی زدہ ہندوستان کی“ ”مقدس آدیزشوں اور کاوشوں“

جیو تو فوقِ عبادت کی سیماں لے کر      مرد تو خونِ شہادت کی سرخیاں لے کر؛  
ہندوستانی نوجوان کی تصمصوتِ خوابِ جوانی کو اک پیام تم :-  
یاسِ غم کا اپنے چہرے سے اٹھا بھی نہ نقاب      جلوہ گر پردوں سے ہو نیز بھی خوشیدِ شباب؛  
انگریزی شاعری کی صنفِ موسوم بہ سائینٹ کے طرز پر اک اودو نظم کا  
مطلعِ قابلِ نقل ہے :-

نہ در تنقید عالم کا نہ خوف قبر و اور ہے !

جوانی دھالتی ہے محمد کو جس سانچے میں ڈھلتا ہوں!

”گوئی تہذیبِ ازلِ سوئی کے ہندی کیت بھی بڑے مدد بھرے ہیں۔ بسنت کی اک تیراکی رات کا منظر حیرت دیکھئے:-

خندہاں ہے مرجھایا سا      دھرتی کا دل بھی ہے پیاسا

من کو کیا ہودعرج، آسا گئی بست بھی بیت!

”روئے پر اے ندیم ملامت نہ کر تجھے“ کی قسم کی اک حضرت بڑی کی عین منطلق‘ سنئے:-

کاری کاری بددی دے آئون سے انجیل کو دھوئے

اُس کو بھی تو ٹوک ! سکمی ری رونے سے نہ روک !

حضرت نور مشرقؒ ایشیائی و ہندوستانی ادبی روشنی کی گونا گوں  
لی ایک توس فرم ہے۔

۱۰۱۰ خ

ایک دہشت بلج چہرے پر  
 پہنچ گئی ہیں ماحبتیں طاری  
 چلیے ننگین چپڑیں اے جوتن  
 ایک مکی بیٹھاس کی دھاری  
 (جوتن)

بے چارے میں کھجے ہوئے بادل  
نکچہ چھپائی ہے وہ کنیت  
میں جہاں جو جانی کسی

# عروسی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس کے ترتیب دیا گیا مگر اشتہار میں صرف تنہا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام مخفی شکایات کا بہترین میں واحد علاج ہے خصوصاً ازکار رفتہ خاندہ اٹھائیں، اسنے کہ ارزاں تجربہ ہے اس کے ساتھ چار چیزیں ملتی، نباتی، کلیدی، لنبی اور ہمراہ ہیں جن کی تفصیل اور ترکیب استعمالی خریدار پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سیٹ عروسی کا ہفتہ بہرہ کو کافی ہوتا ہے جس کی قیمت صرف ایک دوپہ پذیر آئے مقرر ہے ملاؤ محصول ڈاک، اکثر تین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔

صاحب فرمائش نام و پتہ صاف و خوش خط تحریر فرمائیں  
شفا خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

# ناظرین سالہ کلیم


اگر آپ ادب اور دلی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ کلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادباء کے حوصلے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو نظر رکھ کر لکھی گئی ہوں

اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ماضی اور حال کے شعراء اور ادباء کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ بکفایت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں۔

کلیم بک ڈپو جینتی نو اس نمبر دریا گنج دہلی سے فرمائش کیجئے

# گوڈمنسٹ میور سیلک فیکٹری

کی بنی ہوئی جار جیٹ، کرب  
یا سائن ملاحظہ فرمائیے یقیناً  
آپ ان کی عمدہ بناوٹ  
اور خوبصورتی کو دیکھ کر  
ہندوستانی صنعت پر تحیر  
رہ جائیں گے، کیونکہ وہ  
بالکل ایسی ہی عمدہ بنی



کار آمد، ویر پا اور  
مضبوط مال سے تیار کی جاتی ہیں، جیسے ولانتی کثیر تعداد میں  
نئی قسم اور جدید ترین ڈیزائن کے نمونے ملاحظہ فرمائیے، یہ  
خالص اور صرف خالص ریشم سے تیار کی گئی ہیں، اس میں  
کسی قسم کی ولانتی یا نقلی آمیزش نہیں ہے۔

Goat Silk Weaving Factory  
MYBORE

# گوڈمنسٹ سیلک فیکٹری میور

ایجنٹ برائے دہلی اور موبہات متحدہ  
میسرز گوگل چند کھنہ، اینڈ کمپنی سویشی کلاتھ مرٹس  
دہلی کلاتھ مارکیٹ، لکشمی بازار گریٹ - گوڈمنسٹ روڈ دہلی



مار کے ڈونایاب تھے

**جیش بگوسٹر**

رستار نمینیر (بھٹوں کا بنڈ)

ہر سٹاک میں سنگ میل اسٹریٹ فریوڈ لمر ستر تمام شدہ ۱۸۹۶ء

# ادبی دنیا

لک بھر کے جاوونگار ادیبوں اور شعرا کے بہترین افکار مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار  
۸۲ وٹاویز افسانے مضامین اور نظمیں ۸۴ ہفت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے، علاوہ محصول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے اسد مع محصول ڈاک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجو

مینجر رسالہ ادبی دنیا لاہور

# ہمایوں

## بھنگرہ ہیرا میل

چند دن کے استعمال سے سفید بال جڑے کالے ہو جائیں گے

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سیاہ اور دراز کرنے، گرنے سے روکنے، جاکھ  
کرنے، جلد سے جلد نئے بال اگانے اور بالوں کا انجھ پیدا کرنے میں کامیاب  
تجربہ شدہ اور بے نظیر روغن ہے، خواتین کے لئے بے پناہ اور نئی چیز ہے ہم  
اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ عرض کریں گے کہ آزمائش کے لئے اولاً مرث  
ایک ہفتہ استعمال کے لئے منگا یا جائے، اور استعمال سے قبل اپنے بالوں کی لمبائی  
ناب لی جائے پھر چند روز کے بعد جانچ کی جائے، اتنا کافی ہے کہ ہمارا اشتہار  
غلط ثابت نہ ہوگا اور تحریر کے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔  
بائیں خیال کہ ہمارا روغن اپنا اشتہار خود بھی فی الحال قیمت لاگت کے  
برابر رکھی ہے، قیمت فی ادحا ۱۲ روپے، عارضی نمونے کی ٹشٹی ۵ روپے  
لئے کاپیٹہ۔ انڈین اسٹور، بریلی

۱) ہمایوں۔ اتنا پابند وقت ہے کہ جنوری ۱۹۳۵ء سے کر اجب یہ جاری  
ہو اتنا) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی  
روہ صفات میں اس سے قبل ایسی باقاعدہ مثال نہیں مل سکتی۔

۲) ہمایوں۔ آریل ٹیسٹ میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم بیگم  
بنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے  
نصاب ہی دشمنوں کی نظر کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصمت مد نظر  
نہیں رکھی جاتی۔

۳) ہمایوں۔ کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ  
اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں محض اشتہارات۔ وہاں تصاویر اور

مغربی اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعاً غفلت نہیں، یہ رسالہ بلاخبر خواتین کے ہستوں میں دیا جاسکتا ہے۔

۴) ہمایوں کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی لے لاکسن، بیرسٹریٹ لا کے قابل ہستوں میں ہے اس کی ترتیب میں مضامین کے  
محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا سبھی اشیا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمایوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں  
جاذب توجہ ہوتا ہے۔

۵) ہمایوں کے مضامین محض نواز معلومات ہی نہیں ہوتے، بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظر ہے،

۶) ہمایوں۔ محبت زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔

۷) ہمایوں میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات  
اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق بنیاد پرست قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

۸) ہمایوں۔ ملک کے محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

۹) ہمایوں کے کاغذ۔ کتابت، لطافت، اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

۱۰) ہمایوں کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زائد قیمت نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے، مع محصول ہے

خاکسار۔ منیجر رسالہ ہمایوں لاہور



# پیغمبر اسلام

خواجہ دو جہاں سرور کائنات حضرت  
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت  
اور رسالت پر شاہراہ انقلاب حبش  
شیخ آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ  
جس کی رخت و عظمت کے سامنے  
قصر کفر سرنگوں ہوتا ہے، ثبوت  
پیغمبری کے باب میں اس لاغافی  
شاہکار کے انوکھے استدلال  
دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے  
ہیں اس کے اثری الہامات سے  
دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا  
ہے، اس کے دلائل قاطع کے ساتھ  
ادراک متعلق چھانٹنا بھول جاتا ہے  
شاہراہ انقلاب پر حبیب ایک سرشار  
کا عالم طاری ہوا اسی وقت انمول  
نے یہ نظم کہنا شروع کر دی۔ عالم  
بہج دی میں چار روز کی ریاضت  
شاد اور کیسوی قلب سے کچھ  
مائل ہوا صرف وہی صفحہ قرآن  
پر تحریر کیا گیا، جب تک یہ نظم  
مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے  
کچھ کھایا نہ پیا اور نہ خلوت  
سے باہر تشریف لائے۔

قیمت صحیفہ آٹھ آنے  
کلیم بڈپو دیانگج دہلی سنگا

## ہندوستان کے مشہور مصوٰر ماہر شاہکار لاہور

تمام علمی ادبی رسالوں پر کیوں ترجیح دی جائے؟

(۱) اسلئے کہ اس کے ایڈیٹر ملک کے مشہور نقاد ادیب علامہ تاجوڑ اور خواجہ محمود جالندھری ایسے ہیں جن کا علم فضل و سعت نظر اور  
طرز نگارش منک بین مسلم ہے۔

(۲) اسلئے کہ ہمارے زعموں کی جڑیں نہیں ہوتی۔ بلکہ اور بحال (original) مضامین دیکھتے تنقید سے لبریز ہوتا ہے۔

(۳) اسلئے کہ اس میں مستقل عنوانات ذیل کے تحت میں مستند اہل فکر کے نہایت بلند محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔  
مسائل حاضرہ۔ تنقید شعری۔ تصحیح۔ سوال و جواب۔ تعلیمات ہشیمہ۔ شاہیر عالم۔ تنویرات۔ اخبار علمیہ و تعلیمیہ۔  
جلوہ زار۔ برہم انتخاب۔ آثار وحدتہ۔

یہ تمام مفید عنوانات صرف شاہکار کا امتیاز خصوصی ہیں۔

(۴) اسلئے کہ عنوان جلوہ زار کے تحت میں تازہ ترین اردو رسائل و اخبارات کے اہم مفید اور نثر معلومات مبین مضامین کا مکمل خلاصہ  
شائع کیا جاتا ہے۔

(۵) اسلئے کہ عنوان برہم انتخاب کے ذیل میں یورپ، امریکہ، ایشیا اور ہندوستان کے ہر ماہ کے تازہ ترین انگریزی، عربی فارسی  
اردو اور ہندی کے بلند پایہ اخبارات اور رسالوں سے بلند پایہ مضامین کے جاندار اور نثر و افروزہ حصوں کے اقتباسات بڑی  
معت اور تلاش کے بعد درج کئے جاتے ہیں اور اس طرح شاہکار کے ہر نمبر کو مشرق اور مغرب کے ادبیات کا آئینہ دار بن لویا  
جاتا ہے۔ شاہکار کا مطالعہ دوسرے تمام رسالوں اور اخبارات کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

(۶) اسلئے کہ اسکا مشرق نہایت حسین ہفت روزہ ہے اور اس کے ہر نمبر میں آیت کی نہایت بلند اور حسین سہ گئی دیکھنی آہاؤ۔ شاہکار کی کہانی میں  
(۷) اسلئے کہ اس کے ہر نمبر میں مشرق و مغرب کے مستند افسانہ نگاروں کے دلکش اور سبق آموز بانجی افسانے اور ہندوستان کی شہرت  
رکھنے والے سحر خیزوں کی تازہ ترین نغمہ ناز نغمیں شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) اسلئے کہ شاہکار ہر ماہی سائز کے ۷۲ صفحات میں اتنے مضامین سجاتے ہیں کہ عام رسالوں کے تین نمبر شاہکار کے ایک نمبر کی برابر ہیں۔

(۹) اسلئے کہ شاہکار کو عربی، قصائد، برہم نظموں، اور حیا سوز مضامین کی اشاعت سے ایمان کی طرح بچایا جاتا ہے۔

(۱۰) اسلئے کہ اس کے تخلیق ہر ایک سلیس گورنر چناب، سرسبز بہادر سپر، سرخالا برشا، مسری، دستویہ، جسٹس سرخو، محمد نور، سرفروز علی  
نون، نرغسل حسین مرحوم اور ملک اہل الرائے اہل فکر اور معتد اخبارات نے نہایت بلند بلجے میں اظہار رائے کیا ہے۔

(۱۱) اسلئے کہ شاہکار ہر نمبر میں رسالوں کے سالناموں کے برابر اور ان سے زیادہ شاندار اور دلچسپ ہوتا ہے۔

سالانہ چندہ بچہ پے نو کا پرچہ آئے کے ٹکٹ۔ ادا خریداروں سے یہ شرط تصدیق چار روپے بارہ آنے بذریعہ منی آرڈر لیا جاتا ہے۔

دفتر رسالہ شاہکار لاہور

رسالہ کلیم کے لئے ہر جگہ دیانتدار اور محنتی ایجنٹوں کی ضرورت ہے



## نقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی  
کی وجد آفریں نکلوں کا مجموعہ جو مندرجہ ذیل ابواب پر منقسم ہے  
(۱) نگار خانہ (۲) خمریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) نسیب  
ہر نظم اپنی جگہ مکمل، مرصع اور کینیاں شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس  
کے مسطور کن نئے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے  
ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں  
لمحائی، چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے

قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۶) مجلد دو روپے (۲۰) (۱۶)  
کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۱۰ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شاعری راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین  
اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے، جنہیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو  
اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

|               |              |                   |               |
|---------------|--------------|-------------------|---------------|
| مست رات       | پرست رات     | راز و نیاز کی رات | انتظار کی رات |
| اندھیر کی رات | چاندنی رات   | جوانی کی رات      | تصورات کی رات |
| افتحات کی رات | جدائی کی رات | اشکوں کی رات      | برسات کی رات  |
| ربودگی کی رات | ہجود کی رات  | سرشار رات         | بھگی ہوئی رات |
| تصورات کی رات | بچپن کی رات  | ہیان ناگن کی رات  |               |

قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۱۰ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## سوشل

حضرت جوش ملیح آبادی کے نام ملبوعہ اور غیر ملبوعہ کلام سے منتخب کئے

سوشل

دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے  
باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو

اپنی پسند کے ملیں گے

جی ساز، کاغذ، کتابت، لطافت دیدہ زیب، سرورق خوشنما، جڑ  
ہر شاو کی تصویر سبھی ہے

قیمت صرف چار آنے

مینجر کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۱۰ دریا گنج، دہلی

## شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

(کی) بی بی

پرچش اور کیف اور نظموں کا مجموعہ  
جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلامی شان و حریت کے خون کو  
دینے والے واقعات، بادۂ سرچش کی سرستیوں اور گھلبانگ فطرت کے  
روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتا ہے  
شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاعر غیر ملبوعہ کلام سے مرصع ہے  
کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گرد پیش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپے (۳۰)

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۱۰ دریا گنج دہلی سے منگائیے

نمبر ۱۷

نمبر ۱۷

## وڈ ایش جکائی میں جواب نہیں

### جل جلال

خارش خشک و درد او گنج پھوڑے۔ جھنسی گری  
جانے جھانیں کیل۔ جھاسے۔ سوزک۔ آتشک گشیا  
حق انصار برص۔ اور خدام۔ غرض خساخسو سے  
سیا چوہنے والی تمام بیماریوں کے لئے ثابت  
نہید ہے۔ قیمت خشبی ۱۲ قرص  
پہندہ آنے

### نوجون

عام جاتی کمزوری اور طاقت مردانہ  
لئے اس قدر مفید ہے کہ کسی بھی ایک مٹا نہیں  
کر سکتی۔ تمام اعضا و جیسہ کو طاقت دیتی ہے۔ بلکہ  
متولی جسم کے خوشبو پانی کو پانی سے بہتر بنی  
وہ جیسہ تمام اعضا کو چاہئے اور زمانہ و قمر میں  
کر سکتی۔ ۳ قرص بہتر

# جمیلان

### طعنت

اُن لوگوں کیلئے  
جو اپنے ہاتھ پاؤں  
مٹی غلب کر چکے  
ہیں اور غلط کاموں  
نے انہیں کسی قبل  
ہیں زخمی  
طعنت نئی ندگی  
کا حکم رکھتا ہے جنہو  
کی کمی۔ لاشی کی  
اور کوتاہی و غلطی  
ہے۔ اور لوگوں سے  
ماتہ خار خارج کر  
اور طاقت حاصل  
ہوتی ہے قیمت خشبی  
۱۲ قرص

عالیجا بیخ املاک حکیم جمیل خان جبار سرتست ہندوستانی دواخانہ دہلی  
وہ دھن جس سے دولاکھ رضیان جریان کو آب تک آرام و فائدہ ہو چکا ہے

جریان کا نتیجہ کیا ہے؟ دل و دماغ و جگر کا کمزور ہونا۔ باضمہ کابگاڑ۔ حافظہ کی خرابی۔  
جنت کی لہری۔ طبیعت کی سستی۔ اولاد سے محرومی جوڑوں کا درد اور عام ناتوانی پھر  
رفتہ رفتہ مایوس یا چون یا کوئی سمیت بیماری مثلاً دل و دماغ وغیرہ۔ اگر آپ کو جریان کی  
شکایت ہو تو فوراً توجہ کیجئے۔ آج ہی اس سبب سے بھا اور کامیاب دوا کا استعمال شروع  
کر دیجئے۔ جمیلان مرض جریان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہو چکی ہے۔  
جس سے اب تک دولاکھ بیماروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ جریان چاہے بڑا ناچوکا ہو یا  
نیا ہو ہر حالت میں اس سے فائدہ ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دل و دماغ کی کمزوری اور  
اعضا کا تحلیل دور ہو کر تندرستی اصلی حالت پر آ جاتی ہے۔ قبض پیدا نہیں ہوتا۔  
جو ک خوب لگتی ہے۔ غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے۔ زرد چہرہ پر سرخی جھلکنے لگتی ہے  
جریان کی دواؤں میں جمیلان سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔  
ترکیب استعمال۔ دو قرص صبح دو دفعہ کے ساتھ استعمال کریں۔  
قرشی۔ تیل۔ کر۔ اور ثقیل چیزوں سے پرہیز۔

### طرود اشرا

یہ طوائف لوگوں  
کیلئے ہے۔ جن میں  
سستی اور جوش  
کی کمی پائی جاتی ہے  
اس کے استعمال  
سے پہلی رات میں لڑ  
ظاہر ہوتا ہے۔ سبیل  
استعمال سے کمزوری  
سستی۔ لگ۔ اور  
جھول کی خرابیاں  
دور ہو جاتی ہیں۔  
نہایت مفید ہے  
قیمت خشبی ایک  
ماشہ بارہ آنے

### حب مُسک مُشکی

یہ گولیاں دھن پریشانی سے بچاتی ہیں سرعت کی  
شکایت باطل۔ دور ہو جاتی ہے۔ تمام مضر صحت نشہ  
کی چیزوں سے پاک ہیں۔ انکی بدولت اُن لوگوں کی  
جوانی کمزوری کی وجہ سے آنا و خود کشی جو دقت  
بہ خاطر ہوا کامیابی حاصل کی ہے قیمت خشبی  
۱۲ قرص ایک روپیہ

قیمت خشبی سبب ۱۲ قرص  
چار روپے آٹھ آنے

### قرص عجیب

آج تک دنیا میں کثرت اختتام کی اس سے بہتر  
دوا دریافت نہیں ہوئی۔ عرصہ دوا کی شکایت چند  
خوگول میں جاتی رہتی ہے۔ سبقت و سرعت کی کمی  
کرتی ہے۔ ایسی کمی دوا ہے کہ سونی صدی  
کامیاب ہوئی ہے۔ قیمت خشبی ۱۲  
قرص بارہ آنے

یہ سب سے بہتر دواخانہ دہلی

نمبر ۱۷

بچوں اور بچیوں کا با تصویر ماہوار سالہ

پیامِ کلیم دہلی

یہ رسالہ تحریک بچوں کی خاطر جاری کیا گیا ہے، اس میں اُن کی دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے، اچھے اچھے اور مزیدار قصے کہانیاں، سید اور دلچسپ معلومات، لطیف، مفید مشغلے، لکچر اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں وغیرہ وغیرہ، غرض اسے پڑھنے کے بعد انہیں کوئی دوسرا شغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، سچے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے، ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، ایک انجمن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے، اس انجمن کے ذریعے ان کے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے، تاکہ ان مفید مشغلوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں، اسی خیال سے اس کا چند بھی

صرف دو روپے اکٹھا آنے

رکھا گیا ہے، اسی پندہ میں سالانہ نامہ بھی دیا جاتا ہے، یہ سنکر شاید تعجب ہو کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان اب تک پیامِ تعلیم جیسا سالنامہ نہ پیش کر سکی۔

فورا خریدار بن جائیے تو سالنامہ مفت ملے گا

ورنہ ۱۲ روپے ٹکٹ بھیج کر منگانا پڑے گا۔ سالنامہ ۲۵ اکتوبر کو شائع ہوتا ہے۔

مکتبہ جامعہ قریول باغ، نئی دہلی

آپ اپنی تجارت ترقی دینا چاہتے ہیں

تو رسالہ کلیم میں ضرور اشتہار دیں

ذہنی اور سیاسی انقلاب

کا پیغامِ مثبت

رسالہ کلیم دہلی

شاہ انقلاب جوش ملیح آبادی

اگر واقعی آپ کی یہ دلی آرزو ہے کہ:-  
(۱) آپ کے وطن عزیز کو پنڈتوں اور ملاؤں کے فساد سے نجات مل جائے۔

(۲) تشدد و رسوم کی عمارت پر حربہ فکر و آزادی خیال کا پھر یا لہرانے لگے۔

(۳) ہندو مسلم انسان بن کر اپنے اتحاد کے ذریعے سے ایک زندہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈال دیں۔

(۴) اور ہندوستان، غلامی کے طوقِ لعنت کو جس سے شیطان تک پناہ مانگتا ہے، اپنی گرن سے اتار کر پھینک دے۔

پہلی فرست میں کلیم کے خریدار بن جائے

پتہ یہ بھی  
مینجر رسالہ کلیم جینتی نواس دیپ جی

# ایک نفیس مزاج ہمارا فی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر تم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے

تعیین حکم کے لئے فردوس

شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش

جب سب پھول دُور دراز

میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی

اس قدر مر جھائے ہوئے تھے،

کہ تکلیف ہوئی، ہمارا فی اس

مول رہنے لگی، کھانا پینا ترک

اور دُور دراز سے مشورہ طلب کیا،



بہترین خوشبو منتخب کر سکوں،

مثال کشمیر جنت نظیر سوزر لینڈ،

مرغزاروں میں گل چینی کی گئی،

سفر کے بعد ہمارا فی کے حضور

خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی

کہ ہمارا فی کی حُسن شناس نگاہوں

خواہش کے پورا نہ ہوئے ت

کر دیا، ہمارا جہ کو فکر و انگیز ہوا

ہم تم تو شہ خانہ نے ”اصغر علی محمد علی“ سے عطر منگوانے کو کہا، ارے معقول تھی، ذرا اعل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو ہمارا فی کا شباب رفتہ

ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لے دایں آگیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

تازہ ترین تصنیف

جنون و روش

یاد دہی مجموعہ رباعیات

رباعی، تمام اصناف سخن میں وہ تنہا رنگین، عین اور فلسفیانہ صنف ہے جو عظیم شعراء کی مشائی کے نقطہ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے، اور کسی شاعر کو اس وقت تک حقیقی نباعی گو شاعر کا پر شکوہ خطاب نہیں مل سکتا، جب تک کہ اس کی بے پناہ جنون پرور تخیلی قوت مجذوب ہوتے ہوئے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہمہ غفل نہیں ہو جاتی، بدست ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رباعی بھی ہر جہ گیر وطنی غلت شود کے دھڑے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، بیادمان طلیعت نے ہر دم طرد یہ سمجھ رکھا ہے کہ رباعی نام ہے دباحت کی بھڑوں میں چاروں سے سو منوں کو دینے کا، اور بس۔۔۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رباعی شاعرانہ مطالعے شعرا، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ تخیلی خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی سچی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔ اگر آپ کے دل میں اکثر یہ غما پیدا ہوئی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوتا تو آپ کا یہ اولین فرض ہے کہ پہلی فرست میں جنون و حکمت کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاض قدرت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں ایک خیام پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اس کی قدر و قدر نہ کریں۔۔۔ آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک فیئر جیر لڈ مل گیا تھا جس نے اسے ایک زندہ قوم سے روشناس کرادیا تھا لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مردہ اور غلام ہے، اور غلامی کو صرف ہی نہیں کہ کوئی فیئر جیر لڈ نہیں بنا کرتا، بلکہ خود اس کی قوم بھی اس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے تیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون و حکمت مندرجہ ذیل الجواب پر مشتمل ہے، (۱) معارف (۲) ظرا بات (۳) امن و عشق (۴) پیران سالوس (۵) متفرقات

قیمت صرف تین روپے ————— علاوہ محصول ڈاک

منیر کلیم بک ڈپو، جنتی نو اس نمبر ۴ دریا، گنج دہلی



میر جو شمع آبادی

# شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا فکر و نظر نازہ ترین شاہکار

نقش و نگار اور شعلو شبنم کے بعد یہ شاعر انقلاب کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جس میں بالکل نئی نئلیں شامل کی گئی ہیں۔ یہ تمام نظمیں نباض فطرت اور حساس شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ ایک ایک شعر میں مسائل حیات اور دنیا کے رنگارنگ واقعات پر ایسا رنگین تبصرہ کیا ہے جس کی تشریح و تفسیر دفتروں میں نہیں سکتی، اور بیان کی شگفتگی و شادابی پر ہزار چمن نثار ہیں، شاعر انقلاب نے اپنے پیام کے ذریعے اپنے مخاطب کو فکر کی بچ در بچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ اسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے و ماغ کو انجمنوں میں نہیں ڈالا ہے بلکہ ساز و دل کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے، اور ان سے وہ موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالم و جد طاری ہو جاتا ہے۔

کتابت، طباعت، کاغذ نہایت اعلیٰ ہے، سائز بڑا، صفحات ۱۲۵، سرورق خوشنارنگین، کتاب مجلد ہے

قیمت ایک روپیہ

ملنے  
منیجر کلیم بک ڈپو، نمبر ۴، جنتی نو اس، دریا گنج دہلی

# کلام قوت و حیا

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا

قدرت بلا ہے محکو صدیف حکیم

سلاں چند، چھ روپے

آگے کئی صدیوں ہے فناء اپنا

پہروں کو سنائے جا ترا نہ اپنا

سہما ہی چندا - دو روپے

منظور شدہ

ڈاکٹر انیسلم

ششما چند، تین روپے آٹھ آنے ریاستہائے میور، پٹیا لہ، وحیدر آباد دکن قیمت فی پرچہ - نو آنے (۹)

## جلد ۱ فہرست مضامین بابتہ ماہ اپریل ۱۳۳۸ء نمبر ۱

| نمبر شمار | مضمون                    | نمبر شمار | مضمون                                        | نمبر شمار | مضمون                  | نمبر شمار | مضمون                              |
|-----------|--------------------------|-----------|----------------------------------------------|-----------|------------------------|-----------|------------------------------------|
| ۱         | اشارات                   | ۲۶۶       | میر                                          | ۱۳        | دو شیراز بن (نظم)      | ۳۱۶       | جناب حسن صاحب فلم گڈمی             |
| ۲         | باعتات چکش               | ۲۶۱       | جوش بیٹ آبادی                                | ۱۴        | سلام اور وطن           | ۳۱۷       | کثرت                               |
| ۳         | شوکا انبار (نظم)         | ۲۶۲       | جوش بیٹ آبادی                                | ۱۵        | باعتات                 | ۳۲۷       | -----                              |
| ۴         | جاہان کی سب سے بڑی کھانا | ۲۶۳       | مترجم جناب محمود علی خان صاحب بی بی کے       | ۱۶        | مزدور کی جوانی         | ۳۲۸       | جناب احسان بن دانش صاحب            |
| ۵         | حضرت آٹھ گوی اور میں     | ۲۸۴       | جناب پروفیسر رگوپتی سہائے مختار آق ایم نے    | ۱۷        | ہندوستان کی چھوٹی زبان | ۳۳۰       | جناب اتم اکبر آبادی                |
| ۶         | عورت (نظم)               | ۲۹۲       | جناب ایچ ایم صاحب جوش نکلتے                  | ۱۸        | نصیب                   | ۳۳۴       | جناب وجاہت صاحب سند پوری بی بی     |
| ۷         | مہاج کی سنگدلی           | ۲۹۳       | جناب محمد کمال احمد صاحب راز بھگپوری         | ۱۹        | مزدور (نظم)            | ۳۳۵       | جناب مائل صاحب نقوی                |
| ۸         | ادب دارنا                | ۲۹۵       | جناب صدیق بیگم صاحب سیر ہارہ بیگم            | ۲۰        | آج کل (نظم)            | ۳۳۶       | جناب شیخ عبداللطیف صاحب پش پور     |
| ۹         | جذبات شہید (نظم)         | ۲۹۸       | جناب شہید ابن علی صاحب                       | ۲۱        | نقا و وقت              | ۳۳۷       | ادارہ کلیم                         |
| ۱۰        | اورنگ زیب اور راجپوت سنگ | ۲۹۹       | جناب گوڑ صاحب چاند پوری                      | ۲۲        | شاوکی دعا (نظم)        | ۳۴۲       | جناب الطاف صاحب شہیدی              |
| ۱۱        | اسپاہ شہاب لعلی (نظم)    | ۳۱۱       | جناب سیکش صاحب اکبر آبادی                    | ۲۳        | نقد و نظر              | ۳۴۳       | ادارہ کلیم                         |
| ۱۲        | گنبد یا گنبد             | ۳۱۲       | جناب ڈاکٹر عبدالکبیر شادانی ایم بی بی ایم سی | ۲۴        | باعتات آثر             | ۳۴۴       | جناب ذاب جعفر علی خان صاحب آٹھ گوی |

(جوش بیٹ آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ساد کلیم دریا گنج شہر ممبئی قزاق سے نمائندہ کیا)



# اعتدال

## مدیر

### بے اعتدالی کی معراج

اس سے کون انکار کی جرأت کر سکتا ہے کہ زندگی کو خوشگوار اور حیات کو تندرست و پائدار رکھنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ اہم چیز ہے اعتدال۔

توسط اعتدال سے بڑھکر کوئی خیر نہیں، اور بے اعتدالی، اور افراط و تفریط سے بڑھکر کوئی شر نہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے گناہ کی تعریف کیا ہے، تو میں صرف یہ جواب دوں گا کہ بے اعتدالی۔

بے اعتدالی وہ بلا ہے کہ وہ امور بھی، جن میں عرف عام میں خیر کہا جاتا ہے، اس سے آلودہ ہو کر شر بن جاتے ہیں۔ اور اعتدال وہ برکت ہے کہ وہ امور بھی جن میں عرف عام میں شر کہا جاتا ہے، اس سے بہرہ مند ہو کر خیر کا لقب حاصل کر لیتے ہیں۔ دور کیوں جائیے، عبادت ہی کو لے لیجئے، جو اہل مذاہب کے نزدیک ترین عمل ہے، اگر کوئی شخص اپنے تمام فرائض انسانی، اور وظائف طبعی کو یک صوت ترک کر کے مشابہت و زعماد، اور صرف عبادت ہی کا ہو کر رہ جائے تو کیا اس کی یہ عبادت گزاری، بے اعتدالی کے باعث، گناہ میں تبدیل ہو کر نہ رہ جائے گی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ، دنیا کے تمام دیگر اہم ترین امور کی طرح اعتدال بھی ایک نہایت ہی مشکل امر ہے۔ اور اسی وجہ سے زندگی کے کسی شعبے میں صحیح اعتدال کہیں کا سراغ نظر نہیں آتا۔ لیکن بے اعتدالی کے بھی، دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح، مختلف مراتب و مدارج ہیں، اور یہی وہ مختلف مراتب و مدارج

ہیں جن پر نگاہ کر کے، انسانی اقوال و کردار کے باب میں زشت و خوب کا حکم لگایا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نقطہ اعتدال سے ہم سب ہٹے ہوئے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کون کس قدر ہٹا ہوا ہے۔ یعنی نقطہ اعتدال سے جو شخص جس قدر کم ہٹا ہوا ہوگا، اسی نسبت سے وہ قابل تحسین، اور جو شخص جس قدر زیادہ ہٹا ہوا ہوگا، اسی نسبت سے وہ قابل نفرت قرار دیا جائے گا۔

یا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھ لیجئے کہ نقطہ اعتدال سے جو شخص جس قدر قریب ہے، وہ قابل تحسین ہے بہ اندازہ قریب۔ اور جو جس قدر بعید ہے، وہ شایان نفرت ہے بہ اندازہ بُعد۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ قومیں اعتدال سے نسبت زیادہ قریب رہتی ہیں جن کے ذہن علوم کی روشنی سے تابناک، اور اُبھارنے والے جذبات سے طاقتور ہوتے ہیں، اور اس کے برعکس وہ قومیں اعتدال سے نسبت نہایت ہی فاصلے پر رہتی ہیں جن کے ذہن چال سے تاریک، اور بہت توڑ دینے والے آلام سے نالقات ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ہم ہندوستان کے جاہل و مڑوہ باشندے، اسی ثنائی الذکر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اسی ہماری زندگی اور ہماری موت دونوں کو اعتدال سے کوئی دور کا بھی دور باقی نہیں رہا ہے۔

زندہ قومیں، جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، اپنے اقوال و کردار کو توسط اعتدال سے سجاوہ نہیں ہونے دیتیں، لیکن مڑوہ قومیں افراط و تفریط اور بے اعتدالی کا شکار ہو کر جو کام بھی کرتی ہیں، ان میں محدود سے

مستباز ہو کر اپنے گھنے لگتی ہیں۔۔۔۔۔ مثال کے طور پر شاہد و شراب ہی کو  
سے بیچے۔ کسی قوم کے طباع، ذندہ دل اور رنگین مزاج افراد شاہد و شراب  
کو پسند نہیں کرتے؛ مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ ذندہ قوموں کے افراد  
ان متذکرہ بالا فرائض بشریٰ کو اس خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ اس سے  
اُن کی عقلیں روشن، دل قوی، اور تندرستیاں قابلِ رشاک بن جاتی ہیں۔  
اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس میں قدرت نے نوعِ انسانی کے واسطے کیا  
کیا منفعتیں پوشیدہ رکھی ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف، مُردہ قوموں کے افراد  
جب اس کی جانب خیر سے متوجہ ہوتے ہیں تو اس قدر بے اعتدالی ہوتے  
ہیں کہ اُن کی عقلیں تاریک، دل کمزور اور تندرستیاں قابلِ ماتم ہو جاتی ہیں،  
اور وہ چیز جو حکمِ آلام حیات قطعی طیب و حلال ہے اُن کی بے اعتدالیوں  
کے باعثوں ناپاک حرام اور عملِ شیطانی ہو کر رہ جاتی ہے

اسی سلسلے میں مجھے اپنے ایک شایانِ محبت و قابلِ ہمد رومی دوست یاد آ گئے، جو ایک ماٹھے میں خدا کے دُور سے منکر تھے، اور اب خدا کے سب سے بڑے ماننے والوں میں سے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اُن کا اسی دُوبھی ہے اعتدالی کانٹاکار تھا، اور اب اُن کی دینداری بھی بے اعتدالی کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے، جب وہ خدا کے منکر تھے تو اس قدر غلو کے ساتھ منکر تھے کہ خدا کا نام نُسنتے ہی سنجیدگی آمیز حکیمانہ تہنم کے عوض اُن کے منہ سے جھاگ اُٹھنے لگتا تھا، اور اُن کے غلو و خال غیظ و غضب کی آگ سے اس طرح شریخ ہو جاتے تھے گویا کوئی اُن پر سب و شتم، اور اُن کے دشمن کی شان میں قصیدہ طواری کر رہا ہے۔ اور اب جب کہ وہ عاشقانِ الہی کے صلتے میں داخل ہو چکے ہیں، خدا تو بڑی چیز ہے، اگر اُن کے سامنے کوئی کسی صوفی کا بھی نام لے لیتا ہے تو وہ فرطِ ادب سے اس طرح گھبرا کر ٹوپی پین لیتے ہیں، جس طرح غسل خلدنے میں کسی کے ہاتھ جاکر داخل ہوتے ہی نہانے والا ستر پوشی کے واسطے تو لیا کی طرف جھپٹ پڑتا ہے، اور اُس وقت دہشتِ عقیدت و ہیبتِ احترام سے اُن کی آنکھیں مٹی کے اُن ڈھیلوں کی طرح میٹھنے لگتی ہیں، جن کے بیٹے پانی نے آہستہ آہستہ رنگِ شاد رخسار پر دھوا کر دیا ہو۔

انہیں بے اعتدالیوں کے سلسلے میں ذیل کی خبر بھی جو ملاپ ۴۱ ر  
مارچ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی ہے، پڑھئے، اور پڑھ کر عبرت حاصل  
کیجئے۔ —

ہر پانچ قدم پر نماز پڑھنے والا حاجی  
پانچ سال کے عرصے میں حیدر آباد سے سہارنپور پہنچا  
آج ایک اٹھائیس سالہ مسلمان قراب زادہ سہارنپور اور براڑہ  
کے درمیان سفر کر رہا ہے۔ شخص ہر پانچ قدم چھنے کے بعد نماز پڑھتا ہے،  
اس کا مادہ پیدل چل کر خشکی کے راستے لگا ہیں بچے کا ہے، شخص زیات  
حیدر آباد کن کا خاندانی قراب زادہ ہے۔ اس کو حیدر آباد سے چلے قرینا  
ساتھ پانچ سال ہو چکے ہیں۔ شخص ہر روز تقریباً ایک میل سفر کرتا ہے،  
اس کے ساتھ خدمت کرنے کو ایک نوکر بھی ہے۔

اس کے ساتھ فصیح سہارنپور و انبالہ کے ہزاروں مسلمان ہات ملانے کے لئے آتے ہیں۔ وہ قریباً ایک سال میں لاہور پہنچے گا :

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ "

محترم قارئین! یہ خبر آپ نے پڑھی؟

۱۱) کیا آپ کے نزدیک اس کے حواس درست، اور اس شخص کا دماغ صحیح ہے؟  
 ۱۲) کیا اسے خاندانی ذائبِ ذراوے کا یہ فعل، اس کی ذات، اس کے  
 خاندان، اس کے ہمسایوں، اس کی قوم، اور اس کی نژاد کے حق میں مفید قرار  
 دیا جاسکتا ہے؟

(۳) کیا اس شخص کا پرزکوع و سجود آمیز سفر بے غیر اسلام، شریعت اسلام اور خدا نے اسلام کی نظروں میں محبوب ہو سکتا ہے؟

(۴) کیا وقت کی اتنی کثیر مقدار کا اس جبری طرح ضائع کر دینا دنیوی عمل اور دینی وجدان کی رُو سے جائز ہے؟

(۵) کیا اس نوجوان پر اس کے موسمِ پیار، یعنی نوجوانی کا کوئی حق نہیں؟ اور کیا نوجوانی کی کسی دولتِ بیدار کے رنگین حقوق کی پامالی کبیرہ گناہ نہیں ہے؟

(۷) اگر یہ ذاتِ زادہ دکن صاحبِ اہل و عیال ہے تو کیا اس سفر کے ذریعے سے (جسے اُس نے اپنی صحیح زندگی میں شروع کیا ہے اور شامِ زندگی میں

اے خاندانی نزاع ہوا ہے ہی ایسی حرکتیں کر سکتے ہیں

سے ایک نشہ دوشد۔ اپنی زندگی کے ساتھ دوسرے کی زندگی بھی خراب کی جا رہی ہے۔  
سے کیوں جو، مسلمان ایسے آدمیوں سے بات نہ لائے گا تو اور کون لائے گا۔

ختم کر کے گا، وہ اپنے اہل و عیال کی پرورش اور اپنی بیوی کے سبب کو برباد نہیں کر رہا ہے؟

(۷) اگر مجھ وہ ہے تو کیا یہ شخص نکاح نہ کر کے اسلامی آبادی میں اضافہ کرنے سے عملاً انکار نہیں کر رہا ہے؟

(۸) کیا یہ سچ ہے کہ خدا کسی کے نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا؟ اگر یہ سچ ہے تو اس ذاب زادے کو اللہ تو یقیناً اس ہوناک سفر کی تکلیف نہیں دے رہا ہے۔ تو پھر کیا یہ خود اپنے ہاتھوں اپنے کو اتنی تکلیف میں مبتلا کئے ہوئے ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اس چیز کو جسے مذا، اتنی بے پایاں قدرت کے باوجود ردائیں رکھنا، ایک انسان کو خود اپنی مرضی سے اختیار کر لینا چاہیے؟

(۹) کیا قرآن میں یہ حکم بھی ہے کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو؟ اگر ہے تو کیا اس سفر کے ذریعے سے یہ شخص اپنے کو اسباب ہلاکت سے دوچار نہیں کر رہا ہے؟ (۱۰) اور کیا اس ہوناک ہلاکت انگیز سفر کو جوش عقیدت و افراط محبت کا لقب دے کر سراہا جاسکتا ہے؟

اگر ایسا ہے تو کیا اس شخص کو بھی جوش عقیدت و افراط محبت کی بنا پر سراہا جائے گا جو خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی اپنی گردن کاٹ کر پھینک دے گا؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو میں ببانگ دہل کہوں گا، اس تمام عالم کے مجموعی علم و عرفان، اور اس کڑے ارمن کی مجموعی عقل و دانش کی قسم کھا کر کہوں گا کہ ان سوالوں کا اثبات میں جواب دینے والوں کی عقل پیو دیوں کی دیوارِ گرہ کے مثل ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر تمام دنیا کے عقلاً کو ماتم کرنے کے لئے بیہوش ہو جانا چاہیے۔

اور اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو کوئی آواز دو، خدا را آواز دو! ان شمس العلماء و عالمان دین شن، اور ان مفتیان شرع شن، کو جن کی دُمنو سے شاداب گئی و از جیوں کے بچے، حکومتِ عالیہ برطانیہ کے تھے اس طرح جھٹکتے رہتے ہیں، جیسے غلامت کے اندر آبِ حیاں، بلکے لیتا نظر آتا ہے، اور اسی کے دوش بہ دوش تمام دنیا کے قوالوں کی تالیوں اور ڈھولکوں کی قسم کئی آواز دو! ان سجادہ نشینانِ حق شناس، اور ان پیرانِ حقیقت آگاہ کو جن کی رنگین عبائیں شبِ رنگ کاکھوں سے ہلکتی رہتی اور جن کے شکمائے مبارک میں احق میزبانوں کے مُرثا اذانیں دیتے رہتے ہیں کہ وہ سب کے سب اپنے اپنے

مُجروں، اور اپنی اپنی خانقاہوں سے چند نفس کے لئے باہر تشریف لائیں، اور حیدر آباد کے اس خاندانی نواب زادے کے شانے پر پرانہ شفقت کے ساتھ ہات رکھ کر یہ سمجھائیں کہ اس کا یہ سفر اللہ اور بندوں، دونوں کی نظر میں صرف تضحیحِ اوقات ہی نہیں بلکہ گناہ ہے، اور ایک ایسا گناہ ہے جو توبہ کے بعد بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن نہیں، یہ سچی کبھی شکور نہیں ہو سکتی، یہ تو صرف ایک آدمی کا معاملہ ہے، اگر مسالوں کی پوری قوم بھی ہلاک ہو جائے تو بھی یہ علمائے کرام اور یہ پیرانِ پارسا اپنی جگہ سے حشش نہیں کریں گے۔

یہ اٹھائیس سالہ ذاب زادہ میری بات تو کبھی نہیں مانے گا، ورنہ میں خود لاہور کے راستے میں اس سے ملتا، اور بات جوڑ کر درخواست کرتا کہ لے لے برادرِ خدا! اپنے عہدِ واپس جا، اپنی قوم کی بواؤں اور اپنی قوم کے یتیموں کی دستگیری کر کہ تیری یہ دستگیری، تیرے اس متم کے پچاس ہزار پیادہ عجبوں سے بہتر ہوگی۔ اپنی قوم کے درمائدہ انسانوں اور بے یار و مددگار مردوروں کی خدمت کر کہ تیری یہ خدمت تیرے اس متم کے پچاس ہزار پیادہ عجبوں سے بہتر ہوگی۔ اپنے نوجوانوں کو فوجی تعلیم دینے کی سعی کر اور اپنے مسخ شدہ مذاہب کے مارے ہوئے بوڑھوں کی عقلیں درست کر کہ تیری یہ سعی تیرے اس متم کے پچاس ہزار پیادہ عجبوں سے بہتر ہوگی۔ اور اپنے ننگے بھوکے ٹھک، اپنے ایڑیاں رگڑتے ہوئے ٹھک کو محکومی و درمائدگی سے نجات دلانے کی خاطر ایک جوانِ مرد سہاہی کی طرح سر سے کفن باندھ لے کہ تیرا یہ سر سے کفن باندھ لینا تیرے اس متم کے پچاس ہزار پیادہ عجبوں سے بہتر ہوگا۔

لیکن میں کیا کروں۔ یہ شخص میری بات ہرگز نہیں مانے گا۔ بات مانا تو درکنار یہ تو میری صورت دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھانے لگا، اس لئے کہ میں شاعر اور رند شاعر ہوں، جسے اس نوعیت کے "اربابِ صلاح" نقوی برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ افسوس!

مہرم رازِ بہانِ روزگارم کردہ اند  
تا بحرِ گمشدہ ہند خلقِ خوارم کردہ اند

## حکومت ہند کے دہشتناک قیدی

اب جب کہ ان سیاسی قیدیوں کی رہائی کی جانب ہماری توجہ بجا طور سے منسلک ہو چکی ہے جو انفرادی و ذاتی طور سے دہشت انگیزی و سازش کے ترک کر دینے، اور کانگریس کے اصول حق و آزادی و عدم اشتداد کے قبول کر لینے کا اعلان کر چکے ہیں، تو اس موقع پر ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ اس سلسلے میں ہم ہندوستانی جیلوں کے ان دیگر اسیروں کو بھی نظر انداز نہ کریں جن کی زندگیوں پر حکومت کی دہشتناک واقعات سے وہ توڑتی نظر آ رہی ہیں۔ آئے دن کی جھوک بڑھتا ہوا ہے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہندوستانی قیدیوں کے حالات کس بے پایاں دہشتناک ناقابل برداشت ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی اس تمام ہلک کو جو اخبار مبینی کا ذوق رکھتی ہے، نہایت ہی فتن کے ساتھ ان دہشتناک امور کا عم ہو چکا ہے جو جیلوں کے عمال اور پولیس کے افراد کے ہاتھوں جیلوں کی چار دیواریوں کے اندر آئے دن وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

میں آپ کو لاہور کے چیف جسٹس مسٹر جے ڈی، بنگ کے ایک فیصلے کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں چیف جسٹس نے انتہائی غلط و غضب سے بجا طور پر مغلوب ہو کر پولیس کے باب میں ایسے تیغ و تڑش الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں چیف جسٹس کی سی بلند ترین قانونی شخصیتیں اپنے وقار کے منافی خیال کر کے نہایت ہی شاذ استعمال کرتی ہیں۔

چیف جسٹس نے اپنے اس فیصلے میں ان ہولناک اور عبرت انگیز ناقابل برداشت مظالم پر پولیس کو نہایت ہی شدت کے ساتھ طعنت کی ہے جو اقربا پرور اور گھٹیا شہادت کی خاطر پولیس کے ہاتھوں بے قصور عزموں پر آئے دن ہوا کرتے ہیں۔

ایسی طرح چیف جسٹس ہائیکورٹ پٹنے نے بھی آرڈر کے ایک مقدمے پر نہایت ہی تیغ و تڑش الفاظ میں تبصرہ کیا ہے، جسے پولیس نے انتہائی غلط بیانی سے کام لے کر عدالت میں پیش کیا، اور عدالت کو گمراہ کر کے ایک نہایت ہی غلط فیصلہ حاصل کر لیا تھا۔ جس کے باعث ایک شریف نوجوان کو کال دس برس تک مصائب کا شکار رہنا پڑا تھا۔ اور آخر کار ہائیکورٹ نے اس بچہ کو اس بلائے عظیم سے نجات دلائی تھی۔

ہائی کورٹوں کے ان دو تازہ تبصروں سے ان ناقابل شرح، اور ناقابل برداشت مظالم کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے، جو پولیس کے ہاتھوں بے قصور افراد پر ہوا کرتے ہیں۔ لیکن پروسیجر کے پیچھے کیا کیا ہوتا رہتا ہے۔ کس کی مجال ہے کہ وہ انہیں بیان کرنے کا تصور تمام کر سکے۔

اس سلسلے میں ریلویرینڈ، سی، الیف اینڈ ریلوڈ کا یہ بیان ہے کہ ان کے پاس ان ہندوستانی پٹروں کی تحریروں موجود ہیں جن کی سیرت پر کوئی خوردہ گہری کی بہت نہیں کر سکتا، ان تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدم تعاون کے دور جیل میں اسیروں کے ساتھ ایسے ایسے سلوک روا رکھتے جانتے تھے جنہیں زبان پر لاتے ہوئے شرم و دہشت محسوس ہوتی ہے۔ قیدیوں کے ساتھ جو انسان کی نسل سے ہیں، جانوروں اور گتوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر انہیں مارا اور ٹھکرایا جاتا تھا، اور ایسے شرمناک امور پر مجبور کیا جاتا تھا، جن کے ارتکاب سے نفس انسانی خود اپنی نظر میں ذلیل ہو جاتا ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ شائستہ و تعلیم یافتہ اور خوش تربیت افراد کو اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ہزاروں آدمیوں کے سامنے برہنہ ہوں اور سب کے رو برو دفع حاجت کریں۔

کتنے ہندوستانی افراد کو کال کوٹھڑیوں میں سٹوس دیا جاتا تھا، چلا جائیوں کے جرائم پر پٹنگا کرتے ہیں۔

اس کے بعد مسٹر اینڈ ریلوڈ ز تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی قیدیوں کے حالات معلوم کرنے کی خاطر انہوں نے جیلوں کا معائنہ کیا تھا، قیدیوں کی چار دیواریوں کے اندر سے انہوں نے قیدیوں کی وہ دردناک چہنیں خود اپنے کانوں سے سنی تھیں، جنہیں آہ نکال کر وہ فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔

یہ بات انتہائی فتن کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے کہ ہندوستانی جیلوں کا نظام سخت گہری اور انتقام پر مبنی ہے، اور قیدیوں کی اصلاح کے ہر تصور سے بڑی طرح سے پروا ہی برتی جاتی ہے جس کا یہ عبرتناک انجام ہمارے سامنے ہے کہ قیدی جب جیل سے نکلتے ہیں تو جیسے وہ داخل ہوئے تھے اس سے زیادہ بڑے انسان بن کر باہر نکلتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قیدیوں کے بعض سپرنٹنڈنٹ نہایت ہی

شریف اور نیک دل ہوتے ہیں اور ان کا دل بیتاب رہتا ہے کہ وہ اللہ کے ان قیدی بندوں کے ساتھ عدل و رحم کا ہر ممکن پرتاؤ کریں، لیکن ہندوستان کے قید خانوں کا نظام اس قدر سخت اور بے لچک واقع ہوا ہے کہ شریف سے شریف، اور رحمدل سے رحمدل سپرٹنڈنٹ کا جذبہ شرافت و ولولہ حرمت بھی دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

کیا حکومت اس مختصر سے نوٹ پر توجہ مبذول فرمانے کی زحمت گوارا کرے گی؟ کیا ہندوستان کی ہلک اس سسٹم پر حکومت کو متوجہ کرنے کی خاطر ہاٹ پاؤں ہٹائے گی؟

اگر محض امکان کا سوال ہے تو میں اس امکان کو تو مان لوں گا کہ ہندوستان کی حکومت ممکن ہے اس سسٹم پر توجہ مبذول کرے، لیکن میں اسے کسی حالت میں بھی ماننے کو تیار نہیں کہ ہندوستانی ہلک اس سسٹم پر دو ٹوٹ بھی غور کرنے کی تکلیف گوارا کر سکے گی۔

”ہندوستانی ہلک“ ہندوستانی ہلک یہ ہندوستانی ہلک ہے کیا جا؟ کیا یہ انسانوں کا مجموعہ ہے؟ کیا واقعی یہ انسانوں کا مجموعہ ہے؟

اگر گلے بلبے پر لڑنے والے، مسخروں پر جھگڑنے والے، محترم ہولی پر پیٹرے بدلنے والے، چٹیلوں، داڑھیوں پر گتھم گتھا کرنے والے، لوٹوں اور ٹیٹوں پر ناچنے والے، بندروں اور بوروں کو مسخروں ماننے والے، عوسل اور قوانین میں ستر کئے والے اور ڈنار و نسج پر ایک دوسرے کا خون بہانے والے انسان کہے جانے کے مستحق ہیں، تو پھر ہلک ہندوستانی ہلک شیل ہے انسانوں کے گروہ پر — اور اگر ایسا نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے تو کیا ان انسانوں میں حیوانوں، حیوانوں نہیں، بلکہ درندوں سے کوئی یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی خاطر قربانی تو بڑی چیز ہے، ایک ذرا سچا جنبش بھی کر سکیں گے۔

”ہلک کی بھلائی کے لئے جنبش کرنا تو درکنار، یہ گروہ اگر ملک کی بربادی کے منصوبوں سے بات اٹھائے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے۔

کیا آپ نے اد آیاد، بنارس اور حقار کے ہنگاموں کا حال نہیں سنا؟ کیا آپ نے چار یار و پنجین کی آنکھوں کے تاروں کی لکھنؤ شریف میں خورز پیا نہیں دیکھی؟ —

ان حرکتوں کو دیکھ کر کبھی تو ہنسی آتی ہے اور کبھی رونا، اور کبھی

کبھی نہ تو ہنسی ہی آتی ہے نہ رونا، بلکہ اس قدر غصہ آتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ان تمام شریروں کو ایک میدان میں جمع کر کے سب کے سر بیک جنبش نشیر اڑا دوں۔ مگر کیا کروں، قہر و دلش بر جان درویش۔

لوگ کہیں گے جوش نے پھر سخت اور درشت ہے سب سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ جی ہاں جوش کو اقرار ہے کہ اس نے پھر تلخ و درشت لہجہ اختیار کیا ہے۔ مگر وہ ایسا کرنے پر مجبور اور سخت مجبور ہے، اس کے ہوملن اسے دیوانہ بنائے دیتے ہیں دیوانہ۔ اگر وہ ہندوستان کے اس پاگل خانے کا مرت ایک ہفتے کے لئے آمر بنا دیا جائے تو وہ دکھا دے کہ ہندوستان کو مذہب کی آڑ میں شرارت کرنے والوں کے ناپاک وجود سے بس حیرتناک سرعت کے ساتھ پاک کیا جاسکتا ہے۔

یہ اشرا، رشددہدایت اور غلط و غلطین سے ہرگز راہ راست نہیں آسکتے۔ ان کے واسطے تو خاں دار درویش اور جہر دار تلواروں کی ضرورت ہے۔

مگر

غلامی سے انسان مجبور ہے  
زمین سخت ہے، آسمان دور ہے

کاش اس حقیقت کو تو محسوس کر سکے کہ اگر تیری سب تنائیں پوری ہو جائیں تو دنیا تجھے کس قدر قابل نفرت سمجھے گے۔  
جب میں دیکھتا ہوں کہ مساوات کے طریقے بدل رہے ہیں تو انسان ہونا یہ فخر میرے دم میں دم توڑنے لگتا ہے۔

مشاعروں کی عین ٹکڑوں سے عوام پہرہ اندوز نہیں ہوتے جس کے پاس دور بین نہیں، ہر ایک چیزیں کیونکر دیکھ سکتا ہے۔

اشتمالہائے شہرت میں بہت سے لوگ کام کرنے والوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں جس طرح چپے ہوئے موٹر پر چڑھ کر کبھی اور دیکھنے والوں پر یہ ثابت کرے کہ پیوں سے جو اس درجہ گرد آڑ رہی ہے وہ میں ہی آڑ رہی ہوں۔

ہم نے خواب میں دوستی کی، خواب ہی میں دشمنی، خواب میں پیدا ہوئے اور خواب ہی میں مر گئے، خواب ہی میں شادی کی، خواب ہی میں غم یہ ہے دنیا، اس کی ابتدا اور انتہا۔

# رباعیاتِ جوش

اپنی ہی غرض ہے جی رہے ہیں جو لوگ  
اپنی ہی عیبائیں سی رہے ہیں جو لوگ  
ان کو بھی ہے کیا سراب پیسے گریز  
انسان کا خون پی رہے ہیں جو لوگ

حق کا ہو عروج، ہر ولی چاہتا ہے  
باطل مٹ جائے، ہر ہی چاہتا ہے  
کیون یہ بزرگوار جو چاہتے ہیں  
کیا قادرِ مطلق بھی وہی چاہتا ہے

بہل ہے مرے لئے نصابِ زردیم  
محل ہے مجھے سلطنتِ قلبِ سلیم  
کتنی ہے لگا ہوں میں جو افاق و حیات  
میری ہی ہے وہ صبرِ گاہِ غلیم

نہ تاب کی غم سے گلستاں ہے شیریں  
پہلو میں چلی رہا ہے اک ماہِ حسیں  
کری ہے براق لے لے آیا ہے کیون؟  
کہہ دو کہ لپٹ جائے، مجھے وقت نہیں

# شاعر کا ایثار

شجے خبر بھی ہے ہندوستان! کہ تیرے لئے      عمل پسند ہے غفلت شعار تھا جو شخص  
 رواں ہے وار و رسن کی طرف تری جانب      اسیر ملکہ گیسوئے یار تھا جو شخص  
 وہ آج لوکِ سناں کا ہے والہ و شیدا      ہلاکِ طرۂ زلفِ نگار تھا جو شخص  
 بنا ہوا ہے گدائے رہِ نگارِ دماغ      دیارِ دل کا کبھی شہرِ یار تھا جو شخص  
 وہ آج تیغِ رواں کا ہے ہمدِ دوساز      رفیقِ سرِ دل جو یار تھا جو شخص  
 وہ آج طنطنہٴ قبلِ جنگ کا ہے امین      انیسِ زمزمۂ آبشار تھا جو شخص  
 شعاعِ ہر خزاں سے ہے آج گرمِ کلام      خلیبِ منبرِ ابر بہار تھا جو شخص  
 وہ آج مصر و خورشید سے ہے گرمِ ستیز      نسیمِ پیشہ و شبنمِ شعار تھا جو شخص

وہ آج صاعقہ بر دوشِ وکیلِ برکف ہے

سمنِ بدست و چمنِ درکنار تھا جو شخص

جوشِ ملیح آبادی

# جاپان کی سبق آموز کہانیاں

مترجمہ محمود علی خاں اجاڑی بانی

## وزیر کی وطن پرستی

میں اپنے اُن بھائیوں کی ہدایت کے لئے جو سفر بی فیشن اور انگریزی رسم و رواج کی تقلید پر فخر کرتے ہیں ایک جاپانی وزیر کی وطن پرستی کا واقعہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

جاپان میں کثرت سے بچے اپنے باپ اور ماں کو تو سان ادا کرتے ہیں مگر پاپا اور ماما کہنے لگے ہیں، جی کہ اب یہ چیز لوگوں کی نظروں میں کھٹکنے لگی ہے، اس کے سب سے بڑے مخالف ماسٹر مٹ سودا وں پر ہیں جو خصوصیت سے اس کے انداد کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ جاپانی زبان کے ایک اخبار میں آپ تحریر فرماتے ہیں۔

”وزیر تعلیم کو تعلیمات کے سلسلے میں خواہ کچھ بھی اختیارات حاصل ہوں لیکن یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے خانگی معاملات میں بھی دخل دے۔ تاہم میں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں، میری یہ عرض خواہش ہے کہ جاپانی گھروں سے پاپا اور ماما کے الفاظ خارج ہو جائیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر جاپانی بچے اپنے والدین کو جو انتہائی احترام کے مستحق ہیں بدلتی الفاظ سے کیوں مخاطب کرتے ہیں، میں عرض سے بھی مائے رکتا ہوں اور میں نے وزیر تعلیم ہونے سے پہلے بھی اکثر اپنی تقریروں میں بار بار اس کا اعادہ کیا ہے۔

جب میں فرانس میں تھا تو لارڈ کرزن (جو اس وقت برطانیہ کے وزیر

ہوں تو جاپان کی ہر چیز سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے، اس لئے ہمارے لئے سبق آموز ہے، لیکن اس باب میں میں نے اُن بچے واقعات کو جمع کر دیا ہے جن سے میرے ہم وطنوں کو حسب الوطنی و احساس ذمہ داری، حق العبادہ اور اصلاح سیرت کا سبق مل سکتا ہے، وفتا فتنا میں یہ قصے ہندوستانی اخباروں میں شائع کراتا رہا ہوں، اب یہاں انھیں یک جا پیش کئے دیتا ہوں۔

میری دلی تمنا ہے کہ کاش ہمارے نوجوان اپنے جاپانی بھائیوں سے سبق حاصل کریں اور مادر وطن کی جانب سے اُن پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن سے پوری طرح عہدہ برابریں۔

## وطن پرست طالب علم تیار کرنا

جاپان کے افسران تعلیم کا یہ نصب العین ہے کہ وطن پرستی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ تعلیم ہونا چاہیے۔ چنانچہ طلبہ کو اڈمرل ٹوگو کے حالات زندگی بتانے کے لئے حکایت تعلیمات بنے ان کی زندگی کا ایک فلم تیار کیا ہے جس میں بکاگو شیماء کی جنگ سے لے کر اُن کے خانہ کے جلوس کے واقعات تک دکھائے گئے ہیں۔ یہ نفسی فلم ملک کے تمام پرائمری اور مڈل اسکولوں میں بھجوا جائے گا، برعکس اس کے ہندوستان میں ہمارا لگاندھی کی تصویر ہی اسکولوں میں لگانا جرم سمجھا جاتا ہے۔



جنگی جہاز تیار کیا جائے، اس طرح کے چھوٹے چھوٹے چندوں سے فوج نو بہت سے ہوائی جہاز بھی پیش کئے جانگے ہیں۔

اس واقعہ سے ہمارے لڑ جواؤں کو اندازہ کرنا چاہیے کہ اگر وہ جاپانی تو تعمیر قوم کے پروگرام میں کتنی امداد کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی روپیہ کی کمی نہیں ہے، البتہ سچے کام کرنے والوں کا قحط ہے۔ ہمارے لڑ جواں اپنے جاپانی بھائیوں کی پیروی کرنے کی کوشش کریں گے۔

### مادر وطن پر جان قربان

ادھر حکومت جاپان نے واشنگٹن کے بحری معاہدہ کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا اور اُدھر ایک جہازوں کو نیم زندگی حاصل ہوئی۔ اُس نے اپنے جہاز سے علیحدہ ہو جانے کی شرمندگی کی وجہ سے خودکشی کرنا کرنا تھا، اُس کا نام گئی چی کوئ تھا، اور یو کو سو کا اڈمیرلٹی کے ساتویں سب میرین اسکو اڈرن میں ملازم تھا، اس نے ایک اخبار میں مذکورہ بالا اعلان پڑھا اور کتشی کے پولیس تھانہ میں حاضر ہو گیا۔

اس نے بیان کیا کہ جمعرات کو میں جہاز سے اُترا، اور لو کیو کے ایک قودہ خانہ میں اپنی محو بہ سے ملنے گیا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے جا چکی ہے، اُسے بہت کچھ تلاش کیا، لیکن تمام جستجو بہ سود ثابت ہوئی، اسی تلک وہ میں جہاز پر جانے میں دیر ہو گئی۔ اس طرح بہ طرٹ سے ایوس ہو کر میں نے ملے کر لیا کہ سمندر میں کو در اپنی جان دیدوں گا۔ میں سچر کے دن ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، وہیں میں نے اخبار میں یہ اعلان پڑھا کہ حکومت نے معاہدہ واشنگٹن کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، چنانچہ مجھے فوراً موقع کی نزاکت کا احساس ہوا اور سوچا کہ مجھے بھی اپنا فریضہ انجام دینا چاہیے، اس لئے میں پولیس میں حاضر ہو گیا ہوں۔

اس پر یو کو سو کا کے دو بحری افسروں نے اسے واپس لے لیا، اب وہ صرف اس لئے زندہ ہے کہ مادر وطن پر اپنی جان قربان کر دے۔

### جاپانی پارلیمنٹ کے سولیشن ممبر

ستمبر میں بلگریڈ میں کامرس کی بین الاقوامی کانفرنس کا انیسواں اجلاس ہونے والا تھا، اس میں شرکت کے لئے جاپانی پارلیمنٹ کے پانچ ممبر روانہ ہوئے تھے، اور انہوں نے یہ ہمد کیا تھا کہ وہ اس تمام سفر میں صرف جاپانی زبان میں بات چیت کریں گے، اور جاپانی وضع کا لہجہ

خارجہ سے کسی معاملہ میں حکومت فرانس سے گفت و شنید کرنے کے لئے پیرس آئے تھے، اگرچہ وہ فرانسیسی زبان کے ماہر تھے، لیکن جب فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو پونٹکا سے سے گفتگو کرتے تھے تو برابر انگریزی بولنے لگتے، اسی طرح موسیو پونٹکا سے بھی اگرچہ انکلتان کے قدیم باشندے تھے، اور نہایت روانی سے انگریزی بول سکتے تھے، لیکن وہ بھی فرانسیسی میں بات چیت کرتے تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوم کو اپنی مادری زبان کا کتنا احترام کرنا چاہیے۔

میں خارجی ہندوب کا مخالفت نہیں ہوں، بلکہ میں جانتا ہوں کہ لوگ غیر زبانیں سیکھیں تاکہ اُن میں جو اچھائیاں ہوں وہ اختیار کر سکیں، لیکن یا پاپا اور ماما جیسے بدیشی الفاظ اختیار کرنے سے کیا فائدہ ہے، یا عورتوں کو بال ٹٹلنے، مغربی لباس پہننے اور اُن کے رگوں و رواج کی پیروی کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے، مجھے تو عورتوں کے لئے ہوسے بالوں اور مغربی لباس میں کوئی حسن نظر نہیں آتا۔

دیر تعلیم خانی زندگی میں ان الفاظ کے استعمال کے اتنے شدید مخالفت ہیں کہ بقول پن ڈمپو اخبار رسالہ آکھنسی اور عنقریب یہ آیات جاری کرنے والے ہیں کہ پرائمری مدارس اور کٹنگ گارڈن کلاس میں کوئی بچہ یہ الفاظ استعمال نہ کرے، نیز والدین سے بھی وہ یہ درخواست کریں گے کہ گھروں پر بھی اپنے بچوں کو یا پاپا اور ماما کہنے سے روکیں، وزیر موصوف کا یہ عقیدہ ہے کہ ان الفاظ کا غیر ممالک میں خواہ کچھ ہی مفہوم کیوں نہ ہو لیکن جاپان میں ان کے استعمال کرنے سے والدین اور بچوں کے رواجی تعلقات پر ناگوار اثر پڑتا ہے، اور اُن میں محبت کم ہوتی جاتی ہے۔

### دھیلے کا حبسگی جہاز

جاپان وطن پرستی میں لاشافی ہے، وہاں آئے دن ایسی تجویزیں سننے میں آتی رہتی ہیں جن کے ذریعے سے عوام کی وطن پرستی سے فائدہ اٹھا کر مستقبل کو درخشاں بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، چنانچہ تازہ ترین کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ تازہ ترین کوشش دھیلے روز کی تجویز ہے، جسے اوسا کا کے ایک سابق جہازمان ٹرٹریو کو مارو ہنایا نے شروع کیا ہے، بہت سے سابق جہازوں اور لڑ جواؤں کی انجمنوں کے اراکین اس میں شریک ہیں، ہر شخص کو دھیلے روز دینا ہوتا ہے، تاکہ اس رقم سے قومی

پہنیں گے۔

مسٹر اکا کو سا کا موتو بھی اس وفد کے ایک رکن تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ سفر محض وطن پرستی کے جذبہ پر منحصر ہے۔ میں نے سوچا کہ جاپانی زبان میں تقریریں کروں گا، اور بہت زور زور سے بولوں گا، کیوں کہ باہر والے اُسی وقت متاثر ہوتے ہیں جب کوئی خوب چلا چلا کر تقریر کرے۔ میں جاپانی کشتی کا بھی ماہر ہوں، اس لئے کہ لاپاشا، تسیو، یعنی اورنگ پٹیکے سامنے اس کے کرتب دکھاؤں گا۔ جاپان کو ان کانفرنسوں میں کہنا ہی کیا ہے، ہم تو جاپان کی خاص خاص چیزوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے جا رہے ہیں، ہم اپنے معزنی ہار کے کپڑے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن عروفت اس وقت نہیں گئے جب جاپانی کپڑے کی غریباں پیش کرنا ہوں گی، ہمارے کپڑوں سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ جاپانی ریشم کتنا اعلیٰ ہو سکتا ہے، ہمیں امید ہے کہ ہماری اس ترکیب سے جاپانی مال کی مانگ بڑھ جائے گی۔

خون سے رنگا ہوا جھنڈا

جاپانیوں کی انتہائی وطن پرستی کی ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ ایک برس سالہ نوجوان آسا کو سا کے پولیس تھانے میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میں نے ایک جاپانی جھنڈا خرید لیا ہے، اور اسے منہج کو میں متعینہ رہا ہوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، اس کے علاوہ اس نے ایک روپیہ بھی چندے میں دیا۔

یہ نوجوان ایک تصاب کی دوکان پر ملازم تھا، اس نے اپنی انگلی کاٹ کر اپنے وطن سے جاپان کا آفتابی جھنڈا اپنا لیا تھا، چونکہ اسے خود سپاہی کی حیثیت سے بھرتی نہیں کیا گیا تھا، اس لئے اس نے سوچا کہ جس سپاہی رہاں گئے ہیں ان کی اس طرح ہمت افزائی کرنا چاہیے۔

ہمارے یہاں بھی ہر فرد میں وطن پرستی کا یہی جذبہ ہونا چاہیے جب کہیں ہم یہ امید کر سکیں گے کہ خواب آزادی کی تعبیر پوری ہوگی، خدا ہیں اس کی توفیق عطا کرے۔

تختہ دار پر سے وصیت لاش بھی وطن کی نذر  
جاپانی وطن پرستی کی ایک اور عجیب و غریب مثال ملاحظہ کیجئے، یہ کہنے کے ایک قابل تختہ دار پر سے وصیت کر رہا ہے کہ میری لاش سے فوج استفادہ کرے، اس شخص کا نام تکیبے تھا، اور عمر تیس سال تھی، ایک ٹکسی

ڈرائیور کے قتل کے سلسلے میں اسے پھانسی کا حکم ہوا تھا، عدالت عالیہ نے اس کی اپیل نامنظور کر دی تھی، اس لئے اچھی لگایا جیل میں اس نے اپنے باپ کو وصیت کی کہ میری لاش یونیورسٹی کے اسپتال میں دے دی جائے اور وہاں سے جو رقم ملے وہ فوج کو پیش کر دی جائے، میں اپنے آخری وقت میں ملک کی اور کیا خدمت کر سکتا ہوں، بجز اس کے کہ میری لاش سے فوجی فائدہ میں کچھ اضافہ ہو جائے۔

جاپان کی ترقی کا یہی راز ہے، نہ کہ صرف شرح بلکہ کی کمی، جیسا کہ ہندوستان میں بھی سمجھایا جاتا ہے۔

وطن پرست طلباء کے کارنامے

ہمیں مدرسین اور طلباء کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے، کہ جاپان کے پرائمری مدارس کے طلباء کس طرح قومی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ لڑکے روزی چیزوں مثلاً استعمال شدہ بوتلوں، پرائے اخباروں وغیرہ کو بیچ کر رقم جمع کرتے ہیں کہ قومی ہوائی جہاز کے لئے چندہ دیں۔ اس سلسلے میں ایک جاپانی اخبار رقم طراز ہے،

سال گزشتہ سے ٹوکیو آؤڈینس یونین شاہی فوج کے لئے چندہ جمع کر رہی ہے، ٹوکیو کے ادبی حلقے نے اس سلسلے میں خاص کوشش کی، ان کا یہ کارنامہ قابل صد آفرین ہے۔

اس حلقے کے نوجوانوں نے فوج کو ایک ہوائی جہاز پیش کیا ہے، اور وہ اس طرح کہ پرائمری مدارس کے طلباء نے خالی بوتلیں اور پرائے اخبار جمع کر کے فروخت کئے، ایسی ہی اور سینکڑوں معمولی معمولی ترکیبوں سے یہ کثیر رقم اکٹھا کی، پھر اس رقم سے ہوائی جہاز خرید کر فوج کو پیش کیا۔ کیا ہمارے نوجوان اس طرح کے قومی کاموں کے لئے روپیہ جمع نہیں کر سکتے؟ بیشک کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کے استاد اور نوجوانوں کے نام ہندو لیڈران کی رہبری کریں۔ لیکن یہ لوگ تو صرف جلسے کرنا اور طویل بیان شائع کرنا جانتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جو رسی میں زور شور سے بحث مباحثے کر لینے سے ان کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔

پروفیسروں کو وطن پرستی کی ہدایت

ہندوستان کی طرح جاپان کے طلباء غداہ وطن پر و فیسروں کی حرکت کو برداشت نہیں کرتے، مثلاً ایک قصہ سنئے۔

۔ ڈاکٹر ایس بی یو نیورسٹی کے پروفیسر کدوسو کامی بھادوانے لگے کوچی بڑے رسالہ میں ایک مضمون معاہدہ دستخط کی منہج اور اس کے نتائج کے عنوان سے شائع کرایا، اس میں انہوں نے حکومت کے رویہ پر انتہائی نکتہ چینی کی تھی، اس مضمون کو پڑھ کر ان کے دونوں جوان طالب علم اتنے مشتعل ہوئے کہ انہوں نے اپنے پروفیسر کو ایک خط لکھا اور ان سے مطالبہ کیا کہ استغفی داخل کر دیں۔

ایک دن وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے، یہ دونوں نوجوان ان کے گھر پہنچے۔ اس خط کو بآواز بلند وہاں پڑھا، انہیں نڈار وغیرہ کہا اور تمام کتابیں، کرسیاں، میزبائٹ کھینچ آئے، اس کے بعد جب وہ گرفتار ہوئے تو انہوں نے پولیس کے سامنے اقبال کیا اور کہا کہ تخفیف اسلحہ کالفرنس کے معاملہ میں پروفیسر کامی بھادوا کی رائے بنایت ناقص اور کمزور تھی، اس لئے ہم نے ایسا کیا،

اس کے مقابلے میں ذرا ہندوستان کو دیکھئے جہاں استاد اپنے طالب علموں کی جاسوسی کرتے ہیں، اور ان عذرات کے عوض میں خطاب پاتے ہیں۔

### چندہ جمع کرنے کی تدبیریں

ہمارے کارکنوں کو کسی قومی کام کے لئے چندہ جمع کرنا ایک مصیبت معلوم ہوتا ہے، انہیں دیکھنا چاہیے کہ جاپان والے اس کے لئے کیا تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ گراموفون کے تاجروں کی آکھن، شاہی فوج کے لئے کچھ چندہ دینا چاہتی تھی، چنانچہ اس نے ملے کیا کہ تمام ریکارڈوں پر ایک سرخ ہیر لگا دی جائے اور ان ریکارڈوں پر ایک دھبلا زیادہ لیا جائے، اس طرح تین ماہ میں جو رقم جمع ہو وہ کسی قومی کام کے لئے دے دی جائے۔

اگر جاری تجارتی انجینس بھی قومی کاموں کے لئے اسی طرح چندہ جمع کرنے کی کوشش کریں تو بغیر کسی جدوجہد اور مطالبہ کے لاکھوں روپیہ جمع ہو جائیں، مثلاً اگر ایک روپیہ کی کسی چیز پر وہ ایک پیسہ زیادہ لینے لگیں تو لاکھوں کو بھی گراں نہ گزرے اور کافی روپیہ جمع بھی ہو جائے۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ تاجروں کی تسلیم کی جائے، اور انہیں اس قسم کے اقدام کے لئے آمادہ کیا جائے۔

### عرصی پر خون سے دستخط

جاپان میں انقلاب پسندوں کی دہر دست جماعتیں ہیں، اور عوام

میں ان کا بہت بڑا اثر ہے۔ یہ لوگ اکثر ان وزراء کو قتل کر دیا کرتے ہیں جن سے ذرا بھی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے، حال ہی میں ایک سابق وزیر تعلیم کے قتل کی سازش کے سلسلے میں بعض انقلاب پسندوں پر مقدمہ چلا تھا، اس موقع پر سارے ملک نے یہ مطالبہ کیا کہ چونکہ ملازموں کی نیت خراب نہ تھی، اور انہوں نے حسب ادنیٰ کے جذبہ کے ماتحت یہ فعل کیا اس لئے انہیں سخت سزا نہ ہونا چاہیے، ہزاروں آدمیوں نے اس قسم کی تحریریں درخواست عدالت میں پیش کیں، چنانچہ بقول ایک اخبار کے ایک درخواست یگ جاپان لیگ کے تین سوارا کین نے اپنے خون سے دستخط کر کے پیش کی اور یہ مطالبہ کیا کہ اس سٹی کے مقدمہ سازش کے ملازمین کو فوراً بری کر دیا جائے، یہ دستخط لیگ کے نمائندے سرگئی جی اچی جی سے مشرنا دسا دھار دوبرقان کو خود پیش کی اور بتلایا کہ لیگ کے جلسہ علم میں یہ درخواست گذرانا منظور کیا گیا ہے، چنانچہ ججوں نے ملازموں کو بہت سزا نہیں دینے پر اکتفا کیا، اگر ہندوستان میں ایسی کوئی درخواست پیش کی جاتی تو سب کے سب دستخط کرنے والے فوراً گرفتار کر لئے جاتے، اور مقدمہ چلائے بغیر انہیں نظر بند کر دیا جاتا، لیکن جاپان میں ایسے لوگوں کی اور زیادہ عزت ہوتی ہے۔

### مغربیت کو دور سے سلام

جاپان میں قومیت کا دور دورہ ہے، جس طرح ہٹلر تمام غیر آریں الفاظ کو جرمنی سے خارج کرنے کی کوشش کر رہا ہے اسی طرح جاپان بھی اپنے یہاں مغربیت کو دفن کرنے کی فکر میں ہے، اکثر اخباروں اور تاجروں نے لفظ "جاپان" کا استعمال ترک کر دیا ہے، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ بدیشی نام ہے اس کے بجائے وہ "ہین" استعمال کرتے ہیں۔

احیائے قومی کی تحریک کے ساتھ ساتھ تمام پہاڑوں اور ندیوں کے بھی نئے جاپانی نام رکھے جا رہے ہیں۔ اخبار سچی سچی نے اپنے وہی پرائس ایجے نام کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جسے پڑھ کر ہمارے ان ہندوؤں کی آنکھیں کھل جانا چاہئیں جو مغربی اصطلاحات کی اندھا دھند تقلید کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے

مہ ہین سنکرت کا لفظ ہے جس کا مطلب طاقتور ہے۔

رکتے ہیں۔ یہ تجویز خود پولیس انسپکٹر کے شیر و شیمانے پیش کی تھی، جو اس متاد کا انصرامی ہے۔

ذرا اس کا مقابلہ اپنے یہاں کے پولیس والوں سے کیجئے اور دیکھئے کہ ان کا رویہ بے گن ہوں گے ساتھ کیسا ہوتا ہے۔

### انگریزی کا بائیکاٹ

مشرقت سودا و زر تعلیم پاپا اور مانا کے استعمال کو روکنے کی امکانی کوشش کر رہے ہیں، اسوں نے اعلان کیا ہے کہ اس مسئلہ میں انہیں دو سو سے زیادہ خطوط موصول ہوئے جن میں سے صرف ۲۲ خط اس تجویز کی مخالفت میں تھے، ان کا کہنا ہے کہ مسئلہ کے زلزلہ سے پہلے گنر با دار میں انگریزی سائن بورڈ بہت زیادہ تھے۔ لیکن اب بہت کم نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وزیروں کی مشین گونی ہے کہ مغرب وہ زمانہ آئے گا جب جا پانی گھروں میں پاپا اور مانا کے الفاظ بھی سننے میں نہ آئیں گے۔

جاپان نہایت سرعت سے انگریزی الفاظ اور انگریزی عادات و اطوار چھوڑ رہا ہے، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان انہیں اختیار کر رہا ہے۔ ہندوستان میں اتنی فیصدی دوکاندار حتیٰ کو نائی اور دعویٰ تک جو انگریزی کے حرف آشنا بھی نہیں ہوتے انگریزی ہی کے سائن بورڈ لگاتے ہیں۔

### ہندوستانی امرا کے لئے سبق

ڈاکٹر کاسے مسو (پروفیسر کنسٹیوٹور سٹی) کے واقعہ سے ان کی بہت کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے پرانے اسکول سے کتنی محبت تھی۔ انہوں نے سوتے موراکے پر آخری مدرسے کی عمارت کے لئے جہاں انہوں نے بچپن میں تعلیم پائی تھی، دس ہزار تین روپے لیکن یہ رقم دے کر بھی ان کے دل کو سیری نہ ہوئی، اور خاموشی سے مزدور کی طرح خود عمارت کا کام کرنے لگے، شروع شروع میں انہیں کسی نے نہ پہچانا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کون شخص تھا، دراصل وہ روپیہ سے مدد کرنے کے علاوہ اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے اسکول کا کچھ کام کرنا چاہتے تھے، کیونکہ انہیں یہاں کی تعلیم پر نادم تھا۔

دوسری مثال سنئے، جاپان کے دوسرے برادرہ فرمون یعنی تسوئی اور تسوئی نے جاپان کے قلعہ وہ لوگوں کے لئے ساتھ ساتھ لاطین دینے، اور

مثیل پارک کمیشن نے حال ہی میں یہ طے کیا ہے کہ جا پانی ایلیٹ کو جا پانی زبان میں مرکزی سلسلہ کوہ کہنا چاہیے بدیشی لفظ ایلیٹ کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا جائے۔ یہ وہ نیک کام ہے جو آج سے بہت پہلے ہونا چاہیے تھا، جب ہم اپنے پہاڑ کا نام اپنی زبان میں رکھ سکتے ہیں تو ہمیں اس نام کے اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے، جو کسی غیر ملی سیاست نے رکھ دیا ہو، عام طور پر فیشن سا ہو گیا ہے کہ اپنی تفریح گاہوں اور مشہور مقامات کو بیرونی چیزوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ایلیٹ نام بھی اختیار کر لیا گیا۔ بعض جا پانی ادسا کا کو مشرق کا پختہ پختہ ہیں، اسی طرح بعض ندیوں کو جا پانی رائن یا جا پانی ڈینیوب کا خطاب دیتے ہیں اور ساحلی گرم چٹوں کو جا پانی ٹاپولی بار پور کہتے ہیں، حیرت ہے کہ کسی نے سوچا اندھی کو ڈیکو کی ٹیمس کیوں نہیں کہا؟

بہر حال اب اس سیلان کی سختی سے مخالفت ہو رہی ہے اور اس مخالفت کا کچھ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے، ہمیں اپنی چیزوں کے نام اپنے طور پر اپنی ہی زبان میں لینا چاہیے۔ الگسٹی کا لفظ بین الاقوامی طور پر مشہور ہے۔ لیکن اسے ادا کرتے وقت زبان دس بارہ قلابازیاں کھاتی ہے، نازیوں نے اس کے بجائے جرمن زبان کا لفظ برن اختیار کر لیا ہے، جس کا مفہوم برق یا کبر ہے۔ ہمیں اس جذبہ کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے جس کے تحت وہ بدیشی الفاظ خارج اور آریں الفاظ اختیار کر رہے ہیں۔ البتہ اگر شدید ضرورت مجبور کرے تو بدیشی الفاظ کو اپنی زبان کے بارے میں ڈھال کر استعمال کرنا چاہیے، محض جھوٹا علمی وقار قائم کرنے اور خواہ مخواہ رعب ڈالنے کے لئے بدیشی الفاظ عدا استعمال کرنا تو ہی جرم ہے۔

### پولیس والوں کی قربانیاں

جاپان کے پولیس والوں میں بھی قربانی کا جذبہ پایا جاتا ہے، وہ غریبوں، محتاجوں اور مظلوموں کی دل کھول کر امداد کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے مزدوریت مند ہم وطنوں کی خدمت کے لئے اپنے خون سے بھی دریغ نہیں کرتے، ادگی باشی تھانہ کے علاقہ میں اکثر ہسپتالوں میں ایسے مریض آ جاتے تھے جن کے جسم میں فوڈا بیرونی خون داخل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اور چونکہ ہر مریض کے لئے ایک خاص ختم کا خون درکار ہوتا ہے، اس لئے وہاں کے ڈاکٹر پولیس والوں کا پیسے سے استمان کر کے ان کے طون کے نوٹوں

وزیر خارجہ کو اس کا اختیار دیا کہ جس طرح چاہیں اس رقم کو خرچ کریں، وزیر موصوف نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے فوراً اپنے محلہ کی ایک کانفرنس طلب کی چنانچہ امید ہے کہ عنقریب مزید امدادی فنڈ جمع کیا جائے گا۔

ہندوستان میں جاپان کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں لکھ پتی موجود ہیں، ان واقعات سے انھیں سبق سیکھنا چاہیے، دیکھئے ہمارے یہاں سکھ ہندوستان سے پنہاں کرنے پر دالہ سرائے کا زلزلہ فنڈ بہ ہزار دقت چچاں لاکھ روپیہ تک پہنچ سکا تھا، حالانکہ اس میں دالبان ریاست اور لکھ پتی سب شامل تھے، لیکن جاپان کے صرف دو شخصوں نے ۱۰ لاکھ روپے دے ڈالے۔ یہ ہے جاپان کی ترقی کا ایک ماز، اس لئے اسے ہندوستانی لکھ پتیو! تم بھی بیدار ہو اور اپنی تنگیوں کے منہ کھول دو۔

### ایک بیوہ کی وطن پرستی

جاپان کی عورتیں بھی کتنی بلند حوصلہ ہوتی ہیں، انھیں دیکھ کر ہندوستان کی بہادر راجپوت عورتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جن کے کارنامے تاریخ داں حضرات پر اچھی طرح روشن ہیں۔

ٹوکیو میں ایک بیوہ عورت خاور کی حیثیت سے کام کیا کرتی تھی اس نے ایک ہزار روپے کے کپڑے برتن وغیرہ ان سپاہیوں کے لئے پیش کئے جو جاپان کے باہر مبعور تھے، اس عورت کا نام مسٹر ہنا بونکیو تہ، اور عمر ۱۰ سال تھی، یہ ٹوکیو میں ایک دو اسٹور موٹو کچی کیتا کے یہاں کام کرتی تھی۔ جب اُس نے اخباروں میں پڑھا کہ جی جی کوہ کا ایک شخص پرائیوٹ کوہا رانچو یا میں سخت زخمی ہوا ہے، تو پہلے اس نے ضروری سامان کا ایک سٹ اسے روانہ کیا، اس کے بعد وہ مختلف مواقع پر بخیریا کے سپاہیوں کو تحائف بھیجتی رہی، ایک مرتبہ اسے معلوم ہوا کہ ٹوکیو سے ایک سپاہی یوسوئی نامی واپس آیا ہے اور اُسے کاروبار کے لئے کچھ روپیہ کی ضرورت ہے فوراً اس نے دوسو روپے دے کر اسے چادل کا بیوہ پار کرادیا، اس کا ایک دور کا رشتہ دار پوتوئن انجینئرنگ کوہ میں ملازم تھا، ایک موقع پر جب اس کوہ کے تقریباً بیس شخص ٹوکیو بھیجے گئے تو اس نے سب کے قیام و طعام کا انتظام کیا تھا۔ یہ عورت کچھ روپیہ کی بیوہ تھی، کبھی امپیریل مینا بیوہ میں ملازم تھا، اسے بیوہ ہونے کی بارہ برس کا عرصہ ہو چکا تھا، اس کے چھ اولادیں ہوئی تھیں۔ لیکن سب کی سب مر چکی تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے ہر بچہ کی برسی کے موقع پر یہ سامان بھیجا کرتی تھی۔

اور کتنی مٹی کہ میرے کوئی لڑکا نہیں رہا جو ملک کی خدمت کرتا۔ اس لئے جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں ہی ان کی روحوں کی طرف سے ملک کی خدمت انجام دیتی ہوں۔ اس کے پاس بھی جی، ادا کیا اور دوسری رجمنٹوں اور مختلف افراد کے پیسے ہوئے، آئٹھ سو شکر کے خطوط موجود تھے، ایک ملاقات کے دوران میں اس نے اخبار کے نمائندے سے کہا کہ چونکہ میرے نام لڑکے ملک کی خدمت کے بغیر مر گئے۔ اس لئے جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں ہی کرتی رہتی ہوں۔ محنت مز دوری سے جو کچھ میں پیدا کرتی ہوں اس میں سے کچھ اپنی انداز کر کے اُن سپاہیوں کے لئے کچھ نہ کچھ خرید لیا کرتی ہوں جو ٹوکیو سے سرحد ملک میں تھیں ہیں۔

آج ہیں بھی ایسی ہی وطن پرست عورتوں کی ضرورت ہے۔

### جاپان کی نجات دہندہ

جاپان کی سماجی اور امدادی سرگرمیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کی عورتیں نہایت مستعد، وطن پرست اور قربانی کرنے والی ہیں۔ اور حکومت بھی رفاد عام کے تمام کاموں میں اُن کی مدد کرتی ہے۔

جب جاپان میں قحط پڑا تو ٹوکیو کے روزگار مہیا کرنے والے دفتر نے ایسے ہزار خاندانوں کی فہرست تیار کی تھی جو قحط زدہ علاقے کی کم از کم ایک لڑکی کو ملازم رکھ لیں۔ تاکہ اُن کے والدین روپیہ کی خاطر انھیں پیشہ کرنے کے لئے جھگڑ میں نہ بھیج دیں۔ اسی طرح عورتوں کی انجمن قحط زدہ کاشتکاروں کو سونے تک اس وعدہ پر قرض دیتی تھیں کہ وہ اپنی لڑکیوں کی جائز آمدنی میں سے رفتہ رفتہ ادا کر دیں۔

ہندوستان میں تو لڑکیاں اپنے والدین کے لئے ایک بار ہوتی ہیں لیکن جاپان میں وہ اپنے خاندان کی نجات دہندہ تصور کی جاتی ہیں۔

### گمراہ بیہنوں کی امداد

جاپان کی عورتیں اپنی گمراہ بیہنوں کی امداد کے لئے جو کچھ روپیہ ہیں اُن سے انڈین دومنزلنگ کو سبق حاصل کرنا چاہیے، ان کی ایک ایسی انجمن ہے جو طوائفوں کو راہ راست پر لانے کی خدمت انجام دیتی ہے، مختلف زنانہ جماعتوں کی نگرانی میں یہ کوششیں بھی جاری ہے کہ جو لڑکیاں طوائفوں کا پیشہ اختیار کرنے والی ہوں اُن کو اس سے باز رکھنے کی عملی تدابیر کی جائیں، یعنی عورتوں کو لمبی اور قانونی امداد بھی پہنچائی جائے، ایک جانب

سے کیوں نہیں بچاتیں؟

### عہدہ داروں کو نصیحت

جایان کے وزیراعظم نے اپنے عہدہ داروں کو چند ہدایات دی تھیں جو ہندوستان کی ارباب حکومت پر بھی یکساں صادق آسکتی ہیں، اس لئے ہم ذیل میں ان کا اقتباس درج کرتے ہیں۔

”قومی استحکام کے لئے عدل و انصاف کو برقرار رکھنے کے نہایت ضروری ہے کہ سرکاری افسروں میں سخت ڈسپلن قائم رہے۔ اس چیز کے پیش نظر افسروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے فرائض نہایت دیانتداری سے انجام دیں، اپنے حکام بالا کے احکام کی تعمیل کریں، اپنے تمام اعمال و افعال میں خیر جانب داری اور انصاف سے کام لیں، ذاتی اغراض کو کبھی دخل نہ دینے دیں، کوئی ناجائز اثر قبول نہ کریں، اور ذاتی سے بالا تر رہیں، شرافت اور انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں اپنے فرائض نہایت تہہ ہی سے انجام دینا چاہئیں، خصوصاً آج کل جب کہ حالات پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جذبات میں ایک عام بھجان و انتشار پایا جاتا ہے، افسروں کو اپنے طرز عمل میں زیادہ محتاط رہنا چاہئے اور اس کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے کہ سرکاری ڈسپلن قائم رکھنے کے سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا نہ ہونے پائیں۔“

تمام افسروں کو اپنے اپنے کام میں قابلیت پیدا کرنے اور معلومات حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ رفتار زمانہ کا اچھی طرح مٹا لہ کرتے رہنا چاہئے۔ اور وقت کے تقاضے اور زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے کی انتہائی کوشش کرنا چاہئے۔ غرضیکہ یہ چیز نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ انھیں زمانے کے دوش بدوش اور وقت کے قدم بقدم چلنا ہے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمانہ بہت آگے نکل جائے اور ملک و قوم پیچھے رہ جائیں۔ نظام حکومت کی روز افزوں پیچیدگیوں کی وجہ سے حکام کے امتیازات میں اضافہ ہو رہا ہے جس سے یہ امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ ان میں اختلاف آ رہا ہو جائے۔ یا کام میں تاخیر واقع ہو۔ اس لئے افسروں کو چاہئے کہ ہر معاملہ میں سنجیدگی اور وسیع النظری سے کام لیں، اور اتحاد عمل کے لئے کوشاں رہیں۔

افسروں کا یہ فرض ہے کہ دل و جان سے رفاہ عام کے کاموں کی

ان کے خاندانوں کو ضرورت کے وقت مدد فراہم دیا جائے اور دوسری جانب عورتوں کی خزیہ و فروخت کو قائلانہ جرم قرار دیا جائے۔

کیا ہندوستان میں عورتوں کی کسی انجمن نے اب تک اس قسم کے نیک اقدامات کئے؟ اور اپنی ”نہ ہمت بہنوں کو ٹرک و زندگی سے بچانے کی کوشش کی جو ہماری نالغائی اور سماجی خرابیوں کا شکار ہوتی ہیں۔“

### جاپان کا بچہ بچہ وطن پرست

جاپان کس طرح اپنے بچوں کو وطن پرست بناتا ہے۔ اس کا اندازہ اگر کہنا تو کھوٹوں کی دوکانوں پر جا کر دیکھئے۔ ان دوکانوں پر زیادہ تر فوجی قسم کے کھلونے عین گے (شد تواریں) دوپٹے، دوستی گڑیاں وغیرہ) جو عموماً سپاہیوں کے کام آتے ہیں، لڑکوں کے کھیلنے کے لئے طرح طرح کی بندھتیں اور بیٹوں بھی ہوتے ہیں، لیکن سب سے دلچسپ کھلونا وہ مسلح موزیکار ہے، جس پر ایک ہوائی بندہ دفن رہی ہوتی ہے اور اس کا رٹ بٹن نے مقابلے کے لئے چاروں طرف پھیرا جاسکتا ہے۔

اس ابتدائی فوجی تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ہر بچہ بچہ قوم پرست بن جاتا ہے، کسی ملک میں یہ پُر اثر نظریہ دیکھنے میں نہیں آتا کہ سات لاکھ برس کے بچے، دسی پنے اس قسم کے کھانے کھاتے جا رہے ہوں، جیسے آفتابی جھنڈا ہمیشہ بلند رہے گا؟

اور اصل تعمیر قوم کے لئے یہی ضروری ہے کہ وطن پرستی کا بیج بچپن میں ڈالا جائے۔ ذرا سوچئے کہ ہم نے اپنی قوم کی تربیت کے لئے اب تک کیا کیا ہے؟

### نوجوانوں کو سہارا

جس طرح دوسرے ممالک کے نوجوان روزگار کی تلاش میں مختلف سے دارالسلطنت میں آیا کرتے ہیں اسی طرح ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں ہر سال لڑکیوں میں آتے رہتے ہیں۔ جن کا نہ وہاں کوئی عزیز ہوتا ہے، نہ شناسا، اس لئے لڑکیوں کو میونسپلٹی کے سوشل بیورو نے ایک محکمہ کھولی دیا ہے جو بے بارود و دگر نوجوانوں کی خبر گیری کرتا ہے، اور ان کو روزگار مہیا کرتا ہے۔

اسی طرح ہمارے کارپوریشن اور میونسپلٹیاں بھی اپنے سینکڑوں فائدہ کس تعلیم یافتہ نوجوان کی کیوں مدد نہیں کرتیں؟ اور انھیں خودکشی کرنے



تکیل کریں۔ اور اس لئے ان کی خدمات ملک کے لئے نہ پر دست اہمیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان کو بد اخلاقی، رشقتی اور بے پروائی سے احتراز کرنا چاہئے اپنے اپنے فرائض نہایت وفاداری سے انجام دینا چاہئیں۔ اور بے پروائی اور بے قومی پر ایک دوسرے کو تاکید اور تنبیہ کرتے رہنا چاہئے۔ تاکہ کام میں تاخیر نہ ہونے پائے۔

### کسٹومز کی امداد

ذیل میں ہم ایک واقعہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو گا کہ جاپان میں درمند حضرات کسٹومز کی کس طرح امداد کرتے ہیں۔

متوفی، ایواساکی، اور ہیرادا خانہ الاؤل نے ۲۵ لاکھ یں کا ایک عطیہ دیا کہ جس سے حوادث زمانہ کے سستانے جوئے دیہاتیوں کی امداد کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی، اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ ان کی طرز معاشر میں اصلاح کی جائے، اور ان کا معیار زندگی بلند کیا جائے، اس کے امکین میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور مختلف علاقوں کے ناظم شامل ہیں جو دیہی اقتصادیات سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کے علاوہ انجمن مذکور ماہرین کا ایک عہد بھی لازم رکھنے والی ہے، جو مصیبت زدہ دیہات میں تعینات کئے جائیں گے، وہیں جا کر قیام کریں گے اور اس طرح لوگوں کی امداد کی صورتیں پیدا کریں گے اس انجمن کی نگرانی میں ایک ماہر اور سال بھی شائع کیا جائے گا، جس کے ذریعے سے کسٹومز کو ان کے معیار مطلب مشورے دئے جائیں گے، اور بتایا جائے گا کہ فعلوں کو تیار ہونے سے بچنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئیں، کہا جاتا ہے کہ یہ انجمن بالکل غیر سرکاری جماعت ہوگی، بانیان انجمن کو توقع ہے کہ جب تین سال میں یہ کمپنی لاکھ کی رقم خرچ ہو جائے گی تو عام چندہ سے کام جاری رکھا جائے گا۔

اب ذرا ہمیں خود اپنے سے سوال کرنا چاہیے کہ ہم نے سال میں ایک دفعہ تقریریں کرنے کے علاوہ اس تک کسٹومز کی کیا عملی امداد کی ہے۔ وہ بھی جانتا گا کہ جی کا شکر یہ ادا کیے کہ انھوں نے دیہات سدھار کی طرہ اب بھی قدم اٹھایا ہے۔ اگر ہم ان کے مقاصد کو پوری طرح ذہن نشین کر لیں اور سچے دل سے ان کی پیروی کریں تو ممکن ہے کہ کسٹومز کی کچھ خدمت ادا ہو سکے، جو ہمارے ملک کی جان اور ہماری قوم کے روح رواں ہیں۔

### نوجوانوں کے کارنامے

جاپان کے نوجوان کسٹومز کی کس طرح مدد کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمارے نوجوانوں کو ذیل کا واقعہ پڑھنا چاہئے۔ اور اس کی تقلید کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

نوجوانوں کی انجمنوں کے فیڈریشن نے جس میں ۳ لاکھ رکن ہیں اپنی متعلقہ انجمنوں کو مطلع کیا کہ فیڈریشن ہڈانے دیہات کے نوجوانوں میں لکھنؤ اور صنعت و حرفت کا شوق پیدا کرنے کے لئے ایک لاکھ یں دینا طے کیا ہے، اس رقم میں سے فی انجمن تین سو یں یا فی رکن ایک سو یں تک قرض دیا جائیگا، اور اس قرض پر کوئی سود یا ضمانت نہ لی جائے گی، قرض لینے والوں کو چاہئے کہ روپیہ وصول ہونے کے ایک سال کے اندر گریٹ یا باقی ط یہ رقم واپس کر دیں۔

اس فیڈریشن کے پاس جو کچھ روپیہ ہے وہ سب بھری کی فیس سے جمع ہوا ہے، کہا جاتا ہے یہاں نوجوانوں کی کسی انجمن کے پاس دو چار سو روپیہ بھی نہیں گئے؟ حتیٰ کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پاس بھی ایک لاکھ روپیہ نہیں ہے، لیکن جاپان کے نوجوانوں کی انجمنیں لاکھوں روپیہ بلا سودی قرضہ دے سکتی ہیں۔

میں تفاوت رہ اذکبارت تا بہ کہا

در اصل یہی ہماری بے بسی کا سبب ہے، ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے؟ خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ تخلیق اور وہیل منقود ہے جس کی وجہ سے ہم بے دست و پا ہو گئے ہیں۔

### وطن پرستی کی خاطر خودکشی

جاپان میں خودکشی گناہ نہیں ہے، وہ اس اصول کے ماننے والے ہیں کہ مصیبت کی زندگی بسر کرنے سے موت بہتر ہے چنانچہ جہاں انجمنیں اس کا یقین ہو جاتا ہے فوراً عمل کر گزرتے ہیں۔ آئے دن اخباروں میں اس قسم کے خودکشی کے واقعات درج ہوتے رہتے ہیں۔

خودکشی کے بیشتر واقعات کی تہ میں وطن پرستی کا جذبہ کام کرتا ہے، اکثر سہا ہیوں اور عہدہ داروں سے اگر اپنے فرض کے انجام دینے میں کوتاہی ہو جاتی ہے تو فوراً وہ خودکشی کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ جب ایک عرصے

کیا ہوتا تھا۔ سچ ٹریم کی زد میں آ گیا، اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی، فوراً ٹریم والا اسے قریب کے ہسپتال میں لے گیا، اور اس کے جسم میں خون داخل کرنے کے لئے خود اپنا خون پیش کیا۔

ذرا اس کا مقابلہ ہندوستان کے ڈرامیوروں سے کیجئے، لیکن سچ پوچھئے تو اس میں ان کی کیا خطا ہے، انہیں یہ کبھی سکھا یا ہی نہیں جاتا کہ ذمہ داری کا احساس سبھی کوئی چیز ہے، وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہمارا صاحب بھادڑ کا پولیس میں رسوخ ہے، وہ ہیں سزا سے بچا لائیں گے، اسی زعم میں وہ اس قسم کی ذمہ دارانہ حرکتیں برابر کرتے رہتے ہیں۔

### چیمبراسی سے وزیر سلطنت

اخبار سچے سچے ہیں، ایک قفقہ شائع ہوا تھا جو میں یہاں درج کرتا ہوں، تو کیوں کہ امریکن سفارت خانہ میں ایک جاپانی چیمبراسی ملازم تھا، اس کا کہنا یہ تھا کہ انگریز ہی سیکھنے کے لئے اس نے یہاں ملازمت کی ہے، سفارت خانہ کے فوجی افسر نے جب یہ دیکھا کہ اس سے کام نہیں چلتا تو اسے درخواست کر دیا، کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ فوجی افسر اور یہ چیمبراسی دونوں کون ہیں، فوجی افسر تو جنرل پرشنگ تھے جو امریکہ کی فوج میں نے کرجنگ غلبر میں یورپ لگئے تھے اور یہ نوجوان چیمبراسی جاپان کے موجودہ وزیر خارجہ کو کی ہر دشا میں۔ ذاتی ترقی کی یہ کیسی شاندار مثال ہے۔

### وزیر پہلوانی کے استاد

جاپان میں وزیر اعظم سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ قلمی تک ہر شخص وطن پرستی کے جذبہ اور ذمہ داری کے احساس سے سمور ہے، اور شیخی کے مقابلہ میں مبتلا نہیں ہے، ایک دفعہ میں نے ریو سے کے وزیر کا قفقہ سننا تھا کہ انہوں نے خود انجن ڈرامیور کا کام کیا اور تین سو میل تک ریل چلائی، اب یہ معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے ایک جگہ پہلوانی (جو جٹو) سکھانے کی اعزازی خدمت قبول کی ہے۔

مشرقیانہ اور چھدا وزیر ریو سے جو جٹو کے ماہر ہیں، ایک دن وہ اپنا پرائیمری اسکول دیکھنے گئے اور اس فن کے متعلق لڑکوں کو بہت سی باتیں بتائیں، اس پر لڑکوں نے ان سے درخواست کی کہ آپ مدرسے کے مشیر کشتی کی خدمت قبول فرمائیں اور ہمیں جو جٹو کی مختصر سی بیت تعلیم دینا کریں، اگرچہ سرکاری کاموں سے انہیں بہت کم فرصت ملتی ہے۔ پھر بھی ہونا

کے بعد غیر مالک سے واپس آتے ہیں اور جاپانی زبان بول جاتے ہیں تو شرم کے مار سے خود کشتی کر لیتے ہیں۔

### ذمہ داری کا احساس

جاپانیوں میں عموماً اور جبہ داروں میں خصوصاً ذمہ داری کا غہ ہونی احساس نہ جو ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو گا کہ ایک ذمہ دار غلطی کی وجہ سے ایک صوبہ کے گورنر، رشتہ دہندہ، اور ان کے استغفار سے دیا، ایک پولیس انسپکٹر نے خود کشتی کر لی۔

بادشاہ سلطنت کسی مدرسے میں تشریف لے جا رہے تھے ران کی سواری کے آگے آگے پولیس کی ایک مڑکار تھی، اتفاق سے اس موٹر سواری رہنمائی میں غلطی ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ سلطنت مدرسہ میں نصیب گھٹنے قبل پہنچ گئے، جتنا سچ ایک پولیس افسر نے جو براہ راست پردگرام کی اس بلے ترقیبی کا مدرسہ دار تھا، شرمندگی کی وجہ سے خود کشتی کر لی۔

در اصل ہوا یہ کہ شاہی جلیوس کی رہنمائی کرنے میں اس نے اپنی ذمہ داری کا اتنا زیادہ احساس کیا کہ اس کا دماغی توازن درست نہ رہا اور جواس جاتے رہے، پس اسی خبر امٹ میں اس سے یہ غلطی سرزد ہو گئی، جب اسے ہوش آیا تو اپنی غلطی کا احساس ہوا، چونکہ وہ سچا جاپانی تھا اس لئے اس نے سوچا کہ خود کشتی کے علاوہ اس غلطی کی اور کسی طرح تلافی نہیں ہو سکتی۔ پس اس نے تلوار سے اپنا گلا کاٹ لیا۔

آج ہمارے لیڈروں میں سے جو روز نئی نئی پارٹیاں قائم کیا کرتے ہیں، کتنوں میں ذمہ داری کا ایسا احساس موجود ہے؟

### جاپان کی پیروی کرو

ہندوستان میں ٹرمیو سے چلانے والوں کی بے پردائی سے اکثر راہگیروں کی جانیں منانے ہوتی رہتی ہیں، اور اکثر یہ لوگ مجروح کو چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے ٹرمیو بھگاتے جاتے ہیں۔ لیکن جاپان میں ٹرمیو سے والے ان کے بچانے کے لئے اپنے خون تک سے دریغ نہیں کرتے، ذیل میں ایک سبق آموز قصہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک دن ایک ٹرمیو چل رہے پر سے گزر رہی تھی، ایک پانچ سالہ بچہ قریب کے احاطہ سے نکل کر ٹہری پر آ گیا۔ ٹرمیو والا بہت کچھ چلایا، لیکن



وعدہ کر لیا، کہ ہفتہ میں ایک دن وہ اسکول کے بچوں کو پیروانی سکھانے آجایا کریں گے۔

دیکھئے اس صورت سے وہاں کے سرکاری عہدہ دار قوم کی تعمیر کیا کرتے ہیں، اور اُسے قومی تر بناتے ہیں، لیکن ہمارے عہدہ داروں اور سرکاری افسروں کا حال تو آپ پر اچھی طرح روشن ہے، اس لئے اُن کے متعلق یہاں کچھ لکھنا ہی بیکار ہے، ان کا پہلا قصہ ملاحظہ ہو۔

### وزیر انجن ڈرائیور

ایک دن جب سوہانے اکسپرس اوسا کا پہنچی تو ڈپٹی فارم پر سنے وزیر ریلوے سٹیشن پر ادھیرا کے استقبال کے لئے بیت بڑھ گئے، لوگوں نے ساری ٹرین میں وزیر موصوف کو تلاش کیا، لیکن وہ کہیں نہ ملے، اسی اثنا میں ڈائنگ کار سے کچھ لوگ برآمد ہوئے جو نیل اور سیاہی میں لت پت تھے اور بالکل انجن ڈرائیور معلوم ہوتے تھے، دیکھنا وہ ہیں ریلوے وزیر کسی نے ان میں سے ایک فرہ آدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو انجن کی طرف ہنایت تیزی سے چلا جا رہا تھا، سب نے انہیں دیکھا اور پہچان لیا، اور پہچان لیا، مجمع اُن کی طرف بڑھا، لیکن اُنہوں نے اپنے قدم تیز کر دئے، اور بڑھ کر انجن میں اس جگہ بیٹھ گئے جو ڈرائیور کے لئے مخصوص ہے، اس کے بعد گاڑی چھوٹ گئی اور سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

### ڈاکو کو بھی ضمیر رکھتے ہیں

جاپان میں ڈاکو اور مجرم بھی ضمیر کی آواز سنتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں، ایک قصہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک دن ایک نوجوان میگو رو کے پولیس تھانہ میں داخل ہوا اور کہا کہ میں نے حال ہی میں ایک ڈاکو ڈالا ہے لہذا مجھے گرفتار کر لیا جائے، اس نے بیان کیا کہ تین سال پہلے میں ڈاکو کے سلسلے میں گرفتار ہوا تھا، لیکن یہ وعدہ لے کر مجھے چھوڑ دیا گیا تھا کہ اگر پھر کسی قانون کی خلاف ورزی کرے تو خود آکر پولیس میں اس کی اطلاع دے دوں گا، چنانچہ اس مرتبہ چوری کرنے کے بعد بچا یک مجھے اپنا وعدہ یاد آگیا، اس لئے میں حاضر ہوا ہوں تحقیق کرنے پر پولیس کو معلوم ہوا کہ واقعی چار گنہ قبل وہ ایک شخص کے مکان میں گھس تھا، اور چاقو سے اُسے ڈرا کر اور کچھ روپیے کے فرار ہو گیا تھا۔

اس قسم کے بہت سے واقعات جاپان کے اخباروں میں ہر مہینے شائع

ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارا مجرم خود اپنے سابقہ جرائم کا اقبال کرتے ہیں، اور درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں کافی سزا دی جائے۔

### ہندوستان کی پسروی

جاپان میں اب ہندوستان کا قدیم طریقہ تعلیم رائج ہو رہا ہے یعنی گرمل کا وہ طریقہ جو اخلاق کے درست کرنے میں ہنایت مفید ثابت ہوا ہے۔ پرانے زمانے میں وہاں بھی مندروں کے ملحقہ مدارس قائم تھے۔ اس قدیم طریقہ تعلیم میں بہت سی خوبیاں تھیں، کیونکہ اس میں معلم اور متعلم کے درمیان براہ راست تعلق قائم رہتا تھا جس سے بچوں کے اخلاق پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا، ملحقہ تعلیم نے اب یہ طے کیا ہے کہ اس قسم کے مدارس کو از سر نو جاری کیا جائے، علاقہ ایسی میں مشرب دیو تکیہ دے پرانے طرز کا ایک نجی اسکول قائم کیا ہے۔ یہ قدیم طریقہ تعلیم کا مکمل نمونہ ہے۔ سرکاری امداد سے غنیمت اسی قسم کے اسکول ملک کے طول و عرض میں قائم کئے جائیں گے۔

### ہندوستانی مجسٹریٹ غور کریں

ان ہندوستانی مجسٹریٹوں کو جو انگریز افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سیاسی مقدمات میں ملزموں کو سخت سزائیں دیتے ہیں۔ ذیل کے واقعہ پر غور فرمائیے۔

جاپان کے مجسٹریٹ حکومت کے اشارے پر نہیں جتے۔ بلکہ خدا کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، اور اسی سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ انہارنجی سنجی کا بیان ہے کہ خونی برادری کے ہم آراگین نے نظام حکومت کو بد لئے کے لئے ایک وزیر مال کو قتل کرنے کی سازش کی تھی، ان کا مقدمہ گو پتھرو فیو جیج کی عدالت میں زیر سماعت تھا، جیسے جیسے فیصلہ سناتے کا دن قریب آتا جاتا تھا، جج موصوف بھی مندر میں جاتے تھے، اور اپنی ہدایت کے لئے دعا کرتے تھے، سرکاری وکیل نے اس گروہ کے لیڈر نشواٹوئی کے علاوہ تین دوسرے ملزمین کے لئے بھی سزائے موت کا مطالبہ کیا۔ لیکن جج کو خدا نے توفیق عطا کی اور اُنہوں نے اُن کو بہت معمولی سزائیں دیں۔

اس مقدمہ میں ایک بودھ شرنی نے بھی صفائی کی جانب سے گواہی دی تھی جس کا قصہ یہ تھا کہ اگرچہ بودھ مذہب میں کسی کی جان لینے کی سخت ممانعت ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو قتل کر دینے کی اجازت ہے۔ جن سے ملک کو نقصان پہنچتا ہو اُن کا نام مشرک ہو یا موٹو تھا اور یہ دیوتا کو جی مندروں کے

بکلاف اس کے آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان میں بھگت سنگھ کی جان بخشی کے لئے لاکھوں آدمیوں نے سیوریں نیچے اور خود ہانا گاڑی ہے اپنی پوری قوت صرف کر دی، کہ محض اٹھارہ دوستی کے طور پر لاڑ اور بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو معاف کر دیں، لیکن سب کیجیہ بیکار ثابت ہوا۔

### جاپانی فلسفہ

اخبار نئی نئی کے چیف ایڈیٹر مسٹر سنگھ نے جاپانی فلسفہ کو صرف ایک لفظ میں بیان کیا ہے، یعنی خود سے دیکھتے ہیں۔

جاپانی قوم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے حوصلوں کی حامل ہے۔ لوگ انفرادی و اجتماعی ہر حیثیت سے کبھی اپنی موجودہ حالت پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ جاتے، جب تک حال ماضی سے بہتر نہ ہو، اور مستقبل حال سے بہتر نہ ہو، تو وہ اسے تنزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور صورت حالات کی پیٹری کی کوشش کرتے ہیں، گویا جاپانی قوم کے فلسفہ کو صرف ایک لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، یعنی

”حوصلہ، یا اولوالعزمی“

### قطعہ

محنت سے نہ گھبراؤ، ہے اس کا اثر اچھا

سینچو گے جو محنت سے پھولے گا شجر اچھا

جب کاوش و کوشش سے ملتا ہے صلہ سب کو

گر بوگے تنم اچھا، پاؤ گے شہر اچھا

(عظیم حبیب آبادی)

سب سے بڑے پر دہشت اور نشوونما کے استاد تھے، انہوں نے فرمایا کہ انہی نے قومی جذبہ کے ماتحت بودھ مذہب کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کیا اس لئے خواہ اسے انتہائی سزا بھی دی جائے، لیکن اس کی روح ہمیشہ ملک کی خدمت کرتی رہے گی۔

اس ضعیف العمر پر دہشت نے ابتداء میں کہا کہ میں قانونی نقطہ نظر سے قانون کی وکالت کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ روحانی اعتبار پر اس معاملہ کو صاف کرنا چاہتا ہوں اور نشوونما کے فعل پر بودھ مذہب کے لحاظ سے روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

نشوونما تک میراث گرد رہا ہے، اور اس نے بودھ مذہب کے تمام اصولوں کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نشوونما یہ فعل مذہبی، واقفیت کی بنا پر نہیں کیا، بلکہ ملک کے حالات نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا، بودھ مذہب میں ہر مخلوق کو حتیٰ کہ کیڑوں تک کو مارنے کی ممانعت ہے، لیکن اگر کل کی خاطر جزو کو یا تمام مخلوق کی خاطر ایک فرد کو مارنے کی ضرورت ہو تو بودھ مذہب اس کی اجازت دیتا ہے، ہمانا مذہب کے علاوہ تمام بودھ ادوار کوئی نہ کوئی اختیار لئے ہوئے ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہ ہتھیار اسی لئے ہیں کہ مخلوق کے دشمنوں کو ہلاک کر دیں۔

نشوونما مستقبل میں بھی قوم کی خدمت کرنے کا موقع حاصل رہے گا، اگر توازن اسے موت کی بھی سزا دیدے پھر کبھی اس کی روح ہمارے درمیان رہے گی، نشوونما کے سچے جذبہ کا حامل ہے، اس لئے اگر ہم اسے دیکھیں تو اس کی روح اس اعلیٰ جذبہ کی حفاظت کرتی رہے گی، دراصل جاپانی قوم کا انحصار اسی جذبہ پر ہے۔

ذرا تصور کیجئے کہ اگر کوئی شخص ہندوستان میں کسی سیاسی قتل کے مقدمہ میں اس قسم کی گواہی دیتا تو اس کا حشر کیا ہوتا؟ قاتل کی حمایت کے جرم میں اسے گرفتار کر کے فوراً سزا برسر کے لئے بھیج دیا جاتا، یہ ہے ایک آزاد اور غلام قوم کا فرق۔

اسی مقدمہ میں جاپان کے طول و عرض سے ہزاروں لاکھوں عورتوں سے لیکر حاضر ہوئے اور انہی کی کہ ملازموں کو بہت معمولی سزا دی جائے، کیونکہ ان کی نیت نہایت اعلیٰ ہے، غرضانہ اور وطن پرستانہ تھی، چنانچہ جج نے انہیں بہت معمولی سزا دی، گویا اسے رائے عامہ کے سامنے جھکا جانا پڑا۔

# حضرت اثر لکھنوی اور میں

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

نوبہر شمس کے تہم میں جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کی ایک تحریر شائع ہوئی ہے، اس تحریر میں حضرت بیچو اور حضرت متقی کے دو ایک شعروں سے متعلق میرے خیالات پر حضرت اثر نے اظہارِ رائے خوش کیا ہے۔ میرے خیالات ان اشعار پر جو لکھی شمس کے نگار میں شائع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو میں اس شبہ میں پڑ جاتا ہوں کہ کسی شعر پر وجد کرنا یا اس سے اپنے وجدان کو مجروح پانا اپنے مذاق کی چیز ہے اور بحث و مباحثہ محض ایک حد تک ممکن یا کارآمد ہو سکتا ہے۔ میرے والد مرحوم حضرت عبرت کا ایک شعر یاد آیا۔

مگرانا بننا حقیقت میں اتفاق پہ ہے  
خوشی بشر کی مگر مختصر مذاق پہ ہے

خیر میں اس کی کاشش کروں گا کہ بچے تھے الفاظ میں حضرت بیچو اور حضرت متقی کے اشعار کی کچھ تحلیل کر دوں، تاکہ ان پر سختی سے جو اظہارِ ناپسندیدگی میں نے کیا تھا اس کے وجہ اگر ممکن ہو تو حضرت اثر پر واضح ہو جائیں۔ حضرت بیچو کا شعر یہ تھا۔

نشین چو نکلے والے ہماری زندگی یہ ہے  
کبھی روئے کبھی سجدے کے خاک نشین پر

کبھی میر تقی نے اپنے ایک شعر میں ایک قیامت کا ٹکڑا رکھ دیا تھا، ”اے ادھاک گر بیاں والے“ ان کے بعد کے شعر انہی ”والے“ کے لفظ کو اشعار میں باندھا، اور کہیں کہیں بچے شاعرانہ انداز سے باندھا، مثلاً ”ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے“ ”ذوق“ ”دل جیسے سینہ جیسے“

نہیں کرنے والے“ ”آئینہ“ آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے“ ”دماغ“ یا حضرت سائل دہلوی نے بڑے سج دج کی ایک غزل کہی ہے، ”وہ نیکی لوگ پیکان والے وہ سوخا پر والے یا عزیز لکھنوی کا ایک شعر لے بیجے“ ”نکلتا اک پڑ گیا تربت میں جان آنے لگی مجھ میں“ ذرا اوجانے والے قبر پر سپر شکر ادینا ”شب بھر غنوار گس کو بستائیں“ ”ہیں ہنسنے والے ہیں رونے والے“ ”دیکھئے کہ“ ”والے“ کا لفظ مندرجہ بالا مثالوں میں کیا اثر پیدا کر رہا ہے اور کتنی خوش سوسولی سے لایا گیا ہے، ان کے مقابلہ میں نشین چو نکلے والے“ کے لب و لہجہ پر غور کیجئے۔ اور کیا عرض کروں۔ لیکن بیٹے کی مثالوں میں ”نشین چو نکلے والے“ میں کچھ فرق تو ہی ہے، اب ذرا اور تہ میں جائیے، خواہ یہ خطاب خدا سے ہو یا دوست سے یا دشمن سے، مگر یوں برا و رامت کسی سے کہنا کہ ”اے میرا سب کچھ جلائیے والے، اے مجھے بے خافان کرنے والے۔ اے نشین چو نکلے والے“ ”علم کی ایسی تشریح ہے جو مذاقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے، شاعری اور غزل کی شاعری کا نازک دل اس سے دے اور اس تو میں میں سے بیزار ہو جاتا ہے، دیکھئے قافل ایک ہی لفظ ہے، لیکن یہ ایک لفظ ہی سینہ حاضر میں استعمال کر کے کوئی ایسا شاعر جس کا مذاق اور وجدان تربت یافتہ ہے اپنے شعر کو خراب نہیں کرتا، اسے قافل ادھاکار، ادبیہ وفا کہہ کر سوز و ساز نہیں پیدا ہوتا، شوخی اور چمچیر چھاڑ کے مضامین کی اور بات ہے، لیکن حضرت بیچو سے اگر کوئی کہے کہ آپ نے شوخی یا چمچیر چھاڑ کا معنوں اس شعر میں لکھا ہے تو وہ برا مان جائیں گے۔

نشین چو نکلے والے

باغباں بھی آگیا ہے۔ اگر بے ادبی ہو تو حضرت اثر سے میں عرض کروں گا کہ واردات اور ساخت کے بیان کرنے میں کسی شخص واحد پر الزام نہیں دھرنا چاہیے۔ غم اور درد سوز و گداز ٹریجڈی کے عناصر کائنات میں سموئے ہوئے ہیں، یہ تاثرات ازلی اور ابدی ہیں، کیا فلسفہ غم اور پاسپاٹ کے اس پہلو پر حضرت اثر نے کسی غور نہیں کیا، بہر حال بلند مذاق کے اشعار میں چارج ٹیٹ فریم نہیں کیا جاتا، دیکھئے قیر کے یہ اشعار:-

مصائب اور تنہ پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے  
یا۔۔۔ وصل و جہراں میں کہ یہ دوسرے نہیں تھیں عشق کی

دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

یا مومن کا یہ شعر جس میں الزام دیا گیا ہے، مگر کن الفاظ میں:-

میں بھی کچھ خوش نہیں جفا کر کے تم نے اچھا کیا نبہ نہ کی

تیر نے یہ نہیں کہا کہ اے مجھ مصائب لانے والے تو نے میرا دل لے لیا یا برباد کر دیا اور نہ یہ کہا کہ اے جفا کار مجھے وصل و جہر کے دوسوں میں تو نے ڈالا اور ایسا کر کے میرے غریب دل کو نہ جانے کب اور کہاں قتل کر دیا بمعنی کہتے ہیں:-

ہاتوں میں ادا صرل نسوں گرنے لگایا دے وچ ادا صرلٹ اڑا لے گئی دل کو  
اس شعر میں بھی وہ عنصر موجود ہے جسے ٹریجڈی پر بحث کرنے میں

نفا دوں نے (Theory of automa) کہا ہے،

یعنی واردات اور ساخت کا ناگزیر طور پر وقوع میں آنا، ظلم کیا نہیں

جاتا ہے ظلم ہو جاتا ہے۔ لعل نسوں گرا اور زلزلہ پر ہیج الزام سے بری ہیں،

وہ اپنی جان لیوا دلفریبیوں کو کیا کریں؟ میں یہ ماننا ہوں کہ شاعری

کو فلسفہ کے اصول بند نہیں کر سکتے بمعنی کا یہ شعر ہے:-

جب اُس نے اٹھائی تھنہ ہم پر ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

لیکن بمعنی کے پہلے مصرع کا تیور دیکھئے اور نشین پھونکنے والے

کی بد مذاقی دیکھئے۔ ہاں ایک بات ذہن میں آئی ہے۔ میں نے جس

(Automation) یعنی ناگزیریت کا ذکر

کیا ہے (آپ اُسے تقدیر یا قضاء قدر کہہ لیجئے، یا مسند جبر و اختیار یا

حسن اتفاق) اسی کا احساس کرتے ہوئے نگار میں شائع شدہ غزلی پر اپنے

انہوں نے تو بوز لکھا ہے سوز۔ اور ایک کے بدلے متواتر اور مسلسل تین تین لفظوں میں ظلم کی تفصیل کی ہے۔ ضبط گناہ ہے نہ؟ آنسو روکنا گناہ ہے نہ؟ سچ ہے اور مٹانے والے، اور نشین پھونکنے والے، اور مجھے کہیں کا نہ رکھنے والے، یہی کو سنے تو جانِ لطافت ہیں۔ عزیز لکھنوی کا ایک شعر سن لیجئے:-

ادنا شناس جنس وفا میں ترے تار

کہا سو چتا ہے خوں بھری تلوار دیکھ کر

ادنا شناس جنس وفا میں بھی محبوب کو براہ راست کچھ کہا گیا ہے:-

لیکن کہاں پشستہ انداز بیان اور کہاں نشین پھونکنے والے غزلی کا ایک اور شعر سنئے:-

بے خبر عشق کے آثار قدیرہ نہ مٹا

جوش کھاتا ہے لہو نیوں میں دیوانوں کی

مستوح کیا بلکہ دشمن کی جفا کا ذکر اور اس سے خطاب یوں کرتے

ہیں۔ اچھا اب حضرت اثر کی اجازت سے میں آگے بڑھتا ہوں، چنانچہ

مجھے یاد ہے حضرت امیر معانی کے وقت تک نشین یا آشیانہ پر بجلی گرنے کا

ذکر تو شعر میں آجاتا تھا، لیکن نشین آجائے یا پھونکنے کا ذکر شعر میں شاید

ہی آیا ہو۔ لیکن جذباتی مدرس نے ایک بگڑی ہوئی ذہنیت کے تابع ہو کر

ظلم ہونا کہنے کے بجائے ظلم کرنا کہنا شروع کیا، یعنی اظہار غم یا غم کا تاثر پیدا

کرنے کے بدلے الزام دینا اور کوسنا شروع کیا، کسی نے یہ کہا ہے کہ غم اور مصائب

ایک ہی چیز نہیں ہے؟

سو دگرداز میں اس مدرس کی سہل پسندی نے یہ اضافہ کیا کہ بجائے گری

ہے جس پر کل بجلی وہ میرا آشیانہ کیوں ہو؟ یا بجائے

مجھ سا تیر وہ دل بھی نہ ہو گا زمانے میں بجلی بھی آگے سر ہوئی آشیانے میں

لگے سے آشیانوں میں آگ لگوائی اور بجائے آگ لگنے کے آگ

لگانے بلکہ آگ دینے کا قابل قدر ٹکڑا وضع کیا۔ اب شعر سنئے:-

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے

جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

دوسرے مصرع کا کیا کہنا، لیکن باغباں اور اس کا یہ جرم بھی

پہلے مصرع میں بیان ہو گیا۔ میں اس آگ کو ہوا نہیں دینا چاہتا۔ لیکن حضرت

معنی کے ایک مشہور شعر میں آشیانہ اجڑا کیا۔ کے ٹکڑے کے ساتھ جفا

مذکورہ بالا معنوں میں اس طرت اشارہ کیا تھا کہ دورِ حاضر کی غزل میں حسن و عشق کا ذکر سچے معشوق جفاکار، شوخ سستکار اور بجائے عاشق کے جتنا اور جس طرح کر رہا ہے، اتنا اور اس طرح چبے نہیں ملتا، غزل میں جزئی حقیقی، اور محدود چیزوں پر زور نہیں دینا چاہیے۔ اس میں کائناتی اور آفاقی دھنیں سموی ہوئی چاہئیں، نشین چوٹنے والے کپنے سے یہ کام نہیں چلتا، کیا جس اصول کا میں نے ذکر کیا ہے، اسی سے یہ اصول بھی تعلق ہے کہ اکثر موقوفوں پر ضمیر کا حذف کر دینا محاسبہ شاعری سے ہے، تاکہ شعر شخصیت اور جزئیات کے عیب سے بچ جائے۔ نگنائے غزل نے اپنے لئے یہ دھنیں شروع ہی سے محفوظ کر لی ہیں اور خارجی و مخصوص چیزوں کا ذکر تفصیل و شخص اور اصناف شاعری کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

ایک شعر اصغر گوٹہ دی کا شن ہے، یہ شعر حضرت اثر کو اس سے چپے بھی متوجہ اور متاثر کر چکا ہو گا یا یہ میرا سخن ظن ہے؟ ایک میرا ہی فسانہ زائل تا جاہد یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رہو مجھکو (مرد و زندگی صفحہ ۹۱)

ڈرتے ڈرتے اپنا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

دلوں کی آنجن میں بزم یا میں نہیں ہوں اب یہ میں نقش تھا سدا دیا، چراغ تھا بجھا دیا ایک اور شعر اسی غزل کا

وہ سوز دور و دمٹ گئے وہ زندگی بدل گئی سوالِ عشق ہے بھی، یہ کیا کیا، یہ کیا ہوا؟ ہر دو شعر کے دوسرے مصرع میں ضمیر حذف کر دی گئی ہے، میرے اتار

حضرت دسیم خیر آبادی نے قبر کا جب یہ مصرع سنا دیکھا اس بیاری دل نے آخر کام تمام کیا

تو کہنے لگے کہ بجائے آخر کام تمام کیا، کہ میرا کام تمام کیا، ہونا چاہئے تھا، میں تو استاد کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ حضرات لکھنؤ ضمیر کو حذف کرنے اور محذوفات سے غموں بچتے ہیں، بلکہ محذوفات کو عیب بتاتے ہیں، اسی سے تو ان کے یہاں تو تو میں میں کی بھرمار رہتی ہے، با محاورہ اور نکالی اردو پر جان دیتے ہوئے اور اپنے اہل زبان ہونے پر ناز کرتے ہوئے بھی حال یہ ہے کہ ضمیر کو لطیف انداز سے جب محذوف پاتے ہیں تو ہنابت معصوم اداسے پوچھتے ہیں کہ شعر کا مطلب کہاں ہے، کس طرف ہے اور کدھر ہے؟ اس سادگی پر کون نہ مر جائے اسے خدا۔

محذوفات کا لطف دیکھنا ہو تو اہل لکھنؤ کے خطاب و عتاب سے گذر کر شعرائے دہلی کا کلام دیکھئے۔ اب میں حضرت اثر کو نشین چوٹنے والے، ٹکڑے سے حکیمیت جوتا ہوا اور اس پر سر دھننا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھا ہوں، حالانکہ طوقی سلیم مجروح ہو کر اب بھی پوچھ جاتا ہے کہ یہ نشین چوٹنے والے کونسا انداز بیان ہے۔

”ہماری زندگی یہ ہے“ اس غضب کا ٹکڑا ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں کسی شعر کے پیسے مصرع کے آخری الفاظ یہ بھٹتے تو وہ چونک اٹھتا کہ اس مختصر مگر زبردست تہید کے بعد دوسرے مصرع میں کیا کہوں معلوم نہیں کہ اس ٹکڑے کے بعد حضرت تجو کے تخیل پر کیا گزری۔ بہر حال ان کی کاوش کا نتیجہ یہ الفاظ ہیں۔

کبھی روئے کبھی سجدے کے خاک نشین پر

جنہیں دیکھو شکر بادل نا خواستہ داغ کا یہ مصرع یاد آ جاتا ہے۔ بیت شور خنتے تھے پیلوں میں دل کا، حضرت تجو کے دوسرے مصرع کے برابر مندرجہ ذیل اشعار کے دوسرے مصرعے رکھتے تو مہذب باقی مدرسے کی سہل پسند رقت کا بھرم کھل جائے۔

شبِ فراق ہی مشغلہ تھا عاشق کا کبھی چراغ جلانا کبھی سبب دینا (مگر گورکھ پوری، ایم اے نمبر ۲۵ سال)

ترے کوچے اس یہاں مجھے دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا (مستحق)

بیانِ مجبوری میں جس ضبط اور توازن کی ضرورت ہے، ان کی مثال ان اشعار کے دوسرے مصرعے میں دیکھئے، نہ نہیں رونہا ہے، نہ گانا ہے، مگر اس اعتدال میں اس نیچرل انداز بیان میں جو بات ہے وہ اس مصرعے میں کہاں ہے۔

کبھی روئے کبھی سجدے کے خاک نشین پر

انہما را اضطراب میں جسمانی حرکات و سکنات کو بھونڈے طریقے سے پیش پیش رکھنا، اس رونے تڑپنے، لوٹنے کے مظاہرے کو سوز و گداز کا دار و مدار بنانا، زور بیان نہیں عجز بیان ہے، انہما را غم نہیں ہے، غلوں جذبات نہیں ہے، بلکہ جذبہ اور غم اپنے اد پر طاری کرنے کی کوشش ہے۔ لطافتِ شعر ان سستے دامنوں میں نہیں ہوتی، جسمانی اضطراب کا باقیہ

بیان دیکھنا ہو تو یہ شعر دیکھئے :-

کیا تم کو خبر تم نے تو کروٹ بھی نہ بدلی  
میں دروے سو مرتبہ بیٹھا بھی اٹھا بھی  
بجز دو وقت ذوق طبعید ن گستاخ من  
دانشہ دشمن تیز نہ کروں گناہ کیست

اسی سے تو میں نے کہا تھا کہ شعر میں رونے کا ذکر کرنا اپنے اوپر بڑی نازک  
ذمہ داری عاید کرنا ہے۔ زندگی میں رونا جتنا ہی آسان ہے شعر میں رونا  
انتہائی مشکل ہے، شاعر کو نرمی جذبات و احساس کی لڑی منزلوں سے گزر کر  
مقام گریہ پر پہنچنا ہوتا ہے۔

نوفیق با نذاذہ بہت ہے ازل سے

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گہر نہ ہوا تھا

رونے کا ذکر کن نہیں کرتا لیکن اب جس کو خدا دے۔ میرے والد  
مرحوم حضرت قبرت گو کچھوری کو نہ استاد دی کا دعویٰ تھا نہ بڑا شاعر ہونے  
کا، مگر ان کے دو شعر سنئے :-

تم نے پایا ہے کبھی وصل میں شاداں مجھ کو

تم نے دیکھا ہے کبھی جبر میں گریاں مجھ کو

کوئی آنسو پوچھنے والا نہیں  
حضرت امیر مینائی کا یہ شعر دیکھئے :-

انہ پو آئیر سرور کے  
حضرت عزیز کا یہ شعر دیکھئے :-

ابھی تربت دل پہ بیٹھے رہیں گے ذرا اور کچھ دیر آنسو بہا لیں  
نہ کہ اٹھائے لکھ دیا کہ کبھی روئے کبھی سجدے کے خاک نشین پر اس روئے  
کا رونا کہاں تک روئیں۔ اب دوسرا ٹکڑا لیجئے۔ کبھی سجدے کے خاک  
نشین پر، میری جیس تو ابھی شائستہ سجدہ نہیں ہوئی۔ لیکن سجدہ کا ذکر  
جس کثرت سے اردو شعر لاتے ہیں، وہ غالباً کوئی بہت اچھی چیز نہیں۔  
سجدہ کرتے وقت پاؤں سر کے اوپر نہ بھی مگر جسم کے کچھ اور حصے تو سر کے  
اوپر ہی رہ جاتے ہیں۔ حضرت بچو خاک نشین پرناک اور سر گرانے کی  
تصویر کیسے ہیں کبھی ہاتھوں میں اس خاک کو سے کر اُسے سینے سے اور  
سر سے لگاتے ہیں۔ اور خاک نشین پر سجدہ کیا ہو سکتا ہے۔ رونا ہو یا سجدہ

سجدہ کرنا ہو۔ جلد جلد ہو یا دیر دیر ہو، مگر ذہن منتقل ہو جاتا ہے، ایکسانی  
اضطراب کی طرف، اپنے اختیاراً حرکات و سکنات کی طرف اور علم کی  
اس معرور پر حضرت اثر جتنا چاہیں سر دھیں، لیکن جیسا میں عرض کر چکا  
ہوں، انبارِ غم میں ذرا روک تھام کی ضرورت ہے۔ رونا ترپنا، سینہ کو پی  
ٹو اب کی چیزیں نہیں ہیں۔ اور چال ناک جمالیات یا فنون لطیفہ کا تعلق  
ہے وہاں تو فن معرور میں ہی غم اور اضطراب کو نمایاں کرنے میں رنگ  
اور خط (Colour & line) سے حرکت کے اثرات کی  
پربست سکون یا ٹھہراؤ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، یعنی (con-  
trast) سے کام لیا جاتا ہے۔

کبھی روئے کبھی سجدے کے خاک نشین پر

کالاجہ بہت خود دار۔ انہ نہیں ہے۔ نگار میں اس شعر کے تعلق میرے سخت  
انفعا سے جو حضرت اثر کے دل کو چٹ لگی تو کیا اچانک اسی وقت انہیں  
یہ بھی احساس ہو گیا کہ ان اس مصرع کا لہجہ اور یہ حرکات بہت خود دارانہ  
تو نہیں ہیں، کیونکہ

کبھی روئے کبھی سجدے کے خاک نشین پر

اس میں جو حرکات و سکنات کی تصویر سامنے آتی ہے اس سے کچھ وہ بھی  
بیزار معلوم ہوتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ "اس میں رونے اور سجدہ کرنے  
کا صرف ذکر ہے، بیان واقعہ ہے، نہ کہ صورت حال جس شخص کا نشین  
پوناک دیا گیا ہے وہ نشین چھوٹنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ  
اسے بے خانماں کرنے والے کیوں حال پوچھ کر (یہ حال پوچھنے کا ذریعہ  
اضافہ ایجاد بندہ ہے، اور جس مصلحت سے کیا گیا ہے اسے کچھ میں سمجھتا  
ہوں کچھ حضرت اثر - خیر حساب دوستاں در دل) چلے ہوؤں کو ادا  
جلاتا ہے۔ اب ہماری زندگی یہ رہ گئی ہے کہ کبھی خاک نشین پر رونے  
میں اور کبھی انتہائے غم و جوش محبت میں اس خاک پر سجدے کرتے ہیں۔  
ظاہر ہے کہ قائل اس وقت نہ تو درہا ہے، نہ سجدے کر رہا ہے" (یعنی  
یہ حالتیں وہ شروع کرے گا نشین چھوٹنے والے کے چلے جانے کے بعد)  
اس شرح داستان کے تعلق مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ حضرت اثر  
نے اپنی سحریر کا عنوان تو رکھا ہے "شعر مراد رس کہ بُرد" لیکن میں تو  
درسس ہوتا ہوں ابھی اپنے ناچیز مضمون میں تشریح و تفصیل کا یہ انداز

یہ نہیں کہتا کہ کبھی روئے، کبھی تڑپے، کبھی سجدے کئے۔ لیکن در۱  
لکھنؤ کے رنگ میں ایک مصرع اسی مفہوم کا سینے۔  
ترنہ آئے تو کیا محسوس نہ ہوئی  
کتنے چھپو را انداز بیان ہے۔

بات کہاں سے کہاں اعلیٰ گئی، لیکن آنسوؤں کو اور سجدے کو بھی  
نکے سیر کر دینا ملک و ملت کے لئے اور شاعرانہ وجدان کے لئے اتنا مقرر  
رساں ہے کہ شاید مجھے اس تلخ لڑائی سے معاف رکھیں گے۔ ہاں تو میں  
یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اظہار غم میں علم کے خارجی پوچھ جانی حرکات و سکنات  
کے ذکر پر سوز و گداز کا انحصار ہے تو یہ معاذ میں داخل ہے نہ کہ محاسن  
میں، ایسا نہ ہوتا تو ہسپتال میں رونے کو اپنے اور مریضوں کی حالت اور  
صورت کی صورتی یا سٹرکوں پر جو لنگرے ٹوٹنے اور کوڑھی نظر آتے ہیں  
ان کی حالت اور صورت کا بیان سوز و گداز پیدا کرنے کے لئے بہتر چیز  
کبھی جاتی یا قبر کے اندر اجسام کے مڑنے لگنے کا بیان۔ نظم میں ان مناظر  
اور کراہتوں کا ذکر میں خود سخن سمجھتا ہوں، میں ان لوگوں میں نہیں  
ہوں جو ان پسزدن کو شاعری کا موضوع نہیں سمجھتے۔ ہاں لیکن غزل میں  
رونے تڑپنے کے مادی پہلو کو پیش کرنا بلکہ حرم اور چوٹی کا ذکر کرنا بڑا  
عیب ہے۔ اسی احساس سے تو کچھ جہین ہو کہ حضرت اثر کو کبھی کہنا پڑا  
کہ کوئی اس وقت نہ تو دور رہا ہے نہ سجدے کر رہا ہے۔ اس میں تو رونے  
اور سجدے کرنے کا صرف ذکر ہے (یہ صرف ملاحظہ ہو) بیان واقعہ ہے  
نہ کہ صورت حال۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس شعر میں رونا اور سجدہ کرنا  
فی الحال ملتوی کر دینے کو ہم شعر کی جان سمجھیں یا  
کبھی روئے، کبھی سجدے کئے خاک نشین پر

میں جس فعل کا ذکر ہے براہ راست اس فعل کو؟ بیان واقعہ کیا ہے۔ قابل  
کا ایسا کہنا یا ایسا کرنا، کیا ہماری زندگی میں جھوٹ اتنا سرایت کر گیا  
ہے کہ جو کچھ کسی خاناں برباد پر گز رہی ہے جو اس کی زندگی ہے، جو وہ  
کر رہا ہے، اس حقیقت کو اس حقیقت کے بیان سے الگ کر دیا جائے اور  
سچی بات سے قطع نظر کر کے یہ کہا جائے کہ بیان واقعہ کو سب کچھ سمجھئے  
اصل واقعہ کو کچھ نہ سمجھئے۔ یہی یہ بات کہ تنخید کہنے والے کی تصویر حزن  
ویاس پیش نظر کرتا ہے نہ کہ رونے اور سجدہ کرنے کی جس کو وہ بیان کرتا ہے

اختیار نہ کر سکا۔ اس کا فیصد حضرت اثر کریں کہ درس و تدریس کی بوسیری ناچیز  
تحریر سے آتی ہے یا کسی اور کی تحریروں اور تنقیدوں سے۔ دوسری گزارش  
یہ ہے کہ حضرت اثر کی منقولہ بالا شرح بھی کیا شعر کو سوز و گداز کی مثال بنا کی۔  
شعر میں درد پیدا کرنے کے لئے بڑی ہے، روی کی ضرورت ہوتی ہے بڑے  
منہب (restraint) کی ضرورت ہوتی ہے۔

جھوٹ کر ان سے بیت بیدرو ہم بھی ہو گئے  
ایک خنجر ہو گئے جب سے کھینچے قاتل سے ہم  
حضرت اثر کی عبارت کے ان ٹکڑوں پر غور کیجئے۔

”جن شخص کا شہن پہونک دیا گیا ہے، اسے بے خانماں کرنے والے،  
کیوں حال پوچھ کر مجھے ہوؤں کو جلاتا ہے، ہوم، ڈانٹے، راجل ٹیکہ پیر  
اور ڈکس، اتنے سستے پیسے سے رقت نہیں پیدا کرتے تھے، غم اور اظہار  
غم دولوں فطری چیزیں ہیں مگر اس طرح پھیل نہیں جانا چاہیے۔ غم کی نفسیاتی  
ماہیت روک اور ٹنگی ہے (check the pain) درست  
(release) خوشی کی ماہیت ہے۔

فراموشی سے بامعنی بنا دے قصہ علم کو  
زمانہ طول دینا جائے کر دے مختصر اتنا  
نثار پر سش غم کے ترے کرم کے نثار  
ہیں غیر تیں بھی کچھ لے دوست عشق رسوا کو  
نثار پر سش غم کے میں کیا کہوں لے دوست  
کہ تجھ سے اب وہ مری سرگراںیاں نہ رہیں  
ہزار شکر کے پہلو خوں عشق میں ہیں  
سمجھ نہ اور کچھ ان شکو ہائے حبیب کو

زندگی میں تو شائستہ اخلاق ہونا اور صدق و صفا پیدا کرنا تو معمول  
مگر وجدانی اخلاق بھی کوئی چیز ہے اور شعر و شاعری کے اہم مقاصد میں ایک  
یہ بھی ہے کہ ایک تخیلی اخلاق (ideal ethics) کی مثالیں  
پیش کی جائیں۔

مگر معصیت تو یہ ہے کہ بد مذاقی جب ضبط کا ذکر بھی کرتی ہے تو  
شاعری کی روح کو چوٹ لگتی ہے، سودا کہتا ہے۔  
مست پوچھ یہ کہ مات کٹی کیونکہ تجھ بغیر اس گفتگو سے فائدہ، پیارے گز لگی



لیکن اسلوب بیان ہی تو مصیبت ڈھارہا ہے۔ اسلوب بیان میں ایک ایک انہیں دو دو بے اختیارانہ حرکتوں کا ذکر ہے اور دو تصویریں پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ آخر کچھ تعلق تو حزن و یاس اور حزن و یاس کے اس اثر میں ہے۔ ایک اسلوب بیان تو یہ ہوتا ہے کہ کسی حالت کا ذکر کرنے میں اسے اور لطیف بنا دیں، جیسے برقِ شمس یا برقِ آواز یا برقِ بزم یا سناہستی، یا نڈانِ حیات یا مضافِ عالم یا موجدے کو شعلہ کہ جائے اور ایک اسلوب بیان یہ ہوتا ہے کہ لطیف چیز کو کثیف چیز سے تعبیر کیا جائے یعنی سون و یاس کو یوں لکھ لیا جائے کہ

کبھی۔ دے کبھی سجدے کے خاکِ نشین پر

اور یہ کہ ہر جان چڑھائی جائے کہ روئے اور سجدے کرنے کا ذکر نہیں بلکہ حزن و یاس کا۔ بندہ بذا برقِ غم میں بھی کی جی کا ذکر نہیں لیکن آواز کی ایک صفت کے لئے جو استعارہ استعمال کیا گیا ہے، وہ کتنا لطیف ہے۔ میری محض یہ گزارش ہے کہ حضرت تجوّد نے سون و یاس ایسی پاکیزہ کیفیت کے لئے کثیف استعارہ استعمال کیا ہے۔ یعنی رونے کا اور خاکِ نشین کو سجدہ کرنے کا مسلسل ذکر کہنے روئے کا ذکر کافی متبادل کافی سے بھی زیادہ حق۔ یوں کہتے تو کیا بجا ہوتا۔

کبھی روئے، کبھی چپ ہو رہے شاخِ نشین پر

میں نے آسٹیاں برباد چڑیوں کی حالت کا مشاہدہ کیا ہے۔ کچھ دیر پہلے جو ہو کر آسٹیاں ڈھونڈنے کے بعد جس سکتے کے عالم میں وہ شاخِ نشین پر کھوئی ہوئی سی نظر آتی ہیں اس کو دیکھ کر میرا دل خون ہو گیا ہے کبھی رونے کے بعد بھی چپ ہو رہے کا ٹکڑا اسی انتہائے اضطراب کو ظاہر کر رہا ہے جس کا نام نمبر اور ضبط ہے۔

ذرا سوچئے، نشین پھونکنے والے میں پہلے ہی دو لفظ ذہن کو اس واقعہ کی طرف منتقل کر دیتے ہیں کہ نشین خاک ہو چکا ہے۔ اسی طرح کبھی روئے میں دے کے لفظ میں بھی بڑی دھت ہے۔ اس کے تو حضرت اثر بھی محزون ہیں کہ رونے سے حزن و یاس کی تصویر تنخید کے سامنے پیش ہو جاتی ہے: یا ابھی یہ تصویر ناکمل ہے، اور بغیر سجدے کے کام نہیں چلتا؟ پھر سجدے کے جو معنی میں نے لئے ہیں یعنی خاکِ نشین پر تڑپنا۔ اس خاک کو جو شِ اضطراب میں کبھی سینے سے لگانا، کبھی آنکھ اور چین سے لگانا، یہ سب باتیں بالواسطہ

کے خدے ادا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے نشین پھونکنے اور رونے کے ذکر کے بعد خاکِ نشین اور سجدے سب کو جو بھنچا جائے۔ حضرت تجوّد نے غم کی طرف اشارہ کرنے کے بجائے غم کو رگید دیا ہے۔ میں نے حضرت تجوّد کے دوسرے سجدے کے بجائے جو مصرع تجوّد کرنے کی جرأت کی ہے اس سے یہ تمام عیوب دور ہو جاتے ہیں۔ شعر کے معنی اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نشین پھونکنے والے اور کبھی روئے اب بجائے منبذل ٹکڑے معلوم ہونے کے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کو وہی شادی اناب ابتذال کے ”کچھڑ پانی“ میں گرا رہے تھے جو سجدے کے ”اور خاکِ نشین“ سے شعر میں آجائے ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے نگار میں لکھا تھا کہ یہ رونا نہیں ہے۔ یہ سوز و دماز نہیں ہے۔ یہ زخموں کی سینہ کو بلی ہے۔ یہ انبارِ غم نہیں۔ یہ جھک مارنا ہے، اور یہ ابتذال سرف لب و لہجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جس پر صفت آواز آتے جز جز ہو رہے ہیں۔ اسے صاحبِ اضطراب غم میں رونا، جلنا، لونا، تڑپنا، کپڑے پھاڑنا، چھاتی کوٹنا، سر دے دے مارنا، ٹھکسی بندہ جانا۔ سب کچھ ہوتا ہے۔ ہاں ان حرکات و سکنات پر غور کرنا، ان کو اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کے لئے مایہ ناز سمجھنا کوئی بہت اچھی بات نہیں۔ روئے، تڑپے، برباد ستہ، گھر پر سجدے کیجئے، مگر لٹھ شعر میں اور غزل کے شعر میں کچھ تو اعتدال برسنے۔ خصوصاً جب اردو غزل میں رونے کا ذکر اس کثرت سے ہے کہ اور زبانوں کی شاعری کا تو ذکر ہی کیا، فارسی میں بھی ایسا نہیں۔ اتنا تو نہ پوچھئے۔ یہ بی یاد رہے کہ آدمی چھٹتا ہے اور بڑی ڈرگرتا ہے۔ اک ذرا سی لغزش میں۔ جب میں نے پہلی بار حضرت تجوّد کا شعر سنا تو پیسے مصرعے لیکر دوسرے مصرعے میں کبھی روئے تک کے ٹکڑے نے مجھے سحر کارانہ عمل کیا، لیکن کبھی سجدے کے خاکِ نشین پر کے ٹکڑے نے خود اس عمل کا رد عمل کر دیا، اسی پسند و ناسے اسی الثاب سے طبیعت بیزار ہو گئی، ہمسپ کر گئے وہ اور چوٹ مجھے لگی، غالب کہتا ہے

ماتل یہ مری کو شش کی ہے کہ مرثیہ اسیر

اے نفس میں فراہم خس آسٹیاں کے لئے

نکد۔ کبھی روئے کبھی سجدے کے خاکِ نشین پر

اگر غم ہی کا مژہ پڑ گیا ہے تو ایسے شعر سمجھ سکتے ہیں۔

میں د اس طرح تو فریب سکوں نہ دے کہ اس درجہ تو مجھے بھی غم آسٹیاں نہیں

(راؤ المحرّف)



میں نے حضرت تجود کے اس شعر کے متعلق لکھا تھا کہ۔

”موصوف نے غالباً یہ سمجھا ہو گا کہ وہ اس شعر کو انتخاب الفاظ، سلاست بیان، سادگی اور ترمیم سے سوز و ساز کی آخری منزل پرے گئے ہیں۔ مگر یہی جڑی خوبیاں اس شعر کو ابتذال کے گڑھے میں گرا رہی ہیں۔ میرے اس بیان میں اور بعد کے اس بیان میں کہ یہ ابتذال صرف لب و لہجہ سے پیدا ہو جاتا ہے، حضرت اثر کو تصادم نظر آ رہا ہے، اثر صاحب کی صورت شکل اور ان کی شخصیت ایسی ہے کہ دیکھ کے عزت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ حسین سے حسین سرشت ریشم کی ساری نہ ہستی شروانی پہن لیں تو آپ کیا کہیں گے؟ کیا ان کے سنجیدہ حسن کو اس پوشاک کا شوخ و شنگ حسن بگاڑ دے گا، حالانکہ یہ پوشاک اپنی جگہ ہر طرح حسین ہے۔ عورت کی آواز میں کتنی لوح ہوتی ہے۔ اس کے لب و لہجہ میں کتنی دلفری ہوتی ہے۔ لیکن کسی حسین سے حسین مرد کی آواز میں اگر نسبت آ جائے تو آپ کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ حسین آواز ہے۔ لیکن اس شخص کے منہ سے جلدی بلکہ سچ خانا معلوم ہوتی ہے، باہم تروید و تصادم تو حضرت تجود کے شعر ہی میں ہے کیونکہ اظہار غم اختصار چاہتا ہے، اور اُسنوں نے اظہار سے کام لیا ہے، اور اس اظہار میں اس خوشی میں ایک حسین لہجہ کا حسین گھیرا ہوا ہو گیا ہے، ان کے شعر کا یہ لفظ فردا فردا منتخب لفظ ہے، سب سے ہے، اور سترم ہے، اور یہی حال ان کے شعر کے ہر فقرے کا ہے جس سے سلاست بیان پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن جب ان کا پورا کلمہ کان میں پڑتا ہے تو یہ لب و لہجہ اپنے سوز و ساز کے ساتھ مقبذ معلوم ہوتا ہے، ایک کم مشق شاعر تو کوخت اور کرہیہ اور گران الفاظ استعمال کرنے سے نا کامیاب رہتا ہے۔ لیکن الفاظ کا ترمیم ان کی سلاست اور شستگی وہ چیزیں ہیں جو بڑے بڑے مشق شعر کو ابتذال کے گڑھے میں گرا دیتی ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یہ اپنا حال ہے اب شدت بیماری دل سے  
سمجھتے ہیں مرے احباب میری بات مشکل سے (دعنی)  
یہ عالم ہے کہ نہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے  
شبِ فرقت کے غم جیسے ہوؤں کا دم نکلتا ہے (دعنی)  
طریقے ضبط غم کے ناگوش ایسا دگرتے ہیں  
اکٹھڑ جاتا ہے دم یوں کچھ کر فریاد کرتے ہیں  
لگی ہیں بچیاں دم توڑتا ہوں بستر غم پر  
مستی شاید وہ یاروں کو اپنے یاد کرتے ہیں (دعنی)

ٹھیر و ٹھیر و ذرا اسے ڈوبتے تار و ٹھیر و  
دیکھ لوں آخری عالم شبِ تنہائی کا  
یا یہی مصرع لے لیجے۔

م نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار کی زبان کوثر میں دھلی ہوئی نہیں ہے، لیکن لب و لہجہ سے ابتذال پیدا ہو گیا ہے، اسے یوں بھی سمجھ لیجے کہ داغ دہوی کی زبان کتنی مزیدار ہے، جتنی تعریف کی جائے، کم ہے، مگر قرآن پاک کی آیتوں کے لئے داغ کی زبان وضع نہیں ہوئی ہے، بلکہ قرآن پاک کی زبان سے داغ کے جذبات ظاہر کئے جائیں تو ابتذال پیدا ہو جائے گا، جی ہاں، اور لب و لہجہ سے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت تجود کے اس شعر میں تو ”روئے والے کے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی بہتی ہوئی ناک، اور منہ سے گرتی ہوئی رال، ناک کی سرخی اور مختصر قرابٹ اور آنکھ کی سرخی اور گندگی بھی نظر آ رہی ہے، جس سے شعر نہایت گھٹنا ہو گیا ہے“ حضرت اثر کہتے ہیں ”اس شعر میں رال وال کچھ نہیں بہتی“ میں تو حضرت اثر کی زبان میں صرف یہ کہوں گا کہ میرے بیان میں رال وال ”کا صرف ذکر ہے، بیان واقعہ ہے نہ کہ صورت حال“ وجدان کہنے والے کے بیان میں جو ابتذال پیدا ہو گیا ہے اس کی ”تصویر پیش نظر کرتا ہے“ اور بس۔ میری گزارش تو محض یہ تھی اور ہے کہ مہذب اور سنجیدہ نرم اور سترغ الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی حضرات لکھنؤ اکثر اس چیز سے نہیں بچ پاتے، جسے چھپتی کہتے ہیں۔ بجائے مناسباً و مختصراً اظہار غم کے اگر غم کو شعر میں رگید دیا جائے تو چھپتی پیدا ہو جائے گی، حضرت اثر نے مجھ ناچیز کا یہ شعر بھی پیش کیا ہے۔

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا  
وہ اک نگاہ ہی کیوں کسی کو دیکھا تھا

اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ اگر حضرت تجود کے شعر میں ابتذال ہو تو میرے اس شعر میں بھی ابتذال ہے، حضرت اثر نے حضرت تجود کے شعر کے متعلق میرے بیان کو ترقی دینے، چمکانے، اور اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، اولاً تو میں نے فی نغصہ رونے کے لفظ کو سرے سے نہ منوع قرار دیا تھا نہ حرام، میں نے صرف یہ کہا تھا کہ رونے کا ذکر ذرا بچ کے کرنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ میں نے اپنے برباد کرنے والے کو کوسا نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ میں اتنا نہیں کر نہیں۔ دیا جس اطمینان سے حضرت تجو و کھو روتے ہیں اور کبھی سجدہ کرتے ہیں۔ پھر مہی حضرت آخر کو اختیار ہے کہ وہ میرے اس شعر کو لکھو دو گی کی مثال سمجھیں۔ مگر یہ عزور کہوں گا کہ انتقاد عالیہ تو یہ ہے جس کی چیز نہیں۔ مگر عیسے حضرت آثر نے حضرت تجو کے شعر کے متعلق میری ہرزہ سرائی کو کیا پاس۔ اسی طرح غصیل یا مہلی طور پر اس سنسنوں نے یا میرے چپے معنوں میں امتدادی جب کے سلسلہ میں میں نے جو ہرزہ سرائی کی ہے اُسے بھی ذرا ہاتھ لگا میں۔ اجاگر کریں، خواہ یہ مشق تم وہ میرے ہی شعر پر کریں۔ میرے اپنے نمک مند بندہ دستان پیدا کر لے گا۔ لیکن شعر سے متاثر ہونے والی جماعت شول کے قبیلہ سے زیادہ اہم جماعت ہے۔ اس جماعت کی خدمت ہر لفظا دہر فرض ہے کہ ملک کا مذاق بلند ہو۔

میں نے حضرت معنی لکھنوی کے دو شعر بھی کچھ لکھا تھا۔ اور یہ بھی حضرت آثر کو ناگوار ہوا۔ وہ شعر یہ تھے۔

دیکھئے کیوں کوئی تربت ہوگی آپ کو مفت نہ دست ہوگی  
جب کبھی گور غزیاں میں چراغاں کرنا ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احسان کرنا  
سب سے پہلے میں یہ بتا دوں کہ جب صفتی کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع  
شاید یوں ہے "جب کبھی تازہ مزاروں پر چراغاں کرنا" میری گزارش تھی  
کہ پہلے شعر میں ردیف کی شوخی نے شعر کو اس امر پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں  
دیا کہ میں کتنی سستی چلی محبوب کی لے رہا ہوں۔ اور کتنی بازاری بات کہہ رہا  
ہوں۔ کس خبیث روح کا اظہار کر رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ دوسرے  
مصرع میں مفت نہ دست کے ٹکڑے میں جو روزمرہ کا مزہ ہے اس نے بھی حضرت  
صفتی کو غلط فہمی میں ڈال دیا۔ دوسرے شعر پر میں نے صرف یہ کہا کہ خیر غنیمت  
ہے۔ البتہ احسان کرنا کچھ برائے بیت سا معلوم ہوتا ہے۔

مگر حضرت آثر تو متاثر اور شکیف ہونے پر تلے بیٹھے ہیں۔ پڑھوں میں  
کیف سے یوں راگ سے جیسے باجا، یا یوں کہہ دیجئے کہ ہم جان گئے اس کو  
وہ جس رنگ میں آئے۔ یہ بھی نہ بھی یوں کہے کہ یاں استیا زنا قصہ کامل  
ہیں رہا۔ سنئے کیا کہتے ہیں "پہلا شعر ایک نشتر ہے جو دل میں پیرتا جلا جاتا  
ہے۔ پھر عاشق کے مرجانے کا ذکر ہے۔ پھر معشوق کو کوئی بتا رہا ہے کہ جس  
فکر کی طرف تجھے جذب عشق متوجہ کر رہا ہے۔ ہاں آپ کے چاہنے والے ہی

کی تربت ہے اور اس کی محبت کی کشش ہے جو تربت کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہی  
ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی درس و تدریس کے انداز میں کافی خاصہ فہرست فرمائی  
ہے۔ مگر یہ اجنبی اپنے مرحوم دوست کے عشق سے کہتا کیا ہے؟ حضرت تنہی کے  
شعور کے الفاظ پڑھ لیجئے۔ اور اس کے لہجے پر غور کر لیجئے، سچ بتائیے کہ ایک  
شوخی ایک زہ چٹکی ایک طنز ایک ادب پن اس طرز بیان میں ہے یا نہیں اس  
شعر کو سنکر جو اُچار میں مار مار کر۔ دئے اور یہ کہے کہ مارے کیف کے میرا مل  
ہے اور یہ شعر ایک نشتر ہے جو دل میں پیرتا جلا جاتا ہے، اس شعر کے اوپر  
رشتا آئے یا رحم یا غم یا غصہ یا ہنسی۔ میں نے تو خوش نصیبی یا بد نصیبی سے حضرت  
صفتی کو یہ شعر بار بار پڑھتے سنا ہے۔ اور جس طبع وہ اس شعر کو ادا کرتے ہیں  
یا بتاتے ہیں اس میں چھڑچھڑاہٹ کا پہلو غالب رہتا ہے۔ ان حضرات نے  
کائنات کو، انسانیت کو، دنیا کی تمام قوموں کو اور خیالی معشوق کی بھی سخت دل جلاؤ  
اور قاتل سمجھ لیا ہے۔ اور خود ایسا دھان پان بنے ہیں کہ ایک مفرد منظم کا تصور  
ہوتے ہی ٹپک پڑتے ہیں۔ کائنات تو سنگ دل ہے لیکن ان حضرات کا دل ایسا  
پانی ہے کہ ایک بات بار بار فرض کی جاتی ہے، مثلاً گور غزیاں پر معشوق کا گزرنا،  
اور پھر کیا، پس بھوٹ پڑتے ہیں، اسی سے تو میں نے لکھا تھا کہ گور غزیاں کا ذکر  
کرنا بھی دوسرے کے ذکر سے کم نازک ذمہ داری کا کام نہیں۔ حضرت صفتی کے پہلے  
شعر کی بازاریت کے مقابلہ میں اس شعر کو دیکھئے۔

بدنام ہو گئے جانے بھی دو امتحان کو

رکے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

روزمرہ یوں باندھتے ہیں۔ نہ کہ

"آپ کو مفت نہ دست ہوگی"

انہیں لطیف پردوں میں تو حضرات لکھنوی سمجھتی کہہ جاتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں  
اُسے سوز و ساز سمجھ کر دتے ہیں۔

دوسرے شعر کے بارے میں تازہ مزاروں پر چراغاں کرتا ہو معشوق بھی  
کتنا انبساط اور اور کیف اور تخیل ہے۔ اور اس کے بعد بار بار یہ مصرع پڑھئے۔

ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احسان کرنا

اس مصرع کو مزے لے لے کر دس بار پڑھئے یا لکھنا ہے، میرا ذمہ اگر طبیعت نہ  
نہ ہو جائے۔

پھر حال کیف و اثر پیدا کرنے کے یہ بکڑے ہوئے اذکار شعرائے دہلی

تو تھے ہیں، تیر، غالب، درد اور منگلرہان جاناں کو تو یہ بات نصیب نہ تھی۔ یہ لوگ ذرا سنگدل تھے، انہیں یہ توفیق کیونکر ہوئی۔ وہ گئے حضرات لکھنو تو وہ ایسے اشعار سے جتنا بھی مائل ہو کر یہ ہوں وہ اُن کا حقد ہے، یہی تو غزل کی شاعری کی غرض و غایت ہے کہ ایسے اشعار سننے سنانے کے لئے مجتہدیں کی جائیں۔

دو گھڑی مل بیٹھے رونے رو لانے کے لئے

حضرت اثر کے الفاظ میں آیا مشاہدہ اور تجربے کے مطابق؟ ہی ہی ہو ہو اور بھوں بھوں کے بعد "جس میں دانت بھی نمایاں ہو جاتے ہیں یہ حضرت اثر آپ نے باطل پکا کہا، پھر یہ مصرعے پڑے جائیں کہ جانے دیجئے، گرم کیجئے، ادھر نہ کیجئے

آپ کو منت نہ امت ہوگی

اس کے بعد باطل اس سے الٹی خواہش کی ہر کی جائے، اور پیٹے سے زیادہ چلا کر کہا جائے کہ

ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احسان کرنا

سچ ہے حضرت اثر اسی احسان کرنا کے ٹکڑے نے شعر کو نشتر بنا دیا نہ؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا دلی کے مسلمان شعرا ہندوؤں کی طرح بجائے جلتے تھے۔ کیا قبر کن چیز کا نام ہے اسے وہ نہیں جانتے تھے، پھر وہ ایسے شعر کیوں نہیں کہتے تھے، شاید وہ سوز و ساز میں حضرت صفی سے کم تھے، بندہ نواز واحد و جد ایسی باتوں سے اُن کے بچنے کی وہی تھی جو میں نے بتا دی تھی، یعنی بازار بیت اور خجانت سے نفرت۔

ہاں آپ ضرور ایسے اشعار سے لذت یاب ہوں اور بزم طود سے وجدان اور ذوقِ سلیم بتائیں۔ اس سے اکثر لوگ بے چہرہ ہی ہیں، بقول آپ کے، مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا، اب میں بھی کہتا ہوں کہ حضرت بخود کے ایک شعر اور حضرت صفی کے ان دو اشعار میں آہ کیا لطف زبان ہے، کیا سوز و ساز ہے، کتنی گہری کیفیت ہے، بار بار پڑھئے گی نہیں بھرتا وغیرہ وغیرہ وغیرہ، واقعی یہ دونوں حضرات بہت بڑے حسن پرست اور بہت بڑے عاشق تھے، انہیں کچھ نہ کہو۔

## عورت

کبھی اک رازِ عریاں ہے کبھی اک رازِ پنہانی  
نیاز و ناز کی بانی، نقوشِ زیت کی بانی  
محبت ابتدا اس کی محبت انتہا اس کی  
لمبیت کی اُنگلیں ہیں جواں عورت کی ہستی سے  
مصور بھی سمجھتا ہے تنہا اپنی عورت کو  
وہ اپنے دل کو نورِ عشق سے جب جگمگاتا ہے  
محبت اس کی فطرت میں ہے نفرت اس کی طینت میں

نہ سمجھا آج تک دُنیا نے عورت کی حقیقت کو

سراپائے محبت کو سراپائے عداوت کو

# سماج کی سنگدلی

محمد کمال احمد، راز، بھاگل پور

(۱)

ٹرین ایک معمولی سے اسٹیشن پر آ کر رکی،  
باہر بلا کاسٹنا، مالک بیٹے کا جاڑا،  
۱۰ وہ ہفتہ کی صبحی پریشانی، کبر آلود فضا تھی،

ہیٹ فارم پر جا بھا  
سٹیشنم زدہ کہلانے ہوئے پھول  
جھللاتی ہوئی دو ایک شمعیں، دو تین سسٹے سسٹے قہقہے  
ایک آدمہ سا فرخاموش گاڑی پر  
سوار ہوتے اور اترتے نظر آ رہے تھے،

گاڑی نے سیٹی دی، گاڑی کی سبز چمکڑی ہوا میں لہرا رہی تھی، چوہوں میں  
جھپٹ بھونک رہی تھی۔

اتنے میں ایک عورت پٹی پرانی ساری میں ملبوس گود میں ایک ننھی بچی دبائے  
اندرا آئی ہانپتی ہوئی۔

اس کے روکے سوکے بال پریشان، اور سیاہ و خوبصورت آنکھیں کھلائی  
ہوئیں۔

قلی نے ایک بھاری اور ایک حسین تصویر  
جو چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی

اندرا پینکیدی

(۳۱)

گاڑی آہستہ مزاحی کو چھوڑ کر  
اب تیزی سے سائیں سائیں کرتی  
دوڑی طرف جنگلوں اور جھاڑیوں کو  
پچھے چھوڑتی، ہوا سے باتیں کر رہی تھی  
گاڑی مسافروں سے کچھ کچھ بھری ہوئی تھی،  
عورت بھی ابھی تک کھڑی تھی  
دیوار کا سہارا لئے ہوئے

اس کے پاؤں گاڑی کے جھکولے سے ڈگلا رہے تھے۔

آخر وہ بیٹھ گئی انجی کچی کو دبا کر  
موسم سرما کی بیگی ہوئی سات (۳۲)

بچٹی ہوئی معمولی سوتی ساری  
گاڑی کی ٹنڈی نشست

میرادل اس نظارہ کو دیکھ کر بھڑک آیا

میں نے اپنے پاس اُس کو تھوڑی سی جگہ دی

اس کی دو سالہ ننھی بچی ایک ہلکی سی ادنی بنیاد پر سہی سے گود

میں شکر ڈی ہوئی تھی۔

”کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہی ہو؟“

میں نے پوچھا

”آؤ یہ آپ بانکر کیا کریں گئے؟“ اُس نے جواباً کہا

”اس کی آنکھیں موتی روئے لگیں!“

”میں ایک غمزہ عورت ہوں میری کہانی بھی درد بھری ہے“

”میں سنگدل سماج کی سستانی ہوئی ایک بے زماں عورت ہوں“

”جس کا نہ کوئی سونس سے نہ دوکار، نہ ساتھی نہ کوئی غمگزار“

”اس ظالم سماج کے نزدیک ہم بیواؤں کا، عالم بیوگی میں سوائے آشرم کب

گزر ہو سکتا ہے؟“

”آج کوئی دو سال کا عرصہ برابرا سچی، میری زندگی کا سہارا دیکھتے ہی دیکھتے

آنکھوں سے اوجھل ہو گیا“

”پرمانہ میرے دم کو دیکھتے ہوئے بھی اس کو مجھ سے چھین لیا“

”پرمانہ کے سینے میں شاید دل نہیں ہے؟“

”وہ جو گناہ پور میں ایک بڑی دوکان کے مالک تھے“

”اس وقت میں حسین تھی، مالدار تھی میرے لئے خوشی کے تمام سامان ہی تھے“

”یہ بال جو آج کسپرہ کی حالت میں شافوں پر اُدھر اُدھر پڑے ہوئے

ہیں کل تک ان سے خوشبوؤں کی پٹیں نکلتی تھیں“

”مہرے ٹہاک کو اُڑے ہوئے کوئی ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ دوکان

کی حالت بد سے بدتر ہو گئی“

”میں اکیلی، تنہا، دوہینے کا بیج۔ اتنی بڑی دوکان“

”بہت چیزیں لوگ چُر کرے گئے۔ کچھ تھوڑی بہت

قیمت دے کر دہرہ دستی اٹھائے گئے“

”میں انکار کرتی رہ گئی“

(۴۱)

”تھوڑے ہی دنوں میں دوکان ہاکل صاف ہو گئی“

”میرے پاس کچھ نہ بچا“

”گھاؤں کے لوگوں نے دہرہ دستی مجھے گھاؤں کے آشرم میں پہنچا دیا“

”میں اپنی بچی کو لے کر آنسو بہاتی ہوئی

بے دلی کے ساتھ آشرم میں پڑی رہی“

”آشرم میں نام کا آشرم تھا، میں دن بھر دُور کی بھیگ مانگتی، اور رات

آشرم میں رو رو کر:

گزارتی، اور اپنے آنسوؤں کا ہارا اپنے بچی کی اس تصویر پر چڑھاتی:

”یہاں میرا بچہ نہ تھا، بھیک مانگ کر کچھ پیسے جمع کئے“

”اور آپ سبوں پور کے بڑے آشرم میں جا رہی ہوں“

”یہ جلد نہ بچی نہ ہونے پایا تھا کہ گاڑی موہن پور کے جکشن پر رُکی، میں نے

تعلی کو پکارا۔

”تعلی نے آشرم تک اسباب لے جانے سے انکار کر دیا۔

اسباب پریٹ فارم پر پڑا تھا۔

میں سبھی گاڑی سے اُترا، وہ رخصت ہو گئی۔

”یہاں سے آشرم کتنی دور ہے؟“ اُس نے دہلی ہوئی آواز میں پوچھا

”دو میل کے فاصلے پر۔ اس کی مزدوری چار آنے ہوگی“ قلی نے کہا

”مگر میرے پاس اتنے پیسے کہاں؟“

”میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک گئے!“

”میں نے چار آنے پیسے قلی کو دئے اور کچھ پیسے اس یتیم بچی کی ماں کو،

اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی، میں گاڑی پر سوار ہو گیا

(۵)

گاڑی پریٹ فارم چھوڑ چکی تھی

عورت آہستہ آہستہ آشرم کی طرف جا رہی تھی۔

مشرق کی طرف آفتاب عالت بے نقاب ہو رہا تھا۔

اور

میرے دل میں بوہ کی یہ آواز گونج رہی تھی

”پرمانہ کے سینے میں شاید دل نہیں ہے؟“

مذہب سے اخلاف کرتے رہتے  
فیجے سے اخلاف کرتے رہتے  
شاہ گم نہ مدعا مل جائے  
اپنے دل کا طواف کرتے رہتے  
(آزاد کشمیری)

## انٹارزا

لاؤڈنسنی Democracy کے ایکٹ ڈرامہ *Tenito or Ka Aalam* کا ترجمہ  
افراد ڈرامہ

بادشاہ

بنارپ *Banarab* { بدیعینی اوٹ ہائے والے  
آؤب - *Aoub* -

چمبرلین *Chamblain* -

زہرا *Zabra* ایک سرزشتیت

انٹارزا *Eznarza* - ایک عرب دشمنہ (جس سے بادشاہ محبت کرتا ہے)  
سائین و شہر تیلہ کے بہانک کے باہر  
وقت - نامعلوم

### ایکٹ پہلا

بلنارپ - آفتاب غروب ہونے تک ہم ریگستان میں ہوں گے۔

آؤب : ہاں ! - - - - -

بلنارپ - تب ہم ہفتوں شہر سے دور رہیں گے

آؤب - آہ - - - - -

بلنارپ - اودہ - - - - - ہم شہر کی خوشناروح پر درویشی

اوٹوں کے راستوں پر آؤری بار چھلکتی ہوئی دیکھیں گے۔

آؤب - اور پھر ہم ایک زبردست حبیب ریگستان میں داخل ہو جائیں گے۔

بلنارپ - آؤ - - - - - ریگستان - - - - - کتنا خوفناک - - - - -

## صدقہ بیگم سیوہارہ

اس قدر بیگانہ - - - - - مجھے اس کے نام ہی سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

آؤب - دیکھو - - - - - ریگستان کس چال کی سے کنوؤں کو انسان

کی نظر سے چھپا لیتا ہے۔ نہ معلوم اسکو انسان سے کہا دشمنی ہے۔

بلنارپ - ہاں - - - - - آؤب وہ انسانی دشمن ہے، اس نے مجھے

بھی اس سے نفرت ہے۔

آؤب - سہائی - - - - - میرا خیال ہے کہ دنیا میں اتنی حسین، اتنی

خوبصورت، اتنی دلکش کئی شے نہیں مٹنا کہ شہر۔

بلنارپ - ہاں - - - - - ذاتی شہر ہیبت خوبصورت ہوتے ہیں۔

آؤب - میرا خیال ہے کہ جب آفتاب پردہ افق سے غوردار ہوتا ہے۔ فتنہ

رفتہ تاریکی دور ہو جاتی ہے، آفتاب کی سنہری کرنیں شہروں کے گلابی رخساروں

کا بوسہ لیتی ہیں، اس وقت تمام عالم جگمگا اٹھتا ہے، خوبصورت عالی شان محل

دریا میں فن عکاسی کو بایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، ہاں اس وقت شہر کس قدر

دلکش و دلغریب نظر آتے ہیں، انسانوں کے بولنے کی آوازیں فضا میں بلند ہو کر

یکجا ہو جاتی ہیں۔ ایسے خوشنما وقت میں میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ شہر میری

طرف مائل ہو کر کہتا ہے۔ آؤب - - - - - آؤب - - - - - اب

ایسے وقت میں کون مرے گا - - - - - میں - - - - - نہیں - - - - -

میں ہرگز نہ مروں گا۔

بلنارپ - آؤب ! میں تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کرتا، جس وقت

آفتاب اپنی دن کی مسافت طے کر کے اپنی خوابگاہ کا رخ کرتا ہے، اس وقت

ایک ہلکی دلکش روشنی سڑکوں پر سے غائب ہوتی نظر آتی ہے - - - - - اس وقت

آؤب۔ ہاں وہی ————— وہ کیا ہے؟





بلنارب۔ شخص ٹیک کہتا ہے۔۔۔۔۔ میں نے بھی اس کو اکثر تکہ میں دیکھا ہے۔

چیمبرلین۔ حضور صحت فرمائیے (سر جھکا لیتا ہے) ریگستان کی آب و ہوا کو حضور بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔

ذرا۔ (آہستہ گفتگو کرتے ہوئے) میں بادشاہ کو پیچتا ہوں۔

آؤب۔ اور میں بھی۔۔۔۔۔

بلنارب۔ (بادشاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس شخص کو بہت کچھ انعام و اکرام دو اور اس کو محل میں کسی اچھی جگہ پر مامور کر دو۔

چیمبرلین۔ بہت اچھا حضور۔۔۔۔۔

بادشاہ۔ میں ایک بدبو ہوں، اور اب اپنے اونٹوں پر جارہا ہوں۔

چیمبرلین۔ جیسی تمہاری مرضی ہو۔۔۔۔۔

(بلنارب۔ آؤب۔ چیمبرلین۔ ذرا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہیں)

اذنارشا۔ (عربی دوشیزہ) آپ نے بہت عقلمندی سے کام لیا، اور عقلمندی کا انعام ہمیشہ خوشی ہوتا ہے۔

بادشاہ۔ (ہنستے ہوئے) اب اُن کو بادشاہ مل گیا اور ہم عربوں کے غیوں پر واپس چلیں گے۔

اذنارشا۔ اوہ۔۔۔۔۔ وہ لوگ کیسے برفوت ہیں۔

بادشاہ۔ اور اُن کو برفوت بادشاہ بھی قبول کیا ہے۔

اذنارشا۔ وہ آدمی کس قدر برفوت ہے جو چار دیواری کے اندر گرفتار رہ کر زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔

بادشاہ۔ کچھ لوگ پیدائشی بادشاہ ہوتے ہیں، لیکن اس شخص نے بادشاہ بنا پسند کیا ہے۔

اذنارشا۔ چلو اب ہم واپس چلیں۔۔۔۔۔

بادشاہ۔ ہاں! اب ہم واپس چلیں گے، اور ہم اپنے خوبصورت خیمہ میں لوگوں سے تھوڑے فاصلہ پر رہیں گے۔

اذنارشا۔ ہاں!۔۔۔۔۔ اور وہاں ہم ریت کے سرے دیکھنے نئے سینس گے؟

بادشاہ۔ اور دوسرے لوگوں کی بول چال کی آوازیں جی ہمارے کانوں میں آئیں گی۔۔۔۔۔ اور جب سلطان خادراہنی خوابگاہ کی طرف رخ کرے گا، اس وقت دنیا اپنا ماتی لباس زیب تن کرے گی۔ لیکن اس وقت ہم اپنے گزشتہ زمانہ کو یاد نہ کریں گے۔

اذنارشا۔ رات کے وقت میں خیمہ سے اپنا سر باہر نکالوں گی، ذریں ستار

میرے ریشمین بالوں میں ٹٹانے ہوئے نظر آئیں گے، اُس وقت ہم دنیا کی حسین سے حسین ترین ملکہ پر بھی حسد نہ کریں گے

## جذبات شہید

یہ منزل دشوار کہیں جلد بھی ہو طے ہمراہ گراں گام! ذرا تیز ذرا تیز

تقدیر کا قائل نہیں وہ مردِ جواں عزم رکھتا ہے تصرف میں جو دستِ فلک آویز

منصور نہیں قابلِ تعزیر تھا ساقی کیوں اس نے سبک جام کو تلخا بہ دیا تیز؟

کیا جانئے اب کس سے ہم آغوش ہوشیاریں پیدا ہوئے پھر دہر میں تیشہ زن و پر ویز

میں کیف میں کیا کہہ گیا اللہ ہی جانے

مے ریز تھا براور سماں کیفیت انگیز

# اورنگ زیب اور راجہ حسونت سنگھ

کوثر چاند پوری

کون نہیں جانتا کہ اورنگ زیب نہایت دیں دار اور ستمی بادشاہ تھا، اور یہی اس کی ایسی زبردست خطا ہے جس نے اورنگ زیب کو ہندوؤں الزامات کا ہدف بنا دیا ہے۔ حالانکہ جو لوگ دین اور مذہب کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ ایک مسلمان بادشاہ جس کے تمام افعال و اعمال اسلام کے دائرے میں محدود ہوں کسی حالت میں بھی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بے انصافی نہیں کر سکتا، نہ ان کے مذہبی حقوق اور آزادی کو سلب کرنے کی جرأت کر سکتا ہے، وہ اسلامی قانون کی روش سے مجبور ہے، کہ مختلف طبقات رعایا میں عدل و مساوات کی میزان کے پرے برابر رکھے۔ اگر کوئی پلڑا بھی جھپک گیا تو عاقبت میں اُس کی سزا سنگین پڑے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب پکا مسلمان تھا، مگر یہ بھی اقصیٰ ہے کہ وہ نہایت سیاسی، دور اندیش اور بیدار انسان تھا، اُس نے مذہب کو ہمیشہ سیاسی سر بند یوں کے لئے بطور آلہ کار استعمال کیا ہے، اور یہ کہنا حقیقت سے لاعلمی کا ثبوت دینا ہے کہ اس نے ہر کام مذہب کی دوستی میں کیا ہے، وہ بیک وقت مسلمان بھی تھا اور بادشاہ بھی، اس لئے جو لوگ اس کی دلائل حقیقتوں کو جدا لگانے نقطہ نظر سے نہیں دیکھ سکتے، وہ اس کی زندگی کے ایک رخ کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے ہر کام میں مذہبی رنگ پیدا کر دینا ایک سخت متم کا تعصب ہے جس کے لئے جہالت اور بے بصیرت لازمی ہے، اورنگ زیب نے شروع سے آخر تک جو کچھ بھی کیا وہ خالص سیاست اور جہان بینی کے اصول سے کیا، باپ اور بھائیوں کے ساتھ اس نے جبر و تسلط اختیار کیا، اس میں بھی ملکی اور سیاسی انداز کا فرما تھے، اور ایک اولیٰ المزم بادشاہ کو اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ بیٹوں کے ساتھ بھی اس کا

یہی عمل رہا، اس کا بیٹا محمد منظم بلایا ہوا آتا ہے، اور ذرا سے شبہ پر بادشاہ تو پلو کا منہ اس کے لشکر کی طرف پھیر کر حکم دیتا ہے کہ ہتھیار اتار صرف بیٹوں کو ساتھ لے کر آؤ۔ پھر اسی بیٹے کو معاف کر دینا کی بجائے گیلوں سے متاثر ہو کر قید کر لیتا ہے اور اس وقت تک رہا نہیں کرتا۔ جب تک دکن کی صورت حال سے مطمئن نہیں ہو جاتا، اگر بغاوت و سرکشی کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں بھی اورنگ زیب وہی سیاسی چالیں چلتا ہے جو کسی خطرناک غنیم کے ساتھ چلی جاسکتی ہیں، جس سے بیٹے کی فوج کے عہدہ سرداروں کو اس سے تورتا ہے، اس کے لشکر میں پھوٹ ڈالتا ہے اور اس طرح بغیر تلوار میان سے نکالے دفتہ نقشہ جنگ کو بدل دیتا ہے، اورنگ زیب کے بھائی اور بیٹے سب مسلمان تھے، اس لئے یہاں قدر قابل مذہبی تعصب کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ ساری کارروائی اور سیاسی امور سے متعلق تھیں، لیکن یہی سیاسی اور ملکی ضرورتیں غیر مسلم سرداروں اور باغیوں کے بالمتقابل استعمال کی جاتی ہیں تو جہاں اور بے بسہ۔

محترم خورائیں تعصب اور ہندو کشی سے تعبیر کرتا ہے، چنانچہ سیوا جی اور اس کے خیرہ سر بیٹے سبھا پر اسی اصول کے ماتحت فوج کشی کی جاتی ہے، اور انھیں اسیر و دستگیر کرنے کی سعی میں لائی جاتی ہے تو یہ سیاست اور ملکی ضرورت بلکہ کسی وقت کے تعصب اور تنگ نظری میں تبدیل ہو جاتی ہے، حالانکہ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ سیوا جی مرہٹہ اورنگ زیب کا باغی اور اس کی حکومت کا بدترین دشمن تھا۔ سبھا کی حیثیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ یہ دونوں حکومتیں مغلیہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتے تھے، مقبوضات شاہی پر خاصاً قبضہ کرتے تھے، بادشاہ کی رعایا کو لوٹتے اور اُن کے کھدوں کو تباہ کرتے تھے

پھر سہی اوندنگ زیب اُن کے استیصال کی غرض سے فوجی قوت استعمال کرتا ہے، اور عساکر مغلیہ کو حرکت میں لاتا ہے تو اس اہم اور ملکی خدمت کو اس کے اسلامی جذبات سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔

بہیں تبادلت رہ از کجاست تا بہ کجا

اور رنگ زیب اور ہمارا جہنم سنگہ والی جو دھور کا معاملہ بھی اسی ذمیت کا ہے اگرچہ اس میں اذل سے اڑتک اور رنگ زیب کی فیاضی، فزاضی اور غم و درگزر کی سوا اثر اور حیرت انگیز شائیں مٹی ہیں۔ مگر ان سب کو نظر انداز کر کے ایک یا چند غلط فہمیوں کی بنا پر جو یورپین مورخین کی حماقت کے باعث پیدا ہو گئی ہیں، اُسے بدنام و رسوا کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے، اگرچہ ان ہر ذہ سرائیوں کے خلاف متعدد بار آواز بلند کی جا چکی ہے۔ بالخصوص علامہ شبلی مرحوم نے اس خصوص میں نہایت کامیاب اور قابلِ تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ مگر جو لوگ جھوٹ بولنے اور فساد پھیلانے کے عادی ہوتے ہیں، ان پر دلائل کی معقولیت اور واقعات کی اصلیت کا اثر نہیں ہو کرتا، ان کا مقصد عسرت یہ ہوتا ہے کہ فرضی اور غلط افسانے بیان کر کے ہنگامہ برپا کریں اور بس، چنانچہ اسی عادتِ قدیدہ اور فضیلتِ لئیم کی بنا پر آج بھی اورنگ زیب کے خلاف غیر ذمہ دار حضرات کی زبانیں اور اُن کے قلم اپنے کام سے غافل نہیں۔ اس کام کی اہمیت کو وہ خود بھی اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اپنی اغراض سے مجبور ہیں اور اجنبی اقتدار کی ریشہ دوانیاں رہ رہ کر انہیں اس شرارت پر اکساتی اور آمادہ کرتی ہیں یہی راز ہے جو بار بار شاہجہاں اور عالمگیر کو موردِ طعن بنا پا جاتا ہے، اور ان پر بے بنیاد، دل آزار حملے کئے جاتے ہیں، غور و تامل سے دیکھا جائے تو ان غلط فہمیوں کا سرچشمہ جو عالمگیر کے خلاف پھیلائی جاتی ہیں۔ انگریز مورخین کی وہ کتابیں ہیں جو ایک غیر ملک میں جھینگریاں، یہاں کے رسم و رواج اور خصوصیات سے بے خبری کے عالم میں انہوں نے مرتب کی ہیں، اور بعض اس وجہ سے کہ یورپ کے آسمان سے نازل ہوئی ہیں، ناواقف اور متعصب لوگ ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کی تاریخ ہندو یوں سے بہتر اور کوئی شخص بیان نہیں کر سکتا۔

موجودہ زمانہ میں جب کہ ہندوستان صدیوں تک سوچنے کے بعد متحدہ قومیت کا خواب دیکھ رہا ہے اور اربابِ فکر و نظر اس کی تعبیریں تلاش کر رہے ہیں۔ اس قسم کی بیچورہ گفتاریوں کا سلسلہ قطعاً بند ہو جانا چاہیے،

لیکن انہوں کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مدرین یورپ نے جو دھریلے اثرات بکھڑے ہیں ہمارے دل و دماغ پر ابھی ان کا کافی اثر موجود ہے، چنانچہ ابھی حال میں ایک تاریخی افسانہ انتقام کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے مصنف ڈاکٹر ملکشی دت صاحب ہیں، میری رائے میں یہ افسانہ تاریخی حقائق سے زیادہ تلخ گفتاریوں، اور افسانہ طرازیوں کا حامل ہے، مجھے خوشی ہوئی اگر اس نامور مصنف معمولی سی تحقیق و کاوش سے بھی کام لیتے، اگر علامہ میرا اور مصنف ہی کا ہوتا تو یقیناً میں اس کا جواب دے کر اپنی اور اپنی معلومات کی تہین بالقصہ کام تکب نہ ہوتا۔ لیکن صورتِ حال دوسری ہے، اور یہ سیت لفرڈ سے گزر کر ملک کو بھی محسوس کر سکتی ہے، اس لئے میری وطن دوستی مجھ سے مطالبہ کرتی ہے کہ میں ان تاریخی صداقتوں کو عالم آفشاں کا ردِ دل، جن کو کذب و افزائے غبار سے دھندلا کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان ایک نئے قومی دور سے گزر رہا ہے، اس وقت تک وہ اپنی متعین کی ہوئی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک ہمارے خیالات اور عزائم میں بلندی پیدا نہ ہو۔ غیروں کی بیان کی ہوئی جھوٹی داستانوں پر اعتماد کرنے کی مذہم عادت خود اعتمادی کے باطل خلاف ہے، اس لئے ہیں اس کے خلاف پوری قوت سے جہاد کر کے اپنے ارادوں میں بلندی اور خیالات و محسوسات میں پاکیزگی پیدا کرنی چاہیے۔ علامہ شبلی کی کتاب عالمگیر پر ایک نظر اور اس کے تمام ناخیز میرے سامنے ہیں، اور میں کوشش کروں گا کہ جس چیز کو علامہ مرحوم نے ایجا ذ و اختصار کے ساتھ پیش کیا تھا، تفصیل و وضاحت سے بیان کروں، اور ان ضروریات کا بھی احاطہ کر لوں جو بعد میں پیدا ہوئی ہیں۔

ہمارا جہنم سنگہ و شخص ہے جو اورنگ زیب کی اقبالندی کا آفتاب طلوع ہونے ہی، اس سے ٹکرایا۔ اُجین کے مقام پر جس کو عالمگیر کے "خورشیدِ اقبال" کا مطلع کہنا چاہیے۔ راجہ جہنم سنگہ ہی تھا جس نے اورنگ زیب کی سلطنت و اقتدار کے تیز و صاعے کو روکنے کے لئے نیزہ و شمشیر کا استعمال کیا۔ مگر وہ طاقت و شجاعت کے اس سیلاب کو نہ روک سکا اور بالآخر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ میرا خیال ہے کہ واقعات کو سمجھانے میں "اشادات" سے حسبِ دلخواہ ادا نہیں مل سکتی۔ اس لئے ضروری تفصیلات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کے لئے فوج بھیجنے کی فکر کرنے لگا، آخر ایک زبردست لشکر راجہ جسونت سنگھ راجپوت کی زیر سرکردگی اجین روانہ کیا، اس سے مقصد یہ تھا کہ دریائے زہرہ کے گھاٹوں پر قبضہ ہو جائے، اور عالمگیر آگرے کا رخ نہ کر سکے۔

مراد اور شجاع کی طرف سے داراشکوہ نے بادشاہ کو برم کر دیا تھا، وہ چاہتا تھا پیسے ان دونوں کا قند نام ہو جائے، اور عالمگیر تہارہ جائے تاکہ اس کا مقابلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، شجاع کی سرکردگی میں فوج جا چکی تھی، مراد کا یہ انتظام ہوا کہ قاسم خاں کو لشکر دے کر راجہ جسونت سنگھ کے ہمراہ بھیجا گیا تاکہ ضرورت کے وقت مراد کو گجرات سے بے دخل کر دے۔

اگرچہ اورنگ زیب نے اب تک باپ کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا تھا اور نافرمانی کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا تھا، لیکن داراشکوہ نے الجھوٹی خبریں بیان کر کے بادشاہ کو اس کی طرف سے بھی مخبرت کر دیا، اور اس کے وکیل یعنی بیگ کو گرفتار کر کے اس کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔

### اورنگ زیب اور جسونت سنگھ کا مقابلہ

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اورنگ زیب بجا پور کے محاصرے میں مصروف تھا کہ فوجوں کی دالہسی کے لئے شاہی فرماں پہنچ گیا۔ اور اس نازک وقت میں اورنگ زیب تہارہ گیا، مجبوراً وہ سکندر عادل شاہ سے صلح کر کے اورنگ آباد آگیا۔

یہاں آکر عالمگیر نے اگرہ جانے اور داراشکوہ کے اختیارات کو کم کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا، اس کا خیال تھا کہ مراد کو بھی ساتھ لے جائے اور باپ سے اس کا قصور معاف کرائے۔

اورنگ زیب اچھی طرح جانتا تھا کہ داراشکوہ اُسے دربار تک نہ پہنچنے دے گا۔ جہاں تک ممکن ہو گا باپ اور بیٹے کی ملاقات میں رکاوٹیں پیدا کر گیا، اس کے علاوہ اگرہ جانے کے لئے مارے سے گزرتا ضروری تھا، جہاں راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں اپنا لشکر لے پڑے تھے۔ اور قلعہ ہندی کر بے تھے، ان حالات کا افتخار تھا کہ وہ بھی تیار ہو کر جائے، اور اپنے راستے سے رکاوٹوں کو دور کرتا ہوا اگرہ پہنچ جائے، اس خیال سے اس نے اپنی فوج درست کی، امر کی استقامت کیسے ان کو مناصب و حکامات عطا کئے۔ شاہزادہ مراد کو پیام بھیجا کہ تم بھی مارے کی طرف بڑھو اور زہرہ کو

۱۰ رزی انجوش تہارہ کو اورنگ زیب کا باپ اور شاہشاہ ہند شاہجہاں بیار ہو گیا، اور کمروری کے باعث سلطنت کے نظم و نسق کی نگہ رانی نہ کر سکا شاہجہاں کے چاندوں بیٹوں میں سے صرف داراشکوہ جو اپنے متعلق ولی عہد ہونے کا یقین رکھتا تھا، بادشاہ کے پاس موجود تھا، اورنگ زیب دکن میں قلعہ بیجا پور کی بند اور سنگین دیواروں پر اپنی قوت آزمایا رہتا تھا، مراد گجرات کی صوبہ داری کے جھگڑوں میں الجھا ہوا تھا، شجاع بنگالہ میں تھا، داراشکوہ نے میدان خالی دیکھ کر کاروبار حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ساتھ ہی یہ بے عقلی بھی کی کہ داراشکوہ کی خبروں کا باہر جاننا بند کر دیا، خطوط پر نگہ رانی قائم کر دی، امراراد شاہنشاہ دکن کے دکھار کو سختی سے مانعت کر دی کہ دربار کی کوئی خبر نہ لکھیں، داراشکوہ کی اس ناقص اندیشی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بادشاہ کی موت اور زندگی کے معاملہ میں لوگوں کو شبہات پیدا ہونے لگے، رعایا جو بادشاہ کے دشمن کی مادی ستمی اس دولت سے محروم ہو گئی۔ ملک میں اس سربے سے اس سربے تک بیجا ہوا گیا، جگہ جگہ فتنے برپا ہونے لگے۔

مراد بخش نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے خطبہ اور سنگ جاری کر دیا۔ شجاع بھی خاموش بیٹھنے والا نہ تھا، اس نے بھی طرہ مختاری اور آزادی کا دعویٰ کیا، اور پٹنہ پر قبضہ کر کے بنارس تک آگیا، اورنگ زیب ان سب میں عقلمند اور دور اندیش تھا، اس نے اپنے دامن کو خود سری اور بغاوت کے داغ سے محفوظ رکھا۔

داراشکوہ خوب سمجھتا تھا کہ اورنگ زیب کے علاوہ اس کے کسی بھائی میں مقابلہ کی ہمت نہیں، عالمگیر کی دانشمندی اور شجاعت کا اس پر کافی اثر تھا، یہ وہ وقت تھا جب عالمگیر بجا پور کے محاصرے میں مصروف تھا اور فتح کے آثار پیدا ہو گئے تھے، داراشکوہ کو معلوم تھا کہ اورنگ زیب کے پاس کافی لشکر موجود ہے، وہ جس وقت چاہے گا داراشکوہ پر حملہ کر دے گا چنانچہ اورنگ زیب کا زور توڑنے کی اس نے یہ تدبیر کی کہ امدادی لشکر کو جو فتح بجا پور کے لئے مامور ہوا تھا بادشاہ سے کہہ کر واپس بلا لیا، تمام امراد حکم شاہی کی تعمیل میں ہم کو ادھورا چھوڑ کر حضور میں آ گئے، اورنگ زیب تہارہ گیا، بیسے بڑے امیروں میں سے منظم خاں، شاہنواز اور شجاعت خاں کے علاوہ کوئی امیر اس کا شریک حال نہ رہا۔

داراشکوہ، بادشاہ کو دہلی سے آگرے لے آیا، اور مراد و شجاع کی تنہی

ہے، اگرچہ اس حیثیت سے کہ وہ داراشکوہ کے احکام کی تعمیل کر رہا تھا، اور بالفاظ دیگر اپنے فرائض کی بجائے آدرسی میں وفاداری سے کوشش کر رہا تھا، راجہ کو کسی طرح مورد الزام نہیں بنایا جاسکتا، لیکن اورنگ زیب اور راجہ کے تعلقات پر اس وفاداری کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، داراشکوہ اور عالمگیر کی حیثیت ایک تھی، ایسی صورت میں، راجہ کو ان کے معاملات میں دخل نہ دینا چاہئے تھا، اگرچہ اس میں داراشکوہ جن فریب کاریوں کے جال بچھا رہا تھا، راجہ ان سے بھی بے خبر نہ تھا، اس وقت بھی مناسب تھا کہ وہ عالمگیر کو نہ چھیڑتا اور نہ مل جانے دیتا، ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا بعید از عقل نہیں ہے کہ اورنگ زیب کو راجہ حبوت سنگھ کی بے ادبی سخت ناگوار ہوئی ہوگی، اور اقتدار و سلطنت حاصل کرنے کے بعد اگر وہ اس سے انتقام لینے کی سعی کرتا تو قطعی حق بجانب ہوتا، مگر دیکھنا یہ ہے کہ اورنگ زیب کی یہ ہم جو مالہ سے کی لڑائی سے شروع ہوئی تھی بادشاہت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی، تو اس نے اپنے شکست خوردہ راجہ حبوت سنگھ کے ساتھ کیا کیا؟ اس کا جواب نہایت مختصر ہے، یعنی اورنگ زیب سر پر آرائے سلطنت ہوا تو پہلے ہی سال راجہ حبوت سنگھ نے معافی اور قصور کی درخواست پیش کی، اور عالمگیر نے اپنی شاہانہ فیاضی سے اس کا تصور خاف کر دیا، جن دنوں کے موقع پر منصب اور خلعت بھی عنایت کیا۔

### راجہ حبوت سنگھ کی غداری

اُجین کی جنگ کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ حبوت سنگھ نے عالمگیر کا مقابلہ کر کے اپنا وہ فرض ادا کیا تھا جو شاہی حکم کی رو سے اس پر عاید ہوتا تھا اسی لئے ہم بھی قضیہ اُجین کو نظر انداز کئے دیتے ہیں، اور راجہ کی غداریوں کا اس وقت سے شمار کرتے ہیں، جب شجاع کی لڑائی میں دفعہ وہ اورنگ کے لشکر سے بھاگ کر سخت نقصان اور فتنہ کا باعث ہوا تھا، ہم اس واقعہ کو بھی تفصیل سے بیان کریں گے تاکہ وقت کی نزاکت اور عالمگیر کی مشکلات کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے، اور بادشاہ کی رد و اداری و فیاضی کا اندازہ کرنے میں کوئی غلطی نہ ہو، اورنگ زیب نے اپنے بھائی شجاع کو صلح و آسشتی کی دعوت دی لیکن اس نے دل سے اس کی پذیرائی نہ کی۔ آخر کار ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۹۶ھ کو اورنگ زیب شجاع کے مقابلہ کو چلا، اور شجاع کے لشکر سے نصف کوس کے فاصلہ پر تھم ہوا۔

مہر کر کے ہم سے آئے، ان انتظامات سے فارغ ہو کر اورنگ زیب ۱۲ جمادی الثانی ۱۰۹۶ھ کو اورنگ آباد سے برہان پور کی طرف بڑھا، برہان پور سے اس نے باپ کی خدمت میں مزاج پرسی کے لئے عریفہ لکھا، جواب کے انتظار میں ایک مہینہ تک وہاں قیام کیا، لیکن جواب نہ آیا، اور دشتناک خبریں برابر آتی ہیں مجبوراً ۵ جمادی الثانی کو وہ برہان پور سے اکہڑا باد کی طرف چلا، وہاں پور سے نکلا تو شاہزادہ مراد بھی اس کا شریک سفر ہو گیا۔

راجہ حبوت سنگھ نے اُجین سے سات کوس بڑھ کر شاہزادوں کو روکا، اورنگ زیب کی نیت خواہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ لڑائی سے بچنا چاہتا تھا، اس نے راجہ حبوت سنگھ کے پاس کہلا بھیجا کہ میں باپ کی زیارت کو جا رہا ہوں، لڑائی کا ارادہ نہیں رکھتا، بہتر ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو ورنہ راستہ سے ہٹ جاؤ، راجہ نے اس پیام کا کوئی اثر نہ لیا، اور جنگ و جدل پر آمادہ ہو گیا۔

۲۲ رجب ۱۰۹۶ھ کو جمعہ کے دن اورنگ زیب نے اپنا لشکر رات کیا۔

عالمگیر نامہ کی روایت ہے کہ راجہ حبوت سنگھ نے اورنگ زیب سے مرعوب ہو کر کہلا یا کہ میں لڑنا نہیں چاہتا، بلکہ اطاعت و ملازمت کا قصد رکھتا ہوں، اورنگ زیب نے اس کی بات کا اعتبار نہ کیا، اور جواب دیا کہ سچے ہو تو تنہا شجاعت خاں کے پاس جاؤ وہ شاہزادہ محمد سلطان کے پاس نہیں لے جائے گا، شاہزادہ ہمارے پاس لائے گا، راجہ نے اس حکم کی تعمیل نہ کی، اور لڑائی کے اہتمام میں مصروف ہو گیا، ہزاروں بہادر راجپوت اور مسلمان اس کے ساتھ تھے، لڑائی شروع ہوئی اور تیر و تنگ سے گزر کر دست بردست مقابلہ ہونے لگا، راجپوتوں نے اورنگ زیب کے ہر اولیٰ پر زبردست حملہ کیا، اورنگ زیب اس معرکہ میں خود شریک تھا، اس نے دشمن کا منہ پھیر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ حبوت سنگھ شکست کھا کر اپنے وطن جو دھپور چلا گیا اور قہراً لشکر شاہی کے ساتھ فرار ہوا۔

یہ تھی اورنگ زیب اور حبوت سنگھ کی مخی حکمت کی ابتدا، جس سے عدل طور پر پتہ چلتا ہے کہ عالمگیر جن دسکون کے ساتھ مالہ کی سرحد سے نکل جانا چاہتا تھا، مگر راجہ کی فساد مادی نے اس کے امکانات باقی نہ رکھے، اور مجبوراً لڑائی تک ذرت پہنچی، جس کی تمام ذمہ داری راجہ حبوت سنگھ کے سر عاید ہوئی

دو لڑائیوں نے سانسے پڑے تھے، گولہ اندازی اور نادر کا فتنی ہو ہی  
تھی، رات کے وقت شجاع نے اپنا توپ خانہ جو اورنگ زیب پر گولہ باری  
کرنے کی غرض سے میدان میں بھیجا گیا تھا واپس بلا لیا۔ اور اپنی ساری فوج  
کو اکٹھا کر لیا، لشکر آراستہ ہو چکے تھے۔ مگر باقاعدہ جنگ کی نوبت نہ آئی  
تھی، سدرج غروب ہو گیا تو عالمگیر نے حکم دیا کہ فوج کی ترتیب اور آراستگی  
میں فرق نہ آئے، سپاہی گھوڑوں سے اُڑائیں۔ مگر اسلحہ نہ انارہیں اور  
سلاح ہو کر لشکر کی حفاظت کرتے رہیں۔ سردار ان سپاہ فوج کے آگے موج  
بنا کر دشمن کی نقل و حرکت کو غور سے دیکھتے۔ یہ احکام دے کر بادشاہ ایک  
چھوٹے سے خیمہ میں جو لشکر گاہ میں نصب تھا چلا گیا، فوج رات بھر لوہی  
مستعد کھڑی رہی نہ ہتھیار الگ کئے گئے نہ گھوڑوں سے زمین اتارے گئے،  
رات کے آخری حصے میں دھندہ لشکر میں ایک شور برپا ہوا اور زبردست  
ہیجان پھیل گیا۔ معلوم ہوا کہ جسوت سنگھ لشکر کو لٹا، کھسوتا، قتل و  
خواریزی کرتا ہوا شجاع کے پاس جا رہا ہے، یہ بہت ہی خراب وقت تھا،  
لشکر میں سخت برہمی اور بے چینی پھیل گئی، اور جہد انتظامات میں خلل پڑ گیا،  
جسوت سنگھ نے شجاع سے سازش کر کے طے کر لیا تھا کہ میں رات کو شاہی  
فوج پر شب خون ماروں گا اور لوٹ مار کے بعد وہاں سے بھاگے لگوں گا  
تو بادشاہ میر تقی قاب کرے گا۔ عین اسی وقت شجاع کی فوج لشکر شاہی پر  
حملہ کر دے۔

چار پانچ گھنٹے رات باقی تھی کہ اس قرار داد کے موافق راجہ جسوت  
نامور راجپوتوں اور رام سنگھ راتھور، ہمیش داس اور زبردست فوج کے  
ساتھ متحرک ہوا، بادشاہ، امراء، اور شاہزادوں کے جس قدر کارخانے  
اس کے راستہ میں پڑے سب کو اچھی طرح اس نے لٹا، جو اس کا ردوائی  
میں مانع آیا راجپوتوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ شاہزادہ محمد سلطان کو راجہ  
کی اس فزائی سے بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس کا کوئی خیمہ راجپوتوں  
کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا۔ بادشاہی خزانے اور کارخانے بھی لوٹ سے  
نہ بچے، اور دولت خانہ تک تمام خیموں پر راجپوتوں نے ہاتھ عسات کیا،  
دیر تک اس شور و غوغا کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔ لشکر میں قیامت برپا تھی،  
اور عجیب ختم کا تفرقہ پڑ گیا تھا، کوئی راجپوتوں کے ساتھ لڑ جاتا کوئی دشمن  
کے پاس چلا جاتا، اور وہاں مارا جاتا، امراء جو بادشاہ کے ساتھ تھے اپنے

خیموں اور اہل و عیال کی دیکھ بھال کو دوڑے کسی نے جنگ کی طرف بھاگ کر  
وہاں پناہ لی۔ بزدل اور منافق تو الگ رہے، اچھے اچھے جاں نثاروں اور  
پناہ دہوں کے قدم ڈنگا گئے اور اتنی ہیبت طاری ہو گئی کہ ایک راجپوت بھی  
نیزہ سے کر آتا تو پوری جماعت کی جماعت بدحواس ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ  
جاتی، راجپوت لڑے ہوئے اونٹوں کو گھیر کر لے جانے لگے، تو کسی کو رد کرنے  
کی ہمت نہ ہوتی، غرض فوج میں ایسی اتہری پھیلی کہ سارا نظام درہم و برہم  
ہو گیا، لیکن عالمگیر کی شجاعت اور دلیری دیکھنے کے اس کی جبین استقلال پر  
بل بھی نہ آیا، جب اس کو اطلاع ہوئی کہ جسوت سنگھ بھاگ گیا تو اس نے  
ذرا بھی پریشانی اور اضطراب کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ ہاتھی پر بھی سوار نہ ہوا،  
اور تختہ روال پر بیٹھ کر اہل سقر کے کہ فیل سواروں اور گھوڑا سواروں  
کو تاکید کر دیں کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، اگر کوئی بھی ہٹے تو نہایت ذلت سے کھینچتے  
ہوئے ہمارے پاس لائیں۔

بادشاہ اس خطرناک اور نادرک وقت میں بھی نہایت مطمئن تھا۔ بلکہ مذاکا  
شکر کر رہا تھا کہ اس طرح منافق و غمخس میں تمیز ہو گئی، جو لوگ اپنی بے عقلی  
کے باعث راجہ کی اس حرکت کو دشمن کی فتح خیال کر کے اس سے جا ملے ہیں،  
وہ جلد اپنے کفر کو دار کو پہنچیں گے۔ باوجودیکہ آدمی لشکر فرار ہو کر غنیمت  
سے جا ملتا، لیکن اورنگ زیب برابر اپنے کام اور لڑائی کے انتظام میں  
مشغول رہا، صبح کو معلوم ہوا کہ راجہ جسوت سنگھ آگے چلا گیا۔ بادشاہ نے  
اس کی کوئی پروا نہ کی اور ہاتھی پر سوار ہو کر لڑائی کا بندوبست کرتا رہا۔  
جسوت سنگھ کی جگہ اسلام خاں برائدار کا سردار مقرر ہوا۔

ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ راجہ جسوت سنگھ جس پر اعتماد کر کے اورنگ زیب  
نے ایک بھاری فوج کا افسر بنا دیا تھا، اس ضمن کشی اور کفرانِ نعمت میں کہاں  
تک حق بجانب تھا، اور اس کی یہ نڈاری کس قدر خطرناک شرارت آمیز، اور بڑا  
تھی، عالم گیر کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کے گرفتار اور ہلاک ہونے  
میں کیا کمی رہ گئی تھی، لیکن یہ عالم گیر ہی تھا کہ نصف لشکر کے فرار ہو جانے اور  
مالات کارخ پھر جانے پر بھی اس کے ہائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی اور پہاڑ  
کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا۔ حتیٰ کہ فتح و کامرانی نے اس کے قدم چمے اور دشمن  
تباہ و برباد ہوا۔

صاحب سیرالتواریخ اس واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

اور سازشوں کے لئے آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا تھا، چنانچہ محمد امین خاں کو وہ ہزار ہا روپے کا سر دار بنا کر سعد اللہ خاں کے ہمراہ حبوت سنگھ کی تادیب کے لئے روانہ کیا گیا۔

ادھر رائے سنگھ رائٹور کو جو حبوت سنگھ کا سہیلی تھا راجہ کا خطاب اور منصب عطا کرنے کے بعد اس ہم میں شریک کیا گیا۔

### راجہ حبوت سنگھ کی سرگرمیاں

حبوت سنگھ اگرے کے قریب پہونچا تو اکثر کم ہمت لوگوں کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ وہ قلعہ کا محاصرہ کر کے شاہجہاں کو چھڑائے گا اور اسے تخت نشین کرے گا۔

ماتل خاں لکھتا ہے کہ حبوت سنگھ اگرے کے قریب آیا تو شائستہ خاں حاکم اگرہ بہت پریشان ہوا، اس نے شاہجہاں کی دوبارہ تخت نشینی کے خطرے سے آدھی رات کو افضل خاں کے پاس پیام بھیج کر استدعا کی کہ شاہجہاں سے میرا تصور معاف کرادو۔ مگر افضل خاں نے اس کو سمجھایا اور اس افواہ کی تصدیق تک خاموش رہنے کی ہدایت کی، چنانچہ یہ سب اندیشے غلط ثابت ہوئے اور راجہ اگرے سے گزرتا ہوا اپنے وطن کو چلا گیا، وہ خود بدحواس تھا اور یقین رکھتا تھا کہ اس کے تعاقب کے لئے لشکر روانہ ہو چکا ہوگا، اس لئے اپنی عافیت اسی میں سمجھتا تھا کہ جلد مارواڑ کی حدود میں داخل ہو جائے، اور داراشکوہ کو بلا کر اس کے دامن میں پناہ لے۔

ادھر داراشکوہ احمد آباد پہونچ چکا تھا اور حبوت سنگھ سے ملنے کی تدابیر کر رہا تھا، اسی اشار میں اسے اطلاع ہوئی کہ حبوت سنگھ لشکر شاہی سے بھاگ گیا، پھر حبوت سنگھ کا خط بھی پہونچ گیا جس میں اس نے داراشکوہ کو اجیر آنے کی دعوت دی تھی، راجہ کا خط پہونچنے پر جہادی الادل مشن میں داراشکوہ اپنی فوج اور قوہ خانہ کو درست کر کے اجیر کی جانب چلا، ہر منزل پر اسے حبوت سنگھ کا خط ملتا تھا، وہ برابر داراشکوہ کی ہمت بڑھا رہا تھا، اور لکھ رہا تھا کہ میں اجیر کے رہنے والے راجپوتوں اور رائٹوروں کو لے کر آتا ہوں آپ جلد آئیے، داراشکوہ پر ان خطوط کا بہت اثر ہو رہا تھا، اور وہ تیزی سے بڑھا چلا آ رہا تھا داراشکوہ جو دھورے قین منزل کے قاصد پر رہ گیا تو تربیت خاں

اور ادا ابراہیم شب ساخو مٹھی شورش افرا بلبھور پورست و اختلال کلی در انتظام افواج روئے دادہ بیدلان قابو پیشہ راپا قرار و ثبات لغزیدہ راہ فرار کشادہ گشت و عنان استقلال و اصلبار از دست رفت، اما مخلصان غیرت مند شجاعت کیش و فائز اندیش پائے ثبات و قرار افشردہ از جانہ رفتہ و تزلزلے در اساس و خلوص شان راہ زیافت، سنجہ واقعات آن کہ راجہ حبوت سنگھ ضلالت کیش بے عار و رنگ باد جو تعصیب انش کہ عالمگیر نوہ بغایات و افروہ اور اختصاص دادہ بودہ در ظاہر سر بر خط بندگی نہادہ دوست خواہی می نمود بدیں جہت دریں یورش براد اعتماد فرمودہ ہمراہی و سرداری برانغار بخشیدہ بود چون طینت فتنہ سرشت و از حیث مردانہ بے پیرگی داشت بغیر فتنہ پردازی از معرکہ کارزار آخر ہمیشہ فراموش نہ

راجہ حبوت سنگھ کی اس حرکت کو کسی آئین اور اصول سے بھی معاف نہیں کیا جاسکتا، اور اب کسی دانشمند انسان کو اس کی حمایت و تائید کا حق باقی نہیں رہ جاتا، یہ وہ جرم ہے کہ موجودہ قانون میں بھی اس کی کہ سے کم سزا قتل ہے، جن لوگوں نے "انعام" میں تصور کا صرف ایک ہی رخ دیکھا ہے جو تعصب اور خیالات کی تاریکی میں حقیقت و صداقت کی روشنی سے محروم ہو چکا ہے، وہ ان تصریحات کو آئندہ واقعات کے ساتھ ماکر سوچیں اور غفلت کریں کہ اورنگ زیب نے راجہ حبوت سنگھ کے ساتھ کس قدر انسانیت، اثرات اور جو افریدی کا ثبوت دیا اور اس کے جواب میں خود راجہ نے جن حرکات ندرت جی "کا مظاہرہ کیا، اس سے عالمگیر کی رواداری کا وزن بھی کر لیں تاکہ ہر گمانوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

### راجہ حبوت سنگھ کی تادیب

راجہ حبوت سنگھ نے شجاع کی لڑائی میں جس ناقصیت اندیشی اور بزدلانہ سازش کا ارتکاب کیا تھا، اس کا تذکرہ نہایت ضروری تھا۔ خصوصاً ایسے وقت میں کہ شجاع کی ہم پور سے طرد پر سر نہ ہوئی تھی، داراشکوہ گجرات پہونچ گیا تھا، اور وہاں فساد برپا کر رکھا تھا، کسی طرح بھی راجہ کو مزید بغاوتوں



نوجوان جیسر کو بہت ترہ دہوا اور وہ بھاگ کر اورنگ زیب کے پاس آ گیا۔ اورنگ زیب خود ان امور سے آگاہ تھا، اور داراشکوہ کے مقابلہ کو اجیر روانہ ہو چکا تھا۔

## راجہ جے سنگھ کی سفارش

راجہ جے سنگھ جسوت سنگھ کا عزیز تھا، بادشاہ اس پر نہایت بہرہ بان تھا، جے سنگھ نے بادشاہ سے جسوت سنگھ کی سفارش کی، اور اس کے تصور کی معافی مانگی، بادشاہ نے نہایت مزاحمتی سے اس کی سفارش منظور کر لی، اور حکم دیا کہ جسوت سنگھ کو معافی جرائم کی خوش خبری سنا دو۔ جے سنگھ نے جسوت کو خط لکھ کر یہ مشورہ سنایا،

اس خط کے پہنچنے ہی جسوت سنگھ نے داراشکوہ کی امداد سے پہلے ہی شروع کر دی، جس وقت خط ملا ہے وہ اجیر کے امداد سے جو دہپور سے بیس کوس آگئے عمل آیا تھا، لیکن پھر واپس ہو گیا۔

داراشکوہ نے راجہ کو اس کے وعدے یا دلائے، لیکن وہ نال گیا، اس کا بیٹا سپہر شکوہ بھی جانے آیا، مگر جسوت سنگھ نے اسے بھی کسی طرح واپس کر دیا۔

## خطا بخشی کا دوسرا فرمان اور صوبہ داری

عالمگیر کو داراشکوہ کے مقابلہ میں فتح ہوئی، جسوت سنگھ کا قصور پہلے ہی معاف ہو چکا تھا، مگر وہ شرم سے بادشاہ کو منہ دکھانا نہ چاہتا تھا، راجہ جے سنگھ کی سفارش سے بادشاہ نے دوبارہ اس کی تسلی کے لئے فرمان لکھا، اور خطا نہیں معاف کریں، احمد آباد کی صوبہ داری مرحمت فرمائی، سات ہزار کا منصب بحال ہوا، اور خلعت عنایت کیا گیا۔

اس موقع پر کوئی نہ صرف مزاج انسان بھی اورنگ زیب کی شاہانہ نوازشوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ اعتراض کہ اورنگ زیب نے جسوت سنگھ سے دب کر یہ کام کیا تھا، نہایت لغو، بے بنیاد اور طفلانہ ہے، معرکہ امین کے بعد جس میں راجہ کی ذاتی شجاعت و طاقت کے علاوہ شاہی اقتدار بھی اس کی پشت پناہی کر رہا تھا، اورنگ زیب کے ڈرنے اور دبنے کا کوئی سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا، اگر جے سنگھ بیچ میں نہ پڑتا اور راجہ جسوت سنگھ حسب وعدہ داراشکوہ کا ساتھ دیتا، اس وقت بھی وہ امین کے میدان سے زیادہ بہادر ہی نہ دکھا سکتا تھا، اور مالوے کی لڑائی کا جو انجام ہو چکا تھا وہ جیسے آپ پڑھ آئے ہیں، وہاں بھی داراشکوہ ہی کے اشارے سے جسوت سنگھ نے معرکہ کارزار گرم کیا۔ اور اس وقت کا داراشکوہ اتنا کمزور، اور بیس نہ تھا، وہ راجہ کی امداد کے بھروسہ پر احمد آباد سے اجیر نہیں آ رہا تھا، بلکہ چتر شاہی کے سایہ میں بیٹھا ہوا، دولت، سپاہ اور شاہانہ عنایات سے خود راجہ کی اعانت کر رہا تھا، اور اسی امداد کا نتیجہ تھا کہ راجہ جسوت سنگھ نے اپنی فوجی طاقت کے بھروسہ پر اورنگ زیب کا راستہ روک لیا تھا، لیکن طوفان انسانوں کی صفوں سے نہیں ٹکا کرتا، وہ زمین کے نشیب و فراز کو روندتا اور پہاڑوں سے ٹکراتا ہوا اپنی منزل مقصود پر ہی پہنچ کر دم لیا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کچھ تو راجہ جے سنگھ کی مرمت کے باعث اور کچھ اپنی جوہر شناسی و قدر دانی کے باعث راجہ جسوت سنگھ کے جرائم پر پردہ ڈال رہا تھا، اور اسے معاف کر کے ایک راجپوت جرنیل کی حیثیت سے کام لینا چاہتا تھا، اور یہ کوئی نئی یا عجیب بات نہیں اکثر الوالعزم بادشاہوں نے اپنی حکومت کے باغیوں کو اسی طرح معاف کیا ہے۔ تیمور کی سلطنت ہی میں اس کی بیشمار مثالیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

## دکن کی مہم میں جسوت سنگھ کی کستی

۱۶۵۷ء میں راجہ جسوت سنگھ کو حکم ہوا کہ دکن پہنچ کر سیواچی کے استیصال میں امیر الامرار کی شرکت اور ہنوائی کرے۔ جسوت سنگھ احمد آباد سے چل کر دکن پہنچا، مگر اپنی فوج کو لے چلے پونا کے اطراف میں بیکار پڑا، آخر امیر الامرار کو گھر میں گھس کر مہٹوں نے مجروح کیا اور راجہ جسوت سنگھ کو خبر نہ ہوئی، صبح کو جسوت سنگھ امیر الامرار کا سال پوچھنے گیا تو امیر الامرار نے کہا کہ میں تو سمجھتا تھا، آپ کام آگئے جب ہی تو یہ فوج پہنچی۔

اس واقعہ کے بعد امیر الامرار کو مہٹوں کی مہم سے بدل دیا گیا اور شہنشاہ محمد معلم اس کی جگہ مقرر ہوا راجہ جسوت سنگھ اپنی کی طرح لگ پڑتین رہا۔



حبونت سنگھ نے سیوا جی کے بعض عقلموں کا صحرا صوبہ کیا، لیکن کوئی اچھا قلعہ فتح نہ کر سکا۔ مدت تک اس سے سیوا جی کی ہم میں کوئی نمایاں کام نہ ہو سکا۔ تو عالمگیر نے راجہ جے سنگھ کو چودہ ہزار فوج دے کر بھیجا، راجہ جے سنگھ اورنگ آباد میں شاہزادہ معظم سے ملاقات کرنے کے لئے ۲۷ شعبان ۱۰۷۱ھ کو پونا پہنچا، جہاں حبونت سنگھ مقیم تھا، اور ان کو شاہی فرمان کی بوجہ دربار میں روانہ کر دیا۔

## کابل کی ہم پر حبونت سنگھ کی ناکامی

۱۱ ربیع الاول ۱۰۷۱ھ کو راجہ حبونت سنگھ شاہزادہ محمد معظم کے ہمراہ کابل کی ہم پر ناکام ہوا۔ میں ہزار ہوا اس کے ساتھ لئے گئے۔ لیکن یہ جو لاہور سے آگے نہ بڑھ سکی، اور شاہ عباس کی وفات کے باعث عالمگیر کے حکم سے واپس آگئی۔

## حبونت سنگھ کی دوسری غداری

۱۲ سوال ۱۰۷۱ھ کو راجہ جے سنگھ کی جگہ شاہزادہ محمد معظم دکن کی صوبہ داری پر روانہ کیا گیا، حبونت سنگھ امداد کے لئے شاہزادہ کے ہمراہ گیا۔ لیکن راجہ نے اس مرتبہ پھر عالمگیر کے ساتھ غداری کی۔ وہ مرہٹوں سے مل گیا اور شاہی فوجوں سے پر امن دست درازی کرنے کے آزاد چھوڑ دیا، صرف یہی نہیں کہ وہ خود بھی مرہٹوں سے مل بلکہ اس نے بوندی کے راجہ راؤ بہاؤ سنگھ کا ڈاکو بھی جو اس کا سالار تھا اور تین ہزاری منصب پر فائز تھا، اپنی سازش میں شریک کرنا چاہا، بہاؤ سنگھ نے اس تک حرا سے قطعی انکار کر دیا، راجہ حبونت سنگھ نے اس کی بین یعنی اپنی بیوی کو دکن سے بلا کر بیچ میں ڈالا۔ لیکن بہاؤ سنگھ پھر بھی ستر لاکھ روپے کا صاحب با اثر الامرا لکھتا ہے۔

چون بشیر راؤ بہاؤ بہت ہمارا جہاد ہمارا جہاد زان خود را از دمن طلب داشتہ واسطہ نمود کہ باو سے ساز موافقت کوک نماید، اما راؤ بہاؤ حق تک مقدم داشتہ تن بوا فقتش در نہاؤ۔

شاہزادہ معظم بھی اپنی سادہ لوحی سے راجہ کا شریک کار ہو گیا۔ چنانچہ سیوا جی نے پندرہ ہزار فوج جمع کر کے سورت کی غارت گری کا ارادہ کیا تو شاہی فوج بھی یہ خبر سنکر پہنچ گئی۔ لیکن شاہزادہ اور حبونت سنگھ نے شاہی لشکر کو وہاں سے ہٹا دیا۔ سیوا جی نے اطمینان سے تین دن تک سورت کو ٹوٹا، فرمانروائے کاشغر کی والدہ سی پر سورت میں مقیم تھا، اس کا اس قدر مال و اسباب سیوا جی

کے ہاتھ آیا کہ وہ ہمیشہ اس پر فخر کرتا رہا۔

حبونت سنگھ کی یہ دوسری غداری تھی جس کو شاہی غنایات و اطمینان کے پیش نظر کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا، راجہ پر اورنگ زیب فوج کش کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ لیکن وہ ہر بار اس کے احسانات کے بوجھ کو اپنے سر سے اس طرح اتار کر پھینک دیتا ہے گویا اس کی نظر میں وہ نہایت بڑی اور قابلِ نفرت چیز ہے، اورنگ زیب کی عالی ظرفی اور رواداری کا ملاحظہ ہو کہ اس نے اس لغزش کو بھی نظر انداز کر دیا، اور اکتاہٹ میں مہابت خاں کو چالیس ہزار کی جمعیت دے کر دکن بھیجا۔ مہابت خاں نے دکن پہنچ کر شاہزادہ محمد معظم کی فوج کم کر دی۔ صرف ایک ہزار آدمی اس کے پاس رہ گئے۔ حبونت سنگھ کو واپس بلا لیا گیا۔

## کابل کی نائب صوبہ داری

کابل میں افغانوں نے بغاوت اور شورش برپا کی تو راجہ حبونت سنگھ کو کچی صوبہ دار بنا کر امیر خاں صوبہ دار کابل کی امداد کے لئے مقرر کیا گیا، آغز خاں بھی اس کے ساتھ تعینات ہوا۔ حبونت سنگھ کابل ہی میں اپنی اس خدمت کے دوران میں ۱۰۷۱ھ میں عالمگیری یعنی ۱۰۷۱ھ میں فوت ہو گیا۔

## راجہ حبونت سنگھ کے بیٹے

حبونت سنگھ کے مرتے ہی اس کے بھائی بند راجپوت رانی اور دو کم عمر بیٹوں کو بغیر حکم شاہی وہاں سے لے کر چل دئے۔ ماثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے کہ حبونت سنگھ کے مرنے تک اس کوئی اولاد نہ تھی۔ البتہ دور انیاں حاملہ تھیں۔ لاہور پہنچ کر اس کے نکار پر دواؤں نے اطلاع دی کہ دونوں رانیوں کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے ہیں، ان کو منصب، خطاب اور راج عطا کیا جائے۔ عالمگیر نے منغیہ آئین کے موافق حکم دیا کہ دونوں بیٹوں کو دربار میں بھجوا دیا جائے۔ جب وہ ہوشیار ہوں گے تو خطاب اور منصب دیا جائے گا۔ مصنف مذکور لکھتا ہے۔

حکم اقدس و اعلیٰ صادر شد کہ ہر دو پسر را بدرگاہ پہر بارگاہ بیادند و ہر گاہ پسران پس تیز خراہند و رسید

بہ عنایت منصب و راج لازماً خرابند یافت۔

اس حکم میں کوئی فریب، دھوکہ یا مخالطہ نہیں ہے۔ تیموری خاندان کا اصول ہی یہ تھا کہ جب کوئی عہدیدار مر جاتا تھا اور اس کی اولاد کم سن ہوتی تھی تو بادشاہ اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم، تربیت اور پرورش کا انتظام کرتا تھا۔ شہزادوں کی طرح ان کی عزت کی جاتی تھی، جب وہ سن قدر کو پہنچ جاتے تھے تو ان کی استعداد کے موافق منصب اور عہدے مل جایا کرتے تھے، حکومت مغلیہ میں شروع سے آخر تک اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، مگر حسرت سنگھ کے ساتھیوں نے حکم کا انتہائی نیک اور بغیر پروا نہ راہداری حاصل کئے کا بل سے مل دئے۔ دربارے انک پر امیر بکھرنے پر دانہ مادہ اری نہ ہونے کی وجہ سے، واکا تو اس سے رٹے، اور زبردستی دیا کو عبور کر لیا، وطن جانے کے لئے انھیں لازمی طور پر دہلی سے گزرناتھا، پناہ دہلی آئے تو عالمگیر نے ان کی شوہرہ سری کے پیش نظر ان کی قیام گاہ پر چہرہ لگا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد، درگاہ اس اور چند سرداروں نے وطن جانے کی اجازت مانگی، بادشاہ نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ انھوں نے یہ فریب کیا کہ راجہ حسرت سنگھ کے لڑکوں کو غلاموں کے لڑکوں کا لباس پہنایا اور غلام زادوں کو راجہ کے بیٹوں کے کپڑے پہنائے، رانی کو بھی مہمانداری میں طلب کیا، اور اس کی جگہ لوندھی کر زبور وغیرہ سے آراستہ کر کے چھوڑ دیا، اس طرح حسرت سنگھ کی رانی اور بیٹیوں کو لے کر چلے۔ خیمہ میں بہادر راجپوتوں کو بھاگ کر ہدایت کر دی کہ جانے کے بعد راز کھل جائے، تو جیسی لڑکوں اور رانیوں کی حفاظت میں تم اتنی سعی کرنا کہ پانچ چھ گھنٹہ تک کسی کہ ہماری تلاش کا خیال پیدا نہ ہو، دو تین پہر کے بعد بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے کو تو ال سے پوچھا، کو تو ال نے جواب دیا، خبر غلط ہے، بچے اور رانیاں خیمہ میں موجود ہیں۔ بادشاہ نے راجپوتوں کے تعاقب میں آدمی بھیجے، اور خیمہ والے بچوں اور رانیوں کو قلعہ میں طلب کیا، راجپوتوں نے کہا ہم رانیوں اور لڑکوں کو نہیں دیں گے چاہے ہماری جان جاتی رہے۔ عالمگیر نے اس گستاخی اور نافرمانی کی سزا دینے کو فوج بھیجی، راجپوتوں نے مقابلہ کیا۔ لیکن شاہی آدمیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے، اور بھاگ گئے اس میں اتنی دیر لگ گئی کہ رانی اور بچے آسانی سے نکل گئے اور پھر زندہ و سلامت جو دھوروں پہنچ گئے۔

ہمارا رانا اودے پور نے ان کی طرف داری کی، عالمگیر نے اس کے نام فرمان بھیجا کہ باغیوں کی حمایت نہ کی جائے اور حسرت سنگھ کے بچوں کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ لیکن رانا پر اس فرمان کا اثر نہ ہوا، مجبوراً فوج کشی کی گئی اور رانا کو طبع کر کے اس سے جہد لیا گیا کہ حسرت سنگھ کے بچوں کی مدد نہ کرے گا۔ مگر وہ اس جہد سے پھر گیا۔

رانا اودے پور کی جہد کشی کے بعد بادشاہ خود جب مشنہ میں رانا کی گوشالی کے لئے آجبر، دانہ ہرا، اور شاہزادہ محمد غلام کو دکن سے منظم کو بنگالہ سے جانے کے احکام نافذ کئے۔

اجیر پور پہنچ کر بادشاہ نے شاہزادہ محمد اکبر کو رانا کی ہم پر بھیجا، وہ حسرت سنگھ کے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں جا چھا، عالمگیر نے اپنے علمینوں میںوں کو رانا اور دوسرے راجپوتوں کی تادیب کے لئے مقرر کر کے سب کے فرائض تفصیل کر دئے، رانا کی اعانت کے لئے پچیس ہزار راجپوت جو دھوروں کے جمع ہو گئے اور شاہی لشکر پر حملے کرنے لگے۔ رسد بھی ان کی دستبرد سے تباہ ہو جاتی تھی، لیکن جہد شاہی فوج نے ان کو مغلوب کر لیا۔

رانا لشکر شاہی سے ٹکرانے کی تاب نہ رکھتا، اس نے تنگ آکر شاہزادہ محمد منظم سے درخواست کی کہ بادشاہ سے معافی دلادے۔ شاہزادے کی والدہ نواب بائی نے اُسے ہدایت کر دی کہ راجپوتوں کی ان باتوں پر ہرگز متوجہ نہ ہو، بلکہ رانا کے دکھار کو اپنے پاس بھی نہ آنے دے۔ یہاں سے مایوس ہو کر رانا نے شاہزادہ اکبر کو بھانسنے کی تدبیریں کیں، درگاہ اس بہت چالاک اور چرب زبان تھا۔ اُس نے اکبر کو یہ فریب دیا کہ چالیس ہزار راجپوت آپ کی اطاعت کے لئے اور بشپار خزانے خرچ کے لئے موجود ہیں۔ آپ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیجئے۔ اکبر فوجان اور ناخبر بہ کار شاہزادہ تھا، راجپوتوں کی باتوں میں آکر باپ سے باغی ہو گیا۔ محمد منظم نے باپ کو اطلاع کی کہ اکبر سے بغاوت کا اندیشہ ہے۔ لیکن اورنگ زیب کو یقین نہ ہوا۔ سمجھا کہ شاہزادے نے اکبر پر ہتھان باندھا ہے۔ لیکن درگاہ اس میں ہزار راجپوت سواروں کی جمعیت لے کر اکبر سے جا ملا۔ اکبر نے اورنگ شاہی پر بیٹھ کر سکے جاری کر دیا، اور اپنی فوج کے امراء کو منصب و خطابات عطا کئے، ان کاموں سے غارت ہو کر باپ سے رٹنے کو چلا۔

بادشاہ کی ساری فوج راجپوتوں کے مقابلہ میں اکبر کے ساتھ تھی بادشاہ



ڈاکٹر صاحب ایک اور کندہ نشر نکالتے ہیں کہ

”اس سے اس کا اہل نثار کاہل کی بغاوت فرد کرنے کے بجائے

جسوت سنگھ کا کاٹا پہلے نکالنا پھینکنا تھا“

ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوتا چاہیے کہ اورنگ زیب نے اپنے بیٹے کو بھی

کاہل بھیجا تھا۔ کیا وہ بھی اس کے بیٹے کا کاٹا ہی تھا؟

حقیقت میں جسوت سنگھ کا افغانستان بھیجا جانا اس لئے نہ تھا کہ وہ

اورنگ زیب کے پہلو کا کاٹا تھا، کیونکہ عالمگیر کاٹنے نکالنے کے اور طریقوں

سے بھی واقف تھا، بلکہ بات یہ تھی کہ جسوت سنگھ جس ہم پر بھیجا جاتا تھا اس

میں خرابیاں پیدا کرتا تھا، اور دشمنوں سے ساز کر لینے کا عادی تھا اس لئے

اس کو کاہل بھیجا گیا۔ تاکہ وہ اپنی راجپوتی شجاعت سے کام لے اور سازش و

دغا کے لئے کوئی میدان اس کے سامنے نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کے

جاہل اور جنگجو پٹھانوں سے دہان، مدن کی مغائرت کے باعث وہ کوئی

سازش نہ کر سکتا تھا، اور اس سے کام لینے کی اس کے علاوہ کوئی صورت

بھی نہ تھی، کہ اُسے ایسے ملک میں رکھا جائے جس میں اس کی خطرناک ریشہ دوانیوں

کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ ایسا ملک افغانستان سے بہتر کوئی اور نہ ہو سکتا تھا

جہاں حسن اتفاق سے اس وقت بغاوت بھی ہو گئی تھی، عالمگیر ہی پر کیا تو

ہے، اس سے پہلے شہنشاہ اکبر نے بھی اپنے عزیز اور محبوب راجپوت جرنیل راجہ

مان سنگھ کو کاہل بھیجا تھا، کیا اس کے متعلق بھی کہا جائے گا کہ مان سنگھ اس کے

پہلو کا کاٹا تھا، اگر نہیں تو یہ ترجیح بلا مرجع کیسی؟ صرف کاہل سمجھ جانا ہی تھا

اور بدیہی ہے تو اکبر کو اس الزام سے کیوں بری رکھا جاتا ہے؟

شاہی اعزاز کا عطا کرنا محض اورنگ زیب کی فیاضی اور مردم شناسی

سے متعلق ہے۔ ورنہ جسوت سنگھ اپنے اعمال کی بنا پر اس کا مستحق نہ تھا،

بہر عقلمند بادشاہ ایسے آدمیوں کو دوست رکھتا ہے جو بہادر اور جنگجو ہوں

اورنگ زیب میں یہ وصف خاص طور پر نمایاں تھا، وہ شجاعت و مردانگی

کا دلدادہ تھا، اور ایسے آدمی کی ہمیشہ عزت کرتا تھا، ابوالحسن تانا شاہ کا

جاں نثار جرنیل عبدالرزاق لاری حالانکہ قلعہ گوکنڈہ کے محاصرے میں اور گزیر

کے خلاف سخت جانفشی کر چکا تھا، اور قلعہ فتح ہونے پر بھی اس نے اس وقت

تک عسکر مغنیہ کا مقابلہ کیا تھا، جب تک مجروح ہو کر معذور نہ ہو گیا، لیکن

وہ اسیر ہو کر آیا تو بادشاہ نے ہندوستانی اور فرنگی جواہوں سے نہایت

دھماکے ساتھ اس کا علاج کرایا اور اس کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے اپنی

لازمت میں آنے کی ترغیب دی۔ اس نے انکار کیا، ادھر سے شاہانہ فیاضی

اور قدر شناسی میں مبالغہ کیا گیا۔ آخر لاری نے اورنگ زیب کی لازمت پر

آبادگی ظاہر کر دی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ابوالحسن کے شکرت اور گرفتاری کے

بعد عالمگیر لاری سے ڈر رہا تھا جو زخموں کی کثرت سے بیدم ہو کر اس کی

قید میں تھا، اگر واقعی ڈر رہا تھا اور اسی بنا پر شاہی اعزاز عطا کرنے پر مہم

تھا تو سمجھنا چاہیے کہ اورنگ زیب بادشاہ نہ تھا بلکہ ایک ایسا بچہ تھا جو

خواب میں بھی خیالی ہوتے کے تصور سے چونک جاتا ہے۔

داراشکوہ کی لڑائی میں راجہ روپ سنگھ راسٹور وٹن کی فوج میں شامل

تھا اور نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا، ایک مرتبہ جوش میں آکر وہ اپنے گروہ

سے نکل کر اورنگ زیب کے قلوب شکر پر حملہ آور ہوا، جہاں خود اورنگ زیب

موجود تھا، راجہ تلواریں مارتا ہوا بادشاہ کے ہاتھوں تک پہنچ گیا، ہاتھ کے

قریب پہنچ کر وہ پیدل ہو گیا، اور نہایت مردانگی و جہالت کا اظہار کیا، حتیٰ کہ

نیل خاصہ کی عماری کے بند کاٹ ڈالے۔ اورنگ زیب راجہ کی بہادری،

بیدی اور بے باکی کے حیرت انگیز نمائشے دیکھ رہا تھا اور برابر غل بھا رہا تھا،

”خبردار راجہ کو چشم زخم نہ پہنچے، زندہ گرفتار کیا جائے۔ ایسے شجاعت پریشہ

انسان کو ہمارے مخلصوں میں شامل ہونا چاہیے“ اورنگ زیب کو راجہ کی یہ

اداس قدر پسند آئی تھی کہ ایسے خطرناک وقت میں بھی جب در اسی غفلت

میں اس کو نقصان پہنچ سکتا تھا، وہ راجہ کو یعنی ایک پھرے ہوئے شیر کو زندہ

گرفتار کرنے کی ہدایات کر رہا تھا، مگر موقع بہت ہی نازک تھا، راجہ زندہ ہاتھ

آلے والا نہ تھا، ادھر سے ہجوم ہوا اس نے مردانہ مقابلہ کیا، آخر اسی رد و بدل

میں کام آگیا۔

ہر چند جسوت سنگھ نے اب تک اپنی بہادری اور شجاعت کا کوئی مظاہرہ

نہیں کیا تھا، تاہم وہ راجپوت تھا اور مردانگی اس کی سرشت اور غیر میں داخل

تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے اس جوہر سے بادشاہ کی خدمت نہ

کر سکا تھا۔ مگر امید تھی، راہِ راست پر آگیا تو کام کا آدمی ثابت ہو گا، بس یہی

خیال اور یہی جذبہ تھا جس نے عالمگیر کو آخر وقت تک اس پر بہرہ بان رکھا، او

سخت سے سخت لغزشوں کے ظاہر ہونے پر بھی اس نے کوئی دوسری کامیابی

نہیں کی۔

بیان، دوسرے ناروا اور سخت الفاظ کا استعمال، قومی عدالت میں افسانہ نگار کے یہ دلائل جرائم حقیقتاً سخت سزا کے مستحق ہیں، میں اگر اس کا جواب دیتا تو یہ مضمون تاریخی حقائق کا مرقع نہ ہوتا، بلکہ تلخ کامیوں کا مجموعہ ہوجاتا جو مجھے گوارا نہ تھا، کیونکہ میں نے صبح تاریخ بیان کرنے کی غرض سے قلم اٹھایا تھا، دشنام طرازی اور سب و شتم کی گندگی اچھالنا میرا مدعا نہ تھا، میں ہندو مسلم اتحاد کی دل سے قدر کرتا ہوں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میرے پیدا کئے ہوئے لٹریچر میں ایک حرت بھی اس دعوت کے خلاف مل سکتا ہے، میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان کی نجات ہندو مسلم اتحاد میں مضمر ہے حقیقتاً یہی جذبہ ہے جس نے مجھے اس مضمون کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ تاکہ اصل حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ اور تاریخ کی وہ غیر مستند مکرر دل فریب روایات جو کسی خاص حکمت عملی کے پیش نظر وضع کی گئی ہیں، قابل التفات نہ رہیں، اور آئندہ یہ سنگریزے اتحاد و محبت کے سمندر میں "نفاق و شقاق" کی لہریں پیدا نہ کر سکیں۔

## مقالات زریں

وہ پھول مرث قبروں ہی پر چڑھانے کے واسطے ہیں جو تاریخی عمارتوں کے کندھروں میں پیدا ہوتے ہیں۔

میتاب ہو جا، تڑپ جا، یہ نہ پوچھ کون روتا ہے؟ یہ دیکھ کوئی "انسان" روتا ہے۔

دنہ گی آہستہ آہستہ دبے پاؤں گزر رہی ہے اور ہم شور انگیز دلولوں اور طویل اُسیدوں کے شکار ہیں۔

نیک آدمیوں کے مرتے ہی بُرائیاں زور پکڑ جاتی ہیں، آفتاب ڈوبنے لگتا ہے تو سایہ دراز ہو جاتا ہے۔

علوم کے سمندروں سے ہم گرد رہتے ہیں۔ اور روز بروز ذہالت کے نازہ جزیرے دریافت کرتے جا رہے ہیں۔

ہر شخص کی طوف سے نیک گمان رکھنا ایک اعلیٰ مگر بہت جلد تباہ کر دینے والی صفت ہے۔

(مقالات زریں از جوش)

۔ ہا صاحب افسانہ کا یہ ادعا کہ "کابل کے ناقابلِ تسخیر

قلعہ پر راجپوتوں کا کیسری جینڈا لہرانے لگا، فتح و نصرت نے میواڑ کے سنگلوں کے کابل کی سر بلند اور سرکش پہاڑیوں پر پاؤں چوم لئے، شکست خوردہ ہائیٹا نے بھارت کے مایہ ناز سپوت دیر کے مجبور اوتار، راجپوتی روایات کے بہترین محافظ جسوت سنگھ کے، دوبرو ہتھیار ڈال دیئے۔

اس کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جسوت سنگھ کابل کے صوبہ آ کا معاون اور مددگار تھا اور آغرخاں کے ساتھ مددگاری کے لئے متعین ہوا تھا۔ افغان کی ہم آغرخاں کی مردانہ یورشوں سے ملے ہوئی، آغرخاں کی شجاعت اور شیرازی کا افغانوں کے دلوں پر ایسا سنگہ بیٹھا تھا کہ افغانوں کے ہچکے روتے تو انھیں آغرخاں کے نام سے ڈرایا جاتا تھا، اس میں شک نہیں کہ راجپوت اور مغلوں کا شکریہ اس کے ہمراہ تھا، لیکن افغانستان میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب آغرخاں کی جواہر دہی اور اس کے حقیقی بھائی تنگڑی وردی خاں کے دم سے ہو رہا تھا، آغرخاں نے کابل سے مقتولوں کے سر و سوسہ اور مٹیاری قیدی باؤٹا کے پاس بھیجے۔ بادشاہ نے اس کارگزاری کے صلے میں اس کو چار ہزاری منصب عطا کیا۔

افسانہ نگار نے اور رنگ زیب کے لئے جو دل آزار اور خلاف حقیقت الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کے لئے میں انھیں قابلِ معافی سمجھتا ہوں، ذہنیت سسوم اور دماغ ماؤٹ ہو جاتا ہے تو زبان اور قلم پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ البتہ ان کی تاریخی غلط بیانیوں کا پول کھولنا ضروری تھا، اور میں نے اپنی داستان میں شرارت انگیز اور حقارت آمیز الفاظ سے بچتے ہوئے اپنا یہ فرض انجام دیدیا۔ لیکن بعض الفاظ مثلاً غازی، سازش، بغاوت وغیرہ سے کوئی عصبانیت تکلیف محسوس کریں۔ لیکن اول تو معنی اور مفہوم کے لحاظ سے کسی موقع پر بھی ان کا غلط استعمال نہیں کیا گیا اور چہاں ان کو لکھا گیا ہے محض اس مجبوری سے کہ اپنے مفہوم کو ظاہر کرنے کی غرض سے ان الفاظ سے اجتناب ممکن نہ تھا، بادشاہ سے روگردانی کرنے والے اور محسن کشی کے عادی شخص کا تذکرہ کرنے وقت کوئی مضمون نگار کتنا ہی گریز کرے لیکن ان الفاظ سے نہیں بچ سکتا۔ حالانکہ افسانہ نگار نے ایک غلط داستان، اور دل آزار افسانہ لکھتے وقت بہت زیادہ سخت انداز نگینگو اختیار کیا ہے، اور اس بنا پر وہ بیک وقت دو بظاہر کلام ترکیب ہو گیا ہے۔ ایک غلط اور بدگمانی پھیلائے والے جھوٹے واقعات کا

# پاسبانِ شبابِ طفلی

کل شہر سے باہر پئے گلگشت گئے ہم  
کچھ پھول تھے کچھ غنچے تھے، نورستہ و رنگیں  
بے قید مناظر وہ فراغت کی ہوائیں  
گیہوں کے ہرے کھیتوں میں پھولی ہوئی سروس  
گو، پردے کی پابند نہ تھیں پھر سبھی وہ حوریں  
دوڑی کوئی پھسلی کوئی جھمکی کوئی سنبھلی  
مرغانِ حرم، نیند سے جاگے ہوئے فستے  
بکھرے ہوئے گیسو، وہ لچکتی ہوئی کمریں  
پیڑوں میں چھپیں اور کبھی میدان میں آئیں  
نکلانے ڈوبائے وہ چاند ستارے

اک حُسن کا گلزار بھی تھا ساتھ ہمارے  
کچھ برگ و گیا ساتھ میں پھولوں کے ہمارے  
بیروں کے وہ باغیچے، وہ کھیتوں کے نظارے  
اس طرح نہ چھٹکے کبھی افلاک پہ تارے  
کچھ دیر ذرا دور رہیں شرم کے مارے  
دل تنگ و شکستہ سے وہ کھیتوں کے کنارے  
جس طرح ہرن دشت میں بھرتے ہوں طارے  
اڑتے ہوئے ڈھلتے ہوئے ساری کے کنارے  
نکلانے ڈوبائے وہ چاند ستارے

جو کافر و خوزیز تھی اس جمع میں صد شکر وہی سمجھی مرے دل کے اشائے

آزاد و گرفتار و حیا پیشہ و بیباک  
آنکھوں میں حیا دل میں محبت کے شرارے  
وہ نازک و نرم آنکھ وہ نشتر سی نگاہیں  
وہ پھول سے رخسار دکتے ہوئے تارے  
کچھ دیکھ کے شرمائی بھی شرما کے بھی دیکھا  
بتے رہے مٹتے رہے الفت کے نظارے  
مٹی رہیں نظریں کبھی تر چھی کبھی سیدھی  
چلتے رہے دل پر کبھی نشتر کبھی آ رہے  
آنکھوں میں وہ طوفاں کبھی رندی کبھی تقویٰ  
بکھرائے کبھی اور کبھی بال سنوارے  
بے ہاتھ اٹھائے ہوئے انگڑائی کا عالم  
طوفاں کی وہ موج جو پہونچی نہ کنا رہے  
اک چھوٹی بہن ساتھ میں وہ حسن کا درباں  
خیاری سے جس شوخ کی دربان بھی ہارے  
حائل کہیں پردے کی طرح اور کہیں حیراں  
منظر کئے دیتے تھے اُسے میرے نظارے  
تنبیہ کی جرات بھی نگاہوں میں جھجک بھی  
غصہ بھی وہ معصوم وہ انداز پیا رہے  
آخر کو وہ گھر لے ہی گئی ساتھ بہن کو  
جیتی وہی اس بازی کو ہم جیت کے ہارے  
آنے دے جوانی کوئی دن اور ہسرجا  
افت ہی پہ تو اپنا دل و جان نہ دارے  
کیا کام فقیروں سے تمہیں جاؤ سدھارو  
ہو جائیں گے اپنے بھی کسی طرح گزارے  
اپنے ہی سے اب خلوت دل کیجئے روشن

یہ جلوے یہ عالم تو ہیں مغرب کے تارے

# گنبد یا گنبد؟

ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ، ڈی (انڈیا)  
پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی

مجھے اپنے اس سماجی علم پر پورا اعتماد تھا۔ میری خواہش پر وہ مولوی صاحب  
اُسی وقت نگار کا پرانا خاکہ لاہوری سے اُٹھائے، دسبرستہ کے نگار میں یہ  
عبارت درج تھی۔

۔ جو سن (میں آبادی) نے ایک نظم خاتون ہندی کے عنوان سے لکھی  
تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

تو اے خاتون ہندی انجمن سے کیا تجھے نسبت  
کو دیا ہے تجھے تو غلوں، اخلاق کی مسند

اسی نظم کا دوسرا شعر ہے۔

تری رعنائیوں پر حق نہیں بزمِ شبستان کا

ترے عشقوں کا مرکز ہے حب و شرم کا گنبد

لفظ گنبد کو سُنَد کا ہم قافیہ استعمال کیا گیا ہے، دراصل لیکر صبح

تلفظ اس کا گنبد (بضم با) ہے۔

نیا صاحب کی اس تحقیق کا ماخذ کیا ہے جس میں معلوم نہیں، اس لئے اس کے

مستند اور غیر مستند ہونے کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ البتہ اس

لفظ کے صحیح اعراب دریافت کرنے کی تین صورتیں ہیں۔

اولیٰ یہ کہ فضلائے ایران کس طرح بولتے ہیں؟

دوسرے یہ کہ مستند لغات میں اس لفظ کے اعراب کیا بیان کئے گئے ہیں

چند روز ہوئے، میں ایم اے کلاس کے طلبہ کو شاہ نامہ پڑھا رہا تھا۔  
افراسیاب و سیاوش کی داستان میں جب اس شعر پر پہنچا کہ۔

پہر گوشت گنبدی ساختہ

سرش را با بر اندر افراختہ

تو ایک معلم، جو مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل مولوی ہیں، کسی قدر تعجب  
سے میری طرف دیکھنے لگے اور خواہشمند ہوئے کہ میں اس شعر کو مکرر پڑھ دوں۔

میں نے پڑھا، اُن کے چہرہ سے عدم اطمینان کے آثار ظاہر تھے، میں نے

سمجھ لیا کہ اس شعر کے پڑھنے میں اُن کے خیال کے مطابق ضرور مجھ سے کوئی

غلطی ہوئی ہے، وہ اپنا خیال ظاہر کرنا چاہتے تھے، مگر میرے احترام کا لحاظ نہ

تھا، آخر میں نے باصرار پوچھا تو اُنہوں نے بتایا کہ ”آپ نے گنبد پڑھا، لاکھ

یہ لفظ گنبد ہے“ میں نے دریافت کیا کہ آپ کو کیوں نہ تحقیق ہو۔ اُنہوں نے

جواب دیا کہ مولانا قیام پوروی نے نگار کے ایک مضمون میں اس لفظ کے اعراب

بیان کئے ہیں اور گنبد کو (بفتح با) غلط اور گنبد کو (بضم با) صحیح قرار دیا ہے۔

گنبد کے یہ نئے اعراب سن کر مجھے اس سے زیادہ تعجب ہوا جتنا انہیں

میری زبان سے گنبد سن کر ہوا تھا۔ مجھے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ نیا صاحب

نے گنبد لکھا ہو گا اور گنبد کو غلط بتایا ہو گا۔ اس لئے کہ صرف علمائے ہند

ہی کو نہیں بلکہ فضلائے ایران کو بھی میں نے گنبد ہی بولتے سنا ہے۔ بہر حال



تیسرے یہ کہ اسم الثبوت اساتذہ کے کلام میں یہ لفظ کس طرح استعمال ہوا ہے۔

پہلی صورت غالباً نیاز صاحب کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگی۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اپنی آنکھ سے رمضان کا جانبدار دیکھے بغیر روزہ رمضان ہم پر واجب نہیں ہوتا، اسی طرح کسی ایرانی فاضل کا قول جو بطریق روایت کسی کی زبان پر ہم تک پہنچے، کسی لفظ کی لغوی تحقیق کے بارے میں ہمارے لئے محبت نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ خط و ایران میں بھی یہ لفظ غلط اعراب کے ساتھ مروج ہو گیا ہو۔

لہذا بجا یہ کہنا کہ ہم نے ایران میں متعدد فضلاء کی زبان سے گنبد ہی سنا ہے، چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ لغت اور کلام اساتذہ کی سند اگر پیش کی جاسکے تو نیاز صاحب کو بھی اس کے قبول کرنے کے سوا چارہ نہ ہو گا۔ آئیے پہلے لغات ہی کو لیں۔ جن لغات سے لفظ گنبد کے اعراب کی تحقیق میں مدد مل سکتی ہے، وہ پانچ قسم کے ہیں۔

(۱) فارسی کے وہ لغات جو اہل ہند نے مرتب کئے۔

(۲) فارسی کے وہ لغات جو ایران میں لکھے گئے۔

(۳) فارسی کے وہ لغات جو اہل فرنگ کی تالیف ہیں۔

(۴) دوسری زبانوں کے وہ لغات جن میں ان زبانوں کے الفاظ کے

معنی فارسی میں بیان کئے گئے ہیں، اور رومن رسم الخط میں تحریر ہیں۔

(۵) اردو زبان کے لغات (۱) اہل ہند کے لکھے ہوئے۔ (ب) اہل فرنگ

کے مرتب کئے ہوئے۔

اب ہم پانچوں قسم کے مستند و معتبر لغات سے لفظ گنبد کے اعراب پیش کرتے ہیں۔

فرہنگ چہا نگیری۔ گنبد و گنبدہ۔ با اول معنوم ثانی زوہ و بائی مفتوحہ۔

بُیانِ قاطع

گنبد۔ بغنم اول و فتح بائی اسجد و سکون ثانی و

وال بے نقط

گنبد۔ بالغنم۔ (صاحب بہار جم نے لغات کے اعراب

بیان کرنے کا یہ قاعدہ اختیار کیا ہے کہ حروف ثنائت

مفتوحہ ہر تو اس کا ذکر نہیں کرتے، مثلاً غمرہ۔ بالغمرہ۔ بالغمرہ

صرف غنم کی حرکت ثانی اور زوہ چونکہ مفتوحہ

ہے اس کا ذکر نہ کیا، لیکن غنم (بغمرہ و غنم)

میں چونکہ حرف ثنائت معنوم ہے، اس لئے اس کا

ذکر بھی کر دیا۔ گنبد کی سبب چونکہ مفتوحہ ہے

اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا)

گنبد (نیلو فری)۔ بغنم اول و سکون ثانی و فتح بائی

موجہ و فتح ثانی

شس لغات۔ گنبد۔ با اول معنوم ثانی زوہ و بائی مفتوحہ

فرہنگ آندراج گنبد و گنبدہ بغنم اول و فتح بائی موجہ و سکون

ثانی و وال بے نقط

برہان جامع (تالیف عبد فتح علی شاہ قاجار) گنبد و گنبدہ۔

بغمرہ اول و فتح ثنائت

فرہنگ نو بہار (چند سال قبل تبریز میں چھپی ہے) گنبد و گنبدہ۔

فرہنگ کا تو زیان (چند سال قبل طهران میں چھپی ہے) گنبد

Persian English Dictionary by Steinguss.

گنبد - Gumbad

Lexicon Persico-Latinum by Vullers.

گنبد B. s. گنبد

Dictionnaire Persan-Francais by Dermaisons.

گنبد Gumbad.

Dictionary English-Persian by Palmer:-

Dome = Gumbad (Gumbaz) گنبد

Dictionary English-Persian by Phillot:-

Dome = Gumbad or Gumbaz

Dictionary Hindustani-English by Forbes:-

Gumbad, Gumbaz = گنبد

Dictionary Hindustani-English by Fallon:-

Gumbad, Gumbaz = گنبد

نور اللغات۔ گنبد (ف۔ صیح) وال سے ہے۔ ذال سے غلط ہے۔

ملفوظ گنبد۔

یہ اور ان کے علاوہ لغت کی جتنی کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں، سب میں گنبد کی "ب" کو مفتوح ہی لکھا ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اتنی کثیر مستند شہادتوں کی موجودگی میں گنبد کو صرف اس لئے غلط مان لیا جائے کہ قوش صاحب نے (جن کا کلام، خدا کے کلام کی طرح اسقام سے پاک نہیں) اسے گنبد لکھا ہے، اور نہ گنبد کو اس لئے صحیح مانا جاسکتا ہے کہ صرف تیار صاحب نے نزدیک اس کا صحیح تلفظ گنبد ہے۔

شعرا نے ایران کے کلام میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے لیکن ایسے متعدد اشعار تلاش کرنے کے لئے جن میں یہ لفظ بطور قافیہ واقع ہوا ہو، وقت اور محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس زحمت کا کوئی خاص فائدہ نہیں کیونکہ لغت کی تمام مستند کتابوں میں اس کا تلفظ بعراحت مذکور ہے۔ بہر حال تمام محبت کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں، اردوہ ایک ہی مثال ایسی ہے کہ اس کے بعد بھر کسی دوسری سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی، سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر غالباً تیار صاحب نے بھی ضرور سنا ہو گا۔

ہر تو نیکاں نہ گیرد ہر کہ بنیادش بد است

ز بیت نااہل را چون گردگاں برگنبد است

تیار صاحب کی نصف مزاجی سے مجھے اسید ہے کہ جس طرح انہوں نے میرے بتلانے پر قوش کی "بہر شکار" والی ترکیب کو صحیح تسلیم کر کے علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا، ان سطور کے ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی اس چھوٹی سی لغزش کو بھی مان لیں گے، اور اولین فرصت میں اعلان کر دیں گے کہ غلطی میری تھی قوش کی نہ تھی، تاکہ جو لوگ ان کی پہلی تحریر سے غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں وہ راہِ راست پر آجائیں۔

اس امر کے متعلق تو اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ گنبد کی "ب" مفتوح ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لغت کی مختلف کتابوں میں اس لفظ کی دو شکلیں یعنی گنبد اور گنبد کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس دال (مہمل) اور ذال (جہم) کے فرق کو سمجھنے کے لئے پہلے فارسی زبان کے ایک اصول کا جاننا ضروری ہے۔ اساتذہ فن نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ فارسی زبان کے مفرد الفاظ جو "دال" پر تمام ہوتے ہیں ان میں اگر "دال" سے پہلا حرف ساکن ہے۔ لہذا آخری حرف کو ذال پڑھنا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر دال

سے پہلا حرف متحرک ہو تو آخری حرف کو ذال پڑھنا چاہیے جیسے گنبد، کیونکہ "ب" متحرک ہے۔ البتہ اگر "ال" سے پہلا حرف ساکن ہونے کے ساتھ ساتھ حرف علت بھی ہے (یعنی الف۔ واؤ۔ ی۔ میں سے کوئی حرف ہے) تو اس صورت میں بھی "ال" کو ذال ہی پڑھنا چاہیے، مثلاً استاذ (استاد) جو ذ (جو) وغیرہ۔

خواجه محمود ابن سینا نے اس قاعدہ کو ایک قلعہ میں بیان کیا ہے، قلعہ۔

در زبان فارسی حرفتہ میان دال و ذال یا دیگر ایزن کہ این نزد افاضل میم است پیش اردو در لغت مفرد گریج و ساکن است دال خواں آن را دہائی جلد فلجیم است بعض کتابوں میں ابن سینا کا قلعہ اس طرح منقول ہے۔

ہر گاہ دال، ذال، کہ در مفردی فتد ز الفاظ پارسی بشنو ذانکہ میم است حرف صحیح ساکن اگر پیش اردو بود دال است و ہر چہ بہت خبری، ذال جیم است ابن سینا کے علاوہ دوسرے اساتذہ نے بھی اس قاعدہ کو نظم کیا ہے۔ محقق طوسی کہتے ہیں۔

آنکہ بغاری سخن می را شنید در معرض دال، ذال را بنشانید ماقبل دی اسراکن جزوای بود دال است و گرد ذال معجم خوانید فقیر فاریابی نے اسی سخن کو عربی میں بیان کیا ہے۔

احفظوا الفرق بین دال و ذال

فہو سکن بالفارسیۃ معظم کل ما قبل سکون بلا (دال)

فہو دال و غیری ذال معجم شہاب الدین احمد حکیم کرمانی نے ایک قلعہ میں سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس اصول کو نظم کیا ہے۔

ہر کجا ماقبل دی جز حرف علت ساکن است

بہجہ و گرد و سر و برد، آن را دال خواں

ہر کجا ماقبل دی ساکن بحرف علت است

بہجہ باز و بید و بود و باء، آن را ذال خواں

حکیم آلوزی کی ایک رباعی بھی اس قاعدہ پر دلالت کرتی ہے۔

دست بساوت یدربینا بنود از جو ذو تو بر جهان، جہانی افسرد

ساتھ لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ ذال کے ساتھ لکھے ہوئے طیں گے۔ بات یہ ہے کہ آج سے چند سو سال قبل تک اس اصول کی پابندی کی جاتی تھی۔ مگر متاخرین نے اس قاعدہ کو ترک کر دیا۔ لہذا صرف چند مخصوص الفاظ کے سوا تمام الفاظ ذال ہی سے لکھے اور پڑھے جاتے گئے۔

خاتمہ پر اس قدر اور عرض کر دینا مناسب ہے کہ پرشین فلاو بھی (علم الانسان فارسی) کے ماہرین کے نزدیک یہ لفظ (گنبد) فارسی میں آرامی زبان سے لیا گیا ہے، اور پہلوی میں اُس کی شکل سخریری "گبیت" (بعدہ) حرکتِ گات ویم و بفتح با) پانی لکھی ہے۔

کس چوتھی نہ ہست دنی خواہد بود گو قافیہ ذال شوز ہی عالم جو دافزود کے ساتھ قافیہ جو ہونا چاہئے تھا۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ ذال کے بجائے اگر ذال قافیہ ہو گیا (یعنی جو ذال تو کچھ مضائقہ نہیں۔ جو ذ (جو وین) سخاوت) کا مرتبہ بہر حال بہت عالی ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ زبان کے اکثر قاعدوں کی طرح یہ قاعدہ بھی نکتیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے۔ بہر حال اس سے ظاہر ہے کہ گنبد کی "ب" چونکہ متحرک ہے اور حرفِ صیح ہے، حرفِ علت نہیں۔ لہذا آخری حرف کو ذال نہیں بلکہ ذال پڑھنا چاہیے۔ اور اس اصول کی رو سے گنبد ہی صحیح ہے، فارسی کی پرانی قلمی کتابوں میں آپ کو بہت سے ایسے الفاظ جو آج کل ذال کے

## دوشیزہ جمنا

وہ آبشارِ جہنا وہ دلفریب منظر  
خاموش وہ فضائیں بہتا ہوا وہ پانی  
دوشیزہ اک کنارے تغریب کر رہی تھی  
وہ حسن کی شعاعیں ذروں کا جگمگانا  
گویا چراغِ الفت پانی میں جل رہے تھے  
انگڑائی لے رہا تھا سرورِ ہو کے پانی  
رخسار پر ہوا سے بل کھا رہی تھیں زلفیں  
وہ ذریعہ بستم وہ بھولی بالی باتیں  
بڑھ بڑھ کے آبِ دریا قدموں کو چومتا تھا  
پتھر اٹھا اٹھا کر پانی پہ مارتی تھی  
امید ڈوبتی تھی ارمان بہہ رہے تھے

وہ بخودی کا عالم وہ کیفِ روح پرور  
وہ عشق کا فسانہ وہ حسن کی کہانی  
سُرخِ شفق سے لیکر ذروں میں بھر رہی تھی  
پانی کا آسمان کو وہ آئینہ دکھانا  
خورشید ڈوبتا تھا تارے نکل رہے تھے  
موجوں سے کھلتی تھی کافرا داجوانی  
شام و سحر کا منظر دکھا رہی تھیں زلفیں  
وہ نیم باز آنکھیں وہ دلبری کی گھاتیں  
لہرا رہی تھیں موصی اور حسن جھومتا تھا  
اللہ جانے کس پر غصہ اُتار تھی  
شاید پلٹ پلٹ کر یہ بات کہہ رہے تھے

دھیمیوں میں گھنٹیں کر تو قید ہو رہا ہے  
محسن مجھے خبر ہے دل صید ہو رہا ہے

# اسلام اور وطن!

## کشاف

ڈاکٹر اقبال نے مولینا حسین احمد مدنی کے پہلے بیان شانہ شدہ اخبارات (دور بارہ بحث و طغیت و قومیت) پر اپنا سہی اک بیان شائع کیا ہے۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ علامہ اقبال نے جناب اقبال سہیل کے قطعہ (جواب ابتدائی قطعہ اقبال معلق مولینا مدنی) کا کوئی منظوم جواب الجواب دینے سے گریز کیا! محاذ کی یہ تبدیلی اولین اعتراض شکست ہے! مولینا حسین احمد صاحب کے نصاب میں یہ تاریخ کا اک خوشگوار اعادہ ہے! ظہور دعوت اسلام کے زمانے کا ذکر ہے کہ اک معاذ اسلام جاہلی شاعر اس مبارزت کے ساتھ حضرت داعی اسلام کے سنانے آیا کہ میں آپ کے شاعر سے زبان آوری میں مقابلہ کرنا چاہتا ہوں، اور اپنی فتح و شکست کو نو ظہور پیام اسلام کی حقانیت بالبطالت کا معیار تسلیم کرنے کو تیار ہوں! اس باخبر پنجہ گردن کی جو سزا اس مدعی شاعری و ساحری و جزوی پیغمبری کو انگیز کرنی پڑی وہ "قاضی تاریخ" کی عدالت کے "محافظ خانے" میں محفوظ ہے! مدینۃ النبی کے اس سخنور حمد آور کے حوصلہ مند ڈرامے کا آخری باب "حزینہ" یہ تھا کہ بقول اسی مبارز سخن کی سرپرست ہمراہی جماعت کے "اسحق کو آپ کا شاعر ہمارے شاعر سے ہادی لے گیا! — اپنے جد و داماد کی اس قدیم فتح مبین کی یہ تازہ ترین تکرار آل رسول مولینا مدنی کو مبارک ہو! ہمارے عہد کے ادیب لبیب اور منظر نویس، مولینا

ابوالکلام آزاد کی زبان میں اقبال گویا اپنے ہی پسند کے ہوئے میدان میں ہار گئے! — — — — — وھذا یوم الفرقان! یوم التقی الجسکان! اور ہمارا خیال ہے کہ اب حضرت اقبال کی یہ موضوع بحث "نثر فرائی" بھی اپنی قدسی طرازی سے کچھ بہتر حشر متدہ نہیں رکھتی۔ شاید ان کا یہ شعر مشورہ (غنائی) بیان نا ان کے اقبل قطعے کی ذبوں انجامی کی طرنت قبیح کرتے ہوئے، زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ

تو بردن ماچہ کر دی کہ درون مابیائی!!

(۳)

## قوم اور ملت

حضرت اقبال اپنے بیان کے افتتاحی جملے ہی میں تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے معلومہ مصرعے میں میں نے لفظ ملت قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے! اور معاً بعد اعتراضات فرماتے ہیں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ، اور بالخصوص قرآن مجید میں، شرع اور دین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے! — سوال یہ ہے کہ لفظ فناء غنیہ کے لغوی معنی، اور میں قرآن مجید کے مدلول سے دیدہ و دانستہ انحراف کرنے کی کونسی وجہ و توجہ اقبال کے پاس تھی! کیا یہ "دلیرانہ تحریف" اس لئے اختیار کی گئی کہ اس جملے سے حضرت مدنی

مذللہ العالیٰ کو جو جہل و بولہب قرار دیا جائے؟ (نقول کفر کفر نباشد!) غلط بیانی ویسے ہی ایک کمرہ چیز ہے۔ اور پھر ترجمان حقیقت کی زبان سے؛ اور ایک نیک محضر عالم ثانی، اور روشناس البشیا و یورپ، و افریقہ و مرد مجاہد کو نشانہ سب و شتم بنانے کے لئے؛ بنا۔ الفاسد علی الفاسد کی ایسی غلیظ نظیر شاید حکیم اسلام کے سوا دوسری جگہ نہ ملے؛ چاہے  
ایں کار: از تو آید و مردان چہیں کنند!

مزید ملاحظہ فرمائیے کہ اقبال کی کاوش ہر گویا اسی پر قائم نہیں! وہ "قدیم قرآن" سے مایوس ہو کر حال کی عربی، فارسی، اور ترکی زبان مکہ میں پناہ لیتے ہیں، اور ان سے بکثرت سندات لاتے ہیں، تاکہ غریب حسین احمد راجو گندھین کی آغوش کی زد میں ایک بار پھر اس غلو و معصوم کی گردن لائی جائے، اور اس عشرہ محرم الحرام میں اس ابن علی پر تیغ تیر ہی دوبارہ رواں کی جائے!۔

نشو و نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغیت

سر دوستاں سلامت کہ تو خیر آزمائی!

مولانا حسین احمد صاحب وہ آخری شخص ہونے چاہیے تھے جن کے غلط فہم کو کوئی کلمہ ملت میں منتقل کر دے؛ وہ اک عالم دین ہیں، ایک فقیہ متقی ہیں، دس سالہ عربیہ دیوبند کے صدر المدرسین ہیں، وہ حرمین شریفین تک کی جی درگاہوں کی سندوں کی سہا سال تک ذہنیت رہ چکے ہیں، اور ان کی ساری بستی و زندگی اور تاجی قلب و روح پر احترام اسلام اور رعایت شریعت چھائی ہوئی ہے، اگر ان کی قومیت اور ملت میں بھی کوئی حد حاصل نہیں بھی جاتی تو اس سے بڑھ کر تیرہ باطن سوسے ظن اور کیا ہو سکتا ہے! چاہے  
بدست مرگ، دے بدتر از گمان قومیت!

اور اب تو مولینائے مدنی نے اپنے مفصل و مشرح بیان میں قرار واقعی و در پر دفع شکوک فرمادیا تھا، قوم و ملت کے شرعی فرق غلط کو واضح کر دیا تھا، رد میں زمین و آسمان کا فرق مراتب جنایا تھا، با اینہما اقبال اسی پر ٹھہرے مولانا حسین احمد کی مصلحت قرآن قوم، گویا ہٹلر و موسولینی کی غالی قوم پرستی ہے؛ کہ وہ گناہ مدنی کے اس دامن پر جس پر فرشتے اگر ناز پڑیں تو زیبا ہے، داغ مانا گیا ایسا ہی ناقابلِ ترک فرض میں ہے کہ اُسے بجالانے کے لئے کوئی غلط بیانی اور کوئی دیدہ بردوشی ایسی نہیں جو مجاہد بنو؛ کیا ظن المؤمنین خیر!

کاظم البدل ہی ظن اجمالیہ ہے!!

لطف یہ ہے کہ علامہ اقبال لفظ قوم کے ترجمہ ملت کو زیر بحث نہ لے کر چنداں مؤثر نہیں سمجھتے! تعبیر و روایت کی جس لغزش شدید نے جانشین شیخ الہند کو البوجہل و البولہب بنا دیے کی زشت کاری کا ارتکاب کر ڈالا، وہ حکیم الامت کی کشتیوں حاذق اور تحقیق انیق کی روسے اس نزاع میں ہر طرف فرق پیدا نہیں کرتی؛ چاہے

آئینہ می شنوم بہ بیداری ست یارب یا بخواب!

(۳)

## تغافل سے جو باز آئے جفا کی!

بالآخر علامہ اقبال کسی بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کئے لیتے ہیں کہ مولانا حسین احمد کا ایشاد یہی تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں، تاہم اپنے اس اعتراف سے فرق ثانی کو کوئی فائدہ حاصل کرنے نہیں دیتے؛ بجائے اس کے کہ وہ اپنے اس اعلان کے اس نتیجہ صریح کو قبول کریں کہ مولانا مدنی پر قوم کو ملت کا مقام دینے کی بنا پر جو اعتراضات اٹا دیئے تھے وہ اخباری اطلاع کی اس نصیح، یا اقبال کے اس غلط ترجمے سے رجوع کر لینے کے بعد از خود و قریح ہو گئے۔ وہ اک نیا شخسانہ چھپر دیتے ہیں کہ سبھی بر دمن قوم سے قومیت کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آجاتا ہے؛ حضرت علامہ کے قہمات کو ہم کیا کہیں؛ یہ محض قوم سے قومیت کا جدید فرنگی نظریہ ان کے سامنے اسی طرح آگیا ہے جس طرح کہ قبل اذین قوم کا لفظ ان کی زبانِ قلم پر جا کر ملت بن گیا تھا؛ یہ اک چیز کو ایک ہاتھ سے دیکر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لینے کی ستم ایجاد دی ہے؛ علامہ اقبال نے پہلے ترجمہ غلط کیا تھا، اور اب تعبیر غلط فرما رہے ہیں؛ یہ کس درجہ اک قیاس مع الغایق ہے کہ لغت عربی اور قرآنِ محمدی کی مستعملہ قوم بھی مالک مغرب کی جدید العہد مصلحت قومیت ہی کے ہم معنی ہے؟ ایسا کہنا بعینہ اس دعوے کے مترادف ہے کہ انگریزی لفظ (People) فرنگی سیاسی اصطلاح (Nationalism) کے قائم مقام واقع ہو جائے؛ اقبال کو اس غیر منطقی سینہ زوری کی ضرورت ہوں لاحق ہوئی کہ جو خطابات انہوں نے مولینائے مدنی کو، قوم کو ملت بنا دینے کی موعودہ پاداش میں،

شروع ہو جاتا ہے! ————— اللہ اللہ!

اس قدر دشمن ارباب سب وفا ہو جانا!!

(۴)

## علامہ اقبال کا مخالفہ و واہمہ!

ڈاکٹر اقبال کو باوجود فاضل اہل ہونے کے یہ معلوم نہیں کہ مولانا حسین احمد یاکوئی مسلمان "وطن" کو ایک ہمیت اجتماعیہ کے قانون کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا؛ ہندوستانی وطن کا اقتضائے ہم سے اتنا ہی ہے کہ ہم سب اپنی سیاسی و معاشی زندگی کی یکجائی و ہمیشگی کو محسوس کریں، اور اس کی تخلیم کے لئے ایک مشترک ادارہ نظم و نسق کے علم کے نیچے کھڑے ہو جائیں؛ ہم سیاسیات و معاشیات کے علاوہ اپنا کوئی اور شعبہ حیات اس وطنی سرشتہ حکومت کو انمولین کرنا نہیں چاہتے؛ ایسا ممکن بھی نہیں، اس لئے کہ یہ زائد کاروبار مختلف ہندوستانی فرقوں اور ملتوں کے درمیان کم و بیش متعین واقع ہوئے ہیں، جن کی داشت و پرداخت کا بند و بست فریقہ اصول پر علیحدہ علیحدہ ہی ہو سکتا ہے؛ اس اعتبار سے ہندوستانی قومیت کو بجائے علی الاطلاق و بوجہ گیر، بیکرنگ و ہم آہنگ قومیت کے قدرے اک وفاق سیاسی سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہوگا؛ شاید یہی وجہ ہے کہ متعارف سیاسی وطنیت کی جگہ ہماری زبان پر متحدہ قومیت "ہند" کی ترکیب جاری ہو گئی ہے؛ پس ہمارا ہندوستانی وطن اک "فیڈریشن" ہے؛ فیڈریشن کچھل جذبہ و انجذاب کی کوئی کارگاہ نہیں ہو کرتا؛ بخلاف اس کے وہ ثقافتی استقلال (Cultural independence) کے تحفظ و نمائندگی کی صورت ہوتا ہے؛ ہندوستان ایسی واحد اسکن اور متحدہ مذہب دنیا میں قومی سیاسی زندگی صرف عبارت ہو سکتی ہے اک "آل انڈیا کانٹیننٹل فیڈرل گورنمنٹ" سے، جو اس مشترک سر زمین کی بس و قد و مشترک سیاسی نظم و نسق اور معاشی تدبیر (dispensation) کی انچارج ہوگی، اور جس کی اس سطحی سیاست بالائی کے زیر سایہ عاطفت تمام انفرادی ثقافتی خطوں اور مذہبی ملتوں کو گویا اک نوع کی داخلی آزادی کامل (Autonomy) نصیب ہوگی؛ خود وطنی تحریک کی اس وقت تک کی رفتار اسی پنج پر رہی ہے۔ انٹرنیشنل کانگریس

دئے تھے، وہی وطن اب اس طرح جاری رکھیں کہ ہندوستان کے معلوم و حکمت آزمائے آزادی ہندو مسلم جموں کو (مثلاً) عا پان کی مردم خوار و خون آشام ڈرگین سوسائٹی کے شیل ایل قرار دیں؛ یہ اہل زمین نے کیا ستم نو کیا کوئی! نادرجہ آسمان کہن سے نکل گیا؛ نہ صرف یہ کہ ہم اس بے پناہ استدلال پر حیران ہیں، بلکہ خد جناب اقبال کی زبان بھی ہر جگہ ان کی غیر محمود کاوش کا ساتھ دینے سے ابا کو جلتی ہے؛ چنانچہ زیر بحث یہ اگر اٹ ہی میں، مولینائے مدنی کے مزہب جیسے کے بعد ہی علامہ ممدوح کا یہ بھی ارشاد موجود ہے کہ "ممبکو حقیقت میں بولنا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں؟ ————— ہماری عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ جب مولانا حسین احمد کا یہ دے کے ہی ارشاد مابہ النظر تھا اور اس سے اب حضرت اقبال کوئی تعارض کرنا نہیں چاہتے، تو پھر اس نئی کلام و کلام و راز نفسی کا قطعہ کیا محض ہوا یا خلا ہی کے نگینہ پر تعمیر ہوا ہے؟"۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔ کچھ اسٹین کلف نہیں واللہ نہیں ہے؛ تھوڑی دیر کے بعد صاحب ممدوح، مولانا حسین احمد صاحب کے بعد مدہ انہار پر سے اپنے اعتراض کو بار و گربائے ہیں، وہ اقوام و اوطان کے درمیان کے "ازنی رابطہ لائٹنگ" کا اعتراف کرتے ہیں، پھر ازراہ ذہن و ادبی ایسی ذات فانی فی النجاذ کو "ہندی" کہلاتا بھی قبول فرماتے ہیں، ہم آغوشی وطن کو اسلام سے باہم آدہی کے ہم معنی نہیں سمجھتے، اپنی جہم بھیم سے محبت اور اس کی خدمت و مذہب کو سبھی اک فطرت الہی فی تسلیم کرتے ہیں؛ تاہم یہ سب کچھ منظور فرمالینے کے بعد وہ معاذک انتہائی روح سامعوس کرتے ہیں؛ چنانچہ اگر کوئی ان تمام جذبات فطرت کے حسن و استحسان کی تقریب سے "حب الوطن من الایمان" کی گھانا گب عقیدت بند کر دے تو وہ اس جہل و نادانی پر شخص ہو جاتے ہیں؛ اور مغفلات محمدی کی فہرست سے اک کتاب وحی کی شان سے، اس بیان کو وہ حدیث کو خارج فرما دیتے ہیں؛ ان کا ارشاد ہے کہ "وطن اک جہز انیائی اصطلاح" ہونا چاہیے، اب اس اگر کوئی فرزند سر زمین اپنے وطن مالوت سے اس نگاہ تعلق تعلق سے زیادہ غلط فہم لکھتا ہے جتنا کہ اک مشافر سرائے سے، تو معاذک اسلام اس مادہ وطن کا حریف بن جاتا ہے، اور اک تصادم و تزامم، اور اک سرکہ حرب و مغرب

شدت کے ساتھ اپنی سیاسی و اقتصادی حدود کے اندر عقیدہ رہی ہے۔ اور اس لیے  
خون و احتیاط کے ساتھ کہہ گیا ہے

اگر ایک سب سے بڑے پرندے پرندہ  
فیر کی آزادی، مختلف قوتوں کے شخصی قانون کی مناسبت، اقلیتوں کے  
حقوق کا تحفظ وغیرہ وغیرہ اسی حفظ مراتب کے مظاہر ہیں؛ حیو اور جینے دو  
کی اس برادرانہ فضا میں کسی بند دستیابی جماعت یا ملت کے مخصوص مذہب  
و جذبہ کے معرض خطر میں ہونے کا خیال یا معاملہ ہے یا دھماکہ یا بھول بھلی  
اور اس سے گریز و پرہیز یا وحشت زدگی ہے یا مردم بیزاری!

ہیں با دہل ناخو است کہنا پڑتا ہے کہ حضرت اقبال کو کم و بیش یہ ساری  
بیعتیں عارض حال ہیں؛ چنانچہ اس مجوزہ نظام زندگی کی خوشگامی و مہلکی  
پر اپنے اک ہضمگیر کا یہ انسون محبت پڑنے کے بجائے کہ

حافظ! گردصل خواہی، صلح کن با خاص و عام  
با سلمات اللہ اللہ، با برہن رام رام!

وہ یہ بے محل خدائی فوجداری کی آرڈی نیس نہ زبان بولتے ہیں کہ:  
"ہی فوج آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی، موصد و مشرک!  
..... اُسے سلسلہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہی،  
اور وہ الکفرتہ واحدہ کی ہے!"

کیا نولیناے دم کے ان چابی او تار کو ہم مولیناے دم ہی کی اک  
صدائے غفلت شکن سید کر سکتے ہیں، کہ

تو برائے وصل کروں آدمی؟ یا برائے فصل کروں آدمی!  
پھر خیر سے اس اقبالی حقیقت کا کہیں مصداق بھی ہو! مسلمانان ہند  
آج نہ امت مسلمہ ہیں، نہ ہندو ہند، ملت الکفر! ہندوستان کے نام ہندو فرزند  
توحید ہی تو ہیں جن کے اسم با سخی وجود با جو دو کی شہادت خود اقبال اس طرح  
کرتے ہیں:

چہ گوشت ز مسلمان تا مسلمانے؟ جز اینکہ پر خلیل است و آدمی داند!

پھر جن "ہیران پارسا" کی روحانی آغوش میں پلکریہ جگر گوشگان اسلام  
نکلے ہیں، اُن کی پوست کندہ حقیقت بھی اقبال ہی کا کوئی آئی نمونہ دور جنوں  
یوں کہ گیا ہے:

شیخ، اوز برہن کا قرقر است  
زانکہ اورا سوسات اندر سر است!

ہمارے فرزندان و دختران خلیل و خلیل کی ناصحنی جس شرمناک ذہنی ہمک  
پر پونچ گئی ہے، اُس کی پیمائش بھی ترجمان حقیقت ہی کے قلم کو ذرا کرنے دیجئے۔  
شعل از ستر بنی بیکانہ شد باز ایں بیت المحرم بت خانہ شد!  
از منات ولات و عزنی و منہل بر یکے دارو بجے اندر لبس!  
ہمیں اپنے تئیں امت مسلمہ کہتے ہوئے شرمناک چاہیے! ہمیں کیا خبر لیکن  
اقبال ہی کی مدایت ہے کہ:

آنکہ چشمش ستر تار از البصر سوسے قوم خویش باز آید اگر  
نشت بنی! گوید تمولائے دوائے دوائے دوائے دوائے!

پھر وہ اسلام کے تیرہ سو برس کے کارناموں کی طرٹ و حوۃ نظر  
دیتے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ اسلامی تاریخ کے اس طویل و دور کا بیشتر حصہ  
صدر اقل کے خیر القرون کی تعمیر کی تحریک کا شاہد بنا ہے! اور اس وقت دنیا  
کی پُر زور تحریکوں کی ضرب سے ہمارے مسلم نوجوان جیسے اُفتان و غیر اُفتان  
ہیں، اور اُن کی دستگیری و نشت پناہی سے ہمارا "پیر حرم" میسا داماندہ و  
ماندہ ہو رہا ہے، اس حقیقت نفس الامری کی ترجمانی بھی اقبال ہی کو کرنے دیجئے،  
محبکہ تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگر گوں! معلوم نہیں دیکھی ہے تیری نظر کیا!  
ہر سینے میں اک شمع قیامت ہے نودار افکار جوانوں کے ہوسے زیر و زبر کیا!  
کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلاشی اسے پیر حرم، تیری مناجات سحر کیا!  
اپنی ہی زبان سے حالات یوں طشت اذہام ہو چکے ہیں، اور پھر بھی  
ہم اپنے کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ "برہنہ برہنہ" کا پاکریں کہ تا بہ دولت  
نے اپنے منشاے ہمایونی سے عالم انسانی کو صرف دو عنوانات علی کے  
تحت تقسیم فرما دیا ہے، ایک ملتہ مسلمہ، (یعنی ایجنڈا)، اور دوسری  
ملتہ الکفر! (جملہ کفار و اعداء) سے

جنگے دویم و سبرانا الحق شد آشکارا! مارا ازیں گیا پضعیف ایں گماں نبو!  
(۵)

## مزید بحث و طغیت!

بلاشبہ وطنیت کو قومی زندگی پر جا بجا وہ احاطہ و استیلا بھی حاصل  
ہے جس کو علامہ اقبال نے ہر جگہ علی الاطلاق و بلا مستثنیات فرض کیا ہے!  
لیکن حقیقت یہ صورت اُپنی سر زمینوں کے ساتھ مخصوص ہے جو کلیتہً یا تقریباً



ایک ہی دین یا متمدن کے گہوارے میں؛ قدرۃ وہاں حیاتِ قومی کے قادی شے  
نظامِ حکومت و ہدایتِ ریاست کے سپرد ہو نا چاہئیں اور وہ جو جاتے ہیں؛ مگر ظاہر  
ہے کہ حکومت کی اس ہر گیری سے وہاں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ نہ مختلف  
و معاہدہ فرمائے آہادی ہوتے ہیں، نہ ایک کے دوسرے کے اندر جذب و  
فنا کا کوئی سوال ہوتا ہے؛ تاہم جن جن ملکوں میں مذہب و تہذیب کا نقد و ناپا  
ہوتا ہے، وہاں معاً حکومت اپنے تنگ حلقہٴ نظم و نسق و تنظیمِ معیشت کے اندر  
پاؤں سکھڑ کر بیٹھ جاتی ہے، اور اُس سے سرمو سجاوڑ نہیں کرتی؛ ایسے  
ملکوں میں حکومت کو یا قیام امن و عدل ہی کی ضمانت ہوتی ہے۔ آبادی کی  
تہذیب و ثقافت کی ترجمان نہیں ہو کر تھی؛ عمومی حکومت کے بیرونی اجمال  
کی ساری اندرونی تفصیل مختلف ملی تنظیمات کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ جو  
اپنے کاروبار و اختیارات کے اعتبار سے "حکومت اندرون حکومت" کہی  
جاتی ہے؛ چاہئیں؛ جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں، سلطنتوں کی شکست و انفراس  
سے بکثرت چھوٹی چھوٹی مستقل ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں، لیکن باوجود  
چھوٹی ہونے کے کسی حکومت کو تمام و کمال بیک رنگ و ہم آہنگ رعیت نہ ملی۔  
بے تکلف اس کا علاج ہی کیا گیا کہ اقلیتوں کو اُن کے عام مدنی استقلال  
کی ضمانت دے کر اور اُسے داخل دستور اساسی کر کے، کہ وہ پیش و فاتی  
ڈھانچے کی مرکزی حکومتیں کھڑی کر لی گئیں، جس سے وہاں نہ اکثریت کو چیرہ  
دستی کا جو صلہ ہے نہ اقلیتوں کو "ٹک" کے غالب متمدن کا لغتہ بن جانے کا  
خطرہ! ————— اب خدا جانے ہمارا یہ فقدانِ تنجیل ہے یا ہماری  
باسِ شری کو ہم اپنے سادے سے ہندو مسلم سنے کو اک تاقیامت جاری  
رہنے والا عقدہٴ لائیکل سمجھ بیٹھے ہیں، اور اُس کے لئے کبھی "پاکستان" بناتے  
ہیں، اور کبھی "پاکستان"؟

ہزار رخسہ بدام و مرابساہ دلی تمام عمر و اندیشہ رہائی رفت؛  
"قاضی شہر اسلام" اقبال کو اک اور اندیشہ "نڈھال کئے ڈالنا ہے،  
کہ ہندو مسلمان کی مخلوط حکومت میں آخر سیاسی دستور اور معاشی نظام کس  
ڈرتے یا ملت کا، اساس کار بنایا جائے گا، اور آیا وہ کہاں تک اسلامی منافع  
و مصلح کے لئے قابلِ قبول ہو گا؟ وہ سوال کرتے ہیں کہ اگر اس تشکیلِ سیاسی  
و اقتصادی میں اسلامی نظریہٴ سیاست و معیشت کو نظر انداز کر دیا گیا تو کیا  
مسلمانانِ ہند کے لئے یہ امر ممکن یا مستحسن ہو گا کہ وہ جماعتی حیات کے ان دو

اہم ترین شعبوں میں طاغوت کی اطاعت کا جوا اپنے خستہ اسلامی شانے  
پر رکھ لیں، اور اسلامی نظام کے جسم کے سر اور سینے سے مقلوع و محروم ہو جائیں؟  
یہ فکر سجا اور قابلِ ہمدردی ہے؛ لیکن مسلمانوں کو دیکھنا چاہئے کہ اگر  
ٹک کی سیاسی و معاشی شیرازہ بندی میں اصل و اساس، اسلامی اصول و  
نوامیس کو نہ بنایا گیا تو یہ چیز کسی دوسرے مذہب یا متمدن سے بھی نہ لی جاسکتی؛  
یہ اک عمومی و فاتی تصورِ سیاست و معیشت ہو گا، جس کا تعین غالباً یہ  
اصل الاصول کرے گا کہ "زیادہ سے زیادہ فائدہ، زیادہ سے زیادہ تعداد  
خلق اللہ کے لئے کس چیز میں ہے؟" مسلمان اس میں علانیہ نفع میں رہیں گے؛  
یہاں سیاست کا سبب بننا و آزادی ٹک و غربت ضمیر ہو گا، اور معیشت  
کی اساس کم و بیش "اسٹیٹ سوشلزم" ہوگی، جو عین روحِ اسلامی ہے، جو  
۹۰ فیصدی اسلامی مشائے معیشتِ قومی ہے؛ اسے

جو حزنِ تلخ انھوں میں پوشیدہ ہے اب تک  
اس دور میں شاید وہ حقیقت پر موزدارا (اقبال)

بخلاف اس کے ہندوؤں کے حق میں دیکھئے کہ اس انقلاب کے کیا معنی  
ہوں گے؛ اُن کے راج کے تصور والا "اندھنیت" ہمارا جو دھراج اپنے  
عرشِ کبریائی سے سرنگوں ہو جائے گا؛ دوسری طرف مارکسزم کا گڑغزنی  
"پھمی دیوی" کے بُتِ سومات کو پارہ پارہ کر ڈالے گا؛ اس ساری فکرت  
و ریخت میں اخبار کی تہذیب کی صد فی صد تخریب ہے، وراثتِ ایک اسلامی  
تمدن کی کم از کم بقدر ۹۰ فیصدی تعمیر و تجدید؛ ہماری یہ کیسی کورانہ بد بختی  
ہے کہ ہم تعمیر پذیر زمانے کی ہر ادنیٰ جنبش پر لرزہ بردار ہوتے ہوئے جاتے ہیں،  
کہ اب ہمارا کام تمام ہوا، اب ہمارا کام تمام ہوا؛ اسے

ختم کا ہے کہ ہوا، کام ابھی باقی ہے؛  
نورِ توحید کا استام ابھی باقی ہے؛ (اقبال)

(۶)

## وطنیتِ مطلع تاریخ پر؛

اقبال کی نظروں میں وطن کچھ اس درجہ مکروہ و مغلوض واقع ہوا  
ہے کہ بلاشبہ لفظ کہا جاسکتا ہے کہ اب وہ بجائے "شیطان کے" وطن ہی کو  
جانتے ہیں؛ اقبال نے جس پیائے بکھل سے وطن کی ارادت و محبت کو ناپا ہے



اُس کے اعتبار سے بھی وطن معرضِ لعنت سے منور نکل جانا چاہیے! لیکن  
برجستِ وطن کی اتنی رعایت بھی غالباً دنیا کی شرم سے ہے! — خوفِ خدا  
سے نہیں! چنانچہ وطن کے اثر و حق کے اس بادلِ ناخوہستہ احترام کا وہ  
مختلف پیرایوں میں سخت انتقام لیتے ہیں: وہ اُسے سب سے بڑا طاغوت  
کہتے ہیں! وطن کو از علمائے ہند کے التفاتِ وطن کو لعنت کے نام سے  
پکارتے ہیں! اور ایک جگہ تو اپنے جوشِ ایمان کے بحران میں اس حبِ وطن  
کو روحانی غذا مسموم سے تعبیر فرماتے ہیں! اس سارے فلسفے کا "مکس" یہی  
ہو سکتا ہے کہ وطن سے دامن کشی شدید سب سے بڑی "سوسنات شکنی" ہوگی! وطن  
سے بیزاری اک سعادتِ کبرئی ہوگی! اور محبتِ وطن سے غائے دل کی ویرانی  
سب سے بڑا "تزکیہ نفس" اور سب سے بڑھ کر "طہارتِ روح" ہوگی! —  
بیادِ بزمِ رنداں تا بہ سبستی عالمِ دیگر  
بہشتِ دیگر و اعیس دیگر، آدے دیگر!

اسلامی تصور کا عنصر اس ساری ژاڑِ خانی میں صرف اتنا ہے کہ اگر  
راہِ حق میں ہمیں اپنے وطنِ مملکت کو بھی عارضی طور پر ترک کرنے کی ضرورت  
لاحق ہو تو ہم کو بے تکلف بہ قربانی بھی پیش کر دینی چاہیے! وطن کی خاک سے  
خامسکارانہ وابستگی ہماری علمبردارِ حق میں حائل ہونا — لیکن یہ تو باطل  
اک دوسرا نقطہ نظر ہے! نہ یہ وطن بیزاری کے ہم معنی ہے، نہ اصل کوئی ناپسندیدہ  
نظر یہ ہے، حقیقتہً اسلام کے ساتھ کوئی خصوصیت خاص رکھتا ہے: تاریخ  
حریت کے روشناسِ عالم پیامبرِ دامنِ وطنیت شاید قدمِ اولیٰ ہی پر سرزمینِ  
وطن کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے ہیں! لیکن مین اسی غرض و غایت سے کہ چند  
ہی روز کے بعد خاص صواب اختیار بیک مبنی و دو گوش، سخنِ وطن سے خارج  
کئے جائیں! اور مادرِ وطن کے "عاشقانِ مجبور" دیوانہ وار اُس کی آغوشِ  
حافظت کی طرف دوڑیں، یہ رنجِ وطن پڑتے ہوئے کٹ  
بشہرِ خود و دم و شہرِ یارِ خود باشم!

الغرض اس ماجرائے خاص میں وطن صرف وقتی طور پر متروک ہو جاتا  
ہے، ازلی وابدی طور پر "مردود" نہیں ہو جاتا! نامور شہیدِ مجاہدِ وطن، آقا  
کرماتی کو اپنے تمام ایامِ شباب میں شہلِ ہی کبھی دو روز گھر پر چین سے بیٹھا  
ہوا، لیکن اس جبر پر ہجرِ وطن نے معشوقہٗ وطن کو اس "فریادِ وطن" کے لئے جیسا  
"شیریں" بنا دیا تھا، اُس کا پُر سوز نوش و نیش اس شاعرِ وطن پرست کے

ان "سیار ہائے دل" میں پڑھے!

یہ ایراں تباہِ آں چناں روزِ بد کہ کشور بہ بیگانہاں اوفتد!  
خواہم زمانے کہ ایں نو عروس بیفتد بزر جو اناں روس!  
گنجی سبدا کہ ایں عور و لیس شود ہمرؤ آدے! از انیکلیس!

عارضی ترکِ وطن بعد از جہادِ آزادی — ہجرت، با صلحِ اسلام!  
— حقیقتہً اک عام و ناگزیر مرحلہ ہے تحریکِ حرب کی راہ میں! اقبال  
کے لئے تو "ہند ہندوستان" کا کوئی شرف و فخر تسلیم کرنا ناممکن ہے، لیکن  
آپے ہم خود کا گریس کی (بخیال آپ کے) "معدانہ دعوتِ وطنیت" میں ہجرت  
کے نقوشِ قدم دکھیں! لا لا جبتِ رائے مرحوم مذہبِ آزادی کے مؤمنین  
اولین اور پیامِ حرب پر لبیک کہنے والے "السابقون الاولون"۔

(ioneners) میں سے ہیں! نتیجہ یہ ہے کہ اس پُر شور  
عشقِ وطن کی پاداش میں فراموشی نہیں ہجرتِ وطن کی منزل پر گامزن ہونا پڑا،  
جب کہ اُنکا "دارِ ہجرت" دورِ دراز مانڈلہ (شمالی برما) بنا! سبک یہ ممکن ہے  
کٹ

"عشق" کسی کا بے خبر جو "ہجرت" کے آزار سے!

حضرت لسانِ العصر: اکبر الہ آبادی علیہ الرحمۃ نے اس "قیس لیلائے  
آزادی" کی "امیرِ جملہ محل" کی نقاشی اپنے "مفتوحہٗ غفر قلم" سے یوں فرمائی  
تھی:

کرتی ہے سخن کو لیلائے لبزِ ثی مفتوں ہند کے دل کو لبالیتا جرتی کایہ فوں!  
لا جبت بھی ہوئے شاید کہ امیر و محزون پائے کو باں کوئی زنداں میں نیا ہجرتوں!  
آئی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی!

وطن کا اک دوسرا عاشق، جو اس سال سجدِ آزادی کی طرف شہرِ حال  
کرنے والے قافلہٗ قومی کا "میر کارواں" بنا ہے (ہمارا روئے سخن بابر شجاش  
چند روں کی طرف ہے) وہ لیلائے، ملن کے ساتھ اس مہینہٗ محفل (صدارت  
کانگریس) سے پہلے سا لہا سال تک شہرِ بدری و جلا وطنی کے مراحلِ مصعب  
و سخت سے گزر چکا ہے! —

دروہ منزلِ لبی! کہ خطرِ راست ہے شرطِ اول قدمِ آہستہ کہ مجنوں "باشی!  
پس وہ جز ترکِ وطن شہتِ محبوب الہی ہے" اُس کی اقتدار و اتباع کی سعادت  
بھی اپنی بدستارانِ بتِ وطن کو حاصل ہے! —

مسلمان گردانتے کہ "نبوت - عصیت ؟

(نہی)

بدانتے کہ دیں - دربت پرستی ست !

کیا علامہ سراقبال کو ماؤنڈ ٹیبل کا نفرش منعقدہ - قمر سینٹ جیس کی سبت قبلہ میں - بربند یہ مٹھلہا کے اعزاز کے علاوہ کبھی اپنی شہرہ بھرت کی یہ سعادت بھی نصیب ہوئی ہے ؟ یا تبندے ماتم کے ٹھٹھے میں اُن کا تراء نا آشنائی وطن بھی ہے کہ سے

پھر کر رہے ہیں عزم طوف حرم لندن !

ہوتا ہے جاوہ پیا پھر کارواں ہمارا !

اقبال جرح فرماتے ہیں کہ - کیوں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض اک ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بجائے قوم یا قومیت اور جہل والو تب کو اپنائے رکھا، اور اُن کی، لجوائی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں اُن کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی، اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی، مکن ہے اسلام سے مطلق غلامی مراد ہو ! اور ہر شریف سے شریف غیر مسلم کا تسمیہ شاعر اسلام کی زبان میں ابو جہل و ابولہب ہی ہو ! لیکن ہم کو تو بجائے اس کے خدائے اسلام کی یہ "موعظت" آویزہ گوش ہے کہ "لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فلیسبوا اللہ

عدوا بغیر علما پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جام محبت" قلب محمد اپنے ہم قوم محمد بنی حق کی دلجوئی سے ایسا ہی (نمود بالمشا خالی ہو، جیسی کہ اقبال کی مروی حدیث قدسی ہے ! تاہم ہمارے سامعہ اسلامی میں اس "رحمت للعالمین" کی توہی "قومی دسوزی" کی ذائے ہاں نواز گونج رہی ہے کہ لا اللہم اھد قومی ! فانھم لا یعلمون ما یفعلون ! (پروردگار میری قوم پر راہ ہدایت کھول دے ! اور انھیں معاف فرما دے، اس لئے کہ وہ شرارت و معاندت سے یہ حریفانہ کاوشیں اسلام اور داعی اسلام کے خلاف نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اُن سے کیا حرکات سرزد ہو رہی ہیں !) — اللہ اکبر !

کیس کیا دل کی دوسعت اپنی ہم - اللہ ہی وحدت !

اگر نہ آسمان ہوں جمع اک خالی سوید اہو !

آپ سمجھے ! یہ سخی عاشقانہ جذبیہ پیغمبر عرب کی، اپنی دشمن خدا و رسول قوم کے ساتھ ! اس منقولہ بالا دعائے نبوی کی شان نزول یہ بھی کہ امرائے

طائف نے آپ کو مغربی نبی کہہ کر آپ کو دروغ خطاب بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا ! اور قبائل کے خندوں نے آواز سے کہے تھے - بچوں نے تالیاں پیٹیں ! اور بعض اشقیاء نے اس محکم پیام رحمت پر مٹھرا کے کتوں کو بھار دیا تھا ! اور ہمارا رکاب نبوت حضرت صدیق اکبر ایسے رفیق القلب انسان تک کو اس کیسے فضلے بربریت و طبیعت سے اک تیز دند عذاب آسانی کا اسی لئے نزول ہوتا نظر آتا تھا ! لیکن نہیں، عشق ریز سان محمد نے فی الغور اس سارے پُر ہزل ماحول کو اپنی محولہ بالاشفاعت گہری سے ٹال دیا ! اللہ اللہ !

اسد سبل ہے کس انداز کا ؟ قاتل سے کہتا ہے

تو مشق نازک، خونِ دو عالم میسری گردن پر !

اقبال اپنے پنجابی دل و دماغ سے قلب نبوت کی اس کائنات پیاپائی

کو نہیں سمجھ سکتے !

اور ہے تیرا شعار، آئین ملت اور ہے ! زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا !

قیس ہوں پیدا تری محفل میں یکن نہیں، تنگ ہے مہر ترا، محل ہے بے بسی ترا !

تعب ہے کہ، اقبال ہی کے اشعار آبدار ہیں ! لیکن ایسی روج شری اقبال

کی نفل میں موجود ہے، اور اُس کو اُس سے سن تک نہیں !

چشم ہما کہ تراں گفت کہ او درکت بر من و من ہجو ر م !

شاید اس راز سرستہ کا حل بھی زبان محمد نے کیا تھا جبکہ اپنے اک ترجمان،

حقیقت، لیکن ساتھ ہی معاذہ سحر یک اسلام شاعر کا کام شکر اُس پر یہ تعمیلی

تقدیر کی تھی کہ آمَن سَنَان و کَفَر قَلْبَان ! — یعنی

"قلب او کا فر زبانش مومن است !"

جناب حکیم الامتہ (اقبال) کی الہامی شخصیت یہ ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ

حسین احمد یا اُن کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں

وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ غایتیت، کا نظریہ !

اقبال کا طوطی قلب ماثرا اللہ ساری دنیا کے تاریک توہمات کی نزول

ہے ! اللہ اللہ وہ اپنے جبرطن قادیانی مٹتی، کا مشیل اک سید مدنی میں دعوۃ

ہیں ! — بجائے اک پشینی برہن لاہوری کے !

معاذہ تو رشک حوریشی، ہمیں میں مسیر !

سمجھے نہ ہم تو ہنس کا اپنی تصور عتقا !

اقبال کو اس کلورخ اندازی کا بعد سبزاک دندان شکن سب کے کچھ

قومیت تھی کہ آپ نے قبائلی عرب کے ایک ایک خیمے میں یہ صلے ملے  
پہنچائی تھی کہ۔

”آج عرب و عجم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا  
ہیں! اس لئے اسلامی علم کو عرب کے ایک ایک فرزند  
زمین کی ضرورت ہے۔۔۔ عام اس سے کہ وہ ستم ہو یا  
یہودی، یا عیسائی!“

کیا ہمارا کانگریسی برٹش جہند اہم خلافت راشدہ کے اس شکستہ اور  
پرچم اسلام کے نونے سے کچھ مختلف ڈیزائن رکھتا ہے جو عمر ابن الخطاب  
نے کارزار قادسیہ میں اڑایا تھا؟ اور جو اسلام، یہودیت اور عیسویت  
کے مختلف مذہبی ریشوں سے مل کر ایک غیر شکستہ ”جبل النین“ بن گیا تھا!!  
پھر مدینے میں ہجرت فرما ہونے کے بعد ہی پیغمبر اسلام نے اس دارالہجرت  
کے ساکن۔۔۔ اور علما حاکم و آمر۔۔۔ یہود کے ساتھ جو خالص و انحصار  
”سیاسی وطنی مشاق“ خود اپنے اقدام پر کیا تھا وہ ہندوستان کے  
ہنود کے ساتھ کراچی کانگریس والے اعلان حقوق اساسی سے کیا کچھ زیادہ  
ہے؟ مدینے کے اس ”اسلامی یہودی معاہدے“ کے بنیادی شرائط یہ تھے  
کہ ”مختلف“ باوجود اختلاف دینی و نزاع مذہبی کے ہمارا مہتما مشترک وطن  
یثرب ہی ہے! اس اُس کی سیاسی حفاظت اور داخلی امن و قاذون کی صیانت  
فریقین کی یکساں غرض و مصلحت ہے جس کے تحفظ و ادر کے مشترک محاذ کو  
ہم اس دفاعی ائتلاف کا سنگ بنیاد بناتے ہیں؟

سنت نبوی کی اسی روشنی میں فی زمانہ مصر و فلسطین وغیرہ اسلامی  
مالک کی اسلامی اکثریت اور عیسائی اقلیت نے بے تکلف مشاقہائے  
وطنیت قائم کر لے، جن کے زیر سایہ ان ہر دو ملکوں کے عیسوی باشندوں  
نے قوم کے مشترک دشمن، برطانوی حکومت کے خلاف اُس کے مذہب عیسائی  
ہونے کے علی الرغم اپنے مسلم رفقاء وطن کے دوش بدوش دیسی اسی  
واو شجاعت دی مہم کی ”سرحدی گاندھی“ خان عبدالغفار خاں کے سرخوش  
خدائی خدمتگاروں نے کانگریسی علم کے نیچے خدا پرستانہ خدمت وطن انجام  
دے کر اپنی ”سرخوشی“ پر ”سرخروئی“ کو بھی مستزاد کیا:۔۔

زاتفاق گیس شہد میثود سپہ!۔  
خدا چہ لذت شیریں در اتفاق نہاد؟

سے مل سکتا ہے!! اس میں کیا شک ہے کہ سر اقبال اور مرزا غلام احمد انجمنی کے  
باہم گرد خاکہ خیز سے بڑھ کر ایک روحانی مشرکت یہی ہے! آخر الذکر نے  
ایک دینی شقاق پیدا کیا، اور اول الذکر نے ایک سیاسی نفاق ایجاد کیا! ایک  
کا کارنامہ قادیان کا بیہشتی مقبرہ ہے، دوسرے کا شاہکار شمالی مغربی ہند کا  
”پاکستان“ لیکن یہ بیہشت ناقبرستان اور یہ چوکا صفت پاکستان  
دو دونوں کلیسائے سیزٹ پال لندن ہی کے دو مخفی تجربے ہیں! مرزا صاحب  
انجمنی نے بقول خولش، برطانوی سلطنت کی لغت و نقبت میں اتنا بے پایاں  
”اعوان مدنی“ رکھا کہ ”پچاس الداریاں“ اُس کے باوجود عظیم کی حاملہ ہیں! اور مارشال  
چشم بد و در حضرت مسان الہند نے انجمنی مجاہدین کے سامنے اک نہ جز  
پڑھا جو جنگ عظیم میں یونین جیک کے نیچے ہندو و بیت المقدس پر پرچم اٹھم  
کو پارہ پارہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے تھے!۔۔۔ کیوں نہ ہو! الجنت  
تحت ظلال السیوف البرطانیہ!

لیکن ہمیں حقیقت یہی ہے کہ مولین حسین احمد اور اُن کے دیگر بھائیوں  
کے افکار میں نظریہ وطنیت وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکار  
خاکیت کا نظریہ!

”باحیا“ باش دہر چہ خواہی گو!

ہم علامہ کے اک ”دروال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیا سچ سچ سر اقبال  
کا یہ خیال ہے کہ اگر ملک عرب آنحضرت کی بعثت کے وقت سیاست غلام  
بو تا تو آپ قدم اول ہی پر حریت عرب کا رایت بلند فرماتے!! محمد علی بی  
کے اک نہایت فاضل ”اختر طریقت“ حضرت موسیٰ کا اسوہ حسنہ کیا تھا!! کیا  
اُن کی تہامی دینی دعوہ کا اول کلام طیب یہی سیاسی اعلان نہ تھا کہ اَدِیَا  
النی، وَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنیْ اِسْرَ ائِیل!۔۔۔ یہ مطالبہ اگر اک جدید  
”پولٹیکل مینی فیسٹو“ میں منتقل کر دیا جائے تو کیا اُس کا یہ اک آزاد ترجمہ ہوگا  
”کہ اہل مصر اپنے مالک آپ ہیں، لہٰذا تیرے غلام و رعیت اے فرعون! یا  
بالغافہ دیگر مصریوں کے لئے ہے!“

خود عرب کی قرن اول کی اسلامی تاریخ بھی اُن نظائر سے خالی نہیں،  
جو چشم بد و دیدہ در اقبال کو نظر نہیں آتے! قادیسیہ کے فیصلہ کن معرکہ  
فابین اسلام و زرتشتیت کے لئے موت و حیات پر، حضرت فادوق اعظم کی  
”یہ کیا کوئی“ محمدانہ سیاست، یا اسلام فراموشانہ وطنیت، یا تخت فروشانہ

ستمِ عربی دیکھئے کہ اسی مقرر و شامِ فلسطین و عراق کے اندر و فلسطین کے  
تہور کو اقبال ان ہلکاک کی سب سے بڑی بدبختی قرار دیتے ہیں۔ اور اس پر  
بڑی طرح خون در جگر ہیں! وہ جنگِ عظیم کے دوران میں ترکی سلطنت کے  
ان عرب دلیات کی بغاوت کی طوفانِ دعوتِ نظر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے  
میں ان کو اپنے "وطن دشمن فلسفے" پر گویا عینِ یقین حاصل ہو گیا ہے، لیکن  
اگر سلامہ مدوحِ حقوڑی سی حکیمانہ وقتِ نظر سے کام لیتے تو عثمانی خلافت  
کے یہ حوادث اک دوسری ہی حقیقتِ لغز کے شاہدِ عادل نظر آتے! ہم  
واقعات کی تاریخی ناگزیری سے گریز نہیں کر سکتے! ترکی کے عرب صوبہات  
کی نام نہاد غداری و راسل عثمانی سامراج کا براہِ راست منطقی نتیجہ تھا!  
عربی بغاوت اسلام کی سیاست و حکومت سے کسی روگردانی و سرتابی کے  
ہم معنی نہ تھی، بجائے اس کے اس کا بدلتہ مستبد خاندانِ عثمان کی مہجرانہ  
غلط کاری، فرضِ فراموشی، اور عرب با مالی تھی! لیکن کیا شرم ہے کہ اس نقشہ  
بساطِ سیاست بین الاقوامی سے یورپی شاطروں نے خوب ہی فائدہ  
اٹھایا، لیکن یہ سمجھنا بڑی گھماٹا تاریخی بھی ہوگی کہ اس کی باقی و شبانی ہی  
مغربی وسیع کاری تھی! البتہ فرنگی عیاری سے ان ایامِ تاریک کا جو ساتھ  
منسوب کیا جاسکتا ہے وہ خیر سے ہندوستان کے "فرزدانِ توحید"  
مسلمان مجاہدین کے وہ غزوات تھے جو انھوں نے معلوم ترک سپاہیوں  
نکد اصلِ عالم عثمانی سلطان! — کی گردن زنی و خون آشی  
سے انجام دئے تھے! اور جس پر نعرہ ساربانِ مجازہ اپنے والے اقبال نے  
لاہور کے ڈپٹی کمشنر کے دربار پر گہرا میں اک پیشگی قصیدہ تہنیتِ فتح پیش کیا تھا!

کو رزم بنادیتے تھے، اسی طرح عربی نسل خطوں کے ایک ایک پتے سے بیزاری اُن کی پالیسی کی دوسری خصوصیت خاصہ تھی؛ وہ خطرناک اور سبیل و مقتضی المباد عثمانی خلافت اور عربی ممالک ہر دو سے دستبرداری، ایک ہی حکمت سیاسی کے دو لازم و ملزوم عناصر جانتے تھے؛ وہ اب خلافتِ عثمانی کے زرداؤن و دروہر خدین کے مقدس خطہ کو قطعاً اک قصہ ماضی بنا دینے کا عزم بالبحرم کر چکے تھے؛

مرا بخیر تو اُمید نیست شرم رساں؛

دوسری طرف اس کا ردِ عمل بھی عین حسبِ مراد تھا؛ عرب لوگ، ترکی منصوبوں سے نام و کمال سلطن و امین ہو گئے؛ انھوں نے اپنی نام نہاد جہ مغرب کے فزائیدہ استعمار و استبداد پر تڑپ کر بولے پر مرکوز کردی؛ ترکانِ کمال کی اخلاقی ہمدردی اُن کی پشت پناہ بنی، اور یہ جدیدہ بندِ غلامی جلد بارہ بارہ ہو گیا؛

من دساقی بہم سازیم و دنیا دش بر اندازیم؛

ترکوں کے لئے عرب امداد اس سے زیادہ سرگرم نہ تھی۔ ابتدائی باہمی صلح و صفائی کے بعد ہی عربوں نے ترکانِ انگورہ کی کشش کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا؛ چنانچہ یہ ترکی ہونانی کشش کے دورِ اول کی بات ہے کہ عرب بھائیوں نے سرحدِ اناطولیہ کو عبور کیا اور عسکی شہر و سکاریہ کے دہرہ گداز معرکوں میں یونانی در اندازوں کے خلاف اپنے ترک بھائیوں کے عین بھائیوں کے لئے، اور وہ جالِ منظر تازہ ہو گیا کہ

آہیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک؛

یہ وہی عرب تھے جنھوں نے جنگِ عظیم کے لمحہ نازک پر ترکوں کو بڑا فراق مینی وینک کا پلیم و دافعہ سنا یا تھا؛ وطنیت کے دور کے دو طرفہ آغاز کے ساتھ ہی قیصریت پرستانہ خلافتِ عثمانی کے عہدِ زبوں کے ترکوں اور عربوں کے درمیان اک تجدیدِ اخوت، بھور میں آگئی؛

ہو را ز دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا

پردہ جو در سیاں ہو دل کے غنبار کا؛

الغرض جو شے اک مشتعل و مسلسل آبیہ رحمت تھی، علامہ اقبال اُس کو اک "ملت سوزِ لعنت" فرماتے ہیں؛

حیران ہوں کہ شاعرِ قرآن کو کیسا ہوا؛

اور اسی اِن سارے گھبائے نعمت کا گُل سرسُبد باقی ہے؛ یہ حال، جو شرکتِ غیرتِ عہدِ وطنیت کی سادتِ غلطی ہے کہ مغربی و وسطی ایشیا کی معنی بر وطن و وابستہ قوم ریاستوں کا اک سیاسی اختلاف — عملاً اک اسلامی مجلسِ اقوام — معرضِ بھور میں آرہی ہے؛ اور کس کی صدارت میں؟ "ناسخِ خلافت"، وطن پرست، دلدادہ اِلحاد و تفریحِ مصطفیٰ کمال کی صدارت میں؛

خلافتِ عثمانی کے سارے طویل قرون میں ہم اخوۃِ اسلامی کے اِن نادور مناظر کو ترستے ہی رہے؛ اور اب اُن سے آنکھیں شاد کام بھی ہوئیں تو کہاں؟ دورِ وطنیت کے کلجک میں؛

آبِ حیات در خیرِ ظلمات یافتیم؛

الغرض محبوبِ وطن، اور اُس کی محبوب ترسیلیات ایسی چیز تھیں جتنی جو شعرا کی غلط تعبیری اور تبری طرازی سے مردود و متروک ہو جاتی؛ رُوحِ انسان کے صانعِ سامع نے اِن توہم کو کششِ بدیاں سرایوں کو اپنے اہوان میں باریاب کرنے سے انکار کر دیا؛ بجائے اس کے اُس نے وطن نوازی ہی کی "ذباہِ خلق" میں "نقارۃِ خدا" سنا، اور اس خبر جس کا رواں کی سلسلِ تال پر قدم زن ہوتی ہوئی منزلِ مقصود سے ہم کنار ہو گئی؛

تو زڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام

دورِ نجی جنت میں روتی چشمِ آدم کب تک؛

اور مستقبل بھی وطن ہی کے ہاتھ میں ہے؛ اک بین الاقوامی عالمی سیاست

کا جو مطلوبہ نصب العین ہے اُس کا پیش خیمہ بھی وطنیت ہی بننے والی ہے،

اور علامہ اُس کی سرک صاف کر رہی ہے؛ جو چیز طعون و ہلک ہے وہ سلبِ جہ

ہے، نکتہ سورج؛ اقبال بھور سے جس چیز سے ڈرتے رہے ہیں اپنے

اِس ہوتے کو آج تک پہچانتے تک نہیں؛ شاید اُن کی "وحشت" نے

انھیں اِس شناسنت کا موقع ہی نہیں دیا؛ جس طرح مخلصانہ فرقہ پرستی

بُری نہیں، اور اِس قسم کی مختلف فرقہ پرستیوں کی واقعی شکایات و مطالبات

کی دفعہ داد و پھر سانی سے ہم اک مضبوط و مربوط قومیت ڈھال سکتے ہیں۔

(بشرطیکہ نمائشی فرقہ نوازی کے نقاب کے نیچے خود پرستی کے کردہ خط

و خال ہوں) اسی طرح مخلصانہ قوم پرستیوں کے اطمینان یافتہ ستونوں

سے مجوزہ عالمگیر ریاستِ انسان کا قصرِ سحری تعمیر کیا جاسکتا ہے؛

عمرہ عالم میں اک صالح المزاج اور قائم الطبیعت عالمی ریاست کے قیام  
کے لئے زمین ہوا کر دیں، اور اس مضطرب اور پرکرب دنیا کو یہ شاد باند  
لگانے کا موقع بخشیں کہ ہے

لشدا احمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست  
آخراہد ز پس پردہ تقدیر پیدا

(کائنات)

بشر طیکہ ان ارکان عمارت عالم میں نہ مہمان کی طرح کا کوئی برہمن عنصر  
ہوا نہ اہلستان کی قسم کا کوئی سنگ راہ!

غاصب فیصرتوں سے محروم وطنیں ٹکرائیں، اول الاکر کی زندگیاں  
کو براہ دشوار بناتی رہیں گی، تا آنکہ وہ مساوی و معتدل، مرستہ و مہمان  
قسم کی وطنیتوں کی سطح مستوی پر آکر، اور سپاژہ وطنیتوں کو ذرا اوجھار کر

عمر جگہ عجب خطیب آ رہا ہے  
اک قلب پیپ خطیب آ رہا ہے  
گر پتی ہے جب خاک کے ذروں پر  
ہر ذرے میں خورشید خطیب آ رہا ہے  
بہل عبیدی لڑی

مژدہ ہو پیپ خطیب آ رہا ہے  
اشد کی رحمت کے پیپ تاروں کو  
دور رخ کو تو سے خوار اپنے جانی ہے  
اب کون جلائے لگا لگا گلزاروں کو  
بہل عبیدی لڑی

حسرت ہا ہی کوئی نہ حسرت بھلی  
راحت بھی جسے حق میں مصیبت بھلی  
بیٹھا تھا میں دولت کی توقع پر غلطی  
خود وقت کی محنت خاں دولت بھلی  
غلام عبیدی لڑی

وہ شام کی سبب بھری  
تار کی نور کی وہ رنگ بھری  
پیغام ہزار زندگی و سبب بھری  
خبر کی ایک لکھوں کی بھری  
اثر بھری

# مزدور کی جوانی

## سری نگر نئیر کی ڈل پراکٹاثر

دا دئی کشمیر اور پھر ڈل پہ یہ ہنگامِ شام  
ساتگینوں میں نسیمِ شام کے ہے رُوحِ گل  
چھن رہا ہے آنچلوں سے ابر کے ریگِ بیاہ  
ہیں رواں ہر چار سوتارِ مکیوں کے قافلے  
بار سے تارِ مکیوں کے دب رہی ہے روشنی  
جھک گئیں جلوؤں کی پلکیں رُک گئی نبضِ شفق  
یہ ہجومِ کوہ یہ سبٹی ہوئی راتوں کے ڈھیر  
بھاری بھاری تیرگی ہے ہلکی ہلکی روشنی  
وقت کے عارض پہ وہ نکینیاں ہیں الاماں  
سوچے ہیں پتھروں کے بستروں پر زمرے  
یہ شکارے، سانوے خوابوں کی رنگیں کشتیاں

کشورِ تنویر میں ہے ظلمتوں کا اہتمام  
جیسے نیم جانغزا اک بادہ بے طرف و جام  
پڑ گیا دھماحیں موجوں کا بے پروا خرام  
پاسِ باں بن بن کے سناٹے ہیں مصروفِ خرام  
کھل رہی ہے نوعِ عروسِ شب کی زلفِ مشکِ خام  
پڑ گئی محرابِ مغرب پر روائے تیسرہ فام  
رُک گئے ہوں جیسے نیلی آندھیوں کے اژدہام  
پھیکے پھیکے سے چمن ہیں مہکا مہکا سا شام  
ہر کنول کا پھول ہے گویا چراغِ بزمِ شام  
نطق کی بستی میں ہے لبِ بستگی کا اہتمام  
نیم بیداری کے دھارے پر ہیں سرگرمِ خرام

شوخی فطرت میں اندازِ حیا پیدا ہوا  
شورشوں سے اک سرودِ بے صدا پیدا ہوا

آہ اس دُھندے سے منظر میں رہیں انقلاب  
وقتِ رفتن پیرہن کی دستجیاں ہلتی ہوئیں  
جنہشِ شرگاں میں دل کی ناتوانی کا ثبوت  
کرب سے اترے ہوئے بے نور چہرے سے عیا  
پتلیوں کے گرد آنسو قص سا کرتے ہوئے  
دامنِ عسرت میں عہدِ نوجوانی غنچہ ریز  
گرد آلودہ جبین میں جُراتوں کے آئینے  
سامنے تقدیر کے تدبیر ہے محوِ سجود  
بد نصیبی سے خزاں کی زد پہ پھرتا ہوا  
ہائے چھانٹا ہے کے مشنِ ستم کے واسطے  
یہ بجا رائج ہے آوازِ جہاں سے آج تک  
لیکن اُف یہ موت کا سیلاب اور انساںِ گدل  
جبار ہے اک جواں مزدور باعالمِ خراب  
رہروؤں کے ٹھاٹھ سے کلتا ہوا زعمِ شباب  
ہینِ پیشانی میں محرومی، بسم میں حجاب  
شادمانی سے کنارہ، راحتوں سے اجتناب  
ٹھیس سے چھلکی ہوئی میخانہٗ دل کی شراب  
مُغلسی کی گود میں پالی ہوئی رُوحِ شباب  
ہر نفس کی آمد و شد برق و باراں کا جواب  
مطلعِ خاکی کے تارے پر ہے گردوں کا عتاب  
آنکھ کا غنچہ، لبوں کا لالہ، عارض کا گلاب  
دیدنی ہے گردشِ گردوں کا ذوقِ انتخاب  
کتبِ آلام میں مردانہ سیرت کا نصاب  
مرصعِ اندوہ کے جھونکے ہیں اور جانِ حباب

کس طرح کہدوں کہ شکوہ آدمی کی بھول ہے

مسند یہ پیشِ اہل ہوش نامقبول ہے



# ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبر آبادی

گاہے گاہے باز خواں اس دفتر پارینہ را  
نازہ طرازی داشتن گردا غمناے سینہ -۱

اس دنیا میں زبان کا مسئلہ بھی ایک ایسا ہتم باشان مسئلہ ہے، جو عالم کی تمام قوموں میں پایا جاتا ہے، اور ہر فاتح نے تسلط کے بعد اس مسئلہ کی نشر و اشاعت میں کافی حصہ لیا ہے۔ نیز ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مفتوح قوم کو اپنی زبان سے آشنا کر دے، تاکہ باہمی تعاون سے ایک دوسرے کے لئے آسانی پیدا ہو اور روزمرہ کی بول چال میں، کاروباری معاملات میں، تہذیب و معاشرت میں، مخصوص میدان طبع میں، ذوق ادب و سیاست میں، ہمزبان و ہم قوم ہونے میں ہمرنگی نظر آئے، اور دوسرے ملکوں کی قوموں سے ایک نوع کا استیلا حاصل ہو، نیز اس کی عادات و خصائص سے واقف ہو سکیں، یوں تو انسان خواہ وہ دنیا کے کسی خطے کا رہنے بسنے والا ہو، اور خواہ وہ کسی مرزبوم سے متعلق ہو، بہ لحاظ انسان ایک ہی جنس اور ایک ہی چیز ہے، لیکن مختلف الالوانی کے فطری قاذن کے ماتحت، انسانی طبائع بھی مختلف ہیں۔ اس طرح جس طرح ایک باغ میں مختلف رنگ کے پھول پھرتے ہیں اور پھول ہونے کی حیثیت سے تمام پھول ہیں۔ پر خواص والوان میں اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح اس دنیا کے باغ میں مختلف النوع انسان ہیں، کہ ایک ملک کا آدمی اپنے جغرافیائی ماحول کے تاثر سے، دوسرے ملک کے آدمی سے بالکل جدا نظر آتا ہے، اس کے حالات و تخیلات مختلف، حرکات و سکنات

مختلف، اشکال و اجسام کی ساخت مختلف، رنگ اور روپ مختلف، لباس و خوراک مختلف، اور زبان و کلام مختلف، حتیٰ کہ اسی اختلاف کی بنا پر دو ملکوں کے دو آدمی مختلف مذاق و مختلف تہذیب نظر آئیں گے، اور وہ یکجا رہ کر کبھی لطف و راحت کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے، البتہ ہمزبانی بڑی حد تک ان میں انسیت پیدا کر دے گی، ہمزبان ہونے سے ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کرنا پڑے گا، اور حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی شیرازہ بندی کے لئے یہی ایک واحد و تنہا ذریعہ ہے۔

جس قوم کے پاس اپنی کوئی ایک زبان نہیں، وہ قوم نہیں، بلکہ مغفلوں، منفلوچوں، گونگوں، اور بہروں کا ایک گٹھ ہے، جو بیٹرلوں کے خواص اپنے اندر رکھتا ہے، جب کبھی کسی قوم کا دور اتفاقاً شروع ہوا ہے، تو سب سے پہلے اُس نے اپنی زبان ہی کی طرف توجہ کی ہے، تاکہ باہمی اجنبیت دور ہو سکے، جب کبھی ایک ملک کے دو آدمی کسی دوسرے ملک میں حسن اتفاق سے ملے ہیں تو ہمزبانی ہی نے اُن کے جذبہ اخوت و ہمدردی میں تحریک پیدا کی ہے۔ ہاں جو اس جہل و تعصب کے جو آج ہندوستان میں رونما ہے، اگر یہاں کا ایک ہندو ایک مسلمان کو کسی غیر ولایت میں مل جائے تو وہ فوراً مسرت سے دلوں کے دل بھرا آئیں گے، اور دلوں ہم آغوش ہو کر ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرنے لگیں گے۔

غرض کہ ہمزبان ہونا قوم کے لئے باعثِ رحمت و برکت ہے، اور

اور موجب عروج و ارتقا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر ملک اپنی ایک علیحدہ زبان رکھتا ہے، اور ہندوستان بھی باوجود مختلف مقامی زبانوں اور بولیوں کے، ایک مشترکہ و جمہوری زبان رکھتا ہے، ایسی جو اطراف ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور جس کا نام اردو ہے، یا ہندوستانی، یہی زبان آج سے چند سال پیشتر حکومت ہند کی دفتری زبان تھی، اور مغلوں کے زمانہ حکومت سے لے کر برٹش حکومت تک یہی ملی زبان سمجھی گئی تھی، اور ابھی جا رہی ہے۔

لیکن جب سے ہند کی سیاست نے اہل ہند کی دہنیت میں انقلاب برپا کیا ہے تب سے ننگ خیالی کے باعث اس زبان نے رسم الخط کو عربی زبان کے مشابہ دیکھ کر، سہولتوں کی مذہبی زبان سمجھ لیا، اور اس سے اس کے لفظوں سے اور اس کے حروف سے ان کو بے خون آنے لگی۔ چنانچہ یہ ہندی رسم الخط کی نشر و اشاعت کی طرف مائل ہو گئے کہ ان کی نگاہوں میں ناگری رسم الخط سنسکرت کے مماثل ہونے کے علاوہ مذہبی تقدس کی بھی چیز ہے۔

اگرچہ یہ معرکہ آراء مسند کانگریس کے اہل بنیش کے پیش نظر رہا ہے، اور اہل فکر نے اس پر اجتہاد و فیصلہ کن اجتہاد بھی کیا ہے اور چاہا ہے کہ کسی طرح زبان کی اس گستی کو سنبھالیا جائے، چنانچہ جماعتوں کا دل رکھنے کے لئے، یا ماضی منہایت کو پیش نظر رکھ کر کچھ بھی متناک اس مسئلہ کو حل بھی کیا ہے، یعنی یہ کہ اردو زبان کا نام "ہندی" یا "ہندوستانی" رکھا جائے، یا ہندی اردو دونوں زبانیں ملک میں جاری رکھی جائیں اور غیر ممالک سے انگریزی زبان میں مرادست کی جائے، گو یا ایک ملک میں تین زبانوں کو استعمال کیا جانا ناگزیر ہے۔ نزدیک عقلمندی، حق، اور انصاف ہے، لیکن میرے نزدیک ابھی تک یہ مسئلہ لایسحل ہے۔ نہ صرف میرے نزدیک بلکہ آٹھ لاکھ کروڑ انسانوں کے نزدیک حل نہیں ہو سکا ہے۔

بظاہر اس کے حل میں ایک عارضی منہایت و رد و اداری تو ضرور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن باطن اس میں فریب کاری، غیر دیانتداری، نا انصافی، اور ہٹ و دمیری اپنا کام کر رہی ہے، یہ سبب ہے مذہبی جنون شباب کا۔ جس طرح انسان جنون کی حالت میں شیب و فراز کو نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح ارتقا کا پندار قوت انصاف و حق کو زائل کر دیتا ہے۔

بلکہ سبھی نارو ہندو سلطانے  
کہ ماہ صبح دبیم، اور جنگ می طلبد

ظاہر ہے کہ یہ جنگ اردو، ہندی کی نہیں ہے، بلکہ عربی و ناگری رسم الخط کی ہے۔ اگر آج سمان عربی و فارسی کے تمام الفاظ نکال کر سنسکرت کے تمام الفاظ اردو زبان میں بھرتی کر لیں، اور رسم الخط اردو ہی رکھیں، تب بھی ہندو وطن کو تسکین نہ ہوگی، گو یا سیاہ لکیریں بدل دینے سے ان کے نزدیک چائیں یا نہ کرو انسان متحد ہو سکتے ہیں، بصورت دیگر نہیں ہو سکتے، یعنی اگر آج ہندی رسم الخط اختیار کر لیا جائے تو پھر کوئی سمجھ بڑا باقی نہ رہے، حصول آزادی و اتحاد کے نزدیک تو یہ کوئی بڑی اور اہم بات نہیں ہے کہ لکیروں کی صورت بدل دی جائے، بشرطیکہ تبدیل شدہ اظہار سے کسی زبان کے لفظوں کے معنی بدل نہ ہو جائیں۔ لیکن اگر معنی کی صورت ہی نسخ ہو جائے تو پھر ایسا کرنا ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر دو چار الفاظ ہم آواز و مختلف المعانی درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ اگر ذیل کے الفاظ اور اسی قبیل کے سیکڑوں الفاظ جو اردو میں شامل ہیں، ناگری رسم الخط میں لکھے جائیں گے تو یقیناً ان کے معنی کچھ نہ ہوں گے۔ مثلاً

آسی و عاصی۔ آشیر و اسیر۔ عائد و آمد۔ ان کی آوازیں ایک ہیں لیکن معنی جدا گانہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندی رسم الخط میں، ح۔ ہ۔ ث۔ تیر۔ ص۔ ع۔ الف۔ ذ۔ ز۔ عن۔ ظ وغیرہ وغیرہ کے لئے الگ الگ حروف ہیں۔ اگرچہ اس کے اظہار میں ۳۴ حروف دیکھیں، ۱۴ حروف سُوڑ، اور ۱۶ مাত্রا یعنی اعراب ہیں۔ اگر ان پر ۵ اُن حروف کا اضافہ کیا جائے جو۔ ج۔ خ۔ غ۔ ف۔ و۔ ذق کی آوازیں کے لئے نقطے لگا کر بنائے گئے ہیں، تو یہ حروف ۱۶ حروف ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اتنے کثیر ذخیرے کے ل۔ ہ۔ ا۔ و۔ کی مرکب آواز کے کوئی ترکیب نہیں ہے۔ مثلاً کوہوں میں آ کے ساتھ ق کی مرکب آواز نکلتی ہے، اور لفظ تنہا میں آن اور ق کی آواز مرکب ہے۔ لیکن ناگری میں مرکب آواز نہیں نکال سکتی۔ چتر ویدی و آوار کا پرشاد شرمائی ہندی ڈکشنری میں یہ الفاظ اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ کوہوں میں آوار شرمائی شرمائی شرمائی ان سے آواز پیدا ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ گوئی ہو اور تنہا اس طرح ان الفاظ کے معنی بالکل بدل ہو گئے۔ اصل میں ناگری حروف کے ٹکڑے حرف الف اور لاء کے ساکن ہونے کو تو بتاتے ہیں۔ لیکن مرکب آواز پیدا نہیں کر سکتے میرے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناگری اصطلاح اردو الفاظ کے زیادہ آسان ہے۔ اور ہفتہ عشرہ کی معمولی محنت کے بعد لکھنا پڑھنا آسکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ جو لوگ ایسا سمجھتے تھے یا سمجھتے ہیں، وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، چنانچہ جب ان کو ناگری سے واسطہ پڑا تو حقیقت کا اظہار ہوا، ایسی مثالیں ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں ہیں، کہ جس وقت انہوں نے ناگری سیکھنا چاہی تو بمثل مہینے دو ہفتے میں صرف حروف کی شکلیں پہچان سکے، ناموں کے اور خطوں کے لکھنے کے لئے ہینوں کی ضرورت پڑی، ہندی کا ایک خط بچے کر کے اور انک انک کر پڑھا جاتا ہے۔ لیکن اردو کا خط بآسانی روانی کے ساتھ پڑھ لیا جاتا ہے۔ ناگری رسم الخط سے تو کہیں زیادہ آسان و سہل رسم الخط ہے، لیکن ہم آواز حروف کے ساتھ سنی کے تبدیل ہونے کا علاج اس کے پاس بھی نہیں۔ پھر ہندی کا کیا ذکر؟

حال میں میرے پاس کانگریس کمیٹی آگرے کا ایک چھپا ہوا فارم ہندی رسم الخط میں آیا۔ یہ فارم ایگزیکٹو کمیٹی کی ممبری کے داخلہ کے لئے تھا، اس میں چونکہ سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے تھے، اس لئے میں نہیں سمجھا۔ چنانچہ میرے پڑوس میں جو ایک ہندو ماسٹر رہتے ہیں، میں نے ان کو بلایا۔ یہ ایک باقاعدہ اسکول میں ہندی پڑھاتے ہیں۔ جب ان سے کہا گیا کہ اس فارم کو آپ بھردیجئے، دستخط میں کر دوں گا تو انہوں نے پہلے تو کم از کم پندرہ منٹ تک فارم کی تحریر کو سمجھا، اس کے بعد کہا کہ چونکہ اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہیں اس لئے میں بخوبی نہیں سمجھ سکتا۔ پھر نو اسوں نے اپنی سمجھ کے موافق نام ولایت اور سکونت وغیرہ اپنے قلم سے لکھ دیا۔ اس کے بعد جب میں نے دستخط کر کے یہ فارم دفتر کانگریس کو واپس بھیجا تو یہ اس بنا پر ریجکٹ کر دیا گیا کہ فارم غلط لکھا گیا ہے۔

یہ تو روزمرہ کی ہندی کی حالت ہے، لیکن اگر اس کے کلاسیکل لٹریچر پر نظر ڈالی جائے تو وہ اردو لٹریچر کے مقابلہ پر بیچ ہے، بڑے بڑے ہندو کے انشاء پر دازوں کے معنائیں کامیاب راس درجہ بہت ہے کہ اگر آج ایسے معنائیں کوئی اردو کار سالہ پیش کر دے تو شاید یہ ایک نمبر کے بعد بند ہو جائے۔ اس کے چند وجوہ ہیں، ایک یہ کہ اس کے لکھنے والے انگریزی زبان کے بیشتر سند یافتہ ہیں، جن کو انگریزی کے مقابلہ پر اپنی زبان سے مطلق دلچسپی نہیں۔ عدم ذوق کا سبب، عدم صلاحیت زبان ہے اس

مذہب یا لفظ سے ظاہر ہے۔ دیکھو، یاد رکھو اور اسی طرح کے ہزار ہا الفاظ ہیں، جن کی آوازیں جڑا اور واؤ سے ادائی جاتی ہیں۔ لیکن ناگری میں اس کا کوئی علاج نہیں ہے، سوائے اس کے کہ لغت اور واؤ سے لکھا جائے۔

اردو رسم الخط میں عربی و فارسی کے حروف ہونے سے، الفاظ کا کافی ذخیرہ جمع ہوتا رہا ہے، اور ہوتا رہے گا۔

اس کے رسم الخط میں عربی، فارسی اور ناگری کے جملہ حروف ۴۴ ہیں، اگر ان میں اعراب بھی شامل کر لے جائیں تو مع جزم، تنوین اور تشدید کے چالیس عدد ہوتے ہیں، جو ناگری حروف سے تقریباً نصف ہیں، لیکن دنیا کی کوئی زبان، اور زبان کا کوئی حرف و لفظ ایسا نہیں، جو بآسانی اردو کے سانچے میں نہ داخل کئے کسی زبان کا لفظ مفرد ہو یا مرکب، مثلاً ہوا، مشد، ادا کرنے میں اور لکھنے میں کوئی تعظیف اور کوئی رکاوٹ نہیں۔

پھر یہ کہ چونکہ دونوں کے رسم الخط کے حروف کی تعداد میں تقریباً دوگنی فرق ہے، لہذا اس میں اقتصاد ہی پیدا ہی نکلتا ہے، اور اقتصاد و لغات شعاری کے لئے دنیا اور دنیا کا ہر فرد جو یا ہے، قوموں کی ترتیب میں اور اس کے اصول میں اقتصادیات جزو اعظم ہے۔

اگر ہندی کا ایک معنوں ایک صفحہ پر لکھا جائے گا، تو اردو کے ذریعے دو ہی معنوں نصف صفحہ پر آجائے گا۔ اگر ہندی میں ایک معنوں ایک گھنٹے میں لکھا جائے گا تو اردو میں دو ہی معنوں نصف گھنٹے میں لکھا جائے گا۔ اور دونوں کا رسم الخط پڑھنے میں بھی وقت کا یہی واسطہ رہے گا۔ پیسے کی اور وقت کی لغات کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ قوموں کی پیروی اور سبائی کا مدار زیادہ تر انہیں دو چیزوں پر ہے۔

بظاہر ہم آواز حروف غیر مزدوری معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اطلاق جاننے سے معافی کے اختلاف کا کیا علاج ہے؟ اس نازک و اہم ترین بات کی حامل نہ تو ناگری ہو سکتی ہے، اور نہ روس۔ حصول الفاظ کی فراوانی کا یہ ذریعہ جو اردو کے لئے ہے سب سے زیادہ مفید ہے، اور زبان کے لئے یہ ایک قسم کا زیور ہے۔ مگر ہمیشہ قسری سے لکھا جاتا ہے۔ اب اگر ہم اس کو تس سے لکھنے لگیں تو کون بچے گا؟ پھر اس کے سمجھنے کے لئے جس قدر زمانے کی ضرورت درکار ہوگی اس مدت میں ہم دوسرا کام انجام دے سکتے ہیں۔

کہ ناگری کسی بلند تخیل کی نزاکت کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی، اور انداز بیان میں وہ تنوع پیدا نہیں کر سکتی، جو مختلف اسلوب بیان کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ عربی و فارسی کی طرح اس میں تھری لینی سہولتیں نہیں ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہندی کوئی علمی زبان نہیں ہے، بلکہ فرعی زبان ہے، اور ہر فرعی زبان تا وقتیکہ اپنی کسی علمی زبان سے مستغنی نہ ہوگی کبھی مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ سنسکرت سے یہ بخوبی فیضیاب ہو سکتی تھی، لیکن ذات بات کے جھگڑوں نے اسے اتنی مہلت نہ دی کہ یہ اپنی علمی اصل سے فیضیاب ہو سکتی۔ تو اگرچہ سے یہ ثابت ہے کہ ہندو مذہبی لوگوں نے سنسکرت کے دامن و شیرنگی سے کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا، اور بہانہ دینڈت اس سے اور اس کے جمال ہا صرہ و ناز سے حسب و خواہ فیضیاب ہوتے رہے۔ مولف آب حیات نے لکھا ہے کہ:-

چنانچہ جب (ایرین) نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر چکے تو خیالی ہو کر شودروں کے ساتھ آٹھ پہریات چیت رہنے پہنے، اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہو جائے گی، اس واسطے کہنا کہ ہماری زبان زبانی الٹی ہے اور الٹی جہد سے اسی طرح علی آتی ہے، چنانچہ اس کے اصول و قواعد باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے کہ جن میں نقطے کا فرق نہیں آسکتا۔ اصل پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک جذبہ سمجھا، اور سوائے برہمن کے دوسرے کی زبان، بلکہ کانٹک گزند بھی ناجائز ہوا۔

پھر لکھا ہے کہ:-

”اسی بنا پر (ایرین) فتح یا بوں کی بلند نظری نے اسکا نام سنسکرت رکھا، جس کے معنی آراستہ پیراستہ، منزہ و مصفا اور مقدس، جو چاہو سمجھ لو، ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگان دین ہی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں، بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں بھی آواز نہ پڑے۔ اس کا نام دیو ہانی ہوا، یعنی زبان الہیہ۔

جو کچھ مولف آب حیات نے لکھا ہے، یہی منہوم، بیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی لکھا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پراکت زبانیں رائج ہو گئیں، اور سنسکرت کے علم سے عوام ہند و محروم رہے، آج سینکڑوں برس کے بعد سماجی جنون نے ہندو مذہب کو اس طرف بھی متوجہ کر دیا ہے، لیکن اس کے حصول میں عوام کو جو تکلیف ہوگی اور جس قدر مدت درکار ہوگی وہ ظاہر ہے، تاہم اگر یہ کشاکش اردو کے رسم الخط کو مٹا سکتی ہے، تو ایسا کرنا کوئی دشوار نہیں، لیکن اگر اردو رسم خط مٹانا ناممکن ہے، اور یقیناً ناممکن ہے کہ

”آئیں خیالت و محالست و جنوں“

تو چہر آزادی کے میدان میں، حصول آزادی کے لئے یہ رکاوٹ سنجیدگی و انصاف کے خلاف ہے، اور تنگ خیالی کے مرادف، حقیقت یہ ہے کہ تحریر میں، تقریر میں، سلاست و روانی میں، اور استعجاب و استقامت میں، جو طاقت اردو کو حاصل ہے، وہ ہندوستان کی کسی زبان کو نصیب نہیں، اردو بھی ایک فرعی زبان ہے، لیکن اس کو اول روز سے تین علمی زبانوں نے نوازا، اور آج تک نوازا رہی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے دو زبانوں نے فاتح سمران تھے، جن کی مذہبی زبان عربی تھی، لیکن انہوں نے اپنی زبان میں باوجود قرآن کی زبان ہونے کے، اور باوجود مذہبی تقدس کے کبھی نخل سے کام نہیں لیا، کہ عوام اس سے محروم رہیں، چنانچہ عینوں علمی زبانوں نے نہایت فیاضی و نہایت دلیری کے ساتھ فیض عام جاری کر دیا، اور توحیدی مدت میں اردو زبان، الغلطی کی دولت سے مالا مال ہو گئی، دنیا کی شاید ہی کوئی فرعی زبان ایسی ہو جس کو ایک ہی وقت میں تین علمی زبانوں نے نوازا ہو، یہ وجہ تھی، یہ سبب تھا کہ ہندوستان کی جملہ مقامی زبانوں کو پیچھے چھوڑ کر اردو آگے نکل گئی۔ اور باوجود فرعی زبان ہونے کے آج علمی زبانوں کے برعکس ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی پراکت زبانیں کچھ پیچھے رہ گئیں؛ صرف اس لئے کہ اس وقت تک سنسکرت کو ایک عرصہ نوکی کی طرح سات پردوں میں چھپائے رکھا، لیکن سمران فائزین نے اس علمی دہن کو دنیا سے روشناس کرایا۔ اگر سمران ایسا نہ کرتے تو سنسکرت کا تمام مشاہیر خزانہ کرم خورہ ہو گیا ہوتا، یہ اردو والوں ہی کا کرم تھا کہ سنسکرت کی جان بچالی، ورنہ اندلس کے عیسائی بادشاہوں کی طرح، جنہوں نے سمنوں کے عربی علوم و فنون کا قیمتی خزانہ نذر آتش و آب کر دیا تھا، یہ بھی کر سکتے تھے،

(باقی آئندہ)

# نصیب!

وجاہت، سندیلوی، بی لے

رات زیادہ جا چکی تھی، مولوی صاحب نے دو گھنٹہ تک اخوت اور مساوات پر دھواں دھار تقریر کی تھی اور سینکڑوں آسمان بھاڑ لرزے بند کئے تھے، لہذا صحن خشک ہو چکا تھا، طبیعت خستہ تھی تنکا وٹ قدم پر بٹھائے دیتی اور پھر بھوک کی شدت سے تو سکرات ہی کا لطف اُربا تھا۔ راستہ بھر مولوی صاحب نے جلسہ کرنے والوں کو گالیاں دیں کہ کیسے کبختوں نے چار جلیبیوں پر رُخا دیا، گھر پہنچتے ہی مولوی صاحب بڑے زور سے گرجے "نصیب، نصیب، کھانا لاؤ، نصیب، شامت کی ماری ذرا غافل ہو گئی تھی، لہذا پہلی آواز پر نہیں بولی، اب کیا تھا، مولوی صاحب نے اپنا سارا غصہ اُسی پر اتار دیا۔ حرام زادی، لاٹ صاحب کی بچی بنی ہے، ادھر شام ہوئی، ادھر مری رہی، نوکری کرنے چلی ہے، کہہ نخرے دکھانے کیا کچھ تیرے باپ رکھا گئے تھے ہمارے پاس! کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی وغیرہ وغیرہ، مولوی صاحب اپنا لیکچر دیتے ہوئے بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گئے، بیگم صاحبہ ننھے کو ابھی ابھی سلا کر مینے کو دودھ پلا رہی تھیں، مولوی صاحب نے جاتے ہی جاتے پوچھا، پھر تو تھنی کو کوئی درست نہیں آیا۔ سچا اس کے کہ بیگم صاحبہ اس سوال کا جواب دیتیں اُنھوں نے نصیب کو کوسنا شروع کر دیا۔ اس مال زادی نے شام کو پھر ٹھنڈا دودھ پلا دیا اس کو "ٹھنڈا دودھ پلا دیا" مولوی صاحب اپنی جگہ سے ایک ہالٹ اُچھل گئے۔ پھر؟ تمہارے دو دست اور آگئے "بیگم صاحبہ نے کہا۔

"ارے کھانا نہیں لائی ابھی تک حرام زادی، میں دیکھتا ہوں اس کبخت مال زادی کے تو مزاج ہی نہیں ملتے، آج میں اس کی مرمت کئے بغیر نہ چھوڑوں گا، جان کے پیچھے پڑی ہے بچی کے، ارے کھانا بھل یا پھر میں آؤں" مولوی صاحب پھر گرجے، نصیب، ایک سیٹی میں کھانے کو آگئی۔ جیسے ہی اُس نے سینی رکھی بیگم صاحبہ نے ڈانٹ بتائی "نہ ہاتھ دھونے کا پانی، نہ تولیہ، بیگم صاحبہ نے کرا لیں کھانا"

نصیب نے منہ بسود کر کہا۔ لے آ رہی ہوں؟

"لے آ رہی ہوں کی بچی! پہلے سے خیال نہ تھا" مولوی صاحب نے پھر غصہ دکھایا،

جلدی سے نصیب پانی اور تولیہ لائی، تو اب صابون کی مانگ پڑی، صابون آیا تو مولوی صاحب اور بیگم صاحبہ نے کھانا شروع کیا۔

"یہ دال میں مرچ کس قدر تیز ہے؟"

"یہ شور بہ ہے کہ پانی؟"

"آلو بالکل ہی کچے رکھے ہیں؟"

مولوی صاحب کھانا کھاتے جاتے اور اُن کا غصہ تیزی سے بڑھتا جاتا، بیگم صاحبہ بھی اس شعلے کو ہوا دیتی جاتیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب نے کھانا کھاتے ہی سے اٹھکر نصیب کو مارنا شروع کر دیا، بد معاش، حرام زاد

خود مار کھا کر، مولوی صاحب اور بیگم صاحبہ کو کھانا کھلا کر اور ان کے لئے حلال، پائیدار، اگلا نہ انہیں کر کے اور حق سمجھ کر، جی سات کے قریب نصیب خود کھانا کھانے بیٹھی، چونکہ آج پہلا واقعہ تھا کہ اُس نے مار کھائی تھی لہذا اپنی ذلت اور یکسی پر اُس کا دل رو رہا تھا، بارود آئسو کوٹھی لیکن پھر اُس کی آنکھیں بہہ آئیں، اور ان کے منہ سے ایک آدھ سسکی نکل جاتی، بڑی مشکل سے اُس نے وہ چار تھکے کھائے۔

گھر وال نے ایک بجایا۔ وہ جلدی سے اپنے بستر میں گھس گئی، اُسے  
ہاتھ دے اُنکو کمرولی صاحب کو وضو کا پانی دینا تھا، اور پھر کل دن بھر  
کا کام۔ برتن مانجھنا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا، سالہ پسینا، حقہ بھرنا،  
بچوں کو کھلانا، کپڑے دھونا، پاندان اٹھانا، اکال دان لانا، پنک اُٹھانا،  
سمیونے کرنا۔۔۔۔۔۔ وہ سوچتے سوچتے سو گئی۔

## مزدور!

وہ جس کا گردِ شوقِ تقدیر پر کچھ بس نہیں چلتا  
وہ جس پر مشکلیں پڑتی ہیں تو آساں نہیں ہوتیں  
وہ ہر اک سانس جس رنجور کی فریاد ہوتی ہے  
وہ جس کا زندگی بھر غنچہ حسرت نہیں کھلتا  
کڑی محنت کی آنکھوں میں جو دن بھر جان کھوتا ہے  
کسی کو پاس جس کے درد کا مطلق نہیں ہوتا  
بناتا ہے جو قصہ پیش کے دیوارِ دہام و دور  
رہا کرتی ہے پائالِ خزاں جس کی بہار اکثر  
کوئی سنتا نہیں دنیا میں فریاد و دفناں جس کی  
وہ جس کو سب غریب و بیکس و مجبور کہتے ہیں  
یہی ہے جو ققیلِ خنجرِ سرِ ما بھی ہوتا ہے  
یہی ہے وہ جو ذنبہ و فن ہو جاتا ہے کانوں میں  
اُٹھاتا ہے یہی قوموں پہ جب افتاد پڑتی ہے

یہی ناکام رہ کر کام اک دنیا کے آتا ہے  
یہی ذلت گدائی کی بڑھاپے میں اٹھتا ہے

# آج کل

پھر کاروانِ شوق پریشاں ہے آج کل  
پھر ہو چلا ہجوم ہزار پریدہ رنگ  
پھر زاویہ نگاہ کا بدلا ہوا سا ہے  
پھر آرزوئے مرگِ مفاجات ہے ہمیں  
ہو جائے پھر بتوں کی حقیقت نہ بے نقاب  
یہ مشتِ خاک پھر ہے تماشاے رِ بگذر  
پھر آنسوؤں نے حُسن کی گرمی کو کم کیا  
پھر خرمِ اُمید پہ منہستی ہیں بکلیاں  
رگِ رگ پھر ک رہی ہے بہ اندازِ نغمہ پھر  
پھر چل کے پوچھ لیں دلِ شوریدہ کا مزاج  
پھر رنگ و بو میں جان پڑی دیکھنا بہار  
پھر چھپ گیا ہے پردہ تصویر میں کوئی

پھر جبر و اختیار میں ہے کشمکش تپش  
پھر مرگ و زلیست دست و گریباں ہے آج کل

# زقارِ وقت!

ادارہ کلیم

ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے بھیم میں ہم نے یورپین سیاسیات کی رفتار کا مطالعہ کرتے ہوئے جڑمند رجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔  
 ”یورپین مغلّی پر مدت سے ایک دہرہ بہت و سبب شیخوخت طاری ہے؛ جتنی واقعی گزشتہ نصف صدی سے فوج افنی کانگرنگوٹ کس رہے ہیں؛ جاپان نہ معلوم کب سے مشرق کی فتح کا پرچم اڑا رہا ہے۔ امریکہ۔ مائیکسجر کی شہ نشین سے قبل ازیں انگلستان کو معزول کر چکا ہے؛ اور پھر شاید ’سرخ روس‘ تو مغلّی عالم میں ایک نو جو متدین بشری کی دعوت لئے ہوئے مسند نشین مجلس بن چکا ہے؛ ترکی کی ’ترکی قام‘ ہو جانے کے بعد ’مسلطنتیہ کامرہ‘ بیا رہے کسی کا۔ انگلستان کا مرد قومی بن چکا ہے؛ اور ہاں سر زمین ہندو چین پر جو سناظر ہر شہہ دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان کا فتوا بن جلی یہ ہے کہ سے

گراں خواہ بپنی سنبھلے لگے  
 ”ہمارے کے چشمے“ اُبھنے لگے؛

پس ہم اپنی ہند کا خوابِ خرگوش ہی ہے کہ دنیا کو خدشہ کے بعد ساکن سمجھ چکے ہیں؛ بقول سوئیٹنی کے ”تاریخ عالم چلتے چلتے ترک نہیں گئی ہے؛ اور انگریز خدا خواستہ ”خاتم الاقوام“ نہیں ہیں؛ ایسا کشت فہید میں انسان اس سے پیسے بھی مبتلا رہا ہے۔ لیکن بالغاؤ خضر مشرق شیخ سعدی کے دریاے دجلہ پر ستور ع

پس از غلبہ سزا بہر گزشت در بغداد!  
 لوح تقدیر کسی کی بے نقاب ہو چکی ہے؛ اب یہ اک رازِ فاش ہے کہ انگلستان و فرانس کے بعد برہم یورپ کی کارواں ساہری جرتنی و آئی کو حاصل ہونے والی ہے؛ سوویٹ روس۔ غالباً ایک نیم مغربی و نیم مشرقی طاقت کی حیثیت سے اپنے اک بعد اگلا منصب پر قابض رہے گا؛ اور ہنگری۔ سوئیٹنی اپنے عارضی سخری دودِ عبودی کے خانے اور برہم کے میدان کے تھیلے کے بعد شاید روس کے ”پڑ و تاروی عمران“ کے جڑواں رواں کے لئے ”سڑک صاف کرنے والے“ ثابت ہوں گے؛ یہود و احمد جرتن اور ایٹالوی ہاری ہندوستان کی تاریخ سابقین کے مرتبے اور سکھ بنے نظر آتے ہیں اور آسٹریلیک برکاتین مغلّی یا دس بجز عالمگیر کے بعد کی ”مسلطنتیہ مغلیہ“ کے تاریخی ڈرامے کے پارٹ کو کھیلنے والی ہے؛ جرتنی کا تازی ازم۔ اور اٹلی کا فاسسزم۔ اس وقت کے ہمارا مشرورہ پنجاب کی ”فراولی جنگ“ کا مین تاریخی شئی نظر آتا ہے؛ شاید موجودہ روس اس وقت کے انگلستان کی تاریخ کو دہرائے؛ اور ابن دوسرے اور تیسرے درجے کے تمام تباہکن عناصر سے مطلع صاف کر کے ایک بشری تبدیلی کے آفتاب جہاں تاب کے ملین الاوار کی جلوہ گاہ بنے؛  
 آئندہ جو کچھ دیکھنی ہے لب پہ آسکتا نہیں  
 ہجو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی؟



باوجود سارے نماز کے ہم اپنے دل میں یہ ناز محسوس کرتے ہیں کہ پتاریخ  
حاضر کا ایک لمبی ڈو کی نظر رکھنے والا تبصرہ تھا: اس تمام دوران کے واقعات  
و حوادث اسی اجمال کی تفصیل نظر آتے ہیں: جو سنی کا تازہ شکار آئینہ اسی ہوتا  
ہے پتاریخ حقیقت کا ایک خوب منظر ہے: جس کا ہم نے ماضی قریب ہی میں لکھا  
تھا: "یورپ میں جو سیاسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے وہ بدست کندہ  
زمانہ میں یوں ہے کہ برائے نام کی "گرسنہ قومیں" وہیں کی شکم سیر سلطنتوں سے  
"خوانینہ" پر اپنا حق مانگ رہی ہیں: لیکن انھیں ان کے سامنے  
کھڑا ہوا "شانتی" یا "جنتی" کا منتر پڑھ رہا ہے: اس پر جتنی دہائی زبان  
حال و زبانِ قال دونوں سے اس نامحشفق سے کہہ رہے ہیں کہ  
تو یہ فرمایاں جو خود تو بہ کتر سیکند؟

حادثہ قبضہ کے وقت فرشتہ امن و قاضی عالم انگلستان کے نفس ناطق  
سٹر بالڈون کی قلمباز ذبردست و توجہ کا جواب جرائم پیشہ مسولین نے خوب  
دیا تھا (بڑا بان اقبال)

کیا دمانے سے زالا ہے مسولین کا جو ہم بے طرح بگڑا ہے معصومان یورپ کا مرنے والا  
میرے سودائے ملکیت کو ٹھکانے ہو تم نے کیا توڑے نہیں کمر و قوموں کے دھڑلے  
آل تیز چوب نے کی آبیاری میں ہے اور تم دنیا کے بھر سہی نہ چھوڑو ہجر اج:  
پردہ ہند میں غارتگری، آدم کشی، کل ڈو اور کھی سنی تم نے، میں روارکتا ہوا آج:  
ہیں انگلستان و فرانس اور جرمنی و آئی کے درمیان کا معرکہ کوئی "حق  
و باطل" کی نزاع نہیں ہے: بجائے اس کے وہ اک مقابلہ ہے "باطل اور باطل"  
کا: اس لئے اس کا خاتمہ بھی ہنگام اور مسولین کے ترک عوام و پرہیز جرائم  
سے نہیں ہو سکتا: اس کے لئے ضرورت ہے سٹر جمبر لین اور موسیو ہلم کی  
قومی سلطنتوں کے اپنا نکلا ہوا اگلنے کی: یہاں سابقہ حالت بحال۔

(Status Quo) کے انہوں سے کام نہ چلے گا۔ اس لئے  
کہ ہر برہمن عالم آج "برن و گیزر" کی ایک ترکن ذہر پارک کے کل اس حالت  
کو "حالت سابقہ" کہہ سکتا ہے، اور اس لئے کے تحت اس کی بحالی کا دعویٰ  
ہو سکتا ہے: پس مختص الوقت ظلم کے جواز کا نظریہ ناقابل فہم ہے، ظلم اگر آج  
ظلم ہے تو کل بھی تھا: بیسویں صدی میں اگر قبضہ کے چلے، رہا سیکند کے دھاک  
آسٹریا کے چھاپے، اور اسپین کے اندر رفتہ پر داؤد ہنگامے کی بنا پر آئی او  
جرمنی بین الاقوامی قزاق و آتش زن کہلاتے ہیں تو اٹھارویں اور انیسویں

صدی میں ہندوستان کی تسخیر، سلطنت عثمانی کی قلع و برید، تسمی عظم  
افریقہ کی تقسیم، اور چین و ایران کے کثافات و شقاق کی ترویج کی پادشاہ  
میں، انگلستان و فرانس بھی کسی بہتر سیاسی لقب کے مستحق نہیں ہو سکتے:  
یا تو کار و بار ظلم میں "معاذی عارض" نہیں، یا اگر ہے تو قبضہ، ملکیت قانونی  
میں میں بے ہے۔ والی دوسری و سنوری نظیر بھی موجود ہے: "شیخ"  
انگلستان و فرانس کی مذمت و ملامت پر آئی و جرمنی کی مذمت "زمانہ" کا  
کے پاس بڑا منگت جواب موجود ہے، یعنی:

لغتاً: شیخ ہر آنچہ گوئی، مستقیم اما تو چنانکہ می منائی، ہستی؟  
اور پھر تازہ دم و نوخیز ہنگام و مسولین کے پاس ان کی طاقت، برطانیہ  
و فرانس کے لئے اس سے بھی زیادہ دندان شکن جواب ہے: قانون و  
قبضہ دونوں ان کے دکیل ہیں، اور نو شیر و بان انگلستان و فرانس کی طرف  
سے بین الاقوامی امن و عافیت کی موعظہ فرمائی اس سے کم ذہد فرزند شاہ  
خیزی نہیں کہ "تو سوچو ہے کھا کے بیج کو چلی؟"

معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کم از کم اپنے اس راز درون پر وہ "ادھنے  
"را دباے سینہ گداز" کو سمجھتا ہے: چنانچہ وہ نئے تاریخی راہزنوں سے لہول  
غلبت کی تقسیم پر آمادہ ہو گیا ہے: یا آخر الذکر کو تازہ تاخت و تاراج پر شرم  
پوشی کا حق دینے کے لئے تیار ہے: جرمنی سے گذشتہ بھری مغفبت،  
حادیہ قبضہ کی دن دھاڑے پولیٹیکل عصمت دری، پر اس کا ٹک ٹک ویم  
دم نہ کشیدیم، منتہا سپانہ میں آتش افروز فرینکو کے ساتھ راز و نیاز نہیں  
کے قاتل اور بھر آدم کی وسیع آبی دنیا کے نقض امن کے باقی کار مسولین  
سے خلاصا، آسٹریا کو بیک لٹو تر چل جانے والے ہنگام پر صرت معاملہ  
بندی کی قسم کی معشوقانہ فحش گینی، پھر عام بین الاقوامی طوائف الملوک و  
نادر گردی میں اس کا نام واد سکوت و مجبورو وغیرہ وغیرہ اسی نئی تقدیر  
اقوام پر رہنا بقضا ہو جانے کے سلسلہ کے غماز ہیں:

اور پھر اس کے کوئی چارہ کار ہی نہیں: اس لئے کہ مجلس اقوام  
کے سیاسی تقویٰ اور بین الاقوامی اعتبار جبر و جرم کا نعم البدل ایک  
ہونا کہ و لڑہ خیز جنگ ہوگی، جس میں سائنس کے ایجاد کردہ آلات ہنگام  
سائنس کے تخلیق کردہ تسمی تمدن و عمران انسانی کو خاکستر کر دیں گے:  
پس بانبار ظاہر ہمارے سامنے دنیا کے اک نئے سیاسی نقشے اور

جزا اپنے کی تدوین ہے! انگلستان کی علی سیاست کی زبان حال سے اس میں اگرو  
غیر محفوظ ہونے کی ٹکراؤ سنائی دیتی ہے کہ سب دمن جاتا دیکھئے تو آدھا  
مجھے بتائے!

انگلستان نے اس سنگ آبد و سخت آمد پر بد رجبہ مجبوری اپنا گھار کا  
ہے۔ اس سے کہ اس نے اپنے پھوٹ ڈالو اور حکومت کروہ کے تاریخی حربے  
کی پوری آزمائش قبل ازیں کر لی ہے۔ اس کا رفر ما و فاتح کار آئے کا آخری  
استعمال ابھی ماضی قریب تک میں ہوا، جبکہ مشرقی چین نے اپنی سے ہر ملکن شرا  
پر سمجھوتہ کرنے کا منصوبہ کر کے اسے جرتی سے توڑ لینا چاہا! لیکن بجائے اس  
کے کہ مسولینی و ہٹلر ایک دوسرے سے بھڑک جائیں، چیمبرلین اور ایڈنبرگ کے دریا  
ہذا اطلاق بیخی و بینک کا اجرا پیش آیا، کیا برطانیہ کا یہ تار و نت  
پردہ خود اس کے لئے اک نابہ آستین بن رہا ہے؟ کیا انگریزی ڈیپلومیسی  
چاہہ کن راجا و درپیش کی جزائے اعمال سے دوچار ہے؟

انکی اور جرتی کے درمیان ایسے محکم اتحاد کی امید تو نہ تھی، اس لئے  
کہ بعض خودی اسباب بغض اور پناہائے نزاع ان کے باہم ضرور موجود ہیں،  
تاہم وہ جزوی و جدا ہاتی ہی نہیں۔ بر اعظم میں ان کی عام اقتصادی بینوائی،  
صحیح ناسہ دار سائی کے نیچے میں ان کی خارجہ البلدی، ان کی نوخیز نسوں کی  
جوانی و جوانی کے لئے ان کے بیرونی مقبوضات کی تنگ دامانی وغیرہ ملک  
یہ ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے انہیں مستقبل کا باہم و گریخت بنا دیا۔

اور ہمدرد کہاں؟ جو ہولے حضرت دل

در داب تم کو ہمارا ہو، بہت راہم سکو!

ان عمیق ہمدردیوں کی بنا پر دونوں کے درمیان اختلاف کی اساس  
بھی انہی ہی عیش و افح ہوئی ہے آج روم، برتن خطہ سیاسی پیرس۔ لندن  
رشتہ منوڈت سے براصل محکم تر ہے! پھر اس سرشتہ اختلاف کی اس طوائی  
توسیع نے جس کا نام سیاسی اصطلاح میں روم، برتن، ڈکیو محاذ ہے اک  
سند سکندری ہی تعمیر کر لی ہے، جس سے ٹکرینے کے تصور سے بھی عظیم برطانوی  
قیصریت لرزہ بر اندام ہے! پس اتنی و جرتی کے درمیان کی متوق  
رقابت اک امید موموم ہے! ان ہر دو ترکناؤں کے لئے کافی و دانی  
اموال غنیمت موجود ہیں! بیدخل ہونے والے انگلستان و فرانس کی تباہی  
سیراٹ کے وارث وہی ہوں گے! برطانوی و فرانسسی سلطنتوں کی نابید الکا

پہنچائیں دور دور تک ان دونوں طاقتوں کو ہلکسی درست و گریبان کے بھاگتی  
ہیں! لندن اور پیرس ہر رخہ اندازی سے قریباً مایوس ہو چکے ہیں!

چنانچہ یہ اک ماذفاش ہے کہ انگلستان، جرتی کے مرکوز خاطر اہاجی  
آسٹریا پر مشکی فہر تصدیق ثبت کر چکا تھا، بحر الروم کے عالم آب پر فرمازدلی  
کے حقوق میں انکی کو برابر کا شریک ماننے کے جانتان مطالبے کو انگریزوں کا

اور نہ معلوم آگے جا کر واقعات کی منتقلی اور وقت کا حکم مطلق  
اسے کن کن باتوں پر آمنا و صدقہ کہنے پر مجبور کرے! یہ

نرا و رادسند کبریا و دینی کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی!

اور حکومتوں کے بعد پھر قوموں کا نہر ہے! کرہ زمین کی آراضی اتنی

تنگ ہے اور جوع الارض کے مریض سامراجوں کی ہوس اتنی بلا نوش واقع

ہوئی ہے کہ وہ ساری کی ساری ان معدودے چند غارتگران اقوم کے لئے

کافی نہیں! لیکن اگر یہ میاد ان بنی آدم باہم ملن بھی ہو جائیں تو ان سے بد رجا

و یادہ عظیم تنقج، مظلوم و محکوم و محروم اقوم کی ہے، یہ سارا خاندان بشریت کب

تاک چند آدم زاد درندوں کی درید و بربید و شکست و بہست کا تختہ مشق

بن رہے گا؟ عالمگیر علوم و معارف اور ہمد گیر و بد گینڈا نے ساری روئے

ارض پر ایک دائم و قائم روز روشن قائم کر دیا ہے، جس کے سامنے ہر شب

گرد و نقب زن گریز پائی پر مجبور ہے! الغرض اب وہ وقت و ساعت ہے

کہ ہم یہ ترانہ صبری چھیڑ سکتے ہیں کہ

دوش وقت سحر از غفہ سخا تم دادند

و اندر ان غلغلتہ شب آب حیات دادند!

اس وقت شرعاً عالمگیر ہو گیا ہے، لیکن وہ عالمگیر خبر ہی کا پیش خیمہ

بننے والا ہے! یہ سب ضرور ایک دوسرے ہی کے خلاف صفت آ رہا ہیں، اور

باہمی تصادم و تزاوم سے ہلاک و معدوم ہو جائیں گے! تمام مودیان عالم

میں اک آفاق گیر کھٹ پٹ ہے جو اک آفاق گیر سخاات ہر شے ہوگی!

سینے سے اندھیری راتوں کے چھتی برفیا انسانوں میں

فطرت کا نظام تعمیر ہی ہے گرم عمل طوفانوں میں!

رہ جائیں گے قتل و غارت کے اذکار و قحطافاؤں میں

تواریں رکھی جائیں گی پُر ہول عجائب خالوں میں!

سٹ جائیں گے نقشے غلغلت کے، آٹا رضیدہ جائیگے

یہ جہان کے غضب جہان کے راز ہے! اک فقرہ ہم دیکھ کر سب کچھ سمجھ جائیگا!

قلوں کے یہ گنبد سر ہنگام انسان کی طرح پید ہوئے!  
خو نیز فضا سے طیارے غاروں میں اترنے والے ہیں  
ہستی کے دھوئیں سے چھیلے جنازے ابھرنے لگے ہیں!  
کہتا ہے حادثہ کو جو بڑا ہمدرد نہیں ہے، غلام ہے!

در اصل وہ رُوحِ عام کی بہت شکنجی کا مجرم ہے!  
حالات و سیاسیاتِ عالم کا یہ مطلق ہے، اور ہم اہل ہند کس خواجہ گوش  
میں ہیں! بھر آروم میں ایتالیا و برطانیہ کی کشیدگی کے اک سابقہ آئی لے پر  
وادی نیل کی پون کر در آبادی نے اپنے ہاں کے "دورِ فرعون" کو عرق کر دیا!  
لیکن آج انگلستان کی ناستندہی شکلات سے ہم وہ سہ کر دے سجا، ہندوستانی  
دنیا کیا غامہ اٹھا رہی ہے! بھڑاس کے جواب با صواب کیا ہے کہ "محرم الاحرام"  
اور پورہ بولی کے مشترک عشرہ مبارک میں ہندو مسلم فسادات برپا کر کے ہم نے  
پیرِ دال برطانیہ عقلی کی کمرہی تھامی ہے! بیہات! ہندوستان "جنتِ نشان"  
اپنا نامہ اعمال صبح بیان کرتا ہے جب کہ وہ کہتا ہے کہ:-

ہنگوں کا سندر ہوں، ہنگوں کا بیا ہاں ہوں

عدو سے کیا عرض! آپس ہی میں دست و گریباں ہوں!  
خدا کے فضل سے بد بخت ہوں، بڑول ہوں داں ہوں!

درا آقا پہ سر پہ گفتِ برداری پہ نازاں ہوں!  
مری گردن میں ہے طوقِ غلامی پا بچولاں ہوں!

تاہم انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک، ہندوستان کی ناصیہ قسمت کا اک  
اختر تار ہاں ہے! یورپ میں ظالم و آدم خوار قوتوں کی باہم آویزی سے جو  
بادلوں گرد آؤ نے والی ہے، اُس کی نسبت ہم اپنے پاس مشربِ اہل سیاست  
کہہ سکتے ہیں کہ ع

توجہ والی کہ دریں گرد سوار تے باشد!!

مشرِ ایچ جی، ویز، نامور مورخ تاریخِ عالم و باغِ نظرِ مہرِ مستقبل کہتا  
ہے کہ "انسانیت کی بس اب آنکھوں ہی کی سویاں نکلتی باقی رہ گئی ہیں! زیادہ  
سے زیادہ صرف ایک عارضی جھگامہ آدو ملین مستقبل میں نظر آتا ہے، اور اُس  
کے بعد اس وعدہِ عالم کا مہتاب شب تاب بشریت کی بیج سعادت کے طلوع  
کا اعلان کر دے گا! :-

رہبرِ نشنہ لب: گھبرانا اب لیا چشمہ بقا تو نے!

(۱- اسٹا)

### (۳) فیدریشن

کے بارے میں لندن ٹائمز نے اک معنی خیز افتتاحیہ  
لکھا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ "برطانوی حکومت  
کو چاہیے کہ ہندوستان کے مجوزہ نظام وفاق" کو اپنی موجودہ ہیئت میں  
اہل ہند پر مائد کرنے کے منصوبے کو ترک کر دے، سبردست اُس کے قیام کو  
مستوی کر دے، اور اس اثنا میں ایک وقفہ ٹھہرت کا اعلان کرے، تاکہ  
ریاستہائے ہند کے نظم و نسق کے اندر کم از کم اتنے مبادی جمہوریت پیدا  
ہو جائیں کہ اُن کے تحت "فیڈرل اسپل" میں اُن کے نمائندے ریاستی رعایا  
کے منتخب شدہ ترجمان ہوں، انکہ والہاں ریاست کی ذاتہائے شاہانہ کے  
شخصی وکیل!"

فیڈریشن کی مراحت میں نیشنل کانگریس نے جس استقامت کی نمائش کی  
ہے اُس کا یہ ثمر اولین ہے! اس مسئلے کے متعلق مزید قومی مطالبات جی اسی  
پالیسی کے تسلسل و استقلال سے حاصل ہو سکتے ہیں! :-  
نوا راتج ترمی زن چر ذوقِ نغمہ کم یابی  
مدی ماتیز ترمی خواں چمچل راگراں مینی!

ہم لندن ٹائمز کے اس فیاضانہ دعاقلانہ اقدام پر اُسے مبارکباد دیتے ہیں،  
لیکن ٹائمز اپنی عادتِ دیرینہ کے تقاضے سے اک نابزجیا کی بات بھی کہہ گیا ہے!  
وہ یہ کہ کانگریس کو اس اجمال کی کچھ زیادہ تفصیل پر مبصر ہونا چاہیے، اس کے  
کہ موجودہ نازک بین الاقوامی صورتِ حالات کے اعتبار سے کوئی برطانوی  
وزیرِ اعظم ان طویل و لالیلِ حوت و حکایات کو سننے کے لے فارغ نہیں ہے!  
باؤشجاش چندر، کانگریس پر یزڈنٹ نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیلہ،  
آپ نے فرمایا کہ "حاضر الوقت سیاسیاتِ عالم ہی تو وہ چیز ہے کہ کوئی برطانوی  
وزیرِ اعظم بصحتِ نفس و ثباتِ عقل لاجوان ہندوستان کے کسی اہم سیاسی  
مطالبے کو نذرِ تغافل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا! :-

کہنسا میں تیشے کی صدا گونج رہی ہے!

اے داسے بریں دمرزہ عشرت پروریز!

### (۳) بنگال

میں آزاد پر جا پارٹی، کرشک پارٹی اور ولت پارٹی کا  
ستھہ محاذ وزیرِ اعظم کی مابقی عدوی طاقت اسپل کے خلاف  
اک چونکا دینے والی سیاسی نشو و نما ہے! مدیہ ہے کہ کانسل کا بورڈ پین  
گروپ "تاک جناب فضل الحق کی ڈکٹیٹرانہ حرکات سے بدمل ہو رہا ہے! ع

تو دوست کسی کا بھی سنگ نہ بنو!

کھتے میں گاندھی جی کی مقبَل القلوب موجودگی، کانگریسی ارہاب جل و عقد کے، رہبان سسل شوری، مختلف سیاسی پارٹیوں کے باہم گفت و شنود اور مناسب توجہ کے ممکنات کی تحقیقات، اک نئے مستقبل کی گرم خبریں اور بیٹے، نثار بیٹا، سر فضل الحق کی سربراہی پر جا پارٹی اک ٹیمپ غریب عا: عرسے تک ہندو مسلم لفاق، جراثیم پرور فضائے تعصب و منافرت، حکومت اسلامی کے خلاف کاوش کے مشہورہ افسانے، سر فضل الحق و سر ناظم الدین کی وزارت کو زندگی کا اک مصنوعی پٹہ بننے رہے، لیکن وقت اب باطل کی طبعی عمر سے تجاوز ہو چکا ہے: اور حق وزارت اپنی قدرتی موت سے روز بروز نزدیک تر آرہی ہے: دوسری کاؤنسل پارٹیوں کا اُس سے قطع لفظ، اُن کے جماعتی گنہگار سے رت کا بار دگر بنیاد، اور کانگریس کی نیک نام عام اور معتد صلیف و غنیم پارٹی کے زیر سایہ اک نئے ترقی پسند استوت کی تشکیل وغیرہ: بنگالی کی بساط سیاست پر تازہ ترین میاں ہیں۔ جو غائبانہ دباؤ عرصہ گزرنے سے پہلے بار آور ہونے والی ہیں۔

(۴) بنگال ہی کے بھوار صوبہ آسام کی غیر کانگریسی وزارت بھی شہر زل داغ ہوئی ہے: اک سابقہ موقع پر اُس پر کانگریس پارٹی کی طرف سے عدم اعتماد کی تحریک پیش ہونے پر ان کے مخالف و موافق اعداد ۵۰ اور ۵۰ تھے: اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ حکومت غارِ پلاکت کے مین دہانے پر کھڑی ہوئی ہے: ہاؤ مخالف کا اک ہکا سا جھونکا کسی بھی لمحے اُسے سقوط سے دوچار کر سکتا ہے: ع

اگر ماند، شبے ماند، شب دیگر مینی ماند!

(۵) صوبہ سندھ میں اک ضمنی انتخاب کی تقریب سے اک کانگریسی مسلمان کا وزارت پارٹی کے اک خان بہاد

حریف کو شکست دینا، اور اُس کے بعد ہی سر غلام حسین ہدایت اللہ کی کاہنہ پر استیسی کی دوسری پارٹیوں کے مشترکہ ووٹ سے کرامت کی قرارداد کا پاس ہونا اور وزارت کا بالآخر سندھ حکومت کو خالی کر دینا حیرت خیز سیاسی افتادیں ہیں: کاؤنسل کی کانگریس پارٹی کو تشکیل حکومت کی دعوت منجانب گورنر اس کا پس خمیہ بنی: سندھ کی مجلس قانون ساز میں اگرچہ پارٹیوں کی قوتوں کا موجودہ توازن کانگریس کو ترکیب وزارت کی اجادت نہیں

دیتا، تاہم آج کل یہ ساری مضطرب غیر کانگریسی حکومتیں کانگریس ہی کی نظری آغوش مادی میں آکر آسودگی و دیر پائی حاصل کر رہی گی: البتہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری پولیٹیکل سرگیاں نیشنل کانگریس ہی کی مندرجہ ذیل مقصود کی دائرہ میں: اس ساری صورت حال کی شقیں ہیں یہ نظر آتی ہے کہ غیر کانگریسی زانچا اک سلبی و منفی حقیقت رکھتی ہیں: اُن کے درمیان کوئی براہ راست اندر و باہر درشتہ نہیں ہے: اُن کے ارکان کے آپس میں قدر مشترک اور بنائے اتحاد کانگریس دشمنی ہے: لیکن ایجابی طور پر وہ رجعت پسند ہیں، یا اس سے بھی بدتر ہے اور متعلی اتحاد نامکن: پھر خود اپنی کاہم مذہب ترقی نواد عنصر بھی قدرۃ اُن سے غیر مطمئن رہتا ہے: بالآخر آشناؤں کے قریب کی آزمائش کے بعد وہ کانگریس ہی کا رخ کرتے ہیں، یہ سبت پڑھتے ہوئے کہہ

تاہم ساید دل بیتاب من

سب کچھ پیدا کنند سیاست بن!

(۶) شہید گنج کا سارا ماجرا بھی اک دلچسپ ڈرامہ بنتا جا رہا ہے: جو لوگ راجہ درون پردہ سے واقف ہیں

اور اب تو یہ راز رسوائے کوچہ و بازار بھی ہو چکا ہے۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پنجاب کی جو وزارت آج اس قضیہ نامرضیہ کا شریفا: دنیا منانہ حل چاہتی ہے: وہی اس فتنے کو جگانے والی آتش افروزہ ہے: نا عرت یہ بلکہ سجد شہید گنج کے تاریخی شہد میں سادہ لوح مسلمانوں کا خود نا حق بہا کر اپنی امواج خون پر اپنی خود فردشی کا بھرا چلا کردہ دارالوزانہ کے ساحل فراد تک پہنچی تھی: لیکن اب چونکہ اس فہم جیاد فی سبیل اللہ کے "مقاصد مقدسہ" حاصل ہو گئے ہیں، اس لئے اب جو دعوت حقہ دی جا رہی ہے اُس کا عنوان جلی یہ ہے کچ

یاراں فراموش کروند عشق!

تاہم پنجاب کے جاہل و بخیر عام مسلمان سیاسی لغت کے ان اسرار کو کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ سجد شہید گنج کی "بشارت داوہ باز یافت" ہو، یا ابو وزارت پنجاب کی کرسیوں پر تنکن، دولوں مترادف کلمات ہیں: سا قاصد رقیب بود و من غافل از قریب

بیدر و دم مائے خود اندر میان ساخت!

لیکن شاید سکندری وزارت اس قول کو اپنے منطقی نتیجے سے بھی پرہ

جاننا چاہتی ہے کہ سیاسیات میں کوئی خرافات نہیں ہے؛ چنانچہ وہ پوری شاہانہ  
ان سے اپنی رقیب و منجوز اور گزشتہ نازمطوئی، کانگریس پارٹی کے آگے  
دست سوال پھیلاتی ہے کہ لگتا ہے کہ اپنی وسیع المشرقی و دیگر داری کی لاج  
بے، اور مسئلہ شہید گئی کو کسی طرح طے کرادیجئے؛ اس بات کو قبول جانیے  
میں نے گزشتہ انتخابات ایسی کے ڈرامائی لمحے پر وہ فرقہ وارانہ آگ بھڑائی  
جس میں مجلس احرار اور پنجاب کی کانگریس پارٹی کی کامیابی کے سارے آثار  
ختم ہو گئے تھے؛ اگر ہم اس وقت آچکا کلا کاٹنے سے نہ چمکے تو آپ بھی اپنے

جائستاد دشمنوں کو تنہا احسان سے قتل بنانے سے باز نہ رہیے؛ آج ہماری  
وزارت و حکومت کی سو فیصدی نجات آپ کے ہاتھ ہے، اگرچہ آپ کی ایسی  
نجات دہندہ جماعت کے نہ فیصدی ارکان جرائم پیشہ ہیں؛  
اگر پنجاب کی کانگریس پارٹی سکندری وزارت کی آگ میں کود  
پڑتی تو اس کی اس معصومانہ خودکشی پر ہم اس کو اس طرح داد دینے کو سہ  
آسہ سہیل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے  
تو شوق نازک، خونِ دو عالم میری گردن پر

(۱-۱-۱۷)

## شاعر کی دعا

قاضی الحاجات: ہم کو شہوک سے کر دے نڈھال  
صورتِ شعلہ بھڑک اٹھیں زمیں و آسماں  
پایاں کی شدت سے بچے ہوں ہمارے نیچاں  
آسماں سے بوندیوں کے بدلے برسیں اڑو ہا  
ہو اگر خواہش تو انگاروں پہ تڑپا ناہمیں  
موت سینے سے لگانے کے لئے ہو بے قرار  
آرہی ہو صحنِ گلشن سے جو بادِ جانفزا  
زندگانی پر ہماری موت کا ہوا اشتباہ  
آبِ دریا ہو ہو یہ بھی ہمیں منظور ہے  
ہو غضب آلود تو یہ بھی ہمیں منظور ہے

قاضی الحاجات! لیکن اس دعا کو دے اثر

گر پڑیں طوقِ غلامی گردنوں سے ٹوٹ کر!

صحیفہ حصین "چھوٹی کتابی قاسم"، ۸۸ صفحات، نغمہ سرت، کاغذو کتابت و طباعت پاکیزہ و عمدہ، جلد میں منسوخ و رنگین کاغذ کتاب پوش، قیمت ۱۰ روپے۔  
شائع کردہ مکتبہ جامعہ، فرول بار، نئی دہلی۔  
صحیفہ حصین "نامور صنی حکیم و دینی مقتدی کنفیوٹس کی اک اہم تصنیف"۔  
"شوکنگ" کا ترجمہ ہے، جس میں چین کے شاہی خاندانوں کے مختلف و متعدد سلسلوں اور ان کے جداگانہ اذدار و حکمرانی کی تصریح کے علاوہ چینی مدن و ثقافت، معاشرت و معیشت، اخلاق و آداب کے اصول و ضوابط کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ چینی تاریخ و ادبیات میں یہ کتاب اُپہات کی حیثیت رکھتی ہے؛ عہد حاضر کے چین کے انقلابات و سیاسیات و عام حالات کی سحرانہ تعلیم و تعبیر کے لئے اس قدیم و عتیق ملت و مملکت کے اس روایاتی و نفسیاتی پس منظر کا ذہن نشین کر لینا اک شرطِ ماقبل ہو گا؛ جناب سید اسد علی صاحب الہامی، فرید آبادی، بی ایس سی، آئی ایف ایس نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کر کے اپنی زبان و ادب کی اک حقیقی خدمت انجام دی ہے۔  
ترجمہ قابلِ داد حد تک فصیح و سلیس ہے، اک مترجمانہ جدت — یقیناً اک بدعتِ حسنہ! — یہ نظر آتی ہے کہ شوکنگ کے بعض متون کی نظموں کا ترجمہ بھی منظوم کیا گیا ہے؛ کتاب کو متعدد مضمیموں سے آراستہ اور "تاتاریخ مکمل" کر دیا گیا، اور اب اس کے مطالعے سے چین کے عہدین اور اس کے لئے حاضر کے حالات کے "دولانِ ورق" آئینہ ہو جاتے ہیں!

# زباعت اثر

دیریا ہوتا ہے، چشمہ فرت فرت  
کھلتی ہے لولے زخمہ فرت فرت  
بڑھتی ہے پو پو نہیں روح بھی منتزل کی طوف  
ہوتا ہے فروغ فرت فرت

ہمچ پھول دی جا جب چمن نازاں ہو  
ہے شگ دی جا جب خشن نازاں ہو  
موتی ہے دی جا جب سپہ بدن نازاں ہو  
ازاں ہے دی جا جب سپہ بدن نازاں ہو

ایسا بھی کوئی مضطر و ناشاد نہ ہو  
دشمن ہے بھی دشمن پیہ پیہ ادا نہ ہو  
پیشہ بیمار اور بیمار حکم صواب  
تو میں نہ اسیر لب پہ پیاؤ نہ ہو

زہار و تسمم نہ دگر گلنے پائے  
خون پہ ذرا میں نہ آنے پائے  
ہر خطہ رہے نفس کی غرت کا لحاظ  
کر جانے گم گم بات نہ جانے پائے

# عروسی



# کلی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس کے ترتیب دیا گیا  
مگر اشتہاد میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام مخفی شکایات کا  
ہر موسم میں واحد علاج ہے، مخصوص اذکار رفتہ فائدہ اٹھائیں، اس لئے کارڈ  
تجربہ ہے اس کے ساتھ چار چیزیں مومی، نباتی، کلیدی، بعلبی اور ہراہ ہیں،  
جن کی تفصیل اور ترکیب استعمال خریدار پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سیٹ عروسی  
کا ہفتہ بھر کو کافی ہوتا ہے، جس کی قیمت صرف ایک روپیہ پندرہ پانے  
مقرر ہے، علاوہ محصول ڈاک، اکثرین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔

صاحب فرمائش نام و پتہ صاف و خوش خط تحریر فرمائیں

شفا خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

## ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادیب اور دو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ تعلیم کی خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادبا کے حوصلے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں  
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ماضی اور حال کے شعراء اور ادبا کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کو نظر  
رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

اگر آپ بغایت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

کلیم بک ڈپو جنتی نو اس نمبر ۱۰ دیریا گنج دہلی سے فرمائش کیجئے

کا بہترین سامان  
کفایت کے ساتھ  
Porcelain  
Factory  
Bangalore

مجلی کا سامان — پانداری اور اذانی

انسولیٹر سوکھا، روز وغیرہ یعنی بجلی کے چینی مٹی کے ساز و  
سامان کے باب میں اس کی کوالٹی سب سے اہم چیز ہے اور گورنمنٹ  
پورسلین فیکٹری مائے سوارم بنگلور کی بنائی ہوئی چیزوں  
میں یہ خوبی ہے کہ وہ عالی دماغ انجینئروں کے علم اور

تجربے کا بخور ہوتی ہیں  
گورنمنٹ پورسلین فیکٹری  
مائے سوارم پورٹ آفس — بنگلور



اس کے پڑنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

خلو کتابت و دوائی مٹے کا پتہ: منیجر دار الشفا گولیاں جٹوالہ، ضلع گورداسپور (پنجاب)

دے خبر پڑھنا جس کے خریداروں کو  
لوچرخ چہارم سے سیما اتر آیا  
گھوٹا پنجے گمشادہ دیکھیں عاروں کو

دنیا کے صفات کا درخشندہ ستارہ  
گھوٹا پنجے گمشادہ دیکھیں عاروں کو  
پیشہ و برتہ میں دیانتدار و غنی  
گھوٹا پنجے گمشادہ دیکھیں عاروں کو

## گھوٹا پنج

بہت جلد آسمانِ ظرافت پر نہایت آب و تاب کیساتھ نمودار ہونے والا ہے  
مذاحیہ افسانے، دلچسپ مضامین، لطیف کارٹون دیدہ زیب فولاد پاک، طبعی تصویر، شعرائے شیریں مقال کے غیر  
مطبوعہ کلام اور تازہ تیارہ خبروں سے مرتب معرین ہو کر پینے میں صرف دو بار ذرا دلت جناب (سٹیل ذکی صاحب کھپٹی ٹہری  
ذیر سرپرستی جناب احمد حسین صاحب بی ایس سی، ایل ایل بی، ۸۰ راپریل شتے سے جلوہ افروز ہوں گے۔  
دی پی بیجا جھٹ ہے، سائز ۱۰×۲۲، حجم ۱۰۰ صفحے، قیمت سالانہ پناہ ششماہی ۲۰ فی کاپی ۲۰ روپے اسٹال پر تین آنے  
پتہ ہے۔ دفتر اخبار گھوٹا پنج (لال بازار) پکھ بازار، بستی (دی پی)

## ادبی دنیا

ملک بھر کے جادو نگار ادیبوں اور شعرا کے بہترین افکار — مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار  
۸۲ دلاویز افسانے، مضامین اور نظمیں  
۸۰ ہفت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے، علاوہ محصول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے، مع محصول ڈاک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجئے

مینجر رسالہ ادبی دنیا، لاہور

چند دن کے استعمال سے سفید بال جڑے کالے ہو جائیں گے

## بھنگرہ میرا مل

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سیاہ اور دراز کرنے، گرتے سے روکنے، چمک پیدا کرنے، جلد سے چھلنے والے بال اگانے اور بالوں کا انبوه پیدا کرنے میں کامیاب تھرپنڈ (بھنگرہ) ایک عجیب و غریب چیز ہے، خواہ تین کے لئے بے پناہ اور نئی چیز ہے۔ ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ عرض کریں گے کہ آزمائش کے لئے اولاً صرف ایک ہفتہ استعمال کے لئے منگایا جائے اور استعمال سے قبل اپنے بالوں کی لمبائی ناپ لی جائے، پھر چند روز کے بعد جانچ لی جائے، اتنا کافی ہے کہ ہمارا اشتہار غلط ثابت نہ ہو گا اور تحریر کے مطابق ہی خطبیاں پائی جائیں گی۔

بائیں خیال کہ ہمارا دھن اپنا اشتہار خود بھی ہے، فی الحال قیمت لاگت کے برابر رکھی ہے، قیمت فی ادحا ۱۲ تین ادھے فی ٹونے کی شیٹی ۵۰ روپے کا پتہ۔ انڈین اسٹور بریلی

# ہمایوں

(۱) ہمایوں اتنا پابند وقت ہے کہ جو ریاست سے لے کر (جب کامیابی ہوا تھا) آج تک کسی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی، وعدہ صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدہ مثال نہیں مل سکتی۔

(۲) ہمایوں، آئینہ حبس میاں محمد شاہدین صاحب پتلیوں مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے، اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مد نظر نہیں رکھی جاتی۔

(۳) ہمایوں، کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس میں فحش اشتہارات، عریاں تصاویر اور مخرب اخلاق مضمون اور ننگوں کے لئے قلم گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر طاعتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

(۴) ہمایوں کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (اکن) ایئر سٹریٹ لا کے قابل ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترتیب میں معنائین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر طبقہ کا ہر چہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذب توجہ ہوتا ہے۔

(۵) ہمایوں کے معنائین محض پُر از معلومات ہی نہیں ہوتے، بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے۔

(۶) ہمایوں، محبت زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسالے کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔

(۷) ہمایوں، میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی معنائین، دلکش انساے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، بشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی سرگجرات کے متعلق بنیادیت میں قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) ہمایوں ملک کے محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

(۹) ہمایوں کے کاغذ، کتابت، لطافت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر رویہ صرف کیا جاتا ہے۔

(۱۰) ہمایوں کے سالانہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زائد قیمت نہیں لی جاتی۔

چند سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے، مع محصول ہے

خاکسار منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

## ہندوستان کے مشہور رسالہ کلیم کیلئے دیانتدار اور محنتی ایجنٹوں کی ضرورت ہے

موسم بہار اور صبح نشاط سے زیادہ لطیف

ادب و فنون  
شعریت

افسانہ نمبر

عذبات حمید  
احسان لطیف

(کس کا)

ہفتہ وار گلفروش دہلی کا

حسین فطرت کے جھیل پہلو اور انسانی جذبات کے ورق کو نمایاں کرنے والے رُوح پرور افسانے رُومان آمیز کہانیاں اور کوشر فرب تو تیار نہ تھیں شائع ہونگی۔  
فی پرچہ دو آنے

مینجر ہفتہ وار کلفروش دہلی سے منگائیے

سالانہ قیمت تین روپے آٹھ آنے

پاکستان کے اسکینڈل سے خفیہ فرمائیے

ادارۂ ادبیات اُردو کا مصور و چھپاؤی رسالہ

”سب اس“

زیر ادا رت  
ما جزا ده می کش (عثمانیہ)

منونہ کا پرچہ  
سات آنے

منے کا پسہ

خواجہ حمید الدین، منتظم تربیت

رفت منزل، خیریت آباد، حمید آباد، دکن

زیرنگرائی  
ڈاکٹر سعید محی الدین قادری زور  
پروفیسر جامعہ عثمانیہ  
سالانہ چندہ  
چار روپے آمد آئے

نئے سال کا بہترین تحفہ  
حقیقت نگار علی عباس حسینی کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ

آئی سی ایس  
طبع ہو گیا

قیمت صرف ایک روپیہ ۸

انڈین پرنسپل آف آباد

برای کمال نفس - حکمت - بین - لکن - لا جو

## منقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی وجد آفرین نظموں کا مجموعہ جو مندرجہ ذیل ابواب پر منقسم ہے  
۱۱ نگار خانہ (۲) خبریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) شعیب  
ہر نظم اپنی جگہ کمال، مرصع اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے کھور  
کن نئے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے ایک  
خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں

مکمل، چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے  
قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۶)

مجلد دو روپے (۲۰)

کیم بک ڈپو، جنتی نواس دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شاعر کی راتیں

شب انقلاب نے چند راتوں کی محنت کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور کیف  
آور انداز میں بیان کیا ہے، جنہیں پڑھکر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کر لیتا ہے  
راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے

|               |              |                      |               |
|---------------|--------------|----------------------|---------------|
| ست رات        | پہرت رات     | راز و نیاز کی رات    | انٹار کی رات  |
| اندھیری رات   | ہاندنی رات   | جوانی کی رات         | تصورات کی رات |
| انفکات کی رات | جدائی کی رات | اشکوں کی رات         | برسات کی رات  |
| ربوعلی کی رات | بجڑی کی رات  | سرشار رات            | سبکی ہوئی رات |
| تصورات کی رات | بیمین رات    | پہا بن نگوں کانی رات |               |

قیمت

صرف آٹھ آنے (۸)

کیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۷ دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

پُر جوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ  
چراپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلوبی شان و حریت کے خون کھول دینے  
اور واقعات، مادہ سر جوش کی سرسبزیوں اور گنگا ناک فطرت کے روح پرور  
نظموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتا ہے

شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاعر کا غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے  
کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما کردلوں سے آراستہ ہے

قیمت

صرف تین روپے (۳۰)

کیم بک ڈپو، جنتی نواس دریا گنج نمبر ۱۷ دہلی سے منگائیے

## سو شعر

حضرت جوش ملیح آبادی کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کردہ

سو شعر

دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے

... باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ

اشعار آپ کو اپنی پسند کے میں گئے

جسب سائز، کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب، سرورق خوشنما

جس پر

حضرت جوش کی تصویر بھی ہے

قیمت صرف چار آنے

منیر کیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۱۷ دریا گنج دہلی سے منگائیے

ہندوستانی دو اہخانہ کو محنت ملی

چسپا، ان لوگوں کے لئے چھ مہینے کی اور جوش کی کمی پائی جاتی ہے اس کے استعمال سے پہلی رات میں اثر ظاہر ہوتا ہے مسلسل استعمال سے کمزوری سستی جگ اور چھری کی خرابیاں دور جو پہلی ہیں، نہایت مفید چیز ہے قیمت فی سببی یک کٹہ بارہ گنے

بچوں اور بچیوں کا باتصویر ماہوار رسالہ

# پیامِ صلح

یہ رسالہ محض بچوں کی خاطر جاری کیا گیا ہے، اس میں انکی دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے، اچھے اچھے اور مزیدار قصے کہانیاں، مفید اور دلچسپ معلومات، لطیفے، مفید مشغلات، لکچر اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں وغیرہ۔ وغیرہ، غرض اسے پڑھنے کے بعد انہیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، کچھ سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے، ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، ایک انجن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجن کے ذریعے ان کے نئے نئے دوست ملازم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے، تاکہ مفید مشغلوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں، اسی خیال سے اسکا چندہ بھی صرف دو روپے آٹھ آنے

رکھا گیا ہے، اسی چندہ میں سالنامہ بھی دیا جاتا ہے، یہ سنکر شاید تعجب ہو کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان اب تک پیامِ تعلیم جیسا سالنامہ نہ پیش کر سکی۔

فوریہ آخریدار بن جائے تو سالنامہ مفت ہے گا

ورنہ ۲۰ روپے ٹکٹ بھیج کر منگانا پڑے گا، سالانہ ۲۰ روپے کو غنائے ہوتا ہے

مکتبہ جامعہ قرول بائیں ٹی دہلی

رسالہ کلیم میں اشتہار دیکر فائدہ اٹھائیے

ذہنی اور سیاسی انقلاب

پیغامِ صلح

کلم

رسالہ دہلی

ذریعہ اس

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی

اگر واقعی آپ کی یہ دلی آرزو ہے کہ —  
(۱) آپ کے وطن عزیز کو ہندوؤں اور عورتوں کے  
فساد سے نجات مل جائے

(۲) تعلیم و رسوم کی عمارت پر حریت فکر و  
آزادی خیال کا پھر براہ راست لگے

(۳) ہندو مسلم اتحاد میں کراپے اتحاد کے  
ذریعے سے ایک دہندہ ہندوستانی قومیت  
کی بنیاد ڈال دیں۔

(۴) اور ہندوستانی قوم کے حقوق و عزت  
کو جس سے شیطان تک پہنچا نہ سکا ہے اپنی  
گردن سے اتار کر سہیلک بنے —

پہلی فرصت میں کلیم کے خریدار بن جائیے

مینجر رسالہ کلیم دریا گنج دہلی



# ایک سفید مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا کہ دنیا کے ہر چار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ قہم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کر سکوں تعمیل حکم کے لئے فریڈریش لائبرتسمن جنتِ نظیر سوئٹزرلینڈ شاہی میں گل چینی کی گئی جب سب کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اس قدر حیرت ہوئے تھے کہ تکلیف ہوئی، مہارانی اس خوشبو کو لگی، کھانا پینا ترک کر دیا، ہمارا مشورہ طلب کیا، بہتم تو شہ خانہ منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی۔



فورا عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

اصغر علی محمد علی تاج عطر، لکھنؤ (یو۔ پی۔)



شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

(کی)

تازہ ترین تصنیف

جنونِ حور

(یعنی)

پندرہویں مجموعہ رباعیات

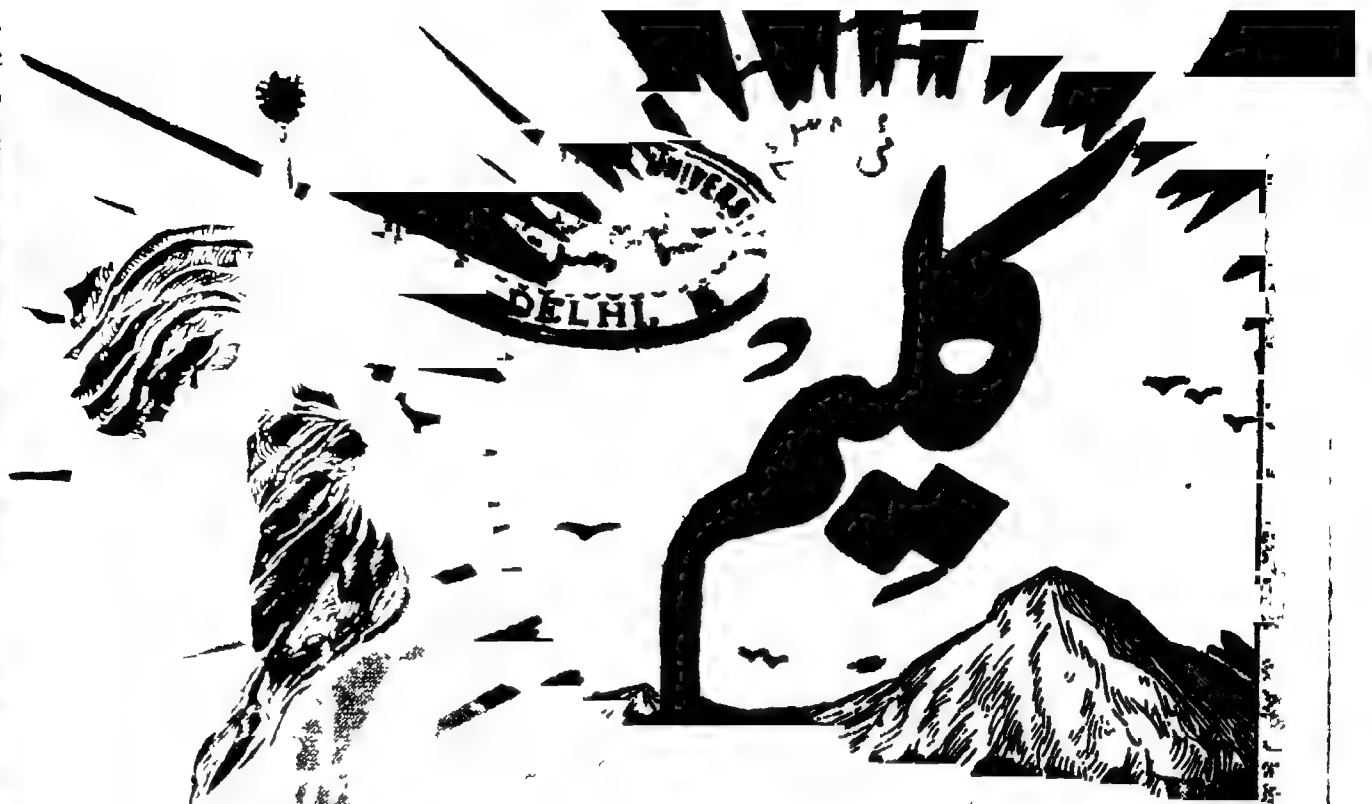
رباعی، تمام اصنافِ سخن میں وہ تہا رنگین، عمیق اور تصفیہ منصف ہے جو عظیم شعراء کی مشافی کے نقطہ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے، اور کسی شاعر کو اس فن تک حقیقی رباعی گو شاعر کا پُر شکوہ خطاب نہیں مل سکتا جب تک کہ اس کی بے پناہ جنون پرور تخیلی قوت بند ہوتے ہوئے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہٹے نہیں ہو جاتی، یہ بختِ ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رباعی بھی ہر جگہ گیر و ملتی جلتی شہو کے دُمرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، یارِ انِ طریقت نے بزمِ خود، یہ سب رکھ ہے کہ رباعی نام ہے رباعی کی بھروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا، اور بس — حالانکہ اگر حور سے دیکھا جائے تو رباعی شاعرانہ مطالعے، شاعرانہ فکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینی خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی بھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔

اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تنہا پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوا ہوتا، تو آپ کا یہ اولین فرض ہے کہ پہلی فرمت میں جنون و حکمت کا مطالعہ فرمائیں، اور دیکھ لیں کہ فیاضِ قدرت نے آؤ کار آپ کے ہندوستان میں ایک خیام پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشگرمی ہو گی کہ آپ اس کی قدر نہ فرمائیں — آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک فیئر جبریلڈ مل گیا تھا جس نے اسے ایک زندہ قوم سے روشناس کر دیا تھا، لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مژدہ اور غلام ہے، اور غلامی کو صرف یہی نہیں کہ کوئی فیئر جبریلڈ نہیں بلا کر تا، بلکہ خود اس کی قوم بھی اس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے تیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون و حکمت "مندرجہ ذیل ابواب منقسم ہے: ۱۰، معارف (۳)، خوابات (۳)، حسن و عشق (۴)، ایرانِ سالوس (۱۵) متفرقات

قیمت صرف تین روپے (علاوہ معمولی اک)

منیجر کلیم بابک ڈپو، حسینی نو اس، نمبر ۴، دریا گنج، دہلی



# شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا تازہ ترین شائع فکر و شعور

نقش و نگار اور شعور و شہم کے بعد یہ شاعر انقلاب کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جس میں بالکل نئی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ یہ تمام نظمیں بغض فطرت اور حساس شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ ایک ایک شعر میں مسائل حیات اور دنیا کے رنگ و رنگ واقعات پر ایسا نگین تبصرہ کیا ہے جس کی تشریح و تفسیر دفتروں میں نہیں سہکتی، اور بیان کی شگفتگی و شادابی پر ہزاروں حمن نثار ہیں۔ شاعر انقلاب نے اپنے پیغام کے ذریعے اپنے مخاطب کو فکر کی بچ و بچ گھاٹیوں میں بٹکتا ہوا چھوڑ نہیں دیا ہے۔ بلکہ اسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے۔ دماغ کو الجھنوں میں نہیں ڈالا ہے بلکہ سبزل کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے۔ اور ان سے وہ موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالم و جد طاری ہو جاتا ہے۔

کتابت، طباعت، کاغذ نہایت اعلیٰ ہے، سائز بڑا، صفحات ۱۲۵، سرورق خوشنما رنگین، کتاب مجلد ہے

قیمت ایک روپیہ

ملتان  
میجر کلیم بک ڈپو، نمبر ۴، جنتی نواس، دریا گنج دہلی



# بنام قوت و حیات کتاب

آئے گانہ جانے کب زمانہ اپنا

قدرت ملا ہے مجھ کو صد حیف یہ حکم

سالانہ چندہ - چھ روپے  
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ

ڈاکٹر کران تقیلم

ریاستہائے میسور، پٹیا لہ، وحیدر آباد وکن

آگے کئی صدیوں ہر فسانہ اپنا

بہروں کو سنئے جاترا نہ اپنا

سہ ماہی چندہ دو روپے  
قیمت فی پرچہ نو آنے (۹)

نمبر

فہرست مضامین بابتہ ماہ مئی ۱۳۸۶ء

جلد

| نمبر شمار | مضمون                               | مضمون نگار               | نمبر شمار | مضمون                    | مضمون نگار               |
|-----------|-------------------------------------|--------------------------|-----------|--------------------------|--------------------------|
| ۱         | اشارات                              | مدیر                     | ۳۵۴       | جوش ملیح آبادی           | جوش ملیح آبادی           |
| ۲         | پیرزن لیگ                           | جناب فیضی پراچہ          | ۳۶۰       | رہنہ سلطان ادیبہ بھوپال  | جناب فیضی پراچہ          |
| ۳         | سرماہ                               | محمد خلیق ابراہیم لکھنوی | ۳۶۱       | آغا برہان پوری           | محمد خلیق ابراہیم لکھنوی |
| ۴         | دل محزون و نظم                      | سید رضا قاسم مختار       | ۳۶۵       | منیار الاسلام ڈپٹی کلکٹر | سید رضا قاسم مختار       |
| ۵         | کامیاب ناکام                        | سجاد وحید ملیح آبادی     | ۳۶۶       | وجاہت سندیلوی            | سجاد وحید ملیح آبادی     |
| ۶         | لفظ آزادی و نظم                     | سید سید جعفری جھلی شہری  | ۳۶۷       | عبد الطیف اعظمی          | سید سید جعفری جھلی شہری  |
| ۷         | ہندوستانی دروڑ سورتھ                | عبد الطیف اعظمی          | ۳۶۸       | عبد الطیف اعظمی          | عبد الطیف اعظمی          |
| ۸         | کسی کی آمد و نظم                    | عبد الطیف اعظمی          | ۳۶۹       | عبد الطیف اعظمی          | عبد الطیف اعظمی          |
| ۹         | شیلا و سلیم                         | عبد الطیف اعظمی          | ۳۷۰       | عبد الطیف اعظمی          | عبد الطیف اعظمی          |
| ۱۰        | ہماما ادب                           | عبد الطیف اعظمی          | ۳۷۱       | عبد الطیف اعظمی          | عبد الطیف اعظمی          |
| ۱۱        | جرنی کا آسٹریا پر تہذیب کیوں اد کیے | عبد الطیف اعظمی          | ۳۷۲       | عبد الطیف اعظمی          | عبد الطیف اعظمی          |
| ۱۲        | مولانا عبد السلام پر بیجا حملہ      | عبد الطیف اعظمی          | ۳۷۳       | عبد الطیف اعظمی          | عبد الطیف اعظمی          |
| ۱۳        | عبد الطیف اعظمی                     | عبد الطیف اعظمی          | ۳۷۴       | عبد الطیف اعظمی          | عبد الطیف اعظمی          |

جوش ملیح آبادی پرنٹنگ پریس، محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپا کر دفتر محالہ - دہلی کا نمبر جنیق نو اس سے شائع کیا

## اشارہ

عہدِ حاضر کی ادبی دنیا کا سب سے بڑا حادثہ

### اقبال کی موت

جس وقت ریڈیو نے اقبال کے انتقال کی خبر سنائی، ایک تیرسا دل و جگر کے پار ہو گیا، اور ضبط کی انتہائی سہمی کے باوجود میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبھنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت آزاد انصاری نے مجھ کو کہا "آپ کو اقبال کی اب قدر ہوئی، ہمیں غماز دیا کہ آزاد صاحب کس روز اقبال میری نگاہوں میں ذیقدر نہ تھا، ہر چند مجھے اس کے مسلک و خیالات سے شدید اختلاف تھا، لیکن اس اختلاف کے باوجود مجھے اس کے شاعرانہ کمال اور اس کی مفکرانہ عظمت سے کب انکار تھا۔"

اقبال ہر حالت اور ہر رنگ میں اقبال تھا۔ افسوس کہ ہماری شاعری کا آفتاب غروب ہو گیا۔ اقبال ان لوگوں میں سے تھا جو صدیوں اور قرونوں کی سچی پیہم کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

مست سہل ہیں سمجھو، پھر تا ہے فلک برسوں  
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اس کی روش اور اس کے دائرہ عمل کو شدید اختلاف تھا۔ ابتدا میں ہر عظیم شاعر کی طرح، اقبال کی شاعری بھی وسیع اور آفاقی شاعری تھی۔ اس کی نظر دور رس، اور اس کا سینہ چوڑا تھا مگر اس

کے بعد، بعض وجوہ کی بناء پر، اس کی شاعری کا دائرہ تنگ ہونے لگا اور آخر کار یہاں تک تنگ ہو گیا کہ اس کی تمام شاعری مذہب تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اعتراض یہ نہیں ہے کہ اس نے شاعری کے ذریعہ سے مذہب کی خدمت کیوں کی۔ شکوہ تو صرف اس بات کا ہے کہ اس نے سے عظیم شاعر کی آفاق فطرت نے اپنے کو ایک ہی دائرے میں محدود کر لینے کی پابندی کو کیوں نہ گوارا کر لیا۔ اس لئے کہ شاعر کے متعلق یہ بات حیرت انگیز بھی ہے، اور عبرتناک بھی کہ وہ حیات کے تمام ناقابل شمار پہلوؤں اور کمرہ ارض کے تمام لائق احوال کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف ایک ہی کوچے میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے۔ شاعر تو بہتا ہوا، ہمیشہ بہتا ہوا پانی ہوتا ہے۔ اس کا تو یہ نعرہ مستقل نعرہ ہے۔

دریچہ مقام نگزار و بدرنگے  
از بوسے یوسے برون آزدنگ برنگے

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ اقبال کی عظمت کا انکار کر دے۔ اقبال شاعر تھا، اور عظیم شاعر۔ اقبال مفکر تھا، اور عظیم مفکر۔

یہ صحیح ہے کہ وہ ایک لیڈر کی حیثیت سے ناکام رہا۔ لیکن یہی ناکامی اس کی شاعرانہ عظمت کی دلیل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ کوئی شاعر لیڈری کی سی فزوقسط تک اُتر نہیں سکتا۔

میں ہندوستان کے رعب آفریں اور حیرتناک وسیع براعظم پر اس سرے سے اس سرے تک نگاہ دوڑاتا ہوں۔ مگر کروڑوں کی اتنی زبردست آبادی کے اندر مجھے ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس بلند پایہ مرنے والے

کی خانہ پہی کر چکے۔

آج اقبال ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ لیکن جب تک اس دنیا کے کسی گوشے میں علم و ادب کا نام باقی رہے گا، اقبال زندہ و پایندہ رہے گا۔ اس کے گیت ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرتے رہیں گے۔ اور اس کا نام انسانی ذہن کے افق پر آفتاب کی طرح جگمگاتا رہے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان نے اقبال کو اس کے تمام ہمعصر شعراء سے زیادہ سراہا، اور سب سے بڑھ کر اس کی قدر کی۔ لیکن عجیب غلطی ہندوستان کی قدر شناسیاں محض رسمی اور فخریجی ہوتی ہیں، اور بعض اوقات تو ان کا دائرہ ذاتی تعلقات یا صوبوی افتخار تک محدود ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کی مالی حالت تمام عمر خراب رہی، اور بھوپال کے وطنیہ کے باوجود وہ ہمیشہ تنگ دست ہی رہا۔ لیکن اب آسانی کے ساتھ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان اس کی قبر کو زرو جو اہر سے پاٹ دے گا۔ محض اس خوشی میں زرو جو اہر سے پاٹ دے گا کہ شاعر جکا ہے۔ مگر یاد رکھئے یہ تمام زندہ بایاں اس کی قبر ہی تک محدود رہیں گی۔ کوئی اللہ کا بندہ بھولے سے بھی یہ دریافت کرنے کی زحمت بجا گو اور انہیں کہے گا کہ اقبال کے بچے اور اس کے متعلقین شکم سیر ہیں، کہ فائدہ کر رہے ہیں۔ زندہ ہیں کہ مر گئے۔

اقبال بلند مرتبہ اقبال، تو مر گیا، بہت اچھا ہوا کہ تو مر گیا۔ اس کمبخت ملک میں تیری مٹی پلید تھی۔ ہر چند تیری موت نے ہمارے سینوں کو سنسان، اور آنکھوں کو ویران کر دیا ہے، مگر خود تیرے حق میں یہ بہت اچھا ہوا کہ تو مر گیا اور مگر ناقدر شناس غلام ہندوستان کی سردہریوں سے تو نے نجات حاصل کر لی میرے دوستو کیا اقبال کی موت کو بھی معمولی موت سمجھ کر ٹال دیا جائیگا؟

کیا اس عظیم مرتبت انسان کی کوئی یادگار قائم نہیں کی جائے گی؟ محض کسی شخص کا اسٹیچون نصب کر دینا، یا اس کی قبر پر کوئی منارہ تعمیر کر دینا یا ہر سال مرنے والے کی برسی منادینا تو کوئی بہتر یادگار نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ دائرہ اقبال کے نام سے ایک ایسی مستقل انجمن کی بنیاد ڈالی جائے جو ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنی شاخیں قائم کرے ہر جگہ ترجمہ، تالیف اور تصنیف کا کام جاری کر دے؟

اس انجمن کی بقا کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اردو زبان کے ہر بکچے اور بولنے والے پر یہ فرض عائد کر دیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی میں

سے صرف ایک روپیہ فی صدی سالانہ چندہ دیا کرے۔

اگر ہندوستان کے سے وسیع براعظم میں سے جہاں ہنسیں کردار انسان آباد ہیں، ہمیں صرف پچاس ہزار آدمی ایسے مل جائیں جو ایک روپیہ فی صدی کے حساب سے چندہ دینا شروع کر دیں تو اندازہ لگائیے کہ دائرہ اقبال میں کتنی خیر دولت جمع ہو سکتی ہے۔ اور اس دولت سے ہم اردو زبان کو کس آسانی اور کس چترنگ سرعت کے ساتھ فروغ دے سکتے ہیں۔ اور اس کے دوش بد بخت اقبال کے متعلقین کی کس قدر خدمت انجام دی جاسکتی ہے اور ہر سال بہترین تصانیف پر ہم انعام بھی دے سکتے ہیں۔

فی صدی ایک روپیہ بھی بڑی چیز ہے، اگر پچاس ایسے ہی آدمی مل جائیں جو صرف ایک روپیہ سالانہ چندہ دیں پھر بھی اس دائرے کی آمدنی پچاس ہزار سالانہ ہو سکتی ہے۔ اور پچاس ہزار سالانہ کی رقم بھی اتنی ہے کہ ہم اپنی زبان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا سکتے ہیں۔

## نخوت کے پردے میں سہاوت

آج کرہ ارض کے ہر گوشے، اور ہر مقام پر ایسے ہولناک ہنگامے برپا ہیں، جن کا اس عہد سے پیشتر اس دنیا نے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔ ہر چند ہماری یہ دنیا کسی عہد میں بھی ہنگاموں سے خالی نہیں رہی ہے اور حوادث اس شاہراہ سے ہمیشہ گزرتے ہی رہے ہیں۔ لیکن اس دور کے ہنگامے، اور اس زمانے فسادات اپنی نوعیت و شدت میں ایسے عجیب و غریب، اور عمومی واقعے ہونے ہیں کہ تاریخ عالم میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

اس سے پیشتر بھی فتنے برپا ہوتے تھے، اور زمین انسانی خون سے رنگین ہو جاتی تھی۔ مگر وہ تمام بد امنیاں اور خون نشاں چنڈا فراد اور چند مقامات تک محدود رہنے کے باعث وقتی و مقامی ہو کر تھیں۔ اور امنیں تھوڑی بہت سی کے بعد دوبارہ جاتا تھا۔ لیکن اس مہربیں مٹا کے فتنے کی نوعیت و وسعت گزشتہ زمانے کے فتنوں کے مقابلے میں عجیب بھی ہے، اور ہولناک بھی۔

عصر حاضر کا فتنہ کسی ایک صوبے، کسی ایک ملک اور کسی ایک قوم تک

کہا جاتا ہے کہ دنیا کے تمام مفاسد کی جڑ ہے جہالت، اور تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے علم۔

یہ ایک بہت بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن تمام تر درست نہیں ہے اس لئے کہ وہ علم جو انسانی نفس میں محبت و شرافت کے عوض شقاوت پیدا کر کے اکثر منظم قتل عام پر آمادہ کر دے، اس جہالت سے بدتر ہے جس کی بربریت شعور کی بے ترقی کے باعث، محدود رہنے پر مجبور رہتی ہے۔

بٹھلے تو وہ نوجوانوں جگہ برپا ہیں۔ مشرق میں بھی، اور مغرب میں بھی لیکن یہ ایک نرس کی بات ہے کہ مشرق میں بٹھلے برپا ہیں مشرق کی جہالت کی وجہ سے، اور مغرب میں بٹھلے برپا ہیں مغرب کی ملیت کے باعث۔

یعنی اس وقت علم و جہل، دونوں معصوم کار ہیں، اور ہر چند کہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مگر دونوں ایک ہی مقصد حاصل کرنے کے واسطے دوش ہر دوش سرگرم عمل ہیں۔ اور دونوں کے نتائج عمل میں جبرتناک ہم آہنگی پائی جا رہی ہے۔

یورپ کی ملیت نے یورپ کو بتایا ہے کہ سیاسی۔ صنعتی اور تجارتی فروغ کے بغیر کوئی قوم زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتی۔ اور جس دس سے یورپ نے یہ بات سمجھ لی ہے، اس کے دامن میں پرورش پانے والی تمام قومیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے آلات ہلاکت کی طیاروں میں دیوانہ وار کوششیں کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی جہالت نے ہندوستانیوں کے کان میں یہ پھونک دیا ہے کہ مسجد کے سامنے باجا بجنے سے اللہ تعالیٰ کی حوسٹ میں فرق آجاتا ہے۔ گائے کے ذبح ہونے سے دیوتاؤں کے گھلوں میں نوازے اٹک جاتے ہیں چار یاری کی مدد سنتے ہی روحوں میں آبلے پڑ جاتے ہیں۔ اور تعزیوں کا جلوس جب رک جاتا ہے تو آئینہ معصومین سوگواروں کے نام دوزخیوں کے رجسٹر میں درج فرمایا جیتے ہیں۔ اور جس دن سے ہندوستانیوں نے اس جالاندہ کو اس کو ایمان سمجھ لیا ہے اس روز سے یہ ایک دوسرے کو لاشیوں اور سوڈے کی بوتلوں سے ہلاک کرنے کے واسطے ہر وقت بڑی خوشی سے آمادہ رہتے ہیں قدرت کے کھیل عجیب ہوتے ہیں۔ وہ جب کوئی آفاقی و عالمگیر تحریک جاری کرنا چاہتی ہے تو امداد کو اپنا ایجنٹ بنا کر پانی سے بھی وہی کام لے لیتی ہے جو آگ سے لیا کرتی ہے۔ اور علم سے بھی وہی خدمات

محدود نہیں ہے، بلکہ یہ فتنہ تو احاطہ کئے ہوئے ہے ہر بڑا فتنہ کا۔ ہر ملک کا ہر صوبہ کا۔ ہر شہر کا، ہر طبقے کا۔ ہر گھرانے کا۔ ہر گھر اور ہر فرد کا اور اس طرح احاطہ کئے ہوئے ہے، جیسے شدید صبر کے بعد کا پانی سے لدا ہوا طوفانی ابر۔

دنیا میں اس وقت جتنی قومیں بھی موجود ہیں۔ وہ سب کی سب بلا استثنا اس غیر طبعی ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ جسے جنون کہا جاتا ہے۔

ہر قوم، دوسری قوم کو دیکھ کر دانت نکال رہی ہے، اور ہر ملک دوسرے ملک کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر بھونک رہا ہے۔

جنگ کے باطل، آفاقی جنگ کے باطل قطبین کے درمیان ہر طبقہ پاپس کو ہٹا کر خاکستر بنا دینے والی جنگ کے خوفناک باطل اقوام عالم کے سرور گھر گھر رہے ہیں۔ اور وہ آخری لمحہ سر پر آچکا ہے۔ جب طوفانی ہواؤں کی سنسانا بٹ اور لڑوہ آگیز بجلیوں کی کرک کے ساتھ پانی دہشتناک جنگلہاؤں کے ساتھ برسناسا شروع ہو جاتا ہے۔

اخبار میں طبعی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت مشرق و مغرب میں کیا کھیل کھیلنا جا رہا ہے۔ حبش میں کیا ہو چکا ہے۔ آسٹریا پر کیا کچھ بیت چکا ہے۔ عربوں پر کیا کچھ گزر رہا ہے۔ چین و جاپان میں کیا قیامت برپا ہے۔ روس۔ فرانس۔ انگلستان۔ اٹلی اور ترکی گھبرا گھبرا کر کس مرکی سرگوشیاں اور کس ہم کی طیاریاں کر رہے ہیں۔ اور ہندوستان کے مستقبل کے باب میں کیا کیا پیش بندیوں کے بال بچائے جا رہے ہیں۔ اقوام کے سینے اس جبرتناک حد تک تنگ و تار ہو چکے ہیں، اور افراد کی حرم و ہوس کا دامن اس جبرتناک طور سے وسیع ہو چکا ہے کہ انسانیت کی نجات کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کسی پہاڑ کی ایسی پھسل پر آگئی ہے جہاں ہر چند کہ ہر شخص اپنی پوری قوت سے پاؤں جمارہا ہے اور زمین کو ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ رہا ہے، لیکن اس تمام سعی کے باوجود جسے دیکھو وہ آہستہ آہستہ پھسلنا ہی جا رہا ہے۔

لیا قدرت انسانی نسل سے تنگ آ چکی ہے۔ آدم کے بچوں کو ختم کر دینا چاہتی ہے؟

بظاہر تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔

انہم داتی ہے جو خدمات کہ جمل انجام دیا کرتی ہے۔

اور یہی وہ مواقع ہوتے ہیں کہ دُشمن انسانیت بے تاب ہو کر پہنچ اُمتی ہے کہ:-

بگذر زخوست و سعادت، کہ مرا

ناہید بفرزہ کشت و مریخ بقبر

بظاہر یہ تمام علامتیں سخت ہولناک ہیں۔ اور اتنی ہولناک کہ ان کے تصور تک سے جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس خوفی آثار کے پس پرہ جو جہود رنگین چھپا ہوا ہے کوئی نہیں دیکھتا۔ اور جو دیکھ لیتا ہے اس کے لبوں پر اس یقین سے ہنس کھیلے لگتا ہے کہ قدرت کس زبردست حکمت عملی سے کام لے رہی ہے، اور کس زبردست آپریشن کے ذریعہ سے انسانی جسم کے تمام فاسد مادے کو کبیر خارج کر دینے کے عزائم پختہ ہو چکے ہیں۔

یہ جب حاضر جو توپوں کی گرج سے لرزہ براہ نام، اور ہڈیاں تک پھیلانے والی کیسوں سے تھر تھرا رہا ہے بظاہر کس قدر مخوس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم افراد اس بات پر یقین لائیں گے کہ امداد اور خود دنیا کے تمام جلیل القدر پیروں کے زمانوں کے مقابلے میں بھی یہ زمانہ زیادہ مسعود اور زیادہ مبارک ہے۔

پیروں کے زمانے میں مرث پیروں کی ایک ذات، یا ان کے متقدمین کی ایک قلیل جماعت ہوتی تھی، جو شر کا مقابلہ کرتی تھی، لیکن آج کائنات کا ہر ذرہ، ہم ٹھونک کر شر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو چکا ہے۔

پیروں کے عہد میں شر کو جو ایک قوی شے ہے، خیر کے ذریعہ سے چیلنج دیا جاتا تھا۔ جو نسبتاً کمزور چیز واقع ہوئی ہے۔ اور اسی وجہ سے پیروں کے دل میں ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کاش وہ خیر کے دائرے کو حسب مراد وسیع دیکھ سکتے۔

لیکن اب قدرت نے تنگ آکر، اور پرانے تجربات سے فائدہ اٹھا کر شر کا زور توڑ دینے کی خاطر اپنا سب سے بہتر اور آخری حربہ استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تمام چیزیں قوموں کو ایک دوسرے کے خون کا پیسا بنا دیا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ قدرت نے شر کی مختلف مقداروں کو کہیں متوازن اور کہیں غیر متوازن صورتوں میں ایک دوسرے کے مقابلے کے لئے لاکھ لاکھ کر دیا ہے۔ اب اگر جنگ ہوگی تو خیر اور شر کے درمیان جنگ نہ ہوگی، بلکہ خدا ایک شر کو دوسرے شر سے ٹکرا دیا جائے گا۔ اور اس ہولناک دھماکے کے ساتھ ٹکرایا جائے گا کہ شر کے تمام اجزاء، صفوں، بن کر جہادوں میں اڑ جائیں گے۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دنیا کی تمام جمہونی بڑی قومیں ایک دوسرے کو ذبح کر ڈالنے کی خاطر تلواروں پر سان رکھ چکی ہیں، اور انسانی تہذیب و ثقافت کو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہر قوم تلوار پر بات ڈالنے سے لرز بھی رہی ہے۔

کیوں لرز رہی ہے؟ اس لئے کہ ایک بار تلوار چلتے ہی سب کی موت ایک یقینی چیز ہے۔

چالاک، شرارت اپنی موت سے گریز کر رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ چٹائیں دھلا کو کا زمانہ نہیں ہے۔ جب ایک قوی گروہ دوسرے کمزور گروہ کو بھگوانا ہو تو آسانی بہت کم کر جاتا تھا۔ اور ایک بیدار جماعت دوسری خوابیدہ جماعت کو اپنا نواسہ بنا لیتی تھی یا ایک چالاک جماعت دوسری بے خوف جماعت کو ہلاک کر ڈالتی تھی۔

اب تو وہ زمانہ ہے کہ تقریباً دنیا کی ہر قوم بیدار، چست، ہوشیار اور قوی ہو چکی ہے، اور آسانی کے ساتھ ایک دوسرے کا شکار نہیں بن سکتی ہے۔ اب جب جنگ ہوگی تو خوفناک و بیدار اور کمزور و قوی کے درمیان نہیں ہوگی۔ بلکہ بیدار کے مقابلے میں بیدار۔ چالاک کے مقابلے میں چالاک اور قوی کے مقابلے میں قوی ہتھیار اٹھائے گا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ صورت حالات ہرگز ایسی نہیں ہے کہ کسی منجلی قوم کا کوئی نوجوان کرنیل دیوانہ وار نفرت جنگ بند کرتا ہو یا جنگ کی آگ میں کود پڑے۔

معاملہ اس قدر سنگین اور نازک صورت اختیار کر چکا ہے کہ عقلیں بڑی بڑی باریک ہیں، اور دقیقہ سنج عقلیں سربراہوں کو نظر آ رہی ہیں۔

اگر ایک طرف امن پسند و غیر مسلح شہری ہوں اور ایک طرف امن پسند و مسلح ڈاکو۔ تو تمام کارروائی آسانی کے ساتھ بخیر و خوبی انجام تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر جب دونوں طرف چور۔ ڈاکو اور بد معاش ہوتے ہیں تو اس وقت عقلیں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اگر اقوام عالم کو جلد ہوش نہ آگیا۔ اور سیاسی۔ تجارتی اور صنعتی ہتھیار کا خیال ترک کر کے انسانیت کے میدان حشر میں مدد و داد کی ترازو بہت جلد نہ کٹری کر دی۔۔۔۔۔ گئی اور تمام زرد گو ہر اور تمام پیداوار کو نوحہ انسانی میں مساوی طور سے تقسیم کر دینے کی کوئی صورت بہت جلد نہ نکالی گئی تو یاد



کئے گی۔ اور قدرت کو مجبور ہو کر وہ عمل کرنا پڑے گا جو دیکھنے میں تو شقاوت  
آئیز ہوگا۔ لیکن حقیقت میں اس کے اندر ایک ایسی بے پایاں رحمت ہوگی  
کہ انسانیت اس وقت تک شکریہ ادا کرتی رہے گی جب تک کہ یہ ننھا سا  
کرۂ ارض عظیم الشان آفتاب کے گرد نقصاں و غزلخواں رہے گا۔  
کیونکہ اس شکست و رنجیت کے بعد بگڑی ہوئی انسانیت کی خاک سے  
ایک ایسا حیرتناک نیا آدم پیدا ہوگا جسے دیکھ کر قدرت کا جذبہ  
الوہیت جھوٹے ہوئے لگے گا۔ اور انسانیت کے ملتے پر الوہیت کا زرین  
تاج جگمگا اٹھے گا۔

وکننا چاہیے کہ ہماری لاکھوں برس کی تہذیب آج واحد میں فنا ہو کر وہ جائیگی  
سب میں بین الاقوامی سیاست سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک قوم  
دوسری قوم کے ساتھ عدل نہیں کرے گی۔ کیا بازار سب کے لئے مساوی ملو  
سے کھلے نہیں رہیں گے؟ کیا رنگ، نسل، مذہب اور وطن کے تعصبات  
نہیں بلائے جائیں گے اور کیا تہیو اور جینے دوڑ کے اصول پر عمل نہیں کیا  
جائے گا؟ اور کیا دولت و ذرائع دولت کی مساوی تقسیم سے دلوں کے زخم  
مندر نہیں کئے جائیں گے؟

اس مکان کا ارہ تو بہت دیر سے واقع ہو رہا ہے۔ لیکن ہے بشریت اپنی  
اصلاح کے لیکن حد سے گزرے حالات سے اندیشہ ہو رہا ہے کہ انسانیت  
ایک بہت ہی شے آپریشن کے بغیر اپنی اصلاح کی طرف مائل نہ ہو

## کلیم کی زندگی میں سب سے پہلی ایل

ہو چکا ہے۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ کا نظر نہیں آتا کہ وہ اپنے قد دانوں  
کی خدمت میں یہ درخواست کرے کہ ہر خریدار براہ کرم پانچ پانچ خریدار  
دیا کر کے کلیم کے اجراء میں اس کا بات بنائے۔  
اگر قارئین کرام کے نزدیک کلیم ایک ایسا پرچہ ہے جسے وطن عزیز  
کی خاطر زندہ رہنا چاہیے تو پھر ان کا یہ ایک ذاتی کام ہے کہ وہ مندرجہ  
بالا درخواست پر توجہ مبذول فرمائیں اور اگر صورت حال اس  
کے برعکس ہے تو وہ اپنی رائے سے مطلع کریں تاکہ اس سلسلے کو  
ہمیشہ کے لئے سدود کر دیا جائے۔

قارئین کرام کو اول تو خود ہی یہ بات معلوم ہوگی، اور اگر نہیں معلوم ہے تو  
اب ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ مدیر کلیم کوئی تجارت پیشہ انسان  
نہیں ہے۔ کلیم کو اس نے تاجرانہ نقطہ نظر سے نہیں بلکہ وطن عزیز کی خدمت کے  
لئے جاری کیا ہے۔

کلیم کی زندگی کا یہ تیسرا سال ہے۔ اور اس تمام مدت میں ہر ماہ یہ  
صورت پیش آتی ہے کہ مدیر کلیم کو خود اپنی جیب سے ایک کافی رقم  
صرف کر دینا پڑتی ہے۔

لیکن اب حالات کی نوعیت کچھ ایسی نازک صورت اختیار کر چکی  
ہے کہ مدیر اپنی جیب پر کوئی مستقل بار ڈالنے کے امکانات سے محروم



## پیرزن لیا

کل رات کو یہ خواب تھا کیا حضرت آزاد  
سہمے سے اجالے میں ہے اک پیرزن تند  
یوں گرم سخن ہے کہ جو اللہ نے چاہا  
ایک بوند میں بہ جائے گی تعمیرِ دو عالم  
ہاں لیگ ہوں اسلام کی دیرینہ مجاہد  
کافر کو جلاتی ہوں سب نارِ جہنم  
آہی نہیں سکتا مرے منہ "لالتہ" بزدل  
کیا اس کا مراد کر، وہ ویسی، میں بدیشی  
گنگا کی ہراک لہر میں غلطیہ ہے پستی  
کفار کے دل، اور مرے چند سپاہی  
بھڑکوں تو ابھی سینہ گیتی کو جلا دوں

لے حضرت آزاد انصاری۔

آغوش میں خلعت کے ہے سہما سا جلوہ  
اور سہے ہوئے شہبائے جوانی کا دشالا  
کردوں گی میں اسلام کی دنیا میں اُجالا  
چھلکے گامرے صبر کا جس وقت پیالا  
ہر بات مری تیغ ہے ہر سانس ہے بھالا  
مومن کو عطا کرتی ہوں جنت کا قبلا  
میں پاک، وہ ناپاک ہیں گوری ہوں، وہ کالا  
میں مصر کی مسجد، وہ بنارس کا شوالا  
دجلے کی ہراک موج میں رقصاں ہی ہمالا  
اعدا کے پرے، اور مرا ایک رسالا  
گرجوں تو ابھی چرخ کو کروں تہ و بالا

صدا کے زما، چندی بن گئے  
اسلام کے بھی نون سا جلوہ

ہر فرد حکومت ہے مری آنکھوں کا تارا ہر خان بہادر ہے مری گود کا پالا

اتنے میں اک انگریز نے ایک قصر کے درے

آہستہ سے پٹ کھول کے سراپنا نکالا

پیشانی گلزنک پہ کج افسر شاہی آنکھوں میں فسوں بات میں سونے کا نوالا

یہ دیکھتے ہی پیرزن لیگ یکا یک دوڑی بڑی شفقت سے اٹھائے ہوئے مالا

مالے کو بچھاتے ہی بہ انداز محبت چہرے پہ نظر گار کے آخپل کو بنبھالا

اور کہنے لگی پیار سے، لے لے کے بلا میں

اے نورِ نظر! سلمہ اللہ تعالیٰ

جوش

جاری ہو گلوں کے درمیان گفت و شنود  
موضوع مکالمات پہنچا جاؤ  
کھلتی ہوئی کلیوں پہ چنبچم دم صبح  
اک منہج نیم کے گراں شک آلود

مجھ پر ہوں منہ زور نہیں تنہا ہوں  
رشتے ہیں قوی اور نہیں تنہا ہوں  
اجاب ہیں منجملہ عادات قبیح  
واقف ہوں مگر چھوڑیں تنہا ہوں

جوش

## سرمایہ

”جو شے جو مضمون کی خرابی یا نفل کے بغیر مڑی کے طور پر چب یا کھنکی جا سکے اور وقت، خواہش، خواہشات کی گیل میں کام آئے سرمایہ کہلاتی ہے۔۔۔“

فیضی پراچہ

دو ہزار میں جبکہ انسانی حیات کا فرض اولین اور منتہائے مقصد حاصل ہو رہا ہے اور جبکہ ہر انسان کو اس کے ارد گرد، پیسے سے حاصل کردہ، منڈ لاتی ہوئی شان و شوکت سے پہچانا جاتا ہے، تو یہ قدرتی بات ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اسی طرف راغب ہو اور اسی کے حصول میں نہک لیکن اس سا لہا سال کے اہٹاک و رغبت نے جو نتائج پیدا کئے ہیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں، انسانیت دو عالمگیر گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے، ایک وہ جس نے انسانی میں اپنی تمام تر توجہ حصول زر کی طرف مرکوز رکھی، غلام و استبداد چالاک و بے انصافی کی تمام کھوں کو کام میں لا کر دولت جمع کی، اس پر قابض ہو کر اپنے رعب و وقار کو بڑھایا اور رعب و وقار کے نشے میں غمور ہو کر جمہور کو دبا رکھا، دوسرا وہ جو ان تمام بد دیانتیوں، اور چالاکوں سے بے خبرت و مقدر پر و الہانہ یقین رکھے۔ ان فریب کاریوں کا شکار ہوتا رہا، اپنے خون پسینے سے، تمام تر سادہ لوحی کے تحت، دوسرے کے گھر کی دیوار پر اینٹ لگا رہا، ایک کی چالاک اور دوسرے کی سادگی سے یہ عمل تیز رفتاری سے جاری رہا۔ حتیٰ کہ تو اذن معاشرت اس قدر بگڑ گیا کہ ایک کو تو دنیا کی ہر وہ چیز حاصل ہو گئی جس کی ایک انسان متناکر سکتا ہے،

## فیضی پراچہ

اور دوسرا اس قدر مغلوب الحال ہو گیا کہ محنت و مزدوری کی ان تنگ گوشہ کے باوجود، مزدوریات حیات کی گیل سے عاجز رہا۔ اس زمین و آسمان کے فرق نے سہارہ کے دل میں اعلیٰ کے غلات شبہات و گمان پیدا کئے، فکر و غور کی بند پر دازیوں کے ساتھ ساتھ یہی شبہات حقیقت میں بدلے گئے، اور پتہ کی احساس ہونے لگا، کہ ”اعلیٰ کو سب کچھ اس کی بند اتالی کی وجہ سے حاصل نہیں، بلکہ خود (سہارہ) کی سخی و محنت سے حاصل ہے، اُس کے اس احساس نے شبہات کو غنا و دشمنی میں بدل دیا۔ اور وہ تمام شدود کے ساتھ سرمایہ کے مقابل صفت آرا ہوا، اس کے سادگی ہونے کا دعویٰ کیا اور اسی نظام ہا تمدن و معاشرت کو یکسر بدل دینے کا مطالبہ کیا، جو سرمایہ دار کو لوٹ کے اور جمہور کو لٹے کے مولفے میں پہنچاتا ہو۔ سرمایہ دار اپنی طاقت کے زعم میں غمور، ان چیزوں کو کب برداشت کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنی تمام قوت، ان جذبات کو دبانے میں صرف کی۔ خدا اور مذہب کے نام کو، کلیساؤں، مساجد اور مناد میں رہنے والے راہنماؤں کی وساطت سے اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کیا، یہ کشش جاری رہے، حتیٰ کہ دنیا کے ایک کھنہ میں حق و صداقت کو نفع ہوئی، اور روس میں، نیکولس زار کے زیر قیادت سرمایہ داروں کے جبر و استبداد کا خاتمہ ہو گیا اور عنان حکومت جمہور کے ہاتھ آئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ”سرمایہ“ (زر و سیم) کو انسانی حیات کے ساتھ کھلا رکھنا ہے، اسکا اجراء ضروری ہے کہ نہیں، اور اس کے بغیر ہم دہ زمرہ

لی ضروریات نبھا سکتے ہیں یا نہیں، سرمایہ کی مختصر سی تعریف یہ ہو سکتی ہے جو شے جو پیشہ کی خرابی یا غفلت کے بغیر موزی کے طور پر اکٹھی کی جاسکے، اور وقت خواہ مخواہ جہتات کی تکمیل میں کام آئے، سرمایہ کہلاتی ہے۔ کیا ایسے سرمایہ کے بغیر انسانی زندگی ہو سکتا ہے؟ فرض کیجئے سونے اور چاندی کو معیار تبادلاً کی حیثیت حاصل نہ ہوتی۔ تو کیا سونا اور چاندی بنفسہ ہمارے کسی کام آسکتے۔ کیا ان سے نباتات انسانی کی کوئی خاص ضرورت پوری ہو سکتی؟ ضرورت کا اطلاق ہر کل بیت وسیع ہے، لیکن یہ ہے کہ انسان کو قدرتی طور پر کیا کچھ ضرورت ہے، اور اس میں کام نہیں کہ قدرتی ضروریات ہر انسان کی سادگی ہیں، مثلاً انسان کو زندگی کی امتدادی ہیئت قائم رکھنے کے لئے مسند رجول، ایل اشیا، زمیں لازمی ہیں، اور ان کا ہر ذی روح بغیر امتیاز بہت وبالہ، امیر و فقیر، مزدور و سرمایہ دار، یکساں طور پر محتاج ہے۔

(۱) خوراک (۲) پوشش (۳) ہوا (۴) باد و باران سے بچنے کے لئے نصرت۔ ان کے علاوہ اگر کسی کے قبضے میں کوئی شے ہے تو وہ ضرورت کو نبھانے کے لئے نہیں، بلکہ تکمیل خواہشات کے لئے، نا تو قبضہ ہے، جو قدرتی طور پر اس کا اپنا حق نہیں بلکہ وہ کسی اور کے حق پر قابض ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ راجہ کا محل بھی تو گھر ہے اس کی نلے و نوش بھی تو خوراک ہے، اس کا بیبتن بھی تو پوشش ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہیں صرف اُس چیز کی ضرورت ہے جو حیات انسانی کو اعتدال میں رکھے، جو اس سے بڑھ جائے، نا تو ہے، درجہ گھٹ جائے کم ہے، اس کا خلافت کے تغاوت ہی نے دنیا میں آگ لگا رکھی ہے، انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہے، اگر سونے چاندی سے میں دیگر حسب خواہش اشیا بھیان ہو سکیں تو سونا اور چاندی بذاتہ ہماری ہی کام کی چیز نہیں۔ اُن سے ہماری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی، نہ وہ راک ہے، نہ پوشش، اور نہ مکان میں استعمال ہونے والی دھات، زیادہ سے زیادہ آج اُن کے وجود سے جو کام لیا جاتا ہے وہ زیورات ہیں، اور زیورات ضرورت کی چیز نہیں۔ یہ محض شان و شوکت اور طوالت کے مظاہر ہے کام آتے ہیں، اور یہی وہ مظاہرات ہیں جو بے انصافی و بددیانتی کو منظر ام پر لا کر، نادار، قدرتی ضروریات کے لئے محتاج نادار کے دل پر چوٹ لگاتے ہیں۔ بظاہر ان نکیٹے کو اس قدر ہر دلعزیزی اور مقبولیت کیوں مل رہی؟

فطرت کا غامض ہے کہ وہ نظام قدرت کے صحیح قیام کے لئے جابر پر جابر جماعت کو پیدا کرتی ہے، تاکہ توازن قائم رہ سکے۔ چنانچہ کیرٹوں کو لیجئے، مرغ اور پرندوں کی خوراک ہیں۔ مرغ اور پرند، شہباز اور چیل کا لقمہ ہیں۔ بکری نباتات میں سے ہوئے بے شمار حشرات الارض کو کھا جاتی ہے، اور بکری کو شیر کھا جاتا ہے، لیکن ماسوائے حادثات کے یہ انسانی مشابہت میں نہیں آیا کہ شیر شیر کے گوشت سے شکم پروری کرے، شہباز، شہباز کو مار کھائے بلکہ اس کے برعکس دیکھا گیا ہے کہ چوئیاں حصول خوراک کے لئے تعاون کرتی ہیں، ایک چوئیاں کہیں کچھ دیکھ جائے تو بقیہ چوئیاں کو خبر کرتی ہے اور وہ بڑے اہٹاک سے سب مل کر قطار در قطار بار برداری شروع کر دیتی ہیں، یہی حال چڑیوں کا ہے، اور اس سے زیادہ سبق آموز منظر اُس وقت دیکھنے میں آتا ہے جب ان میں سے انکا کوئی کزور ساتھی مر جاتا ہے یہ نعلی مخلوق اپنے مردہ رفیق کے جسم کو سنبھالنے میں جس اہٹاک و سعی کا ثبوت دیتی ہے وہ اپنی کا حصہ ہے۔ لیکن انسانی دستور جدا ہے، ان میں سے ہر چالاک و جابر۔ کزور و ناتواں کے وجود پر اپنی پیش و عشرت کا عالیشان قصر تعمیر کرتا ہے اور اُس قصر کی حفاظت کے لئے خود کزور و ناتواں کو استعمال کرتا ہے، کزور و ناتواں کیسے استعمال ہوتا۔ اس کی یہی ایک راہ ہو سکتی تھی کہ اس کی ضرورت کی تمام اشیا پر قبضہ کر لیا جائے، اور ضرورت کی انتہائی شدت میں اسے اس قدر دیا جائے کہ وہ زندہ تو رہ سکے لیکن اس کی ضرورت قطعی طور پر پوری نہ ہو، اور اس داد و ستد کے لئے اسے اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس میں مذہب اور عدا کو بڑی حد تک غلط طور پر استعمال کیا گیا۔ عوام الناس کو کہا گیا کہ یہ قدرتی فعل ہے کہ کزور، طاقتور و توانا کے زیر سایہ اُس کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرے، اور اس دعوے کے جواز میں اوپر دی ہوئی دلائل پیش کی گئیں اور اس حقیقت سے یکسر انکار کر دیا گیا کہ ہم جنس، ہم جنس پر ظلم نہیں ڈھکتا، چونکہ کزوری و توانائی کا تعلق فطری ساخت سے ہے، اس لئے کزور بکاڑ اپنی نافرمانی کی وجہ ان نقلی دلائل سے گمراہ ہو کر طاقتور کی چالاک کا شکار رہتا رہا، اور اس کی سرداری کے آگے جھکنا رہا۔ اور ابتدا میں تقریباً تمام ضروریات بھی قوت بازو سے ہیہا تھیں۔ مثلاً خوراک شکار کے گوشت سے پوشاک اس کی پوستیں سے، اور گھر پہاڑ میں غار کھودنے سے۔

اس لئے بھی قوی و توانا کا بہت مدت تک دور دورا رہا۔ جب عقل انسانی نے ترقی کی اور شکار کے بجائے زراعت و وسیلہ معاش بٹھرا، تو اجتماعی محنت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انفرادی طاقت و زور و بچ ثابت ہوا، چنانچہ اب اسی طاقتور نے اپنی بیہوشی اس میں دیکھی کہ زیادہ سے زیادہ زمین پر قابض ہو جائے، اور اپنی سرداری کو قائم رکھے۔ جوں جوں نسل انسان فی حیات اجتماعی کی عادی ہوتی گئی، طاقتور کی سرداری بھی کمزور ہوتی گئی۔ زمین کا قبضہ اس کی سرداری کو زیادہ دیر قائم رکھنے میں مدد و معاون ثابت نہ ہوا۔ اب ضرورت تھی کہ کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے، اور وہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ کسی کیاب و دعات کو معیار تبادلاً قرار دے کر اس دعات پر قبضہ رکھا جاتا، کیونکہ پیداوار (Commonwealth) پر قبضہ ہی بنی ہو سکتا تھا، اگر ہو بھی سکتا تو دیر پا نہیں، یہاں سے وہ دور شروع ہوتا ہے جس کے حالات مختلف آثار و قرائن کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہیں، دعات کو مستقل طور پر معیار تبادلاً کی حیثیت کب اور کیسے حاصل ہوئی، یہ ایک تاریخی سوال ہے، اور اس کے حل کے لئے ہمیں ابتدائی دور کی مذہبی کتب کی طرف رُخ کرنا ہو گا۔ یہ کتب ہی اپنے وقت کی بہترین تاریخ ہیں، کیونکہ عام تاریخوں کی طرح یہ محض حالات پر مبنی بحث نہیں کرتیں بلکہ اپنے اپنے دماغ کا قانون، جو معاشرت کا بڑی حد تک ذمہ دار ہوتا ہے بھی پیش کرتی ہیں، ہندومت کی ہی کتب کو لیجئے، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ زراعت کے ابتدائی ارتقاء کے دوران ہی میں مذہبی پرستش کا چرچا ہو چکا تھا، اور انسان نے کسی نہ کسی طرح اپنے ہم جنس طاقتور و توانا کے رعب و وقار سے منہ موڑ کر، ایٹور کی پرستش شروع کر دی تھی۔ دعات کا استعمال بھی تقریباً تقریباً اسی دور سے شروع ہوتا ہے لیکن یہ بالکل عیاں ہے کہ ابھی تک دعات کو معیار تبادلاً کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ہندومت کی ابتدائی کتب سرمایہ (زر و سیم) کو کسی خاص ایسی بین شکل میں پیش نہیں کرتیں، جیسے کہ بعد کے مذاہب کی کتب صریح و واضح طور پر بیان کرتی ہیں، بلکہ اس کے برعکس شہو تقسیم و فرائض اور جمہور کی چار بڑے گروہوں، برہمن، کھتری، وید۔ شودرا میں تقسیم اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اُس وقت تک صرف محنت ہی تکمیل ضروریات کا واحد ذریعہ تھی، ایک گروہ نے ایک کام کر دیا اور دوسرے نے دوسرا۔ اس طرح سب کا گزر ہوتا رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے جسمانی طاقت و توانائی پر مبنی سرداری کا دور پُراٹھا

شروع ہوتا ہے۔ اُس زمانے کے چند کے جو آج کل مختلف جگہوں کی کھدائی سے ملے ہوئے ہیں بتاتے ہیں کہ اُن کی قدر و منزلت اقتصادی بنا پر نہیں تھی بلکہ اعتقادی و جوتھی۔

یہ بڑی تانبے۔ اور لوہے کے ٹکڑوں پر کھدی ہوئی چند سورتیاں ہیں جن پر قیمت درج نہیں۔ ان کے مصلے میں جو کچھ ملتا ہو گا وہ اُس محنت کی وجہ جو منہ نے اس پر صرف کی اور خریدنے والے نے اُس سورتی سے عقیدت کی وجہ ہو گا ان ٹکڑوں پر کھدی ہوئی ہے انھیں خریدنا، زر و سیم کے عوض نہیں بلکہ غلہ کھل یا ایسی ہی کوئی اور چیز دے کر۔ (تبت میں آج کل بھی یہ رواج عام پایا جاتا ہے، فصل کی کٹائی کے دوران میں صنایع کئی قسم کی سورتیاں، ٹکڑی، پتھر، سٹی، تانبے اور پتیل کے ٹکڑوں پر بنا کر لے آتے ہیں، جن کا معاوضہ غلہ کے معقرہ وزن کی شکل میں مقرر ہے۔ کسان وہ غلہ دے کر سورتیاں صنایع سے تبرک کے طور پر لے لیتا ہے، آج کل اُن پر فصلی سبز بھی درج ہوتا ہے) ان سورتیوں کی خرید و فروخت اتنی بڑھی کہ عام کارخانہ اسی طرف ہو گیا۔ اب غلہ کو ایک اور موقع ہاتھ آیا۔ اُس نے دعات پر، جو ان دنوں بیت تھوڑی قدر میں ہینا ہو سکتی تھی، لوٹ کھسوٹ سے قبضہ کر لیا، اور اُس پر اپنی سورتیاں کھدایا جناس اور مالداروں کے عوض اُن کی فروخت شروع کر دی۔ یہی خرید و فروخت انجام کار دعات کے مستقل معیار تبادلاً کی حیثیت پر منتج ہوئی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ تبتی سٹے مرد و عورتیں اُن پر بادشاہوں کے بت منقش ہیں، اور جو چھوٹی نظام کے سٹے ہیں اُن پر بھی کوئی نہ کوئی بت بنا ہوا ہے۔ اُن تبتوں کے معنی یہ ہیں کہ یہ دعات اُن کی ملکیت ہے، جن کا بت اُس کی سطح پر موجود ہے، یا کسی ابتدائی، جبر و سطوت اور اظہارِ ملوکیت کے دستور کا اعادہ ہے، جو انسان نے سب سے پہلے اختیار کیا۔ ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان غیر فطری زندگی اختیار کرتا گیا، اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق بڑھتی گئی، امیر و غریب کی پہچان ہونے لگی۔ حتیٰ کہ بعد کے مذاہب نے بھی سرمایہ اور سرمایہ دار کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا۔ حکم کسی نہ کسی شکل میں پیش کیا۔ انسانیت بھی مذاہب کے عروج کے ساتھ ساتھ

نہ چین کے شہر سورن گنگ نے اپنی کتاب "The Ancient and Modern China" میں لکھا "انسانی حیات میں دعات کا اولین استعمال سورج پرستی سے شروع ہوا۔ دھوپ اور چاند کی ہر رنگ و صاف کو ان کے وجود کا حصہ سمجھا کر ان نے ان کی ہم رسانی کو ضلالت میں سمجھا دیا۔ ان کے لئے اپنے پاس اور گھر میں رکھے۔"

اس مسئلہ کو قضاء قدر سے تعلق مانکر اس سے مانوس ہوتی گئی، اور اس قدر ہوئی کہ سچی کا احساس ہی مٹ گیا۔ لیکن جب بھی کوئی شے حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے، اس کی طوبیاں مٹ جاتی ہیں اور بُرائیاں منظر عام پر آ جاتی ہیں، یہی حال "سرمایہ" کیسے دہرا کا ہے۔ جب اس کی مقبولیت محدود رہے تو اس کی اخلاق و دیانت کا خون ہونے لگا۔ غرضی بڑھ گئی، بددیانتی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا، تو یہ خیال پیدا ہوا کہ ان تمام قباحتوں کی علت غائی کیا ہے۔ فکر و طور اور مشاہدات نے ثابت کیا کہ ان تمام برائیوں کا ڈی حد تک ذمہ دار یہی سرمایہ ہے۔ غرض کیجئے اگر ایک کے پاس سونے چاندی کا تہا ہے، اور دوسرا قدرتی ضروریات کے لئے محتاج تو یقیناً محتاج سرمایہ اسے اپنی ضروریات کو نبھانے کے لئے اس کا جمع کر دے سرمایہ چھیننے کی کوشش کرے گا۔ خواہ اسے چوری ڈاکہ قتل، بددیانتی یا کوئی اور ایسا ہی طریقہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ اگر یہی تفادیت مٹ جائے تو یقیناً چور کو چوری، ڈاکو کو ڈاکہ، چالاک کو بددیانتی، زور آور کو قتل اور ضروریات شکر کے لئے زانیہ کو عصمت فروشی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس سرمایہ کے بغیر نظام چل سکتا ہے یا نہیں۔ یقیناً چل سکتا ہے، آج بھی سرمایہ کے اس مقبولانہ دور میں ہمارے نظام کا بیشتر حصہ زرکسیم کا محتاج نہیں، اور اسے ہی کوئیچے، مالک و مزارعہ کے تعلقات نقد و زر کے لین دین پر نہیں بلکہ محنت اور حاصل محنت کی تقسیم پر ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دیندار بے محنت کئے، سرمایہ دارانہ نظام طفیل، دوسرے کی محنت پر پیش اڑاتا ہے، اور مزارعہ اپنی محنت کے بل بوتے پر زندہ ہے۔ پنجاب کے دیہات میں آج کل بھی جولاہوں، برہمنوں، لوہاروں، موچی اور نائیوں سے کسانوں نے ان کی مزدوری نقد کی شکل میں مقرر کر رکھی ہے۔ نقد کی قیمت میں اتار چڑھاؤ کا اس مزدوری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موچی اور نائی سارا سال کسان کا کام کرتے رہتے ہیں اور فصل کے موٹھے پر اپنا مقررہ نقد لے لیتے ہیں۔ پنجاب کے ہر گاؤں میں ایک جولاہا آج بھی چار چھ گندم کے عوض چار ہاتھ کپڑا بن دیتا ہے۔ کشمیر میں یہ عام رواج ہے کہ بستیوں کے موسم میں مالیں سنگھاڑے اور دیگر بستیوں کے لوگوں میں پھیری کرتی ہیں اور پیسوں عوض سودا فطری نہیں جیتیں۔ بلکہ خالص دھان اور چاول کے عوض فروخت کرتی ہیں۔ یہی دھان انھیں آئندہ کاشت میں بیج کا کام دیتے ہیں۔ راجپوتانہ میں بھی یہ رواج عام ہے۔ بازار میں مٹی ہوئی

مالیں سودا، گندم، مکئی اور جو کے عوض ایسا ہی فروخت کرتی ہیں جیسے نقد کے عوض۔ غرض تمام تر مقبولیت کے باوجود سرمایہ (کسیم و زر) اس نظام کو از سر مٹا نہیں سکا۔ جس کی بنیاد محنت کا معاوضہ محنت پر ہے، اور حاضرین ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ضروریات کی تکمیل کے لئے سونا چاندی یا کوئی اور دعائی سکہ بہت کم کام آتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر ان کا نعم البدل نوٹ ہی استعمال ہوتا ہے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا جس کی بذاتہ کوئی قیمت نہیں، معیار تبادلہ کی حیثیت سے کیسے استعمال ہوتا ہے؟ کیا اسپرٹل حکومتوں کے پاس اس قدر بڑا فنڈ موجود ہے، جتنے کہ نوٹ رائے ہیں۔ نوٹوں کے مساوی "پرزو" تو درکنار، انکا اس فیصدی بھی ریزرو نہیں۔ پھر یہ کہوں روپیہ کی مساوی حیثیت سے چل رہا ہے، اس لئے کہ اس کی پشت پر حکومت کا وقار ہے اور محض وقار، جبکہ "پرسٹیج" سے ایک ناقص سرمایہ داری نظام کا نوٹ معیار تبادلہ کی حیثیت سے چل سکتا ہے تو کیا اسی "پرسٹیج" سے "پروڈیوسر ٹیٹ نوٹ" (Producers' Titled Notes) نہیں چل سکتا۔ جو معاوضہ میں سونا چاندی ہی نہیں کرے گا، جو اکٹھی کر کے رکھی جائے، بلکہ ضروریات روزمرہ کی اشیا محنت کے ذریعے ہم پہنچائے گا، چونکہ اسپرٹل نوٹ (Producers' Titled Notes) مستقل حیثیت رکھتا ہے اور چاندی سونے کی ایک مقررہ تعداد کو پیش کرتا ہے اس لئے اس کا جمع کرنا بھی مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن "پروڈیوسر ٹیٹ نوٹ" (Producers' Titled Notes) غیر مستقل حیثیت کا ہوتا ہے، اور اس مقررہ عرصے کے گزر جانے کے بعد جس کے لئے کہ اس کا اجرا عمل میں آیا ہے بے قیمت ہو جاتا ہے، اور اس کے علاوہ وہ سونا چاندی نہیں بلکہ صرف جنس ہی ہیا کر سکتا ہے، اس لئے اس کا اکٹھا کرنا کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا، اور چالاک انسان دوسرے کے حقوق اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔ جرمنی اور روس کے "اسپرٹل کرنسی نوٹ" کا جو حشر جناب عظیم کے بعد ہوا وہ آج ہمارے سامنے ہے، اس کم کاروی روبل، اور ۱۰۰ مارک کا جرمنی نوٹ صرف چار چار آنے کو بکے، یہی نوٹ جناب عظیم سے پیسے، دنیا کی تمام مارکیٹوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے، غرض اگر غور کیا جائے تو دنیا کی تمام برائیوں کا ۵۰ فیصدی ٹھہرا اس سرمایہ کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ اگر اسی دعائی "معیار تبادلہ" کو اڑا کر تکمیل ضروریات کا ذریعہ محض محنت کو قرار دیا جائے تو دنیا میں بہت

مذہب و سکون قائم ہو جائے گا، اور ایک ناقابل انسان کو محض اس  
 درجہ سے وقار حاصل نہیں ہوگا، وہ کسی نہ کسی طرح دولت پر قابض ہے بلکہ  
 علم اور محنت ہی کا دور دوسرا ہوگا، اور انسان اپنی ذات اور خدا کے سوا  
 کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوگا۔ سرمایہ داری کا کھل اہتمام جاری  
 موجودہ مشکلات، بھینپی، بے کاری اور بے روزگاری کا واحد حل ہے،

## دل محزون

دل محزون جسے کہتے ہیں، اک سنان بستی ہے  
 سرور اس کا فغاں ہے اور نالہ اس کی کستی ہے  
 اگر لیلے کی ہے یہ بک تو ہنگی سے ہنگی ہے  
 یہ سودا بھی عجب سودا ہے بازاری محبت میں  
 شر افشانی، اٹکر دامنی، اور آتش اندامی  
 بھڑکتا ہے ہوا سے، اور بجھ جاتا ہے پھولوں سے  
 فنا اس کا قرار اور بے قراری ہے بقا اس کی  
 اسی کا درد ہمایہ ہے، اور ہمدرد بیتابی  
 تردد اور تفسر میں سداحیران و سرگرداں  
 کبیدہ آرزوئیں اور مکدر حسرتیں اس کی  
 ہے وسعت حرص اس کی، اور ہوس اس کی فراخی ہے  
 حرم کلبہ حزن و ندیم ذاتِ ناکامی  
 فدا لگ جائے ہلکا سا حرارت کا اگر جھونکا  
 اپنی برچھی کی، پرتیروں کے اور ٹوٹے ہوئے نشتر  
 اباسیوں کے گھر، ذراغ و زغن کے آشیانوں سے  
 یہ دنیا ہے وہ دنیا، جس پہ ویرانی بستی ہے  
 لہو پینا پلانا اس کا شغل سے پرستی ہے  
 جو ہے یہ جائیداد قیاس تو سستی سے سستی ہے  
 کہ سب اجناس ارزاں میں ہی اک حبس سستی ہے  
 دھواں اس کی بندی اور شعلہ اس کی بستی ہے  
 فنا انجام اس کا، یہ چراغِ راہ، بستی ہے  
 اسے بچین رکھنا عین اس کی سرپرستی ہے  
 جنہیں ہر وقت جوش خود سری و خود پرستی ہے  
 تغافلِ بستی اس کی توجہ اس کی بستی ہے  
 تناسل اس کی، ناکامی کا فقرہ اس کی بستی ہے  
 فغاٹ اس کی ناداری ہے، سیری تگدستی ہے  
 وہ اس کی آرزو ہے جو نکلنے کو ترستی ہے  
 جھاجھم بادلوں سے آگ بھرا اس کے بستی ہے  
 یہی دو چار چیزیں اس کی ساری گھر گشتی ہے  
 خزاں دیدہ چمن میں اس کے شادابی بستی ہے

عدم اس کا وجود اور ہے وجود اس کا عدم سلطان  
 یہ ایسی زندگی ہے، زندگی جس کو ترستی ہے



# کامیاب ناکا

محمد خلیق ابراہیم لکھنوی

(۱)

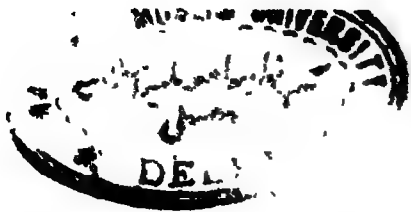
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محبت کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ بعض کہتے ہیں کہ ہوتی تو ہے مگر شاد۔ میں جو پریم کہانی اس وقت بیان کر رہا ہوں اس میں محبت کامیاب بھی ہوئی اور بہت ہی جلد۔ یہ کامیابی غم و اندوہ میں بھی تبدیل ہو گئی۔ یہ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ تھی جس سے کچھ عرصہ تک تو سب کی سی نرم رو، شعلہ ہی اور صاف شفات روشنی نکال رہی تھی، لیکن بہت جلد اس کی لطافت ختم ہو گئی اور تیز و تند ہوا میں بکھر گئے ہوئے لال لال شعلے کی گرمی نے دو معصوم دلوں کو جھلکا کر ان کی زندگیوں کو بھسم کر دیا۔

وہ ایک خوشگوار و دلغریب شام تھی۔ گرمیوں کی پُر فضا شام۔ ہندوستان کی گرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔ مگر مریم گراما کی شامیں سستی پیدا کرنے والی فضا رکھتی ہیں۔ شانتی کیتن کے بورڈنگ ہاؤس کے باہر لان (Veranda) پر وہ خوش نصیب طالبان علم ہلہلاتے ہوئے سبزے اور سبزی بھینی خوشبوؤں میں مسخر ہو چکے ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے جو شاعر اعظم حکیم ٹیگور سے اسباقِ نظرت کا درس لیتے تھے، قریب کی ایک بچہ پر جو چاروں طرف خوشنما پھولوں کی کھاریوں سے گھری ہوئی تھی۔ ایک حسین دوشیزہ نیم دراز اپنی سیاہ اور رفیق آنکھوں کو حکیم ٹیگور کی عرضِ نغمہ پر جھپکاتے ہوئے تھی، اُس کے

لے ٹیگور کی اس کتاب کا نام نکینا تھا، نیا ذخیرہ اس کا اردو ترجمہ عرضِ نغمہ کے نام سے کیا ہے۔

سڈول اور بھرے بھرے جسم کی دلغریبیاں ہر ایک ساری سے بھڑکی پڑتی تھیں، وہ ایک اندازِ استغنا کے ساتھ عرضِ نغمہ کا مطالعہ کر رہی تھی، اُسے شانتی کیتن میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے، جتنی شانتی کیتن کا ہونا ر طالب علم جو آج ہی چھٹیوں سے واپس آ رہا تھا بھٹکا ہوا اور دھڑلے آگیا اور بچ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ اندر کی محبت میں غل پڑ گیا، دو معصوم شرارت تاب آنکھیں اٹھیں۔ لبوں پر ایک شوخ تبسم کھیل گیا۔ جھیلی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ دولوں کے سینوں میں دفعتاً ایک ہنگامہ خیز بھل چم گئی، جس طرح سورج کی کرن اُس کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے، اُسی طرح دولوں کے دل ایک دوسرے میں پوسٹ ہو گئے، جذباتِ محبت دولوں میں اس طرح ابھرنے لگے جس طرح کسی گہرے چٹنے سے پانی اُبلتا ہے، دولوں کی دوستی بہت سے خوبصورت حسین لڑکوں اور لڑکیوں سے تھی مگر اس وقت نظروں کے ملاپ نے دولوں کو ایک بالکل نیا تجربہ کرایا، بالکل نئی قسم کی حسیات اور احساسات ابھرائے، ایک نظر عاشق ہونا نئے آئے تھے لیکن یقین نہ تھا، اب علی تصدیق ہو گئی،

دولوں کا مات چیت کرنے کو جی چاہ رہا تھا، اندر اپنی نسوانیت اور حیا کی وجہ سے بات کرنے میں سبقت نہ کر سکی۔ جھیلی مرد ہونے کی وجہ سے



جرات کر گیا۔ اُس نے پوچھا۔ آپ غرضِ نفرت پڑ رہی تھیں شاید۔  
اندر۔ جی ہاں، بہت عمدہ کتاب ہے، مجھے بھلا پسند ہے۔  
جھیلی۔ جی ہاں، ہے ہی پسند کئے جانے کے قابل (اڑاؤ کر)  
آپ کا غالب نیا داخلہ ہوا ہے؟

اندر۔ جی ہاں، کوئی سچو سات روز ہوئے۔  
جھیلی۔ جی آپ کو آج پہلی بار دیکھا۔ میں چھٹی نے کر گھر گیا ہوا تھا۔  
(تھوڑی دیر کے بعد)۔ اچھا، اپنا تعارف تو کرائیے۔

اندر۔ میں الہ آباد کی رہنے والی ہوں۔ میرے والد بہت بڑے  
تاجر تھے۔ تین ماہ ہوئے وہ دس لاکھ کی جائداد میرے نام چھوڑ کر اس دنیا  
سے سدھار گئے (اُس کی آنکھیں نناک ہو گئیں) میری والدہ کا میری شیر  
خوارگی کے زمانے ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ میرے بہت دور دراز کے  
چند عزیز ہیں۔ مگر اُن سے اور والد سے جانے کس بات پر ہمیشہ لڑائی  
رہی۔

جھیلی۔ تو اب آپ تعلیم حاصل کرنے کے لئے شانتی نکیتن آ گئیں؟  
اندر۔ جی ہاں، میرے والد کو میری تعلیم کا بڑا خیال تھا، ہارسال  
جب میں نے ایف اے کیا تو اُن کا ارادہ شانتی نکیتن بھیج دینے کا تھا مگر  
زندگی نے وفانہ کی۔ پھر حال میں نے اُن کی خواہش پوری کر دی۔  
جھیلی۔ بہت اچھا کیا آپ نے، شانتی نکیتن واقعی شانتی نکیتن ہے،  
اس طرز کی درسگاہ ہندوستان تو کیا دنیا میں شاید ہی ملے۔

اندر۔ جی ہاں، مگر اپنا تعارف کرائیے۔  
جھیلی۔ مجھے جھیلی کہتے ہیں۔ مجھے یہاں دو سال ہو گئے۔ میں ڈاکٹر  
جعفری ڈی مالٹ کا لڑکا ہوں۔

اندر۔ ڈاکٹر جعفری شہور کا نگر سی لیڈر؟  
جھیلی۔ جی ہاں۔

اندر۔ آپ کی تعریف بھی میں یہاں بہت سُن چکی ہوں، بڑی  
خوش قسمتی ہے جو آپ سے ملاقات ہوئی۔

جھیلی۔ خوش قسمتی تو میری ہے جو آپ جیسی خوبصورت و پاک سیرت  
و دہیزہ کی دوستی نصیب ہوئی۔ (اندر کے چہرہ پر سرخی و دھڑکن)  
اندر۔ (شرما کر)۔ یہ آپ کا سخنِ نمن ہے ورنہ میں اس قابل کہاں؟

جھیلی۔ غضب کرتی ہیں آپ، آپ اس قابل نہ ہوں گی تو اور کون ہو گا۔ (اندر  
نے شرما کر نظر نہ اٹھی کر لیں)۔  
اندر۔ آپ کو زیادہ شغف کس سخنوں سے ہے؟

جھیلی۔ شاعری سے، گو خود شاعر نہیں ہوں، ہاں یہ فخر ضرور ہے کہ شعروں  
مقابل صحیح طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے ہومر، خیام اور میر حسن بہت پسند ہیں،  
کالج میں میں لیرک شاعری، بلور اختیاری سخنوں سے ہوسے تھا۔ کچھ روزوں  
پچھلے شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔

اندر۔ ہومر اور خیام کے کیسا تم میر حسن کا نام لینا آپ کے فطری ذوق پر  
دال ہے۔ مجھے میر حسن، انیسویں سے زیادہ پسند ہے، اُس کی ایک غزلیں ہزاروں  
دیوانوں پر بھاری ہے، اُس کی غزلیں کے کئی اشعار ہومر سے ٹکر کھاتے ہیں کچھ  
شاہزادہ کے جوش آنے پر پری کا کہنا سے

ابھی تک تو میرا تھیں تیرا ہے میرا نہیں پر اب گھر تیرا ہے میرا نہیں  
تعریف سے مستغنی ہے۔ لوگ انیسویں و دسویں کے آگے میر حسن کو کچھ نہیں سمجھتے، اکثر  
کے ذوق کے خلاف کوئی بات زبان سے نکال کر بڑی جرات کا کام ہے، آپ نے  
بڑی جرات و بہت سے کام لیا جو ہومر کے ساتھ میر حسن کا نام لیا۔

جھیلی۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا اور میرا ذوق اتنا یکساں ہے؟  
اندر۔ مجھے بھی سید سرت ہوئی کہ آپ کو شاعری سے اس قدر محبت ہے  
یہاں چھ سات روز میں مجھے کوئی اپنا خیال دوست نہ ملا۔ اب آپ سے  
بڑی پُر لطف صحبتیں رہا کریں گی۔

جھیلی۔ مجھے بھی یہاں آپ کا ایسا صحیح ذوق رکھنے والا کوئی شخص نہ ملا۔  
دو سال کے بعد آج آپ جیسی صبح و بلند ذوق رکھنے والی خاتون سے ملاقات  
ہوئی۔ اب شانتی نکیتن میں بقیہ زندگی بڑی پُر لطف گزرے گی۔

اندر۔ صوفیانہ شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔  
جھیلی۔ لا حول و لا قوت

اندر۔ یہی معلوم کرنے کو تو پوچھا تھا، مجھے بھی اس ہرزہ گوئی سے  
سخت نفرت ہے۔ مگر مراد آبادی کا کلام شروع سے آخر تک بہترین ہوتا،  
اگر وہ صرف اس طرح کے اشعار کہتے سے

ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی  
نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی

تقصیر کے سامنے بھی کچھ اس طرح چلی نظر میں پھر گئی تصویر آسمان کی یہ فتنہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حسن جب دیکھئے اک فینڈی آنکھوں میں بھری لیکن اس طرز کے اشارے کو

مجھے تلاش کر اسے بے خودی شوق جو پہنچنے سے پہلے متعدد پہلو گہا ہوں میں تو سامنے ہے پھر بھی بتا کر تو کہاں ہے کس طرح تنہا دیکھوں نثارہ دریاں پھر اسے دل دردمنہ محبت تصور سی کا پریشان ہو گا ان کے کلام میں ہی خرافات کا ایک حصہ شامل کر دیا ہے۔

جسلی: ماشاء اللہ آپ کی نظر بہت وسیع ہے۔ اور کیوں نہ ہو، بھلا ہوا اور خیام کے پسند کرنے والے کی نگاہ میں ان خرافات کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے؟ آپ کا مجھ سے پوچھنا ہی بیکار تھا کہ میں صوفیانہ شاعری کو کیا سمجھتا ہوں۔ اندرا: بعض لوگ صوفیانہ شاعری کی طرف ذرا ہی میں بڑے غلو سے کام لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کا عہد یہ معدوم کروں۔ جسلی: بیت اچھا کیا آپ نے۔

(۲)

اسی طرح پانچ چھ پہلے گزر گئے۔ دونوں میں روزانہ دلچسپ علمی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر اپنے دل کی بات ظاہر کرنے کی ابھی تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی۔ شانتی کیتھن میں غنچرب طالب علموں کی طرف سے حکیم ٹیگور کا ایک عاشقانہ سوشل ڈرامہ دکھایا جانے والا تھا، اس میں ہیرو اور ہیروئن کے پارٹ جسلی اور اندرا کو دئے گئے۔ ریپرسل شروع ہوئے۔ دونوں کے جذبات محبت اور زبانیہ اُبھر آئے۔ خاص ڈرامہ دکھانے کی رات آئی۔ ڈرامہ دکھا گیا۔ حکیم ٹیگور نے سید پسند کیا۔ جسلی اور اندرا کا پارٹ بالکل فطری رہا۔ اور کیوں نہ رہتا۔ دونوں کے دل ایک دوسرے کی حقیقی محبت میں سرشار تھے۔ شانتی کیتھن کی طرف سے دونوں کو انعام میں تھے۔ تین بجے ڈرامہ ختم ہوا۔ جسلی اور اندرا دونوں کے جذبات سیدھا بھر آئے تھے۔ دونوں کے دل بھرے ہوئے تھے اس خوف سے کہ کہیں دونوں کے یہ طوفان اک دم پھٹ نہ پڑیں۔ دونوں فوراً اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بقیہ رات میں کسی کو فینڈ نہ آئی۔ ڈرامہ کے پریمی مناظر دماغ میں جکڑ لگاتے رہے۔ جذبات محبت کا اثر زور و شور سے دل و دماغ پر چھو گیا۔ کچھ کو تنہا ہی مارش ہوئی، صبح آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ تڑکے اٹھ کر جسلی

بہنایا اور اندرا کے کمرہ کی طرف روانہ ہوا۔ دفعتاً سید خوشگوار تھی۔ بلی بلی صبا جی ہوا پھولوں کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی دماغوں کو تازگی اور دلوں کو فرحت بخش رہی تھی۔ ہر سہ بھرے پودوں پر برستے ہوئے پانی کی بوندیں آبدار موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اندرا اپنے بازو پر سر رکھ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی باہر لہلہاتے ہوئے سبزے پر پانی کی تھنی تھنی بوندوں کے خوشگوار منظر کا لطف اٹھا رہی تھی، اس کا چہرہ گونا گوں کیفیات کا حامل تھا۔ جسلی جا کے اُس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جسلی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی نظر جسلی پر گھاڑیں جسلی نے اُس کی آنکھوں میں موتی جیسا ایک آنسو جھلکتا ہوا دیکھا وہ اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ بے اختیارانہ وہ اندرا کے سامنے دوڑا نہ ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پے درپے بوسے لینے لگا۔

جسلی (بھڑائی ہوئی آواز میں) اندرا۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ (اں دفعتاً اظہار محبت نے اندرا کو ایک وقفہ کے لئے خوشی سے سرشار کر کے بالکل جھس کر دیا)

جسلی: بولو۔ اندرا بولو۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ تم کیوں نہیں بولتیں؟

اندرا نے اب جسلی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اُسے اپنے پاس ایک صوف پر بٹھالیا۔ اپنی مرمیں باہیں اُس کی گردن میں حائل کر دیں۔ ایک آنسو اب بھی اُس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ مگر محبت اور پریم کا مقدس مسرت انگیز آنسو۔

اندرا: جسلی پیارے! ہمارا حسن پہلی ہی نظر میں اپنا کام کر گیا تھا، اسی روز سے میرے دیدہ دل میرے نہیں بلکہ تمہارے ہو گئے ہیں۔ شرم و حیا میری زبان کھٹنے نہ دی۔ مگر میں اس کی آرزو مند ہی تھی کہ کسی طرح ظاہر داری کا یہ حجاب ہمارے درمیان سے اٹھ جائے۔

جسلی: اندرا پیاری! مجھے پورا یقین تھا کہ میرا پریم یکطرفہ نہیں ہے۔ (آسمان کی طرف سر اٹھا کر) اے اللہ! میں کتنا خوش قسمت ہوں۔

اُس نے اندرا کی کمر میں اپنے قوی بازو حائل کر دئے اور اُسے اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ اندرا نے بھی اپنے جبر کا تانستر جو جسلی پر ڈال دیا۔ دو نرم و نازک پنکھڑیوں والی نیم شگفتہ گلاب کی سی کلیاں ایک دوسرے

میں پیوست ہو کر رہ گئیں۔

(۱۳۰)

اس واقعہ کے بعد شام کو حبیب دونوں میں ملاقات ہوئی تو گفتگو کا موضوع محبت تھا، اندرا بولی جمیلی پیار سے لوگ کہتے ہیں کہ محبت سر اسر لطیف و پاک ہوتی ہے، اگر ایسا ہے تو یہ آغوش میں لینا یا پیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ ہر عاشق و معشوق کو یہی کرتے دیکھا اور سنا۔ اُس کے تو یہ معنی ہونے کے یا تو حقیقی محبت کا وجود ہی نہیں یا محبت کا مفہوم بالکل غلط ہے۔

جمیلی۔ ہاں پریم، دراصل مفہوم غلط ہے۔ ایک طرف تو محبت کو سر اسر لطیف و دلہانہ ماننے والے لوگوں کا گروہ ہے، دوسری طرف اُس کو سر اسر گندگی سے آلودہ ماننے والے لوگ۔

مشہور ادیب علامہ عبدالوالی اپنے ایک افسانہ مرد و عورت اور دنیا میں لکھتے ہیں کہ ہائی میں کنکر ڈالو تو دائرے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح غلط محبت منہ سے نکالنے سے مختلف دائرے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً عورت و مرد کی نظروں کا چار ہونا، بیک نظر عاشق ہونا، ملاقات ہونا، پیگ بڑھنا اور بے تکلفی ہونا، اظہار محبت، شادی، وصل حاصل ہو جانا، پھر آخر میں لکھتے ہیں کہ زچہ خانہ کوئی اچھا منظر پیش نہیں کرتا، کتنا بھرکتا ہوا اور صبح یہ جگہ ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ محبت نہ صرف پاکیزگی ہی پاکیزگی جو اور نہ صرف خواہشات نفسانی کا نام۔ ایک روز مشہور جرمن شاعر گوٹے زراؤس کی محبوبہ شارلوٹ ایک کمرے میں بیٹھے تھے، شارلوٹ کسی کام سے ذرا دیر کے لئے اٹھ کر باہر گئی، گوٹے اپنی جگہ سے اٹھا اور اُس جگہ کے پے در پے بوسے لینے لگا، جہاں شارلوٹ میٹھی تھی۔ یہ ہے دلہانہ محبت، مگر یہ کہنا غلط ہے کہ گوٹے کو شارلوٹ سے بالکل بے لوث اور خواہشات نفسانی سے پاک محبت تھی، اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی غلط ہے کہ محبت کا مفہوم زچہ خانہ اور ایک نووارد بچہ کا ٹیپوں ٹیپوں کرنا ہے، محبت محمود ہے لطیف اور کشیف دونوں عناصر کا جس طرح انسان منظر ہے برائی اور اچھائی دونوں کا، اور جس طرح سے انسان کو برائی اچھائی دونوں کا منظر ہونے سے اثرات الملوقات بنا دیا، اُسی طرح جذبہ محبت کو لطیف و کشیف دونوں عناصر سے مرکب ہونے کی وجہ سے بہترین جذبہ قرار دیا گیا۔

اندرا۔ بڑے ذہین جو تم جمیلی۔ میں نے اس پر بہت غور کیا تھا، مگر کچھ دیکھی تھی، اب جو تم نے اس کا تجزیہ کیا تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ میں تم پر کیوں غور کیا؟ جمیلی۔ اور مجھے تم پر فخر ہے، سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ہم میں مذہب کے اختلاف کے باوجود جذبات محبت نے نشوونما پائی اور اب ہم شادی کر کے ہندوستانی سنا تھی اور مصیبت ست بھری ہوئی نضا میں ایک انقلابی قدم اٹھانے میں کامیاب ہوں گے۔

اندرا۔ جمیلی پیارے، مجھے بھی اس کی بڑی خوشی ہے، مذہب کی ظاہر داری سے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، ہندو سکن میں شادی نہیں دشتہ محبت قائم نہ ہو، حقیقی الفت قائم نہ ہو۔ کیوں؟ اس لئے نہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک انسانیت سے خارج ہے، بلکہ اس لئے کہ خدا کو دونوں دو مختلف طریقہ عبادت سے پوجتے ہیں، مذہب جو امن و سلامتی، ہمدردی و محبت کا پیغام لے کر آیا تھا، آج قتل و غارتگری، بیدردی و نفرت کا باعث ہے، عیسائی بدھ، کرشن، اور محمد کی رد میں کیا خوش ہوتی ہوگی، جب وہ شیعہ سنی، ہندو مسلم، مسلم عیسائی فسادات کے مناظر دیکھتی ہوگی، وہ انسانیت جس کی تبلیغ کرنے کرشن و محمد آئے تھے دنیا اس کے وجود سے خالی ہے۔

جمیلی۔ بالکل ٹھیک کہتی ہو تم، اندرا پیاری! ان جنت و جہنم کے خودشتہ ٹھیکیداروں کے دراصل یہ سب پس بوسے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ سرمایہ داروں کا بھی جو ان رنگ و روٹوں کے ہاتھ کاٹھوتا ہیں بہت بات ہے۔

اندرا۔ یہی کجنت تو منافرت اور درندگی کے رہنما ہیں۔ اگر اپنی یہ حیوانی حرکات چھوڑ دیں تو مالویت، مولنا نیت، پرمانندیت اور جناحیت کا ٹھکانا ہی کہاں ہے۔

جمیلی۔ بڑی سچی بات کہی ہے تم نے، خدا کا شکر ہے کہ میرے والدین خرافات سے پاک ہیں، جمعی میں انھیں بے حد چاہتا ہوں۔ تو سے شادی والدہ مزدور خفا ہوں گی، مگر والد سب ٹھیک ٹھاک کر لیں گے، ہم کتنے خوش نصیب ہیں اندرا کہ ہماری راہ میں زیادہ روٹے نہیں ہیں، ورنہ تم جانتی ہو اس مٹم کی شادیاں قریب قریب ناممکن ہوتی ہیں۔

شہر اور ٹوک ٹی سے ہے۔ غ

اندرا۔ اور میرا کوئی اعتراض کرنے والا ہے ہی نہیں۔ چند دور کے رشتہ دار ہیں سو پہلے ہی سے روتے بیٹھے ہیں۔

جسلی۔ مگر جن کو ہم سے کوئی سروکار نہیں ہے وہ زیادہ شور و غل مچائیں گے۔ جلوس نکالیں گے۔ اور نہ معلوم کیا کیا کریں۔

اندرا۔ تو ہم ان کی بات پر کان ہی کب دھرتے ہیں۔

جسلی۔ جب ہم تعلیم ختم کر کے اک دم شادی شدہ دہلی پیوینج جاؤں گے تو اتنا جان اس شادی پر کتنے خوش ہوں گے۔ دوڑ کر تجھے اور نہیں دو توں کو لٹالیں گے۔ تم سے بھنا نہ گفتگو کریں گے، اماں جان تم سے اگر نہیں بولیں گی تو ان کو ڈانٹیں گے۔

اندرا۔ اور میں تمہاری اماں پر اپنی معصومانہ ڈبڈبائی آنکھوں سے عجبیانہ نظریں جھاکر ان سے بہت کروں گی، انہیں مناؤں گی۔ وہ مزبور من جائیں گی۔ پھر ہماری زندگی کیسی پُر لطف گزرے گی۔

جسلی۔ خدا ایسا ہی کرے۔ اماں بڑی تعصب اور کٹر مسلمان ہیں، مجھے شانتی کلیتین بھیجے کی صورت اس نئے محالیت میں کہ ڈاکٹر ٹیگر کا قائم کیا ہوا ہے اور ٹیگر ہندو ہیں۔

اندرا۔ مگر ہم جب اسی قدر سناتنی شخص کو نرم نہیں کر سکیں گے تو اور کیا کر سکیں گے؟ میں ان کو سمجھاؤں گی۔ ان کے پاؤں پڑوں گی۔ ان کے لپٹ جاؤں گی۔ آخر وہ بھی عورت ہیں اور عورت کے جذبات سے واقف، اپنی جوان پوسے راضی ہو ہی جائیں گی۔ چاہے باول نا خواستہ ہی کیوں نہیں۔

جسلی۔ ہاں راضی تو ہو جانا چاہیے انہیں، رہا یہ کہ وہ عورت کے جذبات سے واقف ہیں، غلط ہے، وہ عجیب الخلق عورت ہیں۔ تمام دوسری عورتوں سے انوکھی، اور قدامت پرست جاہل عورتیں تو سب ہی ایسی ہوتی ہیں۔

اندرا۔ ہاں میری دور دراز کی اکثر رشتہ دار عورتیں ایسی ہی ہیں۔ اور دراصل وہی اصل وجہ میرے والد اور دوسرے رشتہ داروں کے جھگڑے کی ہیں۔ میرے والد۔۔۔۔۔۔ میری والدہ کو لے کر انھیں لگے تھے۔ وہاں سے واپس کیا ہوئے ہیں ادھر ہی ہو گئے۔ برادری نے حقہ پانی بند کر دیا۔ پھر بھی کچھ رشتہ دار ملتے جلتے رہے۔ لیکن تھوڑے

عرصے کے بعد سب کے سب آپ ہی آپ روٹھ گئے۔ والد نے بھی کہا کہ چلو اچھا ہوا۔ ان روز روز کے نام دھرنے والوں سے فرصت ملی، ایک پُر لطف قصہ سنو، انہیں رشتہ داروں میں سے ایک صاحب سے والد سے کسی بات پر جھجک جھجک ہو گئی۔ والد نے کہا خیر۔ آپ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش، شتا بخیر ماہ سلامت چھوٹے ہی وہ صاحب بوسے، ہاں تم تو ادھر ہی ہو جی، بات بات پر وہی ملکٹوں کے سسٹے مسٹی۔ جسلی۔ تعصب ہر مذہبی شخص میں آج کل ہے۔ مگر ہندوستان میں جس انوکھے طرز کا تعصب ہے اس کا دوسرے ممالک میں وجود ہی نہیں ہے اور خدا کرے ہنو۔

اندرا۔ جسلی پیارے، تعلیم سے فارغ ہو کر ہم دونوں اپنی زندگی انہیں اصلاحات کے لئے وقف کر دیں، کیوں کیسا خیال ہے؟ جسلی، بہت مبارک خیال ہے۔

(۴)

اسی طرح تین سال کا عرصہ گزر گیا، دونوں کی محبت زیادہ والہا ہوتی گئی۔ ہر وقت دونوں ایک دوسرے کے خیال میں محو رہتے تھے، دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو کر رہ گئے تھے، ان کی صحبتیں بہت دلکش و دلچسپ ہوتی تھیں، اب جسلی کو تعلیم سے فراغت حاصل ہو گئی، اندر نے چونکہ اس کے دو سال بعد داخلہ کرایا تھا، اس لئے ابھی اس کو فراغت میں دو سال باقی تھے، شانتی کلیتین میں تعلیمی زمانہ میں شادی منع تھی، اس لئے ابھی دونوں کی شادی بھی ملتوی تھی۔ جسلی نے اندرا کے اصرار سے یہ دو سال کا عرصہ بھی شانتی کلیتین ہی میں شعر و شاعری کے مطالعہ میں گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ باپ سے اجازت منگالی۔ وہ علم کے بڑے شائق تھے، اپنے بیٹے کو بہترین عالم و فاضل دیکھنا چاہتے تھے اس لئے دو سال تک اور لڑکے کو اپنی آنکھوں سے دور رکھنے پر راضی ہو گئے۔

اب جسلی کا ظرف زندگی لبالب بھرا ہوا تھا، ذرا بھی خلا نہ تھا، وہ اندرا کو پورے جوش و خروش کے ساتھ چاہتا تھا، اس کو اندرا کا محبوب اور اس کا ہونے والا شوہر ہونے پر فخر تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس کی اندرا ہر لحاظ سے ایک عظیم شخصیت کی مالک ہے۔ اندرا کی محبت بھی اس کے ساتھ کچھ کم جوش و خروش کی نہ تھی، اس کو بھی فخر تھا کہ جسلی کا ایسا شخص اس کا

حاشی، محبوب اور ہونے والا شوہر ہے۔ جمیلی کو اپنے باپ سے بید محبت تھی،  
 لہذا بید محبت، باپ ہی اُسے بید چاہتے تھے، اُن کی محبت کو جمیلی کی نئی کیفیت  
 قلبی نے دبا دیا تھا، یہ دھماکا باپ کے دھکے کو اُس کا دل نہ چاہتا ہو۔ باپ  
 سے ملنے کی بھی خواہش تھی اور اندر کو بھی نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ باپ سے دو  
 سال بعد وہ دل کھول کر ملے ہی گھا اور اندر اُن کو اُس کے پاس ہی تھی، کیا  
 ایک دل میں بیک وقت خود خواہشات نہیں ہو سکتیں؟ اور اگر ایک ہوش  
 پوری کر لے تو کیا یہ سمجھا جائے گا، کہ دوسری طلب کمزور تھی؟ انسان فی طبیعت  
 کے دوسرے اور جذبات متعلق نہیں ہوتے، اس لئے یہ کہنا کہ باپ کی محبت  
 کو نئی کیفیات قلبی نے دبا دیا تھا صحیح نہیں۔ ان کیفیات کا بھی زور تھا اور  
 اس محبت کا بھی۔ اسی وجہ سے کہا گیا کہ جمیلی کا ظرف زندگی لبالب بھرا تھا،  
 ظرف زندگی کا نہ بھرا ہونا مصیبت ہے، اور ناقابل برداشت مصیبت۔ مکمل  
 انسانی زندگی رہی ہے جو اذواق و خواہشات و جذبات سے بھری ہوئی  
 ہو، اذواق انسان کو مشغول کار رکھتے ہیں اور خواہشات و جذبات  
 سرور پیدا کرتے رہتے ہیں۔

(۵)

ایک روز اپنی شام کی دلچسپ ملاقاتوں میں سے ایک خوشگوار ملاقات  
 میں اندرانے کہا۔ جمیلی پیارے، کچھ بھی ہو محبت کا عقدہ لایخل معلوم ہوتا  
 ہے۔ نئے نئے سوالات و مانغ دل سے کرتا ہے۔ مگر جواب قریب قریب مانگ  
 ہوتا ہے۔ مثلاً اسی کو لو کہ یہ کیا کہ ایک شخص صرف ایک ہی سے محبت کرتا  
 ہے۔ اسی کا نام چپکے چپکے زور زور ہر وقت و روز زبان رکھتا ہے۔ وہی نام  
 دل کی گہرائیوں سے اس طرح اُبلتا رہتا ہے جیسے گہرے کنویں کا سوتا، پھر  
 اگر کوئی بید حسین ہے تو صرف ایک یا دو انسان ہی کیوں اُس سے محبت  
 کرتے ہیں، ساری دنیا اس کو کیوں نہیں چاہتی؟

جیلی۔ اندر پیارے، یہ کوئی عقدہ لایخل نہیں ہے، ذرا غور کی ضرورت  
 ہے۔ ہمارے اس سوال کا جواب صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنی مخصوص پسند  
 رکھتا ہے، تم جو کچھ میری نظر میں ہو کیا اپنے والد کی نظر میں بھی وہی تھیں؟  
 ہسکی کی بوتل سام لال کے لئے لڑو پے ہیں، ہاں تا گاندھی کے نزدیک  
 ایک طرف ہے جس میں سانپ سمجھو سے زیادہ زہریلی کوئی چیز بند ہے بولینا  
 عبد الماجد کو شتمل کر دینے والا سبیل اور کسی کے لئے سے

مے سے غرض نشا طہ ہے کس روسیاء کو  
 اک گونہ بے طو دی مجھے دن رات چاہیے  
 کی تفسیر۔ ایک ہی چیز کیسے کیسے زرخ پٹتی ہے۔ اشبار کی حیثیت نقطہ نظر  
 کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

مجھے تو پسند اور محنوں کو لپٹی نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی  
 یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جمیلی کا دوست سریندر کل آیا، باتوں میں  
 غفل پڑ گیا، سریندر نے پوچھا کہو جمیلی، اُگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟  
 جمیلی۔ ملک اور زبان کا خدمت،

سریندر۔ زبان کی خدمت تمہارے لئے مناسب ہے، مگر ملک کی  
 خدمت کے لئے کسان اور مزدور بنائے گئے ہیں نہ کہ تم جیسا عالی و مانغ۔  
 جمیلی۔ شائنی ککتین میں رہ کر تمہارے یہ خیالات! میرا دل چھٹا جاتا ہے،  
 سریندر۔ داہ میں نے تو میں فطری بات بتائی ہے۔ فطرت نے تم کو پیش  
 و عشرت کے لئے تخلیق کیا ہے، نہ کہ تکالیف و مناسب اٹھانے کے لئے، اگر  
 اُسے تم سے یہ پڑھول کام کرانے ہوتے تو وہ بہتیں مزدور بناتی۔ عالی و مانغ  
 نہیں۔

جیلی۔ ہتھاری ذہنیت میں مجھے عظیم انقلاب رونما ہوتا معلوم ہوتا ہے۔  
 کسان اور مزدور کیا انسانیت سے گرے ہوئے ہیں؟ کیا وہ ہمارے ہی  
 جیسے آدمی نہیں۔ رہا پیش و عشرت کا فلسفہ تو میں اپنے لئے تو کیا اسے  
 کسی شخص کے لئے بھی مناسب و بہتر نہیں سمجھتا، سکون و اطمینان اور پیش و عشرت  
 کی تلاش موت کے آثار ہیں۔ ہر چیز ایک نئی چیز بننے کے لئے ترکیب پار ہی  
 ہے، اس تحت میں ہم تم بلکہ ساری کائنات ہلک ہے، جو پیش و عشرت و صحت  
 وہ اس دنیا کے لئے بیکار ہو گیا۔ اُس کے اجزا ترقی کرنے سے معذور ہو گئے،  
 خدا کا حکم انسان کو اور نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کو یہ ہے کہ اُگے  
 بڑے جاؤ۔ یہی عقیدہ ہے اور یہی آخرت۔ اس کے علاوہ سب دل پہلانے  
 کے ڈھکوسلے موجودہ سائنٹیفک ایجادات ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہیں  
 جو انقلاب اور ترقی کی حامل ہے، پھر آنے والی نسلیں اس سے بھی افضل و  
 برتر و در زندگی کے لئے کوششیں کریں گی، یہی ہوتا چلا جائے گا، پانچک  
 کہ نظام کائنات درہم و برہم ہو جائے۔ مگر یہ ایجادات ترقی کی راہ میں صرف بار  
 برداری کے خچر ہیں۔ اصل ترقی انسانیت کی ترقی ہے۔

سریندر۔ تم اس انتہائی مختل پر بیخ گئے ہو، جہاں سے پھر رادھت پر وہ اس آنا مکن ہے، انسان جب اپنے کو دوسروں کا شکیبار اور ان کے مصائب کے ختم کرنے کو اپنا فرض سمجھنے لگتا ہے تو اس کے ذاتی جوہر ختم ہو جاتا ہیں۔ میں تو مسیحی کی فیسزم کا حامی ہوں۔ آخر انفرادی عظمت بھی کوئی چیز ہے؟

جھیلی۔ بھی تم تعلقدار کے لئے کہے ہو، تمہاری ایسی ذہنیت نہ ہو تو تعجب ہے۔ ہمارا انفرادی عظمت، کوئی شک نہیں اس کے وجود میں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص عوام سے حقوق انسانیت میں بالا تر ہے، البتہ عمر و عہد عظیم الشان انسان تھے۔ غلیظ تھے، لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت تھی۔ مگر حقوق انسانیت میں دوسروں سے بالا تر نہیں تھے، ہندو مذہب سے تو مجھے واقفیت نہیں مگر اسلام میں محمد رسول اللہ کی زندگی خود انسانی مساوات و اخوت کا بہترین پیکر تھی۔ تم انسانیت کا درو اپنے دل میں رکھنے والے کو کہتے ہو کہ وہ اپنے کو دوسروں کا شکیبار سمجھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم انسانیت کے مفہوم ہی سے نہیں واقف ہو۔ اندرا۔ تعلقدار اور پھر اودھ کے تعلقدار کا کیا کام؟ انسانیت کے مفہوم سے کیسے واقف ہو سکتا ہے؟

سریندر۔ جواب دے نہ بن پڑا تو امیروں اور تعلقدار کو گالیاں دینے پر اتر آئے۔ (ہنسکر) اچھا چھوڑو اس قصہ کو، کچھ اور مزے کی باتیں کرو۔

جھیلی۔ میں تو خود تم ایسے کوڑ مزے بحث کرتے گھبراتا ہوں۔ خدا خدا کہے جان بھی۔

(۴)

اسی طرح سے دلچسپیوں اور دلغریوں سے بھرے ہوئے یہ دو سال بھی گزر گئے جھیلی نے اندرا سے کہا کہ شادی یہیں کر کے دہلی چلیں تو اچھا ہو گا۔ اندرا نے کہا کہ ہنری ٹون بھی یہیں منانا چاہیے۔ ہر حال چند دوستوں کے جسرٹ میں دونوں رشتہ نکاح میں وابستہ ہو گئے۔ حکم نیکو نے دونوں کو دعائے ترقی دی۔ شہر کے ہندو مسلمانوں نے سخت احتجاج کئے مگر جو عزم معمم کر چکا ہو وہ ان گیدڑ بمبکیوں میں کب آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ شانتی نیکین ایسے ادارے کے بھی چند اشخاص اس مبارک شادی کے مخالفت تھے،

مگر عزائم معمم کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی، ہندو مسلم پریس کے لئے تو گویا ایک شگوفہ بات آگیا۔ ساتھ ہی ساتھ ملک میں چند خیر مقدم کرنے والے بھی تھے، اخبار سے معلوم ہو کر ڈاکٹر جعفری نے جھیلی کو مبارکباد کا خط لکھا اور لکھا کہ اندرا کو لیکر فوراً اپنے آؤ۔ دیکھنے کو بیدھی چاہتا ہے۔ تمہاری والدہ کو بھیر رہے ہیں، اودھ سے بہت خفا ہیں۔ مگر میں انہیں سمجھاؤں گا۔ جھیلی نے جواب دیا کہ ہم معنی ٹون مناکرائیں گے، آپ والدہ سے کہئے کہ وہ تمہارے ڈر سے نہیں آتا۔ ایک اودھ ماد بعد ان کی ماسا جوش مارے ہی گئی، اس وقت واپس ہو گا، تو کوئی جھگڑا بکیر نہ اٹھے گا، ڈاکٹر جعفری نے بھی اس رائے کی تائید کی۔ شادی کو تین ماہ ہو گئے، ڈاکٹر جعفری کا خط آیا کہ تمہاری ماں کسی طرح نہیں سمجھتی۔ مگر ان کو بکنے دو۔ زیادہ سے زیادہ تم سے اور اندرا سے نہ بولیں گی۔ اب فوراً اپنے آؤ۔ جھیلی نے لکھا کہ چند روز میں واپس ہوں گا۔ آئینکی تمہارے اطلاع دیدوں گا۔

اس روز رات کو جھیلی نے کہا۔ اندرا پیاری جلد از جلد دہلی چلو۔ اندرا، تم نے ابھی سے زبردستی شروع کر دی۔ دہلی پہنچ کر اس میں اور ترقی ہو جائے گی۔

جھیلی۔ مجھے اس بارے میں زبردستی کرنے کا حق پیدا ہو گیا ہے، کیا میرے اس حق سے نہیں انکار ہے؟

اندرا۔ میرے ہی خلاف مجھی سے شہادت دیتے ہو، یہ دوسری زبردستی جھیلی۔ میں جھوٹی شہادت دینے پر تیار نہیں ہوں۔

اندرا۔ جھوٹی ہو یا سچی۔ میں شہادت دینے کی عادی نہیں ہوں۔ اچھا تمہیں کس طرح یقین ہوا کہ میں تمہارے اس حق کو مان لوں گی۔ اگر میں انکار کر دوں تو؟

جھیلی۔ میں براہد ہو جاؤں گا۔ میرے دل کی بستی ویران ہو جائیگی۔ اندرا تو میرے ساتھ زبردستی کرنے میں تمہارے دل کی بستی آباد ہے؟

جھیلی۔ مگر یہی حق نہیں میرے اوپر حاصل ہے، پھر شکایت کیسی؟ اندرا۔ مگر میں تو اس حق کا مطالبہ نہیں کرتی؟

جھیلی۔ یہ ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ میری محبت کا جذبہ تمہارے جذبہ محبت سے قوی تر ہو۔



اندرا۔ ابھی سے یہ شک اور ہدگانی؟

جیسی۔ اندرا پیاری! مجھے دق ذکر دو۔ خوش ہونے دو۔

اندرا۔ دہنکر اور جیسی کو لپٹا کر نہیں پیارے، میں نہیں کیوں دق کرنے لگی؟ پرسوں ہی دہی چلو۔

(کے)

دوسرے دن مات کو جب اندرا اور جیسی گلوں میں ماہیں ڈالے  
پوس دکنا میں کھوئے ہوئے تھے، اندرانے کہا۔ اگر اسی حالت میں مجھ سے  
تو میرا خاتمہ بالآخر ہو جائے گا؟  
جیسی۔ مگر میری حالت کیا ہوگی؟

اندرا۔ پیارے، محبت خود غرضی کا عطر و جوہر ہے۔ جب تہاری  
محبت میرے دل میں جوش مارتی ہے تو مجھے اپنی ذات کے ہوا کوئی ذات  
نہیں دکھائی دیتی۔ مجھے تہارا پیار کرنا نہیں اچھا معلوم ہوتا۔ جی چاہتا ہے  
خود ہی پیار کروں خود ہی لپٹوں۔ اس کیفیت میں جان کی طرف سے بے  
پردائی ہو جاتی ہے۔ جذبہ جان سے تھریک نہیں پاتا، خود اپنے میں نئی  
جان پیدا کر لیتا ہے، جان تنگ جاتی ہے تو اپنی باگ جذبہ کے بات  
میں دیدیتی ہے، جذبہ جان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جان ایک بے حقیقت  
شے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک عجیب وقت ہوتا ہے۔ ایک نیا عالم سامنے آتا  
ہے۔ ایک نہایت پر کیفیت عالم۔ اگر موت اس عالم میں ہو جائے  
تو یقیناً خاتمہ بالآخر ہوگا۔

جیسی اتم کیفیات، اندر دنی کی تحلیل و تجزیہ خوب کرتی ہو۔ مگر عالم بڑی  
کو قبول جانا اس تحلیل و تجزیہ میں کہاں تک صحیح ہے؟

اندرا۔ عالم بیرونی کا تصور کیفیت اندرونی کا تابع ہے۔  
جیسی۔ کیا تم بودے لیر اور رانچو کی پیرو ہو۔ اس نئے اسکول کی طرح  
عالم کی کسی چیز کی صورت و حقیقت معلوم کرنے کی جستجو نہیں کرتیں۔

اندرا۔ میں کسی شخص اور کسی اسکول کی پیرو نہیں۔ پیروی کرنا اپنے بات  
سے اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈالنا ہے۔ میری جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اسی کی  
قائل ہوں۔ نظام قائم کرنا متحرک زندگی کو ساکن کر دینا اور اس میں جمود پیدا  
کر دینا ہے۔ میں اس سے بھتی ہوں کہ فلاں مذہب ہے، فلاں مذہب وہ  
ہے۔ خیال کو فریم میں لٹا کر بند کرنے سے میرے آگ لگتی ہے، کیونکہ یہ ہے،

اپسیریزم سے کہتے ہیں۔ لبرلزم کے مقابل ایک دوسرا نظام خیال کنسروٹیزم  
ہے۔ میری طبیعت ان آدموں سے سہاگتی ہے۔ پیغمبر مذہب بنایا کرتے تھے  
یہ عالم از میں بنانے لگے ہیں۔ ان کی پیروی بھی مذہب کی پیروی سے کم  
نہیں ہے، انسانی زندگی خانوں میں بند نہیں کی جاسکتی۔ اصل پوجہ تو کوئی  
شخص بھی کسی مذہب کا پابند نہیں۔ ہاں تو بودے لیر اور رانچو کی شاعری  
فطرت پرستی اور خیال پرستی کی شاعری نہیں ہے۔ کیفیت پرستی کی شاعری  
ہے، مرکز عالم انسان کے لئے انسان ہے، شاعر کو صرت ان تحریکات سے  
غرض ہے جو اشیائے عالم کو دیکھنے یا تجربہ کرنے سے اُن کے دماغ میں پیدا  
ہوں۔ حقیقت عالم جب غرض اور سائنس کی کوششوں سے نہ معلوم ہو سکتی  
تو شاعری کیا معلوم کرے گی، تم مجھے اسی لئے تو عزیز اور پیارے ہو کہ تمہارے  
پاس مجھ سے میری قلبی کیفیات میں بل چل جاتی ہے، اگر میں تہاری تحلیل  
اور تجزیہ کرنے لگوں گی اور تہاری حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کروں گی تو  
میرا مزہ بھی خاک میں مل جائے گا اور تہاری حقیقت بھی ذرہ برابر نہ معلوم ہوگی۔  
جیسی۔ اگر یہ بات ہے تو اس قصہ کو جانے دو۔ میرے گلے لگ جاؤ، لیکن  
یہ معاہدہ ہمارے تہارے درمیان ہو جائے کہ مزے کے وقت ہم دونوں  
میں سے کوئی مرے نہیں۔ مجھے نفسی، مرن اور موت سے نفرت ہے، ہم تم  
جب دنیا میں نہ رہنا چاہیں تو عالم بالاک طرف اُٹھتے چلے جائیں اور پھول کی  
خوشبو کی طرح ہوا میں غائب ہو جائیں۔ یہ طیب اور اُن کے واقفین اس کے  
بعد تجزیہ و تحلیل کے سامان غفل دینے والے اور گورکن، سب کتنی نفرت انگیز  
چیزیں ہیں۔ تصور سے بدن پر روٹیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زندگی سے انکا  
تعلق کیوں ہے؟ اس کا خیال دل بٹھا دینے والا ہوتا ہے۔

اندرا۔ مگر یہ مشین کسی نہ کسی دن بند ضرور ہو جائے گی۔  
جیسی۔ لیکن آج اس لطف میں تو اس بات کو میں نہ مالاں گا۔ ہم ہمیشہ  
ہمیشہ ذلہ اور تندرست رہیں گے۔ اندرا اور جیسی جب تک ہندوستان  
باقی ہے اُس وقت تک باقی رہیں گے۔ میں، میری اندرا اور میرا ہندوستان۔  
اس تثلیث کا میں قائل ہوں۔ عالم کی حقیقت پس اسی تثلیث میں ہے،  
اندرا۔ میرے اور تہارے خیالات کتنے یکساں ہیں گو کہ اذکار بیان  
میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جیسی تم بہت پیارے ہو۔ (گلے لپٹ کے  
پیار کرنے لگتی ہے۔)



(۵)

اس کے بعد میرے روز اندرا اور حبلی شام کی گاڑی سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے اسٹیشن سے حبلی نے ڈاکٹر جعفری کو اپنے آنے کا تار دیدیا۔ جسے چنگے تار نے پر ڈاکٹر نے بیوی سے کہا کہ حبلی اور اندرا صبح نو بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔

بیوی۔ اُن سے اگر تم کو اتنی محبت ہے تو الگ رکھنے کا سامان کرو۔ میرے گھر میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے۔

ڈاکٹر۔ بڑی کٹر ہو تم خدا کی قسم۔ رکھنے کی مانتا بھی نہیں۔ ہی۔

بیوی۔ میرے بدست تم کو مانتا ہو گئی ہے، اُس نے میرا عجیب کچھ اپنایا ہے۔ خاندان بھر کے لئے نیشنل سنا پڑتے ہیں۔ نا بابانا، میں ایسی مانتا نہیں رکھتی، اُس کا نام سنکر میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے، کجبت، ننگاب خاندان۔

ڈاکٹر۔ افوہ، اتنی عصبيت۔

بیوی۔ نہیں تو مذہب چھوڑ دوں۔ ریت۔ ہم کو مالائے طاق رکھوں۔ میں نالائق بیٹے کی خاطر اپنی عقلمانی غلطی خراب کروں گی۔

ڈاکٹر۔ تم مذہب سے واقف ہی کب ہو۔ ریت رسم جانتی ہو بس۔ بیوی۔ اسے تو جتنا چپ رہو آتا ہی دباتے ہیں۔ اب ہم مسلمان بھی نہیں رہے۔ پھر کون خدا کا سنوارا مسلمان ہے! دیکھو جی، اب کی تو کہا، اب نہ کہنا۔

ڈاکٹر۔ خدا کی قسم جاہل بیوی مذہب الہی ہے۔ ہندو عورتوں کو دیکھو۔ بیوی۔ ہاں ہاں عیاشی اور عاشق مزاجی ہی کے لئے تو کانگریسی ہوئے تھے۔ لو بیوی اب مسلمان پر وہ نشین پھو بیٹوں سے یہ نوئی کافر کچی ہندیاں جن کو نہ کچھ جیسا ہے نہ شرم، اچھی ہو گئیں۔

ڈاکٹر۔ اچھی تم تو بید کو زعفر ہو، اگر ایسا ہی ہے تو تم بیٹے ہو سے بات نہ کرنا۔ رہا یہ کہ میں اپنے گھر میں نہ رکھوں نامکن ہے۔

بیوی۔ اگر ایسا ہی ہے تو میری صورت نہ دیکھو۔

ڈاکٹر۔ دیکھو جی، تمہاری چہالت اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ میں جو جاہلوں کا وہ ہو گا۔ تم میری بیوی ہو، مالک نہیں۔ تم کو میرا حکم ماننا پڑے گا۔

بیوی۔ اُنے وہاں سے حکم کی دھونس بٹھاؤ میں نے آج تک اپنے ماں باپ کی تو بات سنی نہیں۔ تمہاری بہت مسخوں لگی؟ ڈاکٹر۔ ماں کے قدموں کے نیچے تو جنت ہے۔ یہی تم مذہب سے واقف ہو۔ جاہل اجہل۔

بیوی۔ (بجد غصہ میں) دیکھو ذرا زبان سنبھال کے بات کرو۔ برابر بکے جا رہے ہو۔ میں جب تک نہیں بولتی ہوں تمہی تک۔ ڈاکٹر۔ خیر، میں کچھ نہیں جانتا، اندرا اور حبلی ہیں اسی گھر میں رہیں گے۔ بیوی۔ حبلی تک تو میں راضی ہوں۔ مگر وہ ہندو نوئی کافر فی بیٹا ہرگز قدم نہیں رکھ سکتی۔

بیوی۔ یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔

اب بہت زور دھور کی لڑائی ہونے لگی۔ اندرا اور حبلی حبلی شین پر اترے تو انہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ حبلی نے کہا معاملہ دیگر گوں معلوم ہوتا ہے، وہ نہ آتا جان لینے ضرور آتے، خیر، گاڑی کر کے دولوں ایوان جعفری پہنچے۔ اندر سے شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گاڑی کو کھڑا رکھنے کا حکم دے کے حبلی اندرا کو لے کے اندر گیا۔ باپ دیکھتے ہی دوڑ کر پہلے اور بیٹے سے لپٹ گئے۔ ماں نے کہا "ارے نکل نکل چھو کر۔ یہاں تیرا کوئی کام نہیں۔"

اندرا (دوڑاؤ ہو کر)۔ اماں جان، اب تو میں آپ کی بہو ہوں۔ خدا کا رحم کیجئے۔ دنیا میں سوائے آپ کے میرا اور کون بزرگ ہے۔ آپ ہی اپنی پناہ میں مجھے لے لیجئے۔

حبلی کی ماں (لکڑی اٹھا کر اور اندرا کو دو تین مرتبہ مار کر) جل نکل نوئی کافر فی میرے گھر سے۔

حبلی۔ چلو اندرا چلو۔ (ماں سے) اماں جان، اب آپ میری صورت کبھی نہ دیکھئے گا۔ انشرا انڈر۔

ماں۔ حبلی تھے جنت نصیب نہیں ہوگی، ماں کو خفا کر کے۔ بیٹا اس ہندوئی کو چھوڑ دیکھ تو کیسی ننھی ننھی چاند سی دو لہن بیاہ کے لاتی ہوں۔ حبلی۔ بس چپ رہیجئے، اماں جان!

ماں براہِ رنجی چلائی رہیں۔ حبلی اندرا کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلا گیا، پیچھے ڈاکٹر جعفری گئے۔ باہر ڈاکٹر حبلی سے بولے "بیٹا، تم تاج محل پہنچے"

سینے سے زور سے لپٹ جا۔ میں تجھے بھید چاہتی ہوں۔ اندرا بیٹی! جمیلی اور اندرا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ اندرا زور سے جمیلی کی ماں کے لپٹ گئی۔

جمیلی کی ماں (اندرا سے دودھ کا ایک گلاس لاکر) بے بیٹی! یہ دودھ پنیے۔ ہمارے بچاں رسم ہے کہ پہلے پہلے پنیے آتی ہے، تو دودھ پلاتے ہیں۔ اندرا نے شکریہ کے ساتھ دودھ پی لیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جمیلی کی ماں بھی سرور تھی۔ ذرا دیر میں اندرا نے کہا کہ اُس کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ لمحہ کے لمحہ میں وہ جمیلی کی طرح تڑپنے لگی جمیلی از حد پریشان ہو گیا، وہ ڈاکٹر کو ٹیلیفون دینے جا ہی رہا تھا کہ اندرا کی رُوح غصے غصری سے پرواز کر گئی۔ جمیلی ہائے اندرا کہہ کر اُس کی لاش پر گر گیا جعفری ہسپتال کا ہو گیا تھا۔ اُنھانے بڑھا تو جمیلی بھی باطل سر دھتا، اُس نے اپنا سر پٹ لیا۔ اپنی انگوٹھی کا ہیرا چالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی تڑپ تڑپ کر با بخت ہو چکا تھا، قینوں لائیں ایک عجیب بے نیازی کی شان میں پڑی تھیں، فضا پر اُداسی چھا رہی تھی۔ گھر بھر کے ملازم کھڑے حیرت زدہ سے ہو گئے تھے، اندرا اور جمیلی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، اُن کے لب ایک دوسرے میں چوست تھے، ایک دائمی ہنسی اُن کے معصوم چہروں پر کھیل رہی تھی، فضا باطل سائت و صامت تھی کہ جمیلی کی ماں کی دلدوز چنجوں نے فضا کے سکوت کو دہم دہم کر دیا۔

## پیغام

مظلوم کو غرقِ صہبائے گلغام ہیں کرنا ہے اٹھو

لبریز لہو سے ظالم کے اک جام ہیں کرنا ہے اٹھو

جو مذہبوں سے حل ہو نہ سکیں اُن گتھیوں کو سلجھانا ہے

جو کام خدا سے ہو نہ سکا وہ کام ہیں کرنا ہے اٹھو

پیش رو

میں شہر جاؤ۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ کل تک کوئی اچھا بھلا ڈھونڈ نہیں گئے۔ میں بھی اب ہمارے ہی ساتھ رہوں گا۔

جمیلی۔ بہت اچھا بادا جان!

ڈاکٹر۔ اندرا بیٹی! معاف کرنا۔ تم جانتی ہی ہو کہ جاہل متعصب عورتیں کس ٹائپ کی ہوتی ہیں۔

اندرا۔ جی بابا جان، اس میں معافی کی کوئی بات ہے، اہل جان ابھی بید غصہ میں ہیں۔ میں چند روز بعد اُن کو منسنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹر۔ آمین۔

تینوں آدمی تاج محل ہوٹل روانہ ہو گئے۔ بیوی کو معلوم ہوا کچھ نہیں بولیں۔ دو تین گھنٹہ کے بعد جب ذرا دماغ درست ہوا اور واقعات پر غور کیا تو خیال کیا کہ یہ تو بڑا ہوا کہ میاں صاحب بھی بیٹے اور بہو کے ساتھ چلے گئے۔ ہندوستانی سماج بڑی خطرناک ہے۔ جاہل عورتیں مکر و فریب کے ہونے اور چالاک میں بھید مشاق ہوتی ہیں۔ خدا ان کے تریا چر سے بچا۔ ایک مکر و فریب سے پراسیکم اُس کے دماغ میں آئی۔ سوچا کہ کیوں نہ اندرا کو ختم کر دوں۔ بیٹے کو وقتی رنج ہو گا۔ باپ سنبھال لیں گے۔ چند ماہ بعد جسے بدل مل جائے ہی گا۔ آخر کو ماں ہوں اُس کی۔ سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ یہ بھی نہ خیال کیا کہ بٹیا تعلیم یافتہ ہے۔ وہ کہاں ملٹ سکتا ہے، یا اندرا کے قتل سے پولیس کچھ ایکشن لے۔ جاہل عورت تو مکاری کرنا جانتی ہے۔ اُسے اُس کے نتائج سے کیا مطلب۔

بہر حال شام کو اُنھوں نے بیٹے کے نام اپنے بچاں کے منشی سے لکھوا کر ایک رقعہ بھیجا کہ بیٹے میں اپنے کئے پر بھید نامدم ہوں۔ اندرا پھر بھی میری بہو ہے۔ جو جو نام تھا ہو چکا۔ اب میرا بھیتا نابکار ہے، اپنی بوڑھی ماں کے کچھ سے تم اور اندرا دونوں آکر لگ جاؤ، تاکہ میں اپنی بے اعتنائیوں اور بیجا گھڑکیوں کا پتلا اتار سکوں۔

رقعہ پہنچا تو ڈاکٹر جعفری، جمیلی اور اندرا سب بھید خوش ہوئے۔ ڈاکٹر بولے کہ سچی ماں کی ماتا کہاں تک ٹھنڈی رہتی۔ تینوں فوراً وعدہ اسباب کے ایوان جعفری پہنچے۔ مکان میں داخل ہونا تھا کہ دوڑ کر جمیلی کی ماں نے اندرا کو لپٹا لیا۔ بیٹا مجھے معاف کر۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی ذہادیتیاں کی ہیں۔ تو میری بیوہ ہے، اپنی بوڑھی ساس کی باتوں کا کچھ خیال نہ کر۔ بیٹی، میرے

# لفظ آزادی

(یہ نظم محض اپنی معنوی حیثیت سے شائع کی جا رہی ہے)

نظر آؤ فستیر اور ابق عالم دیکھنے والے  
یہی اک لفظ بنیادی ہے تعمیر حکومت کا  
اسی اک لفظ میں دعوت ہے غور و فکر کی تجھ کو  
یہی اک لفظ فشی ازل کا جو عطیہ ہے  
یہی اک لفظ جو دیباچہ ہستی کا عنوان ہے  
یہی اک لفظ جو آئینہ انسانی شعائر کا  
یہی اک لفظ باعث ہے زبان بے زبانی کا  
یہی اک لفظ جو ہے خاتمہ قید غلامی کا  
یہی اک لفظ ہم معنی ہے جو خود اختیاری کا  
یہی اک لفظ جو ضامن ہے انصاف و عدالت کا  
یہی اک لفظ جس پر خواجگی تیور بدلتی ہے  
یہی اک لفظ جو ہے رُوحِ آئینِ جہانداری  
یہی اک لفظ جو بیدار کن جذبات رکھتا ہے  
یہی جس سے غرورِ شہر یاری ٹوٹ جاتا ہے  
یہی جس سے غلام اپنی جگہ میاں ہو جائیں  
یہی اک لفظ بے معنی ہے ہندوستان اب ہے  
سمجھ اس لفظ کو ہمارا یہ ہے لفظ آزادی

جماعت در جماعت ربطِ باہم دیکھنے والے  
اسی اک لفظ میں نقشہ دستانِ سیاست کا  
اسی اک لفظ میں گویا ہے درسِ آگہی تجھ کو  
اسی اک لفظ پر شاہوں کا استادانہ قبضہ ہے  
یہی جس کے عمل کی فطرتِ آداد خواہاں ہے  
یہی اک لفظ گنجینہ حقائق کا بصائر کا  
اسی سے ناطق ہے بند زعمِ حکمرانی کا  
یہی عنوانِ مقصد ہے محبت کے پیامی کا  
یہی جو ہے خلاصہ ہند کی مقصد پراری کا  
یہی مفہوم رکھتا ہے مساوات و اخوت کا  
یہ جس سے بیسی اعزاز کے سانچے میں ڈھلتی ہے  
اسی پر مشرق و مغرب میں ہے اک کشمکش جاری  
یہی جو اپنی تہ میں حشر احساسات رکھتا ہے  
یہی جس سے کہ پابندِ غلامی چھوٹ جاتا ہے  
یہی جس پر ہزاروں عہد نامے چاک ہو جائیں  
یہی جس میں کہ پہناں دفتر معنی و مطلب ہے  
سیاست و جماعت کو ہے جس پر زعمِ استادی



جانتا تھا اور فن خوشنویسی سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ اُس کی طبیعت میں اُسودگی اور قناعت اس درجہ تھی کہ نواب سعادت علی خاں کی طلبی کے باوجود کھٹو جانے سے اُس نے انکار کر دیا، اور اسی طرح راجہ صاحب بھرت پور کے یہاں بھی نہ گیا۔

اُس کے مزاج میں متانت اور شوخی اور طبیعت میں نقیض بدرجہ اتم موجود تھا، خلق و انکسار میں وہ پیش تھا اور یکسویں کی خبر گیری اور غریبوں سے ہمدردی اُس کا شعار تھا، وہ نہایت ہی صحبت پسند تھا، اور مختلف قسم کے لوگوں سے میل جول رکھتا تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ سب اُس کا انتقال ہوا تھا تو اُس کے جنازے میں مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں ہندو بھی شریک تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہزاروں میں ہمیشہ بے در بے شریک ہوا کرتا، اور اُن کے میلے ٹھیلوں کی خوب سیر کیا کرتا، اپنی وجہ کی بنا پر اُس کا تجربہ بہت وسیع تھا، اور بقول شمس پیر عقلمند پتھرے وعظ سنتے ہیں، اور ہر چیز سے اچھائی حاصل کرتے ہیں۔ اُس نے اپنی اس طرز معاشرت کا بہت بڑا فائدہ اٹھایا تھا، جس کا ثبوت اُس کے کلام سے ملتا ہے، اُس نے معمولی معمولی باتوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ بغیر تعریف کئے رہا نہیں جاتا۔ اُس کی معلومات غیر محدود، اُس کا خزانہ لغات غیر مختوم اور اُس کی صفائی بیان دلکش ہے، وہ دوسرے ہندوستانی شعراء کی طرح عاشقانہ نغمے نظم نہ کرتا تھا، اُس کی رگوں میں خاص ہندوستانی طعن و طعہ رہا تھا، اُس کے قلب میں وطن پروری کی آگ شعلہ تھی، چنانچہ اپنے ملکی لوگوں کی معاشرتی و ذہنی ترقی کا خیال اُس کی حب الوطنی کا بین ثبوت تھا، شاعری میں وہ کسی کا شاگرد نہ تھا، مگر اُس کے بہت سے شاگرد تھے، اُس کی نظمیں حقیقت میں ایک نگار خانہ ہے جس میں کھیل کود، میٹھ و آرام، مسرت و شادمانی، غم و الم، دکھ درد اور ہندوستانیوں کے دل و دماغ کی زندہ و متحرک تصویریں نظر آتی ہیں۔

اس کا مہیا ر شاعری نچرل تھا، اور معاصر ہندوستانی شعراء سے اُس کا رنگ بالکل ہی جدا تھا، وہ یورپ کے شعراء کی طرح مبالغے اور صنعت سے بیزار تھا، اور سیدھی سادھی باتیں اور حقیقی کیفیتیں صاف اور سہری زبان میں نقل کیا کرتا تھا۔ مناظر قدرت، واقعات عالم، اور جذبات انسانی وغیرہ اُس کی انگلیوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں چنانچہ نظرت نگاری کی حیثیت

سے بجا طور پر وہ ہندوستانی ور ڈسور تہ کہلانے جانے کا حق ہے۔ نیز اُس کی تصوف و شاعری نے اُس کو اردو زبان کا امیر خسرو بنا دیا ہے اور اس کا ایسا گہرا رنگ تھا جو اُس کے تمامی کلام پر حاوی ہے اور بقول سہ بندہ عشق شدی ترکہ نسب کن جاتی

کاذریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیت

وہ مذہبی تعصبات اور نسلی امتیازات کا حصّہ کھالت ہی نہ تھا، بلکہ اس قسم کی باتوں کو نہایت نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ہندو اُس سے اس قدر غلط ملطہ رہتے تھے کہ وہ صرف اُن کے رسم و رواج، ان کی زبان، اُن کے خیالات ہی سے نہیں بلکہ اُن کے معتقدات تک سے کما حقہ واقف ہو گیا تھا، جس کو اُس نے اپنے کلام میں ایسی خوبی اور صحت کے ساتھ اس قدر دلچسپ طریقے پر بیان کیا ہے کہ اُس کی ہمدانی میں مطلق شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

دوسرے مذاہب یا اُن کے لوازم، پرہیزی اڈانا تو درکنار وہ کبھی اُن کو حقارت کے ساتھ بھی نہ دیکھتا تھا، جو کہ ہمارے ہندوستانی شعراء میں صرف کیا ہی نہیں بلکہ نایاب ہے، وہ مسلمان یا ہندو نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ایک ہندوستانی شاعر تھا، اس نے ایسے الفاظ کو جن میں ہمارے شعراء ادنیٰ انداز میں کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے کلام میں جگہ دی اور اپنے معاصرین کو دکھلا دیا کہ ان میں کسی کیسی خوبیاں پوشیدہ ہیں، جن کو شاید ظاہر میں نگاہیں نہیں دیکھ سکی تھیں۔

اُس کی ہمدردی اور محبت صرف بنی نوع انسان کے ساتھ محدود نہ تھی بلکہ حیوانات کے علاوہ غیر ذی روح اشیاء سے بھی وہ ایک خاص اُنس و محبت رکھتا تھا، چنانچہ اُس کی نظمیں ریچھ کا بچہ۔ گھری کا بچہ۔ برن کا بچہ۔ اور طبیبوں کی لڑائی وغیرہ جانوروں کے متعلق نیز روٹی وال اور تر توڑ وغیرہ بے جان چیزوں کے متعلق نہایت دلچسپ اور جڑیا سے اس قدر ملو ہیں کہ پڑھنے والے کو شاعر کی کما حقہ واقفیت اور ہمدانی پر تسلیم خم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ بڑے تو بڑے چھوٹے بچے تک اُس کی چھوٹی چھوٹی نظمیں مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، بولی، دیوالی، بسنت اور عید وغیرہ پڑھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں۔

وہ مثل گرو نانک کے تارک الدنیا فقیر اور سادھو منس شاعر تھا، اُس کی

و طبع انگریزی، آنا و خیالی۔ ہم گہری اور بے نقیبی ایسی خصوصیات ہیں جو اُس کے کلام کو تمامی شعر سے اُس کے کلام سے ممتاز کرتی ہیں۔ اُس کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی وحی کامل دنیا کی بے ثباتی پر چڑھ کر غلط ہے۔ ہا ہے، اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم سے رہا ہے، جو ہر طور پر ذائل و معکوس سے باطل ہی پاک و صاف ہے۔ اُس کی بعض ایسی دلچسپ اور موثر نقیص بھی ہیں۔ جن کے اشعار اکثر فقیر اور سادہ و صوفیانہ خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کر سننے والوں کے دلوں کو -----

----- نہایت درجہ موثر اور متاثر کر دیا کرتے ہیں۔ اُس کی تمثیلیں نہایت خوب اور بہت ہی دلکش ہیں۔ اُس کی نقیص موت اور بجاہ نامہ نہایت ہی مشہور ہیں۔ جو مفرد اور سرکش لوگوں کے لئے تازیانہ صبر کا کام کرتی ہیں۔ ان نظموں میں دنیا داروں کو وہ آگاہ کرتا ہے، کہ دنیا فانی ہے اس کو چھوڑو۔ اس کے لذات کی طرف سے منہ موڑو اور عاقبت کی فکر کرو۔ چنانچہ اس معانی میں اس کا مقابلہ سعدی علیہ الرحمۃ سے خوب ہو سکتا ہے، کیونکہ دونوں کے کلام صاف، سلیس اور تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں خند صاحب و دوح مالک سہ کے مصداق مغرب میں ہمیشہ ہی دستور رہا ہے کہ کسی کے کلام کی تعریف نہیں کی جاتی جب تک کہ اس میں کسی قسم کا کمال نہ پایا جائے، چنانچہ اُنہوں نے نظیر کے کلام کو بھی پرکھا اور اپنی قیمتی اور بے لوث رایوں کا اعلان کر دیا۔ بڑے تعجب اور لطف کی بات ہے کہ میں پر ہمارے ہندوستانی شعرا و غلام گوئی اور عامیانہ و سوجیانہ الفاظ کے استعمال کا الزام لگاتے ہیں۔ اُسی شاعر کو ڈاکٹر فیض حقیقی ہندوستانی شاعر کہتا ہے، اور اُسی کے اشعار کا بیشتر حصہ اپنی مشہور و معروف لغت میں بطور سند پیش کیا ہے۔

حافظ از یاد خزاں در چمن دہر مر سنج

فکر معقول بنسیر ما گل بے خار گنجا

ڈاکٹر موصوف نے اپنی لغت کے دیباچے میں جو کچھ اس حقیقی شاعر کے متعلق حوالہ قلم کیا ہے اُس کا مختصر ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

قد رگو ہر شاہ داند یا بد اند جو ہری

۔ شعرا ہند میں صرف نظیر اکبر آبادی ہی ایک ایسا شاعر ہے جو مغرب

کی حقیقی شاعری کے قائم شدہ معیار پر پورا اترتا ہے اور وہ صحیح معنوں میں

شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہ ہندوستانی جن کے نزدیک

معانی سے زیادہ الفاظ کی بندش اہمیت رکھتی ہے، اس کو شاعر بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ لیکن اس سے اس کی شہرت اور مقبولیت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہو سکتی، کیونکہ اُس کے اشعار تو مقبول عام اور زبان و مطلق ہر جگہ ہیں۔ اور اُس کی ذات ان کل ذہنی و جذباتی خیروں کی حامل ہے جو ایک پختہ کار شاعر میں ہونی لازمی ہیں۔

اُس کی نظموں میں اُس کی شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہے۔ اور اُس کے اشعار اُس کی سوانح حیات کا کامل مرقع ہیں۔ وہ فی الحقیقت ایک آزاد مرد اور تارک الدنیا سیراگیتا، جو تقدیر کی عنایات اور حوادث روزگار سے باطل ہی ہے پرواہ نہ کرتا، خوش متبع اس کو سرور یا نینبہ اُسے ہرگز ملول نہیں کر سکتے تھے اور وہ اپنی کھان میں ہمیشہ مست رہا کرتا تھا۔

وہ بڑی حد تک ایک نئی طرز کا نمونہ تھا، اور اُس کی جولانی طبع اُس کے مختلف مضامین سے آشکارا ہے۔ اُس نے ایسا ایسا چیزوں پر نظریں لکھی ہیں جن پر ہندوستان کے کسی دوسرے شاعر نے اب تک طبع آدھائی نہیں کیا ہے۔ مگر افسوس کہ ہندوستانی اپنی جہالت کی وجہ سے انہیں معافی کی بنا پر اس کو شاعر تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نظیر شاعر کہلانے جیسے کا ہرگز مستحق نہیں ہے، کیونکہ اُس نے تو آنا، دال، روٹی، مچھ اور چھپر وغیرہ جیسے متبذل مضامین کو قلم کیا ہے، اور عامیانہ و سوجیانہ الفاظ کی آمیزش سے اردو زبان کو غارت و برباد کر دیا ہے۔

واقعی نظیر جیسے شاعر بے بدل نے اپنی مادری زبان میں جو احسن اکتفا کر رکھے ہیں۔ اُس نے اپنی نظموں میں وہی کچھ کیا ہے جو کہ چتر اور شکسیر جیسے ماہرین ادب نے اپنی زبانوں میں کیا ہے، اُس نے ہندی الفاظ کو اردو زبان میں اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ اس سے بہتر صورت خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ اُس نے نئے نئے الفاظ اور بندشیں بڑی جرأت اور خود اعتمادی سے استعمال کر کے اردو زبان کو مالا مال کر دیا ہے

اُس کا کلام کلیات نظیر کے نام سے شائع ہو چکا ہے، نیز محترمی سید عابدین ساکن شاہ گنج اگر اُس کا بقیہ غیر مطلوبہ کلام جمع کر رہے ہیں، اور اس کی چار جلدیں مرتب کر چکے ہیں، چنانچہ یہاں پر اُس کے چند اشعار بطور

منزل نقل لئے جاتے ہیں ۔

اچھا بسی آدمی ہی کہا تاکہ لے لے لے اور سب میں جو بڑا ہے سو ہے وہی آدمی

یہ کچھ بہرہ رو پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی  
بکھرنا، سہرنا، لہلہانا، پھر کسٹ بانا

تمہی نرگ جسے کہتے ہیں انوس انوس ایک ان سب کے تئیں دہریہ کھانا ہوگا  
دیکھ لے اس چین دہر کو دل بہر کے نفیر پھر ترا کا ہے کہ اس باغ میں آنا ہوگا

مردوزن بفل و جواں، نر و دکلاں، پیر و فقیر  
جتنے عالم میں ہیں محتاج و گدا، شاہ و وزیر  
سب کے دل ہوتے ہیں پھندے میں خوشا، کے اسیر

تو سہی دانش بڑی بات یہ کہنا ہے نفیر  
جو خوشا کے خلق اس سے سدا راضی ہے  
مد تو یہ ہے کہ خوشا سے خدا راضی ہے  
اپنی عمر کے آخر پانچ سال تک ہندوستان کا وہ مایہ ناز شاہ بیت ہی  
کبر سنی اور ضعف کے باعث خانہ نشین ہو گیا تھا۔ مگر کے اندر داناں میں

قیام رہتا تھا، صحن میں اتر جانب نیم اور پیر کے درخت تھے جن کے سائے  
تھے کسی کسی بوری یا بچا کر بیٹھا کرتا تھا، یہاں تک کہ تقریباً سو سال کی عمر  
میں فالج کے مرض میں مبتلا ہو گیا، جس کے باعث زمان ماؤف ہو گئی تھی،  
اور آخر کار سو برس اگست ۱۸۳۳ء مطابق ۲۶ دین صفر المظفر ۱۲۵۲ھ  
کو انتقال ہوا اور اپنے ہی صحن میں نیم کے درخت کے نیچے مدفون ہوا۔ پختہ  
قبر موجود ہے۔ جس پر متذکرہ درخت سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اور جہاں

اب تک ہر سال ۲۶ صفر المظفر کو عرس ہوا کرتا ہے ۔

ہے دلا کس کو : دام اس گردش افلاک میں  
خاک کے پتے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں

آخر میں یہ سچی عرض کر دینا سچا نہ ہوگا کہ ہندوستان کی وہ بے بدل  
ہستی جس نے اپنے حکیمانہ و فلسفیانہ کلام کے ذریعہ اپنی زبان، ملک و  
قوم کی درستی و ترقی کے لئے جان و دل سے کوشش کی ہے۔ آج ہم میں  
موجود نہیں ہے، تاہم وہ اپنے پُر اثر و اعطاء کلام کی وجہ سے یعنی طرد  
پر زندہ جاوید ہے، کیونکہ

ہرگز نیرد آنکہ دلش زندہ شد عشق  
ثبت است بر جریدہ عالم دوام

## کسی کی آمد

وہ دیکھو میری ----- نور بر ساقی ہوئی آئی  
وہ آئی، رنگ و بو کی ایک دنیاے حسین لیکر  
وہ انداز حسین اُس کا، وہ روئے آتش اُس کا  
وہ چھائی اک بہار تازہ بکر میری ہستی پر

نگاہ شوق جس کی منتظر تھی ایک مدت سے  
وہ آئی اور میرے دل کو گرماتی ہوئی آئی





# شیدا و سلیم

(۱)

سلیم کی نگاہ میں مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اور کالج کی تعلیم نے تو اس کے اس جذبہ کو اور بھی ابھار دیا تھا۔ لذتِ عمر سے وہ قطعاً نا آشنا تھا، اُس کی زندگی ایک رنگین زندگی تھی، جو فطری رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔ اُس میں محبت کے تاثرات بھی تھے۔ جس کا وجہ ایک بالغ نظر نوجوان کے دل کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتا ہے۔ شباب جب اپنے نکھار کے ساتھ ایک ناقابلِ اُٹھان حشر دنیائے دل میں پیدا کر دیتا ہے، تو عشق ایک انگڑائی لے کر دو ٹوٹے روٹے کو چونکا دیتا ہے۔ یہی کیفیت سلیم کی بھی تھی۔

اُس عشق کا اندھا دیوتا، یہ نہیں جانتا کہ اُس کے دہریں بچے ہوئے تیرکون سے دو دلوں میں پیوست ہو رہے ہیں۔ وہ تیر چلائے جاتا ہے۔ اُسے جوانی کا علم ضرور ہوتا ہے۔۔۔۔۔ نہ جانے کیسے۔۔۔۔۔ لیکن اعلیٰ وہ مذہب و ملت کی تفریق کو ناجائز قرار دیتا ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ سلیم کی سرشت میں بھی یہی راز نہاں تھا، اور جس کے عقد سے وقت کے ساتھ ساتھ کھٹے چلے گئے۔ اور جب وہ نیک و بد سوچنے کے قابل ہوا تو اُس نے اپنے دل کے آفت پر ایک غیر مذہب و شیعہ کو جلوہ گر پایا۔ بچپن میں لاگ سی تھی۔۔۔۔۔ جو جوانی میں آگ بن گئی۔ وہی جو کل تک آنکھ چوٹی کھیلے تھے، آنکھ ملاتے ہوئے شرماتے گئے۔ دم بھر الگ رہتے تو اُداس ہو جاتے۔۔۔۔۔ خدا جانے کیوں۔۔۔۔۔ کچھ تھا ضرور جو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ جس کا احساس رفتہ رفتہ پیدا ہو چلا تھا، اور اب وہ سوسائٹی اور وقت

## سجاد حیدر ملیح آبادی

کی ضرورت کی بنا پر الگ رہنے پر مجبور ہو گئے۔۔۔۔۔ اُس سلیم جسے اپنے نام سے ذرا بھر سچی تعلق نہ تھا، جو سلیم الطبع ہونے کی بجائے شوخ واقع ہوا تھا، اکثر سنجیدہ اور قدرے دنجیدہ بھی ہو جاتا تھا، ہاں وہی سلیم جو اپنی طراوت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا، آہیں بھرنے لگا۔ ایک جذبہ محبت کی بنا پر۔۔۔۔۔ ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

(۲)

دسمبر کی ایک اندھیری رات۔۔۔۔۔ تاریک۔۔۔۔۔ بھیا نک۔۔۔۔۔ خوفناک تیز ہوا چل رہی تھی۔ گورنٹ کوارٹرز کے اس طرف جبل کے ساتھ ساتھ ایک تنہا سڑک پر ایک تنہا نوجوان خوبصورت لڑکی۔۔۔۔۔ آف۔۔۔۔۔ دُور تک برقی لیمپوں پر پروانے جھومتے نظر آرہے تھے؛ لیکن سڑک بائیں سنان تھی، سوائے اُس اکیلے راگیر کے۔۔۔۔۔ وہ ٹھٹھا بار بار ادھر ادھر دیکھتی چلی جا رہی تھی، اپنے خیالات میں مگن، کبھی کبھی برقی لیمپوں کے نیچے کھینچی تو خوف و ہراس کے بجائے اُس کے چہرے پر اُداسی کی لہریں دوڑتی ہوئی نظر آتیں۔ لیکن وہ اپنی منزل کی طرف لپکی ہوئی چلی جاتا تھی، اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اسپتال کی گھڑی نے بارہ بجائے۔۔۔۔۔ وہ چونک پڑی۔۔۔۔۔ اُس نے اپنے ڈگلاتے ہوئے قدموں کو اور تیز کر دیا۔ اب اُس کی منزل بہت قریب تھی، وہ ایک کوارٹر کے قریب آ کر ڈکی۔ شاید عین ارادی طور پر اُس نے اندر جھانک کر دیکھا، ایک کمرے کی گھڑی سے دو شہنا چمن چین کر باہر آ رہی تھی۔ بہر طوٹ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ قبروں کو





پھر اپنے عشق کا سکہ جا رہا ہوں میں  
معا اس کے دل میں خیال آیا، وہ جلدی سے اٹھا اور شرک کی طرف دوڑ  
لگا، ٹانگہ میں مضیکہ ریڈیو اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا، ٹانگہ شہر کے جوم کو چرتا  
ہوا علی پور روڈ پر ہوا۔ شرک صاف سنی، ٹانگہ والے نے ٹانگہ کو تیزی سے  
دوڑانا شروع کر دیا۔ کئی مرتبہ وہ ٹانگوں اور موٹروں سے ٹکراتے بھا،  
لیکن قدسیہ باغ کی موڑ پر ایک مقابلے سے آنے والے ٹانگہ سے اس دور  
سے ٹکرایا کہ دونوں بم لٹ گئے اور ایک پیہہ بھی جواب دے گیا، دوسرے  
ٹانگے کا ہڈ گر گیا اور سلیم اپنی نشست سے اچھل کر دوسرے ٹانگہ کی چھت پر  
جا گرا، دونوں گھوڑے زخمی ہو چکے تھے، اُن کی چوٹوں سے خون نکل رہا  
تھا، دوسرا ٹانگہ والا پیسے ٹانگے والے پر برس پڑا۔ سلیم کچھ بے ہوش سا بڑھا  
تھا، ایک نمٹ اس نے محسوس کیا کہ وہ جس چھت پڑا ہے اس کے نیچے کوئی متفلس ہے  
اُس نے چھلانگ لگا کر چھت کو اٹھایا، نیچے شہیلہ بے ہوش پڑی تھی سلیم  
جلدی سے شہیلہ کو اٹھایا اور دیوانہ وار چلا، شہیلہ کو نکلسن پارک میں لٹا کر  
قریب نل سے اپنا رومال بگھولایا، اور ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔  
اُسے اپنی چوٹ کا احساس نہ تھا، حزن کے گرم گرم قطرے اس کے ماتھے سے  
گر رہے تھے، لیکن وہ اس وقت عالم جذب میں تھا اُس کو اپنی زندگی اور موت

کی پردہ نہ سہی اس لئے کہ اس کو کھوئی ہوئی شیلہ مل چکی تھی۔ شیلہ کو جب کچھ  
برس آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک نامحرم کے پاس پایا، وہ گہرا گئی، لیکن بہت  
جلد اس کی گہرا ہٹ دور ہو گئی، اس نے وہی اور کمزور آواز میں کہا "میں تم"  
ہاں شیلہ اس نے جواب دیا،  
شیلہ نے آخری مرتبہ آنکھیں کھولیں اور اسے گہرا جڑ کو نہستے کیا

## ہمارا ادب

### وجاہت سندیلوی

"مجھے چھوڑ دینے مجھے جانے دیجئے"

"ہنیں، ہنیں، ابھی ہنیں، مجھے تم سے محبت ہے"

کبھی آپ نے کسی خوشخوار جانور کو اپنا شکا۔ بھنبوڑتے دیکھا ہے؟ بس  
اسی طرح ایک سنان شام کو ایک غلوت کہہ ہیں محبت کی تفسیر کی جا رہی تھی۔  
میں غلوت کہہ سے باہر نکلی تو رات چھا چکی تھی۔ ہر طرف تاریکی تھی۔  
لیکن مجھے ایک روشنی دکھائی دی۔ آج میری آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا  
تھا، اور میں صاف دیکھ رہی تھی کہ محبت کیا ہے، کتنا پیارا لفظ ہے محبت  
م، حب، بت، لیکن اس معصوم لفظ کی آڑ میں کیسے کیسے بواہوسی کے ہشتنگ  
سانپ اینڈ رہے ہیں، بل کھا رہے ہیں۔ انسان سب سے زیادہ دھوکا اپنے  
آپ کو دیتا ہے، جس طرح اس نے اپنی مختلف قسم کی نفسانی خواہشات پر پردہ  
ڈال رکھے ہیں۔ اسی طرح اس نے ایک خاص قسم کی نفسانی خواہش پر بھی کیا پردہ ڈالا ہے۔ ہم متبا

اس شام کو قصور میرا تھا، اس کی کیا خطا؟ میں کیوں اس کی پسلی ہبکی  
باتوں میں آگئی میں کیوں نہ سمجھی کہ محبت کا معصوم لفظ کن کن معنوں میں استعمال  
ہوتا ہے؟ خیر اب گزری ہوئی بات کا افسوس ہی کیا؟ کچھ ہوا! اب میں سمجھ تو  
گئی کہ یہ بیگین شعبہ کیا ہوتا ہے، باپ اپنے لڑکے سے محبت کرتا ہے، اس لئے  
کہ وہ اس کا ہے۔ اس سے اس کو تو قذات ہیں، اس کا نام ہے شفقت پڑی!  
کبھی آپ نے کسی باپ کو کسی دوسرے کے لڑکے سے بھی محبت کرتا دیکھا ہے،  
فقیر کو کھانا دیا جاتا ہے، اس لئے کہ گہیں گھر میں کھانا خراب نہ ہو جائے، اس کا  
نام ہے خدا ترسی! کبھی آپ نے کسی کو اپنا پیٹ کاٹ کر بھی فقیر کو کچھ دینے دیکھا  
ہے! ابا ہا ہا ہم نے الفاظ کے کیسے رنگ برنگی پر دے ڈال رکھے ہیں، محبت  
یہ بھی جی کے خوشنما سحر میں چھپا ہوا ایک خوشخوار بچہ ہے!

ہاں تو اس نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہئے تھا، جب میں اس سنان  
شام کو اس سے تنہا ملنے لگی تھی تو مجھے پیسے ہی سے غور کر لینا چاہئے تھا کہ وہ  
کیا کرے گا، لیکن ہنیں غلطی میری بھی نہیں، غلطی ہے میرے ماحول کی، غلطی  
ہے میرے ادب کی، اس نے مجھے پیسے ہی سے کیوں نہ بتا دیا، کہ جو غواں  
محبت کے دریا میں کودتا ہے وہ صرف اس کا صاف و شفاف پانی دیکھ کر  
ہنیں کودتا، وہ کودتا ہے، اس کے کنول نکالنے کے لئے وہ کودتا ہے اس کے  
سوتی لانے کے لئے وہ کودتا ہے، اس کے پانی سے اپنے جسم کو راحت پہنچانے  
کے لئے۔

اس سنان شام کو میں خوش تو ہوئی کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ محبت  
کیا بلا ہوتی ہے، لیکن مجھے اس کا افسوس ہے کہ مجھے اپنے کتب خانے کی  
تین چوتھائی کتابیں آتشزدان میں پھینک دینا پڑیں۔ محبت تو ایک دھوکا  
ہے، لیکن ہمارا ادب ایک دغا بازی! وہ محبت کے دھوکے کو پاک  
اور معصوم بتاتا ہے۔

### اقوال سترمین

میرے مالک، اسطے ہے کہجے اپنی غفلت کا بتا دے اور صاف بتا دے  
کہ اس زمانے میں شریف انفس کو احمق کیوں کہتے ہیں۔  
ہم نے خواب میں دوستی کی، خواب ہی میں دشمنی، خواب ہی میں پیدا  
ہوئے اور خواب ہی میں مر گئے، خواب ہی میں شادی کی، خواب ہی میں غم  
یہ ہے دنیا، اس کی ابتدا اور انتہا۔  
کام یوں کرو کہ ہر دن کو زندگی کا آخری دن سمجھو۔

# جرمنی کا آسٹریا پر قبضہ کیوں اور کیسے؟

سید عید جعفری مچلی شہری

ہو جانے صرف ایک ملکن وقوع حادثہ تھا، بلکہ گزشتہ میں سال کی تاریخ اس بات کی منظر ہے کہ یہ واقعہ ایک تاریخی ناگزیریت کی حیثیت رکھتا ہے یہ کیوں۔

آئیے آج کی صحبت میں اس ملک کی گزشتہ سست سالہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں، آسٹریا میں چند سال پہلے یہ جلد ضرب اٹھ گیا کہ جرمنی میں صورت حالات سنگین ہے، لیکن ناگفتہ بہ نہیں آسٹریا میں موت حالات ناگفتہ بہ ہے لیکن سنگین نہیں اس جلد کے اندر وہ روح پوشیدہ ہے جو آسٹریا کی مخصوص سرت و ہیبت برقرار رہتی ہے۔ جان کنٹر یورپ کا شہرہ آفاق مصنف اپنے دلچسپ انداز میں آسٹریا پر رقمطراز ہے آسٹریا یورپ کا خوشگوار ترین ملک، جہاں لوگ زندگی کی سنجیدہ چیزوں میں منہمک رہتے ہیں، جیسے سامعہ نواز موسیقی یا ہوا خوری اور شراب نوشی۔ لیکن غائب پیچے چند دنوں میں نہ صرف ایک سیاسی انقلاب ہوا ہے بلکہ ممکن ہے کہ آسٹریا کی عام بے پرواہی امن پسندی، سکون طمانیت میں بھی تبدیلی پیدا ہو جائے۔

جنگ عظیم سے پہلے آسٹریا ہنگری اگرچہ قریب المرگ تھی، لیکن اپنے رقبہ کے لحاظ سے ایک عظیم الشان حکومت تھی۔ دنیا میں انقلابات ہمیشہ کرتے ہیں۔ آسٹریا کی حکومت میں جنگ عظیم کے باعث جو انقلاب ہوا وہ کوئی خاص دور میں نہیں تھا، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ریاست جلدیکہ

الراہہ پانچ سو سال کا دن، بعد جنگ عظیم یورپ میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ جرمنی کا آسٹریا کو ہڑپ کر جانا ایک اہم اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے زبردست واقعہ ہے، اس نے ہمیں کہ موجودہ دور تہذیب میں اس قسم کی بربریت کی مثالیں مفلو وہیں یا زیادہ تعداد میں نہیں ملتی، حبش، ہسپانیہ اور چین سمیت موجودہ زمانہ حال سے بچا رہا کر اس بربریت و استبدادیت و جنگیزیت کا رد و نادر ہے ہیں، جو آج ایک عالمگیر و ہاکی طرح کمزور اقوام کو گھیرے ہوئے ہیں، بقول اقبال سے غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش ہر گز کو ہے برہ معصوم کی تلاش

بلکہ اس لئے کہ ابھی تک اس دیدہ دلیری کے شکار سیاہ یازد قومیں نہیں، جو باد صفت دعوائے جمہوریت ہندب اقوام کی صف میں شمار کرنے کے قابل نہیں تصور کی جاتی تھیں، حبش اور چین پر اٹلی اور جاپان کی دست درازی نے یورپ کی بڑی قوموں کے اطمینان میں صرف اس حد تک طغی ڈالا، جہاں تک کہ ان کے اپنے سیاسی و اقتصادی مفاد کو دھکا پہنچنے کا احتمال تھا، آج جنگ عظیم کے بعد پہلی بار یورپ کی خود اعتمادی کو ضرب کاری لگی ہے اور ہر شخص از دست خویش نالہ و فریاد میں مصروف ہے۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ آسٹریا کا جرمنی میں جذب

تھے۔

اگرہ من کے دعووں میں کچھ بھی حقیقت تھی تو آسٹریا کو جرمنی سے ملحق کر دینا چاہیے تھا، کیونکہ بقول کول، ۹۰ فیصدی آسٹریا کے باشندے جرمن ذہن پر تھے ہیں اور اسی نسل اور تہذیب سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا کر دیا جاتا تو آئج بورو پ کو یہ ہزرت نہ اٹھانی پڑتی۔ اور امن کی دہائی اس شرمندگی سے بچ جاتی جو آج ہٹلر کی زبردستی سے اس کے حصے میں آئی، محض اسی پرکتھا نہیں کیا گیا، بلکہ آسٹریا سے جو معاہدہ ہوا (معاہدہ سینٹ جرمن ۱۱ ستمبر ۱۹۱۸ء) اس میں صاف الفاظ میں لکھ دیا گیا کہ آسٹریا ہر اس عمل سے احتراز کرے گا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ یا کسی طریقے سے بھی اس کی آزادی کو معرض خطر میں ڈالے گا۔

اس مایوسی کے عالم میں آسٹریا کے لئے اگر کوئی امید تھی تو جرمنی کے ساتھ اقتصادی تعاون میں، لیکن فرانس اس کو کب برداشت کر سکتا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۹ء کے دوران میں آسٹریا کو فاقہ کرنا پڑا۔ مگر فرانس کو آسٹریا کی آزادی پر رقرار رکھنی تھی۔ کیونکہ آسٹریا کے لئے سوائے جرمنی سے الحاق کے اور کوئی چارہ نہ تھا، جس کو سچانے کے لئے فرانس ہر جائز و ناجائز اقدام پر عمل کرنے کے لئے تلامبھا تھا، کہا گیا ہے کہ آسٹریا کی کمزوری میں اس کی طاقت مضمر تھی، اس معنی میں کہ ایک شیر خوار بچہ کی طرح اس کی ہر ضد بوری کی جاتی تھی۔

۱۹۳۲ء تک اقوام لیگ آسٹریا کی ہر نازک وقت پر مدد کرنے کو تیار تھے، سبلا ہو ان کی ضد کا کہ آسٹریا کو کئی مرتبہ سیاسی و مالی و اقتصادی مدد حاصل ہوئی، اور برطانوی اور فرانسیسی بنکوں کے دروازے آسٹریا کے لئے ہر وقت کھلے رہے، اس خوف کے مارے کہ مبادا آسٹریا کی شکست سے سارے وسطیورپ کا نظام متزلزل نہ ہو جائے۔

آسٹریا کے لئے یہ کوئی خوشگوار صورت حالات نہ تھی، اس لئے متعدد بار اس نے جرمنی سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان سب کا اعادہ پہلا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً ۱۹۲۱ء میں آسٹریا کے وکسجات میں سے تین صوبوں نے جرمنی سے اتحاد کا ریزولوشن پاس کیا جو کہ فرانس وغیرہ کی وجہ سے شرمندہ عمل نہ ہونے پایا۔ سب سے اہم واقعہ وہ تھا جب آسٹریا نے جرمنی سے اقتصادی اتحاد عمل کا ارادہ کیا، لیکن فرانس سے ایسی سخت

دہان میں اپنے دامن میں ڈھائی کروڑ آبادی کو سمونے تھی صرف ایک چھوٹے سے عقب میں محدود ہو گئی اور اس کی کل آبادی صرف ۶۰ لاکھ رہ گئی (جنرل کی آبادی سے کم ہے، یہ تشبیح نہ صرف ایک دردناک پہلو رکھتا ہے بلکہ کسی متنازعہ محکمہ خیر سہی ہے۔ مشہور کہانی ہے کہ جنگ کے بعد دو اطالویوں میں حسب ذیل بات چیت ہوئی۔ آدھی ذرا آسٹریا کے چاروں طرف گھوم آئیں: دوسرے نے جواب دیا۔ نہیں بھائی، میں دو پیر سے پیچھے رہا ہوں نہیں آنا چاہتا۔ لیکن یہ محض مذاق کی بات نہیں۔ آسٹریا کی اس کمزوری کا اثر یورپ کے سارے سیاسی و اقتصادی نظام پر پڑا۔

ذرا طور کیجئے کہ معاہدہ وارسائی کے ترتیب دینے والوں نے ایک ایسا ملک بنا دیا جو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی بھی صلاحیت نہ رکھتا تھا، ۳۳ ہزار مربع میل کا ایک چھوٹا سا ملک لیکن اس میں بھی نوے فیصدی پہاڑی علاقہ۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آسٹریا کی خاص پیداوار پہاڑی سینری ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا میں خود اتنی استقامت نہ ہی کہ اپنا پیٹ اپنے غصے سے بھر سکتا۔ اس لئے غلہ کی درآمد لاجب تھی، اس کے بدلے میں ضروری تھا کہ صنعتی کاروبار ہوتا لیکن خام پیداوار مثلاً کوئلہ وغیرہ کی کمی تھی۔ ہاں لوباکے افرادی تھی اور جنگوں کی کثرت، جس کی وجہ سے آسٹریا کی خاص صنعت کا غذاسازی اور لکڑی کے کاروبار کو فروغ ہوتا رہا۔ لیکن آسٹریا کی ہمسایہ اقوام نہ خام پیداوار جیتا کرنے پر راضی تھیں اور نہ اس کی مصنوعات ہی کو خریدنے کے لئے تیار۔ نتیجہ اقتصادی اور تجارتی انتشار۔ جنگ عظیم کے وقت یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ یہ جنگ دنیا سے جنگ کو ختم کرنے کے لئے لڑی جا رہی تھی، یہ دعویٰ تو باطل ثابت ہو چکا۔ لیکن ایک طریق کے قول کے بموجب اس جنگ کے بعد جو معاہدہ ہوا وہ یقیناً ایسی صلح تھی جس نے صلح کا امکان دنیا سے خارج کر دیا۔ پریسڈنٹ وین کے بلند بانگ و عادی حرف و غلط ثابت ہوئے۔ معاہدہ وارسائی کے الفاظ میں آسٹریا جنگری کی اقوام کو خود مختار نہ ترقی کی پوری آزادی دی جائے۔ لیکن مقام مدحیہ ہے کہ ایک طرف خود اختیاری کا نظریہ تھا۔ لیکن علاوہ ہیئت سے حصے جو نسل آسٹریا سے متعلق تھے آسٹریا کے الگ کر دیئے گئے۔ مثلاً جنوبی ٹائرول۔ گیلیشیا۔ لیچن۔

زیکو سلوکیا کے قبضہ میں ۳۰۰۰۰۰۰ جرمن زبان دانے آسٹریا کے دیئے

کی کاپیٹ دی اور کامرائی اور فمندی کے نقاسے بچنے لگے، شوٹل پارٹی کی یہ ملی کامیابی ایک معجزہ سے کم نہ تھی اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے شعل راہدایت ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن اس معجزہ میں عصائے موسیٰ فرانس وغیرہ کی مالی امداد تھی، جس کے بغیر صیہم اور ظاہر کر چکے ہیں آسٹریا کا ایک منٹ زندہ رہنا ناممکن تھا، سیاسی حیثیت سے آسٹریا ایک عجیب ملک تھا، ایک رحبت پسند ملک میں ایک (Austria) دارالخلافہ بیرونی مالک اگر مالی مدد روک لیں تو سارا توازن درہم برہم ہو جائے اور آسٹریا کی ساری ترقی کا فور ہو جائے۔ ۱۹۱۹ء میں صیہم اور کھچکے ہیں، فرانس نے ہاتھ روک لیا اور آسٹریا کے بینک منہلہ دیگر مالک کے بنکوں کے بوسیدہ عمارت کی طرح گرے لگے۔

سیاسی حیثیت سے اس افتقادی ہنگامہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ دراصل آسٹریا میں جمہوریت کی موت اور آمریت کی پیدائش اسی رستہ پر ہوئی ہے۔

اس سے قبل ہی آسٹریا میں فسطائی بیج بویا جا چکا تھا، اور انتہائی خدمات پسند صوبے اور لوگ شہزادہ فان اسٹارنبرگ کی قیادت میں ایک نئی فوج میں تسلیم ہونے لگے تھے۔ جس کا نام (Heimwehr) تھا۔ ان فسطائیوں میں اور شوٹل حکومت میں اکثر جھگڑا رہتا تھا، جس نے ۱۹۲۷ء سے ذرا سنگین صورت اختیار کرنا شروع کی۔

ایسی فضا میں ایک کھربائی طاقت وجود میں آتی ہے، جس کا نام ڈولفس تھا۔ چند ہی سالوں میں اُس نے آسٹریا کی اسٹیج میں ایک نمایاں پوزیشن حاصل تھی۔ پس جب ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر بورش کی حکومت مستعفی ہوئی تو ڈولفس کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ اگرچہ اس کی میعاد ٹی صرٹ ایک کی تھی۔ پھر بھی وہ ذرا نہ ڈرا، اور بے خطر ہو کر چانسلسری منظور کی۔ یہ نائے قد کا چانسلسر آسٹریا کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا مالک ہے، اُس نے آسٹریا سے جمہوریت کی بیج کٹی کی، پارلیمنٹ کو ختم کر دیا، آمریت کی بنیاد ڈالی، اجتماعی اور فسطائی پارٹیوں میں تصادم پیدا کرنا چاہا، لیکن اسی تعلیم سے خود بھی ختم ہو گیا۔

وہ ایک کسان تھا اور ایک کسان کی طرح بر خود غلط ذہنیت کا مالک، خدا پر یقین رکھتا تھا اور مطمئن تھا کہ اس کے ہر کام میں خدا کا ہاتھ

مخافت ہوتی کہ یہ اسکیم کا سیلاب نہ ہو سکی۔ یہی نہیں بلکہ فرانس نے آسٹریا جیک کر پٹ ایٹالسٹ (Austrian National Bank) (جو کہ وسطیورپ میں اقتصاد دی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا) سے امداد واپس لے لی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلے سے یورپ کے اقتصاد دی نظام کا پتھر ڈھیلو پڑ گیا اور نہ صرف آسٹریا ہی دیوالیہ بن کے سمندر میں ڈوبنے لگا بلکہ اُس کی بہریں بلانیہ ملک پر اثر انداز ہوئیں، ایک مشہور مصنف میکارٹنی کا دعویٰ ہے کہ فرانس کی اس مضبوط اقتصاد دی گرفت کا ہی نتیجہ تھا کہ آسٹریا ہر ممکن تدبیر کے باوصف فاقہ کی مصیبت سے نجات نہیں حاصل کر سکتا تھا۔

یہ بات واقعی قابلِ حیرت ہے کہ فرانس وغیرہ کی خیالات کے باوجود آسٹریا کس طرح زندہ رہ سکا۔ غالباً جو چیز اس عالمگیر مصیبت میں آسٹریا کی معاون ثابت ہوئی وہ آسٹریا کے باشندوں کا مجبور و استقلال تھا، لیکن یہ بے خبری اور بے پروائی اور قفل زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہ سکتا تھا، بقول گنٹر دو طاقین آسٹریا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں عمل پیرا ہوئیں، ایک ہٹلر اور دوسرا ڈولفس۔

اس جگہ ضروری ہے کہ ہم آسٹریا کے سیاسی نظام پر ایک نظر ڈالیں، جس کے بغیر گزشتہ ۴۰ سال کی ہنگامی تاریخ ناقابلِ فہم ہے۔

جنگ عظیم کے بعد آسٹریا میں ایک وفاقی نظام قائم ہوا اور یہ جموں و ممالک ۹ صوبوں میں منقسم ہو گیا۔ دارالخلافہ وینا کی حیثیت ایک صوبہ کی تھی، ساری آبادی کا تہائی حصہ دارالخلافہ میں آباد تھا، ویانا نے اپنی گوناگوں ہماہمی کے دیگر صوبوں سے ایک جداگانہ حیثیت رکھنا تھا، یعنی جہاں باقی صوبے جن میں کسان آباد تھے مذہبی رجحان کے باعث رحبت پسندانہ سیاست کے حامل تھے۔ ویانا ایک ترقی پسند صوبہ تھا، جس پر اشتراکی جمہوری پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ جنگ عظیم کے فوراً بعد جب کیونزیم کا ایک سیلاب سارے وسطیورپ میں موجزن ہو رہا تھا، اس وقت اس اشتراکی جمہوری پارٹی نے آسٹریا میں کیونزیم کو پھیلنے سے روکا۔ ویانا میں اور اس کے ہمسایہ صوبوں میں ایک کشمکش جاری تھی۔ لیکن اس دباؤ کے باوجود ویانا میونسپلٹی اپنے کام میں لگی رہی اور چند ہی سالوں میں اصلاحات کی یہ فراوانی تھی کہ بلاشبہ ویانا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ میونسپلٹی میں شمار کی جاتی تھی۔ (Austria) نے ویانا



کا پرہیز ہے۔ جمہوریت اور آزادی کے پرستاروں کے لئے امرارتیں گھا  
دن آسٹریا کی تاریخ میں ایک نہایت خوش دن تھا کیونکہ اسی دن آسٹریا  
کی پارلیمنٹ نے خودکشی کی اور ڈولفس کا پیش کردہ زہر کا پیالہ پی لیا۔ دنیا  
کے متعدد اکثر واقعات کی طرح اس کی بھی ابتدا نہایت ہی معمولی طریقے سے ہوئی۔  
کسی شمارے کے دوران میں ایک سوشلسٹ ممبر کسی مزدور سے باہر  
چلا گیا اور اس کی جگہ پر اس کے کسی دوست نے ان کی طرف سے ایک  
جعلی بلیٹ پیر ڈال دیا۔ اسبلی کا صدر جو ایک ( ) تھا،  
بہت عالی دماغ اور ایماندار تھا۔ اس نے اس قانون دہرازی کی اجازت  
نہ دی، اور فیصلہ سوشلسٹوں کے خلاف اور حکومت کے موافق پیدا  
مائے کا مناسب ۸۰ - ۸۱ تھا۔ شور و غل میں صدر نے دماغی توازن کو  
دیا۔ اور اسی جگہ پر استعفا دیدیا۔ دونوں نائب صدور نے بھی صدر  
کی تقلید کی۔ بات تو آئی گئی ہو جاتی۔ لیکن ایک مشکل یہ آن پڑی کہ آسٹریا  
میں قانونی طور پر پارلیمنٹ یا اسبلی کا اجراء صرف صدر یا نائب صدر کر سکتا  
تھا، اور اس وقت تینوں مستعفی ہو چکے تھے، ڈولفس کے ایساٹ طریقہ  
وال اس موقع سے کب چوکنے والا تھا۔ اس نے فوراً اپنا بھی استعفا دیدیا  
اور مین رومن کے اندر اندر ایک آمر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔  
یہاں تو یہ خود سری تھی، یہ تو تو، میں میں، یہ تعادم، یہ کشمکش اور  
دور آفت پر ایک چھوٹا سا بادل وجود میں آ رہا تھا، جو عنقریب سارے  
آسٹریا پر محیط ہو جانے والا تھا۔ یہ بادل بھلر تھا۔  
بھلر ایک ناقابل فہم انسان ہے یا بقول ہیڈن "بھلر انسان نہیں  
ہے، جس کے ساتھ کوئی سمجھدار آدمی کسی قسم کا سمجھوتہ یا بات چیت کر سکتا  
ہے۔ وہ ایک مافوق الفطرت ہستی ہے جس کو آپ ختم کیجئے یا خود ختم ہو جائے۔  
لیکن اس کے باوجود وہ ایک صاف گو انسان ہے، اور یہی غالباً اس  
کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے، اس نے اپنی عہد آفریں خود نوشت  
سوانح عمری میری جد و جہد میں متعدد بار آسٹریا کے بارے میں اپنے  
خیالات اور نصب العین کا اظہار کیا ہے۔ بھلر کا پیدائشی وطن آسٹریا  
ہے اور اس نے ایک نفسیاتی کشش اس کو آسٹریا کی طرف کھینچی رہی  
ہے، اس پر امن فکری، اقتصادي اور سیاسی فوائد اور آپ پر بھلر  
کی آسٹریا سے دلچسپی کا راز شکست ہو جائے گا۔ میری جد و جہد کا یہ

ہی جلد بھلر کے اس جذبہ کی تشریح کرتا ہے۔ وہ رقمطراز ہے "میرے لئے یہ بات  
بہت مفید ثابت ہوئی کہ میری پیدائش بران میں ہوئی۔ یہ چھوٹا سا شہر ان  
دونوں جرمن ممالک کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ جن کے اتحاد کے لئے ہر  
ممكن کوشش ہم جائز سمجھتے ہیں۔ اور پھر جرمن آسٹریا کو جرمن قوم غلام کے پاس  
واپس ہونا پڑے گا۔ اقتصادي وجوہات کی باعث نہیں۔ مشترک نسبت ایک  
مشترک ملک میں ہونی چاہیے۔  
ایک ایسے شخص کے لئے جس کا مقولہ ہے "سرحدیں محض انسانی طاقتوں  
سے بنتی اور بدلتی ہیں، طاقت ہی ملکیت کا واحد حق ہے، جس کی لامتناہی اس  
کی ہمیں یہ جذبہ متناحرک ثابت ہو کم ہے۔ ان واقعات اور درمیانی  
کڑیوں کی تفصیل جن کا نتیجہ آج ہماری نظروں کے سامنے ہے، آسان نہیں،  
کیونکہ اکثر باتیں ابھی تک سیخ راز میں ہیں اور سیاسی حقیقت مینوں کی لئے  
اتنی متضاد ہے کہ کسی غیر جانبدار شخص کے لئے تعصیب کرنا ذرا مشکل ہے۔ پھر  
بھی ہماری کوشش ہوگی کہ مختصر طور پر ان شاطراں چالوں اور تحریکوں کا  
ذکر کریں، جس نے حق کو باطل کی طاقت کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کیا۔  
جس وقت سے بھلر جرمنی میں برسرِ اقتدار ہوا اسی وقت سے آسٹریا  
کی طرف حریصانہ نگاہیں اٹھنے لگیں، اور چونکہ شروع شروع میں نازیوں کی  
طاقت مستحکم اور منظم نہ ہوئی تھی اور یورپ کی سیاسی فضا اتنی مکدر نہ تھی،  
اس لئے اکثر حریصانہ نگاہیں پوشیدہ رہیں۔ نازیوں کے اڑکار دہشت انگیزی اور  
پروپیگنڈا سے، اول الذکر اس قدر سرعت کے ساتھ ترقی پذیر تھی کہ آسٹریا  
کی آبادی کا معتد بہ حصہ جرمنی کے خلاف ہو گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ستمبر اور  
ستمبر کے دوران میں آسٹریا کی ہمدردی جرمنی کے ساتھ تھی، لیکن گٹر کی  
سند ہے کہ ستمبر کے آخر تک کم از کم ۶۰ فیصدی لوگ جرمنی کے مخالف  
ہو گئے۔ اس کا باعث دہشت انگیزی اور پروپیگنڈا کا وہ سیلاب تھا  
جو بہتا چلا آ رہا تھا، اور جس نے فرانس، اٹلی اور برطانیہ کو بھی خواب  
غفلت سے چونکا دیا۔ ان اقوام نے صدائے احتجاج بلند کی، جس کا فوری  
نتیجہ نازیوں کی سرگرمیوں کی سرورقاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔  
مکن تھا کہ فضا اسی طرح گرم و سرد ہوتی رہتی کہ آسٹریا کی خارجی اور  
اندرونی حکمت عملی میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ جس نے آسٹریا کی سیاسی  
بساط کا پرانا نقشہ درہم برہم کر دیا، اور میں نے نازیوں کو مجبور کر دیا کہ

کسی نتیجہ اور مخصوص رد و عمل پر گھڑن ہوں۔

ڈولفس کی طاقت کا راز اس کی دوسری اور سولینی کی مدد میں مفرحت، آج جب کہ ہم سولینی اور ہٹلر کی نصب العینیت کی ایک جہتی کو مد نظر رکھ کر ان دونوں کے لازمی اتحاد پر حکم صادر کرتے ہیں تو ہم غالباً بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں آدمیوں کا اتحاد ہیئت تازہ ہے اور کئی سال تک دونوں میں آسٹریا کے دور کشش رہی، یہاں تک کہ ان دونوں کا تصادم کسی کو بھی حیرت میں نہ ڈالتا اس کشش کی وجوہات کئی ہیں۔

(۱) سولینی ہر حالت میں اپنی سرحد پر کمزور قوموں کے وجود کو طاقتور اور جھجھکے ہوئے لوگوں پر ترجیح دے گا۔ اگر آپ نقشہ پر ایک نظر ڈالیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اٹلی کے شمال میں کوہ (۱) ویسے ہی محفوظ کا کام دیتا ہے جیسے ہالیوڈ ہمارا پاس بان ہے، اور شمال سے فوجوں کے آنے کا راستہ صرف بذریعہ درہ برنیر ہے جو آسٹریا اور اٹلی کی سرحد پڑتی ہے۔

(۲) ہٹلر کا دعوئے یہ تھا اور ہے کہ تمام جرمن نسلیں ایک ہی ملک کی سرحد میں آجانی جائیں، ہتھیاری یا خوش قسمتی سے جنگ عظیم کے بعد کی لوٹ مار میں اٹلی کے قبضہ میں جنوبی ٹائرول آگیا، جس میں سو لاکھ جرمن زبان بولنے والے لوگ آباد ہیں۔

چند دیگر وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر آگے آئے گا، سولینی نے یوں کہنے کو ڈولفس کو اپنی جیب میں ڈال لیا۔ سولینی نے یہی نہیں کیا، بلکہ اپنا ایک اور ایجنٹ ٹھنڈا دہ سٹار ہمبرگ کو بنا لیا، جو جیسا ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ آسٹریا میں فسطائی جماعت کا بانی اور رہنما تھا، اُس وقت تک ڈولفس نے اپنی آمریت کی بنیادیں کافی مستحکم کر لی تھیں، ڈولفس کا ارادہ ایک طرف تو سوشلسٹ جماعت کی برصغیر ہوئی طاقت کو کھل دینا تھا اور دوسری طرف وہ اپنے ملک کو آزاد بھی رکھنا چاہتا تھا اور اس لئے جرمنی سے نازیوں کے سیلاب کے دفاع کے لئے بھی پریشان تھا۔ پس اُس نے اپنے ملک کی اندرونی فسطائی جماعت سٹار ہمبرگ کی سمجھ بھڑ سے اتحاد پیدا کرنا چاہا۔ لیکن تھا کہ ڈولفس اسی طرح (۱) میں

دیکر راست و چپ دونوں جانب اشتراکیوں اور نازیوں سے لڑتا رہتا، لیکن سولینی کی شہ لی جانے کے بعد اس نے طے کر لیا کہ اپنی استبدادیت

اور طاقت کا رخ سوشلسٹ جماعت کی جانب پھیر دے۔

آسٹریا میں سوشلسٹ جماعت کافی منظم اور ترقی یافتہ تھی۔ لیکن اس نے اپنے ہاتھوں آپ اپنے پیروں پر کھڑا ہی ماری کیونکہ اس نے اپنی آنکھیں اس خطرہ کی طرف سے بند کر لی تھیں، جو فسطائی طاقت کی بے راہ روی میں پوشیدہ تھا، سوشلسٹ جماعت صلیح پسند جماعت تھی، امن پسند جماعت تھی، ان مزدوروں کی جماعت تھی جو اپنی مزدوری سے مطمئن تھے اور جن کو دیاناکا ترقی پسند سوشلسٹ کی بدولت ہر قسم کا آسام ہوتا تھا، آسٹریا کی سوشلسٹ جماعت کے رہنما ایسے عالی ظرف لیکن برخود غلط لوگ تھے، جو کسی حالت میں تعین کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ اُن کے دشمن ذلیل اور کمینہ حرکات پر اُتر آئیں گے۔ غور تو کیجئے ڈولفس سوشلسٹ جماعت کی بیخ کنی شروع کر دیتا ہے۔ سٹار ہمبرگ کی فسطائی فوج کی چیر و پھیل زوروں پر ہیں اور دونوں معمم ارادہ کر چکے ہیں کہ دیاناکا سوشلسٹ پارٹی کا وجود معدوم کر دیا جائے گا۔ لیکن دوسری جانب سوشلسٹ پارٹی کا رہنما بائیر ایک امید موبوم پر کہ شاید اب بھی صلح کا امکان ہو اور خود بڑی بیخ جائے اپنی جماعت کو کسی قسم کے اقدام سے روکتا ہے۔ کسی مصنف نے کتنی ہی نفی بات کہی ہے کہ آسٹریا میں سوشلزم اپنی شرافت کی وجہ سے ختم ہو گئی۔ آسٹریا کی سوشلسٹ پارٹی نے ایسی حالت میں جو مقابلہ کیا اور پھاوری اور الو العز می کا جو نمایاں ثبوت دیا وہ دنیا کی تاریخ میں ایک درخشندہ باب ہے چاروں تک خانہ جنگی ہوئی رہی۔ دیاناکا کے مزدوروں کے فلکغا کو اڑ بباری کی نذر کر دئے گئے۔ عورتیں اور بچے فسطائیوں کی بند و قوں کا نشانہ بنائے گئے اور چار روز کے اندر آسٹریا سے سوشلسٹ پارٹی مرف کا لحد ہو گئی۔

ڈولفس کا نصب العین خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاتا کہ وہ آسٹریا کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا، لیکن اس نے اسی جذبہ کو اسی جماعت کو اسی طاقت کو جو آسٹریا کی آزادی کی علمبردار ہو سکتی تھی، ختم کر دیا اور نازیوں کو بغلیں بجانے کا موقع دیا، کیونکہ نازیوں کی دہشت انگیزی اور روئے جس کام کو سر انجام دینے میں نا کامیاب رہے وہ کام ڈولفس نے جو کہ نازیوں کا کسی صورت سے دوست نہ تھا پورا کر دیا۔ جمہوریت کے نام لیواؤں کا قلع قمع ہو چکا تھا، اس لئے اب نازیوں کی طاقت کو عروج



نازی تھا، اور سیتھن تھا کہ ڈولفس فون ہائیڈن ہرمان، لیکن سولینی کی مدد پر  
رہی اور ڈولفس اپنی سمیت کی مبادیوں کی کچھ دلائل تک اور طویل کرنے  
میں کامیاب رہا۔

لیکن سارا تو اذن درہم برہم ہو چکا تھا، فرانس اور برطانیہ غلطی اپنی  
اپنی مشکلات میں مشغول تھے اور دخل در معقولات سے عاجز، ڈولفس اور  
اسٹارمیرگر میں وہ پرانا رابطہ ختم ہو چکا تھا، کیونکہ دونوں ایک دوسرے  
کو اپنی طاقت میں رخنہ خیال کرنے لگے تھے۔ ڈولفس نے سچائے سٹارمیرگر  
کی فوج کے ایک نئی فوج کو جو شہنشاہیت و مذہب پرست شمشک کی سرکردگی  
میں قیام میں آئی تھی اور دینی شروع کی۔

۵ مئی تک صورت حالات اس خاموشی کے مانند رہی جو طوفان کا  
پیش خیمہ ہوتی ہے، لیکن اس دوران میں طرفان خیر جماعت - جرمنی کے نازی  
برابر اپنی سرگرمی میں مصروف رہے اور کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۸ کروڑ مارک  
جرمنی کی طرف سے محض پروپیگنڈا پر خرچ کئے گئے۔ مگر محض پروپیگنڈا کسی ملک  
کو اپنی آزادی قربان کرنے پر راضی نہیں کر سکتا۔ نازی اس حقیقت سے قنایا  
تھے، خود جرمنی میں ان کا تجربہ ان کو بتا چکا تھا کہ جب تک نصف آبادی  
کو وہ تہ تیغ نہ کر چکے ان کی ساری عیارانہ چالیں اور ساری دہشت انگیزی  
کسی کام نہ آئی۔ اس لئے تیاری کی گئی کہ ڈولفس کا جو نازیوں کے حملہ کے  
لئے سینہ سپر تھا، خاتمہ کر دیا جائے، اور ۲۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو ڈولفس ایک  
نازی کی گولی کا نشانہ بنادیا گیا۔ انعام تو یہ کیا گیا تھا کہ ڈولفس کے قتل کے  
ساتھ ہی حکومت پر بھی نازی قبضہ کر لیں۔ لیکن چند غلطیوں کی وجہ سے  
ساری سازش ممکن نہ ہو پائی نازیوں کا خیال تھا کہ آسٹریں فوج ان کا  
ساتھ دے گی۔ مگر آسٹریں فوج اپنے ملک کی آزادی کی دفاع دار رہی، نازیوں  
کا خیال تھا کہ کیتھولک صوبے جو آسٹریا کی حکومت تھے، ان کا ساتھ  
دیں گے۔ لیکن یہ صوبے پہلے ہی نازیوں کی دہشت انگیزانہ کارروائیوں  
کے باعث ان کے خلاف ہو چکے تھے، ایسی حالت میں صرف جرمنی کی  
مدد ان کے کام آسکتی تھی، مگر ہٹلر باوجود اپنے بلند بانگ دعوای کے  
ایہاں خطرہ دیکھتا ہے وہ بے پاؤں واپس ہو جاتا ہے۔ یہ ساری سازش  
جرمن قوم کے قائدوں کی مرضی اور مدد سے وجود میں آئی۔ لیکن جرمنی نے  
اپنا قدم واپس لے لیا، کیونکہ سولینی جو ڈولفس کا مرئی تھا کسی حالت میں

بھی آسٹریا کو جرمنی کے قبضہ میں دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ سولینی نے خود  
اٹلی کی فوج کو آسٹریا کی جانب روانہ کر دیا۔ سولینی کی اس دلیری کا نتیجہ  
یہ ہوا کہ ساری سازش غلط ملط ہو کے رہ گئی اور صرف ڈولفس کی روح  
ان اشتر کی مقبولیت سے ملاقات کرنے کے لئے چلی گئی جن کو ڈولفس نے  
اپنی زندگی میں گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

ڈولفس کا قتل نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔ اسی واقعہ سے یورپ  
کی سیاست میں ڈاکوں کا انداز شروع ہوتا ہے، نازی اس وقت  
تاک کافی منظم ہو چکے تھے اور اس واقعہ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ ایک  
ایسی جماعت ظہور میں آنے والی ہے جس کے لئے سیاست میں شرافت، ایمانداری  
معاہدہ پرستی سب بے معنی الفاظ ہیں، دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ ہٹلر جو کہتا  
ہے وہ کرتا بھی ہے، نازیوں کی اس حرکت کا سب سے بڑا اثر تو یہ پڑا  
کہ آسٹریا کی اکثریت ہٹلر اور جرمنی کے خلاف ہو گئی جس نے ان سے  
اس کے کتنے ڈکٹیٹر کو چھین لیا۔ اور یہ ناممکن ہو گیا کہ نازی صلیب جوتی  
سے آسٹریا پر قابض ہو سکیں۔ ڈولفس کے ہٹ جانے سے آسٹریا کی  
حکومت علی میں سولینی کا اثر کم ہونا شروع ہوا۔

آسٹریا کا دوسرا ڈکٹیٹر شمشک تھا جو زیادہ ہر دلعزیز نہ تھا، لیکن  
ایلی سینیا کی وجہ سے ذاتی مشکلات میں مبتلا تھا۔ شمشک کے پاس اس کے  
سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جرمنی سے کسی قسم کا اقتصادي اور مالی سمجھوتہ کرے،  
شمشک کا یہ اقدام آسٹریا کی حکومت علی میں ایک انقلاب کی حیثیت  
رکھتا تھا۔ سولینی آسانی سے اس کے لئے راضی نہ ہوتا۔ اگر یورپ  
کی سیاسی نقصان بدل گئی ہوتی، حبش کے حملہ کے دوران میں جب سیدی  
اقوام عالم اٹلی کے خلاف ہو رہی تھیں صرف جرمنی نے دوستی کا ہاتھ  
بڑھایا تھا، اور اس کے لئے شرط یہ تھی کہ آسٹریا سے جرمنی کے سمجھوتے  
میں سولینی رخنہ اندازی نہ کرے۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو جرمنی کے نمائندہ  
فان پین اور آسٹریا کے درمیان ایک مضم کی صلیب ہو گئی، جس سے آسٹریا اور  
جرمنی کے تعلقات راہ راست پر آ گئے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں  
آتی کہ جرمنی اور آسٹریا کے ناخوشگوار تعلقات کیسے اتنی جلدی صلیب جوتی  
میں تبدیل ہو گئے، اور خصوصاً جب آسٹریا کا نیا چانسلر شمشک نہیں  
ڈولفس کے جرمنی کے زیادہ خلاف تھا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ ہٹلر یہ سمجھ چکا

تھا کہ حکومت معاملات متفقہ تھی کہ بجائے ذہر ہستی کے کم از کم کچھ دلوں تک اور ملکی چٹری باتوں سے آسٹریا میں جرمنی کے اقتدار و رسوخ کو فروغ دیا جائے۔ البتہ گنٹر اس لڑائی کی ذہر ہستی عصمت وری کرنا جس سے آپ کل شادی کرنے والے ہیں ایک فضولی سی بات ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تفصیل کا محتاج نہیں۔ گزشتہ ماہ شنگ سے ایک سمجھوتہ جو کہ دراصل ایک دھکی دھکی تھی وقوع میں آیا۔ شنگ کو احساس ہوا کہ آسٹریا کی آزادی معروض خطر میں ہے۔ اس نے ہٹلر کی ذہر ہستی سے بچنا چاہا۔ مگر دوسری طاقتوں نے اس کی مدد نہ کی اور ہٹلر تین گھنٹہ کے اندر اندر آسٹریا پر قابض ہو گیا۔

جوابات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہٹلر جو آج سے م سال پہلے باوجود اپنی طاقت کے آسٹریا پر قبضہ کرنے میں بری طرح ناکام رہا۔ آج بغیر ایک گولی چلائے سارے آسٹریا پر مختار مل ہو گیا، اس کا جواب ہم کو یورپ کی سیاسی شطرنج کی چالوں میں ملے گا۔ اس بساط پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے

ڈبلیو ہیرلڈ اپنے ایک مقالہ افتتاحیہ میں رقمطراز ہے، جرمن حکمت عملی کا مخصوص حربہ یعنی عریاں ذہر ہستی پھر نمایاں ہوا ہے۔ آسٹریا دراصل اس تزیینہ ڈراما کا تازہ ترین ایکٹ ہے جس کے پیچھے جتنے پھوڑا، جھٹ، اپین اور چین میں، اور ڈراما اسی اختتام سے بہت دور ہے۔

ڈبلیو میل لکھتا ہے ہم یورپ کے تاریخی ارتقار کے ایک فیصلہ کن مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ سوال یہ ہے اب کیا ہوگا؟ یا غالباً اب کون ہوگا؟ یہ سوال محض پریشانی کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جرمنی کی خارجی حکمت عملی یورپ کو جس راستہ کی طرف لے جا رہی ہے، وہی راستہ جنگ کا ہے۔ قتل و غارت کا ہے، خودکشی کا ہے، موت کا ہے۔ یہ حکمت عملی کیا ہے؟

ہٹلر اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتا ہے ہم کو چاہیے کہ جرمنی کی توسیع کا رخ بجائے یورپ کے بیرونی ممالک کے یا یورپ کے مغربی اور جنوبی ممالک کے مشرقی یورپ کی طرف پھیر دیں۔ اور اسی لئے گزشتہ چار سال میں اس کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ فرانس اور برطانیہ کی طرف سے اطمینان حاصل کئے تاکہ آسٹریا اور ڈیکو سلوکیا اور یوکرین پر

دعا و ابول سکے۔ بعض سادہ لوح برطانوی مدبرین اس حکمت عملی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہٹلر کو مشرق کی طرف پھیلنے کی کمال آزادی دیدی جائے۔ تاکہ برطانیہ اور فرانس ہر قسم کے خطرہ سے بری رہیں، اور کسی جنگ عظیم کا امکان نہ رہے۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ اسی چالاک کا شکار ہو جاتے ہیں جو ہٹلر کا اصل مقصود ہے۔ ہٹلر تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شروع میں وہ ان کمزور اقوام پر حملہ کر سکے اور پھر جب اُدھر سے اطمینان حاصل ہو جائے تو اسی رسمی و تاریخی دشمن فرانس کی طرف رخ کرے۔ ہٹلر کو اپنے ملک میں جو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی وہ اس کی خارجی حکمت عملی کی کامیابی کے سامنے بیچ معلوم ہوتی ہے۔ شروع شروع میں ہٹلر کے پاس عسکری اور فوجی طاقت کی کمی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کی خود غرضانہ مناقشات سے فائدہ اٹھاتا رہا اور یکے بعد دیگرے کامیابی حاصل کرتا رہا۔ سب سے پہلے ۱۹۳۸ء میں اس نے آئہ بندی شروع کی اور جمیٹ اقوام کا دفاع ختم کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد پولینڈ سے معاہدہ کیا۔ یہ بھی معاہدہ وارسائی کے خلاف تھا، اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں آسٹریا میں اس شورش کا پھیلاؤ تھا جس نے ڈولفس کو قتل کیا، مگر جو ناکامیاب رہی۔ اس تمام عرصہ میں ہٹلر کی دست راست برطانیہ کی خاموش سہنہ تھی۔ برطانیہ کی حکمت عملی یورپ میں ہمیشہ طاقت کے توازن کے نظریہ پر قائم رہی ہے۔ جرمنی کی کمزوری جس کے باعث فرانس کی طاقت روز افزوں ترقی پذیر رہتی۔ برطانیہ کے مفاد کے خلاف تھی۔ اس لئے معاہدہ وارسائی کے باوجود برطانیہ کی برابر یہ کوشش رہی کہ جرمنی کی طاقت بڑھتی رہے۔ برطانیہ کی اس حکمت عملی کے پس پشت دراصل لندن کے بڑے بڑے تجار اور سرمایہ دانوں کا ہاتھ تھا جو جرمنی کو دس اور سو ملین کا دشمن سمجھتے ہوئے بغض معاویہ کے اصول پر مدد دیتے رہے، لیکن ڈولفس کے قتل کے فوری بعد کچھ عرصے تک برطانیہ کا جرمنی سے یہ ہمدردانہ رویہ ٹھنڈا پڑ گیا، اور فروری ۱۹۴۰ء میں برطانوی فرانسیسی معاہدہ وجود میں آیا جس کے تحت مشرقی یورپ کے تحفظ کے لئے ایک بین الاقوامی قرارداد پائی۔ ہٹلر ان بین الاقوامی دعاوی کی اہمیت سے واقف تھا، اس لئے مارچ ۱۹۴۰ء میں معاہدہ وارسائی کی رو سے جو فوجی پابندیاں عاید کی گئی تھیں اس لئے انہیں بھی مسترد کر دیا۔ فرانس، برطانیہ اور اٹلی کے الزاموں میں ایک وقتی بھجان برپا ہو گیا، اور مشرقی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں جرمنی کی آئندہ جارحانہ کارروائی کے خلاف ایک

محافظ قلم لکھنے پر۔ لیکن اس میں کس قدر ایذا دہی اور اہمیت تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس معاہدہ کی سیاسی بھی خشک بنیں ہونے پائی تھی کہ دس دن کے اندر برطانیہ کا وزیر خارجہ سر جان سائمن ہلوسے دستا طاقات کے لئے برلن جاتا ہے۔ چہ لا درست دزدے کہ کبھی چراغ داند۔ اور جون میں اس کا نتیجہ برطانوی جرمنی بحری معاہدہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو معاہدہ کی خلاف ورزی کا برطانیہ کی طرف سے نمایاں کارنامہ ہے، اسٹسٹ میں (Rhineland) پر جرمنی کا قبضہ اس کی جارحانہ کارروائی میں ایک اور قدم تھا، اس کے بعد اسٹسٹ میں اسپین میں جرمنی کا شورش پھیلانا اور خانہ جنگی پیدا کرنا اور ترقی دینا جرمنی کا یورپ کی فضا کو کھردرنے کے لئے سب سے اہم کارنامہ تھا۔ مگر اسپین میں اٹلی کا رجحان اور توجہ دیکھ کر ہٹلر نے اپنا ہاتھ واپس لے لیا، اور اسپین اٹلی کے حوالہ کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ سپریم تہو مایہ خویش را۔

لیکن ان سب کے باوجود اس دعوے میں بہت کچھ حقیقت ہے کہ ہٹلر اتنا زبردست کارنامہ یعنی آسٹریا پر قبضہ کر کے جرات نہ کرتا، اگر گزشتہ سال کے دوران میں یورپ کا سیاسی توازن درہم برہم نہ ہو چکا ہوتا۔

دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے برطانیہ کے علاوہ جو دو قوتیں سب سے زیادہ کوشاں تھیں وہ سویت روس اور امریکہ ہیں۔ جنگ پیش کے موقع پر امریکہ نے ثابت کر دیا کہ وہ ہر عملی کارروائی کے لئے تیار ہے، اور اگر برطانیہ امریکہ سے مشترک عمل کر کے پٹرول کی درآمد بند کر دیتا تو اٹلی کو ایک مہینہ کے اندر پیش سے واپس ہونا پڑتا۔ مگر برطانیہ ان مضامین طاقتوں سے کچھ ایسا خوفزدہ رہا ہے، اور برطانیہ کے سرمایہ داروں کا اٹلی اور جرمنی سے ہمہ دوا رویہ ہمیشہ ایسا فیصلہ کن رہا ہے کہ سوائے سوویت کو خفا کرنے کے کوئی طاقت کچھ نہ کر سکی۔ یورپ کی سیاست پر جنگ پیش کا سب سے زبردست اثر یہ ہوا ہے کہ اٹلی اور جرمنی میں اتحاد عمل کے لئے برلن، روما، محور وجود میں آئی، آج جب ہٹلر آسٹریا پر قابض ہو جاتا ہے تو وہی سوویت جو چار سال پہلے ہٹلر کے خلاف فوجی طاقت روانہ کرنے سے پرہیز نہیں کرتا، ہٹلر کو دوستانہ پیغام روانہ کرتا ہے اور اس کے کان پر ظاہر اوجوں تک نہیں رہتی۔ کونسی تعجب کی بات ہے کہ ہٹلر سوویت کے اس پیغام کا جواب دلی لشکر

دانتان سے دیتا ہے اور سوویت کو یقین دلاتا ہے کہ اگر اٹلی پھر جرمنی کی مدد یا ہمدردی کی ضرورت ہوئی تو ہٹلر اس سے دریغ نہیں کرے گا۔

جنگ پیش کے بعد سے برطانیہ کی خارجی حکمت عملی جو رہی ہے اس سے ان امور پر یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ برطانیہ ہر حالت میں جنگ سے احتراز کرے گا خواہ یورپ کی سیاست سے اخلاقی عنصر خفا ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کا امن خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ امریکہ کی ہمیشہ سے ایسی ہی ہے کہ یورپ کے مسائل ایک خانگی صورت رکھتے ہیں جس سے امریکہ کا کوئی تعلق نہیں۔ فرانس اپنے میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ بغیر برطانیہ کی پالیسی کی تشریح کے کوئی مستقل فیصلہ کر سکے۔ امن پسندوں کی امید کا مرکز سویت روس رہ گیا۔ مگر گزشتہ ڈیڑھ سال سے روس کے اندر ایک زبردست خانگی اتہری سی پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے روس غالباً معذور ہے کہ تنہا سیاست عالم میں چنگیزیت اور ہہنریت کے خلاف اپنا علم نصب کر سکے۔ مسٹر ایڈن کا اسٹیفنی، بقول مسٹر لائڈ جارج، سوویت اور ہٹلر کی فتح ہے، فرانس کی سیاست حسب معمول ایک نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ایسے موقع کو ہٹلرک ہاتھ سے دینے والا تھا۔ اس نے فوری فیصلہ کیا۔ حالات کا ٹیکہ ہاتھ لیا اور تین گھنٹے کے اندر یورپ کا سارا سیاسی نظام الٹ دیا۔

اجتماعی تحفظ جس خیال پر جمیت اقوام وجود میں آئی تھی ایک بیکار چیز ثابت ہو چکی ہے، اور جب اس زمانہ کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس گناہ کبیرہ کا سب سے بڑا الزام برطانیہ کے سر رکھا جائے گا۔ باوجود اپنی طاقت کے گھنڈ کے نہ سوویت اور نہ ہٹلر میں یہ جرات ہوتی کہ یکے بعد دیگرے من مانی کرتے چلے جاتے۔ اس دعوے کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب گزشتہ سال مراکش کے بارے میں ہٹلر کی کارروائی ظاہر ہوئی تو فرانس نے بخوبی ظاہر کر دیا کہ ہٹلر کامراش کی طرف متوجہ ہونا فرانس کی براداشت نہ کرے گا۔ نتیجہ ظاہر تھا، ہٹلر نے صاف اس واقعہ سے ہاتھ دھو لیا، پھر جب گزشتہ سال بحیرہ روم میں آبدوز کشتیوں نے برطانوی جنگی جہازوں پر حملہ کرنا شروع کیا اور برطانیہ نے نین کا نفر تیس منعقد کر کے اس صدمہ حالات سے اپنی بیزاری ظاہر کی تو تین مہینہ تک پھر کسی قسم کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ مضامین طرہ حکومت کے اندر حلیو دوس کا فرما ہے۔ یہ بھی صحیح ہے

کہ ایک نہ ایک دن فسطائی طاقتیں دنیا کو عالمگیر جنگ میں مبتلا کریں گی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود دنیا میں امن خواہ لوگوں اور قوموں کی اکثریت ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ترقی پسند ممالک مثلاً روس و فرانس اور برطانیہ اجتماعی تحفظ کے لئے کوئی مستقل قدم اٹھائیں اور فسطائی قومن کی دھکیوں کی اصلیت سمجھ لیں۔ جمعیت اقوام ایک مضبوط مصلحت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان سب وجوہ سے یہ خطرہ بہت قریب ہو جاتا ہے کہ ہٹلر اپنی اسکیم کی آئندہ منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔ یعنی ڈیکو سلو ویکیا۔ ہٹلر نے اپنی کتاب میں بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ جرمنی کے لئے اپنی گذشتہ مقبوضات کے حصول کی سبھی ایک فعل عیث ہے، اور مقبوضات میں اور غام پیداوار کی فراوانی محض ایک ڈھونگ ہے۔ مگر یہ ڈھونگ محض اس لئے رچا یا جا رہا ہے کہ ہٹلر برطانیہ کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے ہٹلر کو روس پر حملہ کرنے کا موقع دیدے۔ مقبوضات کے واپس لینے کی جتنی بیکار محض برطانیہ کو پریشان کرنے کے لئے ہے، اور یورپ کی سیاست میں مول بھاؤ کا ایک نادر نمونہ ہے، ہنگری اور بلغاریہ ہٹلر کی طرف راغب ہو ہی چکے ہیں۔ پولینڈ سے تعاون کا معاہدہ مکمل کو پہنچ چکا ہے۔ اب صرف ڈیکو سلو ویکیا پر حملہ باقی ہے۔

ڈیکو سلو ویکیا بھی ان ریاستوں میں سے ہے جو معاہدہ وارسائی کے مرتب کرنے والوں نے قلم کی جنبش سے پیدا کر دیں۔ اور قریب ڈیڑھ کروڑ آبادی میں تقریباً ۳۰ لاکھ جرمن نسل کے باشندے ہیں۔ جرمنی اس بات کو ایک عذر بنانا چاہتا ہے، تاکہ ڈیکو سلو ویکیا کے معاملات میں دخل دینے کا ایسے موقع مل جائے، اور آسٹریا کی تاریخ ڈیکو سلو ویکیا میں دوہرائی جائے تو کیا واقعی ڈیکو سلو ویکیا کے اوپر عنقریب مصیبت نازل ہونے والی ہے؟ سویت روس اور فرانس دونوں نے صاف طور سے ظاہر کر دیا ہے کہ بغیر برطانیہ اور دوسری اقوام کی رائے کے وہ ڈیکو سلو ویکیا کو جرمنی سے بچانے کے لئے جنگ سے اعتزاز نہ کریں گے۔ ایسے تو ابھی کچھ عرصہ آسٹریا ہی میں ہٹلر کو اپنی بنیادیں محکم کرنے میں ملے گا۔ کم از کم ہم فیصدی آسٹریا باشندے ہٹلر کے خلاف ہیں اور ہم فیصدی کی آبادی کو غم کرنا جیٹنا نہ سہیا اور زبردستی اپنی رائے کا بنانا کچھ دن لیتا ہے، پھر حال

وسط اور مشرقی یورپ کی چھوٹی ریاستیں ایک مسلسل خطرہ عظیم سے دوچار ہیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب تک برطانیہ کی خارجی پالیسی پمپکین اور لارڈ بیٹیفکس ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے کیا کچھ نہ ہو جائے۔

اگرچہ جنگ کے بعد آسٹریا کا جرمنی میں جذب ہو جانا ایک جائز بات تھی اور زیادہ قابل اعتراض نہیں۔ لیکن آج جس طریقہ سے ہٹلر نے آسٹریا کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ وہ ایک سنگین واقعہ ہے، یہ واقعہ بذات خود اتنا سنگین نہیں جتنا وہ طریقہ ہے جس کو ہٹلر نے آٹو کار بنایا ہے۔ اقوام عالم کی بے بسی اس بات کی مظہر ہے کہ آج دنیا میں بندوق کا بول بالا ہے فسطائیت کی روز افزوں ترقی دنیا کی امن و تہذیب و تمدن کے لئے ایک خطرہ عظیم ہے۔ اگر نازی جرمنی اور فسطائی اٹلی اور جنگ پرست جاپان اسی طرح ہنگام کے دیوتا کی پرستش کے لئے انسانی خون کی بھینٹ چڑھاتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہماری ساری تہذیب و تمدن ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ وقت تھوڑا ہے۔ لیکن ابھی بارہ نہیں بچے ہیں، اور ابھی ممکن ہے کہ اشتراکی اور جمہوری اقوام دنیا سے فسطائیت کی جنگجو پالیسی کو نیست و نابود کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیں۔ مگر کیا ایسا ہوسکے گا؟

(۲۱ مارچ ۱۹۳۷ء)

جنگ عظیم  
نیٹو کی بنیاد  
پیرس میں  
کھلی ہوئی  
سچی بات  
جنگ عظیم  
نیٹو کی بنیاد  
پیرس میں  
کھلی ہوئی  
سچی بات

(رابعہ خان)

# مولانا عبد السلام پر بحاجہ

عبد اللطیف اعظمی

صبح نقد تبصرہ، لٹریچر کی بقا و تحفظ اور ترقی، اصلاح کے لئے ہنایت مزدی ہے۔ لیکن یہ جس قدر اہم ہے، افسوس ہمارے یہاں اسی قدر کم یاب ہے۔ خصوصیت کے ساتھ موجودہ دور میں، اس کی کیا بی ہنایت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے، کیونکہ۔

ادبی تخلیق و ابداع کے سامان کے لئے موضوعات ختم ہوتے جاتے ہیں۔ قول، قصیدہ، مثنوی، سلام، مرثیہ فرض ہر شہ نغم میں بالکل اسی طرح کے خیالات اب بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ جو صدیوں سے ہمارے پاس سنہ بعد نسل چلے آ رہے ہیں۔ عصر حاضر کی مغربی طرز کی فلمیں بھی کوئی نئی چیز نہیں، ان کی ساری جدت اتنے ہی میں منحصر ہے کہ اشعار زیادہ تر ناموزوں ہوں، ایک ہی شعر کے دو مصرعے، دو مختلف بکروں میں ہوں، تشبیہات مغربی ڈالاز سے مستعار ہوں اور زبان محدود و نامالوس ہو، وہی نثر تو متن نامہ سرشار کے زمانے سے اس وقت تک کے نادلی، قصے کہانیاں اور نسانے سوائے معدودے چند کے سب ایک ہی ڈھانچے پر الفاظ بدل بدل کے لکھے جاتے ہیں، زبان میں تنوع ہے اور نہ نفسیاتی تجزیں جو اس طرح کے تخلیقی کاموں کے لئے، جو بڑی حد تک تنقیدی بھی ہیں، بہت زیادہ ضروری ہے۔

لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اگر کوئی نقاد، عام دستور سے ہٹ کر

نہ صرف کے صبح ذرائع انجام دیتا ہے تو اس کے سر کی خیر نہیں! اس کے خلاف تمام ممکن حربے استعمال کئے جاتے ہیں، تعریضات و کنایات، استخفاف و استہزاء، تحقیر و تذلیل کے جتنے الفاظ لغات میں مل سکتے ہیں وہ تمام اس پر صرف کر دئے جاتے ہیں، اسی وجہ سے ہمارے یہاں نقاد بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو بہت بھی ہوئی تو دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی کی سی شخصیت کو اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ تبصرہ نگار مدموم ہوتے ہیں، ان سے غلطیاں ممکن نہیں۔ وہ جو لکھ دیتے ہیں، صبح ہی ہوتا ہے۔ تبصرہ نگار کو صبح راہ دکھانا، ان کی غلطیوں پر انہیں متنبہ کرنا، درحقیقت یہ بھی ادب و زبان کی بہت بڑی خدمت ہے، کیونکہ اُسے ہنایت اجتماعی)

(میں مخصوص اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس کی بے راہ مدی بہتوں کو گمراہ کر دے گی اور لٹریچر کو غیر معمولی نقصان پہونچ جائے گا۔ لیکن لکھنے اور کہنے کے طریقے ہوتے ہیں۔ یہ کیا کہ جو زبان و قلم پر آیا اُسے لکھ دیا۔

ٹیک انہیں خصوصیات کا حامل، اگست کے نیرنگ خیال میں مولانا

اس کے مصنف کی کیا رائے ہے، اور فاضل نقاد کے متعلق جو لکھا گیا اُسے موصوف نے پڑھنا گوارا بھی کیا یا نہیں؟ اگر نہ پڑھا ہو تو ذرا ملاحظہ فرمائیں تکلیف تو ہوگی، وہ لکھتے ہیں۔

مولوی عبد السلام صاحب کی ذات پر دارالافتاء کو جس قدر ناز ہو کہ ہے وہ وقتاً فوقتاً سعادت میں نہایت اعلیٰ درجہ کے معنائیں لکھتے رہتے ہیں۔

سیرت عرب عبد العزیز، امویہ صحابیات، شرابہند حصہ اول و دوم۔

ابن یمن وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ سنا ہے کہ مولانا سبکی کی زندگی کے

حالات بھی مرتب کر رہے ہیں۔ مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئے شرابہند

میں جو نظم کی ایک مضبوط تاریخ ہے، ان اقوال و معانی کو جو مختلف واقعات

میں نظم اردو پر مرتب ہوئے ہیں بفضل اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے

اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابلِ تکریم ہے، اس کتاب کو

تصنیف کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبانِ اردو کی بہت بڑی خدمت

کی ہے۔۔۔۔۔

اس کے بعد چند سطروں میں بعض لوگوں کے اعتراضات کو دہلی زبان سے تسلیم بھی کیا ہے، اور یہ اعتراف ہی حقیقت اس تنقید کی اہمیت اور محبت کا ضامن ہے، اگر مصنف محض تعریف پر اکتفا کرتا، جیسا کہ آپ جہانِ آرزو کے ہر تبصرہ نگار سے منتہی ہیں، تو اس کی حیثیت تقریباً زیادہ نہ ہوتی۔

مولانا عبد الحق صاحب نقاد کی حیثیت سے بہت بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ تعصب اور شخصیت پرستی سے بہت بلند ہیں اسی وجہ سے اُن کے رسالہ اردو کی تنقیدوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ شرابہند کے متعلق اس رسالہ کی کیا رائے ہے؟ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

فاضل مولف نے چنانچہ ان کی دسترس تھی، دو لاکھ پونوں پر پہلی

بحث کی ہے اور تحقیق کی داد دی ہے۔ تاہم بعض خدشات نشہ رہ گئے ہیں۔

جو جو قدیم چیزیں دستیاب ہوتی جائیں گی، تحقیق کا میدان وسیع ہوتا

جائے گا۔ ہر زمانہ کے تحت میں شعراء کے کلام سے نونے کے اشارے کافی

دے سکتے ہیں۔ اور ہر عنوان کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اور اس کی

ساری کیفیتیں کلامِ نونے کے ساتھ بتائی گئی ہیں۔

یہ کتاب اردو شاعری پر بہت قابلِ قدر ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے

ہی کہ قابلِ مولف نے ہر پہلو کا موازنہ نہایت انصاف اور سچائی سے کیا ہے

لے محمد نضر صفحہ ۷۷

عبد السلام صاحب مذہبی کے متعلق ایک معنون شائع ہوا ہے، معنون کیا ہے مگالوں کا مجروح، صرف اس قصور پر کہ مولانا نے سعادت بابت ماہِ فردی میں چھان آرزو پر تبصرہ کیا تھا اور اُس کی خامیوں کو بھی ظاہر کیا تھا، یہ مصنف کے مستفیدین کو پسند نہیں آیا، پھر کیا تھا،

یا دیکھیں جتنی دعائیں صرف ضرورتوں پر لکھی ہیں

میں نہ لکھا، کیونکہ کسی مسئلہ پر تمام لوگوں کا اجتماع ناممکن ہے، لیکن فاضل مجیب کی ہنر اور طریقہ نگارش نے لکھنے پر مجبور کیا۔

محترم مجیب کالب و لہجہ نہایت ورثت اور نادر ہے، اگر ان کے نزدیک مولانا محترم کے اعتراضات غلط تھے تو آدابِ شرافت و صحافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی، ان کی تردید ہو سکتی تھی۔ تعریضات و کنایات اور ذاتی حملوں کی کیا ضرورت تھی۔

معنون میں فاضل نقاد کی ادبی قابلیت پر بھی بحث کی گئی ہے اور ایڈیٹر اودھ دھج کے اڑائے ہوئے چھیڑے پیش کر کے، ادبی میدان میں اُن کی شکست پائی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

عملی اور ادبی میدان میں مولانا کو جو حیثیت حاصل ہے، اُس کے متعلق چنداں لکھنے کی ضرورت نہیں، یہ باطل مسلم ہے اور سورج کی طرح روشن۔ فاضل مجیب اگر تھوڑی دیر کے لئے، اپنی تعصب کی مینک اتار کر، ان کی کسی اور کتاب کو نہیں، شرابہند کو جو اُن کے نزدیک مصنف کی بدذاتی تنقید کا کچھ نگاہی اور ادبی شکست پائی کی آئینہ دار ہے، پڑھیں تو مصنف کی عملی و ادبی قابلیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آپ کے الفاظ میں اس کے چھیڑے اڑائے گئے ہیں، لیکن اس کے لکھنے والے، آپ کے سے، صرف چند ہیں، اور تعریف کرنے والوں کے مقابلے میں ان کو مطلق اہمیت حاصل نہیں ہے۔ مگر چونکہ مجیب پرستی سے اعظم گدہ کے لوگوں پر خاص طور پر جہر بان ہیں، اس لئے ظاہر ہے وہ تبصرے ان کی نظر سے نہیں گزرے ہوں گے، لیکن اگر وہ تحقیق کرنی چاہیں تو آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اودھ دھج کی جلدوں کی طرح وہ بھی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ صرف اودھ دھج کے اڑائے ہوئے چھیڑے ہی نہیں پڑھنا چاہئے۔ سرشار کے دندان شکن جوابات پر بھی نگاہ ہونی چاہئے۔

تاریخِ ادبِ اردو، مجیب کی نظر سے ضرور گزری ہوگی، معلوم نہیں



دوسرے ماہ فقیر پھر آیا اور حسب سابق لکڑی کافی اور دام لے کر چلا گیا۔ اس بار وہ پیسے سے بھی خفیف و کمزور معلوم ہو رہا تھا، مگر کسی نہ کسی طرح اس نے کام کر دیا۔ کبھی کبھی اُسے مختلف کام بھی کرنا پڑتے تھے۔ کبھی جھاڑ دیتا۔ لکھات اور گڈے صاف کرتا اور کبھی لکڑی کاٹتا۔ غرض کہ وہ اسی طرح کام کرتا اور دام وصول کرتا رہا۔

خورشید کبھی کبھی ترس کھا کر اُسے قیص اور پانچا سمی دیدیتا تھا۔ جب وہ کام کر کے جانے لگتا تو خورشید اُسے مطالبے کے کمرے میں بلاتا، اُس سے میز، کرسی، درمی، اور کھڑکیاں صاف کرواتا۔ فقیر نہایت سنجیدگی سے اُس کی ہر فرمائش اور اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا، لیکن کبھی کسی سے کلام نہ کرتا۔ اُس کے کمرے میں اور جو لوگ بیٹھے ہوتے وہ اُسے دیکھ دیکھ کر ہنستے۔

ایک دن جب وہ کام ختم کر چکا تو خورشید نے اُسے بلا کر کہا: "سنو دوست، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے الفاظ رائگان نہ گئے، اور تم نے اُن سے اثر لیا اور اب تم کام کی طرف توجہ کرنے لگے ہو، لو یہ اسٹی۔ اچھا تمہارا نام کیا ہے؟"

"فیروز۔"

"فیروز، میں چاہتا ہوں کہ تمہیں تمہاری حیثیت کے مطابق کام دلوں۔ کیا تم لکھ پڑھ سکتے ہو؟"

"ہاں، جناب، بہت اچھی طرح۔"

"ادھر آؤ، یہ رقعہ لو اور میرے ایک کالج کے دوست جو فلاں دفتر میں ہیں اُن کو دیدینا، وہ تمہیں نقل کا کچھ کام دیدیں گے، اُس کو نہایت احتیاط سے انجام دینا۔ اور سنو، مستعدی سے کام کرنا، جس نہ پینا، کبھی نہ پینا۔ اور دیکھو میرے الفاظ ہمیشہ یاد رکھنا۔ اچھا..... خدا حافظ۔"

خورشید یہ سمجھتے ہوئے کہ اُس نے ایک غریب و ناکارہ فرد کو کسی قابل کر دیا، بہت خوش تھا، اُس نے فیروز کو آفرین کہتے ہوئے رخصت کر دیا، اور رخصتی کے وقت اُس سے ہاتھ بھی ملایا۔ فیروز نے رقعہ لیا اجازت چاہی اور سلام کر کے کمرے کے باہر نکل گیا اور اُس کے بعد پھر کبھی اس آواز سے نہیں آیا کہ اُسے لکڑی چیرنا ہے۔

اس کے علاوہ خورشید بھی دلجو رہا تھا کہ جس نے اُس کی حالت بدستور کر دی تھی، اور نہ صرف یہ کہ وہ دُعا کمزور اور کام کے قابل نہ معلوم ہوتا تھا، بلکہ اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُسے حرارت بھی ہے۔ خورشید کھانے کے کمرے میں جا کر کھڑکی سے دیکھنے لگا۔ جہاں سے لکڑی کی کوٹھری اور میدان صاف نظر آ رہا تھا۔

بادرچن آگے آگے جا رہی تھی، اور فقیر پیچھے پیچھے۔ بادرچن نے راستے میں اپنے ساتھی کو غور سے دیکھا، سمجھ گیا اور اُس کے بعد لکڑی کی کوٹھری کے پاس پہنچ کر تالا کھولا، اور دھنکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بادرچن کسی کام میں مصروف تھی، اور اُسے موقت بلانا ناگوار گزرا۔ خیر، خورشید نے خیال کیا۔

بھکاری ایک لکڑی کے کندے پر بیٹھ گیا، اور اپنے سر کو ہاتھ کا سہارا دے کر کچھ سوچنے لگا۔ بادرچن نے کھانا اُس کے قدموں کے پاس پھینک دیا، اور کچھ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی، جیسے اُس کو گالیاں دے رہی ہو، فقیر نے بے پروائی سے ایک گنڈا اٹھالیا، اور اپنے پیروں کے درمیان مضبوطی سے پکڑ کر اُسے چیرنے لگا۔ لیکن جیسے ہی اُس نے کندے پر کھانا ڈالی چلائی گنڈا اچھل کر دُور جاگا اور فقیر کو دکر دوسری طرف۔ فقیر نے پھر اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور ڈرنے لگا کہ مبادا کھانا ڈالی اچھل کر اُس کی پیر کی انگلی کو زخمی کر دے۔ آخر اُس نے دوبارہ کھانا ڈالی چلائی، اور اس بار لکڑی اچھل کر دُور جاگ گئی۔

خورشید کھڑکی کی آڑ سے یہ سب کرشمے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے اوپر نفرت کر رہا تھا کہ ناحق اُس نے ایسے ناکارہ آدمی کو ایسے سخت کام پر مقرر کر کے اپنے سر عذاب مول لیا۔ وہ اس وجہ سے اور پریشان تھا کہ وہ مر لیں بھی تھا۔

"کوئی حرج نہیں،" اُس نے آخرش خود ہی کہا، "میں جو کچھ کر رہا ہوں اُس میں اُمی کا فائدہ مضمر ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ اپنے مطالبے کے کمرے میں چلا گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد بادرچن نے آکر اطلاع دی کہ لکڑی ختم ہو گئی۔ "لو، یہ اسٹی اُس کو دیدو،" خورشید نے کہا۔ اور اُس سے کہہ دو کہ ہر ماہ کی پہلی کو وہ اسی طرح آکر لکڑی کاٹ جایا کرے۔ وہ کبھی داپس نہیں کیا جائے گا۔ کوئی نہ کوئی کام اُسے منور دیا جائے گا۔"

رفتہ رفتہ دو سال گزر گئے۔

ایک دن خورشید عکاس خانے کے پاس کھڑا تھا اور ٹکٹ خرید کر دم کی داپھی کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے اپنے نزدیک ایک چھوٹے آدمی کو کھڑے دیکھا۔ وہ گرم نیلے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اُس نے ٹکٹ سے ٹکٹ کے لئے کہا اور دام دے کر انتظار کرنے لگا۔

”اغاہ فیروز صاحب آپ کہاں ہیں؟ خورشید نے اپنے لکڑا ہارے کو پہچانتے ہوئے کہا: کہو بھائی، اچھے تو ہو“

”بہت اچھا جناب۔ میں بالکل بے نیت ہوں اور آج کل ایک مغز میں ہتھم کی حیثیت سے دن سو رہا ہوں اور پر ملازم ہوں۔“

”بڑی خوشی کی بات ہے۔ فیروز صاحب، میں یہ سن کر بہت مسرور ہوں، اتنی خواہ تو کافی ہے تھا۔ سہ لے۔ تم جانتے ہو تم کسی نہ کسی بیج سے میرے جیلے ہو۔ نہیں یاد ہے کہ میں نے نہیں کس طرح راہ راست پر لگایا۔ اگر میں اُس دن تم پر اتنا خفا نہ ہوتا، اتنا سخت سست نہ کہتا تو شاید آج ہمیں یہ دن بچنا نصیب نہ ہوتا، میں تمہارا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے میرے الفاظ تو منائے نہ ہونے دئے۔“

”اس میں کلام نہیں کہ اگر میں اُس دن آپ کے پاس نہ جاتا تو اس وقت تک اپنے کو متعلم و متعلم کی خلیج ہی میں گھنسا ہوا پاتا اور اب تک اسی مغسی اور ناکامی کی زندگی بسر کرتا ہوتا۔ میں بلاشبہ آپ کی وجہ سے سنبھلا اور منہل کے غار سے نکل آیا۔“

خورشید نے کہا: ”میں تم سے بہت خوش ہوں۔“

”اور میں بھی آپ کے گزشتہ الطاف و عنایات کا بیش از بیش شکر یہ ادا کرتا ہوں، آپ نے مجھے اُس دن جو رائے دی تھی وہ بالکل صائب تھی، میں آپ کا نہایت ممنون ہوں اور خصوصاً نصیب باورچن کا، وہ رحمدل اور شریف عورت۔ میں آپ کا احسان قیامت تک نہیں بھول سکتا۔ لیکن حقیقتاً وہ صرف نصیب باورچن کی ہستی تھی، جس نے مجھے اُس عذاب سے نجات دلائی۔“ میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو، خورشید نے کہا۔

”سنئے، واقعہ یہ تھا۔ فیروز نے کہا: ”میں تو آپ کے یہاں ہر ماہ لکڑی چیرنے کی غرض سے آتا تھا، لیکن بہت نحیف و زار تھا۔ مجھ میں چلنے کی تاب نہیں تھی۔ لکڑی کیسے چیرتا، باورچن میرے سامنے کندوں کا ڈھیر

لگا دیتی اور میں کھماڑی لے کر چیرنے کھڑا ہوتا، ایک ضرب لگتا تو دس منٹ دم لیتا۔ غریب باورچن دیکھنے آتی اور آخر دم کھا کر خود لکڑیاں چیر دیتی۔ میں آخر وقت اُٹھتا آپ سے دام لیتا اور خوش خوش چلا جاتا، آپ کو سنکر تعجب ہو گا کہ میں نے آپ کے یہاں ایک بار بھی لکڑی خود نہیں چیری۔“

خورشید یہ سن کر سخت تعجب ہوا، اور غصہ ہو کر بولا۔

”ناشدنی، خدا تجھے سمجھے۔ ہر سمت آدمی۔ نہ تیرے لئے یہاں سکون

ہے نہ آخرت میں۔“

لیکن آپ یقین کیجئے جب وہ لکڑی چیرتی ہوتی تو میں اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا مجبور ہوا کرتا اور شرما یا کرتا، اُس نے متعدد بار میرے حال پر تہمت لگایا۔ مجھے سمجھایا اور آخر کار میں بھی رفتہ رفتہ سمجھا کہ آخر میں تو جو کچھ کرتا ہوں کرتا ہوں۔ لیکن میری وجہ سے اس باورچن کو کیوں تکلیف ہو، چنانچہ میں نے چرس پنا چھوڑ دیا، اور اُس کے بعد سے میری حالت سدھرنے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف باورچن تھی جس نے مجھے فرس سے اٹھاکر عرش پر بٹھا دیا۔

”خیر وہ میں ہوں یا باورچن، مدعا تو تمہارا سدھرنا تھا سو وہ پورا ہو گیا۔“

(پچھوت)

## تلاش حق

خدا کو بزم امیری میں ڈھونڈنے والو

نشاں شباب کا پیری میں ڈھونڈنے والو

خدا تمہیں نظر آتا ہے زر پرستی میں

خدا کو ڈھونڈتے ہو تم فراخ دستی میں

تلاش حق میں بھٹکتے ہو کچھ خیال کرو

خدا کہاں ہے غریبوں سے یہ سوال کرو

(سید فیضی جاندھری)



# حساس بھکاری

لطیف شاہد

اور اُس دن تو نے کہا تھا کہ میں ایک غریب طالب علم ہوں، اسکول سے نکال دیا گیا ہوں۔ اور اب کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔  
کیوں، تجھے یاد ہے یا بھول گیا؟ اور آج تو کہہ رہا ہے کہ میں مدرس ہوں؟

”نہیں حضور..... کبھی نہیں“ اُس نے ٹھہرا کر کہا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں مدرس ہوں۔ اگر آپ کو کچھ شک ہے تو میرے کاغذات دیکھیے۔“  
”بالکل جھوٹ، تین دن کی بات میں بھول نہیں سکتا۔ تو نے صاف سنا کہا تھا کہ میں طالب علم ہوں، بلکہ یہ سچی بات یا تھا کہ اسکول سے کیوں نکالا گیا..... ذرا یاد کر؟“

خورشید غفہ سے سُرخ ہو گیا اور اُس نے اتنا کہہ کر بھکاری کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ جناب بڑی ذلت کی بات ہے، میں جھوٹا نہیں۔“ اُس نے اٹھار پر دور سے کر کہا، ”غریب، سراسر غریب..... میں تجھے پولیس کے حوالے کروں گا، غدار کہیں کا۔ تو غریب ہے، بھوکا ہے۔ یہ سب صبح ہے مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ تو اس دلیری سے جھوٹ بولے؟“

بھکاری نے مایوسی سے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی، گویا وہ ایک قفس میں قید ہے، اور نکلنے کے لئے راستے کی فکر میں۔

”جھوٹ؟ میں جھوٹ ایک حرف نہیں کہتا۔ آپ باور کیجئے اور میری اسناد دیکھ لیجئے۔“ فقیہ نے جھنجھلا کر کہا۔

”اب یقین کسے آ سکتا ہے“ خورشید نے دیا وہ ترش رو ہو کر کہا کہ کس

”لکھ، مجھ پر رحم کیجئے..... میں سخت بھوکا ہوں۔ میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔..... میرے پاس ایک پائی نہیں جو کچھ دے لیتا۔..... سرکار! مجھ غریب پر ترس کھائیں..... رحم کیجئے..... آپ باور کیجئے، میں ذلیل آدمی نہیں، آوارہ نہیں۔ شریف ہوں۔ ایک سال قبل قصبے میں مدرس تھا، جھوٹی شہادت کے الزام میں نکال دیا گیا۔..... اور..... اب تک بیکار ہوں۔..... پریشان ہوں۔..... خدا کے لئے مجھ تکس کی مدد کیجئے۔..... میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

خورشید نے ایک نگاہ غلط انداز اُس پر ڈالی، اُسے اُس کا پٹا ہونا نیلا کوٹ چڑھی آنکھیں اور داغدار گال دیکھ کر اُسے خیال ہوا کہ شاید اُس نے اس سے قبل اُسے کہیں دیکھا ہے۔

”اور سرکار! فقیہ نے ذرا دم لے کر کہا۔“ فلاں شہر میں ایک اسامی خالی ہو لیکن کیا کروں۔ میرے پاس ایک جہ نہیں۔ خود بھوکوں مر رہا ہوں، کرایہ کہاں سے لاؤں۔..... حضور میری مدد کیجئے..... خدا آپ کو اس کا اجر عطا کرے گا۔..... گوجے سوال کرتے شرم آتی ہے۔ لیکن کیا کروں حالات سے مجبور ہوں؟“

خورشید نے اتنی دیر میں اُسے خور سے دیکھ لیا، اور اُس کے غیر معمولی لمبے رُڑکے جوتے دیکھ کر جو گھٹنوں تک مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے ذرا یقین کر لیا کہ وہ اُسے دو روز قبل دیکھ چکا ہے۔

”میں نے تجھے حرموں گلی میں اسی حالت میں دیکھا ہے“ خورشید نے کہا

کیونکہ بن کی بات ہے کہ تو اپنے کو طالب علم اور مدرس بنا کر نہ صرف لوگوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے بلکہ مستحقین کا حق بھی غضب کرتا ہے :

فقیہ کے مرتج جھوٹ سے غور شید کو بہت رنج پہونچا، وہ بہت رحمدل واقع ہوا تھا اور نہ صرف غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ اسے ہمدردی تھی بلکہ وہ ان کی واسے درے امداد بھی کیا کرتا تھا، لیکن اس فقیہ کے امرا اور جھٹلنے پر اسے سخت عیش آیا۔ پیسے تو اس نے اسے بیت زجر و توبخ کی، بہت برا بھلا کہا۔ مگر آخر اس نے عہد کر لیا کہ اب وہ ان غریب حرامزادوں کی مدد کر کے ان کے کاروبار کو فروغ دے گا۔

فقیر بھی اس کی باتیں سن لیا اور خاموش رہا۔ وہ اس قسم کی باتیں سننے کا عادی ہو گیا تھا، پہلے تو وہ اپنے الفاظ کی حمایت کرتا رہا۔ پھر کھائیں اور یقین دلایا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کے قریب میں آنے والا نہیں، اور اس پر یہ چال نہیں چل سکتی، تو وہ خاموش ہو گیا اور آخر کار شرم سے مغلوب۔

سرکار، اس نے بنایت مجاہدت سے کہا۔ آپ سچ فرماتے ہیں، میں جھوٹا ہوں۔۔۔۔۔۔ بالکل جھوٹا، لیکن آپ ہی فرمائیں کہ میں اس کے سوا کہی کیا سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔ یقیناً میں مدرس نہیں ہوں اور نہ طالب علم۔ یہ سب میرے دماغ کی اخترا ہیں۔۔۔۔۔۔ میں گویا ہوں۔ چونکہ جس پیسے کا عادی تھا، اسی لئے بہت جلد میری صحت خراب ہو گئی اور میں کام کے قابل نہ رہا اور نکال دیا گیا۔۔۔۔۔۔ اب اگر میں اپنے واقعات صحیح صحیح بتلاؤں تو مجھ پر کون ترس کھائے گا، کون میری مدد کرے گا۔ اگر میں سچ بولتا ہوں تو اب تک کب کا بھوک اور جائے کی شدت سے مر چکا ہوتا۔۔۔۔۔۔ یقیناً آپ جو کچھ فرماتے ہیں بالکل صحیح ہے اور میں سمجھ بھی گیا ہوں، لیکن خدا کے لئے آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ میں اس کے سوا کہی کیا سکتا ہوں :

مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں اس کے سوا کیا کروں "غور شید نے اس کے نزدیک جا کر چپختے ہوئے کہا۔ میں بتلاؤں۔۔۔۔۔۔ کوئی دھنداکر۔۔۔۔۔۔ دھنداکر :

کام۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ سرکار۔۔۔۔۔۔ کام مجھے ملتا کہاں ہے؟ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مجھے کچھ کرنا چاہیے :

بالکل لغو۔ نوجوان ہے۔ تندرست ہے اور اگر جاہ ہے تو تجھے کام آسانی سے مل جائے۔۔۔۔۔۔ لیکن تجھے معلوم ہے، تو کاہل ہے۔ کام چور ہے۔ جس پتیا ہے، اور جس نے تجھے بالکل ناکارہ کر دیا ہے، اور اب تجھ کو اس کے سوا اور کوئی دمن نہیں : اگر اب بھی تو اپنی حالت سنبھال لے تو کسی نہ کسی فقر میں معمولی ملازمت مل سکتی ہے۔ کسی خانے میں اب بھی کام کر سکتا ہے۔ مگر تجھ سے اب محنت ہو ہی نہیں سکتی۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ تو معمولی سے معمولی کام بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس میں تو تیری توہین ہوتی ہے :

مکن ہے آپ کا فرمانا صحیح ہو۔ فقیر نے تیغ قسم کے ساتھ کہا، میں اب اس قسم کے کام کیسے حاصل کر سکتا ہوں۔ اب میرے لئے یہ شکل ہے کہ میں کئی دکان پر کام کروں۔ کیونکہ اس کام میں سخت تجربے کی ضرورت ہے، اور اب مجھے کوئی معمولی کام بھی کیوں دینے لگا۔ میں کسی کارخانہ میں کام کے قابل نہیں۔ کسی کاروبار کے لئے سرمایہ نہیں۔ پھر آپ ہی بتائیں میں کیا کروں :

لغو۔ تم ہمیشہ اپنے ناکارہ ہونے کا کوئی نہ کوئی عذر ڈھونڈ لیتے ہو۔ کیا تم لکڑی نہیں چیر سکتے :

میں اس کام سے انکار تو نہیں کرتا۔ لیکن اس کام واسے بھی تو مارے مارے پھر رہے ہیں :

اسے سب کام چور اسی طرح حجت کرتے ہیں اور اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم لکڑی چیر سکو تو میں تمہیں دوں۔ جناب مالی، میں بہت ممنون ہوں گا : اچھی بات، مجھے دیکھنا ہے کہ تم۔۔۔۔۔۔ :

غور شید نے جو اتنی طویل اور بے جا بحث سے عاجز ہو چکا تھا، اپنی باورچن نصیب کو آواز دی۔

نصیب، سنو، تمہیں لکڑی چیرنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے، اس لئے اس آدمی کو لے جاؤ۔ اور اس سے لکڑی کٹواؤ :

فقیر جو بالکل ساکت کھڑا تھا، ہاتھ پیر جھٹک کر باورچن کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا، گو اس کی نقل و حرکت اور انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے الفاظ دے کر سخت پشیمان ہے، اور صرف اپنے الفاظ کی وجہ میں لکڑی کاٹنے کے لئے جا رہا ہے۔ مگر وہ اس کے سوا کہی کیا سکتا تھا کہ وہ سخت بھوکا تھا، اور اب اس کی بھوک صند کی حد سے گزر چکی تھی۔

اور مدحتی تعصبات اور مکی خیالات کی مطلق پرمادہ نہیں کی ہے۔

شہر میں زمانہ میں دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے متعلق ایک معنون شائع ہوا تھا، محض نثار مولانا عبد السلام صاحب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

مولانا کی ایسی خصوصیت صرف ادب و انشائیہ ہے۔۔۔۔۔ آپ غلط

ادیب پیدا ہوئے ہیں، اس لئے آپ کی قلم کا محور صرف لٹریچر ہے۔

ان کے فقرے نہایت مختصر فصیح اور برسبند ہوتے ہیں، اور وہ

نظم و نثر دونوں پر قادر ہیں اور دونوں کو اس انداز سے لکھتے ہیں کہ

اس کی تنقید نہیں ہو سکتی۔

استقصا و مقصد و ہمیں، اور نہ اس کی ضرورت، مولانا کی قابلیت اس قسم کے

ثبوت سے بالا ہے، اور نہ دفتر کے دفتر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

رہا آپ کا یہ فرمانا کہ شعر الہند کے حقیقہ پرے اڑائے گئے ہیں، اُسے نا

کمل ثابت کیا گیا ہے، تو یہ کوئی نئی اور تعجب کی بات ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی

تصنیف ہے جس کے حقیقہ پرے اڑائے گئے ہوں، جس کے مصنف پر فقرے

نہ کئے گئے ہوں، خصوصاً اس جماعت پرستی کے دور میں؟ یہ تو عام تعصبات

کی کیفیت ہے۔ تنقیدی کتابوں اور تبصرہ نگاروں کی جو گت بنتی ہے، وہ موجود

دور کا نہایت ہی اناک اور شرمناک واقعہ ہے۔

معنون نگار کے نزدیک شعر الہند کا مصنف چنان آرزو پر تبصرہ کرنے

کا اہل نہیں۔ لیکن

بکس و نا کس ہے نقد تبصرہ کا مدعی؛ زندہ رہنا اہل فن کا آج کل دشواری

لکھدی شعر الہند جب کا غلط نام لگایا شعر کہنے کے لئے خون جگر درکار ہے

کے کہنے والے کو وہ شعر الہند پر تنقید کرنے کا نہ صرف حق دیتے ہیں بلکہ اس کی

رائے کو قابل ثبوت سمجھتے ہیں، سچ ہے، دوسروں کی آنکھ کا شکاہیت آسانی

سے نظر آجاتا ہے، اور اپنی آنکھ کا شبہ تیر نظر نہیں آتا۔ جو شخص چار مصرعے بھی

صحیح نہ کہہ سکے، جسے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ مترادف الفاظ میں ترکیب اضافت

جائز نہیں۔ وہ شعر الہند پر کیا تبصرہ کر سکتا ہے اور اُس کے تبصرے کو کیا حجت

دی جاسکتی ہے۔

محب نے اُسے یا تو اس لئے نقل کر دیا کہ یہ اُن کے کوئی بزرگ ہیں اور

شعر الہند کے خلاف لکھا ہے، اس بحث نہیں کہ شعر کہنے والا تنقید کی اہلیت سے

لے اردو المودعہ

کس قدر معرا ہے اور پھر اُن کے نزدیک تنقید کے لئے کسی خاص صلاحیت

کی ضرورت نہیں، ہر وہ شخص جسے قلم پکڑنا آجائے، وہ تبصرہ کر سکتا، حالانکہ

(۱) نقاد کو ادب کی معلومات اور اس کے متفرق شعبوں کی خصوصیات سے

واقف رہنا چاہئے، نیز متفرق اصناف سخن کی اصطلاحات کے متعلق

دماغی پرہیزی اُس کو کافی عبور ہونا ضروری ہے، تاکہ جہاں کہیں مصلحت

آئیں، وہ ان کی تمام مہیبتات سے واقف ہو جائے۔

(۲) تاریخ پر اس کی گہری نظر ہونی چاہئے، اسی کے تمام ادبوں اور

صنعتی دوروں کی نشوونما اور عروج و زوال سے اس کو کافی واقفیت

ہونی ضروری ہے، اور نہ بہترین سے بہترین تنقیدی سحر پرچہ ایک

شاندار لیکن پادروا عمارت ثابت ہوگی۔ (اردو تنقید صفحہ ۱۱)

محب کا یہ کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی میں ایک

مصرعہ بھی سوزوں نہیں کہا، اگر وہ معارف کا مطالعہ کرتے تو اپنی بے خبری

کا ثبوت نہ دیتے، لیکن جب محب کے نزدیک بھی غیر شاعر کو شاعری پر تنقید

کا حق حاصل ہے تو پھر مولانا عبد السلام صاحب نے کیا تصور کیا ہے کہ انھیں

یہ حق نہ دیا جائے، کیا صرف اس وجہ سے کہ آرزو لکھنوی کی اُسنوں نے اندھ

کی طرح محض تعریف پر اکتفا نہیں کیا؟

معنون نگار نے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے استدعا کی ہے

کہ باب الانتقاد کے فرائض، وہ اپنے ذمے لیں۔ لیکن اس کی کیا ضمانت

ہے کہ کل اگر مولانا سید سلیمان صاحب نے آرزو صاحب کی شان میں کوئی

تقریبی قصیدہ نہ کہا تو یہی مطالبہ ان سے نہ کیا جائے گا اور اُن کے خلاف

اسی طرح خلافت نہ اچھالی جائے گی، جس طرح چنان آرزو کے نقاد کے

خلاف اچھالی گئی ہے۔

اعظم گڑھ سے، داخل معنون نگار کی سرگرمی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی

معدا اعظم گڑھ سے بلند ہوتی ہے، تو چاہے وہ اپنی جگہ کتنی ہی صحیح، کتنی ہی

اہم اور کتنی ہی ضروری ہو، وہ انکار کر دیتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ

اعظم گڑھ سے آئی ہے، چنانچہ آصف مرحوم اور جگر کی خوش بیانی اور قنادی

کے اعتراف کے باوجود، ان سے صرف اس لئے ناراض ہیں کہ اُن کی نظر

اعظم گڑھ سے کی گئی ہے، محب کا ذہنی تضاد ملاحظہ ہو، وہ سید صاحب

سے درخواست کرتے ہیں کہ باب الانتقاد اپنے ذمے لیں، یا کم از کم

دیوانی اور ادبی کتابوں پر طبعاً فرمایا کریں اور جب وہ لکھنؤ کو علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں کا مرکز بن گئے ہیں تو انہیں پیکرِ انشا مولانا اور قبلہ و کعبہ سب کچھ کہا جاتا ہے، لیکن وہی محبوبِ جگر کے دیوان پر مقدمہ لکھتے ہیں تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے اور انہیں جگر کا کنڈیڈٹ کہا جاتا ہے۔ محترم مجیب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”مولانا کے اس رویہ پر میں وہ جذبہ بھی شریکِ حال ہے جس کا مظاہرہ لکھنؤی اور غیر لکھنؤی شاعری کی بحث میں برہنہ کے ہاتھ اور بعض دوادین کے دیباچوں اور مقدموں میں اکثر نظر سے گزرتا رہتا ہے۔“

علامہ سید سلیمان کے ایک خطبہ صدارت کی کچھ عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں۔

”آگے چل کر لکھنؤ کی خدمات کا اعتراف جن الفاظ میں کیا ہے وہ عبدالسلام صاحب ندوی نے مزدور دیکھا ہوگا۔ ہجرت کا مقام ہے کہ ایک انصاف کا پتلا اور دوسرا دسرتا پانصاف کا کالہ ہو کر رہ گیا۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مولانا عبدالسلام صاحب کی کس تحریر سے فاضل مجیب نے یہ نتیجہ نکالا ہے، کیا جہاں آرزو کے تبصرے سے؟ اگر معنوں نکال لکھنے سے پہلے مرثیہ ساروت اور ہندوستانی کی جلدیں دیکھ لیتے تو انہیں اس الزام کی جرأت نہ ہوتی۔

افسوس اس وقت میرے پاس شعر آئند موجود نہیں اور قریب کے کسی کتب خانے میں بھی اتفاق سے نہ مل سکی، ورنہ دکھاتا کہ انہوں نے کتنے متنا پر لکھنؤ کی علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے، مولانا کا ایک معنون مشاعرہ کے عنوان سے البتہ پیش نظر ہے، یہ نظم گڑبگڑ کے ایک شاعر سے پڑھا گیا تھا اور محافل میں شائع ہو چکا ہے مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”آئی کے تباہ ہونے کے بعد جب لکھنؤ اردو شاعری کا مرکز قرار پایا تو جہاں شاعروں نے اور بھی رونق حاصل کی، یا مخصوص شہزادگانِ دلی نے جو لکھنؤ میں آ رہے تھے، ان کی رونق کو اور بھی دوبالا کیا۔۔۔۔۔ ان کے لفظ سے فنِ تنقید کو جو شاعری کا ایک لازمی جزو ہے، بنیاد ترقی ملی تھی چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آبجیات میں اس قسم کے بیٹے

تنقیدی بحثیں لکھے ہیں جو انہیں شاعروں کی پیداوار ہیں، شہ خان لکھنؤ کے مکان پر مشاعرہ تھا، مولانا نے مطلع پڑھا

آرزو قطراتِ عرق دیکھیں کہ اختر پڑے بجائے ہیں فلک پر سے زمین

خان آرزو نے فرزندِ قدسی کا ایک مطلع پڑھا۔

آرزو قطراتِ عرق دیدہ ہیں را اختر فلک سے نگر دوئے زمیں

ہاں! ان سے یہ قصور سزاوارد ہوتا ہے کہ تبصرہ کرنے وقت نقائص کو بھی

ہنایتِ جرأت کے ساتھ ظاہر فرمادیتے ہیں، اور اس کا مطلق خیال نہیں کرتے

کہ صاحبِ دیوان یا مصنف لکھنؤی ہے یا غیر لکھنؤی، معنوں نگار کے مدد

کے استادِ ملک سید عثمان علی جلال لکھنؤی کی شاعری کے متعلق، مولانا کا

جو معنون ہندوستانی میں شائع ہوا ہے غالباً وہ معنون نگار کی نظر سے نہیں

گزرنا، ورنہ شاید وہ اس الزام کی جرأت نہ کرتے۔

گو معنوں نگار کے جواب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ

مرثیہ مجیب کے اس ناردار روئے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی تھی،

جو جواب کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا تھا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاعری

کا ذوق سے ہیبت گہرا تعلق ہے، ناگہن ہے کہ کوئی شاعری پر تنقید کرے

اور اس کے ذوق کو اس میں دخل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی دیوان پر

متعدد تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ جو صحیح ہے کہ مرثیہ ذوق ہی کی کار فرمائی نہیں

ہوتی، بعض دوسرے جذبات کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ مگر اس کا اثر سب پر غالب

رہتا ہے بلکہ ہے میرا خیال غلط ہو۔ مجھے اس کی صحت پر چنداں اصرار نہیں،

مگر خود میرا یہی پر عمل ہے۔ لیکن جب یہ بحث چھڑ گئی ہے تو ذوقیات سے علیحدہ

ہو کر جہاں تک اصول کا تعلق ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تو بہتر ہوگا۔

مولانا عبدالسلام صاحب جہاں آرزو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”ملک سید عثمان علی جلال، لکھنؤ کے ان شعراء میں تھے جنہوں نے سب

سے پہلے لکھنؤ کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا اور فارسی معنائیں یعنی خال

و خط، ذلت و اکمال اور محرم اور دوپٹہ کو چھوڑ کر جذبات و عمارات کو

اپنا سرمایہ تغزل بنایا۔ ان کے تلامذہ نے بھی یہی روش اختیار کی ہے،

اور ان میں سید ابو رحیم آرزو نے اس روش کو اس قدر ترقی دی کہ

اب ان کا شمار دو جدید کے شعراء میں کیا جاتا ہے، اس مہدی رنگ میں

ان کا دوسرا ایمان چھاتی آرزو کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس سے پیش نظر ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے ان کے کلام کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) وہ بہت سی غزلوں میں نامانوس قافیہ استعمال کرتے ہیں۔ جن کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے شعرا غزلوں میں نامانوس کو بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

دہلا شعرا یہ دوئی کب تک بد دل کو سوز غم سے لگ ہے  
جل اٹھی ہیزم تو ہر ہیزم نہیں ہے آگ ہے

جواب۔ نامانوس قافیوں سے کیا مراد ہے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ واگ ل کو اگر قافیہ قرار دیا جائے تو یہ قافیہ محدود تو ہیں مگر غیر مانوس کس جہت سے ہیں؟ کیا محدود قافیوں میں غزل کہنا قافیہ جرم، اخلاقی کمزوری یا ادبی گناہ ہے۔

گزارش۔ دوسرا اعتراض عجیب نے تسلیم کیا ہے، اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ قافیہ جرم یا ادبی گناہ ہے تو اس سے اہل علم اور ادبی ذوق رکھنے والے بخوبی قناعت ہیں۔ غیر مانوس کا مطلب جو کہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہے، اس لئے اس فیصلے کا انہیں کوئی حق نہیں۔ پہلے سمجھ لیں پھر جواب دینے کی کوشش کریں۔

مراشر۔ کم التفات پر ہی شوقِ دل کو سمجھ رہی ہے  
گننا درخت نہ ہو چھاؤں تو گنہ گری ہے  
مراشر۔ دم بخود بیٹھ کے خود جیسے زبان کھلی ہے  
سائن کیا لوں کہ ہوا دہر کی رہبری ہے

اس کا عجیب نے کوئی جواب نہیں دیا ہے صرف یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ نصاب نمبر ۲ اور ۳ کی قدر وہ حضرات اور زیادہ لیں گے جو زبان کے لغات، تنقید و تالیف میں اپنا عزیز وقت صرف کرتے ہیں۔ شاعر نے گننا اور گنہ گری، برق ظاہر کر کے اردو زبان پر احسان کیا، گننا درخت بولتے ہیں اور گنہ گری اول۔ زبان کھلی کا اور ہے۔

گزارش۔ واقعی گننا اور گنہ گری کے معنی کسی کو معلوم نہیں تھے، آپ نے بار بار احسان کیا۔ زبان کھلی کا محاورہ بھی نہیں معلوم تھا، حیدر آباد میں اوکالفت تیار ہو رہا ہے، آپ انہیں سمجھ دیجئے، اردو کی بہت بڑی خدمت مرتبین پر بہت بڑا احسان ہو گا۔

ہر کو تو حسرت دیں کبھی عزت، ان کو مذکر خفیف کو  
چوتھا شعر۔ اوس میں ستم اور اس پر ستم یہ کہنے میں تعریف کو

اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ چاروں شعروں میں شاعر کی سبک و نظر آتی ہے۔ کی آڑ میں پناہ لی گئی ہے۔ گزارش۔ سوال سبب مشکور اور غیر مشکور کا نہیں ہے۔ نفاذ کا کہنا یہ ہے کہ قافیہ محدود اور نامانوس ہیں۔ جواب اس کا دیکھئے۔

(۲) بہت سی غزلوں میں نامانوس بحر میں اختیار کرتے ہیں مثلاً  
(۱) کیوں داؤد بنی امین کے پیر سے کیوں طور کو آنا چاہا ہے  
(۲) میں نے بھی کب لہا کہ یہ کہا نہیں کہ ہے۔

(۳) سپید و سیاہ ایک ہی ہیں تو کچھ نظر نہ بی نہیں۔  
(۴) دے کے قریب لے کے دل کہتے ہیں جلد سا ہو۔

جواب۔ پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں جو بحر ہیں وہ نامانوس نہیں بلکہ مروج بحر ہیں۔ موجودہ شعرا میں بھی سبیکزاد غزلیں ان بحر میں موجود ہیں یہاں تک کہ انہیں بحر میں برابر مشاعرے ہوتے ہیں۔ حضرت امیر غم کا دیوان میر سے پاس ہے نہیں، مگر تمنا حب کا دیوان ہے۔ جگر کے ذیل کے مصرعے انہیں بحر میں ہیں۔

(۱) شہر و نگاہ ساقی کی سرک پہ جس کا ہے

(۲) مرا جو حال ہو سو ہو، برق نظر گرائے جائے۔

جگر کے دیوان میں یہ بحر میں مولانا کی آنکھوں کو مانوس نظر آتی ہیں، اب رہے آرزو صاحب تو ظاہر ہے کہ وہ لکھنوی ہیں۔

آرزو صاحب کا تیسرا مصرع اس میں شک نہیں کہ نامانوس بحر میں ضرور ہے۔ مگر میں بھی عرض کروں گا کہ شاعر اپنے خیال میں آزاد ہے، اگر اس نے ایک غزل نامانوس بحر میں لکھی تو شہر کے اندیشے سے قاضی متا کو ڈبلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

گزارش۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے یہ تو تسلیم کیا کہ ایک مصرع نامانوس بحر میں ہے۔ رہا یہ کہ بصرہ نگار، شاعر کی آزادی کو متعید کیوں کر رہا ہے، شہر کے اندیشے سے ڈبلا ہونے کی کیا ضرورت ہے تو مولانا عبد السلام کوئی پہلے نقاد نہیں ہیں جنہوں نے کسی شاعر کی بے راہ روی پر ٹوکا ہو، اس سے

پچھلے بار پایا ہو چکا ہے۔ خود مجیب کے مدوح کے استاذ حضرت جلال لکھنوی بھی شہر کے اندیشے سے گھل چکے ہیں۔ اگر انہیں معلوم نہ ہو تو آرزو صاحب کی خدمت میں لکھکر یا خود اپنے الفاظ میں فریاد نامہ ارسال فرما کر ان سے دریافت کیجئے کہ حضرت جلال نے نواب کلب علی خاں کو یہ کہہ کر کیوں ناراض کر دیا تھا کہ حضور نے مطلع میں رومی کے ساتھ تائیس اور ذیل کا التزام کیا ہے۔ اور اشعار میں اس کی پابندی نہیں کی۔ یہ درست نہیں۔ شاعر تو اپنے خیال میں آزاد ہے، شہر کے اندیشے سے قاضی صاحب کو دبا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

بقیہ تین بکروں کے متعلق مجیب کا جواب نا کافی ہے۔ قدیم و جدید شعراء کی سینکڑوں غزلوں میں سے دو چار اشعار تو پیش کیجئے۔ یقین رکھئے اگر مولانا، جگر کے کلام پر تبصرہ کرتے تو نا مالوس ہی کہتے۔ لیکن سے پہلے اپنی معلومات کا جائزہ لے لیا کیجئے۔ تعدلیس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ (۳) اس قسم کی بکروں میں بعض غزلیں ایسی ہیں جن کا معنہ بجائے ایک شعر کے دو شعروں میں نام ہوتا ہے، اور آخری شعر میں فائدہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ مثلاً

ہے راہ پر بس وہ طوفانی مد جس کی کوئی نہ تائی ہے  
ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی آخر منزل نا کامی ہے  
اس باغ میں آکر ہم کو بھی تقدیر ہی ہے قری کی  
بندش باد میں الامت کی گردن میں طوق غلامی ہے

اس ہوں تیرا خوقی ازل مجھے کام منظر عام سے  
سرہام جلد ہے ضو فگن نظر آگے رفتہ نام سے  
وہ پٹ کے جلد نہ آئیں گے یہ عیاں ہے طرہ خرام سے  
کوئی گردش ایسی بھی لے نکالے جو مادے کا کو شام سے  
دقت نصیب نہ آسٹیاں ہے سیاہ ہر ذب این داک  
ایسی پر شکستہ ہے مرغ جاں کہ پیرازک کے نکالے جام سے

مجیب نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا مطلب غائب ہے کہ اشعار غلط نقل ہو گئے ہیں، ایک مصرع کو ایک شعر سمجھ لیا گیا ہے۔ یعنی

ہے راہ پر بس وہ طوفانی مد جس کی کوئی نہ تائی ہے  
ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی آخر منزل نا کامی ہے  
کے بجائے یوں ہونا چاہیئے۔

ہے راہ پر بس وہ طوفانی مد جس کی کوئی نہ تائی ہے ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی آخر منزل نا کامی ہے  
چنانچہ آخری منزل کے متعلق لکھتے ہیں کہ تین چار سال قبل سندیلہ میں مشاعرہ تھا، جس میں آرزو صاحب اور حضرت جگر دونوں شریک تھے۔ جگر کی ذیل کی غزل اسی بکھر میں ہے۔

اسے حالِ حال سے واسطہ نہ فزین تمام وقیارت

جسے کوئی نسبت خاص ہو، ترے حسنِ برقِ خرام سے  
مجھے دے رہے ہیں نسلیاں، وہ ہر ایک تازہ پیام سے  
کبھی آئے منظر عام پر، کبھی ہٹ کے منظر عام سے  
کہوں کیا رہا جو متا بد، خطراتِ کام بہ کام سے  
ہر گام عشقِ تمام تک، رہا شوقِ نیمِ تمام سے  
نہ فزین کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام اپنے ہی کام سے  
ترے ذکر سے، تری یاد سے، تری فکر سے ترے نام سے

دخیر و غیرہ (مختصاً)

گزارش، انتہائی کوشش کے باوجود جہان آرزو دستیاب نہ ہو سکا، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ مجیب کا کہنا درست ہو۔ مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تنقید نگار نے قصداً ایسا لیا ہو، ممکن ہے دیوان کی مبالغہ میں اس قسم کی غلط فہمی کا امکان ہو، پھر حالِ جہان آرزو دیکھنے کے بعد اس بہتر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

(۴) ان خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں جن غزل سے معرا ہیں، اس کے ساتھ انہوں نے اسی جدید کہچے میں بہ تحلف قدم رکھا ہے اور لکھنؤ کے دائرے سے نکلنے کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ مرے سے عاشقِ ادب معائن ترک کر دے جائیں۔ لیکن بقول نے ہے شبہ مبتذل اور غارِ جی معائن کو جو غزل سے تعلق نہیں رکھتے ترک کر دیتا۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے حدودِ غزل سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ لیکن سید الامین کے بیت سے اشعار پڑھتے چلے جاتے، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم غزل کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ ایک پوری غزل کا محض

ہنگ جو کر کے آن مان نہ مانگ  
دیکھ چاں شکن امان نہ مانگ  
مرث اُس کی خوشی میں سب کچھ ہے  
مدد پر در ہے کا بہش غنیم دل  
ظلم سے بھگتے نہیں حق گو  
دینے والے سے تو ہے کم ہمت  
جان کر جان دی نہیں جاتی  
ہے دلی میں دکھاؤں دل کیونکر  
آئندہ یہ طلب ہے بے معنی  
ہند میں رہ کے اہنہان نہ مانگ

حبیب نے اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑا ہے۔ میں بھی ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ وہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیں، انشاء اللہ انہیں ایک معرہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں شانِ تفرل اور عاشقانہ معنوں کا شائبہ نہ ہو۔ حبیب نے یہ بھی لکھا ہے اور پورے جزم و یقین کے ساتھ کہ نفاذ نے بغیر پوری کتاب پڑھے ہوئے صرف چند اوراق پڑھ کر یو یو کیا ہے۔ ادق حبیب کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، دوسرے بقول اوسکر وائلڈ (مشہور تنقید نگار)۔

”یہ کتاب پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کس شرب کا مزہ اور ذائقہ دریافت کرنے کے لئے کیا ضرورت ہے کہ تم کا غم چاٹ لیا جائے؟“

”فزل میں اب تصوف اور اخلاق کے معنایں بھی بے تکلف نظم کے جاتے ہیں۔ مزرب اشل باتوں کو بھی نظم کا جام پینا چاہتا ہے، غرض بھی ان کا جزد بن گیا ہے، ایسا بھی بزم ہے کہ شاد و ہند و نفاغ سے بھی اپنے کلام میں کام لیتا ہے۔“

کچھ پڑھنے کے بعد باسانی کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب قابلِ قدر ہے یا بالکل نوبہ، بلکہ اگر کسی کو فطرت نے صلاحیت دی ہے تو اُس کے لئے واقعی مرث دس منٹ کافی ہیں۔ کسے فرصت ہے کہ ایک بے مزہ جلد کو پورا پورا پڑھتے، بس درسا کچھ لین یا کل کافی ہے، بلکہ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ (ہندوستانی سلسلہ صفحہ ۳۱۱)

(۲) باوجودیکہ ان کے کلام میں اخلاق و ایہام نہیں جوتا، شعرائے وید جدید کی طرح معنوی غارتی ترکیبیں بھی استعمال نہیں کرتا، تصوف و غرض کے پیچیدہ مسائل بھی نظم نہیں کرتے۔ لیکن ہاں یہ اس قسم کے پیکلے اور ہمزہ اشعار سے ان کا یہ دیوان بھرا پڑا ہے البتہ کہیں کہیں مہیا و تفرل کے مطابق کچھ اشعار بھی ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اور اپنے گور و پانچ کا حامل سمجھنا چاہئے۔

اس کے بعد بارہ تیرہ اشعار بطور مثال کے نقل کئے ہیں۔

اس کے جواب میں حبیب نے تقریباً سو اشعار انتخاب کئے ہیں اور ناظرین کو غور کرنے کی دعوت دی ہے کہ آیا آرزو کا کلام خیال الفاظ اور انداز بیان کی خوبیوں سے الامال اور اُن کے شعروں میں جذبات کی مصوری اور محاکات کی نادر مثالیں ہیں یا نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک نئی چیز بھی پیش کی ہے جس سے نہ صرف شعر آہند کا معصفت بلکہ تمام دنیا نادانف سخی، ناظرین کی حق تلفی ہوگی مگر انہیں ان کو اور سے محروم رکھا گیا۔ اس لئے ملاحظہ فرمائیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

”فزل میں اب تصوف اور اخلاق کے معنایں بھی بے تکلف نظم کے جاتے ہیں۔ مزرب اشل باتوں کو بھی نظم کا جام پینا چاہتا ہے، غرض بھی ان کا جزد بن گیا ہے، ایسا بھی بزم ہے کہ شاد و ہند و نفاغ سے بھی اپنے کلام میں کام لیتا ہے۔“

عالم کی ہزاروں لوگوں کے لئے  
اس پر جیسا بہت شاد و خوشی ہوگی  
پیرتی ہیں جیائیں نہ جانے کتنی  
کا زبوں پہ عجب علم و دانش ہے  
(پیش)

جب فکرتے راہ پر لگا یا مجھ کو  
حکمت نے جب آئینہ دکھا یا مجھ کو  
ذرات سے لے کے تا خیر بسم وائلڈ  
میں اپنے کوئی نظر نہ آیا مجھ کو  
(پیش)

# خونناک انتقام!

نثر سحر آمیز احمد شریف، بی۔ اے (علی)

ہو کر اس نے اپنے مکان میں قید کر کے اُسے گونا گوں ادنیٰ دینی شروعات میں جب اس سے بھی کام نہ چلا تو جوش غضب سے اندھا ہو کر اس نے اُسے پچاس ضرب ناؤٹ مارنے کا حکم دیا۔

پہنست حسینہ نے رو کر اس وحشی سے جان بخشی کی بیسود التجا کی، لیکن درندہ صفت پرنس کا فلاحی دل اس کی آہ و زاری پر نہ پسجیا، ناؤٹ کی پندرہویں ضرب پر نازک اندام حسینہ بیہوش ہو گئی، اور سزا کے خاتمہ سے پہلے ختم ہو گئی!

اس ہیما نہ واردات کے راز کے ٹٹت ازہام ہونے کا بڑا خوف تھا، لیکن پرنس کے ذاتی رسوخ اور اس کے کارندوں کی رازداری اور حکمت علی سے بات چھوٹنے نہ پائی۔

جیکس ڈی ٹاویل نے صرف اُس کا نام سنا تھا، نہ وہ کسی فیشن اہل جگہ میں اُس سے متعارف ہوا تھا، اور نہ ہی کہیں اس کی صورت دیکھی تھی، آجکل پرنس دوس میں تھا، اُس کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کی بیگم جیکس کے ساتھ ہیبت بے تکلف ہو گئی تھی۔

نثر دسی نازبانہ جے انگریزی میں (Cat of nine tails) لکھی ہیں۔ جرنل کے متعدد گروہ دارنے ایک دستہ سے بندے ہرے ہوتے ہیں، زمانہ قریب تک اس وحشیانہ سزا کا رواج روس اور برطانیہ کی اولیٰ درجہ میں بھی تھا، اس سزا کا سرچے ڈیویڈ ہٹلر نے اپنے ناول "سو لہر زوالف" میں پُر درون نقشہ کھینچا ہے۔ (نثر ج)

مات بیگم علی سنی، کارنیوال پر سے شباب پر تھا، محاکڑیوں کا ایک لامتناہی ٹینیل کنیز کی نگہوں میں سے گزر رہا تھا، ہونٹوں، قبوہ خالوں اور مکاؤں کے درجوں سے جہاں بیگم کے تاشائی تعریج کے لئے جمع ہو رہے تھے، مٹانے ہنسی اور ٹٹٹوں کی آوازیں پیچم آرہی تھیں۔ ان جگہوں سے حال ہی میں یہ لوگ نکل کر بوس میں شامل ہونے والے تھے۔

ٹہر کی ایک طویل اور تاریک گلی میں سے جیکس ڈی ٹاویل گروپش کے ہنگامہ سے بے خبر لیکن غمزہ مست سے معمور دل کے ساتھ رقص کی ایک مشہور مہین سیٹی میں بجاتا ہوا تیز روی سے گزر رہا تھا، ایک ہفتہ سے وہ شہزادی اولگا ڈیمی ڈوف کا خوش قسمت عاشق تھا۔

شہزادی اولگانے ادائل عربی میں ڈاکٹر ایڈیٹنگ پرنس سر جی ڈی ڈوف سے شادی کر لی تھی، جسے اب دس سال ہو گئے تھے، اُس وقت اُس کی خوبصورتی کا آفتاب نصف النہار پر تھا، لوگوں میں اس کے چال چلن کے متعلق چہ گویاں ہوا کرتی تھیں، لیکن پرنس کے رعب اور قہاری کے باعث کسی میں ملائیم انہار رائے کی ہمت نہ تھی۔ خود پرنس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک شہور ایکٹرس کے ساتھ اختلاط رکھتا ہے، کہا جاتا تھا کہ وہ ایک حسین اور لوجوان رقاصہ پر ایک عجیب طریقہ سے متعرف ہوا تھا، عرصہ دراز تک جب وہ ہاد جو کو ششوں کے اس کے جال میں نہ پھنسی تو غضب اور بوس کی آگ سے شعل ہو کر وہ اُسے اُس وقت اڑائے گیا، جب کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر تھیٹر سے نکل رہی تھی۔ پھر اُس کے پیچہ انکاہر ہما فرودتہ



خاموش! — کوئی باغیچہ میں ہے۔ اُس نے بجلی کا لمبے لمبے کرکے  
پردہ دُور کو پردہ دار غمت میں تبدیل کر دیا۔ لیکن کونسی میں پھر بھی شہر  
خوشاں کا سانسنا تھا۔

یہ صرف ہمارا دواہمہ تھا، پیاری! یہ کہہ کر حبکیں نے بٹن دبا کر کہہ  
کو بار در بقیعہ لوز بنا دیا اور دونوں اس واقعہ پر ہنسنے لگے۔ ایک ایک اور لگا  
سپر چوٹی۔ اس دفعہ جو آہٹ ہوئی وہ نہایت معاف تھی، — کوئی  
شخص سامنے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنے والے خطرہ  
کے خوف سے اونٹن کا بچنے لگی۔

میں کہا: اُن سے تمہارا سامنا نہ ہونا چاہیے۔ میری خواہگاہ میں نکل چلو۔ وہاں ہم نسبتہ محفوظ رہیں گے۔

اب نہیں! جسکے نے جواب دیا، اب ہمارا علیحدہ ہو جانے ہی بہتر ہے۔  
اب زیادہ یہاں ٹھہرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ یہ کہہ کر وہ ٹھہر کر کی جانب  
بڑھا، اور اُسے کھول کر چاہتا تھا کہ باہر پھلانگ جائے۔ لیکن اس کی  
حیرت اور دہشت کی انتہا نہ رہی: — در فچے میں رہے کی سلاخیں  
لگی ہوئی تھیں!۔

”یہ کیا؟“ اُس نے خوشگلیں انداز سے ہٹ کر پوچھا۔

کچھ نہیں! شہزادی نے جواب دیا۔ میرے شوہر سوانگی سے  
بیشتر بہنوں کے خوف سے تمام دریچوں کو اسی طرح محفوظ کرنے کی ہمت  
کر گئے تھے، کنیز کی حالت سے تم واقف ہو۔ خصوصاً کارنیوال کے یام،

”باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟ اُس نے عُجَلَت سے دریافت کیا۔

”اے میری خوابگاہ کے در پہ سے تم بیوں کے جاوید ار فرم کے  
 ذریعہ اُتر سکتے ہو۔ یہ کہہ کر اوٹکانے دروازہ کھولنا چاہا، لیکن وہ  
 باہر سے مقفل تھا! اس کا رنگ خوں سے زرد ہو گیا۔“

- دغا، فریبہ۔ اُس نے ٹھیکرائی ہوئی آواز سے کہا یہ محسوس ہے یا اک دامنگاہ؟! میں محتاط رہنا چاہیے! ممکن ہے اس وقت بھی ہماری نگہانی کی جا رہی ہو۔

وہ تہرے باہر ایک جھوٹی سی خوشنماؤ سٹی کی کمین تھی، جہاں آج وہ پہلی مرتبہ اپنے عاشق کا استقبال کرے! اسے باغیچہ کی راہ سے اپنے پھولوں اور عطر سے بسے ہومے مشرقی وضع کے کاشنہ میں لائی۔ اس سے پیشتر وہ اکثر خود اس کے پاس جا چکی تھی۔ لیکن آج پرنس کی غیر سادہ سی میں اپنے محبوب کو یہاں بلانے میں اسے کوئی امر مانع نہ تھا۔

جلیقے نے ایک ہندوستان کی طرح لمبے کی آتش کا ایک نچا و غلط انداز سے جائزہ لیا۔ یہاں تک اس کی نظر پیش پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر پڑی۔

”یہ کون صاحب ہیں؟“ اس نے پوچھا

”آپ قلمی ڈوٹ ہیں۔ آؤ میں ان سے بہت سادہ تعارف کراؤں۔ ایم جیکس قلمی ناٹویل! یہ میں میرے شوہر و عاشق — پرنس قلمی ڈوٹ! آؤ میں ایک شان دار بائی کے ساتھ تصویر کے سامنے خم ہوتے ہوئے کہا:

جبکیں مسکرانے لگا۔ لیکن اپنی محبوبہ کے شوہر کی تصویر پرستے (جسے آج پہلی مرتبہ اس نے دیکھا تھا) وہ یکایک اپنی نظر ہٹا سکا۔ پرنس شاہی دست کی وردی میں ملبوس تھا، وہ ایک جوان العمر آدمی معلوم ہوتا تھا، جس کی آنکھیں بیت بارعب تھیں۔

”کچھ ظالم اور وحشی سا معلوم ہوتا ہے، کیوں؟ اونگھانے شوخی سے ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے باوجود میں اسے آنکھوں پر سنبھال سکتی ہوں، پیارے جیکبسن! آج کی رات ہمارے لئے کتنی پُر کیف ثابت ہو گی۔ میں نے اپنے تمام تذکروں کو آج تفریح کے لئے کارینوال بھیج دیا ہے۔“

جبکیس نے خاتون کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ "اوتلگامیں تھا۔ سی پریش کر تا ہوں! تمہارے بغیر زندگی بے معنی ہے، تم مجھ جوتو میں اُس کا سایہ۔"

تم چاہو تو میں تمہارے ظالم شوہر کو ہلاک کر سکتا ہوں اور اپنے تئیں بھی.....  
- محبت اور پرستش کے معنی کچھ عورتیں ہی بہتر جانتی ہیں۔ (دولگانے عاشق)

کافعی کہہ کرے ہوئے کہا: قربانی کا وقت آنے دو۔ یقیناً میں اس امر میں پیش پیش رہا ہوں گی۔

اس کا جواب اس کے محبوب کی طرف سے ہم آغوشی کے ساتھ گرم جوشی کے چند ہیچ ہو سکتے۔ بیکایک وہ گلیبر اگر ٹھٹھکڑی ہوئی اور ہونٹوں پر اٹھلی رکھ کر دلی آواز سے کہا:-

دو دونوں دروازے سے ہٹ کر کمرے کے ایک گوشے میں آگئے۔ بتوڑے وقفہ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔

جیکس نے پرس سر جی ڈیسی ڈوٹ — اپنی محبوبہ کے شوہر کو جسے اس نے پہلی مرتبہ تصویر میں دیکھا تھا، پہچان لیا۔

لیکن وہ جیکس کی طرف قطعاً متوجہ ہوا! وہ صرف اپنی بیوی کو تیز نظر سے دیکھتا رہا، جو غلط فہم سے بھال ہو رہی تھی۔ بالآخر اس نے کراخت لہجے میں وہی زبان کے چند جملوں میں اس سے خطاب کیا۔ خطا کار خاتون دو ڈیڑھ گھنٹے سے اس کی التجا کرنے لگی۔ لیکن ڈیسی ڈوٹ بغیر کچھ جواب دینے سے باز نہ رہا۔

جیکس جو اس دوران میں اسید ویم کے تہلکے میں مبتلا تھا، اپنی محبوبہ کی طرف بڑھا۔

اس نے تم سے کیا کہا اور لگا؟

شہزادی کے ہونٹوں کو درجہ خشک ہوئی۔ لیکن منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ بالآخر گھو گھیر آواز میں اس نے کہا۔

ہم دونوں میں سے ایک کو ایسا کرنا پڑے گا۔ ایک کو! —

اس کا سینہ فیصلہ کر لینا چاہیے! — پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آکر دونوں میں سے ایک کو ہلاک کر ڈالے گا! — سمجھئے؟ — تم کو ہچکچاتی ہے سنتے ہی جیکس کے حواس باختہ ہو گئے۔ لیکن اسے یاد آیا کہ وہ اس وقت

اس زار کی چنگیزی حکومت کے ماتحت نہیں ہے۔ بلکہ فرانس میں ہے!

ہم مذہب اور جمہوری فرانس کی زمین ہائیں ہیں!

ڈیسی ڈوٹ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا اس کا مقصد صرف ڈرانا تھا۔ معاملہ کا فیصلہ ڈویل سے ہو گا یا طلاق سے! اس نے اولگاکو نشی

تھے ہوئے کہا۔

شہزادی نے جل کر جواب دیا۔ تم اسے نہیں جانتے۔ وہ ایک بے بس عورت کو ناؤٹ کی پیہم ضربات سے ہلاک کرنے سے نہ چوگا۔ باوجودیکہ دنیا ملک کی امان میں تھی!

تو پھر اس صورت میں ہم کو اپنی حفاظت کی آخر دم تک کوشش کرنی چاہیے۔ جیکس نے کہا۔ جس وہ اندر داخل ہو کیوں نہ ہم دونوں اس پر

تیاغ جا پڑیں یا بددکے لئے چلائیں!

”محلہ میوہ ہے۔ وہ سچ ہے! رہا بددکے لئے چلتا تھا۔ ہماری کون سننے لگا؟ اگر ملازم یہاں موجود ہوتے تب بھی فضول تھا۔ کیونکہ وہ سب کے سب دوستی ہیں۔ جن کے جان و مال کا پرس مالک و مختار ہے! وہ اس کی مرضی کے خلاف اٹھلی نہیں اٹھا سکتے!“

تو پھر میں اس درجہ کی سلاخوں کو توڑتا ہوں! یہ کہہ کر جیکس نے اپنا تاج و کمال زور سلاخوں کو ختم دینے میں لگا دیا، لیکن اسٹین جینش تک نہ ہوئی! بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی رہائی کا ہر راستہ مسدود ہے!

اولگاکالین پر بڑی سسک رہی تھی، اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا، ”وہ ہم دونوں میں سے ایک کی جان چاہتا ہے۔ جیکس — مہاری یا میری! — خوب سوچ لو! — یہ سب کہا دھرا تھا رہا ہے!“

یہ الزام سن کر اسے تاب نہ رہی، اس نے جل کر جواب دیا۔

”میرا کیوں؟ قصور سراسر تمہارا ہے۔ تم نے ہی تو مجھے یہاں بلایا تھا! — بزدل! عذار! — کیا تو نے خود یہاں آنے کی مجھ سے درخواست نہیں کی تھی؟“

آدو جس کو تم نے بلا کسی پس و پیش کے منظور کر لیا تھا!

”بہنیں تو ایک شہزادی کے عاشق ہونے کے پندار نے مغالطہ زدہ بنا رکھا تھا!“ اولگاکو نے کہا۔

لیکن ایک ایسی شہزادی کا عاشق کہلانا جس کے مجھ سے پہلے کئی عاشق رہ چکے ہوں۔ چنداں فخر کی بات نہیں!

کتنی جگر خراش بات تھی! سچ عاشق سخن تلخ پر معشوق نہ گفت!

وہی طالب و مطلوب جو کچھ نرمہ پہلے باہم دائمی محبت کے جملہ وہیاں باندھ رہے تھے اب دو درندوں کی طرح زندہ رہنے کے حق پر جھگڑ رہے تھے! سچ

کہ یاراں فراموش کر دند عشق!

یہ ایک دروازہ کھلا اور پرس سر جی ڈیسی ڈوٹ ریلوے بدست اندر داخل ہوا!

جیکس نے پھرتی سے اچک کر اولگاکو باوجود اس کے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے جسم لڑناں کو اپنے بچاؤ کے لئے ایک زندہ ڈھلوان

بنالیا! ع

ایں کار اذ تو آید و مرداں چنین کنند!

پر تن نے حقارت آمیز قسم سے کہا۔

”اچھا تو تم دونوں نے ایک ساتھ ہی مرنے کا ہتھ کر لیا ہے؟ بہت سہارک خیال ہے! بیشک تم ایک جان و دو قالب ہو! ربوہ الورد کی ایک ہی گولی تم دونوں کو قیدِ سستی سے آزاد کر دے گی! اور یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا ربوہ الورد اٹھایا، دونوں عاشق و معشوق ایک چنچ مار کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔“

”رحم! رحم! خاتون نے اپنے شوہر کے قدموں پر گر کر رونے ہوئے کہا۔ میں بے تصور ہوں! مجھے اس شخص سے محبت نہیں — اس سے مجھے بد راہ کیا!“

اس پر عکس بول اٹھا:

”خدا را مجھے بخش دو۔ یہ سب فتنہ اسی عورت کا ہے، اس نے اپنے

شادی شدہ ہونے کا مجھ سے تذکرہ ہی نہیں کیا، مجھے جانے دو۔ میں دھوڑتا ہوں کہ آئندہ اس کی صورت بھی نہ دیکھوں گا۔“

پر تن نے نفرت بار سکوت سے اُن کی طرف دیکھا، اور حقارت بیز قسم سے کہا:

”ابھی چند ہی لمحے پہلے تم دونوں باہم محبت اور پرورش کے تذکرے کر رہے تھے۔ اور اُس کی راہ میں قربانیاں دی جا رہی تھیں! لیکن بہت جلد غریباں حقیقت آشکارا ہو گئی! اچھا نہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ میرا ارادہ اب نہیں قتل کرنے کا نہیں ہے! میرا انتقام اس سے کہیں زیادہ ہر لٹاک ہو گا! میں تم دونوں کو ایک ہی جگہ قید رکھوں گا۔ تاکہ جب تک موت نہیں آزاد نہ کرے، قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی صورت سے متنفر اور ریزا نہ رہو!“

یہ کہہ کر پر تن مڑا اور ابنِ حجر میں عشقِ باغی کو اپنی سزا بھگنے کے لئے جھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا! (نثر ایسی افسانہ کا ترجمہ)

## میر

صبح غم میرے لئے شامِ بلا میرے لئے  
ابتدا میرے لئے ہے انتہا میرے لئے  
کہتی ہے تقدیر تیرے نام کا کچھ بھی نہیں  
میں سمجھتا تھا کہ میں ارض و سما میرے لئے  
بے طلب دنیا کو ملتا ہے دلِ راحت طلب  
وائے قسمت تھا دلِ دردِ آشا میرے لئے  
چارہ گر کی کیا ضرورت کیوں ہوں ممنونِ دوا  
دردِ خو وِ بجائے گا بڑھ کر دوا میرے لئے  
بدگماں صیادِ دشمن باغباں گلچیںِ حفا  
ناموافق ہے زمانے کی ہوا میرے لئے

آگیا محسنِ سمجھ میں شو کریں کھانے کے بعد

میں بلا کے واسطے ہوں اور بلا میرے لئے

محسنِ عظم گڑھی

# ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبر آبادی

(۲)

مصنف فرنگ آصفیہ لکھتا ہے کہ اردو زبان کا سرمایہ الفاظ و محاورات کل ۵۵ ہزار ہے۔ اس میں تقریباً تیس ہزار عربی کے الفاظ۔ اس سے کچھ زیادہ فارسی کے۔ ہزار آٹھ سو الفاظ ترکی، پرتگالی اور انگریزی کے ہیں۔ باقی میں جو مقامی کے قریب خالص اردو کے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور اس کے بعد بڑی تعداد ہندی الفاظ کی ہے۔

یہ فرنگ آصفیہ میں شائع ہوئی ہے، اور چوتھی جلد کے آخر میں تفصیل درج ہے۔ لیکن تیس سال کے گزشتہ دور میں اردو نے جس قدر ترقی کی ہے اور جس سرعت کے ساتھ اس نے اصطلاحات وضع کرنے کا، اور نئے نئے الفاظ ڈھالنے کا کام کیا ہے۔ نیز دنیا کے رد برو جو معیاری ادب پیش کیلئے ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چند ماہ میں انجمن ترقی اردو نے تینا پتہ اد پر چھ ہزار علمی اصطلاحات وضع کیں، اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی انجمنوں نے، اور انفرادی طور پر سے دیگر شعرا وادبان نے ہزار ہا نئی نئی کتب استعمال کر کے اردو زبان کو چار چاند لگا دئے، اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ آج اردو کا سرمایہ الفاظ دو گنا ہو گا۔

یہ اعتراض کہ موجودہ دور میں اردو کے انشا پرداز عربی و فارسی کے زیادہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ براہمان

وطن کو اس سے چڑھے، اور ایسا کرنے سے اردو عام فہم نہیں ہو سکتی، میرے نزدیک یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا، اہل لے کے اول تو برادران وطن کو اردو الفاظ سے نفرت نہیں بلکہ اس کے رسم الخط سے متغیر ہیں، دوسرے یہ کہ ہر زبان کے دو فرق ہوتے ہیں، ایک وہ جو ملک کے رد برو اعلیٰ لٹریچر پیش کرتا ہے، اور اس کو ہمیشہ علمی زبان سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، اور چونکہ عربی و فارسی علمی زبانیں ہیں، اور اس گروہ کا انہیں زبانوں سے قریبی رشتہ ہے۔ لہذا اس کی نظر انہیں پر ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ غیر اٹا پرداز ہوتا ہے، جو معمولی لکھنے پڑھنے پر اکتفا کرتا ہے، اس کو معیاری ادب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

اس کو بھی چھوڑیے اور دیکھئے کہ اردو زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں یا ہندی کے ابھی اس کا شمار اد پر بتایا جا چکا ہے، اس کے ثبوت میں ڈاکٹر گستاخی بان، جو ایک فرانسیسی محقق ہے، اور جس نے ہندوستان میں اپنا سا وقت اسی تحقیق و تفتیش میں گزارا کہ یہاں کی قوموں، برادرانوں، زبانوں کی تحقیق کرے اور ہندیب و تمدن نیز تاریخی حالات قلم بند کر کے دنیا کے رد برو پیش کرے۔ لکھتا ہے کہ

”جو سیاح ہندوستان میں اس خیال سے آئے کہ وہ تمام ملک ہند کے

باشندوں سے انہیں کی زبان میں گفتگو کرے تو اسے تقریباً ۲۰۰ زبانیں

اور ۳۰۰۰ محاورے سیکھنا پڑیں گے۔“

اس بنا پر انھوں نے سب سے زیادہ تحقیق و کاوش کے بعد اردو زبان کو ملکی بتایا۔ جیسا کہ آپ آگے پڑھیں گے۔ یہاں صرف ملاحظہ کے لئے نمونے کے طور پر ذیل کے مضامین درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں یا ہندی کے۔ بھاشا کا ادیب لکھتا ہے۔

”درختوں کے ٹھنڈے چھائے ہیں۔ گھنے ہونے پہنچے ہیں۔ ان کی ٹہری گہری چھاؤں ہے۔ جامن کی ہڈیاں، اور آم کے پتوں میں کچری جو بھی ہے۔ گہری کی ہڈیاں، غاسے سے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی بیل، گمرک کے درختوں پر لٹھی ہوئی ہے، عشق، بیجاں لکڑیوں سے پر چڑھی جا رہی ہے اس کی ٹہنیوں، جانب کی طرح لہرا رہی ہیں۔ بھڑوں کے گچھے پڑے چھوڑ رہے ہیں۔“

برسات کی بہار کے تعلق اس طرح لکھتا ہے۔

”سانے سے کالی گھٹا جھوم کر، انھی ابرو ہواں دھارہ ہے۔ بجلی کو ندی چلی آتی ہے، سیاہی میں گھول کر، سفید سبز دھاریں جا رہی ہیں۔ جب بادل کو اکٹھا ہے، اور بجلی چمکتی ہے تو برند۔ ایک کرکھی ٹہنیوں میں چپ جاتے ہیں، کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ سورج اچھٹا رہتا ہے اور پیسے الگ دیکھتے ہیں۔ چار دیواریں ہری بھری ہیں۔ اور دگر و سرسبز میدانوں میں بے ہونے گاؤں آباد ہیں۔ چار لے پیچے ایک دامن میں بڑھ جاتے ہیں۔ وہاں پیسے کوئی کی آب۔ بچوں پر ہنسا رہا ہے۔ جب اس کے اونچے اونچے مکاؤں اور پریموں کا گھر، پرستار ہے تو پانی میں، کاسیاں جگمگ جگم کرتی ہیں۔“

رات کی آواز اسی کے متعلق یوں لکھتا ہے۔

”آدھی رات، ادھر آدھی رات، آدھ، جھل سنسن، اندھیرا، بیابان، مرگٹ میں دور دور تک راہ کے ڈھیر بٹے ہوئے کتر پڑے ہیں۔ کہیں کہیں چٹا میں آگ چمکتی ہے۔ بھوتوں، پریوں کی ڈراؤنی صورتیں، ادھیرا، صورتیں ہیں۔ کوئی تاڑ سا قد۔ کوئی لال لال دیدے بھاڑے، بے لے انت نکالے گلے میں کھڑکیوں کی لاڈالے کھڑا ہے۔“

اب فرمائیے کہ مندرجہ صدر مضامین میں عربی و فارسی کے کتنے الفاظ ہیں؟ اور ہندی کے کتنے؟ اسی نوعیت کے ہزار ہا مضامین ہیں، جن کے مقابلے میں عربیت و فارسیت آمیز مضامین ایسے ہوں گے جیسے آٹے میں

نمک، حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کے متعلق بحث کی جائے، اور تفصیل سے لکھا جائے تو یہ داستان گنج جلدوں میں ختم ہوگی، کیوں کہ یہاں کی سرزمین پر صد ہا زبانیں اسی طرح پھیلی ہوئی ہیں، جس طرح صد ہا مختلف ذاتیں اور برادریاں۔

اسی وجہ سے ڈاکٹر گستاؤلی بان کو اور تمام سیاحوں کو تکلیف دلا اور وقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی مشترکہ زبان نہیں، اور ایک ہے بھی تو اس کو مٹا دینا چاہئے ہیں، حالانکہ اردو زبان کی تہ دین اور اس کی توسیع و اشاعت میں جس قدر حصہ مسلمانوں نے لیا ہے، اسی قدر اہل ہندو نے بھی، آج بھی ہندو مسلمانوں کا ایک کثیر گروہ اردو زبان کی توسیع میں برابر کا حصہ لے رہا ہے۔ ہندو دوستوں نے اس کو اپنی زبان سمجھ کر تصنیف، تالیف میں، شعر و شاعری میں، اور ادب لطیف میں، باوجود زمانہ حاضرہ کی مخالفت کے وہ کوشش کی ہے جو تاریخ میں یادگار رہے گی۔ نہ صرف ہندو، بلکہ ہر زمانے کے یورپین حضرات نے بھی اردو کی توسیع میں کافی حصہ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکومت ہند کو سوچنا پڑا کہ ہندوستان کی دسی زبانوں میں اگر کوئی زبان ملے زبان بننے کا حق رکھتی ہے تو وہ صرف اردو ہے۔

چنانچہ اس نے ملک کے ماہرین زبان کو وقتاً فوقتاً جمع کر کے مشورہ لیا کہ ہندوستان کیوں کے لئے اور خصوصاً انگریزوں کے لئے کونسی زبان ایسی ہو سکتی ہے، جو سہل الحصول ہو، سادہ و سلیس ہو، اور تمام مرد و عورتوں پر عادی ہو؟ اس پر سب کی متفقہ رائے ہوئی کہ اردو زبان سے زیادہ کوئی زبان ایسی نہیں جو وسعت و جاؤ بیت، سلاست و روانی میں اس کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ لارڈ ورن، سینٹنگز جو ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے قیام کا بانی سمجھا گیا ہے، اس نے انصاف پسندی سے انگریزی زبان پر عربی و فارسی کو ترجیح دے کر اسلام آباد میں ایک مدرسہ مدرسہ عالیہ کے نام سے کلکتہ میں جاری کیا، اور فارسی کو دفتری زبان تسلیم کیا گیا، یہ اس لئے کہ چونکہ فارسی علمی زبان ہے اور اردو دفتری ہے، اور فرعی زبان ہمیشہ علمی زبان سے استفادہ کرتی ہے، لہذا فارسی کے مانگ ہونے سے اردو کی اشاعت خاطر خواہ ہوتی رہے گی۔ لیکن اس کے بعد جب لارڈ میکالے نے محسوس کیا کہ یہ دونوں زبانیں، یعنی عربی و فارسی غیر ملکی ہیں تو انھوں نے

اپنی آتش بیانی سے ایک انقلاب برپا کیا، اور غیبی مشنریوں کی تحریک پر فارسی کو دفتر سے ہٹا کر، انگریزی وارڈ کو اس کی جگہ دہدی دے کر لے کر صرف اس لئے کہ یہی ایک زبان ایسی سمجھی گئی جو تمام ملک کے لئے آسان ترین تھی، چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر جون گھارائنٹ کی نگرانی میں سرکاری حکم اور حزب سے فورٹ ولیم کالج میں اردو زبان کا ایک کالج قائم کیا گیا، اور صدر عدالت دیوانی نے حکم نافذ کیا کہ جملہ ماتحت عدالتیں اردو کو رواج دیں۔ چنانچہ حکومت ہند نے اس زبان کی تصنیف و تالیف پر انعامات مقرر کر دیئے اور تمام مدارس میں اس کو جاری کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ زبان سارے ملک میں پھیل گئی۔

مگر یہ تو بعد کی باتیں ہیں، انگریزوں کی حکومت سے بہت پہلے، تاریخوں کے مطالعہ سے یہ بات بہر تعلیم یافتہ جانتا ہے کہ شمالی ہند میں ہندو مسلم اختلاف و ارتباط کی وجہ سے ہندی و فارسی کے الفاظ مخلوط ہو کر ایک نیا زبان پیدا کر چکے تھے، جس کا نام اردو ہے، سکندر لودھی کے زمانے میں جب کہ آگرے کو پای تخت بنا گیا تھا، تو اسی وقت سے برادران وطن نے فارسی زبان سیکھنا شروع کر دی تھی، اور غالباً فارسی کا سب سے پہلا شاعر پنڈت ڈونگر مل تھا، کاستھ و کشمیری پنڈتوں کو اس زبان سے کافی دلچسپی تھی، اور اسی بنا پر اردو ان کی مادری زبان ہو چکی تھی، پس جس زمانے میں اردو کی تشکیل شمالی ہند میں ہو رہی تھی قربان اسی زمانے میں یہ کام جنوبی ہند میں ہو رہا تھا، اور تنقہ طور پر ہو رہا تھا، جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے حصہ دار تھے، اور انگریز بھی کافی دلچسپی لے رہے تھے، مثال کے طور پر چند انشا پرداز ہندو بزرگوں کے نام درج ذیل کئے جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تصنیف و تالیف و ادبیات میں کافی حصہ لیا۔

کبیر داس، ان کی شاعری میں بھاشا کا رنگ غالب تھا، ان کا کلام علاوہ آبجیات کے دوسری کتابوں میں بھی ملتا ہے، گردنابک مست یہ مواد ہے، اور ان کا سارا کلام صوفیانہ رنگ میں ہے، بابا طوسی داس مترجم رامائن وغیرہ۔ سور داس جی، آپ نے سری کرشن جی کا ترجمہ کیا، لالو لال جی آپ نے چند کتابیں تصنیف کیں، راجہ شیو پرشاد میرٹھی تھے، سندرب برہن چند کتابوں کے مصنف تھے، سنہاپت برہن تونجی اردو زبان

سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ رتنا کرنا پاتھی، شعور شاعری کا ذوق رکھتے تھے، بہدی وال سنسکرت کے فاضل ہونے کے باوجود اردو سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور حسن پرستی کے باب میں خوب شاعری کی ہے۔ تان سین موسیقی کے ماہر تھے، اور اردو ادبیات کا ذوق رکھتے تھے، لنگ، یہ خان خانان کے درباری شاعر تھے، ایسے کہ ان کی شاعری سے متاثر ہو کر شاہ نے ان کو ایک موقع پر ۲۴ لاکھ روپیہ بطور انعام دیا، جسوت سنگھ، دیو کوئی چکیت مشر رام جی، کالی داس وغیرہ وغیرہ یہ سب کے سب اردو زبان کے حامی و مددگار تھے، ان کے علاوہ ہمارا جہاں بلوان سنگھ، صاحب دیوان تھے، نئی جواہر لال جواہر شنوی سحر البیان اور سیر التاخرین وغیرہ کے مصنف تھے۔ شہاب الدین غوری کی فتح پر ۱۹۳۷ء میں چند کوئی نامی شاعر نے، پرتی راج راسا لکھا۔ راجہ جے سنگھ سوانی نے اردو زبان کی بڑی قدر کی، ہنسی ہر گوبال تفتہ کی مرزا غالب بحیثیت ادیب ہونے کے بڑی قدر کرتے تھے، پنڈت موٹی لال مترجم گورنمنٹ پنجاب، اور دیگر اسی قبیل کے ادب نواز مشہور و معروف گزرے ہیں۔

ہمارا جہاں صاحب الورد اردو کے مشہور شاعر ہیں، اور اغلباً صاحب دیوان بھی ہیں۔ گشن پرشاد صاحب سابق وزیر اعظم نظام حیدر آباد اردو کے اعلیٰ شاعروں میں ہیں، اور سارے ہندوستان میں مشہور ہیں، پنڈت موٹی لال ہنر کے تمام خاندان کی مادری زبان اردو ہے، اور شمالی ہند کے تمام کاستھ و کشمیریوں کا شمار اردو کے اہل ادب میں ہے۔ سر شیو پھادر سپرو نے اردو زبان کے متعلق ۲۸ فروری ۱۹۵۷ء کو انجمن پیارادب کی صدارت کے موقع پر اردو کی ہمہ گیری، اور اس کی بنیاد کے متعلق ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی جو درج ذیل ہے۔

”در اصل اردو زبان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلمان

ایک دوسرے سے متحد ہو سکیں، کیونکہ اس زمانے میں یہ ناممکن تھا کہ تمام ہندو عربی سیکھ لیتے یا تمام مسلمان ہندی سیکھ لیتے، اس لئے ایک مشترک زبان کی حیثیت سے اردو وجود میں آئی۔ میں تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوں کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے، اور اردو جاننے والے مسلمان ہیں۔ اردو کی خدمت سب سے زیادہ کھڑے کی ہے اور جس قدر خدمت اس جگہ ہوئی ہے ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں

ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی گفتگو اس زمانے کے وارث بنیں، بلکہ حافظ بھی ہیں اور اگر یہ خزانہ ٹٹ گئی تو اب کشتہ حرم ہو گئے۔

میں بخارہ میں زبان کے ساتھ کے اختلاف کو بڑے انداز سے دیکھتا ہوں۔ مگر نہ تو اس کو ہندو سمجھتے ہیں اور نہ مسلمان کہ ہم اس ذریعہ اختیار کو رد کرتے چلے جاتے ہیں۔ پچاس سال قبل یہ ہوتا تھا کہ جب ایک بچہ کتب میں پڑھنے جاتا تھا تو پاپا بچہ کو دے دالت مولوی صاحب سے تعلیم حاصل کرتا تھا، اس وقت نہ تو کوئی پوچھ رہا تھا کہ یہ کچھ اور تھا، مگر اس وقت یہ ہوتا تھا کہ ہندو بچہ اسلامی تہذیب سے اور مسلمان بچہ ہندو تہذیب سے واقف ہوتا تھا۔ جب آپ ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن سے واقف نہیں گئے تو باہم اتفاق و اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور ایک دوسرے کی عزت کیونکر رکھتے؟ جب عربوں نے اسپین فتح کیا تو وہاں اعراب نے ایک ایسی زبان کی بنیاد رکھنے والی تھی۔ اگر آپ اس کے جو یا ہیں جس کے بغیر ہندوستان فتح نہیں کر سکتا تو آپ اردو زبان کو فتح دیں، ہو جو وہ اردو کی روش سے بھگو اتفاق نہیں ہے۔ آج کل اردو ایسی استعمال ہو رہی ہے کہ بغیر انت دیکھے کام نہیں چلتا، کیونکہ مختلف قسم کے غیر فاضل الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح جو حضرات بنارس و فیرو میں رہتے ہیں اور ہندی و سنسکرت کے حامی ہیں وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ میں نہایت غم کے ساتھ مکتبہ کی نمائندگی زبان کے حامیوں سے کہوں گا کہ اس زبان کو ذریعہ اتحاد بنائیں ورنہ یہ اردو نہ رہے گی۔ مکتبہ کی اردو زبان سے بہتر اردو کا نمونہ نہیں ہے مجھے انجن بھارادب کے مقاصد سے دلی ہمدردی ہے۔ اور میں اس کی خدمت کرنے کے لئے ہر طرح تیار ہوں۔

یہ لوہیں اردو تو از ہندو بزرگ، جو معمولی لوگ نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کی متا شخصیت کے گروہ کے ایک فرد ہیں۔ لیکن آج جو ذہنیت برادران وطن کے ایک کثیر گروہ میں کام کر رہی ہے، وہ مسوم اور ذہیر آلود ذہنیت ہے، بظاہر اس گروہ کی روش مغایر نظر آتی ہے، لیکن باطن طاقت آفرین ہے، زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق محبت، بھائی بھائی، اور آشتی کے اعلانات کئے گئے، اور کئے جا رہے ہیں، انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے اتحاد و تحفظ اقلیت کی آواز اٹھتی ہے، اس کی ورکنگ کمیٹی بار بار اقلیتوں کو تحفظ کے ذریعہ انفلو میں دعوت دیتی ہے، اور ہا ہا زبان دسم انڈیا کے متعلق کہا گیا ہے کہ کانگریس

کسی زبان کے دسم انڈیا میں داخلہ نہیں کرے گی۔ کانگریس کے دستور کار کی دفعہ ۱ میں یہ درج ہے کہ اس کی جملہ کارروائی معمولاً ہندوستانی زبان میں ہوا کرے گی، اور ہندوستانی زبان کی تعریف اندر کے ہندی سہتیہ سیمین کے سالانہ اجلاس میں گاندھی جی نے اس طرح کی تھی کہ

وہ زبان جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی ہے اور جسے اردو و دیوناگری دونوں حروف میں لکھا جاتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے مسئلہ پر جو ایک مختصر رسالہ لکھا ہے اس میں اس طرح اعلان کیا ہے،

شمالی ہندوستان میں قومیت کے ساتھ جو زبان بولی جاتی ہے وہی ہندوستانی ہے، خواہ اسے ہندی کہا جائے یا اردو۔

مسٹر سوبھاش چندر بوس نے اپنے خطبہ صدارت میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں فرمایا کہ

ہندی اردو کے درمیان جو فرق بنایا جاتا ہے وہ اصلی نہیں ہے مصنوعی عینا دہی ہے۔ ہماری مشترکہ قومی زبان دہی ہے جو ملک کے ایک وسیع حصہ میں بولی جاتی ہے چاہے اسے اردو دسم انڈیا میں لکھا جائے یا دیوناگری رسم الخط میں۔

لیکن اس تمام توضیح و تصریح کے باوجود کانگریس کے بیشتر رہنماؤں کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ ہندوستانی زبان ہر اس لفظ کو نکال دینا چاہتے ہیں جو اصل کے اعتبار سے عربی یا فارسی ہے، ایسے الفاظ جو روزمرہ کی عام گفتگو میں خواہ کتنے ہی استعمال ہوں، اور خواہ ان کے سمجھنے میں کتنی ہی آسانی ہو لیکن ان کی مسوم ذہنیت ان کے ترک کر دینے پر بالکل آمادہ و مستعد ہے، اور ان کے بدلے وہ جناتی زبان لکھی اور بولی جاتی ہے، جس کو سوائے مقرر کے یا سو پچاس چھیٹھ آدمیوں کے اور کوئی نہ سمجھ سکے۔ اس جناتی زبان کو ملک میں عام کرنے کی پوری کوشش و طاقت صرف کی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند الفاظ درج کئے جاتے ہیں۔

|       |       |            |        |
|-------|-------|------------|--------|
| مغرب  | منظور | آوشک       | مزدوری |
| پرستو | تجویز | منشودین    | ترمیم  |
| پرانت | صوبہ  | سو مختارتا | آزادی  |
| سہیتا | تہذیب | انتی       | ترقی   |



محو کر دیا، بھلا دیا۔ آج انہیں دعووں کو یاد دلانے کے لئے کانگریس قائم ہوئی لیکن ابھی اس نے پوری طاقت بھی حاصل نہیں کی کہ بعد باندھنے کے ساتھ ہی توڑ دیا۔ اگر واقعی سنسکرت کا سارے ملک میں پرچار کرنا ضروری سمجھا گیا ہے تو کیجئے، اس بدعہدی کا نتیجہ وہی ہو گا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔

پہرے کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا، جس میں برادران وطن نے اس زبان کو شکر زبان نہ سمجھا ہو۔ موجودہ دور میں جو چال و تحصب کے باب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں کوئی جگہ ایسی نہیں، جہاں اردو نواز ہندو دوست، مسلمانوں کے ہمدوش نظر نہ آتے ہوں۔ اس گروہ نے محسوس کر لیا ہے۔ اور اس کو بخوبی علم ہے کہ اردو تنہا مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے، بلکہ ہند کی تمام قوموں کی ہے، اور جبکہ اس میں ہندی کے سچے الفاظ ہیں، اور ان الفاظ کا استعمال مسلمان بھی کرتے ہیں تو پھر کیا وجہ کہ اس کا رسم خط اردو ہو؟ الفاظ ہندی کے اور خط اردو کا، دنیا میں سچ کے دانے معلوم ہوتے ہیں، اور رشتہ اتحاد کی مثال دنیا میں اس سے بہتر نہیں ملے گی، جب کہ ہندی کے الفاظ مسلمانوں نے قبول کر لئے تو اردو رسم خط ہندوؤں کو قبول کر لینا چاہیے۔ اس سے بہتر انصاف ہو نہیں سکتا، اور اگر ہے تو پیش کیا جائے۔

ہندو ادب اور شعرا کے یہ چند نام بطور نمونہ پیش کر دئے گئے ہیں، اور ان میں ایسے ایسے بزرگ اور قوموں کے بانی ہیں۔ جن کے نام نامی سے بچہ بچہ واقف ہے، اور جن کا احترام ہر قوم و جماعت کے لوگ کرتے آئے ہیں، گرو نانک صاحب، کبیر داس جی۔ بابا بکشی داس۔ کالی داس، اور تان سین، یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے ہند کی سر زمین میں جھنڈے گاڑ دیئے ہیں، ان کی روش کو ٹھکرا دینا آسان کام نہیں ہے۔ اگر تمام اردو نواز ہند کے نام درج کئے جائیں تو اس کے لئے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی جاذبیت حیرت افزا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کے الفاظ اس میں بآسانی و سہولت، اور اس حسن خوبی کیساتھ کہ بولنے اور سننے والا محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ اس کی مادری زبان کے الفاظ ہیں، یا کسی غیر زبان کے؟ مثال کے طور پر یہاں چند غیر زبانوں کے الفاظ درج کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

انگریزی کے الفاظ۔ گلاس، بٹن، ٹپک، کوٹ، پتلون، انجن، ریل۔ لائن

عقلم  
گوشن  
سید سیک  
کٹی ٹیک  
موجنا لہ  
تعلیم  
اعلان  
رہنکار  
کھلا بھوس  
جائے طعام  
شدائت  
متبعید  
راشتر ہا سہا  
پرتی ندی  
اصول  
اختلاف  
کانگریس  
ڈیپلیٹ

کانگریس کے قاعدین غلام کے سیم مواعید و اعلانات کے بعد اور اس کی دفعہ، کے تحت یہ ہے شمالی ہندوستان کی عام زبان جس کا ایک ایک لفظ تو کوئی مسلمان سمجھ سکتا ہے اور نہ ہندو۔ پھر اس کے علاوہ کانگریس کے ہندال میں اس کی ہر ہر شے گاہ پر، دروازوں پر، ٹانگش گاہ میں، اور پیالے کے ذریعے ذرتے پر سوائے ہندی و گجراتی رسم الخط کے اردو کا کہیں نام تک نہیں ہوتا۔ ان کے کاغذات، ان کے رجسٹروں اور ان کی رسیدات، استہانات و پوسٹر وغیرہ وغیرہ سب کے سب دیوناگری میں ہوتے ہیں، دیکھنے والوں کو اور خصوصاً شمالی ہند کے باشندوں کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یا تو ہم کسی غیر ملک کے جلسہ میں شریک ہیں، اور یا جاہل و آن پڑھ گوئے، پھر سے اور اندھے ہیں کہ نہ بول سکتے، نہ سمجھ سکتے، اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔

برہی پور کانگریس میں یہ سنی شمالی ہند کی زبان، اب اگر مسلمان آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور کالوں میں روئی ٹھونس کر کانگریس میں شریک ہونے تو بھی جناتی زبان سارے ملک میں پھیلی ہوئی نظر آئے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی فرد یا کوئی قوم قومی سے قومی ترہہ جو باقی ہے، تو طاقت کا زعم، آنکھوں کی بصارت، کالوں کی سماعت، اور دماغوں کی قابلیت زائل کر دیتا ہے، اور حق و انصاف کا نام صرف زبانوں اور کاغذوں پر رہ جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ جہد و پیمان ہمیشہ توڑنے کے لئے باندھا گیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کا تاریخ داں گروہ باغیر ہے، کہ سترہویں برس پارلیمنٹ نے ہندوستان کے مفاد کے لئے کیا اعلان کیا تھا؟ پھر سترہویں میں مذہب، نسل، اور رنگ کے فرق امتیاز کے متعلق کیا کہا تھا؟ پھر یہ وعدہ کہ ہم ہندوستان کے مفاد کو روپوں مفاد پر ترجیح دیں گے کیا ہوا؟ آخر میں سترہویں ملک و کٹوریا انجمنی نے ان اعلانات کی تصریح میں جو کچھ فرمایا اور جن لفظوں میں فرمایا خبرداران ہند کے دلوں پر وہ الفاظ بھی مکرر ہیں۔ لیکن طاقت نے ان تمام دعووں کو کبیر



درج کرنا بے سود ہے، یہ اور اسی قبیل کے ہزار ہا الفاظ و زائد استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن سے ایک شہری، ایک دیہاتی، ایک عالم اور ایک گنوار تک واقف ہے، اور جانتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ یہ الفاظ میری مادری زبان کے ہیں۔ اُس کو ان کے بولنے اور سمجھنے میں کوئی تکلیف اور کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

چونکہ سب سے پہلے یورپ سے ہندوستان میں پرتگالی قوم آئی تھی اور باوجود اس کے کہ اس کی حکومت یہاں پر برائے نام رہی۔ تاہم پرتگالی زبان کے الفاظ بھی اس میں باسانی مدغم ہو گئے۔ ان کے علاوہ فرانسیسی اور یونانی الفاظ بھی اردو میں شامل ہیں۔ جنس "یونانی لفظ ہے جس سے ایک گنوار تک واقف ہے۔ (باقی آئندہ)

ایشین۔ ٹمکٹ۔ بنک۔ نوٹ۔ سائیکل۔ موٹر۔ گاڑی۔ پوسٹ کار ڈیوڈ وغیرہ وغیرہ۔  
پرتگالی الفاظ۔ کرا۔ تباکو۔ بوتل۔ گٹا۔ الماری۔ آلپین۔ توپا وغیرہ وغیرہ۔  
ترکی الفاظ۔ قاپ۔ قابو۔ قاش۔ قرق۔ قزاق۔ قلاش۔ قورما۔ قینچی۔  
چچک۔ چیمپ۔ ماش۔ ماش۔ مازو (ایک پہل کا نام ہے۔ جو گنوار تک جانتا ہے۔  
فارسی الفاظ۔ چابک۔ چاٹوسی۔ دو۔ ہار۔ چارہ۔ چاشنی۔ چاکر۔  
چالاک۔ چائے۔ چپاتی۔ چراغ۔ چربی۔ چرخ۔ چٹ۔ چٹہ۔  
عربی الفاظ۔ ماتم۔ ماہر۔ مادہ۔ ماش (دال کا نام ہے مال۔ خٹن۔  
مالک۔ کھیت۔ اراضی۔ عدالت۔ موکیل۔ محرم۔ عوضی۔ عزت۔ عوق۔ محل۔  
روضہ۔ معائنہ۔

ہندو اور اردو کے الفاظ کی تو بھر مار ہے۔ اس لئے ان کا یہاں



ہندو والوں کو جگا دوں گا میں خواب ناز سے  
سجھ و زنا کے افسوں مٹا ڈالوں گا میں  
عارضی درد و الم مجھ کو ڈرا سکتے نہیں  
بادہ حب وطن سے سر بسر شراب ہوں!  
میرے نعروں میں جہاد و جہد کے پیغام ہیں!!  
جبر و استبداد کے قلعوں کو ڈھانے کے لئے  
میں اٹھا ہوں ہند کے اک گوشہ آزاد سے  
کپکپاٹنے گا میرے نام سے سرمایہ دار

زندہ کر دوں گا میں اُن کو شعر کے اعجاز سے  
ہڈیاں اس کفر و ایماں کی چبا ڈالوں گا میں  
حادثاتِ زندگی کا پیچھا چھوڑ سکتے نہیں  
عشق کی تشیل کا اک جادو داں کردار ہوں  
رُست خیزی اور تغیر دو ہی میرے کام ہیں  
عزتِ مزدور دنیا میں بڑھانے کے لئے  
لے کے اپنے ساتھ تند و تیز و عالی حوصلے  
زندہ ہو جائے گا پھر عُشرت کا مارا کاشتکار

شیر کی صورت بپھر جاؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو  
مجھ کو جو کرنا ہے کر جاؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو







## محمور اکبر آبادی

(یہ مضمون اگست ۱۹۷۷ء میں دہلی سے ریڈیو میں پڑھا جا چکا ہے)

اور خالق حقیقت ہے اور یہ قیوں کیفیتیں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں، اس لئے جس شاعر میں اس نوع کی بصیرت موجود ہو وہ حقیقی شاعر ہے اور اس کا موضوع بھی تمام دقیقہ سنجوں کی طرح انسان ہو گا، ہومر کا لیداس، فردوسی بشیگتہیر، میر انیس، سب کا موضوع کسی نہ کسی حیثیت سے انسان اور اس کے کارنامے ہیں۔ ان ناموں نے مجھے ایک اور الہی شاعر کا نام یاد دلایا۔ جو مدت دید تک گناہم رہنے کے بعد آج بھر نگاہ انتخاب کامر کرنا ہوا ہے۔ میان نظیر اکبر آبادی ایک رمز شناس، حقیقت نگار شاعر ہیں اور ان کا موضوع بھی انسان ہے۔

اصل یہ ہے تمام حقیقی شعرا کا موضوع انسان ہوتا ہے، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو زبان کے دوسرے شعرا کیا حقیقی شاعر ہیں، ادماگر ہیں تو کیا ان کا موضوع بھی انسان ہے۔ اس کا جواب اگر ہاں سے دیا جائے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہو گا کہ نظیر کو کیا فوق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شعر کے باب میں فوق کا سوال کرنا فطری ہے حقیقی شعرا میں ایک کو دوسرے پر فوق نہیں ہوتا، ہر فرد اپنے پیغام کا حامل اور اپنی حیثیت میں حق اور جمال لکے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔ ہاں فوق کی بجائے امتیاز یا خصوصیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

نظیر کا امتیاز سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ دوسرے شعرا نے انسان پر جزوی نظر ڈالی ہے یا زندگی کا ایک پہلو، خواہ وہ کتنا ہی اہم باشندہ ہو۔

# نظیر اور انسان

سب سے پہلی کیفیت جو انسان پر طاری ہوتی ہے وہ غالباً حیرت ہے اس لئے حکما نے حیرت کو علم کی ابتداء یا بنیاد قرار دیا ہے۔ حیرت ایک فہمی اور اضافی کیفیت ہے، یعنی یہ کیفیت انسان پر خود اپنے اور اپنے ماحول کے متعلق طاری ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ علم کا موضوع خود انسان ہے، مجھے اس وقت علم کے امکانات سے بحث منظور نہیں، صرف یہ بتانا ہے کہ علم جس چیز کا نام ہے وہ انسان سے شروع ہو کر، بہت سے درمیانی مدارج طے کرنے کے بعد، جن سے انسان کو اپنے تعینات کا ادراک ہوتا ہے، خود انسان ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس حکیمانہ رمز کے وقت کے بعد دنیا کے تمام مذاہب اور فلسفوں نے انسان کو اشرف المخلوق اور کائنات کی خلقت کی غایت قرار دیا ہے۔ حامل یہ ہے کہ خالق، فطرت، تمدن اور حکمت کا سطح نظر انسان ہے۔

انسانی وجود کی اہمیت تسلیم کرنے کے بعد، صاحبان بصیرت کے لئے، انسان کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا بھی بے جا نہیں کہ حقیقی موضوع جس مفکر کی نظر کامر گزرنے لگے۔ خود اس صاحب فکر کو صاحب نظر مان لینا فرض ہو جاتا ہے۔ حیرت کی طرح بصیرت بھی ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے، لیکن جب یہ فطری پیکر اختیار کرے تو شعر بن جاتی ہے، واضح طور پر یوں سمجھئے کہ تخیل، حکمت اور شاہدے کے سمونے سے جو ذہن جمال خلق ہو، اس کے فطری وجود کا نام شعر ہے۔ انسان کائنات کی سب سے نمایاں، اہم

پیش کیا ہے۔ تیسرے جذبات کا تجزیہ کیا اور جذبات میں بھی وہ پس منظر کیا جو ہم کہا جاتا ہے، انہیں نے رزم کے جوہر دکھائے، ذوق نے توصیف کے وہ دیا پہنائے۔ موت نے حسابات کا مطالعہ کیا۔ غالب نے مسائل حیات پر فلسفیانہ نظر ڈالی۔ رستم نے حسن و عشق اور معاملہ بندی میں گہل دکھایا اور اکبر نے ظرافت کے پیرائے میں محنت کے خزانے نکالے۔ لیکن ان کمالات کے باوجود جو ان بزرگواروں کا حصہ تھے، انسان کے ساتھ ان کا علاقہ جزوی رہا۔

اب نظیر اکبر آبادی کو لیجئے۔ انہوں نے مکمل انسان پر نظر ڈالی، ان کے کلام میں انسان کے خیالات، اس کے جذبات، اس کے افعال، غرض نفس انسان کا مکمل مرقع آپ کے سامنے آتا ہے، نظیر کی تصویریں انسانی زندگی کی سچی تصویریں ہیں۔ ان کی محبت میں آپ معاشرت کے بہر عمل میں حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ ہر پہلو سے باخبر اور ہر حالت سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ بچہ، جوان، بوڑھا، ہنس کھیلتا، روتا، گاتا، ہا کباز، گنگار، عافت غافل۔ غرض ہر قسم اور ہر شکل کے انسان سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے، اس امتیاز کے علاوہ ایک پہلو امتیاز کا یہ ہے کہ دوسرے شاعروں نے جزوی زندگی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھا ہے، ان کے تناک ان کی فکر کا اثر ہیں، مگر یہاں نظیر نے مکمل انسان کو اس طرح دیکھا جس طرح وہ ان کے سامنے موجود تھا۔ ان کے مرقع ان کے مشاہدے کے شاہکار ہیں۔

نظیر کے متعلق جب یہ کہا جائے کہ مکمل انسان پر نظر ڈالی ہے تو اس کے پس منظر میں کہ مکمل نظر ڈالی ہے، تکمیل، معائنہ کا دوسرا پہلو ہے۔ مکمل انسان پر نظر ڈالنا۔ مکمل نظر سے جداگانہ بات ہے، پہلی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں باقی رہتا جس پر نظیر کی نظر نہ پڑی ہو، اس سے مشابہت کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری کا مطلب یہ ہے کہ جس جزو کو دیکھا، اس کی مصوری کا حق ادا کیا۔ اس سے تحلیل اور تجزیے کی قوت ثابت ہوتی ہے۔ نظیر کے باب میں یہ دونوں پہلو مخلوط نہ کرنے چاہئیں۔ زندگی کے بیشتر پہلو ایسے ہیں جن کا مکمل تجزیہ کیے کے نظیر نے مصوری کا حق ادا کیا۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو نشہ نہ گئے۔ نظیر کا اصل اہلکار مشاہدہ ہے اور اس باب میں آپ انہیں کہیں قاصر نہ پائیں گے۔

میاں نظیر ایک مجدد تھے جو اپنے عہد سے ایک عہدی بیشتر پیدا ہوئے

یا یوں کہئے کہ جس درخت کو اس عہد میں بارور ہونا تھا اس کا بیج فطرت کی دُور بین فراست نے اتنی مدت پہلے بو دیا تھا، نظیر کی اہل غفلت یہ ہے کہ انہوں نے مکمل انسان سے بحث کی اور اس طرح فطرت شناسی۔ فطرت نگاری اور فطرت سے مطابقت کا ثبوت دیا۔ فطرت نے انسان کو مکمل پیدا کیا ہے۔ تکمیل سے صرف ہر حالت یا ہر قسم مقصود نہیں، بلکہ ہر عہد، ہر ملک، ہر مہذب اور ہر نوع کا انسان مراد ہے، میاں نظیر کی تصویریں ان کے عہد کی تصویریں بھی ہیں اور اس معیار پر بھی پوری اترتی ہیں۔ غالباً یہی وہ خصوصیت ہے جس نے شکسپیر کو شہرت عام اور بقائے دوام کی عزت بخشی۔ عام شاعرانہ حیثیت۔ غزل گوئی۔ نظم گوئی۔ آرٹ۔ مصوری، ادبیت فن شعری واقفیت، ایسے پہلو ہیں جو میاں نظیر میں دوسرے شاعروں کے ساتھ مشترک ہیں، ان حیثیتوں سے نظیر اور دوسرے شعرا پر یکساں نقد کیا جاسکتا ہے، لیکن نظیر کے خصوصیات یہ ہیں کہ انہیں پہلا ہندی شاعر، خاص ماحول کا مالک اور موضوع کا خلاق کہا جاتا ہے۔ توکل کلر کی آہنیش مستزاد ہے۔ کچھ خصوصیتیں ان سے بھی بالاتر ہیں۔ وہ اخلاق اور خط و کاری کا درس، بے تعصبی اور رواداری، قومی نظریہ، رسم و رواج سے واقفیت، عادات و خصائل کا درک، تاریخی ماحول اور لسانی نکتہ دانی ہیں، ان ماحول میں ہر ایک فی نفسہ ایک مقالے کا محتاج ہے اور ان سب سے مل کر نظیر کے انسانی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس شغف کی یہ اہمیت ہے کہ اس کو نظیر کی شاعری کی اساس یا روح و رواں کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اب تاریخی ماحول اور لسانی نکتہ دانی پر نظر ڈالئے تاکہ اس شغف کی وضاحت ہو جائے۔

نظیر کی بصیرت افروز ہمہ گیری جس طرح وسعت نظر، فطرت کے خائر مطالعے اور کائنات کی بغیر شناسی پر مبنی ہے۔ اسی طرح بنی آدم سے ان کی انتہائی دلچسپی ثابت ان کے تاریخی ماحول کا نتیجہ ہے۔ میرے اعتقاد کے مطابق تو یہ جذبہ بھی انہیں فطرت نے ودیعت کیا تھا۔ لیکن حقائق کو اسباب و علل کی مدد سے دیکھنے والوں کے لئے خارجی سبب کا وجود لازمی ہے اور وہ صرف تاریخی ماحول ہو سکتا ہے۔

مارٹن لیو تھرنے سہ ۶ میں یورپ کی روایت پرستی کے خلاف

حریت خیال کا آواز بلند کیا۔ یورپ کا نقشہ انسانیہ جس نے آخر کار انسان

کی غفلت کا جھنڈا گاڑا، اسی تحریک کا نتیجہ تھا، جس طرح اس تحریک کی

ہمیت سمجھنے کے لئے یورپ کے اخلاقی، مذہبی اور سیاسی انحطاط کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی طرح مہاں نظیر کے ہنرمیں کی اصل وفات سمجھنے کے لئے ان کے عصر کے ہندوستان کو واقعات و حوادث کی روشنی میں دیکھنا لازمی ہے۔ نظیر محمد شاہ کے عہد میں پیدا ہوئے اور سترہ سو میں فوت ہوئے۔ ان کا زمانہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف اور انیسویں کے اوّل ربع کو محیط ہے۔ یہ عہد اخلاقی، تمدنی، مذہبی، سیاسی عرصہ ہر اعتبار سے ہندوستان کے تزلزل کا زمانہ تھا۔ امن و سکون کی حکومت، بد امنی اور طوائف الملوک نے غصہ بکری نہی، اور رنگ زیب کی وفات (۱۷۷۷ء) کے بعد سے برطانوی حکومت کے قیام تک (۱۸۵۸ء) جو مدت گزری اُس میں زندگی کا معیار نہایت پست اور شرمناک رہا۔ اس دوران کے تاجدار اور شاہزادے، امرار اور اراکین عام طور پر سیرت کے بدترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ مشاہیر کی زندگی، شرارت، خداری، فتنہ انگیزی، قتل و غارت مکروہ شہوت پرستی، شدید ظلم، بے نہایت ہوسٹاکی اور حرص و آرزو کا ایک طویل افسانہ نظر آتی ہے۔

مصل فرماؤں کی کم ہمتی، غفلت اور عیش پرستی کے باعث کاندال شروع ہو گیا تھا۔ صوبوں نے خود مری پر کمر باندھ لی تھی۔ اکبر آؤ اورنگ زیب کی میراث اغیار کے ہاتھوں سے بجزے ہو رہی تھی۔ مرہٹوں روہیلوں اور پنڈاریوں نے مات کی غنیمت اور دن کی بھوک حرام کر دی تھی سکھوں کی شورش روز افزوں ترقی پر تھی۔ دلی کا نادر شاہی قتل۔ احمد شاہ ابدلی کا حملہ اور ہانی پت کی تیسری لڑائی، غلام قادر کے مظالم، سب بلائیں اسی عہد میں نازل ہوئیں۔ اندرون ملک کا تو یہ عالم تھا اور ساحلوں پر بدیشی سوداگر فاحشہ طرز عمل اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ امن و سکون، راحت و آسائش نے زندگی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ انسان کی جان مال، آبرو ہر وقت سخت خطر میں تھی۔ آزادی کا کوئی وقار اور زندگی کی کوئی عظمت باقی نہ رہی تھی، یورپ اس وقت کم و بیش بیدار ہو چکا تھا، روس اور وائٹیر کی غفلت سوز تلقینوں نے مذہب اور استبداد کے غلام انسان اوان کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ آخر کار فرانس کے انقلاب نے یگانگتی، مساوات اور حریت کا اعلان کیا۔ دنیا میں آزادی کی لہر دوڑ گئی۔ فرانس کا انقلاب جس اصول کو لیکر اٹھا تھا وہ سماجی مساوات اور انسان کی عظمت کا اصول تھا۔

ہندوستان اور یورپ کے حوادث اور انقلابات ایسے نہ تھے کہ کوئی اہل دل یا صاحب بصیرت ان سے متاثر نہ ہو۔ نظیر ایک گوشہ نشین بزرگ تھے۔ ان کے زمانے میں مراثیت کے ذرائع نہایت محدود تھے، انھیں یورپ کی آزادی کی جنگ کا پورا علم ہونا محال نہیں تو دشواخروں تھا، مگر وہ یورپ کی فزاسے براہ الہام اور ہند کے حوادث سے براہ راست سخت متاثر ہوئے۔ وطن کے ابتکانے جو درد ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا اس کی جھلک کلام میں صاف نظر آتی ہے۔ ملک کی غفلت اور پستی کے حوالے جا سجا موجود ہیں۔ دنیا اور عیش دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی دکھا کر جگہ جگہ عبرت آموزی کی ہے۔ آلام و مصائب دور کرنے کے لئے غالباً پہلا سبق یہ ہے کہ معاشرتی فرق اور عمرانی عدم مساوات کو ذہنی پستی کا مترادف بنا کر دیکھا جائے اور مساوات کا احساس کرایا جائے اور اس طرح انسانی حیات کی صحیح عظمت اور وجود کی منزلت پر زور دیا جائے، نظیر نے یہ فرض بدرجہ اولیٰ انجام دیا ہے۔

اپنی نامہ۔ آدمی نامہ۔ بنجارہ نامہ۔ پٹن نامہ۔ فنا نامہ۔ عاشق نامہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

دوسرا نکتہ جس سے نظیر کا انسانی شغف نمایاں ہے، اس کی لسانی عبارت ہے۔ اردو کے کسی شاعر کے یہاں لغات کا ایسا وسیع استہلال نہیں ملتا۔ اردو میں کثرت سے ایسے الفاظ ہیں جو نظیر نے ہندی سے جن جن کر اردو میں کھپائے، لسانیات کا باہر غالباً اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے گا کہ بازار دیہاتی زمانہ کی زبانیں کسی مہموم کے ادا کرنے میں قاصر نہیں ہوتیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض مفہیم کے لئے ان کے الفاظ اتنے موزوں، حسین اور جانت ہوتے ہیں کہ ان کے مترادف لغات کو میسر نہیں آتے۔ نظیر نے اس راز کو سمجھ کر ان تینوں ذرائع سے الفاظ حاصل کئے اور اس خوبی سے اردو میں سموئے کہ نہ صرف ان کی اجنبیت زائل ہوئی بلکہ ان میں خود بخود مسجیدگی، ثقاہت اور ادبیت بھی پیدا ہو گئی۔ عوام اور خواص کی زبان کا اختلاف دور کرنے کی کوشش اہل میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا بنیادی فرق مٹانے کی سی ہے جو انسانی عظمت کے احساس اور تبلیغ کی کھلی دلیل ہے۔

توسیع کے احسان سے بڑا احسان یہ ہے کہ نظیر نے زبان کو سلیس اور عام فہم بنایا۔ زبان کی سلاست اور بیان کی سادگی ان کی دلشکستگی کا تقاضا



تھی۔ اپنا اصلاحی پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے عوام کی زبان کا استعمال از  
بس ضروری تھا۔ نظیر کے اس طرز عمل سے شاعری کو پغمبری کا جزو تسلیم کرنا  
پڑتا ہے۔ اصلاح اور تبلیغ کے علاوہ شعر کا اثر مسرت، روشن خیالی اور  
جند جمگی بھی پیدا کرتا ہے۔ نظیر کی کوشش تھی کہ شعر و سخن کی دولت میں  
جو خدوائے ان کی ذہنی کاوش کا ثمرہ اور اس کی غیر فانی میراث ہے۔ ہر  
فرد بشر پر اپنا حصہ دار نظر آئے۔ علم کی دولت، زرد و جاہر کے انبار کی  
طرح صرف خواص کا اہارہ نہ بن جائے۔

نظیر کے مخالفت اُن کی سادگی اور عام فہمی کو علم کی کمی کا سبب قرار  
دیتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ اُن کا بھرفارسی اور بعض مقامات پر اردو  
کلام سے ثابت ہے۔ مگر وہ نائنس کے مخالف تھے، اخلاق اور نائنس  
سادگی اور فرد تخی کے مقابلے میں نہ صرف ہیئت آسان ہیں بلکہ ان کو  
علم و فضل کی نائنس کا ذریعہ یا عین فکر اور وقت خیال اور فکر کی دلیل  
سمجھنا ہے۔ نظیر نے اپنا اسلوب دانستہ اختیار کیا تھا جو اُن کے سخن کا  
ایک پُر اثر طریقہ کار تھا۔ نظیر کی زبان ہندوستانی ہے اور وہ ہندوستانی  
جسے ہندو حاضر میں جہاننا گاندھی نے زبان کا آئندہ بل سمجھا ہے۔ یہ شعر کا  
معجزہ ہے کہ جس زبان کی ضرورت ملک کو آج محسوس ہوئی، اس کی بنیاد  
نظیر نے ڈیڑھ سو برس پہلے رکھ دی تھی۔ ان کا طرز عمل سیاسی بصیرت  
کی بڑی دلیل ہے، اور سیاسی بصیرت کا یہ مفاد ہے کہ وہ انسان کے  
لئے کسب منفعت کا ایک معقول ذریعہ ہے۔

ملک اور قوم کی محبت نفس کی شرافت کا لازمہ ہے، اس نوع کی محبت  
ہندوستانی کے دل میں، یہاں کی مختلف قوموں کو ایک ہندوستانی  
قوم بنانے کی آرزو پیدا کرے گی۔ نظیر کا قلب اس آرزو سے لبریز تھا۔  
ایک قوم کے لئے واحد زبان ضروری ہے، اس احساس نے نظیر سے  
مشترک زبان کی بنیاد ڈالوائی۔ غیر مانوس فارسی محاورے۔ ترکیبوں اور  
لفظوں کو نکال کر ہندی محاوروں۔ ترکیبوں اور لفظوں کو رائج کرنا نظیر کے  
محب وطن ہونے کی بڑی دلیل ہے، انہیں یہ کہ یہ اہم خدمت ایک  
دماغ میں عیب خیال کی گئی۔ مگر آج کا زمانہ سمجھی جاتی ہے، نفسیات کا  
مطالعہ کرنے والے اسپرٹس نہیں کرتے، مرض کی شدت میں وہ الکی بھی  
طیب کا غلام عظیم محسوس ہوتی ہے، مگر پھر وہی تمہنی تریاق بن جاتی ہے۔

محب وطن کی کوشش مشترک زبان تک محدود نہیں رہتی۔ وہ اپنے  
ملک میں تھار۔ دم و رواج، میٹے، ہیر و اور دیوتا بھی مشترک دیکھنا چاہتا ہے،  
ہولی۔ دوالی۔ راکھی۔ داؤجی کا میلہ۔ کرشن جنم۔ بانسری، بسنت، تیراکی  
کا میلہ نام کی نظیریں اسی جذبے کے تحت میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ہر نظم ایک منفصل  
تبصرہ کی محتاج ہے۔ جس ملک میں مختلف مذاہب رائج ہوں اور پھر اس کی  
قوموں کو ایک قوم بنانے کی کوشش کی جائے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ  
قومیں ایک دوسرے کی مذہبی آیات اور اعتقادات کو سمجھیں اور ان کی  
عزت کرنا سیکھیں۔ معجزہ حضرت علیؑ اور حضرت سلیم چشتیؒ نام کی نظیریں جس  
خلوص اور عقیدت سے لکھی گئی ہیں اتنی ہی محبت اور ارادت کرشن جی  
کے جنم اور بابائے ملک شاہ گرد، نام کی نظیروں میں نظر آتی ہے۔

اشرف المخلوق ہونے کی حیثیت سے جہاں دنیا کی ساری نعمتیں انسان  
کا حق سمجھی جاتی ہیں، وہاں معاصی اور غمہ الم کا سارا ہمارا بھی انسان ہی  
کی گردن کے لئے مخصوص ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسان خود بھی اپنا دشمن ہے،  
وہ اپنے کو خود ساختہ قید و بند میں گرفتار کر کے اپنی زندگی کو آرام و بہت  
سے محروم کرنا دیتا ہے، نظیر کو یہ راز معلوم تھا۔ ان کی محبت کا تقاضا تھا  
کہ اس بار کو ہلکا اور ان بیڑیوں کو کاٹنے کی تدبیریں بتائیں۔ تعصب، خود  
غرضی، غلامی، لاندھی، بے دینی، جاہ پرستی، جب دنیا، ظلم و تعدی، کبر  
و نخوت کے ذریعے نازل ہونے والی بلائیں، آپ اپنی لائی ہوئی بھتیجی  
ہیں۔ نظیر نے انسان کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی بار بار تہذیبیں بتائی  
ہیں۔ دنیا کے علاقے پھلانے کے لئے کہیں خوش باشی اور آزادانہ طرز زندگی  
سکھایا ہے، سخاوت و عشرت اسی قسم کی ایک ہنایت و محبوب نظم ہے۔

نظیر کے انسانی شغف کا مزید تجزیہ کرنے سے انسان کی محبت کی  
ایسی پُر خلوص مثالیں سامنے آتی ہیں، جن کی بنا پر اس محب علم کو مجدد تسلیم  
کر لینا پڑتا ہے۔ وہ اتنے کثیر الاحباب تھے کہ شہر میں عام طور پر لوگوں سے  
اُن کے تعلقات تھے، ان کی دوستی کے لئے حیثیت کی کوئی قید نہ تھی۔  
ہر درجے اور معاشرت کا انسان ان کی محبت میں بار پاسکتا تھا۔

پیشہ دروں اور اہل حرفت سے انہیں خصوصیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ  
ان کی معاشرت اور ان کے فنون کی اصطلاحوں پر نظیر کو اس قدر عبور تھا،  
سعدی کی طرح نظیر کا وسیع تجربہ ان کے اخلاق کی وسعت کا رہنما بنتا ہے۔



تفکر کی انسانی محبت کا یہ عالم ہے کہ انھیں انسان کے ہر سے بڑے  
فصل سے بھی نفرت نہیں ہے۔ ان کی مخالفت یا اشتعال، رحم کی صورت میں  
جلوہ نہا ہوتا ہے۔ یہی پیشہ اختیار کرنا ہمدردی کی مکمل ہوتی دلیل ہے۔ یہی  
نے معقم کو ذہن اور اخلاق دونوں کی تربیت کا موقع اور اختیار دیا ہے۔ علم  
کا فرض ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے بہت بڑے کی طرف زیادہ توجہ کرے،  
توجہ جس سے ممکن ہے جب معلم کی فطرت میں اتنا درجہ کا غل اور رواداری  
ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے شاگردوں کی پستیوں سے بیزار ہو کر ان سے  
نفرت نہ کرنے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ نفرت کو اپنے ذاتی ایثار اور نفس کشی  
کے ذریعے ہمدردی میں بدل دے۔ تفکر کے یہاں انسان کے افعال شینہ  
سے کہیں بیزاری کا اظہار نظر نہیں آتا۔ جا بجا رحم اور ہمدردی کے جذبے  
پائے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی فطرت میں ایثار کی کتنی غلظت  
قوت موجود تھی۔

فراش کی موجودگی کی بنا پر تفکر کے کلام کو ریگیا اور سوجیا نہ کہا جاتا  
ہے۔ یہ فیصلہ اول تو اس لئے قلعی غلط ہے کہ ایک عیب کی بنا پر ہزاروں  
بے مثل خوبیاں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ دوسرے فراش کے باب میں نیت  
کا مسئلہ نزاعی ہے۔ دنیا اور لوازم دنیا کو تفکر کی طرح ہیچ اور لالچئی سمجھنے والا  
نفس، عیش و عشرت کی بہت وفانی لذتوں میں مبتلا نظر نہیں آسکتا، نہیں ہرگز  
اپنا ممکن نہیں۔ اس قسم کا گمان صرف نفسیاتی غلطی ہے، اس لئے یہ مان لینا  
پڑے گا کہ فراش کا واسطہ بدعتی کی بنا پر اپنے نفس کی پرورش یا حصول  
لذت کے لئے نہ تھا، جب یہ وجہ باقی نہیں رہتی تو دوسری تہاش کرنی پڑتی  
اور وہ تفکر کے علم روپے اور طریقہ کار کے مطابق ہونی چاہیے، یہاں پھر  
تفکر کی کاغذ بصیرت ہماری جستجو کی مدد کرتی ہے۔ باغ کی سیر کرنے والا کانٹے  
سے قلعی نظر نہیں کر سکتا۔ شہر کے آباد و محروم حصوں، فرحت بخش و دلکش شہروں  
سے گزرنے والا، گندے نالوں کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا، اور اگر  
کرے تو وہ پھر نہ کہہ سکے گا کہ پورے باغ کی سیر کر لی یا تمام شہر دیکھ لیا،  
اگر وہ تاج گج کاروضہ اور ڈھولی کمار کا نالہ دونوں پائے جاتے ہیں۔  
سوسائٹی کے مردوں میں نیکو کار اور بدکار دونوں قسم کے افراد موجود ہیں،  
جب نیک و بد حسن و قبح، خیر و شر کی دو علی کا یہ عالم ہو کہ صرف ایک کو دیکھنا  
اور دوسرے سے بے خبر نہ ہونا صرف اپنی بے بصیرت کا ثبوت بلکہ فطرت

سے ایک قسم کی بغاوت ہے، تفکر جیسے ہر وہ فطرت کے لئے اس نوع  
کی بغاوت حرام تھی۔ اس لئے بازاری زندگی کی جو تصویریں تفکر نے  
کھینچی ہیں وہ تمام و کمال صحیح، دلچسپ اور مکمل ہیں۔  
کہا جاتا ہے کہ تفکر نے خود بازاری زندگی بسر کی، اسی لئے انھیں  
اس زندگی کے حالات اتنے صحیح معلوم ہیں اور بعد کو وہ خود اپنی حالت  
پر پشیمان ہوئے، مجھے نہ اس خیال سے اتفاق ہے نہ ہشیانی کی کوئی شکل  
کلام میں میسر آتی ہے، حقیقت اس کے خلاف اور سادہ نقطوں میں یہ  
ہے کہ تفکر نے ہر قسم کی سو قیادہ زندگی کا غائر مطالعہ کیا اور یہ جس ممکن  
تھا، جب ان حالات میں زندگی بسر کی جائے۔ لیکن شرابی کی ہمنشین، تھار  
بادی دوستی اور عیاش کی ہم مجلسی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ساتھی بھی ضرور  
شرابی، جواری یا عیاش ہو جائے، انسانی فطرت کے محقق کے لئے ناگزیر  
ہے کہ وہ تمام فطرتوں کا قریب سے مطالعہ کرے۔ تفکر نے یہی کیا اور اپنی  
روح کو تمام آلودگیوں سے منزہ رکھا۔

مسیحوں کا اعتقاد ہے کہ مسیح خود خدا تھے، باری تعالیٰ نے اپنے کو پہنچانے  
کے لئے مسیح کا انسانی قالب اختیار کیا۔ اصول یہ ہے کہ ایک عین کے لئے  
جنس کا عرفان محال ہے، خدا جب تک انسان بن کر، انسانوں میں نہ  
آئے، انسان کے لئے اس کا سمجھنا ممکن نہیں ہے، مذہبی اعتقاد سے قطع  
نظر کر کے معنی نفسیاتی نقطہ نظر سے اس مسئلے پر نگاہ ڈالے تو بڑی حقیقت  
یہ نقاب ہوتی ہے، ہمنشین مولانا کا وعدہ قلب پر اتنا اثر نہیں چھوڑتا جتنا  
ہمنشین کی بر محل ہمائش۔ تفکر نے سو قیادہ معاشرت میں گھل مل کر اس لئے  
حصہ لیا کہ عوام کی بر محل ہمائش کا موقع ہاتھ آئے۔ انھوں نے داعط کے  
طرح اعلیٰ پر کھڑے ہو کر، دنیا کو کبھی نصیحت نہیں کی، بلکہ جس طبقے کی ہمائش  
مقصود ہے۔ اس کے بدترین افراد کے گلوں میں باہیں ڈال کر سمجھایا اور  
اپنے کو خود انھیں کی جماعت کا ایک انسان قرار دے کر نصیحت کی ہے  
اس کا اثر لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کو ناگوار نہیں ہوتا، اور  
سننے والے کو گوش شنوا میسر آ جاتا ہے۔ دوائی کی نظم میں قار بارادی  
کی خرابیاں بیان کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

تفکر آپ بھی ہے جو دیا دوائی کا

# سری کشرن داس صاحب کا مکتوب

از پرنسپل گورکھ لالہ

مکرم بندہ ایڈیٹر صاحب زادہ عنایت

کیننگھم سن حاجو گٹ سندھنی ٹھکانا راولپنڈی

غیر افسانوی دوز چاہک برائیاں

تسلیم کر سکتا ہوں کہ میرے فاضل دوست سید شقائق علی صاحب  
لی لے، ایل، ایل، بی، پرائیویٹ، ٹنگ سب انسپکٹر پرنسپل گورکھ لالہ نے  
رسالہ طورہ کا اپریل شمارہ کا پرچہ عنایت فرمایا، جس کے لئے میں ان کا شکریہ  
ہوں۔ میں اس کے مطالعے سے بے حد سرور ہوا۔ مگر مجھے اس رسالے میں ایک  
امر جو نہایت نمایاں و روشن تھا، قابل اعتراض بلکہ میسر معلوم ہوا۔ اور  
وہ امر یہ ہے کہ دقیق و ادق بندشوں کے علاوہ جا بجا جمل و سیم الفاظ استعمال  
کئے گئے ہیں۔ جن کی نظیریں مستند اردو کی عبارات میں پائی جاتی ہیں، اور  
جو قواعد صرف و نحو کی رو سے بھی غلط ہیں۔ مثیل کے طور پر ان میں سے میں چند  
ایک درجہ ذیل کرتا ہوں۔

(۱) ادبیات (۲) تجلیات (۳) سفلی رجحانات (۴) ذاتیات (۵) اقتصادیات  
(۶) عرفانیات (۷) شبابیات (۸) جمالیات (۹) توارکخی مقامات  
(۱۰) طسماتی حسن (۱۱) مقدس تعلیمات (۱۲) مابعد الطبیعیاتی (۱۳) مافوقی نظام  
عربی اور فارسی مصادر کی تجنیس و تانیث اور پھر ایسے مصادر پر توثق  
کی ہیں صرف و نحو یا علم ادب کے کسی قاعدہ سے بھی جائز نہیں ہیں۔ ان میں سے  
بعض میں تو غیر ضروری بھی ہیں، کیونکہ ان کے صیغہ جات واحد موجود و مروجہ  
اور صحیح معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً تمہی۔ رجحان۔ عرفان۔ جمال وغیرہ

معلوم معنوں نگاروں کی ہمت پسند طبع نے کیوں غلط۔ غیر ضروری اور  
بے معنی الفاظ کے اختراع کی ضرورت محسوس کی۔ میں خود زبان داں یا دانش  
پرداز نہیں ہوں۔ بقول مخفی ص

ذیب و ذینت لبس مہینم نام من ذیب النساء

مگر میرا خیال ہے کہ بعض الفاظ مثلاً شبابیات۔ جمالیات وغیرہ کے  
موجد خود بھی ان مشتقات کے مآخذ و معنوم کی تلاش سے قاصر ہوں گے۔

توارکخی مقامات۔ طسماتی حسن اور مقدس تعلیمات کے صحیح مترادف یعنی  
تاریخی مقامات۔ طسمی حسن اور مقدس تعلیم اردو میں مروجہ و موجود ہیں۔ پھر  
معلوم کہ یائے صفت لگانے سے پہلے کم کی صحیح بنانے کی کیا ضرورت درپیش تھی۔  
بعض مرکبات مثلاً مابعد الطبیعیاتی۔ مافوقی نظام وغیرہ ایسے مرکبات  
ہیں جو غیر مروجہ غیر فصیح۔ خلاف محاورہ اور خلاف قواعد ہیں۔ نہ تو قواعد  
صرف و نحو ایسے مرکبات کی اجازت دیتے ہیں۔ نہ ہی اشاعت اردو کے  
لئے ان کی ضرورت ہے، اور نہ ہی ان کا مطلب آسانی سے اخذ ہو سکتا  
ہے۔ بلکہ پڑھنے والے کی طبیعت پر ان کا وہی اثر پڑتا ہے جو بالائی میں صحت  
کی ڈیلیوں کے ساتھ سنگریزوں کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔  
تجلیات کے راقم خود متضاد بندشوں کے موجد ثابت ہوئے ہیں مثلاً  
صفحہ اول پر لکھتے ہیں۔

جو مشکلات انہیں خرد ساز سازی میں دیکھنا پڑیں۔

اور صفحہ دوم پر لکھتے ہیں۔

ہر ایک چیز کو آہستہ آہستہ ترقی کرنی چاہیے۔

الفاظ مشکل اور ترقی اردو میں سوئٹ استعمال ہوتے ہیں۔ نہ معلوم اہل  
الذکر کے لئے فعل دیکھا ہیضہ مذکر اور نوزال ذکر کے بعد کئی بصیغہ سوئٹ  
کیوں استعمال کئے گئے ہیں، مناسب تھا یا تو دونوں جگہ ہیضہ مذکر استعمال  
کیا جانا یا ہیضہ سوئٹ، اگرچہ مختلف شعرا نے دونوں بندشوں کو استعمال  
کیا ہے، مگر ایک ہی صفت کے ایک ہی معنوں میں دو متضاد معنوں کا  
استعمال معیوب اور قابل اعتراض ہے، ارشد گوگانی فرماتے ہیں ع  
اگر آنکھیں دکھانا نہیں دکھاتے اپنی آنکھوں سے  
صفحہ ۳ پر لفظ نواز آغا ہر کرتا ہے مگر یہ بظاہر کسی اردو مصدر  
نوازنا کا ہیضہ ماضی ہے، مگر اردو زبان میں آج تک ایسا کوئی مصدر  
دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا، البتہ فارسی میں نواضن، نوازیدن، مصدر ہیں  
معلوم لفظ نواز کہاں سے تلاش کیا گیا۔ یا کیوں اختراع کیا گیا ہے، ایسا  
ہی صفحہ ۳ پر درج ہے۔

وہ ایک بھارے تن و توش کا آدمی تھا۔  
اردو میں لفظ بھاری استعمال ہوتا ہے، آج تک کسی نے الفاظ بھارا  
یا بھارے استعمال نہیں کئے جیسا کہ شعر ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔  
دیکھتی جو اٹھا کر نہ ترے لٹے ہاتھ  
یہی اتنا تو نہ تھا پردہ محفل بھاری

صفحہ ۳ پر جو رباعی درج ہے، اس کے مصرع دوم میں لفظ آرمیدہ  
استعمال کیا گیا ہے مگر شعرا اردو نے اب تک لفظ آرمیدہ ہی استعمال کیا ہے مثلاً  
نظم چماں نہ دور فلک کا مجھے خیال  
میر مثنوی۔  
دریا کے جوش میں تیرا آرمیدہ ہوں  
ہے آرمیدگی میں نکویش بجا بے  
فائب  
صبح وطن ہے خندہ دندانہ مجھے

میر امجد تنقید یا مکتہ صبی نہیں ہے۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ رسالہ  
مطوع جیسا پڑھو اور مفید ہے۔ اسے ویسا ہی عام فہم بھی ہونا چاہیے۔ تاکہ  
نہ صرف وہ اصحاب جو عربی اور فارسی سے بخوبی واقف ہوں، بلکہ اردو  
والی اصحاب بھی اس کے مطالعہ سے فیضیاب ہو سکیں اور مبتدیوں کے لئے  
ایسی بندشیں اور ترکیبیں پیش نہ کی جائیں جس سے وہ گمراہ ہو کر خود غلط الفاظ  
کے موجد بنیں۔

ایک ادبی رسالہ کے مدیران کا فرض اولین ہے کہ اپنے قارئین کو علم و  
ادب کے صحیح الفاظ اور سبق سکھائیں۔ اور اردو زبان کو لغزشوں اور  
بہل بندشوں سے ہٹا رکھیں۔ ع

خود پرستانہ دست بزم عشرت ساختن  
کیست کو آید ہر دل در رزم سنداں بافتن  
میں اپنے خیالات کی تائید میں جناب مولوی سید مہدی حسن صاحب  
اتسن کھنوی کے چند اشعار جو ملک کے چوٹی کے اشعار وادار شعرا  
میں سے ہیں، نقل کرتا ہوں۔  
نفسیات وعلیات وخصیات وخصیات وخصیات وخصیات وخصیات  
مالیات وخصیات وخواہشات وصدقیات وخصیات وخصیات وخصیات  
سالم جمع سوئٹ ہر لیاات وداہیات  
فاملائن، فاملائن، فاملائن، فاملائن  
ہر ادبی رسالہ کا ایک فرض اہم اردو کی مردج غلیظوں کی تصحیح بھی  
ہونا چاہیے، اور میں سفارش کرتا ہوں کہ ہر پرچہ کے ساتھ ایک فہرست  
مردج غلط کی اور ان کے صحیح مترادفات کی درج کی جائے، تاکہ زبان  
اردو کو جس کے متعلق گرامی صاحب فرماتے ہیں کہ

.....  
در نہ قرآن اترتا بزبان اردو  
اے گرامی کشا ہر زہ سرایا نہ زبان  
نہستی واقف اسرار بہان اردو  
یہ شعر زبان حال سے نہ کہنا پڑے  
زبان زجبت باران فن بہ تنگ آمد  
کہ ہر معنی پڑ جوش پڑ آئنگ آمد

ہر عالم میں پناہ، جا میں نکلا  
ہر کہہ مثال کا، بسبب نکلا  
افسوس کرتے تھے سیدہ ہائے حق کا  
جھلکا جو تباہ تو بنے باطل کا  
(پیش)

# رقار وقت

ادارہ کلیم

قسم کے اسٹیٹ سوشلیزم کے منہک کو اپنی پالیسی بناتی رہی ہیں! آزادی ملک و قوم کی معنی تحریریں بھی اس وقت سرمن نشو و نما میں ہیں ان کی معاشی حیثیت کی اساس انکا اک غیر نوشتہ نوشتہ تقدیر پایا جاتا ہے! انڈین نیشنل کانگریس کی جدوجہد بھی اس نکتے میں کوئی استثنا نہیں رہی ہے، چنانچہ اس کی مٹی قریب کی تاریخ کے دیبا میں یہ دو دھارے — لبرلزم اور سوشلیزم — نمایاں طور پر پہلو بہ پہلو نمودار ہوئے ہیں: کراچی کانگریس ۱۹۳۱ء اگر "اعلان حقوق باشندگان ہندوستان" کے لئے یادگار ہے تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اک اجماع اس عقیدہ سہی بیاہ — صفحات تاریخ ہند پر اس حیثیت سے ثبت ہو چکا ہے کہ اس کی اک طویل و مفصل قرار داد نے شرکت کراچی والی ابتدائی سلسلہ جنہائی و دربارہ استعسان قیام ہندو پر دلالت کی واضح و قاطع الفاظ میں تصدیق و توثیق کی! اس نئی محدود تہیم آمر (dispensation) نے کانگریسی پیام و نظام دہدگار کے سارے سرشتوں کو شدید طور پر رنگین کیا! کانگریس روز بروز مزاحمتی و مزدوران کی اکٹھ بننے لگی، اس نے اپنا پہلا دیہاتی اجتماع فیض پور کے کپڑا گوردہ میں برپا کرنے کا انقلابی قدم اٹھایا، جس کے بعد ہی آئندہ انتخابات زیر نوفا ذائین ہند کی شرکت کے لئے اپنا چار پولیٹیکل سینیٹیوٹ لے گیا، وہ گویا کساؤں اور مزدوروں کے حقوق ہی کا اک بشارت نامہ تھا! کانگریس کے الیکشن کمپین کا ہی نقیب جہا اور سلطنت ہند کے ۷۷ صوبوں کے اندر اہل کانگریس کا کوسن لمن الملک الہوم سجا دیا!

کانگریس کا نیمینہ و نیمینہ ہذا افریق بینی و بینک کے محلے پر  
(Congress at the Cross-roads!)

جس چیز کا اندیشہ تھا وہ اپنی توقع اور شاید اپنے قیاسی وقت گہور کے میں لمے پر پیش آگئی! ہمارا نشانہ الیہ وہ سیاسی شقاق ہے جو عام کانگریس اور اس کے سوشلیٹ بازو کے درمیان عملاً واقع ہو گیا ہے! اور اس سانچے کے سرمن وجود میں آجانے میں اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ اس قدر کسر نہیں جس قدر کہ اس کی پردہ داری کی اک بیسودہ پردہ و رکشش ہے! کانگریس کا سوشلیٹ گروپ شاید زبان حال سے یہ غیر محفوظ پیام سند ہے کہ اسے

مختص در پئے وجہ سے سرلیاں بہ کہیں

شبلیا، نہ ہی پہنان تو دشوار آفتاد

اس اجمال کی تفصیل اور اس ایہام کی تصریح مندرجہ ذیل سطروں

ملاحظہ فرمائیے!

اس بحث کے جوڑی پس منظر کی حیثیت سے اگر فارغین تقیم رسالہ ہذا کے جنوری نمبر (سند رواں) کے پہرہ و رفتار وقت کے لوٹ بسترخی نیشنل کانگریس اور ہندوستانی سوشلیٹ جماعت کو پیش نظر رکھیں تو ہم مطالب میں خاص آسانی ہم پہنچے گی!

عہد حاضر میں جہاں جہاں آزادی نیا جی حکومتیں قائم ہوئی ہیں وہ لک

بلشبہ کانگریسی وزارتوں نے اپنے شہرہ مواعید کو فراموش کر دیا۔ انھوں نے مسند حکومت پر لیکن ہوتے ہی اصلاح پرستی، حریت پروری، صحافت پرستی، قلمی جہاد کی پزیر گشتی، اہل دیہات و کارخانہ جات کی دستگیری پرست پناہی کا اک فاسقانہ دور شروع کیا، اور اک ہفتہ عشرہ کے اندر ہی اندرونِ مظلوم کی فضا کو امید، آسودگی، راحت رسیدگی، اعتماد، اعتبار، بلکہ پندار کی برقی اسراج سے لبریز کر دیا:۔

لشکرِ محمد ہر آن چیز کو خاطر بخوات

آخر آمد ز پس پر وہ نقد پر پدید

تاہم دُور انقلاب کی اس بامرہ نواز تہید میں قدرے خوش خُشید دے دولتِ مقبول پر دے کے سیمائی مناظر تھے: کانگریسی کا مہینائے وزارت کے یہ جلوس ہائے اصلاح و امداد و تعمیر اپنے تنگ ممکنات کے آخری مدد سے جلد دو چار ہو گئے: برطانوی و فزیت و قیصریت کی محفوظ سب سکندری اُن کے مزید تقدم میں حائل ہو گئی: لیکن یہ چیز تو ناگزیر اور سستی نظر اندازی تھی، جو چیز دیکھنے والوں کو کھٹکی وہ یہ تھی کہ اڑکھ حنفی مزہ و روں کی بعض ہنگامہ آرائیوں میں اُن کے ساتھ ناپسندیدہ عقیدہ پر دازوں کا سا معاملہ بڑھا گیا:۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ:۔ یہ بے شک و نام ہے؟

یہ جانتا اگر تو نانا تائے گھر کو میں:

مشہور سر شیلڈ ایجی ٹیسٹر سربانٹی والا کی اک دانشکاتِ تفریح کی بنا پر عداس کی رہبانیتِ آب "حکومت بعدداتِ شریعت راجہ گوپال چارنیہ نے اُن کو ایسسرڈن کی رائے کے علی الرغمِ تقریباً انتظاماً اسیر نفسِ جیل بنا دیا، اور کان پوس کے بن مزدوروں کے فائدہ زدہ معدوں اور برہمنہ جموں کو تو فارنگ سے بھی نوازا گیا:۔ اُن کے اُس نوٹ کی قیمت کی ادائی میں جس نے کانگریسی وزراء کو اچان وزارت کا پردہ راز رابرداری بخشا تھا:۔

عجب ہم عشق تو ہم می کشند و غوغا فیت

تو نیز بر سرِ رام آ کہ خوش تا شا میرست:

بالآخر اک طرح کی شقن ناز کے مشاہدہ و مطالعے کے بعد وقت کے کانگریسی پر بیڈنٹ پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگریسی دُزار و اُمراء کی پندہ پر مدیوں اور تیز خرمیوں کا شکوہ دیکھیں کرنا پڑا:۔

جو پردہ دار بشیر می نذہرہ را کئے متقیم حرمِ حرمِ خواہد ماند! صوبہ بہار میں کانگریس و کسان سبھا کی اُن بن نے اس آویزش کو قریب قریب اک درجہ اول کے تعادم کی نوبت تک پہنچا دیا: بابو راجندر پرشاد اور سر سہجاند، علی الترتیب بگڑ و سرباہ داری کانگریس اور ولاداد سوشیلزم کسان اندولن کے ممبر داروں کی حیثیت سے اک دوسرے کے دو بدو آ گئے: اول الذکر نے اک کانگریسی پر کسان سبھا کی ممبری حرام کر دی، اور آخر الذکر نے بادل ناظر اسٹہ کانگریس سے استعفیٰ دیدیا: کیا پتہ کانگریس کمیٹی کے اس اقدام کی اثر آفرینی پتہ کے زمیندار اور تعلقداروں کی ستبار گہ کی وکی تھی؟ اگر راز و روں پر وہ یہ عقائد صوبہ جاتی کانگریس کا دشمن و درست کا یہ نیاترک و اختیار کہاں تک قابلِ رشک کہا جاسکتا ہے:۔

بقولِ دشمنِ پیمانِ دوست شکستی: میں کہ اڑکھ بڑیدی و باکہ پیوستی؟

مشر سہجاند نے اُپنی ایام میں اس نئی سیاسی شکست و ریخت کو اپنے

اک مبوط و مدلل بلبک اعلان میں دانشکات بیان کیا تھا:۔

انشائے راز عشق میں گزشتیں ہوئیں

لیکن اُسے جتا تو دیا، مان تو گیا:۔

آخر کار آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس تہری پورہ میں یہ سیاسی جوت پیش ہوا، راجندر بابو کی وکٹوری کی عنانگیری کی گئی، کانگریس و کسان کے درمیان کی اس مزعومہ نفیض سے انکار کیا گیا: اور کانون کی تعلیم و سیاسی تعلیم کانگریس کے سختن فرائض قرار دے گئے: نہ کہ کانگریس دشمنی یا کانگریس شکنی: کانگریس سوشلسٹوں کی طرف سے اس موقع پر اک جو بیج کی گئی: اتنا ہونا تھا کہ سر واپٹیل کو جلال آ گیا: اور اُنھوں نے اپنے سارے مشہور نکتہ کلام عدم تشدد و روحانی قوت کو غیر با و کہ کر یہ بلند بانگ چیلنج کیا کہ:۔

میں دو سال سے سوشلسٹوں کی رخنہ اندازیوں اور فتنہ پر دازیوں کو برداشت کرتا رہا ہوں، لیکن اب برداشت نہ کروں گا:۔

یہ اُس ہندوستانی فاسزم کی پہلی آواز ہے جس کی نسبت پنڈت

جواہر لال نہرو نے وقتاً فوقتاً اپنی تقریرات و تقریرات میں لٹل ٹکٹ کو متنبہ

کیا ہے: اور جس کے ہندوستان ایسے سرباہ داروں اور ہاجوں،

دینداروں اور متفقداروں، نوابوں اور راجوں، پھمی جی کے بھائیوں اور  
سینے علیہ السلام کے چستاروں کے ملک میں غور پذیر ہونے کے لئے قوی  
امکانات و محرکات پائے جاتے ہیں: ع

بہشتدار کہ سیلابِ فنا در پیش است:

معلوم ہندوستان اور روشن عالم بنگالی سوشلسٹ مصنف و  
مصافی و داعی مسٹر ایم۔ این۔ رائے کا ماضی قریب کی بنگالی پولیٹیکل کانفرنس  
کے پنڈال میں پھینکا ہوا یہ ہم اگر ہم اس موقع پر اک دفعہ اسٹن میں تو ملک  
کی تحریک سیاسی کی موجودہ "سوز" کی توجیہ و تبہیم میں اہم آسانی ہم پہنچے گی:  
"منصور انانیتھ منبت" رائے نے کہہ ڈالا کہ:

"اگر آپ کانگریسوں کے دلوں کو ٹٹولیں تو آپ کو ان کی اکثریت ایسی  
نظر آئے گی جو بہت دور اپنے ناخاندہ اور غریب بھوٹنوں سے غامدہ اٹھنا  
چاہتی ہے! اور آپ اگر اسی طرح ان کے مافی الضمیر کا جائزہ لیں تو آپ  
ان کے قول و فعل کا اختلاف دیکھ کر حیران و ششدر رہ جائیں گے: غریب  
مزدوروں اور کسانوں کی حالت پر ازراہ بعض اشک ریزی کرنے والے  
یہ لوگ، ساہوکاروں، کارخانہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں،  
جو ملک کے خربار کے جسم سے خون کا آخری قطرہ پھونک دیتے ہوئے ہیں،  
گہرے تعلقات رکھتے ہیں! اس وقت ملک کی عام آبادی کو ایسی طرح کانگریسی  
کارکنوں کی خود غرضی سے نجات دلانے کی ضرورت ہے جس طرح غیر ملکی حکمرانوں  
کے اثر و اقتدار سے! اگر ایسا نکلیا گیا تو ہم اپنی جد و جہد سے آزادی کے  
منہمکے مقصود سے قریب تر ہونے کے بجائے دور تر جا پڑیں گے!"

رائے کے اخیر جملے میں جس اندیشے کا اظہار کیا گیا ہے وہ اسپین اور  
اٹلی میں اک عملی تاریخی حادثہ بن چکا ہے! اول الذکر ملک میں معاشی جمہوریت  
اک کامیاب انتخاب (راہی سٹی، ادو آخ الذکر میں اک پورے باپردہ بال  
سوشلسٹ انقلاب کا جلوس رواں دواں ہو گیا تھا! لیکن

پہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے

اڑنے دے پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!

ہمارا مشاذا الیہ اسپین کے اُمراء و قائدین عسکری کی باغیانہ مداخلت  
فی الجمہوریت اور اٹلی کے کارخانہ داروں اور زمینداروں کا جوابی انقلاب  
رحبت ہے! اپنی تحریک کا سرخیل جنرل فرینکو بنا، اور دوسرے فتنہ فاسیزم

کا آلہ کار بنیو سولینی: جمہوریت جب معاشی جمہوریت کی صورت میں اپنی تکمیل پاتی  
اور اپنا "اقامہ نعمت" حاصل کرتے لگتی ہے تو سرمایہ دارانہ لبرلزم کے بورژوا متفقین  
اس نشو و نما کو روکنے کی ایسی ہی جان توڑ کوشش کرتے ہیں، جیسی کٹولیت کی سرحد  
اور حریت کے آغاز کے لئے پر شاہ اور ہنزادے، اعیانہ درباردار کا بن دولت ہر  
کردنی و نا کردنی کر گزرتے ہیں! درحقیقت اسی افتادہ بد کو روکنے کے لئے شاہی  
خاندان کی نظربندی اور ڈکٹیٹر شپ آف دی پروڈیٹریٹ کی ضرورت ہوتی  
ہے! اس نکتہ سیاست کو مارکس اور لینن نے جیسا پایا وہ اپنی کا حصہ تھا،  
بہت پایہ و ایلانیہ کے علاوہ یہ فروگزاشت جنگ عظیم کے بعد کی سوشلسٹ  
جرتی اور کمیونسٹ آسٹریا کے عوامی لیڈروں سے بھی سرزد ہوئی! اور وہ  
عبوری کے اس دشوار گزار پل صراط پر سے گزرتے ہوئے سوشلسٹ انقلاب  
کا "لا بُرجنت" اندھے منہ فاسیزم اور میٹروزم کے عینم میں جا گرا: یہ  
بر سے ڈوب جانے کا باعث نہ پوچھو کہ اسے سے نکلا گیا تھا سفینہ:  
سیاسیات کے اس چوراہے پر اگر ہندوستانی تاریخ ریت کا  
اس منزلہ الاقدام کی ٹکر سے محروم ہو جانا کوئی بعید امکان نہیں ہے: ہج  
تو یہ ہے کہ اس خوفناک سبب اور بندہ ذر سر زمین میں "فاسیزم" کا شجر غیٹ  
اک خود رو رویدگی نظر آتا ہے! بج بھی ہر چار اطراف میں اس ملعون  
موسم کے ہتھید آمیز آثار کافی نمایاں ہیں! مسلم لیگ اور ہندو جٹا سبھا  
حقیقتہً مسلمان اور ہندو فاسیزم کے درخیز کارندے ہیں! اس لئے کی  
قرار واقعی تشریح کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کے اُن مقالات کے پڑھنے  
کی ضرورت ہے، جن میں اُنھوں نے ان پرورش پذیر فتنوں کی طرف دعوت  
نظر دی ہے! اُن لوگوں کی بصیرت قابلِ رحم ہے، جو لیگ اور سبھا کا اسی  
طبقہ امارت اور ہندو ہماجی ٹوٹے کے نقیبوں اور سنگھ لڑاؤں کے سوا  
کچھ اور سمجھتے ہیں! پوتہ کا "شواجی ملٹری اسکول" اور یادش بخیر قلی گڑھ (قند  
ع) "بزبان خواجہ حسن نظامی، لاٹ پادری آل انڈیا فسطائیت کا مجوزہ  
کلیہ عربی مستقبل کے ہندوستانی فاسیزم ذیر سایہ برطانیہ کے ریپڈنٹ  
ڈپو" ثابت ہونے والے ہیں: برین بسیرے کے "قلعہ الموت" والا شخ مجمل  
اپنی بہتم بالشان خیر کمپنی کے ذیر تجویز اور دو ہندی، انگریزی اخبارات و  
جرائد کے ساغروں کی گردش سے اک ہندوستانی رجعت و فسطائیت کا حرق  
خشیش: یہ پیمانہ کبیر تقسیم کرنے کے منصوبوں کا بانگ دہل اعلان کر چکا ہے

پر اتر آیا ہے کہ جہادِ حریت کو معاشی جمہوریتہ کے آخری ٹھہر شیریں سے بارود نہ ہونے دے، اس لئے کہ سوشلسٹ نظم و نسق ملک کا گھرہ اُس کی دولت و عشرت و ریاست کے لئے اک ساڑ موت ہوگا!

سردار پٹیل کا ہری پورہ کے کانگریس پنڈال میں یہ پہنچ کہ اب میں سوشلسٹوں کو برداشت کرتے کرتے اپنے پیادے ممبر کو چھلکتا ہوا پارہا ہوں؟ ہندوستانی بورژوا کے ترکِ رفاقتِ جنگ کا وہ مرحلہ آخِر ہے جبکہ ملک کی بیخ کنی و سخت جان سرمایہ داری، وطن کی صفوفِ انقلاب کو اپنا مقدمہ پیادہ ہذا فاقِ بیخ و بنیک شٹانے پر مجبور ہو رہی ہے! اب وہ اپنے نقابِ فریب کو چاک ہونے سے نہیں بچا سکتی!

اس عجیب ماجرے میں ہاتھ لگانے کا توقف مطالعے کا دلچسپ موضوع ہے! بقول پنڈت جواہر لال کے ہاتھ ابھی اک پیدائشی انقلابی ہیں، اور مظلوم و محروم خلقِ اللہ کے دسوز حامی! لیکن وہ کیونرم کے مسلکِ تشدد سے خواں باخستہ ہیں اور اربابِ دولت کے منصبِ امانت داری دولت کے مقدس خط میں مبتلا! پس اس آغاز پذیر معرکے میں اُن کی زبردست شخصیت کا سدا ورن علامہ بورژوا غلام کے پڑے میں جاتا ہے، اور نادانستہ اُن کی معاشی خون آشامی کی حمایت کرتے ہیں! سردار پٹیل، ہاتھ کے خانی فی الشیخ مریدین وہ اب سرمایہ نواز کانگریس کے علم کے نیچے ہندوستانی مزدوروں کی اک ہندوستان گیر تلخ کے علمبردار بن کر میدان میں آگئے ہیں، احمد آباد کے حرفی مزدوروں کی اک انجمن اُن کے اذعان میں مزدوروں کے لئے بہترین ممکن اُسوتہ حسنہ ہے، جو ہڑتال کی حامل ہے، مزدوری دسریہ کے درمیان کی "مبتاتی جنگ" کی حامل! گویا ست

سپر دم جو مایہ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را! سردار پٹیل کی معصومانہ خود فراموشی قابلِ دید ہے! غائبانہ مملوک و محکوم کے درمیان کی بھی کسی ناگزیر نقیض کو بھی اب تسلیم نہ کرتے ہوں گے، جس پر اُن کے دیہاتی ستیاگرہ اور انکار اداوی ٹیکس کے سارے تاریخی یادگار معرکے اپنی تنہا بنیاد و اساس رکھتے تھے! تاہم ہندوستانی سوشلسٹ ان ابد فریبوں میں آنے والے نہیں، وہ ملک کے مزدوروں اور کسٹوں کی تنظیم و تعلیم کو سوشلسٹ اصولوں پر جاری رکھیں گے، تاکہ فرمن کی بچار پر وہ آپس کے صلحِ تجربے سے دوچار نہ ہوں! — بلکہ روسی انقلاب

اُس کی دہان کی خونخاک معنی خیزی کا سٹا لین کیجیے! محمد علی جناح کوئی سیدِ مغموم خادم نہیں ہیں، مختار الملک ہیں، بعض سوشلسٹ ریاستہائے ہند کے اندر ابھرنے والے معاشی سیاسی پران کو تنبیہ کی جاتی ہے اور سچائے آئینی قسم کے ٹھہر پار بننے کے اُن کے ساتھ ہندو سوشلسٹوں کی جتنی وائی کا جلال و اقبال پیش کیا جاتا ہے! موجودہ تحریکِ عوامیہ کاسمہ کین گردی سے کیا جاتا ہے! اور کانگریس سوشلسٹوں کی سرگرمیوں کو "روس فلاموں" کی تہ و بالا کرنے والی انقلابی طاقت خیزوں سے تعبیر کیا جاتا ہے! — پھر خود و الیاق۔ راست ان پشت گرمیوں پر جن ہند پر دازیوں میں ہیں اُس کا اندازہ اس امر سے کیجئے کہ ان میں سے دو ایک تاجداروں نے گزشتہ ایام میں کانگریس کی بیٹیا قدم انقلاب دوست جماعت کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے اک داخلی مدنی جنگ (Civil War) کا یہ نتیجہ دیا ہے کہ اگر ہمارے آبائی و پشتی حقوق شاہانہ کو ٹیکس می آئیکوں سے دیکھا گیا تو ہم اپنے اقتدار کی بڑو شیر نہافت کرنے میں بھی قطعاً تامل نہ کریں گے!

یہ ساری خائف و خون آشام قوتیں ہندوستانی نیشنلزم کے مجوزہ نظام کی صورت میں دنیا کی سب سے بڑی ملی فاسٹ طاقت برطانیہ عظمیٰ کے زیرِ سایہ عاطفت صفت بستہ ہونا چاہتی ہیں! لاریب کہ قاتلانہ ہندوستان کا مجوزہ ایوانِ دفاق اس ملک میں اک فاسٹ گرانڈ کاونسل کا ہم معنون واقع ہوا ہے!

فتنہ می بار دازیں طاقِ مقرر نس بر خیز! اک ممکن الوجود ہندوستانی فاسٹزم کی یہ پوری معرکہ آرائی نہیں ہے! اختیار اور اُن کے خواجہ تاشوں اور حلقہ بگوشوں کے علاوہ تمام ملی اعراض کے لئے اک حلیف کی طرح کی اہم دستگیری خود مجاہدین آزادی کے لشکر کی بعض داخلی صفوں سے اس چیز کو بل رہی ہے! یہ ملک کے سارے بورژوا ہیں جو شخص کانگریسی ہونے کے باوصف "فاسٹزم" کی قدرتی فوج ہیں! یہ دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا طبقہ ہے، اور اپنی لاملاح ازلی جماعتی فطرت کے ناگزیر تقاضے سے جنگ آزادی میں کچھ زیادہ دور تک نہیں جاسکتا! وہ خارجی مستبدوں کے اخراج میں پوراہم آہنگ احوار ہے لیکن سرمایہ داریت کے سٹیٹانی آئین حیات قومی کوشش ہونے دینا نہیں چاہتا، اور چونکہ معرکہ آزادی اپنے آخری مراحل میں ہے وہ اب علانیہ اس جدوجہد



کی تاریخ کے اک ہندوستانی اعادے سے ثریاب ہوں! سے

توڑ ڈالیں نظرت انسان نے زنجیریں تمام  
دعدی جنت میں روتی چشم آدم کب تک! (۱-۱-خ)

## مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ!

مسلم لیگ کا تازہ اجلاس کلکتہ شرمناک شرمناکیوں اور زعفران دار  
مضحکہ خیز یوں کا اک شکم و مترنم غم ہے! حسب معمول رجز خوانی کی اس محفل  
کا افتتاح بھی کانگریس کے غلات جہاد بالسان سے ہوا، اک شیخ چلیا  
نعرہ یہ تھا کہ مسلم لیگ اس کسی میں بھی سو کانگریسوں کے برابر ہے! سے  
لڑتا سامنے جوش آفتاب آئے گا جب ان اداؤں پہ پورا شباب آئے گا!  
شیخ اسلام مولینا فضل الحق نے ارباب مسلم لیگ کی ساسد خراش و دواغ  
باش غوغائیت کا اعتراف فرمایا، لیکن اس کی وجہ موجودہ یہ بیان کی کہ ایک  
ایک لیگ مسلمان شیر اور شیر برز واقع ہوا ہے! سے

بگے دویم دسرانا الحق شد آشکار مارا اڑیں گیا ہضعیف اس گماں نمود!  
برطانوی حکومت کی کمزوری مسر فضل الحق کو ہٹلر اور سولینی سے بھی  
زیادہ دار و زبوں نظر آتی ہے! کاش اس نپولین ہند کا سایہ اعیان اہل  
پر پڑ جائے تاکہ ان کو کم از کم ایک صدی کی توسیع حکمرانی تو اور نصیب ہو جائے!  
مسٹر جمبر لین، جناب جلالتہ الملک فضل الحق سے بزبان حال کہہ رہے ہیں

آنا کہ خاک را بنظر کیسب کنند آیا بود کہ گوشہ چشے مہا کسند!  
علیم انسان مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کلکتہ میں اس کے بعد پانی پت  
اور تھانیسٹر کے معرکائے جدال و قتال لڑے گئے اور حسب توقع "لیگ  
ایکٹرز" ان ہمت سے بھی شلغور و غبور جہدہ برآ ہوئے! سے

ذوق! ہادی گہ لٹلاں جو سر سر یہ زیں ساتھ بچوں کے پڑا کھین گویا ہم کو!  
اسی طرح وراثت بنگال کی "میر جعفری" حکومت کو عالمگیر حکم کی سلطنت  
بھی فرض کر لیا گیا! ط

برتنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا!

والسٹر لے کی طرف سے ہاتھ گاڈھی کو نیاز سندانہ دعوت ملاقات  
دے جانے پر مشرق بری طرح خون در جگر ہیں! اور اپنی ٹوڈیت کے باوجود

اپنی "نظر انداز" کو ناقابل برداشت صدر محسوس کرتے ہیں! ط

اس قند و شبنم ارباب وفا ہو جانا! سے

ملفت یہ ہے کہ سجد شہید گنج کے تفسیہ نامرضیہ میں تو مسٹر جناح محکم صلح  
داشتی ہیں، لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کی نزاع مزہوم کو داور جشی کے  
لے اٹھا رکھنا چاہتے ہیں! سے

در کینہ و رزی نفسیدہ مشتے! در ہربانی بستیاں سراسے!  
اک نہایت پر ملت ماجرا یہ نظر آتا ہے کہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے  
خطیبوں اور آتش خواروں کے لبہا نے بلند بانگ واز میان تھی اپنی  
لفظانہ خوش فہمیوں میں شاید یہ سمجھتے ہیں کہ گویا انہوں نے ہندوستان  
کی سر زمین میں یوروپین "فاسزم" اور نازی ازم کا قلم لگا دیا ہے! ان کے  
فتنہ جو و الفیئر گو یا ہٹلر کے "اسٹارم ٹروپرز" سے کم نہیں! ان کے برپائے  
ہوئے "ہندو مسلم فسادات" اسپین کی داخلی جنگ کا منشی ہیں! جو آبر لالہ  
ہاتھ گاڈھی کی طرف سے جناح کو بیانات اتحاد کو یا متوازی واقع ہوئے  
ہیں، مسٹر جمبر لین و لارڈ سٹی فیکس کی دلجوئی سولینی و ہٹلر کے! اور غائب  
یوپی، کے گزشتہ تین انتخابات میں مسلم لیگی کامیابی بالقابل رکھی جاسکتی  
ہے، اتنی و جوتنی کی فتح محض و اسپین و آسٹریا کے! پھر بھی کلکتہ - لاہور آگ  
نوعہ "میں مائل کہا جاسکتا ہے روم - برتن، کو گھر محاذ کے! - زیر ذکر  
اجلاس لیگ میں مولینا شوکت علی اور مسر فضل الحق کی زبان بے ہشام سے  
جو چیلنج بیک وقت کانگریس، ہندو قوم، اور ولسٹر لے ہند کی طرف پھینکے  
گئے ہیں، وہ اپنی شیخ چلیا خاوں اور جعفر زلیخا ہزنیات کے غماز نظر  
آتے ہیں! ط

گو تو خوش باش کہ ماگو شس بہ امن ندیم!

(۱-۱-خ)

## یورپ!

برطانیہ اور آئلی کے درمیان کانٹیکسٹ معاہدہ دوستی "یورپی سیاست  
کی تاریخ میں اک نئے دور کا آغاز ہے! ابھی تک انگلستان اپنے کو براہم  
کاسر تاج اور عالم کا سیاسی قلب سمجھتا تھا! یورپ کی گزشتہ طویل  
تاریخ نے سمجھ اس کے اس زخم و پندار کی قرار واقعی پردیش کی اس نے



سیاسی حلقوں میں اس معاہدے پر جس تشویش کا اظہار کیا گیا ہے وہ اسی تین کے خاکے کو رنگ پیچھا ہے! اگر ایسا ہوا تو اسی میں ضنا بین کی نجات بھی نظر آتی ہے! اتنی وجہ تھی کی اخلاقی پشت پناہی کے خاتمے کے بعد شرق بعید میں جاپان کی "درید و برید" ایسا مومن من مانا کھیل نہ رہے گا! اُس وقت روسی ہمدردی و دستگیری جتن اک غالب اثر انداز عنصر بن جائے گی! جاپان کی قاہر ضربوں سے گراں خواب مینی "بیدار و مستعد" کار ہو رہی ہے! لیکن ہے اس نئے نقشہ بساط سیاست میں اُن کی مدافعت ذور آدمائی نہ یاد بخیرہ خیر ثابت ہو! کون کہہ سکتا ہے کہ جتن کی تازہ جنگی کامیابیاں اسی جد جدید کا فتح باب ہوں! اسے

پہنچ کہ تاکہ دگاہ جہاں دریں آشکارا چہ دارد نہاں!!

(۱-۱-خ)

## مصر

مصر کی سیاسیات کا موجودہ پٹا جس کے منظر تازہ انتخابات پارلیمنٹ کے نتائج ہیں! — اک بنایت پیچیدہ مطالعے کا موضوع نظر آتا ہے! استاس پاشا کی حامی پارلیمنٹ پارٹی کا ۱۲۱ کے عدد کے نقطہ حقیقت تک اتر جانا! حتیٰ کہ خود رئیس حزب الوفد و صدر اعظم کا انتخاب میں اڑ جانا، اور اس المناک شان سے کہ اُن کے درضمانت تک کا ضبط ہو جانا! نیز سلطان کی پارٹی کا کافی تنازعہ اکثریت میں پارلیمنٹ میں داپس ہونا، حیرت خیز حادثات ہیں! معاملے کی انجمنی نہیں ختم نہیں ہو جاتی! مزید طرہ یہ ہے کہ "سعدی پارٹی" کے نام سے اک نئی مصری پارٹی مصری قوم میں آئی ہے جو موجودہ پارلیمنٹری تعدادی موقف کے اعتبار سے ایلان کی دوسری سب سے بڑی پارٹی ہے، اور وہ سلطان کی برسر اقتدار پارٹی کی پشت پناہ واقع ہوئی ہے! یہ "سعدی پارٹی" مرحوم سعد زائفل پاشا کے نام پر قائم ہوئی ہے۔ اور جس کا مقصود یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ سیاسیات مصر میں سعد پاشا اعظم کے مسلک حریت و استقلال کی تجدید عمل میں لائے گی! یہی سبب سعد جو "قصر عابدین" کے سیاسی طاغوت، سلطان، کی ہوا خواہ ہے؟! پھر کہا جاتا ہے کہ مصری پارلیمنٹ کی "انڈی پیڈینٹ پارٹی" بھی جلد اغراض عملی کے لئے حکومتی پارٹی کی ہمنوا ہوگی! "وفد پارٹی" کے اندرونی اختلافات اُس کے فوق العادہ زوال کی کافی توجیہ نہیں تسلیم کئے جاسکتے! پولٹیکل پارٹیموں کے

فرانس کو منسوخ کیا، غیبتیں کو سرنگوں کیا۔ جہتہ آس کے دوس کو پا پر بھیر کیا، نقد قیصر و قیم ثانی کے جوتی کو بیدست و پا کیا، دنیا کے سمندر میں پڑ گئے بھڑک پڑے اڑایا۔ اور اپنی آفاق گیر سلطنت میں خود بر آفتاب۔ کونا کھن بنا دیا! اساتذہ جب عظیم میں اُس کی سربراہی و کامیابی نے اُس کو اپنی معراج کے ناک و نفل تک پہنچا دیا! لیکن ..... یہ ساری ترقی درجات شاید اُس کی آنے والی اُفتادہ بد کہ عبرت انگیز تر بنانے کے لئے ہی تھی! آج برحانہ ظلمی و برپ میں خلا اک دوسرے درجہ کی طاقت ہے! اُس نے اس سنگ آمدت آمد کو انگیز کر لیا ہے کہ وہ دنیا کے اسوال غنیمت کے خواہین بنا پڑے! ظہور قزاقان قوم کو دعوت دے گی، اور اپنی آئندہ تاریخ تصیرت میں اپنے اسی موقف کو بسا غنیمت سمجھ لے گا!

نہر جیسے مرکب تو ان تاغوتی کہ جاہا سپر باید انداختن!

خود گرم خون و محروم المزاج فرانس بھی بادل ناخوaste انگشتان کے نقش قدم پر چل رہا ہے! یعنی دوسرے لندن کے معاہدہ کے بعد پیرس و برکن کا بھی معاملہ ہونے والا ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کی سیاسیات بڑی دہن افواہی میں سجائے انگشتان و فرانس کی جوڑی کے اب انگشتان فرانس آتی اور جوتی چاروں مل کر دنیا کی پولٹیکل شکرائی کے منصب کو سمجھ سادی تقسیم کر رہے ہیں! اک متحدہ ایٹالوی نہیں سیاست کا یہ بیان کہ جوتی کو اُس کی لوہا دیات از خود مل جائیں گی، اسی قسم کی سخی خیزی کا حال نظر آتا ہے! آخر جوتی کا شکار آسٹریا بھی تو دُربین انگشتان کی خلوتوں میں پیسے سے اک مطلوبہ راز اور اک منطوق شدہ واقعہ تھا! — انگشتان کی دُلاہ کی سرپرستی میں یہ سارے نئے ٹوڑ جوڑ خدائوaste کمزور اقوام کی حفاظت کی حماقت کی قبیل سے نہیں واقع ہوئے ہیں! یہاں غایت الغایات خود اپنی سلامتی ہے! جبکہ اسپین کی گلو خلاصی اور وہاں سے ایٹالوی افواج کی واپسی اک قسم طریقہ فریب حبیب ہے! اس لئے برطانیہ و اٹلی کے درمیان کے زیر بحث معاہدہ پر دستکوں کی عین ساعت سعید میں جنرل فرینکو جمہوری اسپین کی تعمیر کمال کی تاریخ کا روڈ نامچہ اپنی نوک کشمیر سے لگھا رہا تھا! — البتہ دیکھنا یہ ہے کہ سفید یورپ کی ان چاروں (علا) فاسٹ طاقتوں کے جتھے میں کالہ جاپان کہاں تک شریک ہے! اس امر کا خاصا احتمال ہے کہ یہ جدید استکلاف اربعہ اک خالیغہ (Chukhman) ہو گا! جاپانی

خاندان شاہی! فاسنم کا پھر اس کی مشہور روح الروح ہے! پھر چونکہ مسوئقی اپنے اُمیدواروں کی میاں کشت گری کے لئے تیار ہو گیا ہوگا، اور انگلستان نے سخاس پاشا کے ہاتھ مضبوط کرنے میں اپنی معمولی مسست رگی کا ثبوت دیا ہوگا، اس لئے پارلیمنٹری نتائج وہ پیدا ہوئے جو پیدا ہوئے: برطانوی سفیر تحفہ قاہرہ کے ساتھ سخاس پاشا کی حال کی بعینہ راز کا قاتل شاید اپنی عبرتوں کو اپنا موضوع ذکر و فکر بنا رہی ہیں۔ (۱-۱-خ)

## نقد و نظر

اداس

طرح نو! عام رسالہ جاتی قامت، ۴۴ صفحات ضخامت، کتابت و طباعت (علی الترتیب) خوشخط و صاف، کاغذ خفیف، علم گیٹ آپ خوشنود با سلیقہ، لوح نو، چند سالانہ تین روپے، مقام اشاعت، اردو بک اسٹال، بیرون لہاری گیٹ - لاہور، طرح نو پر تنقید کرنے میں ہمیں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اب رسالہ سے معذرت خواہی سے بھی اس کی کافی تلافی ہوگی! پس ہم "مذہب گناہ" کے ذریعے کسی "بدتر از گناہ" غلط کاری کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتے، اور اپنے اس تساہل کو اس کے اپنے ہی مقدمہ کے رحم پر چھوڑ کر، اپنے توفیق زدہ فرعی تنقید کو ادا کرنے میں مہلت کرتے ہیں! یہ

زشتہ ہائے جدائی شود جدائی طویل زبان کو نہ دست دمازی خواہم طرح نہ بلاشبہ اسم بامسمیٰ ہے! اس کے مضامین و مقالات اور انسانی ادبیات صاف صاف ترجمان ہیں، ایک ترقی پسند تقریر ادب کے، حیات پر دست تحریکات کے، اور انقلاب نواز نگارشات کے! پنڈت جو ابراہیم ہندو کا طرح نو کے مدیر کے نام یہ استقبالی پیام کہ میں آپ کے رسالے کا بیختم کرتا ہوں" باوجود مختصر ہونے کے "از دل خیزد و دل ریزد" و لافنی و پڑی لب و لہجہ رکھتا ہے! بیشتر مضامین بھی اس قابل رشک استحقاق کے شاید قابل ہیں! (ہاں بے پیش نظر طرح نو کا فردوسی نمبر ہے!) لیکن رسالے کے شذوذات (بعض ان ابدان افکار) میں ایک جگہ شاہین بچوں کو خاک بازی کا درس دینے والے خداوندان کتب کی شکایت بہت متعلق علامہ اقبال کے

اختلافات سیاسیات کے صبح رشام کے لمبی احوال ہستہ ہیں، اور یہ چیز کسی جماعت کو آغا فانا ایسا منزل لال نہیں کر سکتی! پھر سلطانی پوزیشن، مصری سیاست میں عرصہ دمازی سے ایک برہم قار مصر بن چکی ہے! سلطان مستبدان پارلیمنٹ کو فتح تو کر سکتا ہے اور کرنا چاہے، لیکن ایک آزاد و عام انتخاب پارلیمنٹ میں اس نے ہمیشہ منہ کی کھائی ہے! دوسری طرف حزب الوفد بھی اپنی گزشتہ سیاسی تاریخ کے سامنے ہست و بلند میں کبھی اتنی گردش میں نہیں آئی ہے کہ اس کے سرخیل، اس کے منازاعیان، اس کے کابینہ وزارت کے ارکان، حرف غلط کی طرح محو ہو گئے ہوں: جب کہ ملک و ملت سے ایک نیا مینڈیٹ طلب کیا گیا ہو! اور وہ بھی بظاہر مستبد سلطان کے ساتھ ایک آنجی نزاع، کچھ پیش آنے کی تقریب سے!

ہمارا خیال ہے کہ صورت حال کسی قدر ایک بالغ نظرانہ اور ژرف نگاہانہ مطالعے کی دعوت دے رہی ہے! اہلی سرشتہ فتنہ وفد پارٹی اور انگلستان کے درمیان کا سابقہ معاہدہ مؤدت نظر آتا ہے! یہ معاہدہ ایک سیکرٹو سے زیادہ تو پیر حال نہیں ہو سکتا تھا، تاہم اس کے وہ شرائط جن کے تحت بصورت جنگ مصر برطانوی افواج قاہرہ کی پامال جولانگاہ بن جائے گا، اور جس ذلت آفرین ہنگامہ خیزی کے لئے اسے جدید سڑکوں، ریلوے لائنوں، فوجی مستقرات، اور ہوائی اسٹیشنوں سے خود مصر کے ہنگامہ و مصارف سے آراستہ کیا جانا ہے پایا تھا (اور جس پر بلاشبہ مل درآمد بھی شروع ہو گیا تھا) ان سب چیزوں نے رئیس وفد سخاس پاشا کی حکومت کے خلاف دادی نل کی ہڈا کو یکسر بدل دیا! غیور ارکان حزب الوفد ایک اضطراب محسوس کرنے لگے اور شاید اپنی سیاسی خوارچ سے بدیدہ ایم "سعدی پارٹی" کا ساز و برگ ہم پہنچا ہے! تاہم سلطانی پارٹی کا اس ہنگامہ آرمائی میں شرکت کرنا، اور مصر کے استقلال خواہ اور ترقی دوست عناصر کے ساتھ صفت بصفت استنادہ ہونا، بلکہ ان کی قیادت و ریاست کا منصب حاصل کر لینا، یہ ایک اور عقدہ ہے جو حل طلب رہ جاتا ہے! دراصل کسی شخص میں اصل کلید معاملہ چھپی ہوئی ہے! اغلب گمان ہے کہ اس میں مسوئقی کی ریشہ دوانی کا دریا ہے! اس نے احوال مصر اور سلطان مصر پر دو کے لئے ایک اک اہم و دلکش پیش کش کی۔ اول الذکر کہ جسے انگلستان کے پنجہ گلوگیر غلطی، اور اگر الخالذ کر کے لئے مصر کی تاریخی "ارض خلوت" کی سر بلندی دیرسایہ

اک قول کا حوالہ ہیں کچھ خوش ذاسم ہندوستان کی سیاسیات میں اب وہ فذرخم ہو رہا ہے کہ ایک پولیٹیکل پارٹی کا معنی فیڈو اک دوسری حوالیت جھوٹ کا کوئی لغوی ناطقہ ترتیب دیا کرے۔  
اسی طرح طرح لا کے سیاسی نشان — تصویر شمع — کے نیچے یہ مصرعہ کہ

”طرح نو افغن کہ مابدت پسند افتادہ ایم“  
لکھنا کچھ بچے کلمات تبسیر نہیں: انقلاب اور ادب انقلاب بعض اشتیاق مذاق“  
جدت پسندی سے ہر اصل بلند تر و متین تر واقع ہو رہا اس کا مضمر کسی حیرت خاںہ امروز و فردا کی بھول بھلیاں سے غلطی نہیں: دامگاہ استبداد سیاسی اور عذاب کہ وہ بیدار و سحاشی سے نہایت ہے! — اگر رسالے کے نام طرح نو کی لغوی معایت ہی ایسی ناگزیر ضرورت تھی تو اس زیر بحث مصرعے کا کہیں بہتر نم البدل یہ مصرعہ تھا کہ

فلک ماستف بشکافیم طرح نو در اندازیم!

اخبارات و رسائل کی پیشانی پر اس ستم کے اشعار یا آیات کا لکھنا جن کی ترکیب لفظی سے کسی جگہ متعلقہ اخبار یا رسالے کا نام ٹپک پڑے، ہماری آردہ اسلامی صحافت کی ایک سبب متوکلہ بن گئی ہے! بعض موقعوں پر تو اس صنعت ادبی کا خواہ مخواہ التزام پر غفلت بدحواسیاں پیدا کیا کرتا ہے! یادش بخیر پنجاب کا جریدہ فروغ انقلاب (لاہور) شاید اس کی سب سے زیادہ مضحکہ خیز اور عبرت انگیز مثال ہے! غالی سیاسی رجحان کی یہ پوٹ جس کا نام انقلاب رکھا گیا ہے، اپنے اس برعکس رسمہ میں کیا اس حقیقت کی تصدیق نہیں کہ

برعکس ہند نام زندگی کا نور!

مگر آخری ستم ایسا دی ہے کہ انقلاب (نئی سیما) صبح پر قرآن مجید کی یہ جملاتی آیتہ قاہرہ لکھنے سے بھی نہیں شرماتا کہ ”سبیلعلمو الذین ظلموا اعدی منقلب ینقلبون“ — قرآن کا یہ اعلان خود غلط کارو باطل کو شش دشمنان انقلاب کے نام اک چیلنج تھا جس میں ان کو یہ مدلل غفلت شکن رسید کی گئی تھی کہ وہ اسلام کی تحریک حق کے خلاف اپنی ساری کوششیں اعدا کاوشیں مرتب کر ڈالیں! بہت جلد وقت کا حکم ناطق یہ فیصلہ کر دے گا کہ جو ابی انقلاب کے ان قسمت آدمیوں کی اُلٹی آئیں

مکھ پڑ جائیں گی؟

سیاسی و ادبی مقولوں کے انتخاب کی اس تقریب سے ہم نے جو طویل و لا طائل جملہ معترضہ چھیڑ دیا، ہم اس کی قابل اعتراض نوعیت کو محسوس کر رہے ہیں! لیکن ہمارا یہی مذر ہے (بشرطیکہ وہ قابل قبول ہو) کہ شنیچ بود حکایت شدید تر گفتیم!

ہاں باز آدمیم بر سر مطلب! رسالہ طرح نو اپنے مواد و منظور و غلت کے اصلی معیار کی روشنی میں غالباً اک درجہ اول کا انقلابی صحیفہ ہے! خود مدیر طرح نو اک خوشگوش عزمیں، اور اک انقلابی ادیب! رسالے کے اندر جا بجا ان کی نظمیں طرح نو کی نشری تحریکات کی عام گرمی کو سرخ شہزادہ میں اڑانے لگتی ہیں! ہم جناب سر آج الدین صاحب قفری، اے کو پنجاب کی سیاسی طور پر شور زین سے ایسا گلہ محافت و ادب نکالنے پر گرجوں مبارکباد دیتے ہیں! طرح نو نسل نو کے ایک ایک فرد کے مطالعے کی ناگزیر چیز ہے!

(۱-۱-خ)

واقعہ ہوں! یہ غنا پشانی کیوں ہے  
پیشیوں و آہ و نوحہ خوانی کیوں ہے  
ہر سی و عمل ہے زندگانی کئے  
لیکن کھلا کہ زندگانی کیوں ہے  
(پیش)

زفیں کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں  
جی بھر کے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں  
سننے والے ستم ہوتا ہی نہیں  
افسانہ گیت ستم ہوتا ہی نہیں  
(پیش)

حسین بن جانا کس قدر آسان ہو گیا ہے

# میو رسندل سوپ

یہ چہرے کے رنگ کو تروتازگی، نرمی اور صحت آمیز شگفتگی بخشتا ہے  
اس کے مساوات میں اتر جانے والے بالائی کے سے مالا مال جھاگ



چہرے کی جلد کو تمام آلودگیوں سے پاک کر دیتے ہیں، کیونکہ سوپ

سندل سوپ میو رسندل کے شہرہ آفاق روغن کی آمیزش ہوتی ہے اور  
یہی وجہ ہے کہ تمام حسین و جمیل خواتین میو رسندل سوپ کا استعمال  
کرتی ہیں، اس لئے کہ انہیں یہ سبب معلوم ہو چکا ہے کہ یہ صابون  
ان کے حسن و جمال کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

میو رسندل سوپ ہر دوکاندار سے مل سکتا ہے  
گوڈمنٹ سوپ فیکٹری بنگلور

# عروسی

یہ ایک نہایت کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس کے ترتیب دیا گیا  
مگر اشتہار میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ مردوں کے تمام مخفی شکایت کا  
ہر موسم میں واحد علاج ہے، مخصوص اذکار رفتہ فائدہ اٹھائیں، اس لئے کہ ان کا  
تجربہ ہے اس کے ساتھ چار چیزیں مومی، نباتی، لکھنوی، اور ہر وہ  
جن کی تفصیل اور ترکیب اشغال خریدار پر ظاہر کی جاتی ہے، ایک سیٹ ہفتہ  
کا ہفتہ بھر کو کافی ہوتا ہے، جس کی قیمت صرف ایک روپیہ ہندو ماٹھے  
مقرر ہے، علاوہ محصول ڈاک۔ اکثرین ہفتہ کا استعمال صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔  
صاحب فرمائش نام دہتہ صاف و خوش خط تحریر فرمائیں

شفا خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

# ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اور ادبی خدمت کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ کلیم کی خوبیاں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعراء اور ادباء کے واسطے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں  
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ ماضی اور حال کے شعراء اور ادباء کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی مزدوریات کو نظر  
رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

اگر آپ بکفایت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

کلیم بک ڈپو جنتی فراس نمبر ۱۰ دریا گنج دہلی سے فرمائش کیجئے

# ادب لطیف کا افسانہ نمبر

افسانہ نگاری پر لا جواب تنقیدی مقالات — فن افسانہ کے ہر پہلو پر رانیا یہ مضامین  
دلچسپی زندگیوں کی اشک افشاں کہانیاں — سرسبز بہتیوں کے مسکاتے ہوئے افسانے  
مغربی شاہکاروں کے کامیاب تراجم — روح پرورد جڈری کرنیوالی منظوم داستانیں

دلپذیر تصاویر

شانداز گیت اپ

ادب لطیف کا افسانہ نمبر حقیقتاً

اردو کے افسانوی ادب میں ایک دلآویز اضافہ ہے

ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۱۲

اگر آپ یہ افسانہ نمبر مرغیم بان مرغمت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ہن پڑے چار آنے بھیج کر فرید بکس

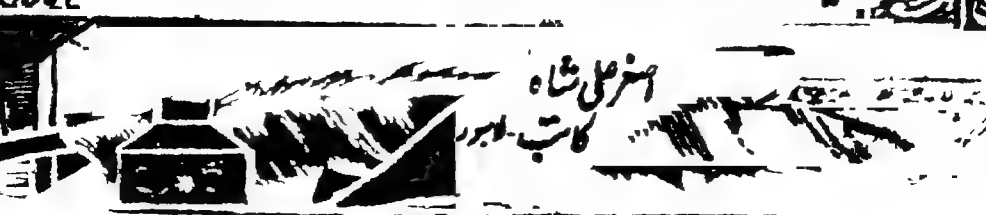
مقام اشاعت

مکتبہ اردو۔ ۱۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

مشہور ترین حضرات کے لئے یہ نایاب موقع ہے جلد اشتہار دیکر فائدہ اٹھائیں

ہنر علی شاہ

کاتب



شائع ہو گیا!

شائع ہو گیا!

نوید ہمار

# گلفروش

کیا! کثرت

ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی کا افسانہ نمبر

اس خاص نمبر کے تمام افسانے جناب سید محمود صاحب مورخ نے لکھے ہیں، حیرت انگیز، لرزہ خیز، معاشرتی، اصلاحی، سائنٹفک اور رومانی افسانے ان کے ساتھ ہی اردو کے بہترین رومانی شاعر حضرت اختر شیرانی کی زندہ جاوید نلموں کا مطالعہ کیجئے۔ مختصراً چالیس صفحات، قیمت صرف ۳ روپے آنے والی ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی ایک کامیاب اور کثیر الاشاعت اخبار ہے، اس کا سالانہ چندہ مبلغ تین روپے آٹھ آنے ہے، مگر جو صاحب اس سر می تک خریداری قبول فرمادیں گے ان کے نام دو روپے آٹھ آنے سالانہ میں جاری کر دیا جائے گا۔ اور مذکورہ بالا افسانہ نمبر کے علاوہ ۵۰ روپے کو شائع ہونے والا جوشش نمبر اور ۳۰ روپے کو شائع ہونے والا افسانہ نمبر بھی ہمارے مفت میں گئے، اس لیے آج اپنا چندہ بھیج کر خریداری بن جائیے۔ کیونکہ دیر کرنے سے ممکن ہے کہ افسانہ نمبر ختم ہو جائے اور آپ کو نہ مل سکے۔ نمونہ کی کاپی مفت منگوائیے۔

مینجر ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی

ادارہ ادبیات اردو کا مصور ٹیپ ڈولی رسالہ

## تسبیرس

زیر نگرانی  
ڈاکٹر سید محی الدین قادری ڈور  
پروفیسر جامعہ عثمانیہ  
سالانہ چندہ  
چار روپے آٹھ آنے

زیر ادارت  
صاحبزادہ میگلش دھانی  
نمونہ کا پرچہ  
سات آنے

لے کا پتہ

خواجہ حمید الدین، مہتمم تسبیرس

ہفت منزل، غیرت آباد، حیدر آباد، دکن

نئے سال کا بہترین تحفہ

حقیقت نگار علی عباس حسینی کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ

## آئی سی ایس

طبع ہو گیا

قیمت صرف ایک روپیہ ۸

لے کا پتہ

انڈین پرنس الہ آباد

برائچ آفس۔ کلکتہ۔ پٹنہ۔ بھنڈو۔ لاہور

## منقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

وحد آفرین نظموں کا مجموعہ  
جو مندرجہ ذیل باب پر مشتمل ہے  
نگار خانہ (۲) خبریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) شعیب  
نظم انجی جگہ کتل، مرصع اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے کور  
نظم، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے ایک  
خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں

کھائی، چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے

قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۸)

جلد دوم روپے (۲۰)

مکمل ڈپو، جینتی نو اس نمبرم دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شاعر کی راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور کیف  
آواز میں بیان کیا ہے، جنہیں پڑھکر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کر سکتا ہے  
راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے

|                |              |                   |                 |
|----------------|--------------|-------------------|-----------------|
| مست رات        | ہست رات      | راز و نیاز کی رات | انتظار کی رات   |
| اندھیری رات    | ہانہ کی رات  | جوانی کی رات      | تصویرات کی رات  |
| انتہات کی رات  | مہمان کی رات | اشکوں کی رات      | برسات کی رات    |
| ربو و ملکی رات | بجود کی رات  | سرشار رات         | سبکی مٹی کی رات |
| تصویرات کی رات | جین رات      | پہا بن نکل کی رات |                 |

قیمت

صرف آٹھ آنے (۸)

مکمل ڈپو، جینتی نو اس نمبرم دریا گنج دہلی سے منگائیے

## شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

پُر جوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ

پُر کواشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلمی شان و حریت کے خون کو لادینے  
لے واقعات، یادِ سر جوش کی سرسبزیوں اور گلابِ فطرت کے روح پرور  
نظموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا

جوان انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے  
کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما کردہ پوش سے آراستہ ہے

قیمت

صرف تین روپے (۲۰)

مکمل ڈپو، جینتی نو اس نمبرم دریا گنج دہلی سے منگائیے

## سو شعر

حضرت جوش ملیح آبادی کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کردہ

سو شعر

دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے  
باوجود اختلاف مذاق کے نصف سے زیادہ  
اشعار آپ کو اپنی پسند کے میں گئے

میں سائز، کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب، سرمدی خوشنما

جس پر

حضرت جوش کی تصویر بھی ہے

قیمت صرف چار آنے

مکمل ڈپو، جینتی نو اس نمبرم دریا گنج دہلی سے منگائیے



وہ دین دینا میں ہے

# نوجون

# جمیل

# جل جلال

خاموش رنگ تو را داد، بزم چہرے پستی، گری و غم  
 ہمیشہ کیل، جلا ہے، سو تاک، آتشک، گھٹیا اور  
 سوز و غم، اور جہاد، غم و غم، غم و غم، غم و غم  
 ہو سکتا ہے غم و غم، غم و غم، غم و غم، غم و غم  
 غم و غم، غم و غم، غم و غم، غم و غم

خاموش رنگ تو را داد، بزم چہرے پستی، گری و غم  
 ہمیشہ کیل، جلا ہے، سو تاک، آتشک، گھٹیا اور  
 سوز و غم، اور جہاد، غم و غم، غم و غم، غم و غم  
 ہو سکتا ہے غم و غم، غم و غم، غم و غم، غم و غم  
 غم و غم، غم و غم، غم و غم، غم و غم

ایک نوجون  
 ایک جمیل  
 ایک جل جلال

وہ دین دینا میں ہے

ایک نوجون  
 ایک جمیل  
 ایک جل جلال

وہ دین دینا میں ہے

ایک نوجون  
 ایک جمیل  
 ایک جل جلال





# ایک نفس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا کہ دنیا کے ہر چار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ قسم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب

کر سکوں تعمیل حکم کے لئے فردوسِ شال

انگریز تسمانیہ کے گلابِ شمر غراؤں

پھول دُور دراز سفر کے بعد مہارانی

اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی

مہارانی کی خُشن شناس نگاہوں کو

کے پورا نہ ہونے سے ٹٹول رہنے

کو فکر و انگیز ہوا اور وزرا سے

نے اصغر علی محمد علی عطر



کشمیر جنتِ نظیر سوئٹزرلینڈ شبا

میں گلِ چینی کی گئی جب سب

کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر

اس قدر حیرت ہوئے تھے کہ

تکلیف ہوئی، مہارانی اس غمِ ہش

لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا، مہاراجا

مشورہ طلب کیا، مہتممِ توشہ خانہ

منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی۔

فورا عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری پیاریں ساتھ لئے واپس آگیا

اصغر علی محمد علی تاجِ سر، لکھنؤ (یو۔ پی)

REG. NO. L. 3694.

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی



تازہ ترین تصنیف

جنون خور

(یعنی)

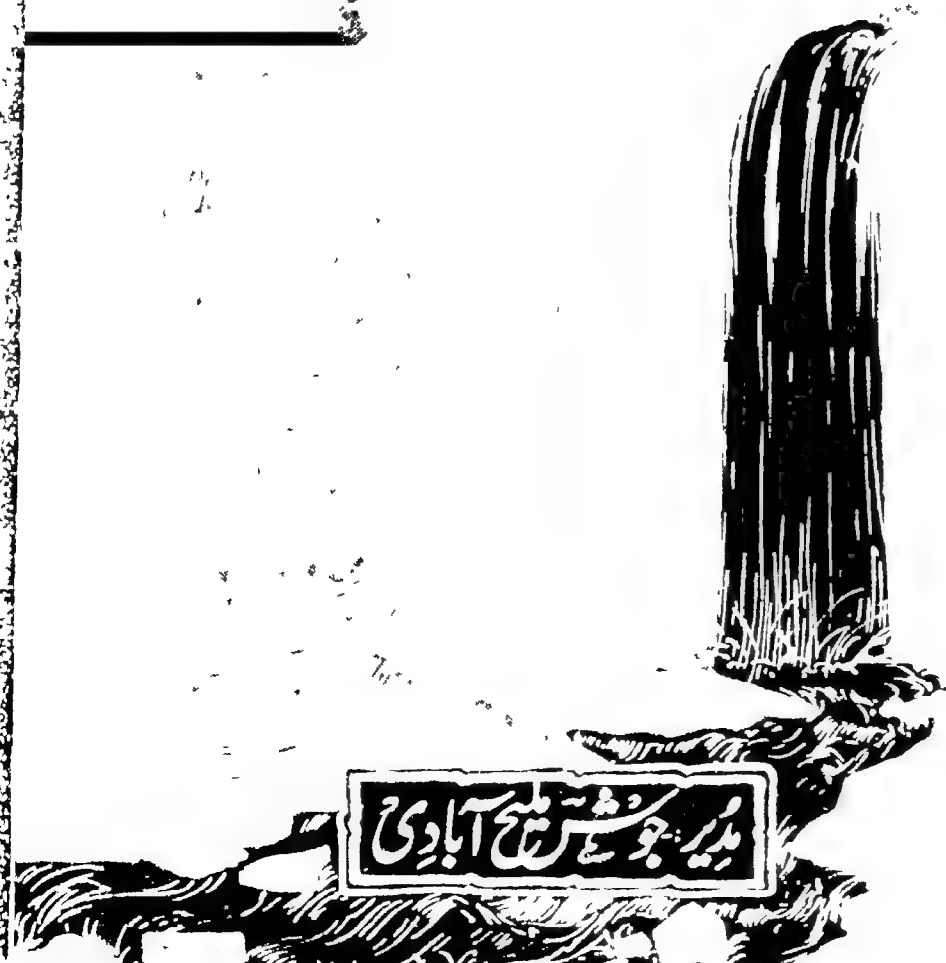
پناہ دہی! مجموعہ رباعیات

رباعی، تمام اصناف سخن میں وہ تہارنگین، عمیق و فصیحانہ صنف ہے جو غلیظ شعرا کی مشافی کے نقطہ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ اور کسی شاعر کو اس فن تک حقیقی رُباعی گو شاعر کا پر شکوہ خطاب نہیں مل سکتا جب تک کہ اس کی بے پناہ جنون پر درخششی قوت بند ہوتے ہوئے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہٹا نہیں ہو جاتی، یہ بخت بندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رُباعی بھی ہرچو گیر و غلتی علت شود کے دُعرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، یا ماہن طریقت نے بزعم خود، یہ سبجہ رکھا ہے کہ رُباعی نام ہے رُباعی کی بچروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا، اور بس — حالانکہ اگر عجز سے دیکھا جائے تو رُباعی شاعرانہ مطالعے، شاعرانہ فکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینی خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی بھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر رنگین ہو جائیں۔

اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تنہا پیدا ہوئی ہے کہ کاش بندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوا ہوتا، تو آپ کا یہ اولین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں جنون و حکمت کا مطالعہ فرمائیں۔ اور دیکھ لیں کہ خیام نے قدرت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں ایک خیام پیدا کر دیا ہے، اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اس کی قدر نہ فرمائیں — آپ کے اور ایران کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک فیئر جیرلڈ مل گیا تھا جس نے اُسے ایک زندہ قوم سے روشناس کرا دیا تھا۔ لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مردہ اور غلام ہے، اور غلامی کو صرف یہی نہیں کہ کوئی فیئر جیرلڈ نہیں بلا کر، بلکہ خود اس کی قوم بھی اس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے تیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون و حکمت مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے: (۱) معارف (۲) خواہات (۳) حسن و عشق (۴) چراں سالوس (۵) متفرقات قیمت صرف تین روپے (علاوہ محصول ڈاک)

منیجر کلیم بک ڈپو، حقیقی نو اس، نمبر ۴۰، دریا گنج، دہلی



میر جو شریع آبادی

# منقش و نگار

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی  
کی وید آفرین نظموں کا مجموعہ  
(۱) نگار خانہ (۲) خبریات (۳) تاثرات (۴) مطالعہ و نظر (۵) شیب  
ہر نظم اپنی جگہ کمال، مرصع اور کیفیات شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے  
سورکن نئے دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون، اور رُوح کے لئے  
ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں  
لکھائی، چھپائی، نقیص اور دیدہ زیب  
قیمت

غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے

کلیم بک ڈپو، جنتی نو اس نمبرم، دریا گنج دہلی سے منگائیے

# شاعر محی راتیں

شاعر انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وید آفرین  
اور کیف اور انداز میں بیان کیا ہے۔ جنہیں پڑھکر ہر شخص اپنے آپ کو  
اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔  
مست رات بدست رات راز و نیاز کی رات انتظار کی رات  
اندھیری رات چاندنی رات جوانی کی رات تصورات کی رات  
انفکات کی رات جدائی کی رات اشکوں کی رات برسات کی رات  
ربو وگی کی رات بخودی کی رات سرشار رات بیگی ہوئی رات  
تصورات کی رات بچپن رات پیا بن ناگن کالی رات

قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جنتی نو اس نمبرم، دریا گنج دہلی سے منگائیے

# شعلہ و زہ

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی (۱) شعلہ و زہ  
پُر جوش اور کیف آفرین نظموں کا مجموعہ

جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلامی شان و حریت کے خون کھولا  
دینے والے واقعات، ہادوہ سر جوش کی سرستیوں اور گلاب فطرت کے  
رُوح پر درختوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیکھا  
شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے قطع ہے  
کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گرد پوش سے آراستہ ہے  
قیمت صرف تین روپے

کلیم بک ڈپو، جنتی نو اس نمبرم، دریا گنج دہلی سے منگائیے

# پیغمبر اسلام

خواجہ دو جہاں سرور کائنات آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت  
اور رسالت پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت  
و عظمت کے سامنے قہر کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوت پیغمبری کے باب میں اس لافانی  
شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اُتاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے  
اذلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل  
قانع کے سامنے اور اک مطلق چھانٹنا بھول جاتا ہے۔ شاعر انقلاب پر جب  
ایک سرشاریت کا عالم طاری ہوا اسی وقت انہوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی  
عالم بخودی میں چار روز کی ریاضت شاد اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل  
ہوا صرف وہی صفحہ قرطاس پر تحریر کیا گیا۔ قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جنتی نو اس نمبرم، دریا گنج دہلی سے منگائیے

# بنام قوت و حیات

و صلہ



منظور شدہ

ڈائریکٹر ان تعلیم

ریاستہائے میسور - پٹیا لہ وحیدر آباد دکن

آئے گانہ جانے کب زمانہ اپنا

قدرت کا ہے محبکہ صدیف حکیم

سالانہ چندہ چھ روپے

ششماہی چندہ تین روپے

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا

پہروں کو شائے جا ترانہ اپنا

سہ ماہی چندہ دو روپے

قیمت فی پرچہ نو آنے

## فہرست مضامین رسالہ کلیم بابتہ جون ۱۹۳۸ء عیسوی

| نمبر شمار | عنوان                       | مضمون نگار                             | نمبر شمار | عنوان                   | مضمون نگار                              |
|-----------|-----------------------------|----------------------------------------|-----------|-------------------------|-----------------------------------------|
| ۱         | اشارات                      | جناب فیضی پراچہ سری نگر                | ۱۳        | ادب و فن کا تعلق        | جناب فیضی پراچہ سری نگر                 |
| ۲         | سرایہ دار - پٹنہ دار - کرکٹ | جناب شوکت صاحب سبزواری ایم اے          | ۱۴        | دہ واقعہ                | جناب اختر صاحب ادویہ ایم اے             |
| ۳         | رقم                         | جناب رومی صاحب مدنی                    | ۱۵        | غزل مسلسل               | جناب خلیق صاحب قریشی فاضل پور           |
| ۴         | صالحات و جودات              | جناب محمد یوسف صاحب گلکے               | ۱۶        | نیکدل سراپہ دار (نظم)   | جناب احسان دانش صاحب گاندھد             |
| ۵         | تضمین (نظم)                 | جناب عبد الواسع صاحب عمری چنگھوری      | ۱۷        | ماں کا خط               | جناب جی آر۔ قیس صاحب شیخپور دی          |
| ۶         | جائزہ دل کے منتقل رنگ       | جناب احمد حسین صاحب الہ آباد یونیورسٹی | ۱۸        | تمیلات کے تین بھول      | جناب سلام صاحب محلی شہری                |
| ۷         | حق سچ و دار و سپید          | جناب شاہد مدنی صاحب حیدر آباد دکن      | ۱۹        | بیر کا درخت             | جناب سعد شیر صاحب کانپوری               |
| ۸         | ہندوستان فی ادب میں         | جناب شری رام صاحب                      | ۲۰        | شاہ ہارسے (نظم)         | جناب علی القاب فرما زوئے ٹونک دام اقبال |
| ۹         | نقد و (نظم)                 | جناب شری رام صاحب                      | ۲۱        | ہندوستان کی جہیز کا بان | جناب اہم صاحب اکبر آبادی                |
| ۱۰        | مشرق است و ہزار ہر گئی      | جناب شری رام صاحب                      | ۲۲        | چور (تیکر کی نظم ہے)    | جناب افسر صاحب ادا پوری                 |
| ۱۱        | دریغ غیرت (نظم)             | جناب شری رام صاحب                      | ۲۳        | رقنا و وقت              | ادارہ کلیم                              |
| ۱۲        | افسانہ نگاری                | جناب شری رام صاحب                      | ۲۴        | استعارات                | مشتہرین                                 |

(چونکہ کابادی پر نثر و بیانیہ محبوب اعلیٰ ہے۔ تبصرہ ۱۹۳۸ء میں دیا گیا تھا۔ اس پر ہم دیا گیا ہے کہ شائع کیا)

# اشک

مدیر

## ایک صحیح ترین پیش گوئی

ہر پیش گوئی یہ دلی نشا ہوتی ہے کہ اُس کی پیش گوئی حوث بحوث صحیح ثابت ہو۔ لیکن بعض اوقات حالات کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ پیش گوئی یہ نشا کرتا ہے کہ اُس کی پیش گوئی کا ایک جزو بھی صحیح نہ ہو سکے۔

لیگ اور کانگریس کی مصلحت کے واسطے اس وقت جو گفت و شنود کا سلسلہ جاری ہے، اور جس کے باب میں خوش عقیدہ حضرات بہتر توقعات قائم کئے ہوئے ہیں، اُس کے بارے میں میری یہ پیش گوئی ہے کہ یہ مصلحت کی تمام گفت و شنود قطعی بے نتیجہ، اور بے اتحاد کے تمام سامعی ٹھیکہ غیر شکور رہیں گے۔ اور ہر چند کہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کہ رہا ہوں، حرف بحرف ایسا ہی ہو گا۔ پھر کسی میری یہ دلی آرزو ہے کہ کوئی لطیفہ غیبی ایسا پیدا ہو جائے کہ میری یہ پیش گوئی ہر صورت سے جھوٹی ثابت ہو کر رہ جائے۔

میری اس پیش گوئی کی بنیاد معاذاً اشد یہ نہیں ہے کہ میں لیگ و کانگریس کے اتحاد کا حامی نہیں ہوں، اور خدا نخواستہ یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان کبھی صلح نہ ہو سکے۔ کیونکہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان عدم اتحاد کی وہی آرزو کر سکتا ہے جس کا دل و دماغ غذائی کے مرض سے ماؤف ہو چکا ہے۔ نیز میری اس پیش گوئی کی بنیاد یہ بھی نہیں ہے کہ میں سونہن کا مریض ہوں، اور میرا دماغ اچھے خیالات کی

روشنی سے محروم ہے، کیونکہ میں اپنی زندگی میں ہر قدم پر اس کا تجربہ کر چکا ہوں کہ میری برشت کو حسن ظن کی اتنی کثیر مقدار و دلالت کی گئی ہے کہ جب تک کسی شخص کی بُرائی دو اور دو چار ہو کر میرے سامنے نہیں آ جاتی ہے میں اُس کے تعلق بُری رائے قائم کرنے کے تمام تصورات سے رُوگرداں ہی رہتا ہوں۔

اصل میں میری اس پیش گوئی کی بنیاد ہے (الف) لیگ کے قائد اعظم، مسٹر جناح کی ذات، اور (ب) مسلم لیگ کے اربابِ عمل و عقل کی ذہنیت۔

(الف) لیگ کے قائد اعظم، مسٹر جناح کی ذات۔

مسٹر جناح کی ذات، ہندو مسلم مصالحت کی راہ میں سب سے بڑا پہاڑ ہے۔ کیونکہ مسٹر جناح کے خمیر میں یہ بات داخل ہے کہ وہ زندگی کی ہر منزل، اور حیات کے ہر میدان میں سب سے آگے اور سب سے پیش پیش رہیں۔ اور اس قدر پیش پیش رہیں کہ اُن کے رفقاء میں سے کوئی اُن کی گردن کو بھی نہ پہنچ سکے۔ یہ الفاظ دیگر مسٹر جناح ہر صحنے میں ایک دیوتا بن کر رہنا چاہتے ہیں، اور دیوتا بھی ایسے جو وعدہ لا شریک! سے کم پایے کا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ بلا شرکت، وعدت، انہیں کانگریس کے حلقے میں میسر ہی نہیں ہو سکتی، کیونکہ کانگریس کے معمولی والے غیر بھی اس قدر قربانیاں

مید زبوں واقع ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ لیاک کے اربابِ معلّٰی و عقدا  
پہچانتا ذرا سہی دشوار نہیں ہے، اس لئے کہ ان سب کے ماتحتوں پر سنان  
بورڈوں کی ساز کے لیل چسپاں نظر آرہے ہیں اور اُن کے حروف  
اس قدر جلی ہیں کہ ضعفِ بصارت کے مریض بھی اُنہیں غریاں آنکھ سے  
پڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اُن کے لیلوں کی عبارتیں ملاحظہ ہوں۔  
"جاگیر دار" "راجہ صاحب" "خان صاحب" "خان بہادر" "سر" اور  
"سائٹ آف زیل"

کیا ہندوستان کے مسلمان اب اس درجے کو پہنچ چکے ہیں کہ  
 اتنی موٹی بات بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جناح کا سا جاہ پسند  
 اور ۔۔۔۔۔ اصحابِ جناح کے سے خطاب یافتہ اُن کے کسی کام نہیں  
 آسکتے، اور اسلام دُزدہ باد کے نعروں کے ذریعے سے اُنہیں ایسا ایسے  
 بولناک غار کی طرف ہانکا جا رہا ہے، جہاں پُرانی تباہ شدہ قوموں  
 کی ہڈیاں بچکار بچکار کر رہی ہیں کہ خدا را اس طرف نہ آنا کیونکہ یہ وہ  
 وہ غار ہے جس میں ایک بار گر جانے کے بعد پھر کوئی آج تک اُبھرا  
 نہیں ہے۔

میں اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کروں تو مناسب ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو معلوم ہے کہ مسٹر جناح اور سوبھاش چندر بوس وغیرہ میں کانگریس و لیگ کے درمیان مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے اور مصالحت کو طے کرنے کی خاطر مسٹر جناح ایک ماہ کی رخصت حاصل فرما چکے ہیں۔۔۔۔۔ اس رخصت کے اختتام پر حرف و حکایت کا سلسلہ سپر جج ٹریبل گلڈ اور اُن دو صورتوں میں ایک صورت طے ہو جائے گی: یعنی یا تو کانگریس اور لیگ میں اتفاق ہو جائے گا یا صلح ہونگی اور نا اتفاقی باقی رہے گی۔ اگر خدا خواستہ دوسری صورت پیش آئی تو اُس وقت کم سے کم تعلیم یافتہ اور سیاست آشنا مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ عدم مصالحت کے اسباب پر غور کریں اور دیکھیں کہ خطا کس فرق کی ہے۔ اگر مسلمان ایسا کریں گے تو ہمیں دعوے کے ساتھ یہ عرض کرنا ہوں کہ مسٹر جناح اور ارباب لیگ کی شخصیتیں اُس وقت اس درجہ برہنہ ہوکر اُن کے سامنے آجائیں گی کہ وہ لیگ کے قریب میں ایک لمحے کے واسطے بھی مبتلا نہیں رہیں گے، اور کانگریس کی طرف کارواں درکارواں کوچ

(ب) لیگ کے ارباب عقل و عقد کی ذہنیت: — اس باب میں زیادہ خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ ہر وہ شخص جو کیفیت عقل و ادراک سے محروم نہیں ہے۔ اس فریاں حقیقت تک برآسانی پہنچ سکتا ہے کہ لیگ کے ارباب عقل و عقد کس شرناک ذہنیت کے



کر کے آزادی کی دشمن طاقتوں کے خلاف ایک ایسا متحدہ محاذ قائم کریں گے کہ دیوبند کے منہ سے خون کا دھارہ جاری ہو جائے گا۔

## پروفیسر محمود شیرانی

آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اُس کے علم پر جراتی آتی ہے، علم کی دیوبی کا مزاج، تمام عالم کے حسینوں سے مختلف و متضاد واقع ہوا ہے، ہر حسین دیوبی زوجان کے آغوش کی طالب ہوتی ہے۔ مگر علم کی دیوبی زوجانی کو حقارت کے ساتھ دیکھتی ہے، اور پیرائے سالی کے آغوش کو ترجیح دیتی ہے۔ میرٹھس مرحوم نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

گٹھا دور، مشق سخن بڑھ گئی

ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

علم کے منبر سے کسی شخص کو اس مذکر کے ساتھ اتار لینا کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے ایک نہایت خطرناک قسم کی چہالت ہے۔ اور یہ وہ چہالت ہے جس کا مظاہرہ پنجاب یونیورسٹی کر رہی ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی ہندوستان کے مایہ ناز ادیب اور مستند فاضل پروفیسر محمود شیرانی کو اس محکمہ خیر عقلت پر وظیفہ دے رہی ہے کہ وہ پچھن سال کی زد میں آگئے ہیں۔

کیا کالج کی پروفیسری، کوئی پولیس یا فوج کا محکمہ، یا پبلو اڈن کا اکھاڑہ ہے، جہاں ہم کی فرہی اور عمر کی نارسیدگی ہی سب کچھ سمجھی جاتی ہے؟

پنجاب یونیورسٹی کو معلوم نہیں کہ علم کا پارہ، ۱۰ ماہ و سال کی گرمی سے چڑھتا ہے، اور جس قدر عمر بڑھتی ہے اتنا ہی علم میں اضافہ ہوتا اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ کیا اُسے یاد نہیں کہ برائون کو پیرائے سالی میں پروفیسری پیش کی گئی تھی؟ اور کیا پنجاب یونیورسٹی کو علم نہیں کہ فوجان بی لے، ایم لے، اور نو سال پی ایچ ڈی، ہرگز اس قابل نہیں ہوتے کہ پروفیسری کی سی اہم ترین خدمت انجام دے سکیں۔ کیا وہ پروفیسری کو اب سمجھتی ہے کہ مرعنی کا بچہ انڈا کھٹک کر باہر نکلا، اور فوراً دانہ چُکنے لگا؟

میرا یہ مذہاب نہیں کہ عمر کی بنا پر کسی پروفیسر کو وظیفہ نہ دیا جائے، لیکن جب تک کسی پروفیسر کی آنکھوں میں روشنی، ہات پاؤں میں چُپے پھرنے کی سکت اور دماغ میں تدبیر و تفکر کی قوت باقی ہے، یا بالفاظ دیگر جب تک کوئی پروفیسر جہانی حیثیت سے سٹھیا نہیں جاتا، اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کام کرتا رہے، اور اُسی وقت تک کام کرتا رہے جب تک کہ قدرت اُس سے کام کرنے کی صلاحیت نہ چھین لے۔ پروفیسر کوئی پھل نہیں کہ جیسے ہی وہ پختہ ہو جاتا ہے، شاخ سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے؟

اس لئے ہم نہایت روشن، گرم اور گرجتے ہوئے الفاظ میں پنجاب یونیورسٹی کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی کو پروفیسر محمود شیرانی کے علم اور تجربے سے محروم کر کے ایک ایسی چہالت کا ارتکاب نہ کرے، جس پر بے علمی بھی قہقہہ مار سکتی ہے۔

ظاہر میں کدورت ہے، مغلانی چپی  
شکار ملک بک کو، دلربائی چپی  
بیگانہ شہی پیا، شاطر کی نہ جا  
نہادان بکال، آشنائی چپی

دُرِ بک نہ تیغ زندگانی ہو جائے  
تمہیدِ الم نہ شادمانی ہو جائے  
ہاں پارسِ نریتِ خدا را شیا  
سکن بکریل عود جانی ہو جائے

# سرمایہ دار شہر پارہ کر دگار

(۱)

موت کے بستر پر اک دوشیزہ ہے لیٹی ہوئی  
 چہرہ گل رنگ ہے اس طرح بیماری سے فقی  
 ضعف کی شدت سے ہے یہ رنگ چشم شرمگین  
 دل میں کچھ یوں اٹھ رہی ہو پے پے رہ رہے ہو  
 تابِ رُخ یوں مضمحل ہے رومیں احساں کی  
 جس نے دیکھی ہیں ابھی چوڑا بہاریں عمر کی  
 خٹپٹے کے آخری لمحات کی جیسے شفق  
 نورش اوہام سے پڑ مرہ ہو جیسے نقیس  
 فلسفی کے قلب میں جس طرح چھتے ہیں شکوک  
 کوچ میں ہو چاندنی جس طرح پھیلی رات کی

(۲)

وائے محرومی، مالِ حسن اور اتنا مہیب  
 پائینتی مجبور ماں مہیٹی ہوئی ہے سرنگوں  
 سیم و زر تو اک بڑی دولت ہے ربِّ الخلیں  
 رحم فرما خالق کو نین مجھ نادار پر  
 سب کا تودا تا ہے، مجھ ناچیز باندی کے خدا  
 کھائے جاتے ہیں مجھے یہ سرد لمحے رات کے  
 پھیپھڑے ماؤف ہیں، اور سانس رکنے کے قریب  
 کہہ رہی ہے کس سے مانگوں بھیک، مولا کیا کروں  
 میرے گھر تو چند پیسوں کے سوا کچھ بھی نہیں  
 آج کی یہ رات بھاری ہے بہت بیمار پر  
 چند سکے، اے عظیم الشان چاندی کے خدا  
 چند ٹکڑے، یا الہی! چند ٹکڑے دعوات کے

(۳)

کیا ہوا جاتا ہے بچی کو ارے دوڑو کوئی ہائے تکیے سے ڈھلی جاتی ہے گردن پھل سی  
وہم ہوتا ہے مجھے لاش کچھ تو سُنو سے بول اے زبیدہ، اے زبیدہ، اے زبیدہ! اکھ کھول

(۴)

بعد ازاں ایک آخری ہچکی، مکمل بے بسی مُرغ جاں کی پریشانی، موت کی سنجیدگی

(۵)

لاش کا چہرہ خدا معلوم کیا کہنے لگا گر پڑی چکرا کے ماں، سر سے ہو پہنے لگا

(۶)

پوچھی اتنے میں، کانپی لاش پر پہلی کرن لاش سستی، یا سو رہی سستی منیند کی ماتی دُہن  
مخوشیوں تھا چراغِ کشتہ کا ہلکا دُھواں رو رہی تھیں بے زری کی موت کی خاموشیاں  
موت کے آغوش میں سستی ایک دیوی حُسن کی زانوئے ظلمت پہ گو یا سو رہی سستی چاندنی  
کارِ دال نورِ بحر کا یوں تھا چہرے پر رواں جیسے دُھندلے آئینے میں پر تو ابرِ خزاں

(۷)

سانس لی آبادیوں نے مُرغ کی آواز سے جاگ اٹھے زروا ہسائے ہی خوابِ ناز سے  
بے بسوں کی ہچکیوں سے جن کے بچے ہیں با۔ بیکوں کے آنسوؤں سے کھینچتے ہیں جو شراب

(۸)

(الف)

اے پٹاری کے سڑے انگور اہلِ غزوہ جاہ آدمی پر رحم کرنے کو سبھتے ہو گناہ  
غرقِ نکبت ہے تمہاری ذات سے نوبہ بشر شرم سے گڑجاؤ لے بے ہر فرزندِ انِ ذر

اے امیر و منہ دکھانے کے بھی تم قابل نہیں  
خاک میں مل جاؤ سینوں میں دل بحس لئے  
آدمی کب، آدمی کی شکل کے توڑے ہو تم  
مقتیلیوں میں ذر تو ہے، سینوں میں لیکن دل نہیں  
ماش کے آٹے کی صورت ایٹھتے ہو کس لئے  
نُشتِ مخلوقات پر سلطان کے پھوڑے ہو تم

(ب)

اور اے غاصب حکومت، دشمنِ لطف و کرم  
ہو نہیں سکتا ہے حاملِ اس حکومت کو دوام  
ہم نے یہ مانا کہ غفلت کشش میں، نادان ہیں  
ڈالتی ہے دل میں تو وہ زخم جو بھرتا نہیں  
جوتیاں تک چھین لے انسان کی جو سامراج  
جس کے لاتعداد مُردوں کو کفن ملتا نہیں  
لے یہ سر ہے، یہ جگر، یہ دل ہے، لے مخوس لے  
موت کے جادے ہیں تیرے گیسوؤں کے بیچ غم  
پیٹ بھر کر کھانا سکتے ہوں کبھی جس کے غلام  
اے حکومت، پھر سبھی ہم حیواں نہیں، انسان ہیں  
یہ ستم تو کوئی حیوانوں پہ سبھی کرتا نہیں !  
کیا اُسے یہ حق پہنچتا ہے کہ رکھے سر پہ تلج  
اُس کے پرچم کو نگل جاتی ہے بالآخر نہیں  
چوس لے جتنا ہو باقی ہے، وہ بھی چوس لے

(ج)

اور ہاں لے ماورائے فہم ہستی، لے خدا  
کون اتنا کور ہے انکار کر سکتا ہے کون  
نُستے ہیں تو ہے کہ وروں ماؤں بڑھکر شفقت  
اے خدا لے سر پرستِ نکتہ سنجانِ ریا  
پوچھتا ہوں میں کہ لے آقا بہ اس شانِ علو  
بے زروں کے غم سے کیا ہوتا نہیں تجھ کو قلق  
مجھ میں ہے انکار کا یارا نہ دمِ قسار کا  
کس کے منہ میں دانت ہیں اقرار کر سکتا ہے کون  
لے امیروں کے مُرتی، شہر پاروں کے رفیق  
اے خدا اے نا آور و چنگیز کے حاجت روا  
کھلتا ہے کیا غریب انسان کی آہوں سے تو  
تیرے زرداروں ہی کو ہے کیا فقط جیسے کا حق

کتنی ہی رُوحوں پہ دروازے جہنم کے ہیں باز  
تُو نے ہی اِس کا دیا ہے پاس کیا لے کر دگار  
آدمی جب کا پنتا ہے آدمی کے جبر سے  
آدمی جب آدمی کے پاؤں پر رکھتا ہے سر  
ایک شاہِ بحر و بر ہے، ایک پر دُنیا ہے تنگ  
فاتہ کش مخلوق مضطر ہے ذرا آنکھیں تو کھول  
دائرے میں رزق کے جب اتنی وسعت ہی نہ تھی  
اتنی آبادی بڑھانے کی ضرورت ہی نہ تھی

(۹)

آہ اے آدم کے بچے نامراد و نامتام  
شہر یاری سنگدل ہے، اور خدائی بے نیاز  
اغنیاء جس، خدا غافل، حکومت بے عمل  
فرش پر ہمدرد تیرا ہے، نہ ہمدم عرش پر  
سنگ پاروں کی حقیقت کیا، سونے گوہر نہ دیکھ  
کر بھی دے بیدخل ان اربابِ عز و جہا کو  
آسمانوں پر خدا کو اور زمین پر شاہ کو

جو بھر دے خود پہ کر لیتا ہے سب کو چھوڑ کر

ہاں وہ رکھ دیتا ہے دُنیا کی کھائی موڑ کر

اُمٹھ کہ یہ ہستی کا جس سیر سیکر اں کچھ بھی نہیں

مرد کے آگے زمین و آسماں کچھ بھی نہیں

## فیضی پراچہ

کاسرو اسلف، یا اور چھوٹی موٹی اشیاء، ہاں اس کی پیداوار سی حیثیت جنگ کے پیش نظر روز بروز محکم سے محکم تر ہوتی جاتی ہے۔

نمبر ۲۔ رقم وقار۔ موجودہ دور میں بیشتر نظام یا سپانڈ مالک میں ملتا ہے۔ یہ نہ اقتصادیات میں لازمی عنصر ہے اور نہ باقی تین رقم میں سے کسی کی سٹوس نمائندگی ہی کرتی ہے، یہ رقم محض شاہی حکومت وقت کے وقار کی نمائندہ ہے، اور اس کی جہت کا نام تر انحصار حکومت کے دبدبہ اور طاقت پر ہے، اس کا وجود کاغذی ٹکڑے ہیں، جن پر حکومت کے نمائندہ کی طرف سے رقم دھات کی مقررہ تعداد کے ادا کرنے کا وعدہ تحریر ہوتا ہے، لیکن جب کبھی بھی مردہ حکومت کے وقار کو نقصان پہنچتا ہے یا کسی وجہ سے خطرے میں پڑ جاتی ہے تو اقتصادی سنڈیلوں میں اس کاغذ کے پرندے کی، ردی کاغذ کے سوا، کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ جنگ عظیم کے بعد اس رقم کا رواج کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں نہیں رہا۔ یہ رقم حکومت کو لوٹ (Liquidity) کے مواقع پر پیچھا پاتی ہے، اس کے رواج سے رقم دھات سٹسٹا کر حکومت کے قبضہ میں چلی جاتی ہے، اور رقم پیداوار پر حکومت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس طرح عوام محض اس وقاری کاغذ سے مزدور بات پورے کرتے رہتے ہیں، اور حقیقی رقم دھات، اور پیداوار کے قبضہ سے محروم ہو جاتے ہیں، مگر شہنشاہی حکومت لگی ہو تو رقم دھات محفوظ رہتی ہے اور رقم پیداوار کو بھی زیادہ سے زیادہ ہینڈ یوں میں رقم دھات سے تبدیل

موجودہ دور رقم میں جبکہ انسانیت رقم کی محتاج محض ہو کر رہ گئی ہے۔ رقم کی حقیقت و ماہیت پر غور و غور، اور اس کی ابتدائی وارتقائی ہیئت کو جاننا ضروری ہے۔ موجودہ وقت میں رقم ہاں تکلیف اختیار کر چکی ہے، اور یہ چاروں ذریعہ ہیں۔

رقم دھات۔ سکتے۔ سونا۔ چاندی۔ پتیل۔ تانبا۔ لوہا وغیرہ  
رقم وقار۔ شہنشاہی نوٹ۔ ڈاکخانے کے سرٹیفیکٹ۔ حکومتی قرضہ بانڈ وغیرہ۔

رقم اعتماد یا بی۔ چیک۔ ہینڈوی، بینک نوٹ۔ اسناد تبادلہ وغیرہ۔  
رقم پیداوار۔ غلہ۔ روٹی۔ کوئلہ۔ تیل۔ مصنوعات وغیرہ۔

نمبر ۱۔ رقم دھات کی دو قسمیں ہیں، اعلیٰ وادنی۔ اعلیٰ کیاب دھاتوں پر مشتمل ہے، اور ادنیٰ عام یا پ دھاتوں پر۔ اعلیٰ کا تو عوام سے بیت کم تعلق رہ گیا ہے۔ یہ زیادہ تر حکومتوں کے ذریعہ صرف ہے، اور حکومتوں کے اعتماد اقتصادی کے یقین کا کام دیتی ہے، اور کبھی کبھی دولتوں کے جنگی قرض اور تادان ادا کرنے میں بھی استعمال ہوتی ہے اور ادنیٰ روز بروز اپنی وادنی حیثیت کو کم کر پیدوار سی ہیئت اختیار کر رہی ہے، اس وقت اس ادنیٰ رقم دھات سے اقتصادی لحاظ سے قیمت کم کام لیا جاتا ہے۔ یہ صورت ادنیٰ درجہ کی ضروریات کی تکمیل، اور لین دین میں کام آتی ہے۔ مثلاً غنہ

کر دیتے ہیں۔ یہی نوٹ عوام سے رقم دھات اور پیداوار، کچھ کچھ اس اداؤ کے تصرف میں لے آتے ہیں۔ اب ان کی ساکھ بڑھ جاتی ہے۔ باقی میانہ سرمایہ دار (Bourgeoisie) اور نچلے سرمایہ دار (Petty Bourgeoisie) اپنا اپنا سرمایہ ان اداروں میں جمع کر دیا کہ حساب کھلو اچھے ہیں، اقتصادی منڈیوں میں ایسے اداروں کی ساکھ بڑھ جانے کی وجہ اب لین دین اسی ادارہ کے نام کے حامل کاغذ ہے۔ چیک یا ہنڈوسی سے ہونے لگتا ہے، اس طرح رقم اسی ادارہ میں ایک کے حساب سے دوسرے کے حساب میں منتقل ہوتی رہتی ہے لیکن اصل رقم دھات یا رقم پیداوار پر قبضہ بدستور اسی جماعت کا رہتا ہے، یہاں بھی اگر یہ ادارے دیسی ہوں تو قوم کا سرمایہ حکومت کے حدود کے اندر محفوظ رہتا ہے، اگر بیسی ہوں تو تمام تر سرمایہ ان مالک میں منتقل ہو جاتا ہے جن کی وہ ملکیت میں۔ اس طرح اداروں کے مالک مالک کے سرمایہ داروں کی ملکیت روز بروز بڑھتی رہتی ہے، اور جس غیر ملک میں یہ ادارے کام کر رہے ہوں وہاں کے عوام روز بروز بد حال سے بد حال ہو کر اقتصادی لحاظ سے ان کے محتاج ہو جاتے ہیں، اس طرح سے برطانیہ کا ایک بھاری ادارہ (The Imperial Bank of Persia) بینک شہنشاہی ایران۔ احمد شاہ قاجار ابتدائی عہد سے لے کر رضا شاہ پہلوی کے ابتدائی دور تک، ایران میں ایرانی نام لیکن انگریزی ملکیت سے کام کرتا رہا جسے اب چار سال پیشتر پارلیمنٹ ایران نے بند کر کے (De National Bank of Persia) بینک ملی ایران کی بنیاد رکھی، ہندوستان پر آج کل رقم وقار، اور رقم اعتماد دونوں کی یورشیں ہیں، اور تقریباً ایک صدی سے ہیں، اب اندازہ ہو سکتا ہے، کہ بچارے ہندوستان کے عوام کی مالی حالت کیا رہ گئی ہوگی، اس وقت مندرجہ ذیل بڑے بڑے بینک ہندوستان میں مصروف کار ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ

- |                              |                                  |
|------------------------------|----------------------------------|
| (۱) لائیڈز بینک آف انڈیا     | (۲) مرکٹل بینک آف انڈیا          |
| (۳) چارٹرڈ بینک آف انڈیا     | (۴) نیشنل بینک آف انڈیا          |
| (۵) گرینڈ بینک آف انڈیا      | (۶) بینک آف انڈیا                |
| (۷) پی اینڈ او بینک آف انڈیا | (۸) اسپرنگ بینک آف انڈیا (مشترک) |

مخوف کیا جاتا ہے۔ یہ محفوظ سرمایہ بین المللی حیثیت سے حکومت کے وقار اور مدد پر کو بڑھاتا ہے۔ لیکن اگر حکومت غیر ملکی ہو تو اس طرح سے جمع شدہ تمام سرمایہ مگر ان قوم کے ملک میں منتقل ہو جاتا ہے، جس کے قبضہ کے طور پر مگر ان ملک کی حکومت کی ساکھ تو بڑھ جاتی ہے۔ لیکن غلام ملک روز بروز نادار ہو جاتا ہے۔

نمبر ۳۔ رقم اعتماد باہمی۔ یہ رقم دھات اور کسی حد تک رقم پیداوار کی نمائندگی کرتی ہے، اس رقم کا وجود بینکوں، باہمی سوسائٹیوں، اور اجتماعی اداروں سے ظہور میں آتا ہے، یہ جن رقم کی نمائندگی کرتی ہے اس پر صرف، مندرجہ بالا اداروں کو قائم کرنے والی سرمایہ دار جماعت کا قبضہ رہتا ہے، اور عوام اس جماعت کے توسط (Medium) سے اپنی ضروریات نباتے رہتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو ہوتا ہے کہ انسانیت صرف ایک شہنشاہ کی احتیاج سے نجات پا کر ایک جماعت کی دست نگر ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود شہنشاہ اس جماعت کا محتاج ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے، زیادہ اور منظم ہونے کی وجہ، اس جماعت کی سرمایہ دارانہ گرفت شہنشاہی گرفت سے زیادہ سخت اور مضبوط ہوتی ہے، جس کے اثر سے یہ جماعت تو مال مال۔ لیکن عوام زیادہ نادار اور سنبھل ہو کر رہ جاتے ہیں، یہ سرمایہ دارانہ نظام کی سنگ بنیاد ہے، اس وقت امریکہ انگلستان اور جاپان میں اسی رقم کا دور دورا ہے ۱۹۲۵ء کے دوران میں ہر سال برطانیہ غلے کی کل لین دین کا تقریباً ۳۱-۴۲ فیصدی اور امریکہ نے ۱۹۲۵ء میں ۸۰ فیصدی ڈالر کا لین دین اسی رقم کے ذریعہ کیا، اور جاپان نے کل لین دین کا ۸۰ فیصدی اس رقم کے ذریعہ سنگتوں کیا۔ اس کا مجموعہ مل میں آتا ہے۔ چند سرمایہ دار مل کر ایک ادارہ، بینک یا انجمن رقم (Money Society) کے نام سے، اپنے سرمایہ کو ملا کر، نام کر لیتے ہیں، اور اس جمع شدہ سرمایہ کا کچھ فیصدی (Some Percentage) حکومت وقت کے پاس ضمانت کے طور پر رکھ کر اپنے ادارہ کے نام سے نوٹ اور ہنڈیاں (Drafts) جاری

(۱) The Communist answer to the world's needs:- by Julius F. Hester. P. 34, ch. III  
(۲) Japan Finance, By B. K. Kishida. P. 79.

## امریکہ

۱) ڈیٹیل سٹی بینک آف نیو یارک (۳) امریکن ایکسپریس بینک

## جاپان

۱) متسوئی بینک (۲) یوکواہاما پسین بینک (۳) متسوئی کیشا بینک

## باقی ممالک

۱) نیدرلینڈ ٹریڈس بینڈش بینک (۲) نیدرلینڈ ٹریڈنگ سوسائٹی

## ہندوستانی

۱) دی سنٹرل بینک آف انڈیا (۲) دی پنجاب نیشنل بینک آف انڈیا

(اس کے علاوہ کئی اور چھوٹے موٹے ہندوستانی بینک ہیں، لیکن ان کی حیثیت ایک واحد سا ہو کار کے کاروبار کے کاروبار سے بھی کم ہے اس لئے درج نہیں کئے جاتے)

ان کے علاوہ بے شمار غیر ملکی تجارتی ادارے ہیں جو میکنگ بھی کرتے ہیں جن میں سے بڑے بڑے مندرجہ ذیل ہیں۔

## برطانیہ عظمیٰ

۱) رالی برادرز (۲) والٹرٹ برادرز (۳) فارلس فارلس کمپن (۴)

ڈیوڈ ساسن (۵) ای۔ ڈی۔ ساسن (۶) پی اینڈ او کمپنی (۷) میکنین میکنری

## جاپان

۱) متسوئی بوسان کیشا (۲) متسوئی بوسا کیشا (۳) شینپن یون کیشا

(۴) ادسا کا کیشا (۵) جاپان کاٹن کیشا۔

امپیر نیٹک مالک کے سرمایہ دار اپنے زیر اثر ملک کے عوام کو کس طرح تاخت و تاراج کر کے اور سب کچھ لوٹ کر فاقہ کشی پر مجبور کر دیتے ہیں اس کا تصور ابیت اندازہ مندرجہ بالا اداروں کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔

نمبر ۱۔ رقم پیداوار۔ حقیقت میں بھی وہ رقم ہے جس پر بقیہ تین رقم کا بنیادی انحصار ہے، اور یہی وہ رقم ہے جو انسانی مزدوریات کی تکمیل میں لگا آتی ہے۔ اور اسی سے رقم کے لحاظ سے انسانیت سب سے پہلے متاثر ہوئی۔ اس پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں قبضہ حاصل کرنے کے لئے چالاک دماغوں کے رقم کی بقیہ تین اشکال کو ایجاد کیا، اور انہی تین نئی اشکال نے انسانیت کو موجودہ دہائی میں مبتلا کر کے ایک دوہرے

سے لڑایا۔ اور فساد برپا کیا۔ چند ایک کو لوٹ کے اور عوام کو ٹٹنے کے مواقع میم پہنچائے، اس ابتدائی رقم میں چند افراد کی چالاک کی نے تغیر و تبدل پیدا کیا اور رفتہ رفتہ تبدیل شدہ اشکال رواج پذیر ہوتی گئیں۔ اور یہ ابتدائی رقم محض معنی خاتم کا نام لے کر رہ گئی۔ پہلے جہاں رقم پیداوار انسانی مزدوریات کے درمیان معیار تبادلہ کا کام دیتی تھی، اور حاجت کی تکمیل کے بعد ذائد تبادلہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اب رقم دھات۔ رقم وقار۔ اور رقم اعتماد۔ سیاحتی تبادلہ کی حیثیت اختیار کر گئے اور ابتدائی رقم جنس خاتم کی شکل میں عوام میں تبدیل ہونے لگی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے جہاں ضرورت کا تبادلہ محنت سے ہوتا تھا، یعنی کھانا نے کھیتی باڑی کر کے جو لہجے کو غلہ پیش کیا اور جو لہجے نے محنت کر کے کاشتکار کے لئے کپڑا بنا، اب اجناس کا تبادلہ ہونے لگا، ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ حکمت کی بنیاد پر۔ یعنی پہلے اگر ایک جوڑا دس ہاتھ کپڑا دے تو یہ بن سکتا تھا اور اس کی ضرورت صرف دو ہاتھ بننے ہوئے کپڑے سے پوری ہو جاتی تھی تو وہ ذائد نہیں بنتا تھا۔ اور بقیہ وقت آرام میں کاٹتا تھا، لیکن اب وہی جوڑا، ضرورت سے قطع نظر، استطاعت کار کے ذریعہ، ملکیت، کو بڑھانے کے لئے زیادہ کام کرنے لگا، تاکہ ضرورت کو پورا کر کے خالص مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ رقم پیدا کر پرقبضہ کیا جاسکے، اور چونکہ رقم پیداوار کی نمائندگی رقم دھات میں موجود تھی، اب رقم پیداوار رقم دھات میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اس عمل کا نتیجہ عیاں ہے، انسان ملکیت کے لالچ میں ضرورت سے ذائد پیدا (Produce) کرنے لگے، اور خالص حاصل (Excess Production) جمع ہونے لگا۔ رقم پیداوار تو ذخیرہ ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لئے بچت کو محفوظ کرنے کے لئے رقم دھات میں ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور رقم دھات زیادہ سے زیادہ رواج پذیر ہوتی گئی، ابتدا میں یہ خالص حاصل دستکاروں کے ہاتھ جمع رہا۔ بعد میں عقل نے دستکاری پر فتح حاصل کی سرمایہ بھی اہل فکر (Capitalist) کے پاس منتقل ہو گیا، اور پھر کھٹے کھٹے انسانوں کو تنہا دنیا میں صرف چند افراد یا جماعت کے زیر تصرف آگیا، محدود ملکیت نے ہٹا کی مانگ اور مقبولیت کو بڑھایا۔ رقم پیداوار کی ضرورت (حاجت) کے باوجود وقت گزرتی گئی اور انسان زیادہ سے زیادہ رقم دھات حاصل کرنے لگے، استطاعت سے زیادہ مصروف کار رہنے لگے، لیکن اس مصروفیت اور ذائد محنت کے باوجود رقم دھات کا ذائد حصول ممکن نہ ہو سکا، رقم دھات کی مانگ



جماعت نے، پیداوار کی کثرت کے پیش نظر، پیداوار اور دھات کے معاوضہ کی شرائط سخت کر دیں، پہلے جہاں ایک تولہ چاندی کے لئے دس دن محنت کے حامل کی ضرورت تھی اب وہی تولہ چاندی ۲۰ دن محنت کے حامل سے بھی دستکار کو دستیاب نہ ہوتی۔ اب ایک طرف تو رقم دھات گراں ہو گئی۔ دوسری طرف مزدوریات حیات محنت کی بجائے رقم دھات کی مناجات ہو گئی اور تیسری طرف مصروفیت عد سے زیادہ بڑھ گئی۔ اس عمل سے جہاں رقم دھات کی کمپا کر چند افراد کے قبضہ میں چلی گئی وہاں عوام محنت کے باوجود مزدوریات حیات کی تکمیل سے عاجز آ گئے، رد عمل لازمی تھا، بددی چھا گئی۔ انسانیت استقامت سے زائد محنت سے تنگ گئی۔ اب اہل خیال (Intellectuals) نے موجودہ پیداواری مقدار کو قائم رکھنے اور پھر بڑھانے کے لئے مشینری ایجاد کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے جو چیز زائد محنت سے کم تعداد میں حاصل ہوتی تھی، اب کم محنت سے زائد تعداد میں حاصل ہونے لگی، شے کے ہوئے عوام کو ان ایجادات سے کچھ دیر آرام کرنے کا موقع مل گیا اور مشینری روز بروز مقبول سے مقبول تر ہو کر پڑھنے لگی، مزدوریات بغیر محنت کے رقم دھات کے عوامی مشینری حاصل (Mechanical Production) سے پوری ہونے لگیں۔ لوگ آسودہ ہوتے گئے جب سابقہ زائد محنت سے حاصل کردہ محفوظ بچت مشینری حاصل کے ذریعے سرمایہ دار کے قبضہ میں جا چکی۔ تکان اتر چکی، اور مزدوریات کو پورا کرنے کے لئے رقم دھات کی ضرورت محسوس ہوئی تو لوگ کام کے متلاشی ہوئے۔ اب کام کہاں تھا۔ کام پر تو مشینیں چھا چکی تھیں یعنی دیکھاری کا دور دورا ہوا کچھ لوگ تو ایجاد مشینری کے ذریعے کام چلانے کے لئے تعلیم کی طرف راغب ہوئے، بڑی بڑی یونیورسٹیاں کھلیں۔ لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ مشینری میں بھی ترقی ہوتی گئی، پہلے جس مشین پر ۱۰ آدمی کام کرتے تھے اب وہ ایک آدمی کی مدد سے پہلے سے زائد کام کرنے لگی، تعلیم روز بروز باریک سے باریک جڑھونے کی وجہ سے ہٹتی ہوتی گئی، اور آمدنی کے ذرائع کم ہوتے گئے۔ عوام افلاس و بیکاری سے تنگ آ کر دزدگی سے عاجز آ گئے۔ اس ٹکئی نے چند ہی عرصہ میں نسل انسانی کو حقیقتِ حالی پر غور و خیر پر مجبور کیا اور محسوس ہونے لگا کہ اس ٹکئی کی سب سے بڑی وجہ رقم دھات، اور اس کی نمائندگی کے تحت رقم دھات اور رقم اعتماد، اور ان کی ذاتی شخصی ملکیت ہے، ان کے خلاف

Basic Principles for Scientific Socialism  
A.S. Sacho.

۱۔ سوشلزم کے بنیادی اصولات کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل کتب معاون ثابت ہو سکیں گی۔  
(۱) داس کیسٹل - کارل مارکس (۲) جیٹری آف سوشلسٹ تھنکٹ (History of  
H.W. Laidler (Socialist Thought  
۲۔ باربر سسٹم - اس سسٹم کی رو سے انجمناس کا تیار ہونا ضرورت کی بنا پر ہے۔ انجمناس سے مراد  
۳۔ م۔ جیٹری آف سوشلسٹ تھنکٹ - History of Socialism  
۴۔ جیٹری آف سوشلسٹ تھنکٹ - History of Socialism  
۵۔ جیٹری آف سوشلسٹ تھنکٹ - History of Socialism



# عدالت حیوانات

## حیوان کو سزا دینے کے دیکھتے

شوکت سبزواری - ایم اے

آنے والی سنوں کے لئے اسی طرح باعثِ تفریح خاطر ہوں گے جس طرح ہمارے لئے ہمارے آباد اجداد کے فیصلے اور وہ عقوبات جو انہوں نے لگا ہے گا ہے غیر ناطق حیوانات کو دیں۔

انسان ابتدا ہی سے یہ خیال کرتا رہا ہے کہ جو چیز عالمِ وجود میں ہے ——— خواہ وہ غیر ذی حیات کیوں نہ ہو — اُس کے لئے ایک نفس ہے جو اس کو دوسری موجود چیزوں سے ممتاز بناتا ہے۔ اس لئے قدیم انسان کو جب کسی چیز سے ضرر پہنچتا تھا تو وہ اس سے انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتا تھا، اور بچوں کی طرح دُور جوش و غضب سے مغلوب ہو کر اُسے ہلاک کر ڈالتا تھا۔ یونان کے قدیم باشندے اُن آلات کو بھی سزا دیا کرتے تھے جن سے کسی انسان کو قتل کیا جاتا تھا، یہ سزائیں تین طرح کی تھیں، یا تو ان آلات کو فنا کر دیا جاتا تھا یا کسی بھیڑ میں ڈال کر اُن کو تپایا جاتا تھا یا آبادی سے دور کسی ویران جگہ میں ڈال کر گویا انہیں خارج البلد کر دیا جاتا تھا، قرونِ وسطیٰ تک یورپ کا بھی یہی حال تھا۔ انگلستان میں وہ آگہ جہاز جس سے کسی انسان کو قتل کیا جاتا تھا، مقتول کے ورثہ کو دے دیا جاتا تھا، کیوں؟ اس لئے کہ اُسے فنا کر دیا جائے اور جوشِ انتقام کو سر دیا جاسکے۔

قدیم ایام میں سزا کو قانونی انتقام تصور کیا جاتا تھا، اس لئے انسان کو یہ حق تھا کہ وہ جس طرح چاہے اپنے دشمن سے انتقام لے، اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس کا دشمن سنگِ راہ ہے یا چلنے پھرنے والا حیوان، ہر اہلِ رخت ہے یا بولنے اور سمجھنے والا انسان، جذبہ انتقام کی نسکین مرکزِ خاطر ہوتی تھی اور پھر حالِ سزا اس بھرکتے ہوئے جذبہ کو ایک بڑی حد تک سرکڑتی تھی، یہی باعثِ متناہیتر حالات میں عدالتیں ہر ذی حیات اور مردہ چیز کو مجیب و عزیز سزائیں دیا کرتی تھیں۔ قدیم انسان کا خیال تھا کہ ہر وہ چیز جو کسی انسان کو ضرر پہنچائے، یا کسی دوسری چیز کے لئے باعثِ ضرر بنے، اپنے اندر ایک ناپاک روح رکھتی ہے۔ ان کی رائے میں اس روح کو فنا کرنا ازل سے ضروری تھا، چنانچہ وہ اس غبیث روح کو مختلف انواعِ سزائیں دے کر نیست و نابود کیا کرتے تھے۔

مرد و ایام سے یہ خیال بدل گیا، اس کے بعد سزا تنبیہ و اصلاح کا ذریعہ سمجھی جانے لگی۔ اس وقت جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ اسی خیال سے دی جاتی ہیں کہ مجرم کی اصلاح ہو جائے، اور وہ آئندہ جرائم کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن بائبل میں اس دورِ عروج و ترقی میں ایسے فیصلے بھی صادر کئے جاتے ہیں جن کے متعلق وفاق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ مستقبلِ قریب میں ہاری

ایک مدت کے بعد جب حق انتقام حکومت کی طرف منتقل ہو گئی تو یہ طریقہ رائج ہوا کہ حکمران وقت اس چیز کو جس کے خلاف دعویٰ کیا جاتا تھا مجرم قرار دیتا تھا۔ اس مجرم کو فروخت کیا جاتا تھا۔ اور اس کی قیمت ما و خدہ میں خرچ کر دی جاتی تھی، اس مجرم کو دیو دند کہتے تھے، جس کا ترجمہ ہے "اللہ کی قربانی"۔ دیو دند کے متعلق بکثرت احکام و قوانین وضع کئے گئے تھے، اگر کوئی انسان کسی گاڑی کے نیچے دیکر مر جاتا تھا تو تمام گاڑی کو مجرم قرار دیا جاتا تھا، اور اگر گاڑی کھڑی ہوتی تھی اور اتفاق سے کوئی بد بخت انسان اس کے کسی پیٹ سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاتا تھا تو اس کی ذمہ داری تمام تر پیٹ ہی پر عائد ہوتی تھی، ایک کشتی دریا میں تیرتی جا رہی ہے سو اتفاق سے کشتی میں سوار ہونے والوں میں سے کوئی شخص پانی میں گر کر غرق ہو جاتا ہے، اس صورت میں کشتی پر مقدمہ چلایا جاتا تھا، اور اسے سخت معذرت تصور کیا جاتا تھا، یہی کشتی اگر ساحل سمندر پر روانہ ہوتی تھی، اور اس نوع کا کوئی حادثہ پیش آ جاتا تھا تو کشتی کو مجرم نہ سمجھا جاتا تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ کشتی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ سمندر کی بے پناہ موجوں کا مقابلہ کر سکے۔ امریکہ کی قدیم تاریخ کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عہد استعمار کے اوائل ہی میں ایک شخص درخت کی شاخ سے گر کر انتقال کر گیا۔ ایوان داد وائین نے فیصلہ صادر کیا کہ اس درخت کو جلا کر خاک سمیاد کر دیا جائے۔

یہ جملہ واقعات قدیم انسان کے ضعف عقل اور نقصان فہم پر رکھے ہوئے واقعات ہیں، اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم عدالتی فیصلے کیا تھے، عہد ترقی کے احکامات و جرائد کے تغیر کی کام تھے۔

جہاں جمادات پر دعوے کئے جاتے ہوں وہاں حیوانات کو سزا دینا کرنا چنداں تعجب انگیز نہیں۔ یورپ کی قدیم عدالتی دستاویزوں اور فیصلوں میں بے شمار اس نوع کی روایات ہیں جو اس درجہ عجیب و غریب ہیں کہ بدشواری عقل انسانی ان کو باور کر سکتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے بعض اطراف میں حیوانات کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی گئی تھیں۔ ان عدالتوں میں مجرم حیوانات کو مظلوم یا اس کے متعلقین کے سپرد کر دیا جاتا تھا، تاکہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے ان کو سزا دیں۔ یہ عدالتیں دو نوع کی تھیں۔ دینیہ اور مدنیہ۔ اول الذکر عدالتیں وحشی یا

نوعی جانوروں کے مقدمے فیصل کیا کرتی تھیں، اور ثانی الذکر عدالتوں میں مانوس یا پالتو جانوروں کے مقدمے پیش کئے جاتے تھے، مقدمات کی عدالت اور ان کے پیش کرنے کے طریقے قریب قریب وہی تھے جو اس عہد میں ہیں، باقاعدہ ججوں کے حضور میں، مدعی و مدعا علیہ یا مستغنیث اور ملزم پیش کئے جاتے تھے، شہادتیں قیام کی جاتی تھیں۔ جرم میں کی جاتی تھیں، اور تنہا معین کے دکھار بخش بھی کرتے تھے۔

چودھویں صدی کے "اوراق پارینہ" میں ہے کہ ایک مرتبہ فرانس میں ایک بیل کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ کہا گیا کہ اس بیل نے شہر مورانی کے قریب ایک انسان کو ہلاک کر دیا ہے۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ بیل پر فرد جرم لگائی گئی اور اسے قلعے میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۳۱۷ء میں پیرس کی پارلیمنٹ نے اس انوکھے فیصلہ پر بھرپور تصدیق بھی ثبت کر دی۔

۱۳۷۷ء میں فرانس کی عدالتوں نے ایک گھوڑے کو موت کی سزا دی، اس لئے کہ اس گھوڑے نے ایک شخص کو لاتیں مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ۱۳۹۷ء میں "اکس" کے ایوان داد وائین نے قتل کے جرم میں ایک گھوڑی کو نذر آتش کر دیا۔

حیوانات کے مقدمات میں سب سے زیادہ دلچسپ اور انوکھا مقدمہ وہ ہے جو صفحات تاریخ میں قضیہ سافینی کے نام سے شہور ہے، ایک مادہ خنزیر اور اس کے چھوٹے چھوٹے چھ عدد بچوں نے ایک نوع انسان کے بچہ کو ہلاک کر کے کھا لیا۔ خنزیر کے اس پورے خاندان کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ فرانس کے ایک شہور و معروف قانون دان نے، جو تردہانی اہل فصاحت میں اپنی نظیر آپ تھا، مجرموں کی حمایت کی۔ یہ قادر الکلام قانون دان اپنی جا دو بیانی سے بچوں کو موت کی گرفت سے بچانے میں کامیاب ہو گیا، لیکن ان کی بے زبان ماں موت کے پنجے سے نہ چھوٹ سکی، بچ اور مجبوری دونوں نے اتفاق مادہ خنزیر کو مجرم قرار دیتے ہوئے، اس کے لئے سزا موت تجویز کی، اور عام مناشائیوں کے روبرو شارع عام پر اسے سولی دیدی گئی۔

چند ایام کے بعد دوبارہ خنزیر کے بچوں پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ اس مرتبہ عدالت نے فرمان صادر کیا کہ یہ بچے مظلومہ سبڈم ڈی سافینی کے سپرد کر دیے جائیں۔

۱۹۳۷ء میں فرانس میں ایک خنزیر کو جس نے کنبہ سے متعلق زمین میں ایک شخص کو ہلاک کر دیا تھا، گرفتار کیا گیا۔ اس قاتل خنزیر کا مقدمہ ایک مجلس کے سامنے پیش ہوا، جس کے ممبر تمام تر راہب تھے۔ مقدمے نے اپنے تمام عدالتی مدارج باقاعدگی کے ساتھ طے کئے۔ اور آخر میں حکم صادر ہوا کہ خنزیر کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا جائے۔ فیصلہ میں لکھا گیا تھا۔

ہم سب تارک الدنیا راہب ہیں۔۔۔۔۔ ہماری رائے میں جرم کی نوعیت بدرجہ فحاشت مکروہ اور سفاکاذ ہے، داد و انصاف کی تائید اور عبرت عامہ کی غرض سے ہم نے خنزیر کے لئے سزائے موت تجویز کی ہے ؟

دینی عدالتوں میں بالعموم ان جہد مقدمات کی سماعت ہوتی تھی، جو چوہوں، چھچھوندروں، ٹڈیوں، پھھروں، مکھیوں، چوٹیوں اور عام کیڑوں کوڑوں پر دائرہ لگے جاتے تھے۔ بیشتر حالات میں، حشرات الارض اور ایذا پہنچانے والے جانوروں کو یہ الہی عدالتیں جو سزا دیتی تھیں وہ لعنت ہوتی تھی۔ ہارگاہ خداوندی میں گڑگڑا گڑا کر دعا میں مانگی جاتی تھیں کہ وہ ان مجرموں پر اپنی تہاریت کے صدقے میں لعنت نازل فرمائے۔ مثلاً میں ایک ٹڈی دل کو، جس نے تیروں کے علاقہ کو برباد کر دیا تھا۔ سزائے لعنت دی گئی، اور جب اتفاق سے اس گردہ پر کوئی لعنت نازل نہ ہوئی تو پوچھا گیا کہ اس علاقہ کے باشندے گناہگار ہیں، اس لئے سختی رحمت یزدانی نہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے کلیساؤں میں نمازیں پڑھی گئیں اور بھولے بھالے عامۃ الناس یہ سمجھتے رہے کہ خدا نے ان کی خطاؤں کو معاف فرما دیا ہے۔

اسی سلسلہ کا دلچسپ ترین مقدمہ ایتان کے چوہوں کا مقدمہ ہے، سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں فرانس کے جہد اطراف و جواب میں اُس کی کافی شہرت تھی، تفصیلات یہ ہیں۔ ایک علاقے کے چوہوں پر دعویٰ کیا گیا کہ انہوں نے جہد مزدعات کو برباد کر دیا ہے، جس کی وجہ سے جو کی فصل تمام تر سخت ہو گئی۔ فرمان صادر ہوا کہ چوہوں کو عدالت میں حاضر کیا جائے۔ ان کی طرف سے ایک قانون دان جس کا نام "باد ٹو ویو شاسانی" تھا، پیش ہوا، اس قانون دان کی شہرت تمام تر اسی مقدمے کی رہنمائی

حقیقت یہ ہے کہ اس قانون دان نے باحسں وجوہ اپنا فرض انجام دیا، اور باطل اسی طرح ان چوہوں کی حمایت و دفاع میں اُس نے سعی و کوشش کی، جس طرح وہ کسی امیر کبیر یا باعزت شخص کی مدافعت کر سکتا تھا۔

اُس نے عدالت سے کہا کہ چوہے شہر کے اطراف و جواب میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے مساکن کی معرفت اور انہیں عدالت میں پیش کرنا چنداں ہل نہیں۔ جب عدالت نے اُس کے اس عذر کو قبول نہ کیا تو وہ خود چوہوں کا نمائندہ ہو کر عدالت میں آیا۔ اور ان کے دفاع میں اس نے ایک پرمغز تقریر کی، جس میں اُس نے خصوصیت کے ساتھ اس لہر پر زور دیا کہ چوہے، جن کی طرف سے وہ نیابت کر رہا ہے، اس قابل نہیں کہ عدالت میں حاضر ہو سکیں۔ ان کے مساکن ہیئت دور ہیں، اور راستہ غیر محفوظ ہے، اس لئے کہ راہ میں بیاں اور گتے بکثرت ملتے ہیں، جن کے دست و دھن سے مخلصی پانا چوہوں کے لئے ہیئت دشوار ہے۔ اگر تندی یہ چاہتے ہیں کہ پھر حال میرے موکل "عدالت میں حاضر کئے جائیں" ان کی زندگی و حیات کی ضمانت انہیں کرنا ہوگی۔

عدالت نے دعویٰ کرنے والوں سے دریافت کیا کہ کیا وہ ضمانت دینے کے لئے آمادہ ہیں، اور جب اُنہوں نے انکار کیا تو عدالت چوہوں کو بری کرنے پر مجبور ہوئی۔

اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ جو سب سے زیادہ عجیب و غریب اور حیرت فرما ہے، یہ ہے کہ موسز لینڈ کے شہر ہال میں ایک مرغ نے اٹھ دیا۔ وہاں کے باشندوں نے اُسے قابل اعتراض جرم تصور کرتے ہوئے شہر کی عدالت میں مرغ پر دعویٰ کر دیا، مرغ کو عدالت میں لایا گیا، عدالت نے شہر کے کاہنوں، افسروں اور اعیان و اشراف کے رو برو فیصلہ صادر کیا کہ مرغ کو جلیتی ہوئی آگ میں ڈال کر ہلاک کر دیا جائے۔

حیوانات پر جو دعوے کئے جاتے تھے تو صرف اس خیال سے کہ ان کے اجسام میں ناپاک رو میں حلول کئے ہوئے ہیں، خنزیر یا سور اُن کی نظروں میں ناپاک ترین جانور تھا، اس لئے اس کو سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔

عبد قدیم کے انسان کسی طرح بھی دور حاضر کے دلیہ الاوی اور صغیر

چاہتا۔

اس کے علاوہ چند اور عدالتی فیصلے بھی ہیں جن میں سہل سے سہل جرم کی سزا دشوار سے دشوار دی گئی ہے۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار فیصلے علامت ہیں اس امر کی کہ یہ عدالتیں ذمہ داری کا سہنوم سمجھنے میں غلطی کرتی ہیں، اور ان حالات و ظروف پر نظر کئے بغیر جن میں جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ مجرموں کو سزا دیتی ہیں۔ جہاں تک ذمہ داری یا سہولیت کا سوال ہے ہم بھی اس کا مفہوم وہی سمجھتے ہیں جو قرون متوسط میں یا اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی فرق ہے تو اس قدر کہ ہم ذمہ دار صرف انسان کو قرار دیتے ہیں اور وہ حیوان اور جماد، جاندار اور بے جان سب کو ذمہ دار تصور کرتے تھے۔

بچوں سے زیادہ حافل، زیادہ فہیم، اور زیادہ باشعور نہ تھے، ان کے اعتقاد میں حیوانات اور جمادات ان افعال و اعمال میں ذمہ دار قرار دئے جاسکتے تھے جو با منظرار یا بلا شعور ان سے سرزد ہوتے تھے۔ یا کسی طرح ان کی طرف منسوب کئے جاسکتے تھے، یورپ اور امریکہ میں ہمد قریب تک دیوانوں اور کم فہم بچوں کو ان کے اعمال کا ذمہ دار بنایا جاتا تھا۔ بعض حالات میں ان مالک کی عدالتیں مضحکہ خیز فیصلے دیا کرتی تھیں۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک شہر میں چھ سال کے نوعمر بچہ پر دھوئی کی گیا کہ اس نے بندوق سے ایک شخص کو ہلاک کر دیا ہے۔ جج نے حکم دیا کہ اس بچے کو پندرہ سال کے لئے اصلاحی جیل میں بھیجا جائے۔

۱۹۳۳ء میں امریکہ کی ایک عدالت نے دو شخصوں کو دس دس سال کی سزا اس بنیاد پر دی تھی کہ انہوں نے اشتراکیت کی تائید میں کچھ کہنا

## تضمین

من در طلب تو بہ مرا دے نہ رسیدہ  
محرورم پر و بالم و تو اوج نشینی  
معتوبم و افسردہ دلم، تشنہ مشام  
صد برق بہ آغوش فلک شد تبسم  
با اینہم محسود رقیب با ہم و رسوا  
عامی شدم و لذت عصیاں بخشیدہ  
صیاد و ددارم سر آہوئے رسیدہ  
کو تاہ کندم سر بامت نہ رسیدہ  
وز گلشن بہر تو شمیم نہ وزیدہ  
حالانکہ سر شاخ نشین نہ رسیدہ

در کوئے تو معروفم و اذروئے تو محروم

(سدی)

گرگ دہن آلودہ و یوسف نہ دیدہ

رنجی صلیقی

# جانوروں کے مختلف رنگ

محمد یوسف، کلکتہ

علم حیوانات کی اصطلاحات میں، حیوانات کی ایک قسم پروٹوزوا (*Protozoa*) یعنی حیوانات اولیٰ ہے، جس قسم کے حیوانات پر اس اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے اُن کی نسبت ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا درحقیقت وہ سلسلہ حیوانات کا اولین حلقہ ہیں یا اُن سے بھی پہلے کوئی کڑی ہونی چاہیے قطعی جواب تو اس کا کوئی نہیں دیا گیا۔ اور غالباً دیا بھی نہیں جاسکتا۔ البتہ موجودہ معلومات سے یہ امر مسلمہ ہے، کہ اس وقت تک جننے بھی حیوانات دریافت ہوئے ہیں، اُن سب میں سب سے ترین اور اولین حیوان بھی ہیں۔ ان حیوانات کے جسم سے ایک خاص قسم کا لیسدار مادہ خارج ہوتا ہے، اس مادہ سے جب باؤں کے ذرات ملتے ہیں، تو فوراً چمک جاتے ہیں، اور ان سے ایک خول (*case*) سرتیا ہو جاتا ہے، عموماً اس خول کا رنگ حیوان کے جسم کا رنگ سمجھا جاتا ہے، اب غور طلب چیز یہ ہے کہ اس میں رنگ کس چیز کا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ بالوں کے علاوہ اور کسی چیز کا نہیں ہو سکتا۔

حیوانات کے ظاہری اعضاء کی طرح اندرونی اعضاء کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً جگر کا رنگ اور ہسے۔ دل کا اور۔ گردہ کا رنگ جدا ہے اور آنٹوں کا جدا۔ مگر ظاہری اعضاء کی طرح اُن کے رنگوں کا اختلاف بھی فزیا لوجی کل اسباب کا ہی نتیجہ ہے۔ چنانچہ ان کی کیساوی تشریح کے نتائج اس کی تسلی بخش شہادت دیتے ہیں۔

یہ ہیں علم وظائف الاعضاء کی دلائل

خود علمات علم الحیات نے ہیں بتایا ہے کہ جاندار چیزوں کی بالیدگی

پسند علم نباتات (*Botany*) اور علم حیوانات (*Zoology*) کا مشترک موضوع ہے جس قدر تحقیقات اس وقت تک ہوئی ہیں۔ وہ اگر ایک مرتب صورت میں مدون کر دی گئی ہیں۔ تاہم اُنہیں ابتدائی درجہ سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملا ہے، کیونکہ مقاصد و عمل کا بہت کم حصہ سامنے آیا ہے، اور بہت بڑا میدان ابھی باقی ہے۔

علم وظائف الاعضاء (*Physiology*) کے ایک گردہ کی تحقیقات یہ ہے کہ حیوانات میں اختلاف الوان معض فزیا لوجی کل اسباب سے پیدا ہوا ہے۔ اور اس میں قدرت کے کسی ارادے اور قصد یا تقدیر و تخمینہ کو دخل نہیں۔ فزیا لوجی کا صحیح ترجمہ میرے خیال سے علم وظائف الاعضاء ہے اور فزیا لوجی کل اسباب، وہ اسباب و موثرات ہیں۔ جن کا تعلق علم وظائف الاعضاء سے ہے۔ پس میں پہلے اُن کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

ادی اشیا، خواہ وہ حیوانات ہوں، یا نباتات یا جمادات، اُن کے لئے اکثر حالتوں میں رنگ کا ہونا لازمی ہے۔ حیوانات اور نباتات ایک طرف ہیں جمادات میں بھی شکل کوئی ایسی مثال ملے گی جس کا بعض گیسوں کی طرح کوئی خاص رنگ نہ ہو۔ چونکہ تمام حیوانات اور نباتات کے جسم اور جمادات سے مرکب ہیں اس لئے طبعی طور پر اُن کے جسموں میں ان جمادات کے رنگ کا رنگ ہونا ضروری ہے۔ البتہ ہماری آنکھوں کو صرف وہی رنگ نظر آتا ہے جو جسم کی بالائی سطح سے قریب ہوتا ہے۔ مگر جب کسی جسم کی تشریح کی جاتی ہے تو اس میں اُن تمام بلعات کے رنگ یا اُن کے آثار نظر آ جاتے ہیں۔ جن سے اُن کا قوام مرکب ہوتا ہے۔



ایک خاص قانون کے تحت ہوتی ہے جس کو موازنہ یا مقایسہ کہتے ہیں۔ یعنی مختلف اشیاء کا باہم قیاس میں لانا، اور ان کا موازنہ کرنا۔ یہ قانون جس طرح حیوانات کے قد، جسم اور اندرونی ساخت میں نافذ ہے، بالکل اسی طرح رنگ میں بھی جاری ہے، چنانچہ جب ہم مختلف الوان حیوانات کو غور سے دیکھتے ہیں، تو ان کی رنگارنگی اس کے تحت نظر آتی ہے، اگر ایک جانور کے بدن پر بازو پر خاص رنگین خط باگ ہے تو مزور ہے کہ دوسرے بازو پر بھی بعینہ اُس کی جگہ ویسا ہی رنگ ہوگا، کیونکہ وہ دونوں بازوؤں کا غیر ایک ہی قسم اور ایک ہی مقدار کے مادہ سے بننا ہے،

شیر اور چیتے کے جسم کا موازنہ کیجئے۔ مور کے پروں کا مطالعہ کیجئے، کس نظام و ترتیب اور تناسب و تقابل کے ساتھ ایک پتھر سے پتھر نقش کی طرح نقاشی کی گئی ہے، جس سے زیادہ متناسب اور باقاعدہ نقش و نگار ہو نہیں سکتے۔ مختلف قسم کے ہوائی پرندوں پر نظر ڈالئے، اور چھوٹی چھوٹی تینکوں کو دیکھئے، جو شام کو اڑتی ہوئی پودوں اور پھولوں پر اُبھرتی ہیں، ان کے پروں میں نقش و نگار، رنگ کا نمونہ، کیسا باقاعدہ، کیسا منظم، کب مرتب، کس درجہ با اصول ہے، ایک معمولی نقش چند لکیریں بھی کیجئے کہ کسی نہ کسی تصویر و نقش کے مقصد کو اپنے سامنے رکھتا ہے، پھر کیا قدرت کی اتنی بڑی نقاشی، محض ایک بے قصد و بے مقصد اتفاق اور ترکیب جیسی ہی کا نتیجہ ہے؟ اور کوئی غرض اور کوئی حکمت اس میں پوشیدہ نہیں؟

علمائے حیوانات، قانون مقایسہ کو رنگوں میں ایک باقاعدہ موثر قانون تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکثر شیر کے خطوط میں ایک ناقابل محسوس نسو یہ اور نظام محفوظ ہوتا ہے، تو اس کی وجہ صرف یہی قانون ہے، جس کے سبب سے اس کے دونوں پہلوؤں میں مماثلت و مساوات نظر آتی ہے۔ بیشک بعض مثالیں ایسی بھی ملیں گی جہاں یہ قانون بظاہر غیر موثر نظر آئے گا۔ لیکن جب زیادہ دقت نظر سے کام لیا جائے گا، تو معلوم ہو جائے گا کہ دراصل وہاں بھی یہی قانون محفوظ ہے۔ مگر کسی غیر طبعی سبب سے (مثلاً، مختلف قسموں کے باہمی اختلاف سے یا گرد و پیش کے بعض موثرات خارجہ سے، یا بعض عوارض اور ان کے توارث وغیرہ) یہ حالت پیدا ہو گئی ہے۔

ہمارے سامنے محققین فائزین کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جس نے ہوا الوان کا غائر تر نظریے مطالعہ کیا ہے، اور اسے محض فزیالوجی کی موثرات کا نتیجہ بے قصد سمجھ لینے پر ہماری طرح قانع نہیں ہے، اس بارے میں ہمیں سب سے زیادہ مشہور معلم چارلس ڈارون کا ممنون ہونا چاہیے، جس نے اپنے سفر امریکہ کے جمع کردہ جانوروں کے متعلق تحقیقات کرتے ہوئے اس موضوع کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد بعض علمائے حال ہیں، جو علم حیوانات کی تحقیق طلب ماہیوں میں تلاش منزل مقصود کے لئے تنگ و دو کر رہے ہیں۔ قانون نشو و ارتقاء یا ڈاروینزم (Darwinism) کا ایک بنیادی مسئلہ (Teleology) ہے جس کا ترجمہ قانون مطابقت کیا گیا ہے، اور تراجم عثمانیہ یونیورسٹی نے اس کا ترجمہ تاثرات وسطا کیا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حیوانات پر ان کے گرد و پیش اور مولود و موطن کے نام حالات کا اثر پڑتا ہے، اور رفتہ رفتہ ان کے اعضاء اور جسم میں تغیرات پیدا کر دیتا ہے۔ جس قسم کی آب و ہوا میں رہتے ہیں، جس طرح کا مکان انہیں ملتا ہے جیسی غذا ان کے اندر جاتی ہے، اُس کے مطابق ان میں جیسی تغیرات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کے مناسب ان کے جسم کی ہر شے ہو جاتی ہے۔

اس قانون مطابقت سے اختلاف الوان کے ایک بہت بڑے سید کا انکشاف ہوتا ہے۔ خود علمائے حیوانات کی تحقیق میں ابھی لکھ چکا ہوں کہ اُشیا کا رنگ ان اجزاء کے رنگ کا نتیجہ ہوتا ہے، جس سے وہ ترکیب پاتے ہیں۔ مثلاً پتہ سبز ہوتا ہے، اس لئے کہ اُس میں کلوروفیل (Chlorophyll) ہوتا ہے، جو سبز ہے، خون سُرخ ہوتا ہے کیونکہ یہ ہیموگلوبین سے ملو ہے، جو سُرخ ہے۔

پس اگر صرف نباتات اور جمادات کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کہہ ارض کے مختلف حصوں میں عالم نباتات اور جمادات کی جس قدر بھی پیداوار ہے، ان کی رنگت ان اجزاء کی وجہ سے ایک خاص قسم کی ہو گئی ہے، جن کی ان حصوں میں قدرت نے کثرت و فراوانی رکھی ہے، اور اسی لئے ہر حصہ زمین میں کسی خاص رنگت کا غلبہ اور احاطہ ہے۔

جب حیوانات ان حصوں میں رہنے لگے تو قانون مطابقت نے جس طرح ان کی تمام جسمانی حالت اور قوی کو ان کے وسط کے مطابق بنا دیا۔



ان کے وجود کو ارد گرد کی چیزوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتیں اور وہ ان کے حملہ سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ گو یا رنگت ان کے لئے ایک بہترین کیم گاہ کا کام دیتی ہے۔

برستان کے اندر جانوروں کو دیکھنا کس قدر مشکل ہے، جن کی رنگت کی سفیدی اور برت کی سفیدی میں کوئی تیز نہیں۔ رنگت ان کے اندر ان جانوروں کو کیونکر پہچانا جاسکتا ہے جو ریت کے کسی ٹیلے کے ساتھ لگ کر لیٹ گئے ہیں، اور ان کی کھال بالکل اسی رنگ کی ہے جو رنگت ریت کی ہوتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جو شکار کے شائق ہیں، اور بسا اوقات جنگلوں میں، سانپ کی نگلی ہوئی دم کو ایک خوشنما اور رنگین پتہ سمجھ کر پکڑ لیا ہے، حالانکہ وہ اس رنگت کا سانپ تھا جس رنگ کے پتوں اور گھاس سے جنگل کا وہ ٹکڑا بھرا ہوا ہے۔

یہ دنیا تنازع بقا کا (Struggle for Existence) میدان کاربزار ہے، اور ہر حیوان اپنے دشمنوں کی بڑی بڑی صعوبتیں اپنے سامنے رکھتا ہے، جو اس کے قرب و جوار میں پھیلی ہوئی ہیں، یا اس فضا میں اُٹتی پھرتی ہیں، جو اس کے اوپر چھلا ہوا ہے، اگر حیوانات کی رنگت اس زمین اور وسط سے مطابق نہ ہوتی جس میں وہ رہتے ہیں، تو ان کے لئے اپنے گھونٹوں سے نکل کر تلاش غذا میں پھرنا اور زندہ رہنا کس قدر مشکل ہوتا۔ لیکن قدرت نے ان کی رنگت کو ان کے وسط کی رنگت کے مثل بنا کر انہیں دشمنوں کی نظر سے آڑ میں کر دیا۔ وہ نکلتے ہیں، زمین پر پھرتے ہیں، ایک درخت سے اُڑ کر دوسرے درخت پر جاتے ہیں۔ لیکن ان کے دشمن اکثر اوقات انہیں پہچان نہیں سکتے۔

اگر ایک طبعی عائد ذائق رکھنے والا قدرت کی نوازش اور مہربانی کے علاوہ کسی دوسری چیز کا بھی طالب ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان حیوانات میں پہلے وہ تمام رنگ پیدا ہوئے، جنہیں علم و خائف الاعضاء کی رو سے پیدا ہونا چاہیے تھا، مگر بعد میں انتخاب طبعی (Natural Selection) کا عمل شروع ہوا جس کے تحت یہ ہیں کہ فطرت صرف قوی، موافق، مناسب، موزوں، اور صحیح و سالم چیزوں کو باقی رہنے دیتی ہے، اور نشوونما کے لئے مچھانٹ لیتی ہے۔ باقی معدوم و نابود ہو جاتے، پس جب یہ انتخاب نافذ ہوا تو صرف وہی رنگ رہ گئے جو ان

اسی طرح ضروری تھا، کہ ان کی رنگت بھی ان کے وسط کے مطابق ہوتی، کیونکہ قالان مطابقت ہر حیوانی انفعال پر موز ہے۔

چنانچہ تحقیقات سے نظر آتا ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حیوانات کی ایک بہت بڑی تعداد کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے جسم کی رنگت بعینہ وہی ہے، جیسی رنگت ان کے گرد و پیش کے درختوں، پھولوں، پتوں، پتھر اور زمین کی ہے، یا ان طبعی موجودات کی ہے، جن سے وہ خطہ گھرا ہوا ہے، علمائے نشو و ارتقاء نے اس حالت کو ایک خاص موثر طبعی تسلیم کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ مماثلت وسط ہے۔ یعنی گرد و پیش سے حیوانات کے جسم کا رنگ ہم آہنگ ہو گیا ہے۔

مثلاً شیرستان میں رہتا ہے۔ اس کا اصلی وطن وہی ہے، گو وہ کسی نا کے اندر یا دریا کے کنارے پر لیٹا ہوا نظر آجائے، پس اسی لئے اس کی کھال کے بالوں کا رنگ دھاری دار خاکی، یا مٹیلا ہوتا ہے۔ بعض شیر لیے ہیں، جو رنگستان میں رہتے ہیں۔ پس ان کی رنگت بھی گرد و آلود زروی مائل اور بالکل ریت کی سی ہوتی ہے۔

قلب شمالی کے دب کی رنگت دیکھی گئی ہے کہ بالکل سفید ہوتی ہے، کیونکہ اس کے وطن کی زمین ہمیشہ برت سے سفید رہتی ہے۔ اسی طرح بیشمار پرند جو درختوں میں آشیانے بناتے ہیں، اور ان کی رنگت بالکل ان پرند کی ہوتی ہے جو ان درختوں کی شاخوں میں لگتے ہیں۔

یہ مماثلت خواہ حیوانات اولیٰ کے پس دار جسم کے ساتھ خارجی جزاء ارضیہ کے مل جانے کا نتیجہ ہو، جیسا کہ علمائے وظائف الاعضاء کا قول اور لکھا جا چکا ہے۔ یا کسی مخفی قالان طبعی کا نتیجہ۔ مگر بہر حال قالان نشو و ارتقاء کے علماء تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے اندر بعض بیش بہا مٹانخ اور حکمتیں نظر آتی ہیں۔

از آنجہ ایک حکمت جس تک فہم انسانی دسترس پاسکی، یہ ہے کہ یہ مماثلت حیوانات کی زندگی کے بقا اور دشمنوں سے حفظ کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے، یہ اگر نہ ہوتی تو ہزار ہا حیوانات دنیا سے نابود ہو جاتے ہیں، اس مماثلت کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں اور اپنے سے قوی تر حیوانات کی نظروں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کی رنگت اور ان کے گرد و پیش کی اشیاء کی رنگت ایک ہی ہے، اس لئے ان کے دشمن کی نظر سے

وسط اور محیط کے مناسب تھے۔ اور بقیہ سب رنگ بہت سے اعضاء کی طرح  
ناپید ہو گئے۔

اس سے بھی بڑھ کر اختلاف الوان کے مصالح کا پتہ دوسرا اس  
نظر سے لگتا ہے۔ جسے انتخاب جنسی (Sexual Selection) کہتے ہیں۔  
خواہ اسباب کچھ ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہر قسم کے حیوانات کی  
خاص خاص اور الگ الگ غذا میں ہیں، علم وظائف الاعضاء کی رو سے  
جسم پر جن چیزوں کا اثر پڑتا ہے، ان میں ایک بڑی شے غذا بھی ہے، غذا  
کا اثر رنگ پر بھی ہوتا ہے، جو بقدر استعداد طبعی کم و بیش ہوتا رہتا ہے،  
چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ حیوانات کی غذاؤں کے رنگ اگر روشن ہیں تو خود  
ان کے جسموں کے رنگ بھی روشن ہوتے ہیں، اگر غذا کا رنگ تاریک ہے  
تو خود ان کا رنگ بھی تاریک ہے۔ مثلاً طوطا زیادہ تر پھل کھاتا ہے، اس  
لئے اس کا قیام پھل والے درختوں میں رہتا ہے۔ درختوں کے رنگ ٹھونا  
روشن ہوتے ہیں، اس لئے اس کا رنگ بھی روشن ہے، یا بعض قسم کی  
کھیاں ہیں، جو گندھی جگہ پر رہتی ہیں، اور سبباًست پر زندگی بسر کرتی  
ہیں۔ جس کا رنگ تاریک ہوتا ہے تو خود بھی ان کا رنگ تاریک ہو جاتا  
ہے۔

ایک عرصہ کے استعمال سے جانوروں کو اپنی غذاؤں کے رنگ سے  
ایک خاص قسم کی موافقت ہو جاتی ہے، اس لئے جب ان کی تناسلی خواہش  
میں حرکت ہوتی ہے۔ تو دوسری جنس کے انہیں افراد کی طرف بالخصوص زیادہ  
مائل ہوتے ہیں۔ جن میں ان کی غذاؤں کے رنگ زیادہ نمایاں ہوتے ہیں،  
یہی شے ہے جس کو انتخاب جنسی (Sexual Selection) کہتے ہیں،

پس جس طرح قانون ارتقاء کا انتخاب طبعی ایک مدت بہ مدت کے بعد پوری  
نوع کی نوع میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح انتخاب جنسی بھی انواع  
کے رنگ پر جبروت انگیز تغیرات طاری کر دیتا ہے۔

بہت سے جانور ایسے ہیں، جن کے رنگ عام طور پر تو معمولی حالت  
میں رہتے ہیں۔ مگر جب ان کے تولید و تناسل کا موسم آتا ہے، اور زاور  
مادہ کی ایک جاتی ضروری ہوتی ہے، تو رنگوں میں ایک دلغریب چمک  
دھمک اور ایک خاص رونق و حسن پیدا ہو جاتا ہے، حیوانات کے بعض  
انواع یعنی گہو تر، فاختہ، مور وغیرہ ایسی ہیں جو اتحاد و تناسلی سے پہلے  
اپنی مادہ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے مستانہ رقص و تہجد کرتے ہیں،  
اور اپنے پردوں کے دلغریب رنگوں کی ایک خاص انداز سے نمائش کرتے  
ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر ایک خاص دلغریب و رعنائی کی کشش  
پیدا ہو جاتی ہے، جو بے اختیار مادہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور جذبہ  
طبعی کے لئے اختلاف الوان ایک بہت بڑا معین خارجی بن جاتا ہے۔  
غرضیکہ حیوانات کی جنسی خواہش پر رنگوں کا اثر پڑتا ہے۔ اور زیادہ  
ترہ ہی رنگ موثر ہوتے ہیں، جو محبوب۔ دلغریب۔ نظر افزہ و دلپسند  
ہوتے ہیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ حیوانات کی نسل کی افزائش و حفاظت  
کے لئے قانون انتخاب جنسی اپنا کام کرتا رہتا ہے اور حیوانات کی رنگت  
ایک بہت بڑے مقصد حیات کو پورا کرتی ہے۔



دنیا میں دنیا پر آنے والے  
آئے جا رہے ہیں گے روز جانے والے  
عزیزان حیات ہو مبارک شہید  
اسے شدت غم پر شکر آنے والے

مشرقی دنیا پر چاہیں مجھ کو زنجیر  
تقصیر  
آواز تو دو کوئی، کدھر میں آخر  
اک بندہ مجبور کی آخر  
ماحول دورانت و شربت و تقدیر  
چویش

# حق بحق دارر سید یالیر ابادشاہ

عبدالواسع عصری چنگلوری

افراد ڈراما

بادشاہ۔

فرخندہ یاحسینہ۔ بادشاہ کی بیٹی۔

نوجوان۔

نوجوان۔ شراب کھنچی جا رہی ہے یا کسی انسان کی کھال؟  
ڈاکو۔ تم کون ہو؟

نوجوان۔ پیسے میرے سوال کا جواب دو۔  
ڈاکو۔ تمہارے سوال کا جواب (کوڑے دکھا کر) ان سے دیا  
جائے گا۔

نوجوان۔ اے بیٹریے کا دل رکھنے والے شیطان! شرم کرو، اور  
اس حسینہ کی مشکیں کھول دو۔

ڈاکو۔ اے نوجوان! آنکھوں کی گرد صاف کر اور غور سے دیکھ

پھر سمجھ لے کہ —

نوجوان۔ (گوڑے سے اتر کر) خبردار (ریو اور نکال کر) پھر دوسرا

لفظ دہان سے نکلا تو سمجھ لو کہ خیر نہیں۔ (ڈاکو ڈرجاتے ہیں۔ اور بھاگنے

کی کوشش کرتے ہیں۔ نوجوان حسینہ کے سینے کی رستی کھوتا ہے۔ ڈاکو

فرار ہو جاتے ہیں۔ نوجوان بے ہوش حسینہ کو ایک چٹھے کے قریب لے

جاتا اور زخم دھو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسینہ کو ہوش آتا ہے)

حسینہ۔ (آنکھیں کھول کر) کون — انسان یا فرشتہ۔

نوجوان۔ میں فرشتہ نہیں بلکہ فرشتہ سیرت انسان کا غلام۔

حسینہ۔ آپ نے میری جان بچائی۔

نوجوان۔ نہیں، بلکہ خدا نے۔

## پہلا ایکٹ

منظر اول۔ صحرا کا ان دودق میدان، جنگلی ڈاکو ایک حسین دوشیزہ  
کو مار پیٹ کر رہے ہیں، وہ آہ و نالہ کر رہی ہے، ایک نوجوان گھوڑے پر سوار  
اُسی راستے سے گزرتا ہے اور رونے کی آواز سن کر گھوڑا کھڑا کر کے ادھر  
ادھر نظر ڈالتا ہے، یکایک اُس کی نگاہ چند درختوں کے جھنڈ پر پڑتی ہے۔  
نوجوان۔ آہا ہا۔ غم — ایک بکس پر، کمزور بہتی پر — کس قدر  
سنگدل ہیں یہ دنیا کے لوگ — کیا کیا جائے (سوچتا اور اپنے  
ریو اور کو نکال کر دیکھتا ہے) ان لوگوں کی تعداد بہت ہوگی — اور میں  
تمہارا ان کا مقابلہ — ناممکن — (پھر کچھ سوچنے کے بعد) نہیں — میں  
انسان ہوں — مجھے مغلوم کی حمایت کرنی چاہیے۔ یہ میری زندگی کا فرض  
ہے۔ (اٹھتا ہے، ریو اور ہاتھ میں لئے ہوئے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا جا بیٹے  
دوڑے پر پہنچتا ہے۔ تھوڑے ڈاکو گھوڑے کے ٹالوں کی آواز سن کر فرار ہو جاتا  
ہے۔ پہلی آستینائی رنگینہ کو مار رہے تھے پھر رہے رہتے ہیں۔)

حسینہ۔ آہ۔۔۔ تم کتنے خوبصورت ہو

نوجوان۔ خوبصورتی، ظاہری خط و خال میں نہیں۔۔۔ دل کی صفائی اور نیک افعال میں ہے۔ آہ۔۔۔ انسان کتنا ظاہر میں ہے، خدا یا ان فریبوں، میکینوں، اور مخلوقوں کا کیا حال ہو گا جو خوبصورت ہونے پر بھی، کالی گٹا میں چاند کی طرح منہ چھپائے بڑی ہیں (حسینہ کی طرف دیکھ کر آپ اپنا ٹھکانا بتا دیجئے، تاکہ میں آسانی سے وہاں پہنچا دوں۔ حسینہ۔ آپ کا نام کیا ہے اور کہاں کے باشندے ہیں۔

نوجوان۔ یہ نہ پوچھئے کہ میں کون ہوں؟

حسینہ۔ آپ کے احساظ کا بھاری بوجھ مجھے شرمندہ بنا رہا ہے، نوجوان۔ بے شک، مگر میں مجبور ہوں، اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا حسینہ۔ تو کیا آپ مجھ کو مایوس کرنا چاہتے ہیں۔۔۔

نوجوان۔ معاف فرمائیے۔ میں ایک پراسرار زندگی بسر کر رہا ہوں، میری زندگی کی کشتی دلمے کے سسل مادوں کا ٹکڑا ہو رہی ہے۔ دشمن میری گھات میں ہیں، اللہ سے امید رکھئے۔ اگر آپ میری سچی قدر کر رہی ہیں تو وہ ہیں مزدور ملا دے گا۔

حسینہ۔ آہ کتنی دل دکھانے والی بات ہے۔

نوجوان۔ بات بنیں ممتا ہے، اچھا چلئے۔ جلد اپنے گھر کا پتہ بتا دیجئے۔ حسینہ۔ میں عراق کے ایک سردار کی بیٹی ہوں۔ اور بصرہ میرا شہر ہے۔ نوجوان۔ میرے گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ اس کے سوا اور کوئی صورت اس وقت ممکن نہیں۔ نوجوان حسینہ کو گھوڑے پر سوار کر کے، رداخ ہو جاتا ہے، اور لڑکی کو اس کے مکان میں پہنچا کر خدا حافظ کہتا ہوا نکل جاتا ہے۔

## دوسرا منظر

بصرہ کا ایک تنگ و تاریک کوچہ، رات کا وقت ہے، فضا خاموش ہے۔ نوجوان کا اس کوچے سے گزرتا ہوا ہے۔ ایک گھر کا سارا کتبہ باہر نکل کر بے سہ سامانی کا ڈھکڑا رہا ہے۔ نوجوان وہاں پہنچ کر حالات پوچھتا ہے، نوجوان۔ بتا اے مرد غریب! کس سیاح کار کے ذہر آلود ناخن نے تیرے دل کو زخمی کیا ہے۔

لوڑھا۔ بھائی! میں ایک غریب کسان ہوں۔ سرمایہ دار زمیندار نے

مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے، اُس نے میری ساری جائیداد اپنے فرض میں ضبط کر لی ہے، آہ میرے ننھے ننھے بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ آہ۔۔۔ ان کمزور ہاتھوں اور کندھوں میں اتنی طاقت کہاں کہ بوجھ ڈھو کر ان کے لئے دال بھات کا سامان کر دوں۔

نوجوان۔ خدا یا کتنا درد انگیز نظارہ ہے، اُس امیر کا مکان کہاں ہے۔ لوڑھا۔ یہی گلی کے قریب بڑی سڑک کے وسط میں ایک مالیشان کوٹھی ہے۔

نوجوان۔ ٹھہرو۔۔۔ میں ابھی آتا ہوں۔ (نوجوان جاتا ہوا سڑک پر پہنچ کر گھوڑے کو چھوڑ دیتا ہے، اور سیاہ لباس پہن کر ریو الو رہائے میں لئے ہوئے چھپتا ہوا، کوٹھی کے بالائی حصے پر چڑھ جاتا ہے۔ کتبے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ شمع جل رہی ہے۔ امیر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کئی دال کا مطالعہ کر رہا ہے، نوجوان کمرے میں داخل ہو کر ریو الو راگے بڑھاتا اور کہتا ہے)

نوجوان۔ خاموش رہنا، زبان سے کوئی لفظ نہ کہئے، (امیر مڑ کر دیکھتا اور گھبرا جاتا ہے، پکارنے کی ناکام کوشش کرتا ہے، مگر نوجوان ریو الو کی نال سینے سے لگا دیتا ہے)

امیر۔ تو کیا چاہتا ہے۔

نوجوان۔ روپیہ اور کاغذات۔

امیر۔ کتنا اور کاغذات کیسے؟

نوجوان۔ غریب کسان کی جائیداد کے کاغذات اور پانچ ہزار روپیہ

امیر۔ یہ میں نہیں دے سکتا۔

نوجوان۔ تو موت کے پنجے سے بھی نہیں چھوٹ سکتا۔

امیر۔ تو کون ہے،

نوجوان۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔

امیر۔ ظالم! تو چور ہے، ابھی پولس کو خبر کر دوں گا۔ کسی کو پکارنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر نوجوان اس کو گھونسنے مار کر دم بخود کر دیتا ہے اور اپنی ترسی سے امیر کو ستون سے باندھ دیتا ہے، پھر تنگ سے کنبیوں کے گچھے کو اٹھاتا اور الماری کھول کر روپے کاغذات کی گڈی اٹھالے جاتا ہے، اور غریب کسان کے گھر پہنچ کر کہتا ہے۔

نوجوان - (تھیلی سامنے رکھتے ہوئے) یہ تو کافذات اور روپوں کی تیلی۔  
کسان - (خوش ہو کر اسے غریبوں کے دلوں پر راج کرنے والے زخمی جگر پر رحم رکھنے والے یہ تو بتاؤ کہ تم جو کون؟  
نوجوان - یہ نہ پوچھو۔ مگر خبردار! یہ راز کسی پرناش ہونے دینا۔ خدا حافظ۔ (باہر نکل جاتا ہے)

## تیسرا منظر

سراٹے

سراٹے میں مسافروں کا تانا لگا ہوا ہے۔ سراٹے کا داروغہ صدر دروازے میں بیٹھا ہوا ہے۔ انہیں مسافروں میں ایک بڑھیا ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ سراٹے میں داخل ہونا چاہتی ہے۔  
بڑھیا - داروغہ صاحب ہیں اس سراٹے میں ایک رات بھرنے کی اجازت دیجئے۔ میں مصیبت کی ماری ہوں۔ سردی سے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہیں۔  
داروغہ - جا جا۔ بڑی آئی آرام کرنے۔ کیا سراٹے تیرے باپ نے بنوائی تھی۔  
بڑھیا - ارے بابا! سراٹے تو مسافروں کے لئے ہے۔ خدا کے لئے مجھ غریب پر رحم کھاؤ۔

داروغہ - جا جا۔ مسجد میں جا۔ رحم کی درخواست ملاؤں سے کر لڑکی۔ کیا سراٹے غریبوں کے لئے نہیں ہے؟  
داروغہ - اری مغزور لڑکی! اگر سراٹے میں رہنا پسند کرتی ہے تو یہ بتا کہ تو نے کسی سے آنکھیں لانا بھی سیکھی ہیں؟  
لڑکی - یہ سراٹے ہے یا کسی بازار۔ شاید تم بازاروں کے ٹھیکیدار ہو، سراٹے کے نگراں نہیں۔

داروغہ - اری بد زبان لڑکی۔ اپنی عزت اور عصمت کی خبر چاہتی ہے تو یہاں سے نکل جا۔ ورنہ۔

لڑکی - ایک شرپن لڑکی تیرے سے ثبوت پرستوں کے دماغ کی کلیں دھبی کر دے گی۔ مگر اپنے دامن عصمت پر دھبہ آنے دے گی۔ سمجھتا کیا ہے؟  
داروغہ - (غصے سے) اپنا ڈنڈا اٹھاتا اور مارنا چاہتا ہے کہ ایک

نوجوان فوراً داروغہ کا ہاتھ تمام لیتا ہے۔

نوجوان - عورتوں پر مرد ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ مسلمان کبھی بکس و مظلوم کا دل نہیں دکھاتے، زخمی شیر کو بچھاؤ کر، مرنے والے کو مار کر اپنی بہادری کا دعویٰ نہیں کرتے، البتہ ایک کمزور عورت پر لاشی چلا کر اپنی فوقیت بھگانا اور اپنا رتبہ بہادری بڑھانا چاہتے ہیں یہ اچھا نہیں۔ آہ آج کل کمزوروں پر دباؤ ڈال کر اپنا مطلب نکالنا اور اپنے ہم قوموں کا گلا گھونٹ کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا، کاسیابی کی کبھی سمجھا رہا ہے۔

داروغہ - آخر تو کونسا امیر زادہ ہے۔

نوجوان - سمجھ کر یہ پوچھے گا کوئی حق نہیں۔ اگر تو مسلمان ہے عورتوں کی تعلیم کر اور ان کے لئے آرام کا سامان کر۔

داروغہ - میں نے تیرے سے مسلمانوں کو بہت دیکھا ہے۔ ہوٹلوں کے بھٹیادار، تم کو عورت بچوں سے کیا غرض، ہوٹلوں کی وال روٹی، پردہ بیک کی عاشقی، تیار ادن رات کا مشغلہ ہے اور ہمارے ہی منہ پر اپنی بڑائی۔  
نوجوان - کیا تو اس بڑھیا پر رحم نہیں کھائے گا۔

داروغہ - نہیں، ہرگز نہیں۔

نوجوان - دیکھ، اومردم آزار دیکھ! بڑھیا سردی سے کانپ رہی ہے۔

داروغہ - وہ مر جائے یا جئے۔ جہنم میں جائے یا جنت میں میری کیا۔

نوجوان - لعنت ہے تیری سلفانی پر۔ تو چاہتا کیا ہے؟

داروغہ - دام

نوجوان - کتنے

داروغہ - ایک مات کے پانچ روپے

نوجوان - ے (جب سے پانچ روپے نکال کر پھینکا ہے) اگر

ان کا ذرا بھی بال بیکا ہوا تو پھر تیری جان کی خبر نہیں۔ سنا

داروغہ - میت اچھا۔

نوجوان - (دو لڑائی عورتوں کو کمرے میں داخل کرتا ہے) اور سراٹے

سے باہر نکلتے ہوئے داروغہ سے کہتا ہے) ذرا سنبھل کے رہنا، کل ہی دن

تجہ پر بھی آنے والا ہے (چلا جاتا ہے)

چوتھا منظر

جوان - مگر غبردار۔ یہ ماذفاش ہونے پائے۔

## دوسرا ایکٹ

### پہلا منظر

محل - دربار۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا ہے۔ فریادیں سنی جا رہی ہیں۔ مندا صاحب۔ امرا اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہیں، یکایک کسی کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

امیر - ڈہائی ہے۔ دہائی، ہائے میں ٹٹ گیا، برٹ گیا۔

بادشاہ - (کو تو ال سے) ایہ شور کیسا، دیکھو کون ہے۔

کو تو ال - ہاں حضور! ایک فریادی ہے۔

بادشاہ - حاضر کرو۔ (کو تو ال اُس کو لاتا ہے) کیا حال ہے، کیوں پریشان ہو۔

امیر - جہاں پناہ! کیا بتاؤں۔ زندگی بھر کی ساری کما چاندیوں میں ایک چور کے حوالے ہو گئی۔ امیرانہ ٹھاٹھ جاتے رہے، نان شبینہ کا محتاج ہو گیا ہوں۔

بادشاہ (کو تو ال سے) یہ کیا ماجرا ہے۔ پائے تخت اور یہ اندھیر لگا۔ کو تو ال - حضور عالی! جان بخشی ہو تو پورا قلعہ عرض کروں۔

بادشاہ - کیا تم نے اب تک اُس چور کا پتہ نہیں لگایا؟

کو تو ال - لگایا کیوں نہیں، عالی جاہ! قدم قدم پر جاسوس مقرر ہیں، چور کو پکڑ کر لانے پر انعام کا اعلان بھی سارے شہر میں کراؤ کیا ہے، مگر افسوس ساری تدبیریں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔

بادشاہ - وہ کیسے؟

کو تو ال - بات اصل یہ ہے کہ وہ چور نہیں بلکہ غریبوں، بخلوں

بے کاروں، زمینداروں کی شیخ امید ہے۔ شہر کے غریب طبقے کی کھیتی اُسی

سے پھری بھری ہے۔ وہ ملک کے بیکار طبقے میں تل کا محرک بن کر بھلی کی

طرح کرتا ہے۔ بخلوں کے تازہ زخم اُسی سے مند مل ہو رہے ہیں۔ مگر امیر

اور سرکاری طبقہ اُس سے نالاں ہے۔ میں مجبور ہوں۔ لاکھ متن کے مگر

شران نہیں ہن۔

بادشاہ - کیا راتوں میں سپاہی شہر میں گشت نہیں کرتے۔

سراٹے سے تھوڑے فاصلے پر داروغہ کی کوشی، داروغہ بستر لیٹا ہوا ہے،

نوجوان آجی رات میں سپاہ لباس پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

داروغہ گھبرا کر اٹھ جھپٹتا ہے،

داروغہ - کون - چور - رحم - رحم - خدا کے

سے رحم

نوجوان - درندوں میں رحم کا مادہ نہیں ہوتا۔

داروغہ - تو چاہتا کیا ہے،

نوجوان - کرایہ

داروغہ - کس کا، کیسا، اور کتنی

نوجوان - کمرے کا۔ پانچ ہزار روپے

داروغہ - افسوس، بڑا پھنسا

نوجوان - اس وقت جب کہ جناب عدالت کی کرسی پر تشریف فرما تھے

داروغہ - مجھے معاف کیجئے۔

نوجوان - دام کے بغیر معافی نہیں مل سکتی

داروغہ - ہائے میں ٹٹ گیا، برباد ہو گیا۔

نوجوان - کیا ٹیڑھے بھی کہیں لٹے ہیں۔ محنت کی کئی تھوڑی سی

بے جرم اجاتا ہے کجنت!

داروغہ - دیکھو تم چور ہو۔ آخر ایک نہ ایک دن پھنسرے

اُس وقت میں کام آؤں گا۔

نوجوان - میں ایک غلام ملک کے غلام انسان سے مدد کی درخواست

نہیں کرتا۔ لوٹری بھی کہیں کسی کے کڑے وقت میں کام آتی ہے۔

داروغہ - مجھ پر رحم کرو۔

نوجوان - آج کل دام کی قدر رحم سے بڑھ کر ہے، روپیہ دو۔

ورنہ تھاری جان کی خیر نہیں۔

داروغہ باطل تاخیر سے اٹھتا اور صندوق کھول کر روپوں کی تیلی چور

کے حوالے کرتا ہے، نوجوان لے کر سیدھا سراٹے کے کمرے میں داخل

ہوتا اور بڑھیا سے کہتا ہے: یہ لو اماں! (روپے کی تیلی پیش کرتے ہوئے)

مجھ سراٹے سے نکل کر کہیں آرام کی زندگی گزارو، یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

بڑھیا۔ خدا پر ہرجا کرے۔





ہمارے رحمت پر نثار۔ آہ اگر دنیا کے سنگدل امیر جو کموں کی طرح خون چوسنے والے سرمایہ دار غریب کی سچی ہمدردی کرتے تو مجھے یہ ناروا پیشہ اختیار نہ کرنا پڑتا۔ آہ انسانیت بھڑپے قوم و ملت کے نام پر مہذب ڈاکے ڈال کر اپنی جوی بچوں کا پیٹ پالنے کی بجائے قوم کی صبح بھنائی کرتے تو آج یہ روز بد دیکھنا نصیب کیوں ہوتا۔ میں بدنام ہوا۔ سوسائٹی کے قابل نہ رہا۔ مگر مطمئن ہوں کہ میری زندگی کا ہر لمحہ قوم کی آسودہ حالی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی طرح سود ثابت ہوا۔ اب اگر کپڑا بھی جاؤں اور قتل بھی کر دیا جاؤں تو مجھے غم نہیں۔ میں خوشی سے موت کا پیار پینے کے لئے تیار ہوں (کو تو ال اسی جھل میں سپاہیوں کو لے آتا اور چھپا دیتا ہے۔ نوجوان ہنسی پر معزوم جھپٹا ہوا کچھ سوچ رہا ہے، دور سے کسی کے رونے کی آواز آتی ہے۔ نوجوان گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا اور کہتا ہے) شکر ہے کہ میری زندگی کا آخری لمحہ بھی ————— (پھر گھبرا کر) ————— یہ دھوکا تو نہیں دیا جا رہا ہے ————— (سوچتے ہوئے) ساری زندگی انہیں کاموں میں مصروف ہوئی ہے۔ آخری وقت میں کیوں گھبراؤں اگر یہ دھوکا بھی ہے تو اللہ میرا حامی و ناصر ہے (درخت سے کودتا اور آواز کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر سپاہی اس کو گھیر لیتے ہیں۔ نوجوان چپ چاپ اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتا ہے، سپاہی اور کو تو ال اس کو زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جاتے ہیں۔)

### تیسرا منظر

محل کا پائیں باغ، سپاہی اور کو تو ال قیدی کے قریب کھڑے ہوئے ہیں۔ بادشاہ چند مصاحبوں کے ساتھ باغ میں آتا ہے، شاہزادہ فرخندہ اپنے کمرے میں کھڑی ہوئی کھڑکی سے دیکھ رہی ہے۔ بادشاہ۔ اُت، یہ قیدی ہے یا یوسوں کا مرتع۔ قیدی۔ مایوسی مذہب اسلام میں کفر ہے۔ بادشاہ۔ اوہو دیکھو تو آج تم کس قدر مجبور ہو۔ قیدی۔ ایک بہادر موت کے آخری اور تلخ لمحوں میں بھی خوش رہتا ہے۔

بادشاہ۔ وہ دھکی جوت نے مجھے دی تھی یاد ہے۔ قیدی۔ جی ہاں۔ وہ دھکی بنیں مٹی بلکہ حضور کو حقیقت سے آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔

بادشاہ۔ کیا حکومت کے آگے بھی کسی کا زور چلتا ہے۔ قیدی۔ بیشک حضور حکومت سے بڑھ کر کسی ایک طاقت ہے۔ بادشاہ۔ آج وہ غریب کہاں ہیں جن کی مدد پر تو ————— قیدی۔ وہ غریب تو یہاں نہیں، لیکن ان کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ بادشاہ۔ (ناتشہ منہ میٹھتے ہوئے) بے وقت۔ ہنگامہ کبیں کا۔ قیدی۔ بچے وہ ہیں جو اپنے چند روزہ جاہ و جلال کو عزت و مرتبہ کو دنیا کی ظاہری چیزوں میں ڈھونڈتے ہیں۔

بادشاہ۔ مگر آج کھنکمرے پنچے سے کون چھڑا سکتا ہے قیدی۔ وہی جس نے خیل کو نرود کی آگ سے، موسیٰ کو فرعون سے، یوسف کو کنوئیں سے نکالا تھا۔

بادشاہ۔ کیا تو پنیر کی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ قیدی۔ قدرت کی حقیقت اور اپنے ایمان کا اعتراف کر رہا ہوں۔ بادشاہ۔ تیری موت رسوائی کے ساتھ عمل میں آئے گی۔ قیدی۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ بادشاہ۔ یہ بات ہے قیدی۔ جی ہاں۔

بادشاہ۔ (کو تو ال سے) سارے شہر میں اس کی موت کا اعلان کرا دو۔

کو تو ال۔ (ادب سے) عالی جاہ، مصلحت اسی میں ہے کہ اسی کی موت خاموشی سے عمل میں لائی جائے۔ ورنہ بغاوت کا اندیشہ ہے۔ بادشاہ۔ اچھا تو اس کو ابھی سو لی پر چڑھا دو۔ (کو تو ال اور سپاہی قیدی کو سو لی پر چڑھاتے ہیں۔ فرخندہ فوراً اپنے ترکش سے تیر کھینچتی اور تاک کر سو لی کی رسی پر نشانہ لگاتی ہے، رسی ٹوٹ جاتی ہے)

بادشاہ۔ (حیران ہو کر) یہ کیا؟ قیدی۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ — — — بادشاہ۔ پھر چڑھاؤ اس مردود کو۔ (سپاہی قیدی کو ڈار پر کھینچتے ہیں۔ دوسرا تیر سننا تا ہوا آتا اور رسی کو کاٹ دیتا ہے) بادشاہ۔ یہ جادو کا زور ہے یا رسی مکرور ہے۔ قیدی۔ صرف قدرت کا کھیل ہے۔



بادشاہ۔ اس کو پھر دوبارہ لڑ چھوڑ دست (قیدی سولی پرے  
جایا جاتا ہے۔ تیسرا تیر پھر آتا ہے اور تسی کو کاٹ دیتا ہے۔ ساتھ ہی ایک  
کاغذ بھی گرتا ہے، بادشاہ چھٹی کو جھٹ سے اٹھا کر کوڑا ل کو پڑھنے کے لئے  
دیتا ہے، کوڑا ل پڑھتا ہے (یہ ہے گناہ قیدی ہے۔ حقیقی مجرم میں ہوں اور  
ابھی حاضر ہوتا ہوں۔)

بادشاہ۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ (کوڑا ل سے) تم نے مجھے دھوکا  
دیا۔ (آن کی آن میں کالی گھٹا چھاتی ہے۔ سبکی کو نڈتی ہے، اتنے میں  
ایک حسین دوشیزہ برقع اوڑھے ہوئے بادشاہ کے سامنے آ کر کھڑی  
ہو جاتی ہے)

بادشاہ۔ (گہرا کھم کون ہو۔)

اجنبی۔ آپ کو ابھی ابھی معلوم ہو جائے گا۔

بادشاہ۔ کس لئے آئے ہو۔

اجنبی۔ حضور کا وعدہ یاد دلانے کے لئے۔

بادشاہ۔ میں نے کیا وعدہ کیا تھا اور کب؟

اجنبی۔ غور کیجئے۔ سوچئے

بادشاہ۔ مجھے یاد نہیں آتا۔

اجنبی۔ کیا یاد دلانے پر پابند رہیں گے حضور!

بادشاہ۔ ضرور

اجنبی۔ اس شخص کا بھر دسا ہی کیا جس نے دولت کے لالچ میں خفتی۔

بادشاہ۔ (حیران ہو کر آئین — کیا کہا — جلد بتاؤ

اجنبی۔ قسم کھائیے

بادشاہ۔ میرے تاج دسر کی قسم، اللہ جلد بتاؤ

اجنبی۔ صحرائی ڈاکوؤں سے جس وقت تمہکو —

بادشاہ۔ کون — فرخندہ — میری بیٹی — افسوس۔

(فرخندہ برقع اتار کر آنکھیں نیچی کئے ہوئے بت کی طرح کھڑی رہ جاتی ہے،

قیدی اس کو غور سے دیکھتا اور یکایک چنگ مار کر بادشاہ کے ہاؤں پر گر

جاتا ہے۔ بادشاہ اس کو اٹھانے کے لئے ٹھٹھکتا ہے، اور اس کے گھٹے کی

سہری زنجیر دیکھ کر جلا اٹھتا ہے) آہا ہا — فیروز — میرا بھتیجا —

(فیروز ہوش میں آتا اور ایک طرف ادب کے ساتھ کھڑا رہ جاتا ہے)

فیروز۔ ہاں میں وہی گنہگار فیروز ہوں جو جلاوطن کر دیا گیا تھا، حضور

بادشاہ۔ (آنسو بہاتے ہوئے) آہ بیٹا، خدا کے لئے مجھے شکوہ میری

خفاؤں کو بخش دو، میں مجرم ہوں، ہوس دولت اور خواہش تاج نے مجھے

اندھا کر دیا تھا — آہ کس قدر ظالم ہوں میں۔ بیٹا! یہ لڑ (تاج کو پہناتا

ہوئے) تمہارا تاج، جس کے تم حقیقی وارث ہو۔ (فرخندہ کا ہاتھ میں ہاتھ

دے کر آج سے یہ تمہاری ملک ہے۔

بادشاہ جاتا ہے، درباریوں پر سناٹا چھاتا ہے اور یہ آواز گونج جاتی ہے۔

عجب دنیا ہے یہ کھلتا نہیں راز اس کی قدرت کا

ابھی دوزخ کا منظر تھا، ابھی نقشہ ہے جنت کا (محوی)

خوشن بزرگ سبکدوشی  
مہربازی ساغر چھلک جاتے گی  
جھکے تو یہ دوزخ کو ڈال دیتی گی  
جہنم اتنی جلدی جلدی جاتے گی

چرخ میں خوشی کا راج دیکھا میں نے  
پھر فرقہ خیزوں پہ تاج دیکھا میں نے  
پہلے جو سفر سے تم نواک غم کے جب  
انہی جانب بھر چراج دیکھا میں نے

# ہندوستانی ادب میں بین الاقوامی نقطہ نظر کی ضرورت

ترقی پسند ادیبوں سے ایک گزارش

احمد حسین۔ آلہ آباد یونیورسٹی

آج ہندوستان ایک طعنے انقلاب کے دروازوں پر کھڑا زور آزمائی کر رہا ہے جو نہ معلوم کس وقت کھل جائے اور سارا ملک تہ و بالا ہو جائے۔ خود اس ظلم کے سر پر جو ہمارے سماج کا سنگ بنیاد ہے، تخریب اور فنا کی جہم بھیا کوند رہی ہیں جو اگر نہ معلوم کب اسے خاک تر کر دیں۔ بھوک، غزبت اور بیکاری کے سوال کو اٹھنے والا نہ کہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، لیکن یہی سوال اتنی اہمیت حاصل کر چکا ہے کہ آج ہمارے تمام سیاسی، معاشی اور اقتصادی سوالوں کا مرکز بن گیا ہے، اور ہندوستان کی آزادی کا سوال ایک جذباتی سوال نہیں بلکہ یہاں کے مفلس اور بے بس ترین طبقوں کی اقتصادی آزادی کا مسئلہ ہو گیا ہے، المختصر یہ افلاس ہی کے تہ جھونکے ہیں جو سینہ ہندوستان میں بھڑکنے والے شعلہ انقلاب کو تیزی سے ہوا دے رہے ہیں۔

ہمارا ادب بھی جو حیات قومی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کرتا ہے ان انقلابی محرکات سے بخوبی متاثر ہوا ہے۔ ہمارے شاعروں کے خیالات ہجر و دھل اور ساعر و مینا کی خاک فضا سے نکل کر مفلس کے دل کو بھونک دینے والی آگ کے شعلوں میں کود پڑے ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار اور ناول نویس حشرآ کے قہر، آرمسٹریلن، برقی روشنی، گلاب گھر اور رومانی واقعات کے تذکرہ کے بجائے گلاؤں میں پھونسنے کے کچے جھوٹے، بکھتے جواخ۔ لاغر بلی شکستہ، زمیندار کے ظلم، طوفان اور طغیانی کی بربادی، روٹی کی فکر، امر امن کی تکلیف وہاں کی پریشانی، محنت، مزدوری اور پھر بھی فاقہ مستی وغیرہ کی انانک

داستانیں ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اور اپنی ترقی پسند رجحانات میں ہم کو اردو، ہندوستانی زبان کی بقا اور ترقی کا ایک خوشگوار مستقبل نظر آ رہا ہے۔ کیونکہ زندگی کی لحاظ بہ لحاظ متحرک حالتوں کے ساتھ ہم اس زبان کو بدلتا ہوا پاتے ہیں۔ اور اس کے ادب میں اپنی حیات مجددہ کے مختلف نقوش اس قدر کامیابی کے ساتھ منعکس ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

یہ سب درست، اور ہم کو ان خوشگوار علامات سے ایک گونہ اطمینان بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارے مصنفین کا بیشتر حصہ اپنے بناؤٹی اور ناقابل تعبیر خواب سے بیدار ہو کر عصر حاضر کی زبردست اور طوفانی حقیقتوں سے آنکھ ملانے کی اب بھی جرأت نہیں کر سکا ہے۔ پھر بھی اردو، ہندوستانی ادب میں عوام سے ہمدردی اور ان کی زندگی کی ترجمانی کے جو جراثیم پیدا ہو چکے ہیں کافی امید افزا ہیں۔ لیکن حیات قومی کے ان تمام زندہ مسائل کو سمجھنے اور ان کی صحیح ترجمانی کرنے کے باوجود ہمارے شاعر اور نگار ایک بڑی زبردست، جیاد اور اہم ترین حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یا شاید ان کی نظروں نے اس کے دور رس نتائج کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اور ان کے خیالات اس کی انقلابی قوت کا اندازہ نہیں کر سکے ہیں۔

غالباً ہمارے ادیب ابھی اس چیز کو محسوس نہیں کر رہے ہیں، کہ ظلم و تشدد کے خلاف، بیکاری، تنگدستی اور فاقہ مستی کے خلاف، سیاسی غلامی، تہی پامالی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف، شہنشاہیت، استبدادیت اور

مزد ہے۔ لیکن پھر سبھی اس کو اپنے غلبہ و طاقت پر بھروسہ ہے، اس کے پاس خوفناک آفات و حرب کا ایک بے پناہ انبار ہے، اس کے پاس دولت ہے اور دولت سے خریدی ہوئی ایک عظیم سپاہ جس کے کس ہل پر اسے یقین ہے کہ وہ زبردست سے زبردست مخالفت کو بھی انتہائی بے دردی سے کھل دے گی۔

لیکن آج سرمایہ داری نے خود اپنے ہاتھوں اپنی شامت بلی ہے، کیونکہ اس کے باعث اس سے زیادہ شدید اور بھیانک چیز یعنی شہنشاہی معضض وجود میں آچکی ہے، شہنشاہی (یا سامراج) کے معنی ہیں سرمایہ دارانہ حقوق کا ٹھیکہ کی طرح کسی خاص قوم یا ملک کے ہاتھوں بک جانا، اس کا نتیجہ خام ایشیا کی منڈیاں حاصل کرنے اور فردخت کے لئے بازار تلاش کرنے کی کوشش میں نمودار ہوا ہے۔ یورپ کی اقوام اور دیگر ممالک کی جو ملک گیری اور نوآبادیات حاصل کرنے کی دلدانہ وارداد ووش سامراج کی اسی حکمت عملی کا ایک فطری انجام ہے۔ لیکن اسی میں خود اس کی فنا کا راز بھی مضمر ہے۔ کیونکہ اس ملک گیری کی زد میں آکر ایک طرف تو ان سرمایہ دار اقوام کو دشمن بنایا جاتا ہے جن کی حریصانہ نظریں کمزور ممالک پر ہمیشہ پڑا کرتی ہیں جو دوسروں کے مفتوح ممالک کی ٹوٹ میں بڑے سے بڑا حصہ لے کر بھی آسودہ نہیں ہوتیں، جو بری بحری اور ہوائی راستوں کی پیچیدگی کی وجہ سے کسی بھی قوم کی فتوحات میں اپنے حقوق پر نہیں ملتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں اور تجارتی رقابت کے باعث کسی دوسرے ملک کی ہر طاقت کو اپنی کمزوری کا پیش خیمہ اور ہر ترقی کو اپنے مقاصد اور حکمتوں سے مستحادم پاتے ہیں۔ اس طرح قومی دشمنی اور رقابت کے جذبات میں الجھ کر یہ حاسد اقوام خود آپس ہی میں دست و گریبان ہو جاتی ہیں اور نہایت ہی خوفناک اور بھیانک جنگوں سے زمین کے چہ چہ کو ہلا دیتی ہیں اور دوسری طرف مفتوح ممالک کے وہ لائقہ اد انسان جن کو یا تو تلوار کی دمھار اور توپ کے دھاتوں سے فوج کیا جاتا ہے اور یا پھر سرمایہ دارانہ تجارتی معاہدوں کی زہر پاشی سے رفتہ رفتہ مدنی موت کے جام پلائے جاتے ہیں۔ سامراج کی قوت کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کرنے میں سرگرم ہیں تاکہ جبکہ سرمایہ دار قومی آپس میں ہنر و آزمائی کر رہی ہوں اور جب قوت و طاقت

سرمایہ داری کے خلاف محض ہندوستان ہی میں جنگ نہیں جاری۔ بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں سماجی ترقی کا پرچم بلند کیا جا چکا ہے اور انسانیت کا ہر سال طبقہ اپنی اقتصادی آزادی کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید ابھی ہم یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہماری آزادی کی وہ تحریک جس میں کسان اور مزدور سب سے زیادہ پیش پیش نظر آ رہے ہیں کوئی مقامی جنگ نہیں بلکہ ایک عالمگیر جنگ ہے، جو ہر مورچہ پر پوری قوت کے ساتھ لڑی جا رہی ہے۔

اد آج بیسویں صدی کے وسط میں تو اس جنگ کی عالمگیری حیثیت اتنی واضح ہو گئی ہے کہ خود ہندوستانی سیاست میں بھی اس کی جھلک آنے لگی ہے۔ دنیا کی تاریخ کو تین بنا کر اس کو نئے سانچوں میں ڈھالنے والے واقعات جتنی شدت اور کثرت سے ہر طرف رونما ہو رہے ہیں، انسانیت کی نعمت کا فیصلہ کرنے والی قوتیں جس گرجوئی سے برسرِ پیکار ہیں یا اس کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ دنیا کی مظلوم قومیں اور مجبور طبقے جتنی تیزی کے ساتھ متحد و منظم ہو رہے ہیں، اور جتنی مستعدی سے اپنی قومی یا طبقاتی جدوجہد میں مشغول ہیں اس کی مثال تاریخ کے کسی دوسرے دور میں نظر آنا تقریباً ناممکن ہے۔ سرمایہ داری نے انسانیت کے ہر طبقے کا خون جی بھر کے چوسا ہے۔ اس لئے اس کے دھولے نئے دنیا کے ہر حصہ کو ایک وسیع برادری میں منسلک کر دیا ہے۔ شہنشاہی کے عام خطرے کے خلاف ہر ملک اور ہر قوم میں ایک عام آواز اٹھ رہی ہے اور تمام ہمالیہ طبقے اس اصولِ معاشرت کے خلاف جو نہ صرف اس قسم کے اجتماعی مظالم کو رد کرتا ہو بلکہ خود ان کی حفاظت کے لئے قائم کیا گیا ہو، اور جس کی باعث دنیا کی سبھی بھر جماعت کے علاوہ زمین و آسمان کے درمیان سانس لینے والا ہر انسان ایک مصیبت اور عذاب کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو، ایک جذبہٴ تخریب تیزی سے اثر کرتا جا رہا ہے، ننگے، بھوکے اور غیر آسودہ افراد کا ایک عظیم اٹان کا رواں بڑی تیز رفتاری سے اسی منزل کی طرف رواں ہے، جہاں وہ استعاریت کو مار کر انسانیت کی ہر گیر مصیبت کا خاتمہ کر سکیں گے، اور جہاں تشدد اور بے اطمینانی کو نیست و نابود کر کے سوسائٹی کے لئے ترقی کی ان شاہراہوں کو کھولنے میں کامیاب ہو سکیں گے جو آج بالکل مسدود ہو چکی ہیں۔

اس کے برخلاف سرمایہ داری بھی اپنی دھن میں مشغول ہے وہ ان تمام محرکات کو خوب سمجھتی ہے اور حالانکہ اکثریت کی قوت سے کچھ نہ کچھ ہراساں

کی کجیاں حکومت کے اہواؤں سے نکل کر میدانوں میں حرکت کرنے والی اکثریت کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی ہوں۔ تشدد سے خائف ہو، اور جب دونوں جنگل کے اُن جاؤروں کو جن پر کل تک دست درازیاں روا رکھتے تھے جنگل کی شاداب وادیوں کی فتنیں دلا دلا کر اپنی مدد کے لئے جاسوس ہوں اُس وقت۔ اُس نازک لمحہ میں یہ مظلوم اور پسپا انسان اسٹیفن اور ان دونوں طاقت آفرین بیسٹریوں کا غارتہ کریں۔ اسی وقت وہ اپنی اقتصادی آزادی کا پسند پوری قوت اور آمادگی پوری ہم آہنگی کے ساتھ اٹھا کر سرمایہ دارانہ جھوٹا کو رو دیتے ہوئے دنیا کے ہر گوشے پر چھا جائیں اور طاقت پر غلبہ حاصل کریں۔ یہ گزشتہ جنگ غلبہ میں ہو چکا ہے اور تاریخ اپنا یہ کارنامہ آئندہ جنگ غلبہ میں ایک بار پھر دہرائے والی ہے۔

ہیں چاہیے کہ ہم آج بہت صاف طریقہ سے اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ دنیا کی سیاست اس وقت قومیت کے تنگ چوڑے کو اتار کر بین الاقوامی لباس زیب تن کر رہی ہے، ہر مظلوم قوم آج دنیا کی مظلوم اقوام کی آواز پر آواز دیتی نظر آتی ہے۔ ہر غلام ملک جب ہینشاہیت کی سفاک دقوں کے خلاف جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے نعروں کے ساتھ دوسرے غلاموں کی آزادی کے نعروں بھی لگاتا ہے۔ اور یہ واقعہ ناقابل انکار حد تک درست ہو چکا ہے کہ دنیا کی کل سیاسی تحریکوں میں تمام انسانیت کی جدوجہد کو منظم کرنے کی تحریک بڑی سرعت سے دماغوں میں بڑھ چکی ہے۔

اس سلسلہ پر ملک کے ادیبوں اور خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کو خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہی وہ پہلو ہے جہاں ہمارا ادب ہماری سیاست سے بہت کافی بکھر گیا اور یہی وہ بڑی تحریک ہے جس کی صحیح تصویر پیش کرنے سے ہندوستانی ادب کمبخت غافل ہو رہا ہے۔ آج دنیا میں جو بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ہندوستان اُن سے روز بروز زیادہ متاثر ہوتا جا رہا ہے، وہ دوسری پامال اقوام کی ہمدردی میں آواز اٹھاتا ہے۔ جب غلام ملک اپنی آزادی کے مسئلہ کی چیرچاڑ شروع کرتے ہیں تو اُن کی بہت افزائی کرتا ہے۔ یا جب کوئی سامراجی قوت کسی کمزور ملک کی آزادی پر ڈاکہ ڈالتی ہے تو اس کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یوم میس۔ یوم فلسطین۔ یوم چین وغیرہ مناکوہ اپنی ہمدردیوں کا اظہار ان غریب اور مظلوم ملک کے ساتھ کرتا ہے۔

میں مالی مدد بھیج کر اور بین الاقوامی فوجی دستہ میں ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی کر کے اپنی حکومت سے اپنی ہمدردی کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن ہمارا ادب خیالات میں وسعت پیدا کرنے والی ان تحریکوں سے سرسری گناہ ہے۔ کوئی نظم۔ کوئی افسانہ اور ڈرامہ یا کوئی ادبی مضمون ہم اپنے ادبی رسالوں میں مشکل ہی سے پائیں گے جس میں اطالیہ کے خلاف اظہار نفرت، چین کے پناہ داروں کے لئے ہمدردی اور محبت کے خیالات کا اظہار ہو، فلسطین کے عربوں کے لئے ادب میں مبنی ہمدردی کا اظہار ہو رہا ہے وہ صرف نہ ہی نقطہ نظر سے جس کو بین الاقوامی وسعت نظری سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پر یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج ہندوستان میں زبان کا مسئلہ جو اس قدر سخت بنا دیا گیا ہے تو ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہی زبان ترقی کر کے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے جس میں دوسرے ملک سے گفت و شنید کرنے کی آسانیاں ہوں، اور یہ آسانیاں اُس وقت تک ہم نہیں پہنچ سکتیں جب تک کہ ہمارا ادب مختلف ملک کی تحریکات سے اپنی ہمنوائی کا ثبوت نہ دے۔

آخر میں ترقی پسند ادیبوں سے میں بھرپور عرض کروں گا کہ جب آپ کا دل کسی بیکار ہندوستانی نوجوان کو خودکشی کرنے دیکھ کر کھول جاتا ہے، جب آپ ہندوستان کے عوام کو ہینشاہیت کے مظالم سے کھلتے دیکھ کر مظالم کے خلاف ایک زبردست احتجاج کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، تو پھر آپ کے دل میں چین کے پناہ داروں کو ہم گلوں کے شہداء جھیلنے اور جا پانی ہینشاہیت کی تختیاں برداشت کرنے دیکھ کر جوش کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ ہندوستان کی جس بھوک اور مفلسی کے نظارے ہم کو ٹھوڑی دیر کے لئے ساری دنیا میں آگ لگا دینے کا خیال دلاتے ہیں تو جب اسی بھوک کے خلاف اور اسی مفلسی کو مٹانے کے لئے جب دنیا کے دوسرے گوشوں میں لڑائی ہوتی ہے تو ہم اُس کی ہم آہنگی کے لئے کیوں نہیں تیار ہوتے، ہمارے ادیب کا یہ فرض ہے کہ دنیا کی مختلف تحریکوں کی ایک بین الاقوامی جھلک ہمارے سامنے ضرور پیش کرے۔ اور ہمارے ذہن کو اس طرف منتقل کرے جب کہ دنیا کے ہر گوشے میں لگنے والی آگ ایک بڑے شعلہ ریز آتشکدہ میں منتقل کی جاسکے۔

# تضاد

آسماں پر چھا چکی تھیں شام کی تاریکیاں  
اور کلکتہ کے بازاروں میں روشن تھے چراغ  
سیر کو نکلے تھے باہر شہر کے سرمایہ دار  
مطلبن چہرے خوشی کے نور سے شاداب تھے  
اُڑ رہے تھے اہل زر حرص و ہوا کے زور میں  
پھر رہی تھیں ہر طرف ڈالے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ  
وہ تبسم ریزیاں باہم اشارے دیکھ کر  
جیسے بیوہ کے غم ناکام کی تاریکیاں  
جس طرح مفلس کے دل میں یاس و محرومی داغ  
دعوتِ اہل نظر تھاجن کی پوشش کا نکھار  
عیش وائے مسکرانے کے لئے بیتاب تھے  
سانس لیتی تھی امارت موڑوں کے شور میں  
چند دلکش عورتیں کچھ خوشنما مردوں کے ساتھ  
آسماں پر ٹسکرا اُٹھے ستارے دیکھ کر

میں بھی اس ہنگامہ عشرت میں تھا کھویا ہوا

روح میں بیداریاں تھیں ذہن تھا سویا ہوا

ایک بیک کانوں میں آئی اک صدائے و خراش  
فکر نے منزل بدل دی، دل کی راہیں مڑ گئیں  
دیکھتا کیا ہوں کہ اک بڑھیا بہت زار و نحیف  
جبر کے شدتِ درد و غم و آلام پر  
چھپے چھپے آ رہا ہے ایک بوڑھا آدمی  
جسم میں رعشہ ہے، منہ پر جھجریاں ہیں، سر پہ خاک  
سائے تھیں میرے اپنی قوم کی رسوائیاں  
جس نے پیدا کر دیا جذبات میں اک ارتعاش  
میں نے دل پر ہاتھ رکھا اور نگاہیں مڑ گئیں  
مضطرب مفلس، پریشاں حال، افسردہ ضعیف  
کہہ رہی ہے ایک پیسہ دو خدا کے نام پر  
اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی اندھا آدمی  
دیکھتا جاتا ہے شاید کوئی خواب ہو لٹاک  
رفتہ رفتہ وقت نے لے لیں کئی انگڑائیاں

نصف شب تک اہل دولت دل کو بہلاتے ہے

اور یہ دونوں سڑک پر ٹھوکرین کھاتے ہے

# عشق است و ہزار بیدگمانی!

اثر خامہ والتیر! — ترجمہ از اسرائیل احمد خان

زائرہ: فرامیسی ڈرامائی ادبیات عالیہ کا اک شہیاد

۱۳۔ اگست ۱۹۳۲ء کو عمل میں آئی: اس کی مدت نسویدہ ۱۱۵۵ ہے! ڈرامے کا جذبہ رقابت کسی مدینک شیکسپیری ڈرامے "آئیلو" سے مستعار معلوم ہوتا ہے، تاہم والتیر کے کرداروں میں وہ شدید کشش حیات مفقود معلوم ہوتی ہے جو شیکسپیر اور کائناتِ بخیل کی خصوصیت خاصہ ہے!

اشخاص ڈراما

عثمان - بیت المقدس کا سلطان  
خالد - سلطان کا اک افسر  
ایلفرد - مسیحی سلاطین قدس کے باقیاتِ صالحیت میں سے ایک،  
ہنری - اک فرانسیسی بیٹی مجاہد،  
نائرہ اور میرا - دو فرنگی خواتین، سلطان کی حراست میں۔

پہلا ایکٹ

میرا - اب! دھر چند روز سے تم بیت خوش خوش نظر آتی ہو۔ زائرہ! یہ

مالتیر کے ڈرامے، والتیر کے ناولوں کی طرح ساحرانہ نہیں ہیں، تاہم وہ اک مشورہ پسند رکھنے ہیں، — خامکر انگریزی زبان کے تاجین کے علاوہ: ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کا درمیانی زمانہ والتیر کی فطرت میں گزرا۔ اس عارضی قیامِ فطرت نے "فرامیسی فردی" پر خیمہ اٹھلستان — شیکسپیر کا اک باقی اثر چھوڑا، جس کا دورِ کم مدتی ۲۰ سال فرما کر گیا ہے: تاہم قیامِ فطرت میں والتیر نے جو ڈرامے لکھے ان کی تقریریں بہ کوششِ مستر نظر آتی ہے کہ شیکسپیر کے ڈرامائی ادبیات کی مخصوص شدت احساس اور سرعہ عمل جڑ، فرامیسی ڈراما میں منتقل کی جائے، جو کچھ دوسرے سے مسلسل اختلاط پذیر ہو کر "پانچ ایکٹ" کے اک ٹکڑے کی شبیہِ اجنبی میں تبدیل ہوا ہمارا تھا! والتیر نے شیکسپیر کے اس تاثر و تفتیش میں کل ۱۰، ۵۰ پارے سپردِ قلم کئے عجیب بات یہ ہے کہ ان قلمکاروں کا بیشتر حصہ المیوں پر مشتمل ہے ہوتا بیدارگی تیر کے قالب میں خاص اختیار کرے، یہ اک مدیہ اول کی بوجہ تھی! زائرہ جو شخص ڈرامے — زائرہ — کو والتیر کی اس قلمی جہن طرزی کا کل سرسید سمجھا جاتا ہے! خود علم فرامیسی ادبیات کے دفریعالی کا بھی وہ اک دوقیہ تہیں کہا گیا ہے! زائرہ کی تشیل

کیا کرشمہ ہے کہ اب تمہارے آنسوؤں میں اک عجم منکس نظر آتا ہے؟۔۔۔۔۔  
کیا ہنری لوٹ آیا؟! اب تو اسے بدحارے جوئے دو برس ہونے آتے ہیں!  
سلطان عثمان کی طرف سے اُس کی مشروط رہائی کو اس سے کم بھلا کیا زمانہ  
گزرا ہو گا؟ کیا کچھ ہنری آگیا ہے؟ اور ہم سب کی رقم فدیہ ادا کر دی گئی  
ہے؟!

زائرہ۔ اسیرانِ جنگ جو قول و قرار اپنی مٹو خلاصی حاصل کرنے کے لئے کیا  
کرتے ہیں، شاذ و نادر ہی اُسنیں وفا کیا کرتے ہیں! ہنری، جو ہمارے یارانِ  
زندہ ان میں سے تھا، اب نہ کبھی آئے گا، نہ ہیں بند اسیری سے چھڑائے گا!  
یامان تیز مال سے ہے یہ گلہ کہ ہائے ہم کو اسیر پنجہ صیبا دکر گئے!  
لیکن یمن میریا! اب مجھے بھی آزاد ہونے کی کہاں ہوس باقی ہے؟! بچ  
ہوں گرفتار و فاندان سے گھبراؤں گی کیا!

میریا۔ اچھا!!۔۔۔۔۔ لیکن فرض کرو کہ وہ فرانسیسی نائٹ آج ہیں چھوٹنے  
کے لئے آجائے؟!

زائرہ۔ سرزمینِ فلسطین میں عورت ایک شخص ہے جو میری بند آزاد کر سکتی  
ہے، دوسرا کوئی نہیں!۔۔۔۔۔ اور وہ ہے ہمارا آقا سلطان عثمان!۔۔۔۔۔  
وہ شریف ترین، شجاع ترین، شیریں ترین روح ہے جو اس ارض مبارکہ  
کی خاک پاک سے اُٹھی ہے!۔۔۔۔۔ اور اُس نے مجھے قبل انہی  
ظلم و ظالم سے آزاد کر دیا ہے!۔۔۔۔۔ تاہم میں اپنے کو ہمیشہ سے  
زیادہ اسیر و پابِ بخیر باقی ہوں!!

ہوں گرفتار الفتِ صیبا و۔۔۔۔۔ ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز!  
میریا۔ سلطان عثمان؟ سلطان عثمان!۔۔۔۔۔

زائرہ۔ مجھے محبت کرتا ہے!۔۔۔۔۔ میں تمہارے شہداء کی خبر بہم پہنچاتی  
ہوں!!۔۔۔۔۔ ہاں اب ہمسرا مژدہ جاں نواز سنو کہ اُس نے مجھے اپنی  
خونِ محترم بننے کا پیام خوش بھی دیا ہے!!۔۔۔۔۔ سلطانِ قاہرہ و قدس بنے کا!! بچ  
جاہ و جہولِ پیشہ وصالِ تباہ نہ بوجھ!

میریا۔ نامکن! نامکن!! اک دخترِ سمیت، اور اس پیشکش کو نوازے!! پھر  
اک خوشی مسلمان کی آغوشِ بے تہا سے آگیتہ مسلماتِ دینی کی کیا رعایت کرے  
گی؟!

زائرہ۔ دخترِ سمیت!! یہ کیا کہنا؟ مجھے ادبِ سمیت کا یہ نسب روحانی نصیب

نہیں! میں سلطان کی عاشق ہوں، اور اُسی کے خدائے اسلام کی بندی!  
میریا۔ آج بھی وہ ننھی سی سنہری صلیب تمہارے سینے پر، تمہارے  
اصلی کپڑے ایمان کی، اک قطبِ نما کی طرح، قبلہ نمائی کر رہی ہے! یہ صلیب  
تمہاری سچی ولدیت پر اک ٹہر گئی ہے!

زائرہ۔ وقتِ ولادت ہیستے کے چھینٹے ہماری لوحِ دل پر کوئی  
تحریر ایمان نہیں لکھا کرتے! یہ دراصل ہماری تعلیم و تربیت ہوتی ہے  
جو ہماری متکم ایمان بنتی ہے! مجھے ادا اعلیٰ طفلی ہی سے محبتِ عربی کا دین  
زبان، اور مقامی شریعت و شعار سکھا یا گیا ہے۔

(سلطان عثمان داخل ہوتا ہے!)

عثمان۔ شریف و شیریں زائرہ! قبل اس کے کہ ہماری شادی کا رشتہ  
ریشی میرے تمہارے درمیان من و شدم تو من شدمی کے القاب کا فتح  
باب کرے۔ میں تجھے یہ بات بتائے اور جتانے دیتا ہوں کہ میں نے اُن  
آساں پسند، شست رگ، دُختِ نواز و حید جو مرہم و شاعر  
اسلام کو خیر یاد کہہ دیا ہے جو فقہاء دُنیا پرست نے سلاطین کی کامجربوں  
کے لئے اختراع کر رکھے ہیں! امرائے اسلام بند گمانِ ہوس بن گئے،  
اُنہوں نے محسوسوں کو نیکیات اور خدام کے اسبل بنا ڈالا! پھر میں  
نے اپنی آنکھوں سے اُن کے پرچم سرنگوں ہوتے دیکھے! غیور صلیبی مجاہدوں  
نے اُن کی سلطنتوں کو درہم برہم کر ڈالا! لیکن تم میری زائرہ میری تہا  
بیوی ہو گی! میری واحد و منورِ اُلفت!! اور میں تمہارا عاشق ہوں گا۔

اور تمہارا شہیدائی و فدائی! تم میری جانِ جاں ہو گی۔ تم ہی میری روح  
پروردی کرو گی، تمہاری کنا دِشیرس سے براہِ راست میں میدان کا رزار  
میں اُتروں گا! میں سلطنتِ اسلام کے سمار شدہ قصر کو بار و گر تعمیر کروں گا!  
اور اُسے روئے ارض کی اک بے پناہ طاقت میں تبدیل کروں گا!

زائرہ۔ میرے آقا، میری روح درواں۔ میرے محبوب، میرے  
معبود!۔۔۔۔۔ اگر تم میرے غلام بے دام بھی ہوتے،۔۔۔۔۔ صبیحی کہ اس

وقت میں تمہاری کنیز ناچیز ہوں!۔۔۔۔۔ اور میں ملکِ عالم ہوتی، تب بھی  
میں فرائِ دُخت سے سرنگوں ہو کر تمہاری حقیضِ اسیری تک اُترتی۔ اور  
میں اُنکا کہ اپنا پہلو شین باقی! عثمان میں خود تمہاری والدہ و شہید ہوں!  
تمہاری ثروت و شوکت کی ولادہ نہیں!



بچنے کے لئے تیار ہے: زائرہ اک نجیب الطرفین مسیحہ ہے، اور ایلفرڈاک  
قابل رحم پیرا سیر ہے!

عثمان - میں جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے اُس سے میں باز آنے والا نہیں!  
پس اب تخفیفِ تعدید! ایک دن کے اندر اندر میرے سارے عطا یاد  
مرامات کو لے کر رخصت ہو جاؤ! تمہاری تاخیر میرے عتاب کی تعمیل کا باعث  
ہوگی! (زائرہ کی طوف متوجہ ہو کر) اچھا زائرہ! تم حرم سرا کی طرف عزت  
خوام ہو! میں بھی جلد حضورِ حسن میں باریاب ہوتا ہوں!

(زائرہ اور ہنری مختلف دروازوں سے رخصت ہو جاتے ہیں)

## دوسرا ایکٹ

زائرہ اور ہنری

زائرہ - پیارے ہنری! سلطان نے ادراو ہربانی مجھے اجازت بخشی  
ہے کہ تم سے ملاقات کروں! اور میں ایک خوشخبری کی پیامبر بن کر آئی ہوں!  
تم جانتے ہو میں تمہاری کتنی منوں نوازش ہوں! ہم چھوٹے ہی چھوٹے  
تھے کہ سلطان صلاح الدین کے قیدیوں کی طرح لبک ہی بندی خانے میں  
رہا کرتے تھے! اس قید کے زمانے میں ہم اسیر محبت ہو گئے، اور غم ہستی سے  
آزاد! تمہاری خاطر میں نے کتنی کوشش و کادش کی ہے، اور آخر کار اس  
چیز کو حاصل کر لیا ہے جو تمہیں اتنی عزیز ہے! — یعنی بابائے محترم ایلفرڈ  
مد ظہم کی رہائی! آج وہ حکم سلطانی سے آزاد ہیں!

(ایلفرڈ داخل ہوتا ہے)

ایلفرڈ - ہاں، بلاشبہ میں آزاد ہوں! لیکن وہ سب کہاں ہیں! —  
میرے بچے! میری گوداں سے سوئی کر دی گئی! میرا بچہ اور میری بچی  
قیصریہ کے سقوط کے بعد قیدی بنائے گئے تھے اور سلطان عثمان کے محل  
کی حراست گاہ میں منتقل کئے گئے تھے!

ہنری - مجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے! میں اُس وقت بالکل بھڑکا،  
لیکن آج بھی اپنی خوابوں میں اُس سوختہ بخت جلتے ہوئے شہر کو دیکھا کرتا  
ہوں! نیز ان عرب یا جوج و ما جوج کو جو سچ کی بیخودوں کو تر تھک کر رہے  
تھے! زائرہ میرے ساتھ، چند اور اسیروں کی صحبت میں، بیت المقدس  
بھی گئی تھی۔

(خالہ داخل ہوتا ہے۔)

خالہ - ہنری، وہ کسی غلام جو جہد کر کے گیا تھا کہ واپس آئے گا،  
اور وہ دسے کر اپنے سارے رفقاءے اسیری کو چھڑائے گا، آیا ہے، او  
میرے آقا حضور کی باریابی کی درخواست کرتا ہے!  
میریا - تیری شان، اسے سنبھال!  
عثمان - اسے آنے دو!

(ہنری داخل دربار ہوتا ہے)

ہنری - شہامت و شرافت کے پیکر سلطان ذی شان! خاکسار  
بار و گزشت اندوہ حضور ہی ہوتا ہے! میں اُس جہد کو پورا کرنے کے لئے  
حاضر ہوا ہوں — زائرہ اور میریا اور وہ دس صلیبی مجاہد، جو سنبھالنے  
کے سفر کے میں سلطان کی حراست میں آئے تھے اُن سب کی رقوم فدیہ موجود  
ہیں! لیکن خود اپنا ذریعہ رہائی میں ہم نہ پہنچا سکا! جس کی پاداش میں میں اپنی  
گردن دوبارہ طوق اسیری کے لئے پیش کرتا ہوں!

عثمان - شریف النفس صلیبی! تو نے خوب ہی اپنا قول نباہا، لیکن  
شرافت و صروت کے کارناموں میں اک فرزند اسلام اک سچی غلام کو  
سبکدوش بازی لے جانے دے گا! اچھا تم بھی دوسروں ہی کی طرح آزاد  
ہو! جو ذریعہ فدیہ تم لائے ہو اُسے بھی میں عطائے قبولیتے تو کرتا ہوں،  
نہیں، بلکہ یہ رقم سہ چند کر کے تم کو واپس کی جائے گی! پھر بھی نہیں، بلکہ  
اُن دس صلیبی مجاہدوں کے بجائے میں پورے ایک صد فانیانِ صلیب  
کی گلو خلاصی کرادوں گا! پھر تم کو یہ بھی اختیار ہے کہ جس زندان خانے  
میں سے چاہو یہ منظور شدہ سوئی تعداد منتخب کر لو! — تاہم ایلفرڈ  
اس سے مستثنیٰ رہے گا! — میں اُس کے بارے میں کوئی رعایت  
نہیں کر سکتا! وہ اس شاہی خاندان بوسیلہ کا کلہ گوبے جس کے ذریعے  
کبھی یہ زمین رہ چکی ہے! پس وہ میرا سیاسی حریف ہے! —

اب رہی زائرہ — وہ اہلۃ الجمال زائرہ! — تو اگر سارے شاہان  
و اہل ابانِ فرنگ مجھ پر اپنی مجموعی افواج کے طوفان کو ریل دیں، تب بھی  
اس گوبر نایاب کو میری صد فوسینہ سے نکال کر نہیں لے جاسکتے!

ہنری - کیا فرمایا سلطان نے! کیا عالی منشا امیر اسلام کو اپنا وہ  
پایانِ تین یا وہ نہیں کہ وہ کم سن زائرہ اور کیرا سن ایلفرڈ کو فدیہ دے رہا ہے



۱۔ (دعا آواز کی گردن کی زنجیر کو پکڑتا ہے، اس پر جھکتا ہے، اسے دیکھ کر  
پھاڑ پھاڑ کے دیکھنا چاہتا ہے، اور پھر ایک دم اس زنجیر کو کھینچ لیتا ہے،  
جس پر دعا آواز کے گلوئے حسین کی سنہری صلیب کھل جاتی ہے!)

ہنسری۔ یہ موجود ہے پر محترم!

ابن سنی فی اللہ اور ایفٹوڈ کے قدموں پر گر پڑتا ہے! ایفٹوڈ اُسے محسوس نکالتا ہے۔ ساتھ ہی اپنا دوسرا خالی بازو زائرہ کو کنارہ گیر کرنے کے لئے پھیلاتا ہے! زائرہ - باپ! میں آپ کی آغوشِ اُلفت کے قابل نہیں! میں مُرتدہ ہوں! میں مسلمان بن چکی ہوں!

ایلیفرڈ۔ اے کاش کہ اک برقی حافظ گروے، اور مجھے خاکِ سیاہ کر ڈا!  
میرا اک ہشتاد سالہ پیر ناجینا ہوں، اے خدا! میں نے پورے ساٹھ سال تیری  
راہ میں قتال کیا ہے! پھر ۲۰ طویل سال تک میں تیری ہی رضا جوئی میں ایک  
دندانِ سیاہ کے اندر تحلیل ہوا کیا ہوں!! دشمنانِ حق نے میری جبری اور میرے  
بچوں کو شہید کر ڈالا! میری خدا پرست قوم کے کثیر التعداد افراد کے حلقہ دلوں سے  
اگت جوئے طمانِ پیادہ دی! اس اوجِ مقدس کو ویران کر ڈالا! اولے میرے  
خداوندِ مقدس! اماکنِ پاک کو تیرے قدموں نے سُس کیا تھا، وہاں اُنھوں نے  
انجیلِ اہم نام و آدنیانِ نصب کر دیے!! اور آج میری بیٹی تیرے دشمنوں کی صفوں  
میں گھڑی ہوئی ہے!۔۔۔۔۔ تیرے دامِ پاکی کا اک داغ!!۔۔۔۔۔  
بہنِ بہنِ میری بچی! تو خدا نے قدوس کی گرد سے گریزاں نہیں ہو سکتی!!

آنکھیں اٹھا کے دیکھو۔ جد ہر تیرا جی چاہے! اور آفات اللہ کے منارے  
تیری نظروں کے سامنے غنڈ ہوتے دکھائی دیں گے! ہاں، ایک ہی نگاہ  
غلام از ڈال، اور دیکھو گے کہ وہ ہے سامنے وہ پیٹا سی جہاں ابنِ آدم  
نے ہمارے لئے جان دی تھی!!

زائرہ - باپ! میرے باپ! مجھے بتا کہ میں کیا کروں؟  
ایلیفروڈ - اُن! بس میرے بڑا چاہے کے بھڑک اٹھے جوئے سر پر  
غم اور شرم کا بار بخت اٹھائے! ماں کہہ دے کہ میں سبھی ہوں؟  
زائرہ - میں سبھی ہوں!

(سُنی ن عثمان داخل ہوتا ہے!)

عثمان - مردود! یہاں یہ بد آموزی، باطل کوشی، فتنہ پروازی جاری ہے؟! کفارہ اعتبار! نکلو یہاں سے!..... کیا میرا فرمان تمہارے لئے یہ نہ تھا کہ فی الخور یہاں سے منہ کالا کر جاؤ؟!

(سیحی در انداز رخصت ہو جاتے ہیں! آئزہ دم بخود کھڑی رہ جاتی ہے۔۔۔ زرد رُو اور لکڑہ بر اندام!)

(عثمان، دائرہ سے) آؤ میری دائرہ! ہماری شادی خانہ آبادی کی تیاریاں مکمل ہیں! عمو کے بھرات، مسجد کی فضا کو بسر بڑھ گئے ہوئے ہیں! میری ذمہ کے مستحقانِ جہاں کی نظریں تمہارے جلوے کی جو یا ہیں! ساما جسٹن عروسی تیار ہے! تخت شاہی تمہارے قدم کا اور عثمان کا سینہ تمہارے ورد و سحر کا منتظر ہے!

زائرہ - میرے اللہ! میں کہاں جا چھوں! اے میرے باپ کے خدا،  
میری مدد کر!..... عثمان! اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو اللہ اس  
شادی کو مٹتی کر دو! اور ہاں میری روح کا واسطہ کہ مجھے بزرگ سال  
ابغزو سے بچنے دو!

عثمان، ایلیغز؟ اس کھوسٹ غلام سے تم کو کیا واسطہ؟ تم کوئی سیسی نہیں! تم ابتدائے طفلی سے اسی خدا کی حمد گو، جو جس بکائیں ستائشگروں! زائرہ - پیر حال، شادی کو ایسی اشارہ کنایہ ہے! نہ چھوڑے غمگت، باد پیری ماہ لگ اپنی!

عثمان - آنجھ می شنوم ہ بیداری ست یا رب یا بخواب !!.....  
 زائرہ : ہاں تم ہو جو بول رہی ہو !



دیں، وہ اندیشہ نہیں اس قدر شوش نہیں کر رہا ہے! ہمارے دل نازک کے اس طوفانِ اضطراب کا سرچھپچھپے "احساسِ خوف" کے ان کیفِ محبت "ہے! جس نے ہمارے دماغ کو مکدر اور صبح کو مضطرب کر رکھا ہے! ننھی قمری! تم کانپ رہی ہو اس بات سے کہ کہیں اس وحشی انسان (عثمان) کی چشم و ابرو پر کوئی بن نہ آجائے! وہ عثمان جس کی محبت اک درمنے کی دلداد کی شکار سے زیادہ نہیں! کیا سچ بچے عشق کا ثبوت ایسا ہی اندھا بہرہ ورا کرتا ہے؟ کیا تمہاری آنکھوں میں اتنی برائے نام بینائی بھی باقی نہ رہی کہ تم اس ملعون درندگی کو دیکھ لو جو تمہارے سلطان کے سین و بیاں چلنی ہے! وہ اک گرگِ جگرخوار ہے، تاہم اک "نرم لحم حلوان" اس کے لئے آہ کشی کر رہا ہے! ح

زارہ - آہ میرے تاج!

دل کو روئوں کہ یا جگر کو تیرے؟

میری دونوں سے آشنائی تھی!

ایکاش کہ میں اس سرزمینِ سمیت کی زیارت کرتی جس میں میرا بھائی مجھے لجانا چاہتا ہے! و احسرتا کہ مجھے عثمان کی غلبتِ الفت ہی میسر ہوتی!۔۔۔۔۔ میرا! میں اک دو گونہ رنج و عذاب میں مبتلا ہوں! اس اذیتِ دوئی میں میرا دل بیمار گرفتار ہے! وہ التزامِ فرغ اور وفائے عشق کسی کا بھی اہل نہ رہا! وہ اک قیامتِ خیز تھلک کے اندر مٹ کر لڑل ہے! او میرے الشدا مجھے میرے تاریک توہمات سے نجات دے!۔۔۔۔۔ ہاں، میں اس سے طوگی! اس سے دودھ دہاتیں کروں گی! اور جس وقت وہ قدس سے رخصت ہو جائے گا میں اپنی دندگی کا رازِ سرسبز اپنے عاشق پر بے نقاب کر دوں گی! وہ میری "انجیلِ دل" کا بے پردہ مطالعہ کرے گا، اور اک غریبِ نصرانی لڑکی پر ترس بکھائے گا، جو سلطان کی محبت اور سچ کی ارادت کے درمیان صحن ہو رہی ہے!۔۔۔۔۔ اچھا ہرچہ بادا باد! سچو اس غلام کو جو یہ تحریری پیام میرے پاس لایا!

زارہ - (غلام سے) تم ہی یہ خط لائے تھے، فرانیسی صلیبی مجاہد کے کے پاس ہے؟

غلام - جی ہاں!

زارہ - اچھا کہو اس سے کہ میں اس کی مراد دل سے دُعا کروں گی!۔۔۔۔۔ اب جس وقت وہ موقع پر پہنچے اسے سیدھے پیس لے آؤ! (زارہ رخصت ہو جاتی ہے، اور سلطان اور خالد داخل ہوتے ہیں) عثمان - الشدا کبر! ایک ایک گھڑی ساعتِ قیامت کی طرح گزر رہی ہے! اگر وقت کی رفتار یہی ہے تو میں یقیناً جنون ہو جاؤں گا!! (غلام کو آتا دیکھ کر کہو کہو اس نے کیا کہا! ہاں ہاں جلدی کہ! ابلے تو بولے گا کہ نہیں!!

غلام - میرے آقا! اس نے کہا کہ میں کہوں کہ وہ یہاں اس کا اختلا کرے گی، اس سے طاقت کرے گی، اور اس کے مقصدِ ملی سے بے وفائی نہ کرے گی!

عثمان - اچھا، جاؤ! معلوم ہو گیا!

(غلام چلا جاتا ہے)

(خالد سے) اچھا تم بھی چلے جاؤ! ابھی ابھی! ہاں بس رخصت ہو جاؤ! فوراً میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، نہیں تو میرے ہاتھ سے دو چار کا خون ہو جائے گا!!

(خالد چپکا چلا جاتا ہے!)

(تہائی میں) میں کہاں ہوں؟ میں کہاں ہوں!! آٹ یہ تاریکی!! ایسی فضائے غمات!! مجھے کچھ سمجھائی نہیں دیتا!۔۔۔۔۔ زارہ!۔۔۔۔۔ زارہ! نہیں نہیں، میں کیوں کسی کو بچاؤں!! ح موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بہن آئے نہ ہے!!

آہ! میری خوش منشی کے مطلعِ ذریں پر یہ اُبڑ تاریک اُسی کی کم نگاہی ہی کا تو پُر توجہ!۔۔۔۔۔

اسے پُر توجہ تباب جہاں تباب اور صرہ

سامنے کی طرح ہم پر عجب وقت پڑا ہے!

ہائے زارہ کی شیریں لب شش پیاں کی یہ پہلی تمنی ہے! اور

رگ دے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو!

ابھی تو تمنی کام و دہن کی آذنائش ہے!

ہاں زارہ! تباب عثمان کے پاس نہ آئے گی، لیکن ہنری حلیفانہ فائر

کے دائیں بائیں کی طرف بڑھ رہا ہے!۔۔۔۔۔ اچھا آہا ہے مردود! دھڑ

خدا بھی شریک کار میں آئے وہ ان سب سیدہ کاروں کو ابھی کو وہاں  
چین کر دوں گا بخشنم بختم! ----- ہاں کیا میرا عزم انتقام نہا  
ہے! ----- خالد! خالد! بھٹ آ!

(خالد داخل!)

کہو وہ نظر آیا؟ تم نے اُسے گرفتار کیا!!

خالد۔ میرے آقا! وہ ابھی تک نہیں آیا!

عثمان۔ رات! خوفناک رات!! اک طرفانِ غلط!! ----- لے

شبہ دیجور! اپنی ساری سیما ہی کے ہا وجود تو ان کفار زشت کار کے  
چرم سیاہ کو کیوں کر اپنے پردہ تاریک میں چھپا سکے گی!! ----- اُت  
ذائرہ! تیری، میرے حرمِ دل میں یہ "قدمِ ثنائی و مزدو آئی" اور پھر لہی  
گریز پائی!! آہ! آہ!

محبکو خبر نہیں تھی کہ ہیں کتنے بہت خواں

جامِ شراب ناب و لبِ میگار میں!

اُت میرا یہ عشق مجنونانہ، اور اس پر ایسا جفا کار تازیانہ؟

خالد۔ جیسے مظلوم آقا! پیشین کشیوں اب ختم ہونے دیجئے! اور

اپنے ہاتھ میں جسمِ انتقام منجھالے!

عثمان۔ او میرے خدا! اک عورت کیسی ناگن ہوتی ہے! اپنی نیرنگی  
میں بالکل اک گرگٹ! اُت رنگِ جنا، خونِ شہیدان کو کس طرح اپنی ہی  
طرح اک توبہ بے پردہ سمجھتا ہے! آہ خالد! تم نہیں جانتے کہ میں اس  
گردن روئی غزالہ گریز پا کا کیسا قاتلِ خرام ہوں! اُت خالد! رجم رجم!  
دوڑ! دوڑ! مجھے اس صدمہ جانکاہ سے بچا! آہ ذائرہ! تو کیسی مسیخی پھری  
ہے!! دادیلا! دامعیتا!!

خالد۔ اُت! سلطانِ عثمان، اور صرف شیون و بین!! اے خدا! یہ

میں کیا دیکھتا ہوں!!

عثمان۔ ہاں ہاں، ٹھیک ہے! قہرمانِ سلطان کے یہ پیے آنسو میں

جو اُس کی آنکھوں سے نکلے ہیں! ہاں وہ خون کے گھونٹ بن کر پئے جائیں گے!

اُن کی تنگی اک ذائقہ بازگشت چکھائے گی! ہشیار کہ اُن میں خونِ محبوب

کی رنگینی ہے اور مرگِ جدو کی دہرناکی!! ----- ذائرہ! میرے سر پر

پیے وہ اُبر کرم، اور اب برقی سوزاں کا یہ پرچم!! اپنے کرتوت کے

غیا زے سے نا آشنا لڑکی! تجھے کیا خبر کہ تو نے حقِ ذلیت کھو دیا ہے!!  
تیرے سر کے سنہرے بالوں پر خونی موت موز جھل کر رہی ہے! -----  
اُت یہ کیا!! یہ کون!! خالد! جلدی جلدی! گرفتار کر اُسے، گرفتار!!  
ہاں اس موزی کو پاؤں بھر کر کے کشاں کشاں میرے حضور میں لا!

(خالد بھاگ کر جاتا ہے! ذائرہ اور میرزا دھندلی شریک میں دکھائی

دیتی ہیں!)

ذائرہ۔ آؤ میرزا!

عثمان۔ وہ آواز! ----- یہی وہ صوتِ جاں نواز ہے جو کبھی  
میرے لئے اک کلمہ سحر جنتی تھی، لیکن آج کی رات اک ٹختر خورِ زہر ہے! اُت  
نیرنگ ساز تھی! میں تیری طنزِ آشامِ رنگ طرازی سے اب فریب میں  
نڈاؤں گا! تجھے تیرے اہلی رنگ میں بے نقاب کر دوں گا!!

(وہ سہان سے اک نیچہ نکالتا ہے، اور چپکے چپکے آگے بڑھتا ہے!)

ہاں ہاں، وہی ہے، وہی ہے! میرے خدا، ذائرہ، اور اُس کے

ہاتھوں و فانی نقش کی تدفین اس لحدِ سیاہ میں!!

(خبر اُس کے ہاتھ سے گر پڑتا ہے، اور وہ پیچھے کھسک آتا ہے!)

اُت اُت! یہ خبرِ خونین اور اُس کا گلوئے حسین!! حیف مجھ پر!

ذائرہ۔ میرزا! یہ کیا آواز تھی!!

میرزا۔ اُسی ہنری فرانسسیسی کی آمد کی خبر!

(عثمان معاصر خبر بکفہ ہو جاتا ہے!)

عثمان۔ اس سے معلوم ہو تا ہے کہ ساری سازش پوری بخت و بیز چکی

ذائرہ۔ آہ، مجھ پر ہر اس دیاس کا ظلم ہو رہا ہے! آہ، میرا دل

دونیم!! کیا یہ تم ہی ہو ہنری پیارے؟

عثمان۔ نہیں یہ ہے عثمانِ مبعوض! ----- وہ جسے خدا مانہ تم ٹکرا

رہی ہو۔ نک وہ جس سے معشوقانہ معاملتے کے لئے جا رہی ہو! اور (خبر کھینک)

لو یہ ہے ہمارا صلہ، ہمارے رنگین دھوکے کے لئے!!

(ذائرہ قدموں پر گرتی ہے، عثمان جھٹک دیتا ہے، اور خبر اُس کے

سینے میں پیوست کر دیتا ہے!)

ذائرہ۔ عثمان! عثمان! ارے یہ تم! تم! آہ!

(جاں بحق ہو جاتی ہے!)

عثمان - ہا! خوش کام انتقام کی قہمی آسودگی!..... اچھا اب مجھے جاننا چاہیے۔ اب میں اُس کی طرف ایک نظر نہیں دیکھ سکتا: اُس کی نقش بھی میرے لئے لب نامحرم ہے!..... اچھا، کوئی بتائے گا، میں نے کیا کیا؟..... کیا کیا؟..... انصاف! انصاف!..... اچھا ستور! اور پھر جانیں، وہ دیکھو اُس کا ناش و عاشق بھی آتا ہے! مجھے عناد و رقیبانہ کی لذت سے پرورش مل سیر ہی ہو لینے دو!!

(ہنری ایسرو پا پر خیر لایا جاتا ہے۔ خالد اور شعلہ سلسلی سے پہاڑی اُس کو حصارے میں لٹکے ہوئے ہیں!)

دیکھو، ادبِ بخت، دیکھو: تو نے میری حیاتِ ارضی سے ساری روچ سرت نکال لی! لیکن شمس کہ اب جا

برگردن تو بس اند و بر ما گذشت!

بد معاش، دیکھو! وہ جو خا مخلوق، جسے تو نے اپنا بد بخت بنایا، اور اپنی بد آموزی سے اُسے اس حق سرنگ کی راہِ ننداری پر چلایا،..... یہ تیرے سامنے پڑی ہوئی ہے!!

ہنری - ایں، مقتول! میری بین مقتول!! زائرہ! پیاری زائرہ!!

(غش کھا جاتا ہے!)

عثمان - ایں، بہن! اُس کی بہن!! کرشمہ ساز خدا - کیا یہ ممکن ہے!!

ہنری - او حضرتِ خبیث! یہ ممکن کیا، سہ حقیقت ہے! ارے ظالم! وہ میری بہن تھی، ماں جانی بہن!!..... اور ایفروڈ اُس کا باپ تھا!..... وہ واصل باشد ہو گیا، اور آہ میں زندہ درگور! میں زائرہ کے پاس والدِ مرحوم

کا اک پیام وصیت لہا تھا جس کی نسبت میں نے یہ امید موہوم وابستہ کی تھی کہ شاید وہ اُس کے کمزور دلِ دارستہ کو سچ کے دین حق کی طرف واپس لے آئے گا! لیکن وہ خدا کی غیر خوشنودی مزاج کی مرتکب ہوئی، اور اُس نے تجھ سے محبت کرنے کی پاداش میں سیرے ہی ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچایا! عثمان - (زائرہ کی نقش کے پاس جا کر خالد! کھول دو مشکیں! اس نحرانی نوجوان کی!.....) اور جاؤ، میری ساری دولت زیرِ حراستِ کسی اسیروں کے درمیان تقسیم کر دو! اور سب کو رہا کر کے پاتھ (بندر لگاؤ قدس) پہنچا دو!

خالد - لیکن میرے آقا.....

عثمان - لیکن میرے خاتم! دم بخود ہو کر میرے حکمِ ناطق کی تعمیل کرو! (ہنری سے مخاطب ہو کر) اور تو اسے سوختہ بخت مجاہدِ صلیبی اور قاتلِ محبتِ خواہری! اپنی ہمشیر عزیز کو لے جا، اور اُس کی مادرِ وطن کی آغوشِ معد میں اُسے سُکھا! اور اگر زبانِ خلق یوں شکوہ سنج ہو کہ ہائے یہ تو وہ پیکرِ نسوانی تھا جو فرات شیرینی، عالی منشی، اور معصومی کے آبِ دگل سے کبھی دستِ قدرت نے بنایا تھا، تو کہنا کہ لاریب ایسا ہی تھا! عثمان نے اُس سے محبت کی، اور سوئے نمن کے خنجرِ مسوم سے اُسے شہید کیا، اور پھر اپنے ہی سے اپنے مقتول کا انتقام لیا! اس طرح! دیکھ!

(وہ خودکشی کر لیتا ہے!)

(کاپی رائٹ)

پچھلے میں جہادِ اسرارِ نواز  
نغمے میں ہیں تو اس سال پہاڑ  
پہلو میں تھیں رہا ہے اک ستِ شباب  
اسے میری شبِ باہ تری عمرِ دراز

یہاں نہیں سچ از زندگیانی ایسی  
اللہ سے اور بد کسیانی ایسی  
بے شائبہ و باوہ جس کی تیری گزینہ  
توینِ شہیت ہے جوانی ایسی

# دریں شہر

کس قدر ہے تجھ کو دختر کی ولادت کا ملال  
حشر برپا ہو گیا اک بے گنہ کی حبان پر  
اب کہاں گنجوت کی قسمت میں دلجوئی تری  
سرخ سرخ آنکھیں بھیر کا سہی نگاہیں گرم گرم  
اک جہنم سا نظر میں پھر رہا ہے ہر طرف  
تجھ کو کیا حق ہے کہ بے پیدائش دختر کا غم  
او غلام سلطنت نامرد تو نے کیا کیا کیا؟  
تجھ سے زنجیر غلامی میں کڑی اک بڑھ گئی  
تو نے میعاد غلامی میں اضافہ کر دیا  
تجھ سے محکم ہو گئی بنیاد نصیر سلطنت  
اک جنازہ ہے حکومت دوش پر قانون کے

زرد درخ، نیچی نظر، افسردہ خاطر، دل بند حال  
شوق میں بیٹے کے پانی پھر گسیا ارمان پر  
اٹ یہ نازک وقت اور یہ ترش ابدی تری  
منفصل اور متعل، دل سرد، آہیں گرم، گرم  
شعلہ حوالہ گھر میں پھر رہا ہے ہر طرف  
ہو کے برہم اس قدر کھلوانے تو اپنا بھرم  
تجھ کو قدرت نے کیا تھا مرد، تو نے کیا کیا  
مرد ہونے سے ترے لعنت بڑی اک بڑھ گئی  
تو نے بزم کبر و نخوت میں اُجالا کر دیا  
بڑھ گیا تیرے سبب سے اور عصر سلطنت  
اُس کو گر زندہ نہ رکھیں گھونٹ تیرے خون کے

ہاں مناسب کچھ یہی معلوم ہوتا ہے ہمیں

بیٹیاں ہی بیٹیاں ہوتی رہیں اُس قوم میں

مضحکہ سمجھیں بڑوں کی عزت و تعظیم کو  
دین میں مفلوج ہوں اخلاق میں مچھول ہوں  
ٹھوگرؤں میں جن کی ہوں ماں باپ کی خود داریا  
اور ہر انداز سے جن کے نسائیت تجھل  
ہر ادھر ناز سے محبوب ہو مردانگی

جن کے بیٹے چھوڑ دیں ماں باپ کی تعلیم کو  
مکتبوں کو چھوڑ کر جو داخل اسکول ہوں  
ہوں بزرگوں کے شعائر سے جنہیں جیزاریاں  
ناز و محبوبانہ سے ہر طور جن کا منفصل  
جن کی ایک ایک بات سے مجروح ہو فرزانگی

جن کے دل نفرت سے معمور اور آنکھیں شعلہ بار  
جن کی تاریکیں تعصب سے چسپم درکنار  
بزدلی کی ہوں سند جن کی کتابوں کے ورق  
لیں بجائے درسِ حریت غلامی کا سبق  
جس کے بیٹے مادرِ بھارت کی رسوائی کریں  
جس کے بیٹے غیر کے در پر جہیں سائی کریں

تیر برس جن کی ہر تقریر سے، مضمون سے  
راہ میں چوٹی کی پامالی کا بھی ڈر ہو جنہیں  
جو نہ جیتے ہوں نہ مرتے ہوں وطن کے واسطے  
جیل جانے کے عوض جائیں جو دفتر کی طرف  
آہ وہ دفتر، جہاں حیوانیت ہو حکمراں  
عدل اور انصاف کا نیلام ہوتا ہو جہاں  
حق کیا جاتا ہو ناحق اور ناحق، حق جہاں  
کوڑیوں کے مول میں انسان بکتا ہو جہاں  
مکر و کذب و فسق کی تلقین ہوتی ہو جہاں  
حق آزادی و حریت جہاں محبوس ہو  
داد خواہی جس جگہ روتی ہو دعاڑیں مار کر

رنگ لیں دامن جو اپنے بھائیوں کے خون سے  
شیر مادر کی طرح خونِ برادر ہو جنہیں  
ہوں جو نافرمان گل اپنے چمن کے واسطے  
ہوں غلامانہ نگاہیں جن کی افسر کی طرف  
ابن آدم کی شرافت ذبح ہوتی ہو جہاں  
خنجر بیداد خوں آشام ہوتا ہو جہاں  
عدل کا خون، رحم کا ہوتا ہو سینہ شق جہاں  
چند سکوں کے عوض ایمان بکتا ہو جہاں  
صدق و عدل و رحم کی توہین ہوتی ہو جہاں  
اپنی رفعت سے جہاں انسانیت مایوس ہو  
بیگناہی مار ڈالی جائے باڑیں مار کر

غور تو کرتے تھے سے مرد اچھے ہیں اب یا عورتیں؟  
بھینسی سے ہے یوں تو قوم ساری ہی غلام  
شرم کر تیری طرح محروم ہیں کیا عورتیں  
تو ہے غیروں کا، مگر بیٹی ہے اپنوں کی غلام  
سیج دل میں شکر سمجھو یا شکایت چاہیے  
نام سے بیٹے کے ادنا مرد غیرت چاہیے

بہل سیدی جوشی

ٹونک



# افسانہ نگاری

محمد یوسف ظفر۔ بی۔ اے

میں کس قدر زندگی ہے، اور یہ افسانہ اُس کے بچے کی آئندہ حیات پر کتنا اثر انداز ہو گا۔ مذہبی میدان میں افسانوں نے جس قدر حصہ لیا ہے، وہ انہرمن اُنس ہے۔ حضرت سلیمان، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف علیہم السلام اور دیگر واقعات قرآن حکیم میں، کورو پانڈوں کی جنگ۔ سری کرشن؟ اور سری رام چندر جی کے واقعات رامائن میں اور دیگر مذہبی کتابوں میں بزرگوں کے تذکرے فی الحقیقت افسانے ہیں اور اپنی افسانوں نے انسان کی زندگی کو رنگنے کی جس قدر کامیاب سعی کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش و تحسین ہے۔

دنیا بھی ایک افسانہ ہے اور افسانہ کو پسند کرتی ہے، لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے افسانہ نگاری کا ملکہ حاصل کیا ہو، انسان کا دل و دماغ ایک رنگین اور دلکش کامیاب افسانے کے تاثرات کو بڑا شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن بہت کم افسانہ نگاروں کو یہ محسوس ہو سکا ہے کہ وہ احساس جو اس طرح پیدا ہوتا ہے کس قدر اخلاقی قوت حامل ہے اور اس اخلاقی قوت کو کس طرح جائز طور پر استعمال کیا جائے ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ایک ایک عمدہ اور کامیاب افسانہ، افسانہ نگار کے اپنے ذہنی ارتقا کا شاہد ہے۔

افسانوں کی ابتدا درس آموزی کی غرض سے ہوئی۔ اُس زمانہ میں جب ادب صرف افسانوں اور کہانیوں کا دوسرا نام تھا، اُن کا مقصد تعلیمی تھا، واقعات ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں اُسنے

دور حاضر میں افسانہ کو تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ قرار دیا جاتا ہے، اور فی الحقیقت موجودہ نسلوں کو گزشتہ زمانے کے تجربات اور بچہ وقت کی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لئے افسانہ ہی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ افسانہ میں رومانی حیثیت کے علاوہ واقعات کو جس قدر دخل ہے وہ ظاہر ہی ہے۔ اگرچہ ان میں مبدت بہت کم ہوتی ہے، لیکن پھر کیف انسان کے اخلاق اور عادات پر انہیں افسانوی واقعات نے جس قدر اثر ڈالا ہے وہ شاید ادبیات کی تمام دیگر صنوف سے بڑھ کر ہے۔ افسانے عہد ماضی کے حاصل ہیں، اور دور جدید کے لئے یہ عجیب ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ نسلوں کی تعلیم و تربیت میں افسانوں کا درجہ بہت بلند ہے، اُس زمانے میں جب استادوں اور کتابوں نے انسان کو سدھارنے کا بیڑا نہیں اٹھایا تھا، کہانیاں اور صرف کہانیاں ہی اس مقصد کو حل کر سکتی اور کرتی تھیں۔ بچے اور نوجوان۔ مرد اور عورتیں اپنے بزرگوں کے گرد حلقہ لگائے عشق و محبت، شجاعت و دلیری قربانی اور ایثار کے رنگین اور دلکش افسانے سنا کرتے، یہ افسانے حقائق پر مبنی ہوتے اور کوئی شخص بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا، آج بھی ماں اپنے بچے کو سنے رات کے اولین حصے میں اپنے بزرگوں کی تعظیم کرتی ہے، اور اسی روش پر گامزن ہے جو قدما اور متاخرین نے تیار کی تھی، آج بھی وہ اپنے بچے کو خوش کرنے کے لئے افسانے سناتی ہے۔ لیکن اُسے یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس ایک سچی طبعی اور ایک تھاپوٹا



بجائے دماغ کے احساسات پر اثر پڑے۔

چند چیزیں جو ہر افسانہ کے لئے جزو اتم ہیں اور جن کے بغیر افسانہ کی حقیقت فی الواقع افسانہ ہو جاتی ہے، ہر افسانہ نگار کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ یہ نقائص افسانہ کی جان ہیں۔ خواہ وہ افسانہ اخلاقی ہو یا معاشرتی۔

سیاسی یا مذہبی، ہر افسانہ نگار ان پر جانتے ہوئے یا نہ جانتے ہوئے عمل کرتا ہے۔ ان میں ہم نقائص افسانہ کی روح و رواں ہوتے ہیں۔ (۱) تہید (۲) واقعات کا بندوبست بڑھاؤ (۳) Climax (۴) یا افسانہ کا ماحول (۵) اختتام۔

تہید ہر چیز کے لئے لازمی ہے۔ لیکن افسانے کی اجتہاد افسانے کی جان ہوتی ہے۔ جس طرح گوڑہ دوڑ میں ایک گھوڑے کی دوڑ آغاز پر منحصر ہوتی ہے مین اُسی طرح افسانے کا آغاز بھی اُسے کامیاب یا کامیاب بنانے میں بڑا حصہ لیتا ہے اور محض بُرے آغاز کی بنا پر کئی افسانے ناکام ہو جاتے ہیں۔

تہید میں مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہیرو سے پڑھنے والے کو تعارف کرا دیا جائے یا ایک پر وہ پس پشت افسانہ کے لئے تیار کیا جائے۔ اسے

(Background) کہنا چاہیے۔ لیکن اس تہید سے پڑھنے والے میں دلچسپی ضرور پیدا ہو۔ اور یہ افسانے کی رنگینی اور چاشنی میں اضافہ کرے۔

افسانہ نگار کے لئے لازم ہے کہ وہ تہید ہی میں ایسی جاذبیت پیدا کرے کہ اُن احساسات کو جگانے کی کوشش کرے جن کا تعلق نفس افسانہ سے ہے۔ پہلا یہ امر قابل ذکر ہے کہ جس قدر تہید چھوٹی ہوگی اُسی قدر ہیرو اور موثر ہوگی۔

بے لگے جگہ اور بیکار تہیدیں بلاوجہ باعث تکلیف ہو جاتی ہیں، اور پڑھنے والے پر اُن کا بار پڑتا ہے اور وہ اُن کو روندتا ہوا اصل افسانہ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آجکل اس افسانہ کی نسبت بھی اُس کی چاشنی اور دلچسپی اہم ہے۔

اور تہید سے ہی پڑھنے والے کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ جس افسانے کا وہ مشتاق ہے وہ افسانہ یہی ہے۔ لمبی چوڑی تہید کی بجائے چند تو صوفی اور

ترکیمی جیسے استعمال کرنے چاہئیں اور آغاز کو سوچ کر چند حرف ہی بھرتہ تہید کافی ثابت ہوں گے۔

نفس افسانہ میں معراج کی طرف واقعات کا بندوبست بڑھاؤ بھی بہت اہم ہے۔ اس مقام پر ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ واقعات کو قدم قدم بڑھایا جائے، اور پڑھنے والا کم از کم معراج کو پہلے سے ہی سمجھنے کی کوشش کرے گا۔

صورت میں منتقل کر دئے جاتے تھے، تاکہ وہ موجودات کی زندگیوں کے بنانے میں کامیاب ثابت ہوں۔ اس طرح انسان قدرت کے احکام کی خلاف ورزی کوئی کی پاداش اور فطرت کے جذبہ انتقام سے آگاہ کر دئے جاتے تھے، اور اس طرح وہ شجاع پرستی اور اخلاقی جرات کی خوابیدہ رگوں کو بیدار کیا کرتے تھے، جن میں ہم انسان کے ارتقاء کی منازل پر غور کرتے چلے آتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ افسانوں کا درجہ کسی حالت میں بھی کم نہیں ہوتا۔ ہر عہد میں ہر نسل کے پاس افسانوں کا موروثی ذخیرہ سبز سبز چلا آتا ہے جو تاریخی لحاظ کے علاوہ اور افسانوی پہلو کے باوجود ایک بلند و بالا مقصد لئے ہوئے ہوتا ہے سب مل جاتے اپنے زمانہ میں بھی افسانہ اپنی عظیم الشان وقعت لئے ہوئے ہے اور ہم اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شاید انسان کی زندگی پر اخلاقی تدبیریں کتب نے بھی اس قدر احسان نہیں کیا جس قدر افسانہ کی مابہیت نے کیا ہے۔ افسانہ نے جو سلوک گزشتہ نسلوں کے ساتھ روا رکھا تھا وہ آج ہم سے بھی وہی رعایت برت رہے ہیں، اور ہم اُن کے مرہونِ سنت ہیں۔

اگر ہم جائزوں اور افسانوں کی دماغی زندگی کے فرق پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اس مسئلہ میں انسان کی فوقیت بالخصوص اس امر میں ہے کہ وہ مستقبل کے لئے اپنا مقصد قائم کر لیتا ہے، اور جائزہ اپنے آباء اجداد کی طرح اپنی شہنی زندگی بسر کرنے پر مجبور اور مطمئن ہیں۔ انسان کے دماغ میں اُن چیزوں کے تصورات کے دھندلے دھندلے نقوش پیدا ہو جاتے ہیں جو آئندہ ہر وہ چیزیں پر وقوع پذیر ہونے دیتے ہیں۔ بچہ جائزہ اور انسان کی مہذبہ صلیں۔ کھڑا ہو کر اپنے قرب و جوار پر نظر ڈالتا ہے، اپنے اندرونی جذبات کے تحت درختی بیانی کی بنا پر وہ ہر چیز کو ایک شفقی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اب یہ انسان کی ذمہ ہے کہ وہ اپنے کو اس شفقی اور شفقی دنیا سے نکال کر مادی دنیا سے متعارف کریں اور اپنے پر اُس کی حقیقت اور اُس کی زندگی کی ماحول پر مقاصد واضح کر دیں۔

اب سوال یہ ہے کہ افسانہ کس کو کہتے ہیں؟ اگرچہ یہ سوال علمی طور پر دیکھنے کا معمولی نظر آتا ہے لیکن بہت کم اہل قلم افسانہ کی صحیح تعریف پیش کر سکے ہیں، واقعات کی بے نقاب یا تاریخی بیان کہ افسانہ قرار دے دیتے ہیں مبالغہ کی منت کچھ اور ہے۔ میرے نزدیک افسانہ سچے باقیاتی واقعات کا اس طرح بنایا جاتا ہے کہ واقعات بندوبست ایک دوسرے سے منسلک رہیں، اور

تاکہ اُس کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ ہر افسانہ نگار صرف ربط پر ہی ندر دیکر افسانہ کی خوبی پر چار چاند لگا سکتا ہے۔ یہاں پر محاوروں کا استعمال اور سلاست کو بھی دخل ہونا چاہیے۔

معراج یا (Climax) پر نام افسانے کا دار و مدار ہوتا ہے، افسانے میں معراج کی خاطر واقعات کو بڑھاتے چلے جانا چاہیے کیونکہ معراج کی ناکامی تمام افسانے کی ناکامی ہے، افسانہ کی زندگی کا تمام تر انحصار معراج پر ہے، اور معراج میں افسانہ نگار کی قابلیت کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ بغیر معراج کے کوئی افسانہ افسانہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر یہاں پر ندر جیرانی کو دخل ہو جائے تو یہ بھی اُس کی خوبی ہے۔ اور کم از کم خداحید میں جیرانی افسانہ کے لئے جو لازم ہے اور اخلاقی افسانہ تو بغیر معراج کے بے معنی تحریروں کا مجموعہ ہے۔

معراج کی طرح افسانے کے انجام کو بھی کامیابی اور ناکامی میں دخل ہے، ایک اچھا افسانہ خاطر خواہ انجام نہ پاسنے کی وجہ سے بے معنی سا ہو جاتا ہے، کیونکہ اُن احساسات کا جو معراج میں اتہا تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔

سبب انہم پر منحصر ہے، اور پڑھنے والا خود بخود یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ افسانے کا انجام بھی ہے اور وہ وہی تاثرات لے کر اُسٹے جو معراج میں اُس لے رکھے گئے تھے۔ یہاں پر دماغ کو قدسے سکون ملنا چاہیے، تاکہ نام افسانہ پر ایک نظر ناز ڈالنے اور گہرائیوں کی تک پہنچنے میں کامیابی ہو۔

اس لئے ہر اچھے افسانے میں دلچسپی پیدا کرنے والی تہید۔ واقعات کا باقاعدہ اور مکمل پڑھاؤ، اور معراج جو تمام افسانے کی روح ہے کا نظام اور ایک لطیف انجام جس سے پڑھنے والے کو سکون سا نصیب ہو۔ ہونا چاہیے۔ یا دوسرے الفاظ میں ایک افسانے کے لئے ہیرو۔ واقعات کی رفتار۔ پلاٹ اور انجام اسی کا جسم ہیں۔

چند واقعات کو ایک لڑی میں پرودے کا نام افسانہ نہیں، بلکہ افسانہ کا جزو اساسی واقعات کا درجہ بدرجہ ربط اہ اُن کا ایک ذرہ دست برداشتی میں ٹھہر اور چھوٹے چھوٹے کزرد واقعات پر دسترس ہی افسانہ کو یہ نام ملے سکتے ہیں، اور اس سے بھی بڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ اس میں کچھ ہونا چاہیے۔

## مقدار یا معیار

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ کلیم کے حجم کو دیکھتے ہوئے اُس کا چندہ زیادہ ہے۔ حالانکہ ہر سراسر غلط واقعہ ہے، اتنے بڑے سائز کے ساتھ کلیم کا جو حجم ہے وہ اردو زبان کے کسی پرچے کو میسر نہیں۔ چھوٹے سائز کے پرچے زیادہ سے زیادہ ساٹھ سطروں پر مشتمل ہوتے ہیں، اور کلیم بڑے سائز کے باوجود تقریباً سو صفحے پیش کرتا ہے، اور اس لحاظ سے وہ اردو کا سب سے زیادہ سستا پرچہ ہے۔

اور اگر یہ غلط واقعہ امر تسلیم ہی کر لیا جائے کہ کلیم کا حجم حسبِ مراد نہیں ہے، پھر بھی یہ اہم سوال باقی رہ جاتا ہے کہ معیار کی "مقدار" قابلِ توجہ ہوتی ہے، یا اُن کا "معیار" اور کسی شے کا "وزن" اُس کی خوبی کا فاسن ہوتا ہے، یا اُس کے "محاسن"؟ اگر معیار "محاسن" سے قطع نظر کر کے کسی شے کی قدر و منزلت "مقدار" و "وزن" پر مبنی ہو سکتی ہے تو خاک کے ایک ہیئت بڑے انبار کو ترجیح دی جاسکتی ہے، ایک ہیئرے کے ٹکینے پر، کیونکہ ہیئرے کا ٹکینہ چھوٹا ہوتا ہے۔ اور ایک ہاتھی کو ترجیح دی جاسکتی ہے انسان پر، کیونکہ ہاتھی کا جسم گوشت کی ایک ہیئت بڑی مقدار کا حامل ہوتا ہے۔

(منیجر کلیم)

# انڈین نیشنل کانگریس

اور ہندوستانی مسلمانوں کے بڑے بڑے سوال

## گزارش

۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۶ء تک مختلف اوقات میں کانگریس نے ہمارا ایسی تجویزیں منظور کی ہیں جن کا براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں سے تعلق ہے، ان سب تجاویز کو جمع کرنے اور ان کے متعلق تفصیلی طور پر لکھنے سے ایک خامی کتاب مرتب ہو جائے گی۔ ہمارا مقصد اس وقت صرف اس قدر ہے کہ کانگریس کی کارروائیوں میں سے بعض چیدہ چیدہ تجاویز درج کر دیں تاکہ مسلمانان ہند کو اس قومی ادارہ کی ہمہ گیری اور اہمیت کا ہلکا سا اندازہ ہو جائے اور وہ اُسے محسوس کریں کہ مسلمانوں کی حقیقی خدمت فرقہ پرست انجمنیں نہیں بلکہ صرف استوار دشمن اور کٹر قومی ادارے کر سکتے ہیں، جن کے دروازے ہر ملت کے قریب اور جودہ چید کرنے والے لوگوں کے لئے یکساں کھلے ہوئے ہوں۔

ہم نے بعض تجاویز بیرونی اسلامی ممالک کے متعلق دی ہیں اس کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی دلجوئی نہیں ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ اسلامیان ہند سے خوب محسوس کریں کہ آج ہندوستان اور اسلامی دنیا میں اس لئے قرب و بچانگی پیدا ہو رہی ہے چونکہ بیشتر ایشیائی ممالک مغربی استعمار اور خصوصیت سے برطانوی استعمار کے نیچے دب گئے ہیں اور ایک کی قومی جدوجہد کا دوسرے پر لانا اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج مصر، شام، فلسطین، ترکی

موتب کس دہ

شعبہ اطلاعات سیاسی و معیشتی آل انڈیا کانگریس کمیٹی - الہ آباد

طرابلس اور دوسرے اسلامی ملکوں پر ہندوستانی قومی تحریک کی بڑا بڑا گاہ رہتی ہے اور خلافت کی تحریک نے تاریخی طور پر ہندوستان میں ایک بلند پایہ قومی اور ملی تحریک کا درجہ اختیار کر لیا تھا، اس سے یہ بات بھی صاف ہر جا گئی کہ بیت سے ایسے سیاسی مسئلے جنہیں مسلمان خالص انداز پر اور اپنی تصور کرتے ہیں۔ کانگریس کے استوار دشمن ملک کی وجہ سے ہم کانگریسوں کے لئے اسی درجہ اہم ہیں اور ہماری سیاست کا لازمی جزو ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں پنڈت جواہر لال نے تقسیم فلسطین اور واقعات سرحد سے بڑا گہری دلچسپی لی ہے اور کانگریس نے براہ تجاویز منظور کریں اور ان پر عمل کیا ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے متعلق کانگریس کی تجاویز پڑھنے سے یہ خوب واضح ہو جائے گا کہ کانگریس نے یا تو مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا ہے مثلاً سندھ کی علیحدگی اور صوبہ سرحد کے لئے اصلاحات کا مطالبہ یا غیر مثبت الفاظ میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ کانگریس فرقہ دارانہ مسئلہ کا کوئی مخصوص حل اس وقت تک تسلیم نہ کرے گی جب تک تمام فرقوں کو یہ صورت منظور نہ ہو، کانگریس کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ جب اس نے نزاعی فرقہ دارانہ سوالات کا ایک حل پیش کیا لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ ایک یا دونوں فریق اس مخصوص تجویز سے متفق نہیں ہیں، تو اس نے

جو تامل اسے ضائع کر دیا۔

غرض کہ قیادتوں اور مسلمانوں کو بالخصوص کانگریس کے رویہ اور ضیعت کے متعلق اطمینان ہونا چاہئے۔ جیسا کہ وقت بے وقت (اور خاص کر ایسے زمانہ میں جب متحدہ قومی تحریک کے آثار بڑھنے لگیں اور آزادی کی جدوجہد سامنے آ رہی ہو) یہ خوف دلایا جاتا ہے کہ کانگریس میں غیر مشروط طور پر شریک ہونے سے ان کے جائز حقوق خطرہ میں پڑ جائیں گے، اعتراض کرنے والوں اور خوف دلانے والوں کا بظاہر قومی اور ملکی آزادی کی جدوجہد سے کم از کم اس وقت دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا۔

میں نے کانگریس کی سجاوید مضامین کے اعتبار سے نہیں بلکہ سنہ اور تاریخ کے لحاظ سے بلا عنوان دئے درج کر دی ہیں تاکہ تسلسل کا اظہار ہو جائے۔ (محمد اشرف)

### ۱۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بنارس ۳۰، ۳۱ مئی ۱۹۲۰ء

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی قطعی رائے ہے کہ ترکی کو صلح کی جو شرائط پیش کی گئی ہیں وہ ان وعدوں کے خلاف ہیں جو حکومت برطانیہ نے کئے تھے اور قومی خود مختاری کے اصول، جسے اتحادی حکومتوں نے تسلیم کر لیا تھا، کے منافی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو تکلیف پہنچانے والے ہیں، اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ دوران جنگ میں ہندوستان کی دولت البتہ میں آزادی کے ساتھ استعمال کی گئی تھی، یہ کمیٹی اس کی مذمت کرتی ہے کہ اس استعمال کا نتیجہ مذکورہ بالا صلح کی شرائط کی صورت میں ظاہر ہو جس سے خلافت کا وقار اور طاقت تباہ ہوتی ہے اور مسلمانوں کے مقدس مقامات خلافت کے قبضہ و حفاظت سے نکل کر ہمسائیوں کے قبضہ یا اثر میں آتے ہیں۔

کمیٹی پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ ہندوستان میں امن اور اطمینان کے قیام کی خاطر صلح ترکی کی شرائط پر ایسی نظر ثانی کی جائے کہ وہ متذکرہ بالا وعدوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جائز مطالبات کے مطابق ہو جائیں۔

۲۔ اجلاس خاص کلکتہ ۱۶، ۱۸، ۱۹ ستمبر ۱۹۲۰ء  
اس امر کے پیش نظر کہ خلافت کے مسئلہ پر ہندوستان کے مسلمانوں

سے متعلق جو ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں ان کو پورا کرنے میں حکومت برطانیہ اور حکومت ہند دونوں نمایاں طریقہ پر ناکام رہی ہیں اور وزیر اعظم نے امداد ان وعدوں کو جو انہوں نے مسلمانوں سے کئے خلافت و ریزی کی ہے اور چونکہ ہر غیر مسلم ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی ان کی مذہبی مصیبتوں کے دور کرنے میں ہر جائز طریقہ سے مدد کرے۔

۱۔ اور اس واقعہ کے پیش نظر کہ اپریل ۱۹۱۹ء کے حادثات میں دولہا متذکرہ بالا حکومتوں نے پنجاب کے بے گناہ لوگوں کو سجانے اور ان افسروں کو جیلوں نے ان کے ساتھ غیر سہاویانہ اور وحشیانہ سلوک کیا تھا سزا دینے میں تا کو تا ہی کی ہے بالکل ناکام رہی ہیں اور سر مائیکل اوڈ وائر کو جو اکثر سرکاری جوائنٹ کے براہ راست یا بالواسطہ ذمہ دار تھے اور جنہوں نے ان لوگوں کی مصیبتوں سے جان کی حفاظت میں رکھے گئے تھے، بے پرواہی برتی، ذمہ داریوں سے بری کر دیا ہے، نیز چونکہ دارالعوام اور دارالامر کے مباحثوں میں ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کی تکلیف وہ کسی ظاہر ہوتی ہے اور صوبہ پنجاب میں باقاعدہ تشدد اور ہیبت انگیزی کی حمایت کا پتہ چلتا ہے، اور چونکہ وائسرائے کے آخری اعلان میں پنجاب اور خلافت کے معاملات پر ذمہ داریاں پاتا سمٹ کی کوئی علامت نہیں ملتی اس لئے

۲۔ اس کانگریس کی رائے ہے کہ ہندوستان کو اس وقت تک چین نہیں آسکتا جب تک اوپر ذکر کی ہوئی دو بے انصافیوں کی تلافی نہ ہو جائے اور یہ کہ قومی وقار برقرار رکھنے اور اس قسم کی دوسری بے انصافیوں کو روکنے کا موثر ذریعہ صرف سوراخ کا حصول ہو سکتا ہے، اس کانگریس کی مزید رائے ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ عمل نہیں ہے کہ غیر متشدد و ترک موالات کی پالیسی جسے مسٹر گاندھی نے شروع کیا ہے، اختیار کی جائے تاکہ متذکرہ بالا بے انصافیوں کی تلافی ہو جائے اور سوراخ حاصل ہو جائے۔

### ۳۔ ورکنگ کمیٹی بمبئی ۱۵، ۱۶ جون ۱۹۲۱ء

اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر حکومت برطانیہ، انگلند کی ترکی سلطنت کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کرے تو ہندوستانیوں کو حکومت کی مدد کرنی مناسب ہے یا نہیں؟ ورکنگ کمیٹی کی رائے ہے کہ ترک موالات کی

اس تجویز کے پیش نظر جو کلکتہ کانگریس کے خاص اجلاس میں منظور کی گئی تھی، ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ کے خلاف ان کا رد و ایوان میں حکومت برطانیہ کی مدد کرنے سے باز رہے، اور اس لئے ہندوستان کے سپاہی ہمیشہ طبقہ کو چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت کی خدمت کرنے سے انکار کر دے۔

۴۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بمبئی ۲۸، ۲۹، ۳۰ جولائی ۱۹۲۱ء

”حسب ذیل تجویز کو جو مرکزی خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام اہالیان بمبئی کے ایک عام جلسہ میں پاس ہوئی ہے نوٹ کر لیا جائے۔

”اس واقعہ کے مد نظر کہ ہندوستان کے باشندوں کی قیمت لازمی طور پر ہمہ ایہ ایشیائی اقوام اور حکومتوں کے ساتھ وابستہ ہے مسلمانانِ تبتی کا یہ جلسہ عام آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ہندو حکومتوں کے ساتھ محبت اور اتحاد کے جذبات کو ترقی دینے کی کوشش کرے اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی خواہی اور ہمدردی کے تعلقات قائم کرنے کی غرض سے ہندوستان کی ایک واضح اور قطعی خارجی پالیسی ترتیب دے۔

”میں نے کیا گیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے تجویز کی مدد سے سرگرمی سے، جلسہ کے صدر اور مرکزی خلافت کمیٹی کے پاس روانہ کر دی جائے اور اس بات کا شکریہ ادا کیا جائے کہ انہوں نے اتنے اہم مسئلہ کی طرف آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی توجہ مبذول کرائی اور دو کتاب کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ متذکرہ پالیسی کے متعلق ایک بیان تیار کرے تاکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں غور و غوض کے لئے پیش کیا جائے۔

۵۔ ورکنگ کمیٹی ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء بمبئی

خارجی پالیسی کی اس تجویز کے متعلق جس بحث نے ذریعہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جولائی کے اجلاس بمبئی میں خاص طور پر ورکنگ کمیٹی سے ایک بیان تیار کرانے کی درخواست کی تھی، ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ کانگریس پٹرس کی حکومتوں اور دوسری سلطنتوں پر بھاری کر دے کہ

(۱) حکومت ہند کسی طرح بھی ہندوستان کی رائے عامہ کی نمانندگی نہیں کرتی ہے اور اس کی جو پالیسی بھی ہوتی ہے اس کی غرض روایتی طور پر ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت نہیں ہوتی بلکہ ہندوستان کو ہمیشہ اپنی غلامی میں رکھنا ہوتی ہے،

(۲) کہ ہندوستان کو ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے حاصل کرنے کے بعد دوسری حکومتوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، چونکہ اس کے باشندے ان میں سے کسی کو نقصان پہنچانے کے خواہشمند نہیں ہیں، اور اس لئے ان کا ارادہ کسی ایسے تجارتی رشتے کا قائم کرنا نہیں ہے، جسے متذکرہ بالا حکومتوں کے باشندے نہ پسند کرتے ہوں یا جو ان کے اغراض و مفاد کے منافی ہو۔

(۳) نیز یہ کہ ہندوستان کے باشندے اکثر ان معاہدوں کے متعلق جو حکومت برطانیہ اور ہمسایہ حکومتوں کے درمیان طے پائے ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ استعماری حکومت نے ہندوستان میں لوٹ بھاری رکھنے کے لئے کئے ہیں، اور اس لئے ان حکومتوں سے جو ہندوستان کے باشندوں کی بدخواہ اور ہندوستان کے مفاد کو نقصان پہنچانے کے خواہشمند نہیں ہیں، مطالبہ کرتی ہے کہ استعماری حکومت کے ساتھ اس قسم کے معاہدے کرنے سے باز رہیں۔

”کمیٹی اسلامی حکومتوں کو یہ بھی یقین دلاتی ہے کہ جب ہندوستان خود مختاری حاصل کرے گا تو اس کی خارجی پالیسی ایسی رکھی جائے گی جس میں مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی توقیر کا خاص لحاظ ہوگا۔۔۔۔۔

۶۔ اجلاس سالانہ منعقدہ احمد آباد ۲۷، ۲۸، ۲۹ ستمبر ۱۹۲۱ء

”یہ کانگریس غازی مصطفیٰ کمال پاشا اور حوٹوں کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور ترکی قوم کو یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان کو ان کے ساتھ پوری ہمدردی ہے اور ان کی موجودہ حیثیت اور آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد میں مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔

۷۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ۲۰ تا ۲۲ جون ۱۹۲۲ء، کلکتہ

”آل انڈیا کانگریس کمیٹی ترکی قوم کو جلدیہ فتوحات پر مبارکباد دیتی ہے

صوبہ بھارت کی کانگریس کی مجلس عاملہ عام طور پر ان لوگوں کو ترجیح دے گی جن کی سفارش صوبائی خلافت کمیٹی نے کی ہو۔

(۳) مجلس قانون ساز کی کانگریس پارٹی کا کوئی رکن فرقہ دارانہ مسئلہ سے متعلق کوئی ایسی تجویز قانون یا ترمیم پیش نہ کرے گا جس کی کانگریس پارٹی کے ہندو یا مسلمان اراکین کی تین چوتھائی کی اکثریت خلاف ہو۔

۱۱۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بمبئی ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ مئی ۱۹۲۶ء

ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق حسب ذیل مزید تجویزیں منظور ہوئیں۔

(۱) مسلمان لیڈروں کی یہ تجویز کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں اور برطانوی بلوچستان میں اس قسم کی اصلاحات نافذ کی جائیں جیسی کہ دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں، کمیٹی کی رائے میں مناسب اور معقول ہے اور اس کو عمل میں لانا چاہیے، اور اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ دوسرے انتظامی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان صوبوں میں ایک مناسب عدالتی نظام بھی نافذ کیا جائے۔

(۲) اس تجویز کے متعلق کہ سندھ کو الگ صوبہ بنادیا جائے اس کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ زبان کی بنیاد پر صوبوں کی دوبارہ تقسیم کا وقت آگیا ہے، یہ ایک ایسا اصول ہے جسے کانگریس کے دستور میں تسلیم کر لیا گیا ہے۔

کمیٹی کی یہ بھی رائے ہے کہ صوبوں کی دوبارہ تقسیم کا کام فوراً شروع کر دینا چاہیے اور جو صوبہ زبان کی بنیاد پر علیحدگی کا مطالبہ کرے اس کا اس اصول کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

کمیٹی کی مزید رائے ہے کہ اندھڑا، سندھ اور کرناٹک کو علیحدہ صوبہ قرار دے کر اس کام کی ابتدا کی جاسکتی ہے۔

(۳) آئندہ دستور میں ہر شخص کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور مرکزی یا صوبہ بھارتی کسی کونسل کو آزادی ضمیر میں مداخلت کا حق حاصل نہ ہوگا۔

ضمیر کی آزادی، سے مراد اعتقاد اور عبادت کی آزادی، مذہبی رسوم کی ادائیگی اور اجتماع کی آزادی، دوسروں کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے اور دوسروں کے اسی قسم کے حقوق میں مداخلت کئے بغیر مذہبی تعلیم و تبلیغ کی آزادی ہے۔

۱۲۔ اجلاس، کلکتہ ۱۹۲۸ء

یہ کانگریس تیسرے شام جلسے میں اور حقائق کے لوگوں کو مغربی استعاریت

اور اپنی اس قسمی رائے کا اظہار کرتی ہے کہ ایشیا اور یورپ کے ترکی علاقوں میں پوری اور بے روک آزادی دینے کے متعلق حکومت انگلینڈ کے تمام مطالبات پر سے نہ کر دئے جائیں اور جب تک جزیرہ العرب کو غیر اسلامی قبضہ سے آزاد نہ کر دیا جائے ہندوستان میں امن و اطمینان نہیں ہو سکتا۔

۸۔ اجلاس سالانہ منعقدہ گیا ۱۹۲۲ء

چونکہ مشرق قریب کے نازک حالات خلافت اور حکومت ترکی کے وجود کے لئے خطرہ ہو رہے ہیں اور ہندو، مسلمان اور ہندوستان کے دوسرے لوگ اس خطرے سے ہونے والے نقصانات کو مدد کرنے کا عزم رکھتے ہیں، یہ کانگریس طے کرتی ہے کہ ورکنگ کمیٹی، خلافت ورکنگ کمیٹی کے مشورہ سے ایسے ذرائع اختیار کرے جن پر عمل کر کے ہندو، مسلمان اور دوسرے لوگوں کی طرف سے ناجائز مفاد کی خاطر ہندوستان کو استیصال کئے جانے سے روکنے کے لئے متحدہ محاذ پیش کیا جاسکے اور صورت حال کا بندوبست کیا جاسکے۔

۹۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بلگرام ۲۸ دسمبر ۱۹۲۲ء

”اے پایا کہ کانگریس مصریوں کے ساتھ ان کی مصیبتوں میں مودبانہ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ وہ بیادری کے ساتھ ان آلام کو برداشت کریں گے اور ان کے ملک میں تشدد کا جو دور دورہ ہے اس کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔“

۱۰۔ ورکنگ کمیٹی سابرمتی ۴ مئی ۱۹۲۶ء

بحث و مباحثہ کے بعد ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق مجدد اور ہاتوں کے حسب ذیل تین تجویزوں پر اتفاق رائے ہوا۔

(۱) گفتگو پلیٹ کی شرائط کے پیش نظر کسی مجلس قانون ساز کے کسی کانگریسی ممبر کو یہ اہمیت نہ ہوگی کہ کوئی تجویز یا قانون جداگانہ انتخاب کو ختم کر کے مشترکہ انتخاب جاری کرنے کے لئے پیش کریں جب تک کہ اس کے متعلق مجلس قانون ساز کے ہندو مسلمان اراکین کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔

(۲) مجلس قانون ساز کے مسلمان امیدواروں کا انتخاب کرتے وقت

کر سکتے ہیں۔ یہ رپورٹ آئندہ مارچ کے اختتام سے پہلے کیٹی کے پاس پہنچ جانی چاہیے۔

تجویز مذکورہ بالا کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

”چونکہ شمال مغربی سرحدی صوبہ، میں فرنٹیر کرائم ریگولیشن (ضوابط جرائم صوبہ سرحد) مرڈس اور ٹریبس ایکٹ (قاتلانہ جرائم کے متعلق قانون) اور ضوابط تحفظ (سیکیورٹی ریگولیشن) وغیرہ کے انتہائی تباہ کن طریقے نافذ کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے عام شہریوں کی زندگی اس صوبہ میں ناقابل برداشت ہو گئی ہے اور جن کے غیر محتاط اور بلا امتیاز استعمال کی زد سے اچھے تعلیم یافتہ اصحاب بھی بچتے نہیں پاتے۔

”اور چونکہ قانونی سماعت، بحث یا اپیل کا موقع باقی نہیں رہا ہے۔ جس کی وجہ سے سرکاری جہدہ داروں کو سن مانے طریقے پر بے گناہ قتل کو ہر اسل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

یہ تجویز کی جاتی ہے کہ جلد ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے جو اوپر ذکر کئے ہوئے قوانین کو جانچے، شہادتیں لے اور ان کی وجہ سے جو نقصانات ہوئے ہیں ان کا پتہ چلائے اور ان کو جلد از جلد ختم کرنے کے ذرائع پر غور کرے۔

#### ۱۶۔ اجلاس سالانہ لاہور ۱۹۳۶ء

”چونکہ ہندو رپورٹ کو منسوخ کر دی گیا ہے، اس لئے فرقہ دار مسائل کے متعلق کانگریس کی پالیسی کا اعلان کرنا غیر ضروری ہے۔ کانگریس کو یہ یقین ہے کہ آزاد ہندوستان میں فرقہ دار مسائل کو صرف قومی عمل پر حل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ سکھوں نے خلع اور مسلمان اور دوسرے فرقوں نے عام طور پر فرقہ دار مسائل کے اس حل سے بے امنی ظاہر کی ہے جو ہندو رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے، کانگریس سکھوں، مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کو یقین دلاتی ہے کہ کسی آئندہ آئین میں اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل کانگریس کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جو تمام متعلقہ جماعتوں کو پورا اطمینان نہ دلا دیں۔

#### ۱۷۔ سالانہ اجلاس فیض پور ۱۹۳۶ء

کانگریس کی رائے میں شمال مغربی سرحد پر حکومت ہند کی اختیار کردہ

کے چوبیسے جو کانگریس کی رائے میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے لئے بڑا خطرہ ہے، آزادی حاصل کرنے کی کوششوں پر بار بار کاپوش کرتی ہے اور ان کو ہندوستان کی پوری ہمدردی کا یقین دلاتی ہے۔

#### ۱۸۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی لکھنؤ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۶ء

”آل انڈیا کانگریس کمیٹی ان ذلت آمیز اور تکلیف دہ پابندیوں کو جو جنوبی افریقہ کی یونین حکومت نے اپنے ملک میں قومی برادران کے داخلہ پر عائد کی ہیں نہایت افسوس کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان پابندیوں کو قومی توہین خیال کرتی ہے، کمیٹی کی رائے میں حکومت ہند، یونین حکومت پر ان ناقابل اعتراض پابندیوں کو اٹھانے اور جنوبی افریقہ میں قومی برادران کے داخلہ میں ہولتیں ہم سچانے پر اصرار نہ کر کے قومی وقار کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی ہے، خاص کر ایسی حالت میں جبکہ انہوں نے اس ملک میں قیام کے دوران میں سیاسی مباحث سے الگ رہنے کا خود ہی وعدہ کیا تھا۔

#### ۱۹۔ ورکنگ کمیٹی نیو دہلی ۳۰ فروری ۱۹۳۶ء

”کمیٹی نے افغانستان کی مالیہ اندرونی مشکلات، اور شاہ امان اللہ کی نافذ کردہ اصلاحات کو ختم کرنے کی رجحان پسندانہ کوششوں کا یقینی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، یہ کمیٹی دل سے ملک کی قومی پسند منام کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور افغانستان کو متحد اور ترقی پرورد ملک بنانے کی کوششوں کو کامیاب دیکھنے کی آرزو مند ہے۔

#### ۲۰۔ ورکنگ کمیٹی لاہور ۲۲ جنوری ۱۹۳۷ء

”نیچے درج کی ہوئی تجویز (جو کانگریس میں پیش کرنے کے لئے تیار کی گئی اور ورکنگ کمیٹی کو بھیجی گئی) کے متعلق یہ کمیٹی ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر کچھو اور لاہور دوئی چند انبالوی کو اس تجویز میں مندرجہ الزامات کے متعلق تحقیق کرنے اور جن قوانین اور ضوابط کا حوالہ دیا گیا ہے ان کی نوعیت اور ان کے نفاذ کے طریقوں کے متعلق رپورٹ تیار کرنے پر مامور کرتی ہے، ضرورت ہو تو یہ اصحاب دو مقامی اصحاب کو بھی جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ دو ہونے پر یک کار



پالیسی قطعاً ناکام رہی ہے اور اس لئے ہندوستان اور سرحد پار کے قبائل کے مفاد کو نقصان پہنچا یا ہے۔ یہ پالیسی ملکیت کے اغراض کی خاطر اضمار کی گئی جس کا مقصد زیادہ تر یہ ہے کہ ہندوستان کے گرانبار فوجی اخراجات کو جائز ثابت کیا جائے، اور نیم جنگی حالات پیدا کر کے ان فوجوں کو جو عام طور پر جنگی پڑھی رہتی ہیں، استعماری اغراض کے لئے ٹریننگ دی جائے، کوئی پالیسی جو ہوائی جہازوں کے ذریعہ مہاری میے خلاف انسانیت اور وحشیانہ طریقوں کے استعمال اور سرحد پار کے علاقوں پر ہمیشہ فوجی حملوں کو ضروری قرار دے قابل مذمت ہے، اس کے علاوہ یہ پالیسی سرحد پر امن قائم کرنے میں ناکام طریقہ پر ناکام رہی ہے اور اکثر سرحد پار کے صلیف قبائل کو دشمن اور مخالفت بناتی رہی۔ ہندوستان کے اندر دینی و بیرونی دونوں مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ سرحد پر امن ہو اور ہمارے ہمایوں کے ساتھ دوستوں کیساتھ تعلق قائم رہے، اور کانگریس یقین رکھتی ہے کہ یہ دوستانہ تعلقات اور امن بغیر کس وقت کے قائم کئے جاسکتے ہیں، اگر سرحد پار کے قبائل کے ساتھ دوستوں اور اچھے ہمایوں کے مانند سلوک کیا جائے اور تہذیب پھیلانے یا اقتصادی

اعانت پہنچانے کے جیسے سے فوجی سڑکیں تیار کر کے یا کسی دوسرے پردے میں ان کے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ کانگریس یقین رکھتی ہے کہ سرحد کے چٹان قبائل کے خلاف غیر مستند، خطرناک، ظالم اور حملہ آور ہونے کے الزامات بے بنیاد ہیں، اور اس لئے رائے گئے ہیں کہ ان کی بنا پر ناجائز مداخلت اور کثیر فوجی اخراجات کو صحیح ثابت کیا جائے۔

کانگریس اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنے ہمایوں سے دوستی چاہتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ امن اور فلاح انسانی کو ترقی دینے والے بڑے کاموں میں تعاون کے لئے تیار ہیں۔

سرحد پار کے علاقوں میں کبھی تعزیری کارروائیوں کی، جو حکومت ہند کی بے نتیجہ اور خطرناک سرحدی پالیسی کی مزید مثال ہے اور جس سے تباہی اور ناخوشگوار کی ایک لائن ہی سلسلہ شروع ہوتا ہے کانگریس مذمت کرتی ہے۔ کانگریس کی رائے میں سرحد کے مسئلہ کو حل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سرحدی علاقہ کی اقتصادی سیاسی اور فوجی حالات کی تحقیقات کی جائے، تاکہ سرحدی قبائل کو ساتھ لے کر سرحدی مسائل کو پر امن طریقہ پر ہمیشہ کے لئے حل کر دیا جائے۔

آزاد ہونے، شادمانی ہے چپی  
نشان ہو قلب، کامرانی ہے چپی  
کچھ چپی ہو، خراش قلب وینہ کی  
محسن نہ کہ زندگانی ہے چپی

طوفان کے عجزیت کی بجائے  
اس برتن جہاں سوز کو چھپا کر دے  
گنگا میں پانی ہے علم سے اسے شہید  
مصرعہ جہاں تلوں کو داپ کر دے



## وہ واقعہ!

انسان کی زندگی بعض دفعہ کئے چھوٹے چھوٹے واقعات سے شدید طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ بظاہر معمولی واقعات کیسے انقلاب انگیز ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ روزمرہ کی ناقابل التفات باتیں وہ معجزہ ثانی کرتی ہیں کہ اہم حادثات بھی ان گشت بدندان ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں اور شاہد لڑکپن سے ساتھ رہتے رہتے آئے تھے، وہ میرا چچا زاد بھائی تھا، ہم لوگ ابتدا سے برابر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، میں اسے اکثر چھیڑا کرتا تھا، اس پر بہتیاں کتا رہتا، اس کی نفیوں اتارتا، اور سوسوچ سے اسے پریشان کرتا تھا، شاہد بھی بڑا زودور سچ تھا، محض مذاق کی باتیں اسے ڈالنے کے لئے کافی تھیں، وہ بہت حساس تھا، دن گزرتے گئے اور ہم لوگ اسکول کی منزل طے کر کے کالج میں پہنچے، بن شورو کو پہنچ کر لڑکپن کی باتیں تو خیر ختم ہوئیں۔ لیکن اب بھی میں اور شاہد برسہا برس بیکار رہتے تھے۔ یہ تقریری جنگ ہوتی تھی۔ خیالات اور عادات میں ہم دونوں بیت مختلف تھے۔ لہذا ہم لوگوں کے درمیان اکثر مباحثہ و مناظرہ ہوا کرتا تھا۔

شاہد کا دل ایک شاعر کے دل کی طرح نازک تھا۔ مگر وہ رسمی شاعر نہ تھا، وہ حد درجہ جذباتی تھا، لیکن جذبات پرست نہ تھا۔ اسے اپنے جذبات پر اقتدار حاصل تھا اور یہ اقتدار رفتہ رفتہ پیدا ہوا تھا، مجھے حیرت ہوتی تھی کہ لڑکپن میں بات بات پر رونے والا شاہد کس طرح ایک زبردست قوتِ ارادی کا مالک ہو گیا ہے، پھر بھی اس کے دل کی رقت علیٰ حالہ قائم تھی۔ وہ جذبات کی آگ میں جلتا رہتا تھا، مگر اظہارِ جذبات میں وہ پھانڈ

## اختر اور نیوی، ایم، اے

پر آہستہ آہستہ گرنے والی برتن کے گالوں کی طرح تھا، شاہد نے بی آ میں معاشیات اور تاریخ کا مضمون لے رکھا تھا اور اس کا زیادہ وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔

یوں تو میں بھی پڑھنے لکھنے میں بیٹا نہ تھا، مگر میں کتابوں کو صحافت کی طرح اوڑھے نہیں رہتا تھا۔ کبیل کو داد و صحبت احباب کا مجھے کافی شوق تھا۔ نازک احساسات شاید میرے دل میں کبھی نہیں رہے اور میں دل پر جبر کرنے کا بھی عادی نہ تھا۔ میں نے بی اے میں انگریزی اور فارسی ادب لیا تھا۔ کالج میں ہم دونوں کی جولانگاہ بھی جدا جدا تھی۔ شاہد معاشیات اور تاریخ کی سوسائٹیوں کا ممبر تھا، اور میں بزمِ ادب اور کشتی رانی کے کلب کا۔ البتہ مجلسِ مناظرہ میں ہم دونوں برابر کے شریک تھے۔ وہاں بھی اکثر و بیشتر ہم لوگ ایک دوسرے کی مخالفت ہی میں نہاں آوری کے جوہر دکھلاتے تھے، ہوسٹل کی عام صحبتوں میں بھی جب نظریہ اخلاقیات یا طریقہ تعلیم و تعلم کی بحث چھڑتی یا سنیما کی جدید فلموں پر آ زنی ہوتی تو ہم دونوں فریقِ مخالفت ہی کی حیثیت سے ان میں حصہ لیتے۔ غرض ہم لوگ ایک دوسرے کے حریف تھے۔

شاہد نے معاشیات میں اعزاز کے ساتھ درجہ اعلیٰ میں اول ہو کر بی اے پاس کیا۔ میں نے بھی انگریزی ادب میں اعزاز حاصل کرتے ہوئے معمولی طور سے بی اے کر لیا۔ ایم، اے میں شاہد معاشیات میں فرق ہو گیا، اور میں انگریزی ادب کی دلفریب دستوں میں محوِ مگلشت

رہنے لگا۔ شاہد کی غرقابی ایک غواص کی غرقابی تھی، جس سے وہ دنیا کے ہزاروں فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہر چند کہ شاہد کو فوری فائدے کی توقع نہ تھی، پھر بھی اُس نے اپنے مطالعے کی دولت کو دنیا کی اجتماعی فلاح کے لئے عملی طور پر استعمال کیا۔ امیٹے میں پہنچ کر شاہد کے دائرہ عمل میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ وہ استاذ طلباء کی مجلس اور انجمن لڑھکاناں کا متحد تھا۔ نیز صوبہ کی اسٹریکٹ انجمن کا نائب مقرر۔

ایک اقرار کو ہر مسئلہ کے چند طلباء کی معیت میں، میں اور شاہد کامن روم میں مشغول تفریح تھے۔ اخبار دیکھتے دیکھتے میں نے کہا: ”دیکھو شاہد! تمہارے دوست میں بھی سرمایہ داری نے آخر غلبہ حاصل کر ہی لیا۔“ بعض طلباء مسکرانے لگے۔ شاہد نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اگر ایسا ہو گیا ہے تو مجھے افسوس ہے، بُری صحبت کا آخر کچھ تو اثر ہو، مجلس اقوام میں دوست اور کیا کیے گاتے۔ سب لوگ اب ہوجہ ہو گئے۔ میں نے کہا: ”نا ممکن اعلیٰ طریقے ہمیشہ ناکامیاب ہوتے ہیں،“ شاہد نے ذہن نظر رسالہ کو بند کرتے ہوئے کہا: ”بہت سی باتیں ایک خاص مضامین نا ممکن اعلیٰ ہو جاتی ہیں۔ آپ اگر اصول صحت و صفائی پر نقطہ بہ نقطہ سچی عمل کیجئے اور آپ کے محلے والے بے اصولے ہوں تو آپ اُن کے اعمال کے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ایسی صورت میں ممکن ہے آپ اصول صحت و صفائی کو بھی کو سننے لگیں۔ سمجھتے ہو حادہ! بیماریاں کے جراثیم کی طرح ظلم و ستم، گناہ و عصیان کے بھی جراثیم ہوتے ہیں، طاعون سے محفوظ رہنے کے لئے ساری سستی کو پاک و صحت کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ساری دنیا کو۔ اشتراکیت کی کامیابی تکمیل کو اس وقت پہنچے گی جب سارے ممالک اس اصول کی پیروی کریں گے۔ اب وہی اشتراکیت کے عملی پہلو کے متعلق گفتگو، عشرتِ ادب میں ڈوبے رہنے والوں کے لئے تو ریڈیو کا ہر ایگنڈا ہی حرفِ آخر ہے۔ کاش تم اس امر پر غور کرتے کہ وہ نظریہ جو کروڑوں انسان کی ناگفتہ بہ حالت کو چند سالوں میں بدل دے، وہ نا ممکن اعلیٰ نہیں ہو سکتا، حیاتِ آفرین و حیاتِ پروردگار ہی ایک خالق و قیوم قوت کی دلیل ہے۔“

شاہد کے لیے میں ایک مبلغِ جوش تھا، اسی طرح دیرینک رتو و بدل جوتی رہی، تب میں نے کہا: ”یہ ساری دنیا کو ایک لاشی سے

ہلکانا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ فرق و تفاوت تو قدرت نے بھی رد کر رکھا۔ شاہد بولا۔ تم لوگوں نے فطرت اور انسان کے تعلق کو اب تک نہیں سمجھا۔ اصلاحِ فطرت اور فطری رجحانات میں توازن کا قیام مقصدِ انسانیت ہے۔ اخلاقِ فاضلہ کی تائیس اور مذہب کی بنیاد بھی اسی اصول پر ہے۔ جذبات و شہوات کی روک تھام کے آخر کیا معنی ہیں؟ سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے بند باندھے جاتے اور نہریں بنائی جاتی ہیں۔ اگر فطرت کے پیدا کردہ فرق و تفاوت سے انسانیت کو نقصان پہنچا ہے تو ہیں اس میں ترمیم و ترمیم کا حق ہے۔ یہی آدم کا مقامِ خلافت ہے، انسانیت فطرت کی غلام نہیں آقا ہے۔ فطرت کے لوازم، فطرت کے مظاہر و آثار انسانیت کے لئے خام پیداوار ہیں، جن سے اُسے اعلیٰ و ارفع چیزیں تیار کرنا ہیں جس طرح ایک ہمارنگ ناکارہ سے محل و قصور کی تعمیر کرتا ہے۔ یہی انسانیت کی الوہیت ہے۔ اور اس ترمیم و ترمیم، تعمیر و تخلیق کا معیار اجتماعی فلاح و بہبود ہے۔ ہمارے اعتراض کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ ممکن ہے وہ پہلو تمہارے پیشِ نظر نہ ہو۔ مگر لوگ اکثر اس سوال کو اٹھاتے ہیں کہ انسانی فطرت ذاتی ملکیت کے تصور سے ملحد ہو کر دولتِ آفرینی کی محرک نہیں ہو سکتی۔ یہ اعتراض بھی غلط ہے۔ اشتراکیت سے قطع نظر، موجودہ سماج کے ہمارے اجتماعی اعمال ذاتی سود و نفع کی تحریکیں سے بلند تر ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت انہی بہت نہیں جس قدر اُسے سودِ خوار سرمایہ داروں نے سمجھ رکھا ہے اور دوسروں کو غلط طور پر سمجھانا چاہتے ہیں، اور اگر تم خالص افادیت کے نقطہ نظر سے بھی دیکھو تو اجتماعی فلاح و ترقی کے معنی انفرادی فائدہ و کامرانی کے ہیں۔ حادہ! پھر اس امر پر بھی غور کرو کہ لوگ جسے انسانی فطرت سمجھتے ہیں وہ بعض حالات میں نفسی لحاظ سے معصوم و مجاہد فطرت ہوتا ہے۔ انسانی فطرت ماحول، عادات اور قوانین کے پرورے میں روپوش بھی رہتی ہے۔“

شاہد نہایت ہی پرسکون مگر پُر اثر انداز میں اپنے خیالات کو داغ کر رہا تھا کہ ایک صاحبِ پناہ پانگ کھیتے ہوئے بول اُٹھے۔

”شاہد صاحب کچھ بھی ہو اشتراکیت مذہب کے خلاف ہے، مذہبی دہریے ہیں۔ سرمایہ داروں کے ساتھ ان لوگوں نے خدا کو بھی ملک بدر کر دیا ہے۔ میں نے بھی ان صاحب کی پُر زور تائید کی، شاہد ایک انداز





کی نازوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ حامد! انفرادی نیکیوں کا بھی مقام ہے۔  
مگر ترک فرائض کے بعد نوافل کا اہتمام مضحکہ خیز بات ہے۔  
شاید کا حوت حوت اکثر بن کر میرے دل میں اتر اٹھا رہا تھا، شاہ  
اٹھا اور چلا گیا۔ رکش والا ہمارے مکان کے سامنے سڑک پر ایک سایہ  
درخت کے نیچے اپنے اور میرے مستقبل سے بے خبر رکش کے چوڑے تکیہ  
لگائے سو رہا تھا۔ گرم لڑکے تیز چھوٹے چل رہے تھے۔ دفنائیں بگڑے قفس  
کنائیں تھے۔  
بس ایسی معمولی واقعہ نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے  
بعد میں شاید کاہم خیال تھا اور شرکاب کار۔

جاری رکھتے ہوئے کہا: چرائی ہوئی نیکی اور ذرہ دیدہ مسرت! کاش لوگ  
کو مجموعی طہ پر دیکھ لیتے! حامد! بہتاری نیکی میں بالیدگی نہیں، زندگی نہیں۔  
بے روح نیکیاں ان دنوں عام ہیں۔ ایک فلاکت زدہ رکش والا سماج کے  
مظلوموں کا ناسندہ تھا، کیا تم آٹھ آٹے بخش کر سارے دکھی لوگوں کو ظلم  
سے بچا سکتے! نہیں! بلکہ اُس ایک فرد کی زندگی بھی سونارنے سے تم قاصر رہے۔  
تم نے اپنے غرور و پندار میں اضافہ کر لیا اور اُس غریب مزدور کی عزت  
نفس پر تیر چڑھایا۔ بہتاری نیکی اُس بارواڑی کی نیکی کی طرح ہے جو ہزاروں  
انسان کے خون چوس لینے کے بعد کسی اتوار کو خیرات بانٹ کر نیکی خریدتا  
ہے یا اُس نمازی کی نیکی کی مانند ہے جو عیدین کی نماز میں پڑھ کر سال بھر

## غزل مسلسل

فصل گل نسیم ہزاراں نہ پوچھئے  
جوشِ شباب و باد و محبوبِ حور و شش  
اک اک نگاہِ مست ہے محشر طراز۔ اُف!  
پہچھے ہی رہ گئی ہیں جنوں کی حدیں تمام  
یہ سر ہو اور اُس بُتِ کافہ کا آستان  
میں ذرہ اور ذرہ نوازیِ آفتاب  
اُس مہ حبیب کے عشق میں ہوش و خرد سے آج  
اب حالتِ خرابِ محبت نہ دیکھئے  
سُن لیجئے فسانہ بے چارگیِ عشق!  
ایسیاہ و زلفِ پریشاں، نہ پوچھئے  
سب میں شکستِ توبہ کے ساماں، نہ پوچھئے  
رودادِ زہد و دلائلِ حسیاں، نہ پوچھئے  
لعیانِ دوق و شوقِ نسرِ اواں، نہ پوچھئے  
شوقِ نیازِ مسند کے ارماں، نہ پوچھئے  
تا بندگیِ قسمتِ نازاں، نہ پوچھئے  
کیونکر جنوں ہے دستِ دگریباں، نہ پوچھئے  
ذکرِ وفائے قلبِ پریشاں، نہ پوچھئے  
لیکن مالِ حُسنِ پشیمان، نہ پوچھئے

اک کافرِ حبیب کا پکاری ہے آج کل  
اب مسلکِ غلیق مسلمان نہ پوچھئے

خلیقِ قریشی۔ لاہور

# نیکدل سرمایہ دار

احسان

یہ نیکم ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، جو جناب حفیظ ہوشیار پوری نے مجھ سے کیا۔  
 اک دن کہ دوپہر کی جوانی ممتی کا سیلاب آتش فشا نیوں میں تھا مصروف آفتاب  
 ممتی بام و در پہ زورِ جہنم فسانہ خواں جھنجھلائی سی زمین، بھڑکتا سا آسمان  
 ایسے میں اک مریض ادب خستہ و زبوں  
 لیکر عقیدتوں کا اُبھارا ہوا جنوں  
 ہر سانس میں غلوں کی خوشبو لئے ہوئے دل میں خیالِ خدمت اُردو لئے ہوئے  
 سودا رُسوخ کا نہ جنونِ مصاحبت سر سام منتوں کا نہ ضبطِ ملازمت  
 خواہش نہ قرض کی، نہ سفارش کی آرزو شہرت کی اور نہ دادِ نگارش کی آرزو  
 ملنے کو اک محافظ اُردو کے گھر گیا  
 رو کا ہزار ذوق خودی نے، مگر گیا  
 نیکی کا جس کی سارے زمانے میں شور ہے ہاستوں میں ہی نہیں ہے، قلم میں بھی زور ہے  
 ہے جس کے رنگِ رُخ کا زردِ سیم پر مدار قوئل سے کامگار ہے لشتوں سے مالدار  
 لیکن بغیر پوچھے اس آئے کا کیا سبب؟  
 اس دھوپ میں عذاب اُٹھانے کا کیا سبب؟  
 با صد غرور جاہ و باندازہ بچ و تاب دولت کی بیخودی نے یہ بڑھکھک دیا جواب  
 آرام کا یہ وقت ہے اس وقت جائے  
 گر ہو سکے تو شام کو تشریف لائے  
 ارماں بھری نگاہ کو جکڑ سا آگیا دنیا کے آرزو پہ اندھیرا سا چھا گیا  
 رنگیں بیانیوں کے قدمِ زک کے رہ گئے خود داریوں کے سبز علم جھٹک کے رہ گئے

ثابت ہوا کہ فطرتِ زر میں غرور ہے

شہرت کا طمطراقِ حقیقت سے دور ہے

احسان دانش

لے یہ حضرت احسان کی سیدھی سادی سی نظم چمنوی و نقلی حیثیت سے ان کی دوسرے نظموں کے مقابلے کی نہیں ہے، اس لئے درج کی جاتی ہے کہ اس سے زردار دعبان  
 ادب کے اطلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ یہاں ادیب ہونے کے باوصف زردار، زندہ ادیبی رہتا ہے۔ (مُبرم)۔

# ماں کا خط

جی، آر، قیس، شیخوپورہ

ہر چند اس خط میں خط کی شان مغفود ہے، اور یہ خط کے پردے میں ایک مضمون ہے۔ لیکن چونکہ اس سے ہندوستان کے اظہار پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

میری زندگی کی روشنی

بیٹا اشوک! اب میں بڑھی ہو گئی، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ زندگی کی کتنی راتیں میرے لئے باقی ہوں گی۔ میں کتنے دن اور جیوں گی نہیں کہہ سکتی۔ اس دنیا میں میرا بسیرا اور چند روز سے زیادہ نہیں۔ نہ معلوم کب — میری کشتی نجات سمند ہار میں آکر ڈوب جائے۔ مرنے سے پہلے چاہتی ہوں کہ تمہیں شکہ اور شائستگی کی زندگی گزارتے دیکھوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ ماں کے پریم بھرے دل میں کتنے جذبات، کتنی آندھی اور کتنا طوفان اٹھتا رہتا ہے۔ بیٹا! — ماں کا دل پریم کا اہوا سا گر ہوا کرتا ہے۔

جب سارا سنسار سو جاتا ہے، حتیٰ کہ رات کی خوفناک تاریکی میں سمندر کی لہریں بھی خاموش ہو جاتی ہیں تو میرے دل کی گہرائیوں میں صرف تمہارا ہی خیال ہوتا ہے۔ گو تم میری نظر سے دور ہو، لیکن میں اپنے دل کے قریب پاتی ہوں۔ پردیس میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرتے ہو گے۔ تمام دن چکر کے بعد رات کو کہاں اور کدھر سوتے ہو۔ بیٹے اور ایم لے کی ڈگری حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن نوکری کے لئے جان دینی پڑتی ہے۔ ہمیں اب تک کوئی نوکری ملی یا نہیں۔ بیت و لڑائی سے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ جس سے دل میں دھڑکن اور بے چینی رہتی ہے۔ آج دو دن

سے آنکھیں پھڑک رہی ہیں جس سے طرح طرح کی پریشانی ہو رہی ہے۔ بھگوان مہلا کرے۔ رات کو پنجرے میں مینا دور سے پھڑ پھڑانے لگی، اور پھر دونا آواز میں ایسی بولی جیسے وہ زخمی ہو گئی۔ یا ڈر گئی ہے! مارے ڈر کے اختوں سے اور پرندے بھی خوفزدہ ہو کر اڑ گئے۔ میں رات بھر جاگتی رہی، ہلاک بھی نہیں مار سکی۔

ہر اسٹوار سے ڈاکیہ اسی طرح ڈاک کا تحویل لے گاؤں میں پہنچتا ہے۔ ڈاکیہ کو دیکھ کر شامادوڑی جاتی ہے اور اپنی توتلی زبان سے بولتی ہے کہ سیلے بیلا کا خط دو! ڈاکیہ کو میری بے چینی، اضطراب اور پریشانی کا حال کیا معلوم —؟ آج بھی تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ شامادوڑی اُداس ہو گئی۔ اُس کو تمہارے خط سے شائستگی ملتی ہے، اور میرے دل کو بھی، تم بڑے کابل ہو۔ نہ ماں کا خیال ہے نہ شاماکا، شاماکتی ہے کہ اب بیاسے جی نہ بولوں گی۔ وہ ہم کو یاد نہیں کرتے۔ تمہاری شاماتم سے رُوٹ گئی۔

آج دس روز سے بیمار پڑی ہوں۔ بیمار ہے، اور حرارت سے بدن پھنک رہا ہے۔ کچھ بیماری، کچھ تنگدستی اور کچھ مجبوری نے حالت خراب کر دی ہے۔ چنے پھرنے سے مجبور ہو گئی ہوں۔ ایک قدم چلنے کی سکت نہیں، دوسرے، درد و غم، رنج و اطم، مفسی و مایوسی نے اور بُرا حال کر دیا ہے، بھوک سے مر رہی ہوں۔ گھر میں نہ اناج ہے، نہ پیسہ، نہ شکل سے ایک وقت روٹی میسر ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے وقت پیٹ پر پتھر باندھ کر سو رہی ہوں۔ بھوک سے تڑپتی ہوئی شامادوڑی جلتے ہوئے بچوں کو دیکھا نہیں جاتا۔ مصائب اور تکلیفات







کی آخری خوشی ہے، اس کا بیاہ ہو جانا، میری اتنا خوشنیتی تھی۔ لیکن بیاہ کہاں سے کر دیں جس کو ایک وقت کمانے کا ٹھکانہ نہیں جس کو رہنے کی جھونپڑی نہیں وہ نقد ہزار، پانچ سو کی رقم کہاں سے لائے۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ دلچ ہو گیا ہے کہ لڑکی والے جب تک لڑکے کو کم از کم ہزار — پانسو دیں۔ شادی کرنا پاپ سمجھتے ہیں۔ پڑے لکھے لڑکوں کو دیکھتی ہوں کہ وہ ولایت مانے کا خرچ مانگتے ہیں۔ موٹر چاہتے ہیں، اور بہت کچھ فرمائشیں ہوتی ہیں۔ ہائے پیسے کے لوگ کیسے سید سے سادے ہوتے تھے۔ پیسے روپیہ اور سونے چاندی کے زیورات شادی کے موقع پر مرد کی جانب سے عورت کو دئے جاتے تھے۔ مگر ہائے زمانہ کتنا ہٹ گیا۔ وہ کارخانہ ہی بدل گیا ہے کہ اب عورت ہی کی طرف سے مرد کو سونے چاندی دئے جاتے ہیں۔ غریب لڑکی والے مارے جاتے ہیں۔ وہ چکنی کی طرح پسے جاتے ہیں۔ اڈ امیر اپنی شادیوں میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ہزار، دو ہزار کی آتش بازی پھونک ڈالتے ہیں۔ دان جیپز حوصلے کے مطابق دیتے ہیں۔ تمام ارمان دل کھول کر نکالتے ہیں۔ برات کے ساتھ ڈھول باجہ ہوتا ہے۔ عیش و نشاط کی محفلیں آگستہ کرتے ہیں۔ غیر ضروری ادر بڑے دسوں میں بڑی بے دردی کے ساتھ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ امیر اپنی دلچسپی اور عیش و آرام کے سامان میں کمی کرنا گوارا نہایت نہیں کرتے ہیں۔ غریب خون پمانے کے لئے اور سرمایہ دار جو تک کی طرح خون چوسنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھیں یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ پڑوس میں کتنی بد نصیب عورتیں ایسی ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں۔ جن کے سہاگ کے دن برباد ہو رہے ہیں۔ دکھیا رسی ماں رو رہی ہے۔ ایک طرف گھر میں جوان لڑکی بیٹھی مڑ رہی ہے، اور دوسری طرف میزیم بچے مڑ کوں پر بھوک سے مبلاتے مارے پھر رہے ہیں۔ بچوں کی بڑی حالت اور گھر کی تباہی دیکھ کر، باپ جرم کی طرف قدم اٹھانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اور ماں ایک عصمت فروش عورت کی طرح گھر کی چار دیواری سے باہر نکل پڑتی ہے، بیٹا — انسان سب کچھ کر سکتا ہے، مگر بھوک کی آگ برداشت نہیں کر سکتا۔

بیٹا — اس احساس کے بعد — جب مستقبل کا بھانک خواب دیکھتی ہوں، تو کانپنے لگتی ہوں، اور جب اُس کی گہرائیوں پر نظر ڈالتی ہوں تو اس تاریک پردے میں کسی طرف سے مدہم روشنی بھی دکھائی نہیں

دیتی ہے۔ چاروں طرف گھٹپ اندھیرا معلوم ہوتا ہے اس لئے گھر کی تباہی اور بختی سے بچنے کے لئے میرے بیٹے جی رادھا کے ہاتھ، برہمن کے ہاتھ نہ ہی، اچھوت کے ساتھ بیاہ کر دو۔ تم اس بھار پر مجھ سے نفرت کرو گے۔ لیکن ادبچ ذات کا برہمن، اور نیچ ذات کا بھنگی کبھی ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اگر آج نہیں تو کل، آؤا خیال ہی کرنا پڑے گا۔ میں اُس کو ذات اور رُسوائی سے اچھا سمجھتی ہوں۔ بہت سی لڑکیاں بے آسرا ہو کر ادھر ادھر بھاگ گئیں۔ اس لئے قسمت کہیں ایسے غار کی طرف لے نہ جائے۔ جو تباہی کی آخری حد ہوتی ہے، سماج اور سماج کا بننا یا ہوا قانون اندھا ہے۔ سماج کو چھوڑو۔ سماج کو بکنے دو۔ وہ بڑ بڑا کر خود ہی چپ ہو جائیں گے۔ ظلم و تشدد کرنے والے رہنروں کی مجلس کا نام سماج ہے، اور تم اُس کی پوجا کرنا چاہتے ہو۔

زمانے کی بے وفاداری کو دیکھتے ہوئے اصلاح کا بیڑا اٹھاؤ۔ اخلاقی جرات پیدا کرو۔ جھوٹ جھات کے بُت کی میٹھ کے لئے توڑو۔ تباہی مٹا زیادہ سے زیادہ ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ تم لوگوں کو اپنا مہنہ بنا لو گے۔ ہتھاری آواز آج نہیں، مگر ایک روز اچھی طرح سُنی جائے گی۔ لوگوں دلوں پر اثر کرے گی، اور کیا تعجب ہے کہ اپنی زندگی میں اس کا خوشگوار نتیجہ دیکھ لو۔ یا اگر نہ دیکھ سکو تو نسلیں تم سے سبق لیں گی۔ آنے والی عورتیں نہیں انصاف کا دیوتا کہیں گی، تم دنیا کے محسن سمجھے جاؤ گے۔

کھانا کے غصے کو بچ کر دے  
اس بنی جہاں سوز کو بچ کر دے  
جنگ سے بچ کر دے  
مصر میں جہاں کو داپ بچ کر دے  
پیش

# تخیلات کے تین پھول

سلام محبلی شہری

۱۔ پریم کی موت

میرے پیارے! میرے مرنے کے بعد میرے ماتم میں حسرت آگئیں نئے  
نہ گانا۔ میرے سر ہانے پھول نہ چڑھانا۔ میری قبر پر کوئی سایہ دار درخت نہ لگانا۔  
مرث سبز گھاس شبنم فطروں کے ساتھ میری قبر پر آگے گی۔  
کبھی کبھی مجھے یاد کر لینا۔ یا باطل پھول جانا!  
میں سیالوں کو نہ دیکھ سکوں گی۔  
بارش کو نہ محسوس کر سکوں گی۔

عندلیب کے حسرت آگئیں نئے نہ سن سکوں گی۔  
اور طویل خواب نیم شبی میں کبھی کبھی تجھے یاد کیا کروں گی۔  
یا شاید پھول جاؤں گی۔ (ترجمہ) (کریمیا روز نیٹ)

۲۔ اندھی لڑکی

اندھی لڑکی نے ماں کی انگلی چھوڑ دی اور باغ میں ایک جگہ بیٹھ گئی۔  
پھر ادھر کان لگا کر ادھر یہ اطمینان کر کے کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے اور اپنے  
ہاتھ دعا یہ انداز میں اٹھائے اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگی۔  
"میرے اللہ میاں! اُمّی جان کہتی ہیں کہ تم نے سورج بنایا ہے جو اپنی  
روشنی سے ساری دنیا کو روشن کر دیتا ہے، چاند اور سورج بنائے ہیں جو  
اندھیری راتوں میں دن کی طرح اُجالا کر دیتے ہیں۔  
اُمّی جان کہتی ہیں کہ تم نے طرح طرح کے پھول کھلائے ہیں جو اپنے  
رنگ و بو سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں طراوت اور دل میں تازگی پیدا  
کر دیتے ہیں۔

اُمّی جان یہ بھی کہتی ہیں کہ تم نے بڑے بڑے پہاڑ دریا۔ سمندر اور  
جنگل بنائے ہیں جن سے تمہاری قدرت ظاہر ہوتی ہے!  
میرے اللہ میاں! تم نے جو مجھے ان چیزوں کے دیکھنے کے لئے  
آنکھیں نہیں دیں تو میں اُس کی شکایت نہیں کرتی اور ان میں سے کسی  
چیز کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن میرا دل اتنا ضرور چاہتا ہے کہ  
کم از کم اپنی اُمّی جان کی صورت تو دیکھ لیتی!!  
(طبع زاد) (سلام محبلی شہری)

عام لڑکیوں کی طرح وہ ظاہری حسن سے موصوف نہیں۔  
جب وہ دیکھ کر مجھے سکرائی تو پہلی بار میں نے اُس کے حسن کو بے نقاب  
دیکھا۔ اور پہلی بار میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ اُس کی نظر ایک چشمہ  
الفت اور ایک جوئیہ ناز ہے۔ لیکن اب اُس کی نگاہیں سرد  
اور فراموش گار ہیں، اور میری پُرشوق نگاہوں کا جواب نہیں دیتیں۔  
پھر بھی میں اُس کی نظر میں محبت کی روشنی دیکھتا ہوں، اور اب  
بھی اُس کی چڑھی ہوئی تیور باں مجھے دوسری لڑکیوں کے جسموں سے  
زیادہ سہلی معلوم ہوتی ہیں۔  
(ترجمہ) (کریمیا)

۳۔ التماس  
پرچہ نہ پونچنے کی شکایت ہر مہینہ کی دس تاریخ تک سید بنی  
چاہیے ورنہ بعد میں تعیل نہیں کی جائے گی۔ (منیر کرم)

# بیر کا درخت

سندھیر کا پنوری

جاڑے کا موسم تھا۔ سرد ہوا میں چل رہی تھیں اور جوار کی سفید بالیوں سے لدے غیدہ پودوں کے کیتوں سے سرسراہٹ ہوئی گزر رہی تھیں، گذر رہی تھیں اور ایک عجیب اُداس نمہ پیدا کر رہی تھیں، بوڑھا سوتھن کیتوں کی دوش پر آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا، بڑھا رہا تھا اور کچھ گزری ہوئی ہاتھوں کا خیال کرتا جاتا تھا۔ بس برس قبل کے واقعات اُس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ عہد پارینہ کے گزرے ہوئے حالات اس طرح اُس کے سامنے آ رہے تھے جیسے فلم کے پردے میں پر تصویریں گزر رہی ہوں۔ ایک ایک واقعہ اُس کی آنکھوں میں ایسا تازہ تھا۔ گویا وہ ابھی گزرا ہو، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا وہ داہنی طرف گھوما اور ایک کنویں کے قریب لگے ہوئے بیر کے درخت کو کھڑے ہو کر نکلے لگا۔ ہرے بھرے درخت میں کچے، زرد اور سرخ بیر ڈالوں کو جھپکائے ہوئے تھے۔ کہیں دور سے قمری کی دلگداز نوحہ خوانی نسیم کے دوش پر آ رہی تھی اور فضا کو خلیں بنا رہی تھی وہ خیال کر رہا تھا، وہ دن بھی اُس کی زندگی کا کتنا سہرا اور پیارا دن تھا، اُسی دن تو صبح محض میں اُس کی زندگی کا آغاز ہوا تھا، اُس دن کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا، وہ تو اُس کے دماغ میں اس طرح آباد ہے جیسے ستاروں کے درمیان روشن چاند۔

بھی سردیوں کا زمانہ تھا اور یہی سہ پہر کا وقت، نیچے آسمان کے سمندر میں آفتاب ایک نور کی کشتی کی طرح مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ اپنی مری کے گاؤں جا رہا تھا، کہ گھوٹا، سیر کرتا ادھر آ نکلا، ایک خاص کشش

تھی، جو اُسے اس طرف کھینچ لائی تھی ایک ایسی مقناطیسی طاقت جس کے ذریعہ اُس کے قدم خود بخود اُٹھتے چلے آئے تھے۔

سندھری اسی جگہ بیر کے درخت کے نیچے کھڑی، بیر توڑ رہی، وہ کس قدر تھکی تھی شباب کے بوجھ سے دہلی ہوئی اُس وقت اُس کے رخسار شفقت کی سوتھی سے کیسے گلنار ہو رہے تھے۔ وہ سندھر کھڑا اب بھی اُس کے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ اُس کی بکریاں اُسے دیکھ کر مباتی ہوئی بھاگ گئی تھیں، اُن کے بھاگنے سے جو سرسراہٹ پیدا ہوئی تھی وہ ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی ہے، وہ اُسے دیکھ کر چونک پڑی تھی۔ اور شہر باکر لگا ہیں بچی کر لی تھیں، اُس وقت اُس کی یہ ادا عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

دن گزرتے گئے، ان کی ملاقات بڑھتی گئی اور چپکے چپکے محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ بچ ذات کی مزدور تھی۔ لیکن پریم ذات پات کو تو نہیں دیکھا کرتا۔ اب اُس کا دل اپنے گاؤں میں باغی نکلتا۔ اس لئے زیادہ تر وہ اپنی مری کے گاؤں میں رہنے لگا، سندھری کی ہر نعمت رفاقت اُسے اپنے اندر جذب کئے رہتی۔ بڑی رات تک وہ اور سندھری اسی فردوس محبت میں چہل قدمی کیا کرتے۔ بیٹھا کرتے اور میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے۔ باتیں کیا کرتے اور کبھی نہ اُٹکتے، ایک رات جبکہ چند راجپوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر براجم رہا تھا، زرد و سیاہی کی طرح آکاش پر تارے بکھرے ہوئے ہوئے تھے جھلکی پھولوں کی باس سے بے ہوئے ہوا کے جھونکے فضا کو مسطر کر رہے تھے، ردمان و شہریت کی بادشہ ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے پیمان باغ محبت

کا لطف و معصوم چہان، چاند کی نقرئی کروڑوں کے زیر سایہ، ننھے ننھے نازک پھولوں کو گواہ بنا کر۔

جلدی ہی گاؤں والوں کو اُن کے ملے جلنے کی خبر ہو گئی، اور وہاں سے رفتہ رفتہ اُس کے پتا کے کالوں تک بھی پہنچ گئی، اُس کے پتا اُس کی ہر طرح سے دلدہی کر سکتے تھے، اُس کی ہر بات اور ہر آواز دہری کر سکتے تھے، لیکن اُس کو ایک بچہ ذات کی لڑکی سے ملنے اور دھرم تباہ ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے، اپنی ذات، اپنے خاندان کو، عقبہ گئے کو نہیں پرست کر سکتے تھے، برادری میں سبک ہونا نہیں چاہتے تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ سندری سے بیاہ کرنا چاہتا ہے تو بہت ہی برہم ہوئے۔ اول سمجھاتے سمجھاتے رہے، اور دھمکاتے بھی رہے۔ لیکن وہ تو محبت کا مذہب قبول کر چکا تھا۔ پریم دیوی کے چروڑوں کے آگے سر جھکا چکا تھا اور پریم دیوی کا سچا بھاری ہی بنا ہوا اُس کے لئے بڑی ہر امتنا تھی، اسی خیال میں مدہوش وہ ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا۔ جب اُس کے پتلے اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی تو سخت فتنہ ہوئے۔ اسی شدید غصے کی حالت میں اُسے بڑی لعنت و لعنت کی، اور دنیا میں ہمیشہ آلام و مصائب کی زندگی بسر کرنے کی بد دعا دیکر گھر سے نکال دیا۔

گھر سے نکلنے کے بعد وہ بالکل غفلت تھا، اس لئے اس نے پہلے کچھ پونجی جمع کرنے کا فیصلہ کیا اور بعد میں بیاہ کرنے کا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سندری اُس کی ہو جانے کے بعد تکلیف اور پریشانی میں زندگی بسر کرے۔ دونوں گاؤں میں اُس کا مقابلہ ہو چکا تھا، اس لئے اُسے وہاں کوئی کام ملنے کی امید نہ تھی۔ اگر امید تھی تو شہر میں، اگرچہ وہ سندری کی عویل مفارقت اور جدائی نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس عارضی جدائی میں اُس کی اور سندری کی آئندہ بہتری کا سبب پرشیدہ ہے۔ اسی خیال نے اُس کے ارادہ کو مضبوط بنا دیا تھا۔ جب اُس نے اپنے ارادہ کو سندری پر ظاہر کیا تو وہ گھبرا گئی۔ سخت پریشانی ہو گئی اور عاجزی و خشم سے اُسے روکنے لگی۔ لیکن جب اُس نے اُسے طرح طرح سے سمجھایا اور جانے پر اصرار کیا تو وہ روکنے لگی، اُس کی آنکھوں کی اتھاہ ندی سے محبت کے قطرے ٹپکنے لگے، اُس نے روتے ہوئے کہا تھا۔ میں یہ جدائی نہیں برداشت کر سکتی گی۔ اتنا کہ اُس نے اپنا سر

اُس کے سینے پر رکھ دیا تھا، مومن نے سندری کو بہت دلاسا دیا اور جلد ٹوٹ آنے کے وعدہ پر اُسے روتا ہوا چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ پردیس میں اُسے سخت تکلیف اور مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ کئی روز کام نہ ملنے کی وجہ سے غافہ کرنا پڑا، آخڑ بڑی دقتوں اور مشکلوں سے چنے چاب چاب کر اُس نے کچھ رقم جمع کی اور اُس کو لے کر چھ مہینے کے بعد گاؤں واپس آیا۔ وہ خوش خوش سیدھا سندری کے جھونپڑے کی طرف جا رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، سورج تیزی سے چمک رہا تھا۔ پسینے میں شرابور جب وہ راستے میں برگد کے درخت کے نیچے سے گزرا تو کسی نے کہا۔ سندری تو مر گئی! اُسے یقین نہ ہوتا تھا۔ لیکن اُس کا دل خوف و ہراس سے زور زور سے دھڑلکا۔ جوں جوں سندری کا گھر نزدیک آتا گیا اُس کے قدموں کی رفتار سُست ہوتی گئی۔ اُسے اندیشہ ہونے لگا تھا کہیں یہ بات سچ نہ ثابت ہو جائے اور اُس کے دل اور رزتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ جھونپڑے میں داخل ہوا، اُس وقت اُس کا سانس رُکا جاتا تھا، گھر میں اُدا سی چھائی ہوئی تھی، سندری کی ماں چپ چاپ رُخ و رخ کی صورت بنی بیٹھی تھی اُسے دیکھتے ہی وہ جنھیں مار مار کر رونے لگی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔ اُس نے تمہارے لئے جان دیدی، تمہارے جانے کے بعد کئی روز تک اُس کے منہ میں ایک کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی تھی، چند روز بعد گاؤں کے منبردار، چوکی دار اور تمہارے پتا آئے اور مجھے اُس کی شادی جلد اپنی برادری کے کسی لڑکے کے ساتھ کرنے پر مجبور کرنے لگے، مجھے طرح طرح دھمکایا، ڈرایا، آخر خود ہی بڑتلاش کیا اور بیاہ کا انتظام کر دیا، جس صبح کو بیاہ کا دن تھا، سندری کا پتہ نہ تھا۔ بہت جستجو کے بعد اُس کی لاش بیر کے درخت کے پاس دسے کنویں سے برآمد ہوئی، اُس وقت اُس کا دماغ چکر اٹھا، اُسے یاد نہیں وہ جھونپڑے سے کب اور کیسے نکل گیا تھا، اور حزن و ملال میں ڈوبا ہوا معلوم نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔

ماں کے خوشگوار پیام کے آغاز اور اُس کے خونی انجام کی یاد سے اُس کا دل ایک بار پھر چین ہو گیا، اُس کی بے رونق مگر دنیا دہمی آنکھوں سے آنسوؤں سے قطرے گرنے لگے۔ چٹیل میدالوں سے سرد ہوائیں آرہی تھیں اور جوار کی سفید بالیوں سے لدے ہوئے خمیدہ پودوں کے کھیتوں سے سرسراہٹ ہوئی گزر رہی تھیں، گزر رہی تھیں اور غم انگیز طوطا اس ننھے پیدا کر رہی تھیں۔

# شاہ پارے

از نتیجہ افکار مالی جناب معالی القاب فرمانروائے ریاست ٹونک دام اقبالہ

ٹھٹھری

جب شام کی ٹرلی کان پر سی میں جات ڈگریا ہٹساری رہی  
گمونگٹ سے جو واکو دیکھا سکھی پت لاج اجبیرن موپہ بھی

استرہ

جب شام نے پستہ دیکھی موری تب راج نگر کی باٹ لئی  
جب برہ اگن میں پھٹکن لگی واہو ٹرلی نے سانچے ٹر میں بھی  
تن من کو جلا دے سن ری سکھی جو خاک بھی اکسیر بھی

جب شام

ٹھٹھری

جے برہ اگن کی آسج نئی تن چھوڑ کے جائے من میں لگی  
سُکلت ہوں نہ پوچھے بات کوئی کانوں پہ دھرت ہیں ہاتھ بھی

استرہ

جب کوک کروں سنار بنے جب چپکی رہوں تو گھاؤ لگے  
اس غم کی بکھا کو کون سنے اپنے بھی پرائے ہو کے چلے  
میں ہائے کروں تو راج کہے جب رونی جی تب جوت بھی

ہے برہ اگن

ٹھٹھری

کر جو رہی ٹھکرائے گیو بیدردی موئے تریائے گیو  
دن رین کا چین لیو سجنی ٹکھ مور کے سوتن سنگ بھیو

انستہرہ

کر جو رہی

جب روت تھکی تب آنکھ لگی سینے میں درشن پائے رہی  
جب راج کے پیاں پرن رہی من ہنوک سے موری آنکھ کھلی  
سب سونے سے کھو دیں اے ہی سکھی میں جاگ کے داکو کھوئے دیو

بھمڑی

جو پریم کا بن من بھائے گیو جی دیکھ مورا بہرائے گیو  
گھر در کو دیو سچ اے بھنی سنگ ساتھ کٹم لبہرائے گیو

انستہرہ

جو پریم

جب راج کی داسی بن کے چلی کر تمام کے بولی مو سے سکھی  
کاہے کھوت یہ باٹ بڑی ہی میں بیتاں چھرا کر واسے کہی  
یہ پیت کا بن ہے اے ری دی جو کھوئے گیو سو پائے گیو

بھمڑی

جب پیت کی بسندہ بنانے چلی سندھ تن کی رہی نہ من کی رہی  
جب برہ اگن تن من میں لگی منجدھار میں آپ ہی آن پری

انستہرہ

جب تن کی نیا بھنور میں بھنی گھبرا گئی پی پی کرنے لگی  
جب راج دُہائی دینے لگی کاہو کان میں مورے بات کہی  
یہ پیت کی ندیا ہے ری دی تو ڈوب گئی تو پار بھئی  
جب پیت کی بسندہ بنانے چلا

# ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبر آبادی

(۳)

بعد کو جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہوا، اور اُن کو چند بیڑوں سے حاصل ہوا تو سینکڑوں الفاظ اردو میں انگریزی کے شامل ہو گئے اور اس طرح ہوئے کہ بولنے اور سننے والا محسوس تک نہیں کرتا کہ میں غیر زبان کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔ رفتہ رفتہ جب انگریزوں کو اردو سے بچی ہوئی تو اُنہوں نے اُس کو پڑھنا شروع کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ادبیات کا ذوق پیدا ہو گیا، اور سینکڑوں انگریز شاعری کرنے لگے، نہ صرف یہ بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی کافی حصہ لیا۔ مثال کے طور پر یہاں چند انگریزوں اور فرانسیسیوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

مسٹر جون جاشوگلندر۔ یہ ڈچ قوم سے تھا، جس نے ۱۸۵۶ء میں اردو زبان کی صرف و نحو لکھی۔ اس کے بعد مسٹر ہیڈے نے ایک قواعد ۱۸۶۲ء میں لکھی۔ پھر مسٹر فرگسن نے ۱۸۷۷ء میں ایک لغت لکھی اور ڈاکٹر گلکراٹ نے جو اس زبان سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ متعدد تصنیفات کیں، اور انگریزی سے اردو میں تراجم بھی کئے۔

جون شیکسپیر نے ایک لغت ۱۸۷۷ء میں۔ مسٹر ڈکن نے ایک لغت ۱۸۷۷ء میں۔ جون ولیم پرڈیسر آگرہ کالج نے طبی آلات پر ایک کتاب مع نقشوں کے ۱۸۷۷ء میں لکھی۔ جون پارکس لیڈے کو اس زبان سے استفادہ دلچسپی تھی کہ اگر سے میں اردو کا ایک چھاپے خانہ قائم کیا، اور دستورالعمل پر ۱۸۷۷ء میں ایک کتاب لکھی۔

مسٹر برڈلینڈ فرانسیسی نے ۱۸۵۵ء میں ایک لغت لکھ کر پیرس میں

چھپوائی۔ مسٹر براؤ نے ایک لغت ۱۸۶۶ء میں لندن میں طبع کرائی، اور ڈاکٹر فیلین جو ایک محقق فاضل تھا اُس نے اردو سے انگریزی، اور انگریزی سے اردو میں دو لغات تیار کیں جو بہت مشہور ہیں، مستند ہیں، اور سبیلہ کشش و محنت، تحقیقات و جانفشانی کے ساتھ لکھی ہیں۔ اس کے مقدمے میں نظیر اکبر آبادی کے کلام پر جو رائے ذاتی کی ہے وہ ہندوستان کے ادب کو ازبٹنے کی انگلیں کھول دینے کے لئے کافی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ سعدی و شیکسپیر کی طرح نظیر بھی دنیا کے اسٹیج پر آگیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ نظیر نے اپنے کلام کے ذریعہ کائنات کی ہر ہر چیز کو ایسی زبان میں پیش کر دیا ہے کہ جس سے بڑھ کر اتحاد کی بے انتہا کبر آبادی کے کلام میں ہے، اور نہ غالب کے۔ اُس نے اردو زبان کی ایک ایسی شاہراہ قائم کر دی ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ غرض کہ اس لغت کے مقدمے میں ڈاکٹر مومون نے ہندوستان کے بڑے شاعروں کو نظر انداز کر کے صرف نظیر کی تعریف و توصیف کی ہے۔ ڈاکٹر مومون مدت و راز تک آگے اعلیٰ میں مقیم رہے، اور الفاظ کی تحقیقات کے لئے شہر بہر گشت کر کے ماہرین زبان سے ملے رہتے تھے۔

مسٹر گارن کی شخصیت بھی قابل قدر ہے۔ یہ فرانسیسی تھے اور کئی زبانوں کے ماہر اُن کو اردو سے ایک ذوق کا عشق تھا، یہ بات چیت اور خط و کتابت اکثر اردو میں کرتے تھے۔ پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور اردو میں بہت سی تصنیفات کیں، انہوں نے اردو کی عظمت فرانس تک کی۔ اُن کی چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

تذکرہ جات شعراء مصنفین اردو۔ یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں پیرس میں  
چھپ کر ائی گئی۔

مصنفین و مؤلفین اردو۔ مطبوعہ پیرس ۱۹۳۶ء  
ہندوستانی ڈرامے کا انتخاب۔ مطبوعہ پیرس ۱۹۳۵ء  
انتخاب کلام تیسر۔ مطبوعہ پیرس ۱۹۳۲ء  
اردو زبان کا رسالہ۔ مطبوعہ پیرس ۱۹۳۳ء  
مسلمانان مشرق کا علم عروض۔ مطبوعہ پیرس ۱۹۳۲ء  
انتخاب کلام ولی دکنی۔ مطبوعہ پیرس۔

اسی قبیل کے اکثر و بیشتر یورپین حضرات گزرے اور موجود ہیں۔  
جنہوں نے اردو زبان کو یورپ سے روشناس کرایا، اور اس کی  
نشر و اشاعت میں کافی حصہ لیا۔ انیسویں صدی کے آغاز سے اور ذوق  
برصا اور ادب و شاعری تک ذہن پرست۔ اس زبان کی جاویدیت پر  
حیرت ہوتی ہے کہ باوجود ہندوستان میں پراکرت زبانوں کی موجودگی  
کے، یورپ کے ذوق نظر نے اردو ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ اسی سے الگ ہر  
گہری کا ثبوت ملتا ہے، اور یقیناً فرسی زبانوں کے لٹریچر میں سب سے  
زیادہ اور سب سے اعلیٰ لٹریچر اسی زبان کا ملے گا۔ ذیل میں چند یورپین  
شعراء کے نام بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھ کر حیرت  
ہوتی ہے۔

مسٹر جون واکر تخلص واکر۔ یہ انگریز کلکتہ میں کسی متاثرہ عہدے پر  
ماور تھا، کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اولاب دنیا تجھے غیرت نہیں آتی کھائی دہن خاک نے غنور کی ہڈی  
گر راستہ موت ہو کبھی باعث دولت مشہور ہے کچ پاؤں میں تہور کی ہڈی  
مسٹر جیمس تخلص صاحب۔ تلمذ از میر و ذریعہ صبا۔ فرماتے ہیں۔  
دیکھنا تو لکے وحشت میں نکل جاؤں گا مچھکو پیناتے ہوز بخیر پہ نہ بخیر عیش  
مسٹر جیمس تخلص فلاحوں۔ تلمذ از مرزا جہدی حسن خاں، اردو  
فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔

کیوں خزاں میں سر شگ کر مر بجائے عندلیب

ہے بقائے گل سے وابستہ بقائے عندلیب  
مسٹر برٹی تخلص برٹی تلمذ از عنایت علی اگرہ شاگرد غالب۔ کتنا

بلند شعر کہتا ہے۔

محبوب دوائے سجود لب چنبش پائے دوست

کوئی جلا دے کہاں اس کا حرم ناز ہے  
مسٹر الگرتڈرا تخلص آزاد۔ ریاست الوری میں ملازم تھے، اردو اردو  
سے خاص ذوق رکھتے تھے۔

اردو بہنو تو تنج ستم ریز کیجئے مرگیاں بہنو تو خنجر برآں نکالئے  
مسٹر ڈکن تخلص عرب۔ تلمذ از مرزا عنایت حسین اگرہ شاگرد غالب  
گر یہ میں تکیں تری افزائش گر یہ ہوئی

درو بہتانی سے میں کچھ ایسا لذت یاب تھا  
مسٹر جارج اسٹیفن تخلص استخوان دہلی میں اکثر قیام رہا۔ اردو کے شعرا  
کی صحبت کو پسند کرتے تھے۔

خط کا یہ جواب آیا لکھا جو کسی پھر خط  
کر ڈالوں گا ایک دم میں تری آن کے ٹکڑے  
مسٹر فراسو تلمذ از دلتوز دہلوی۔ ان کا بھی اکثر دہلی میں قیام رہا۔

گرا دے برق یارب ہے قیامت شام تنہائی

ہندو جب عمل ہی گلشن میں تو اپنا آشیانہ کیوں ہوا  
مسٹر آرتھک تخلص عبری۔ یہ مذہباً یہودی تھے، ان کا قیام اکثر کلکتہ  
میں رہا۔ فرماتے ہیں۔

اشک سے ایشہ جگر چشم بنی بھانڈا دیکھئے اب ہر تن غیرت سے خاند ہوا  
مسٹر اسس رین تخلص صاحب۔ تلمذ از خیراتی خاں دلتوز۔ یہ صاحب  
فرانسیسی قوم سے تھے۔ کہتے ہیں کہ

ہے زلف حلقہ زن خط دلبر کے آس پاس یا اند دہا ہے فوج سکندر کے آس پاس  
لارڈ بین ماؤتھ۔ یہ اردو زبان کے بجد مداح تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

پر وہ داری اُن کی ہے یا شعلہ سامانی مری  
شام تنہائی ہے، میں ہوں شعلہ سوز و ساز ہے  
مسٹر جان ٹامس تخلص طوماس۔ تلمذ از نقیر دہلوی، اردو کے دلدادہ  
تھے۔ فرماتے ہیں

کاوش غم ہے جوں سا ز بقدر لذت  
پر بجے حسرت و آوارہ کا انداز نہیں



مسٹر جو ناظم تخلص شائق۔ یاد جو دو جی ہمدے دار ہونے کے ذوق شہر تھا۔  
جو رقیب بنت درماں وطن غیر کیا کیا جفا میں ہم نے سبیں تیرے واسطے  
مسٹر آگشٹن ڈی سٹوا تخلص مفتوں۔ مقیم آگرہ۔ تلمذ از مرزا عنایت حسین  
آگرہ۔

نکالوں کس طرح پہلو سے ٹکڑا اُس کے پکال کا  
کہ مدت میں گزر دل میں ہوا ہے آج ہاں کا  
مسٹر جارج فائٹم تخلص صاحب۔ ملازم ریاست مامپور۔ انداز  
بیان یہ ہے۔

یہ آرزو ہے تیرے آنے کی مجھے لے شوخ  
کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے  
مسٹر جوت تخلص غریب۔ تلمذ از مرزا عنایت حسین آگرہ۔ شاگرد  
مرزا غائب

شباب دیکھا تو ان کے شباب کو دیکھا  
اک آگینے میں گویا شباب کو دیکھا  
مسٹر ڈانیاں گارڈر تخلص شکر، تلمذ از قناد از مرزا عباس حسین  
ہوش گھنڈی۔

پہنچا ہے بعد مرگ فلک پر مرا غبار رنہ بلند سخن میں ہے خاکسار کا  
مسٹر ایرن جیکوب تخلص ایرن۔ تلمذ از ریاض خیر آبادی  
ہ کیا چکے چکے شکایت ہے ایدل خبر دار کس کا گلہ ہو رہا ہے  
مسٹر جون بیٹرن تخلص اتیر۔ تلمذ از شاہ نقیر دہلی، فرماتے ہیں کہ  
سینے خانوس میں در پردہ جل ہے دیکھو  
شعلہ آہ نکالے ہے سبگر سے باہر

سر ولیم جونس کلکتہ میں ججی کے ہمدے پر مامور تھے، اور ۲۸ زبانوں  
کے ماہر تھے۔ لیکن ان کو اردو زبان سے گہری دلچسپی تھی، ڈیوک آف  
نٹا اور فریڈرک پن کوٹ وغیرہ کو سبھی اس زبان میں خاص مہارت  
تھی۔ یہ حال تو یورپین مردوں کا تھا۔ لیکن یورپین لیڈرز کو سبھی اس زبان  
سے بڑی دلچسپی تھی۔ مثالی کے طور پر ان کے بھی چند نام پیش کئے جاتے ہیں۔  
ملاحظہ ہوں۔

مسز آرچن، تخلص حیات مقیم آگرہ فرماتی ہیں کہ  
دُش ہے ہمارا جوہ دلبر کئی دنے اس واسطے رہتی ہوں میں مضطر کئی دن  
بس آئین جگر۔ تلمذ از منشی عبدالغفور شاہ کلکتہ۔ آپ چند  
کتابوں کی مولف بھی تھیں۔ سخن الشعراء وغیرہ انہیں کی تالیف کردہ تھیں۔  
ہو گئی نیند بھی ہمسایہ کو نامحرم میں نے نالہ جو کسی مات سر شام کیا  
مسز بیک۔ تخلص خنی۔ اردو زبان سے گہری دلچسپی تھی  
اے خنی اپنے اشک بے تاثیر مفت میں جگ ہنسی کرتے ہیں  
مسز کلایں۔ مقیم آگرہ۔ یہ ایک یورپین خاتون ہیں۔ لیکن اردو  
سے ایک نوع کا مشق ہے۔ (حیات)

مسز مورسن۔ مقیم آگرہ۔ یہ ایک ترکی خاتون ہیں، ان کے  
خاوند اُرش تھے۔ فرماتی ہیں۔

صبا چیر دست کر تو مجھ خستہ دل سے  
مجھے اپنی اور تجھ کو اپنی پڑی ہے  
مس مورسن۔ مقیم آگرہ۔ یہ ایک ترکی دو شیزہ ہے، ان کو اردو  
موسیقی سے محبت ہے۔ اور اردو غزلیں ہنایت دلکش آواز سے  
گاتی ہیں۔

لیڈی ہارڈنگ۔ اردو زبان کی سیدہ مداح تھیں۔ اور اکثر اسی  
زبان میں بات چیت کیا کرتی تھیں۔

لیڈی جمیسفروڈ۔ آپ کو اس زبان سے اتنی محبت تھی کہ شہ کے  
ایک زمانہ جلسہ میں اردو ہی زبان میں تقریر فرمائی، اور اس مولائی  
کے ساتھ کہ سامعین حیرت تھیں۔

ملکہ وکٹوریہ آجھائی۔ آپ اس زبان سے اتنی محبت تھی اور  
اردو کی اس قد عزت افزائی کی کہ اس کے حصول کے لئے آگرے  
سے مولوی برکت اللہ صاحب کو انگلستان بلایا۔ اردو زبان میں آپ نے  
اپنا ایک روزنامہ بھی تیار کیا تھا، اور ہندوستانیوں سے اکثر اسی  
زبان میں بات چیت فرمایا کرتی تھیں۔

یورپین مردوں اور عورتوں کے یہ چند نام بطور مثال پیش کئے  
ہیں، حالانکہ اسی قبیل کے ہزار ہا نام ایسے ہیں جن کا بیان اس مختصر مضمون  
میں نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ انہیں وہ یورپین ہمدے دار جو دو سو سال



| بھٹی   | مرہٹی  | گجراتی | پنجابی | ہندی   | اردو   | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
|--------|--------|--------|--------|--------|--------|--------|--------|--------|--------|
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |
| پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی | پنجابی |

اردو لکھنا، پڑھنا، بولنا اور سمجھنا بخوبی آتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی صوبوں میں کم و بیش ۵۰ فیصدی آبادی اردو سمجھتی ضرور ہے۔ ڈاکٹر گستاوی بان کے نقشے کی تائید کانگریس کانفرنس کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں میں نے خود مسند تجارت ہندوستان کے ہر صوبے تقریباً ہر شہر اور دیہات کا گشت کیا ہے، اور ہا ہا کیا ہے۔ اور اس دوران میں زبان کی تحقیق کا مشغل مجھل بھی رہا ہے۔ اس بنا پر میں دعوے سے کہتا ہوں کہ مندرجہ صدر مقامات پر جہاں کانگریس نے اردو تسلیم نہیں کیا ہے وہاں ۵۰ فیصدی اردو سمجھنے والوں میں ۵۰ فیصدی لکھنا پڑھنا بھی بخوبی جانتے ہیں۔ جن سے روزانہ مراسلت ہوتی رہتی ہے۔

چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے، اور ثبوت کے بعد دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت صرف ہندوستان میں اردو سمجھنے والوں کی تعداد کم و بیش تیس کروڑ ہے، آئندہ نقشوں سے اس کا مزید ثبوت پیش کیا جائے گا، اور بتایا جائے گا کہ ہندوستان سے باہر اس زبان کو کتنے کروڑ انسان سمجھتے ہیں۔

کانگریس کے نقشے کے بموجب زبان کے لحاظ سے کل ۲۱ مقامات ہیں۔ ان میں سے سات مقامات پر اردو زبان تسلیم کی گئی ہے۔ حالانکہ تمام ملک ہندی اردو سمجھی ضرور جاتی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سات صوبوں کی آبادی کتنی ہے۔

اس کا نقشہ یہ ہے

| آسٹریلیا | ہندوستان | پنجاب   | پنجاب   | پنجاب   | پنجاب   | پنجاب   | پنجاب   | پنجاب   | پنجاب   |
|----------|----------|---------|---------|---------|---------|---------|---------|---------|---------|
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |
| ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ  | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ | ۲۰ کروڑ |

اس نقشے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تقریباً ۵۰ فیصدی آبادی کو

اس دور کا بندوبست کیجیے اگر  
شانِ فتح و شکست کیجیے اگر  
ہو جائے گی سلطنتِ دہلی خود سے ہموار  
ہو جائے گی سلطنتِ دہلی خود سے ہموار  
دنیا کے بندوبست کیجیے اگر  
دنیا کے بندوبست کیجیے اگر

انسان اور اس درجہ تباہی، توجہ  
آویزشِ انوار و سیلابی، توجہ  
گشتِ کریمنا ہے، اور یہ حکم لکھنا  
تسک ہے الہی توجہ  
کیا دور و  
چشم

## چور — ٹیگور کی ایک نظم سے ماخوذ

### افسر ماہ پوری

میری آنکھوں میں آنسو از خود اُمٹ اُٹے، زمیندار کے سنانے میں  
بال مجبور تھا، بالآخر میں نے گلوگیر آواز میں کہا "معاذ کیجئے سرکار! مجھے  
تباہی میں نہ ڈالئے۔ کیا یہ میرے لئے باعثِ ندامت نہیں ہے کہ مرث  
دو بیگہ زمین جو میرے باپ دادا کی واحد یا دگوارہ گئی ہے اُسے بھی  
فروخت کر کے نانِ شعبینہ کے لئے محتاج ہو جاؤں؟"

زمیندار کا چہرہ مارے غصہ کے سرخ ہو گیا، اُس کے بشرے سے  
خشم و قہر کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہ چند سکند تک خاموش رہا۔ پھر کچھ  
دیر کے بعد معنوی ہنسی ہنسنے ہوئے بولا "اچھا کچھ ہرج نہیں دیکھا جائیگا؟  
ابھی شکلِ دو ماہ گزرے ہوں گے کہ زمیندار نے ایک جعلی سینڈ لٹ  
بنا کر مجھے دو لڑوں بیگہ زمین سے بے دخل کر دیا۔ افسوس! جن لوگوں کے  
قبضہ میں دنیا کی ساری دستیں بٹ کر آگئی ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ  
زمین حاصل کرنے کے لئے بدترین فعل کرنے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔

"شاید خدا کو یہ منظور نہیں ہے کہ میں اب دنیا میں زندہ رہوں؟  
میں نے دل میں سوچا "اسی لئے تو اُس نے میری کچی کچی زمین بھی چھین  
کر زمیندار کو دے دی؟"

یہ خیال کر کے کہ مجھے دنیا کی نعمتوں اور مستردوں میں حصہ لینے کا کوئی  
حق حاصل نہیں ہے۔ میں نے ایک سادھو کا ہاتھ پکڑ لیا، اس کے ہمراہ در  
در مارا مارا پھرنے لگا۔ گلی گلی کی خاک جھپائی۔ میں نے دنیا سے تعلق منقطع

دو بیگہ کے سوا میری تمام زمینیں ہمارے جنوں اور زمینداروں کی نذر  
ہو گئیں۔ میں نکبت و غسرت کے بھیا نک غار میں گر پڑا۔ دو بیگہ زمین کی  
بسا طہی کیا! دالِ ٹیلے پر بھی گزارا وقت کرنا دشوار ہو گیا۔ اکثر خاف کرنا پڑتا  
تھا۔ مگر بڑا جو غرت کا کہ یہ دو بیگہ زمین بھی جس پر میری تمام زندگی کا  
مدار تھا، گھاؤں کے زمیندار کی آنکھوں میں کھٹکے لگی۔ چنانچہ ایک دن منبدا  
مجھے ہاکر کہنے لگا۔

"ادپن! ایک خاص کام کے لئے تمہاری زمین کی شدید ضرورت  
ہے۔ اگر میرے ہاتھوں فروخت کر دو تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ معقول  
قیمت دے دوں گا۔"

"آپ زمیندار ہیں سرکار! آپ کے پاس تو دنیا بھر کی زمینیں موجود  
ہیں آپ کو مزید زمین کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے، اگر ہو سکتی تو میں قطعی مجبور  
ہوں سرکار! مرث دو بیگہ زمین باقی رہ گئی ہے۔ اگر اسے بھی بیچ دوں  
تو کھاؤں گا کیا سرکار؟"

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے ادپن! زمیندار چرب زبانی سے کام  
لیتے ہوئے بولا بات یہ ہے کہ تمہاری زمین کو اپنے بلوغ سے محض کر کے  
اس میں بھی پودے لگا دینا چاہتا ہوں۔ اس طرح باغ کی خوبصورتی  
اور تفریحی دو بالا ہو جائے گی۔ قیمت کی طرف سے مطمئن رہو۔ کچھ  
زیادہ ہی دیدوں گا۔"



# زقار وقت

## اڑیہ کا سبق!

مربہ اڑیہ کا سابقہ محمود اور اس کا معسور مل۔ کانگریسی وزارتوں کی سیاسی فتوحات میں اک طرہ افتخار کا اور اضافہ ہے؛ کانگریس کا قبولی منصب اگرچہ ہر لوث اور ضعف سے پاک رہا ہے، لیکن انگریزی سرمایہ داری اور برطانوی سامراج مسلسل اُسے ترغیب اور ترہیب کی دو گونہ آزمائش میں گرفتار کرتا رہا ہے؛ اک مستبد و فاسد حکومت خود اپنی جگہ طاقت اور دولت کی صید بذریعہ ہوا کرتی ہے، پس اپنی زار و نزول رعیت کو وہ ان دونوں مذکورہ فتوں کی کار فرمائی سے بالاتر کیونکر سمجھ سکتی ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بار بار یہی دو گونہ طعش اُس پر چلاتی ہے اور ہر ناکامی پر اک تلخ کام استہباب سے اد جا رہوتی ہے اسے

خدا یا! جذبہ دل کی مگر تاشیر الٹی ہے!

کہ جتنا کھینچا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھے!

اپنے دُشمنوں کی فزیت کا یہ خطاب سننے کی صلاحیت غلط گوشِ حکومت

بشکل رکھتی ہے کہ

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ کہ غنقا را بلند است آشیانہ!

حقیقتہً اس معرکہ کے فریقین جنگ یہ ہوتے ہیں:

اس طرف تیغ و تلنگ، اس طرف اک ذوقِ عمل

جنگ پھر ہوتی ہے دیوانوں کی فریادوں سے

## ادارہ کلیم

شانِ فردادِ صحران، براہیم اور صحران  
جس کے نکلائے ہیں درویش چا بانوں سے!

الغرض حکومت اس ماجرائے عجیب کو نہیں سمجھتی۔ غلط فہمی، غیر معاملہ دہی، غیر مردم شناسی، غلط کوٹھی، غیر عبرت پذیر ناکامی بی۔ بیسود دست و پا زنی، یہی اُس کے کاروبار ہوتے ہیں، جو اُس کی آنکھیں اُس وقت جا کر کھولتے ہیں جب کہ نقاب انگلی بھی بے معارف ہو جاتی ہے؛ تاج و تخت کے تیز لزل ہونے سے پہلے تاج پوشوں اور تخت نشینوں کے دماغ معطل اور حواس مختل ہو جایا کرتے ہیں اسے

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر آسد جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا!

پہار اور یوتی میں کانگریسی وزراء نے غلظ کو نذر تغافل کرنے کی کوشش

میں ناکام ہو کر اب اڑیہ میں کانگریسی وزارت کی بیداری حواس و انتہا

ضمیر کا حکومت نے جائزہ لیا؛ اُس نے شاید فرض کر لیا کہ خاندان کانگریس

کے سائین اتیک سو گئے ہوں گے۔ کیا مصافحہ ہے اگر اُن کے پاؤں کی

جوتی اتار کر اُن کے سر کا تاج بنا دی جائے؟! یعنی وزارت کے ماتحت

سیکرٹریٹ کے اک اہل کار کو صوبے کی گورنر شپ کی شہ نشین پر تنگ

کر دیا جائے؛ یہ کتنی معصوم عیاری اور کیسی محفوظ پس منظر تیر اندازی ہوگی!!

کانگریسی حلقوں کی طرف سے اک ہوش آدرجئے احتجاج پلا یا گیا، مگر

کی خود فہمی کا پردہ تو اُسی وقت چاک ہو گیا تھا، تاہم وہ دوسروں کو اپنے

پر قبض کرنے کی انسانی کرداری سے جلد نجات نہ پاسکی؛ اُس نے اگر اپنی

ہمگز سازی کی کارروائی کو اک شریف آدمی کے گھر میں مداخلت بوقت شب کا اقدام سمجھا تھا تو کانگریسی وزارت کی تنبیہ کو سبھی اک گیدڑ بچنے سے زیادہ فرض نہ کیا: پھر دیکھئے کہ اس قیاس فاسد کی اساس فاسد پر ادباج حل و عقد کی نشت آزمائی کس ذبت تک پہنچی! مسٹر داس وزیر اعظم اڑتے جب بغرض اذغال استعفیٰ، پوری روانہ ہونے کے لئے اپنی کاریں پارکاب ہو گئے تو اس وقت گورنر پیار کے قدم متزلزل ہوئے اور انہوں نے بذریعہ ٹیلیفون مابل پرواز وزیر اعظم کو مطلع فرمایا کہ آپ تکلیف نہ فرمائیے۔ میں نے اپنا عزم رخصت فرما کر دیا ہے، اور سارا معاملہ رفت و گزشت ہے! یہ

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں سبھی امتیاز آیا ہے اب مزاج ترا استخوان پر: تاہم تنبیہ اڑتے کا اسی سبق ایک قدم آگے واقع ہے: قبول منصب کے وقت یہ اندیشہ کیا گیا تھا کہ کہیں کانگریسی وزیر اس بخیلانہ آئین کے جامہ تنگ کے شکنجے میں کھل کر نہ رہ جائیں! جاسے کی تنگی میں شک نہ تھا، لیکن قوم پرست و ذیروں کی سیاسی و اخلاقی تونسنڈی بھی ہر شک و شبہ سے بالاتر ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے زندہ و بالیدہ اجسام نے جامہ آئین کو کہیں کھینچ تان کر فراخ کر لیا اور کہیں اپنے گداز بدن کے وزن سے اسے پھاڑ ڈالا! جو مطلق العنان گورنر منتخب شدہ و ذرارہ پر عرصہ ذلت تنگ کر دینے والے تھے، خود ان کی ولادت اور وضع محل میں آج کانگریسی وزیر حائل ہو گئے!

در جہاں مانند جوئے کو ہمار از نیشیب و ہم نسر از آگاہ شو  
یا مثل سیل بے زہن سارزی فارغ از دست و بلند راہ شو:  
جو وزارت چھتاری وغیرہم کے لئے اک دامگاہ متقی وہ داس  
و امثالہم کے حق میں اک درز شاہ "بنو گئی! یہ  
ہرچہ گیر و ملتی علت شود "کفر گیر دکانے" علت شود

(۱-۱-خ)

## میسور میں کانگریسی علم کی سرفرازی!

"دور سوا اتم" ریاست میسور کا اک گنام کو روہ، شاید جدید الہد تاریخ میسور میں اُس سے زیادہ یادگار مقام بننے والا ہے جتنا کہ

اینگلو انڈین ہسٹری آف انڈیا میں نامور قلعہ سرنگاپٹم، یہی ارض دکن کا وہ تاریخ ساز نقطہ ہے جہاں دس ہزار خلق اللہ نے اپنے وطن گرم سے بخت ہند کے علم قومی کے ساتھ اپنی بے پناہ عقیدت کا طفری - فائزنگ کی زبان شہادت کی مہنوائی میں خاک میسور کی لوح محفوظ پر لکھ دیا! اور پھر اس عقیدت کے اخلاص کے احترام و خیر مقدم میں دربار میسور شریفانہ و فیاضانہ آگے بڑھا، اور کانگریس کے ترنگے جھنڈے کو اپنی ملکیت کا لازمی علم تسلیم کر لیا! یہ دیکھیں تو کس طرح انہیں ہوتا نہیں اثر

تو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم! شہید کا جو خون اک کلیسا کی تعمیر کے لئے آب و گل "یہم بھپتا" ہے وہ آزادی کے مندر کے خاکے کی صورت گری بھلا کیوں نہ کر دھکا! شش جہت میں قربانی ہی کے کھڑکن فیکون کی کائنات نظر آتی ہے! سخی جرات ہے نشان قیس و شان کو بہن عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہا!

"عادتہ" دور سوا اتم کے بعد بے درپے جو واقعات ظہور میں آئے ان کی طبع زبان حال بجز اس کے کس حقیقت کی ترجمان ہے کہ سارا ساتھ اک وقتی غلط فہمی کی بنا ہیکاری تھا! میسور، ہندوستان کی اک درجہ اول کی ریاست ہے! ترقی و تقدم اس کی پیشانی پر خط جلی کندہ رہے ہیں! گزشتہ سین کے اک دہرے کی تقریب سعید پر ہاتھ لگانے والی نے دربار میسور کے نظم و نسق کو رام راج کا قریب ترین دستیاب ہندوستانی نمونہ فرمایا تھا! ماضی قریب کی اس نیکنام اور خوشناس ہندوستان "تاریخ ندیں" کی جلد کا ایک جز و بھلا دور سوا اتم کا "درق خونیں" کس طرح بن سکتا تھا! نیک محضر ریاست میسور کی شاہراہ ترقی و ارتقا کا جلوس رواں ایسے فائز تاریک کی اُقاد سے بالا واقع ہوا تھا! چنانچہ وقوع واقعہ کی پہلی صدائے بازگشت پر گو یا میسور کے نظام عصبی کا ایک ایک ریشہ بیدار ہو گیا! اور وہاں کی حکومت نے عاجلانہ تشکیلات و تکرار سے متحدہ ایسے دلیرانہ اقدامات کا مظاہرہ کیا کہ ہندوستان کی مٹی پر نگران آنکھوں کو جو خوش حال میسور کے رُخ روشن پر ناگہاں پڑ جانے والی اس نقاب تاریک پر مرکوز ہو رہی تھیں، معاً میسور کا اصلی چہرہ نظر



واقیت کو اس ماضیاء معاملہ بندی کی زبان میں ادا کرنا پسند کرتے ہیں کہ  
"میں ستر جناح کے جناب میں باریاب ہونے کے لئے جا رہا ہوں!۔"

مقصود ہے ناز و غرور، دے گفتگو میں کام  
بتا نہیں ہے دشمنہ و غفر کہے بغیر!

تایم آپ یہ خیال نہ کیجئے گا کہ ستر جناح کی بارگاہ ناز کے مجلسی آداب کے  
یہ آخری مکتبہ مدود ہیں بحاشا دیکھا! اس اجمال کی تفصیل آپ یوں سمجھنے کی کوشش  
کیجئے کہ اپنی ذہنی یادیں گفٹ و شنید کی افتتاحی تاریخوں میں کہیں پہنچتی سے  
مولانا ابو الہام آزاد نے بریل تذکرہ اک نامندہ پریس سے انا کہہ دیا کہ تو آغاز  
ذکر اتہ صلیح اک مثلث ناخط و کتابت کا حاصل ہیں جس کے ایک فریق ستر جناح  
بھی ہیں! اس پر ہندوستان کے مختار الملک، اسلامی ہندوستان کے  
"قائد اعظم"، علامہ اہل، ممبئی کے "شہزادہ اسلام" نے مٹا اک برقی پیام سے  
ملی پریس کو نوازا، جس میں اس شاہی نگ کو مسترد کیا گیا کہ اُسوں نے موجودہ  
گفتگوئے مصاحبت کی سلسلہ جنابی و طرح اندازی کے کسی ننگ کو گوارا کیا ہے!  
بندہ پرور! مگر خدا شہدہ!!

جن بزرگوں کو وطن مظلوم کے مسائل و مشکلات سے اپنی ہمدردی ہے مٹنی  
کہ ستر جناح کی ذاتِ عمدت آپ کے ان کلمات سے مترشح ہوتی ہے، انکی  
"شکل کشی" پر ہم ایمان لائے ہیں!۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے و فسا کیا ہے!  
سچ تو یہ ہے کہ ستر جناح خود مسلمانانِ ہند کی اک لاعلاج سیاسی شکل  
ہیں، نہ کہ ان کا محلِ شکل! خود اک عقدہ و شوار کو ہم نے نہ ناخن تدبیر قرض کر  
رکھا ہے! اک طاعون کو "تریق"!

ہاں دیر بحث گفت و شنید کے آئندہ مراحل سے اگر آپ اُس کی بات  
پر دریوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس خبر کے اندر اک سُرخ مستقبل پچا  
کہ اب مزید گفتگو جناح اور قوس کے درمیان خط و کتابت کے ذریعے ہوگی!  
یہ مکتوب نصف المقات "ہوں گے، نصف التفیق" ہوں گے!۔

تعلیم ہم مروت کہاں رہی باقی؟ ذریعہ باتوں کا اب جبکہ نیٹینو ہوا!  
حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ اک درو لادو ہے! ارباب لیگ کے جو مقصد  
مرکزِ خاطر ہیں وہ تو ناگفتہ بہ ہیں، اور جو گفتنی ہیں وہ تفصیل حاصل ہیں! پھر وہ  
کوئی سمجھوتہ، داد و مستند کے اصول پر کرنے کے لئے تیار نہیں! وہ زیادہ

نہا دایں گج مایا رب غم از باد پریشانی!  
سر مرزا آغیل بالاقبہ اور سردار پٹیل کے درمیان جو معاہدہ  
عمل میں آچ ہے وہ مستقبلِ قریب کے برطانوی ہند اور ہندوستانی  
ہندوستان کی بنگلہ دہی کا تہید سی، ٹیک ہینڈ ہے!۔  
شکرا یزد کہ میانِ من و او صلح فتاد  
حوریاں رقص کنان ساغر مستانہ زدند!

عالی جناب ہمارا جہ پیا در میسور کی پیشگاہ سے ترم خسرو داد کے  
جو ایک سے دائمہ اطلاعات ہوئے اُن میں شکست خوردگی کے کسی پہلو  
کی تلاش کی کاوش، اس شاہانہ کریم النفسی پر بڑا خراجِ تحسین ہو گا!۔  
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست  
یہ حقیقت میں نفرمندیِ سلطانی ہے!

اگر وہ حور اسوا اتم کے شہداء کا خون، قومی پرچم کو اتار سُرخ رو  
کر سکتا ہے تو ہم اسے ناکافی "خربہا" نہیں سمجھتے! اگر اک غلط کارِ مایہ نکت  
کا فائرنگ آرڈر، اصل قلبِ ریاست سے قومی مملکت کے جمہوری رنگ  
میں رنگ دے جانے کے اک نامندہ کمیشن کے تقرر کی، گلبانگ کا  
آہنگ پیشیں بن سکتا ہے تو ہم اُسے سینہ شکست، کیا معنی "سامع خراش"  
کہنے میں بھی تامل کریں گے!۔

تفاوت است میان شنیدین من و تو  
تو لیسن درو من فتح باب "می شنوم"

(۱-۱-۱۸)

## گفتگوئے مصاحبت!

مسلم لیگی بچوں کو منانے پر جانے کا بزرگانِ کانگرس نے پھر اک  
مرتبہ سلسلہ شروع کیا ہے! گاندھی جی کو اس سٹیج پر "لذت"  
سبارک ہو!۔

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو! از شما یک کس نشد اسرار جو!  
"مطلوب عربہ جو" کی نزاکتِ طبع کی اتنی رعایت اس مجاہدی  
طالب (ہما تھا) کو منظور ہے کہ وہ اپنی اور جناح کی ملاقات کی بیکار



سے زیادہ یافتہ کا بدلہ زیادہ سے زیادہ طلب سے دینا چاہتے ہیں۔ اور دوسرے کو زیادہ سے زیادہ پابند کرنے کا نغمہ البدل ان کے ہاں اپنی زیادہ سے زیادہ آزادی و بقیہ ہی ہے۔ ان کے فلسفہ آئینی میں حقوق کے بالمقابل فرائض واقع نہیں ہوتے، میں صرف حقوق کی ہوں ہے۔ کانگریس کی کوئی بات انہیں، کانگریسی وزارتوں کی کرسیوں کے سوا پسند نہیں۔ یعنی وہ کانگریسی جہاد آزادی پر تو تہڑی بھیجتے ہیں۔ لیکن اس کے اشارہ فتح میں اس کا نامہ بنانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان کی شرائط معافیت یہ ہیں کہ ہم تہائے یہاں آئیں گے تو کیا کھلاؤ گے؟ اور ہم ہمارے یہاں آؤ گے تو کیا لاؤ گے؟ غالباً اس ایک طرفہ معاملت میں اک راز ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل لیگ، فریق ثانی کی ساری پیشکشوں اور مراعات کا معاوضہ اپنی طرف سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آئندہ اپنی رخنہ اندازیوں اور فتنہ پروازیوں کو ترک کر دیں گے؟ پس ہم سے کوئی سمجھوتہ کرے تو اس حیثیت سے نہیں کہ ہم کوئی حقدار فریق ہیں جسے اپنا حق ملنا چاہیے۔ یا یہ کہ ہم کوئی کارآمد ملی جماعت ہیں جنہیں اپنے سیاسی مستقبل سے مطمئن کر کے استخلاص وطن کے معرکے میں دوش بہ دوش کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس لئے اور محض اس لئے کہ اگر ہماری دہن دوزی، مذکی گئی تو ہم تہا را بھی خواب و خور حرام کر دیں گے۔ پس صرف ہمارے شر سے ڈر کر ہم سے معاملہ کر دے۔ اور تمہارے عطیات کی ہماری طرف سے یہ کافی و دوانی سمیت ہے کہ ہم اب شرارت نہ کریں گے! — یہ کوئی پارٹی پالیسی نہیں ہے، ٹوٹیکل بلیک سیلنگ ہے۔

مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کے یہ آخری ممکنات ہیں! ارادہ و سادہ نواہان و قلعہ داران کو اگر آپ سارے ہندوستان کی پیشکش بھی نذر دینا تب بھی وہ برطانوی سامراج کے خلاف کسی جدوجہد میں شریک نہیں ہو سکتے! آخر الذکر چیز ان کے دو تہہ اندازہ شاخ و برگ کی بیخ و تنہ ہے۔ اور کوئی شے امکاناً اپنے مادر پدر کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتی۔ اگر ارادہ سے سمجھوتا ممکن ہے تو ہندوستان کے قلعہ نشین برٹش سونہرے سے بھی اک معاہدہ کی طرح ڈالنی عینہ اسی طرح دائرہ امکان میں ہے۔ ہم سادہ لوح کانگریس کے دماغ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ

دل ناداں نکتے ہوا کیا ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے! مسلم لیگ کے بعضی بچے بھی مخصوص مفادات ہیں۔ نہ کہ سر جناح!

جو محض اک پردہ ہیں! اگر آج وہ کانگریس سے متفق ہو جائیں۔ قائد اعظم کی بلند نشین سے مغرور ہو کر اک سیاسی مرتد کے گڑھے میں دھکیل دیے جائیں۔ کانگریسی مولانا محمد علی مرحوم کا کٹر مسلم حلقوں میں قبل ازیں ہی حشر ہو چکا ہے! الفرض جناح انہی مذکورہ بالا ارباب دولت و ریاست اور ان ہی خطاب یافتہ درباریوں اور حکام رس خواجہ سراؤں کا وکیل ہے۔ حوزہ اہل معاملہ نہیں۔ قائد اعظم کا خطاب صرف تمھارے کان کا اک جڑ ہے جو بجائے نقد کے جتن میں ادا ہوا ہے! اسی طرح محمد الملک کا لقب لبراً کے مقدمے میں مختار نامہ لگانے کی ایک فیس ہے! — پس سر جناح کو مفید کن عنصر سمجھا بڑی مخالطہ امیر شخص ہے! اصل فریق معاملہ معمولاً باوجود چھتاری ہیں۔ چنانچہ محمودہ راضی نامے کی شرائط کو وکیل نے اپنے موکلوں کی طرف رجوع کر دیا ہے۔ جو ہم چون کو اس کے دکات خانہ واقعہ میں قدم بڑھنا ہو کر اپنے عدالتی نمائندے کو ضروری احکام دیں گے۔

سوال یہ ہے کہ کانگریس ہندال کی ساری وسعت کے باوجود کیا وہ اتنا فراخ کیا جاسکتا ہے کہ محمود آباد و چھتاری کو اس کے اندر لایا سوڈیا کیا جاسکے؟

صلح گران کانگریس کی طرف سے یہ غیر ملفوظ فریاد ہمارے گوش زد ہوتی معلوم ہوتی ہے کہ

بس عجم نا امید خاک میں مل جائیگی یہ جو اک لذت ہماری سی بے مال ہے!

(۱۰۱ء)

## کان پور کی سرائیک

کان پور کے کارخانجات پارچہ بانی کی تازہ آغاز مہیب ہڑتال، سرمایہ داری کی نااہلی اور بے دردی کی اک پرسوز رسوائی ہے! یہاں نامہ سرائیہ داری کی مریضہ کے اک ہمدرد معالج اور دسوز بیمار وار واقع ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ سرمایہ داری کی اصلاح ضرور کرنی چاہیے۔ لیکن اسے منسوخ نہ کرو دینا چاہیے۔ تمام دولت مندوں کو امانت داران دولت کے قالب میں ڈھال لو۔ اور پھر غم کو، بالشوک انقلاب کی ضرورت ہے، نیکو سنٹ تشدد کی۔ نہ ڈکٹیٹر شپ آف دی پریویرٹیٹ کی! ارادہ اور غر با زیادہ سے زیادہ پس ذرا بے فکر والدین اور قدرے محروم نظر

مہر اولہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور تھوڑی سی تعلیم و تلقین اور بیداری منیر و سلسلہ جنبانی کرم کے بعد دونوں کے درمیان صلہ رگمٹ کے تعلقات بحال ہوتے ہیں! — مہاتما جی کی نیکی و معصومی کا یہ اک نہایت خطرناک پہلو ہے۔ جس چیز کو وہ بھائی کہتے ہیں اس کی تاریکی نسبت پروردگار سے لے کر کسی وقت بھی کوئی ایسی شے کبھی سرخ و جود میں نہ رہی جو بجز طبقہ آویزش کے "مادر و دختر کی آمیزش" کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہو! بلاشبہ ایسے افراد بکثرت ہوتے ہیں جنہوں نے اس اذعان کو اپنے سینوں میں پایا کہ وہ ایک ہی خاندان آدم کے ارکان ہیں جن کے ساتھ ایک ہی دست و پاؤں پر انہوں نے کھانا کھایا۔ وکٹر ٹیوگو کی لائبریل کابشپ اک ایسی ہی ہستی تھی۔ سفر طرا اسی است بشری کا اک دوسرا داعی تھا۔ مسٹر ایچ۔ جی دیلز دژندہ و زندہ جاوید مورخ تاریخ عالم، اک ایسا ہی عالمی دل و دماغ رکھتا ہے۔ جو دنیا کو ہمارا بڑا گاؤں کہتا ہے۔ خود مہاتما گاندھی اسی سلسلہ عالیہ کے اک حلقہ زریں ہیں۔ اور پھر تاریخ کی سب سے بڑی بوا بھی یہ ہے کہ سوشلزم و کمیونزم کا پیغمبر کارل مارکس۔ شاہی لاک کا ہم نسل تھا۔ اور ساری دنیا کے لکھ جتوں اور کروڑ پتیوں کی دولت کو۔ محمدین و مسالکین اہل کے لئے حلال کر دینے والا ابھی قارونوں اور فرعونوں کے بڑے بڑے علمتہائے ترے تازہ سیت گریزاں و دو گرداں رہا:

تاہم سب کچھ کہنے کے بعد حقیقت اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ یہ سب افراد کی داستان تھی، افراد کی لیکن ناپیدائندہ انسانی جبل کے یہ معدودے چند گل و شگوندہ اس "نیستان سوسائٹی" کے منظر خارزار میں کوئی قابل شمار تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ ایسے افراد و زو انسان کا درماں بننے میں جتنے کامیاب ہیں اتنے ہی کیما ب ہیں ان کو کثیر القداد و عامۃ الورد و ادہل الوصول سمجھنا اس قدر نیک خواہی نہیں جس قدر کہ بدعقلی ہے، اگر تیراج موجود ہوتا تو گاندھی جی کو بتانا کہ:

مت سہل ہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پرے و انسان بھٹکتے ہیں! اخلاقی و معاشی و اجتماعی فلسفیوں نے اسی حقیقت کو اخلاقی فرد اور اخلاقی سوسائٹی کے اصطلاحی کلمات میں بیان کیلئے! سع نیت جزاں دریں عالم کہ بسیار است و نیست:

اس وقت کان پور کے سرمایہ داران، اجتماعی طب کے دارالمتخص

میں کھڑے کئے جا چکے ہیں۔ اب مہاتما جی دیکھ لیں کہ ان مرعیوں کی امتنان کیا حرکات مذہبی کے چارٹ کے اندراجات کیا بتاتے ہیں۔ ان امانت داران دولت قومی نے کارخانجات کان پور کی گزشتہ متعدد و متواتر ہڑتالوں میں فائدہ کش و نشاء فائزنگ مزدوروں کا رقص سہل دیکھا: "تامن حرفت" کے مراعاتی قانون سے پورا فائدہ اٹھانے کے باوجود مزدوروں کی اجرت کو قوت لایوت کے پیمانہ تنگ تک بھی نہ پہنچایا! روٹی کے بجائے گرنے کے نتیجے میں ہندوستانی کاشتکار کو کروڑوں کا مجموعی خسارہ ہونے کے علی الرغم، کارگاہوں کے بازانی ساختہ کپڑے کے نرخ میں مطلق کسی تخفیف پر آمادگی کا اظہار نہ کیا۔ حکومت کی مامور کردہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پاک حساب کے سارے ادعا کے باوصف محاسبہ کتب حساب سے مجرمانہ گریز کیا۔ کانگریسی وزارت کی تنبیہ پر بھی کمیٹی کی نہایت معتدل سفارشات کو عملی جامہ پہنانے سے انکار کر دیا۔ حکومت کی حرف گیری پر خود اس کی مقرر کردہ کمیٹی کو گونا گوں اصطلاحی بے مبالغیوں کے ارتکاب کا ملزم گردانا۔

لیبر کمیٹی سے اشتراک عمل کرنے کے بجائے اس کے ارکان کو عین وقت آخر پر اپنی سفارشات میں ترسیم و تحریف کرنے کی سازش کی اثر آفرینی کی! ابتدائی اعلان اشتراک کے بعد کارخانوں کو کھلا رکھنے کی کوشش کی اور ہڑتالی مزدوروں کے راستے میں لیٹے ہوئے اجسام کو "خام ناز کاڑ سے ٹھکراتے ہوئے"

اپنی فیکٹریوں کے دفینوں کے کاشانوں میں دڑاتے ہوئے چلے جانے کی معشوقانہ جفا کاریوں کی نمائشیں کیں! چالیس پچاس ہزار کے درمیان مزدوروں اور تقریباً ڈیڑ لاکھ نفوس رکھنے والے مزدور خاندانوں کے زن و بچہ کو بے آب و ناں اور شاہد بے خانماں جمہور دیکھنی تال۔ مثلاً اور ولایت کی بہشتوں کی طرف رخ الی السما فرما گئے! — سبحان اللہ بریں امانت داری! دولت قومی! "صل علی بریں تلاح پذیر بی سرطان سرمایہ داری!" ہندوستان کے سرمایہ دار مہاتما گاندھی کے اُپیشوں پر اس سے بڑھ کر شرح صدر کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ جتنا کہ پر یڈنٹ روز ویٹ کے بدگروام تجدد معیشت پر امریکن ملوک التجار نے دیا ہے۔

بایطینت آدم زخیر و گراست تو توقع زحل کوڑہ گراں میداری! موجودہ لمحے پر بھی ارتقا یافتہ بشریت کی پماندگی کا یقین ہے۔ ہاں نوع بشر چین مجیں ہے اب تک انسان رہ راست پر نہیں ہے اب تک

## ماہرین کی کمیٹی

کانگریسی مسوجبات ہند کے ذریعے اعظم نے اپنے حال کے اجتماع  
بہت ہی قریب سے ماہرین کی کمیٹی کے قیام و انتخاب کی ایک غیر معمولی  
جزیرہ پیش کی۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمائیے،

ماہرین فن کی ایسی کمیٹیاں جو مخلوط و مشترک علمی و حرفتی  
و حکومتی مسائل و مہات پر متعلقہ ارکان حکومت کو مشورہ دیں تاکہ  
آج کل کے تعمیراتی تجاویز و سببش از سببش کامیابی سے بار آور ہوں،  
اپنے وسیع ترین مالد و اعلیٰ میں ایک بالکل جدید العہد تصور ہے۔ ہند  
مالک کی حکومتیں اگرچہ صدیوں سے دینی تسلط سے آزاد ہو چکی ہیں اور  
اسی قریب سے ایوان حکومت اور حرم کلیسا کا افتراق عمل میں آیا ہے  
لیکن اس الہامی محور سے لنگر گستا ہو جانے کے بعد ان کو کوئی دوسرا  
سینہ مرکز نقل بھی نہیں ملا ہے۔ ان کا عام ترقی پسندانہ، متمدن زاویہ  
نگاہ کافی نہیں کہا جاسکتا۔ عالم غیب کے الہامی دین سے ان ریاستوں  
نے جو رہائی حاصل کی تھی وہ عالم ظاہر کے مثبت علم و سائنس کی منم کشائی  
پر کی تھی۔ لیکن اس پس منظر کی روشنی میں انتظامی حکومت کا داخل خارج  
میں صحیح فزین کے نام نہ ہوا۔ ہم پادریوں کے بچے سے چھٹے اور پالیٹنوں  
کے چٹل میں پھنس گئے! علم کی حکومت نہ وہ تھی، نہ یہ ہے! ہمارا نقل  
مکان و کورانہ عقیدے سے عام سیاسی توہمات اور قوم پرستانہ  
نقصیات کو ہو گیا۔ مزدورت تھی کہ مغل خلاص شہری کا ہاتھ جہل و جمود  
سے چھڑا کر مین علم و فن و تقدم و تمدن کے دست بعبیت میں دے دیا  
جائے، اور جاہلی پادری اور عامی سیاسی ہر دو کو سررشتہ حکومت  
سے خارج ابلد کر دیا جائے۔

انسانی و مانع ابھی تازہ تازہ ہی اس تصور کی علی الاطلاق وسعت  
و قطعیت سے آشنا ہوا ہے۔ چنانچہ اس مسلک سیاست و حکومت کی  
ترجمانی کے لئے جو اصطلاحی نام تجویز ہوا ہے وہ "ٹیکنوکریسی"  
(Technocracy) ہے! — یعنی نظم و نسق علم و فن!

کانگریسی وزراء کی مجوزہ کمیٹی ماہرین اسی تصور کا خواب ابتدائی  
ہے اور اسی نئی تدبیر امر کا نقش اول۔ ان حکومتی کمیٹیوں کے

اشد کو ہوشدار کہ سہ ماہانہ ہمارے ہاں وہیں ہے اب تک!  
بشریت کا دیرینہ سلطان، نیز اس کے لئے ایک جدید ناچکار رجحان  
نشر ہے!

خواجہ انور، لکھنؤ، سب سے زیادہ قابل و درجہ دار  
انقلاب! انقلاب! انقلاب! (۱-۱-۱۸)

## لیبر کمیٹی

لیبر کمیٹی کے نام سے آل انڈیا نیشنل کانگریس نے ایک جداگانہ  
ادارہ قائم کیا ہے۔ جس کے اغراض و خدمات کی نوعیت کا ایک عمومی  
تصور اس کے نام ہی سے قائم کیا جاسکتا ہے، یہ جدید صیغہ آئندہ کے  
ہندوستان گیر کانگریسی ایوان حکومت کا ایک پرور با پرور بال مستقل محکمہ  
بن سکتا ہے۔ اور یہ امکان بھی چنداں بعید نہیں کہ وہ مستقبل کی سوشلسٹ  
حکومت ہند کا تخم ثابت ہوا۔ شاید کہ ہمیں بیضہ برآمد پرور بال!  
بہت ہی۔ توپی۔ تیار اور بڑوہ و غیرہ میں حرفتی مزدوروں کی زندگی و  
لازمت کے حالات کی جو تحقیقات ماضی قریب میں عمل میں آئی ہے۔ بے  
روزگاروں کے بارے میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں۔ اوقات خدمت  
کی ساعات میں جو تخفیف اور مقدار اجرت میں جو اضافہ ہوا ہے۔ افتاد  
مرض و ہرج میں جو رعایتیں منظور ہوئی ہیں۔ زنانہ مزدوروں کو ایسا موقع  
عمل و ابتدائی زمانہ زندگی میں جن مراعات کی سفارش کی گئی ہے۔ ٹیکسٹائل  
کی جو توسیع عمل میں ہے۔ بچہ بردار مزدور عورتوں کی خدمت کے کارخانجات  
و مقامات میں سودیٹ آداب حکومت کی اتباع میں شیر خواروں کے لئے  
جن گھوڑوں کی مبارک جدت کا اجرا کیا گیا ہے، وغیرہ۔ ان تمام  
حرفتی و مزدوری و اسے عنوان حیات و وطن کے تحت جس قدر قابل ذکر  
و داد تازہ نشو و نما مختلف کانگریسی صوبوں اور بعض ترقی کوں ریاستوں  
کے اندر ظہور میں آئی ہے، اس پر ایسی لیبر کمیٹی نے اظہار استحسان کیا ہے  
اور ان سرگرمیوں کی مزید ترقی و توسیع کی باصرار و تکرار متعلقہ جماعتوں  
اور حکومتوں سے فرمائش و سفارش کی ہے۔ کانگریس کا یہ اہم شعبہ ہمارے  
پرجوش خیر مقدم کا مستحق ہے!

ایک پیش کردہ رکن، سرہنوتیو ریادنیائے صنعت و انجینئرنگ کے اک منابر  
غفلت و جہالت واقع ہوئے ہیں۔ (۱۰۱-خ)

## دہلی اور نئی دہلی

دہلی کی میونسپلٹی میں ماہ مہنتہ کے دوران میں میونسپل کمیٹی کے غیر  
سرکاری صدر کی تائید میں اک بلند آہنگ ریزولیشن پیش ہوا جس پر  
ایوان کی دونوں پارٹیوں کے درمیان ہنگامہ خیز مجادلہ ہوا۔ مابہ النزاع  
یہ چیز تھی کہ پایہ تخت سلطنت ہند کی ۵۰ سالہ میونسپل کارپوریشن کی  
پیرزبانہی کا یہ کیا حال ہے کہ بایں ہمدردی و شش و شش اس کی سند صدارت  
پر اس کا خضر راہ اک سرکاری حاکم چلا آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کہاں تک  
قابل برداشت شرمناکی ہے؟

دلی صدیوں اور قرونوں سے ہندوستان مسلمان سلطنتوں کی تھکا  
جی ہوئی ہے۔ پس اس کے رگ و ریغ میں طاقت کے سامنے سجدہ ریزی  
کا ذوق غمزدہ ہو چکا ہے۔ سلطنتوں کے پایہ تخت سیاسی سطوت کے قلعے  
ہوتے ہیں اور افلاقی بزدلی کے زنا خنائے؟ یہاں کا ہر شخص طبعاً اک امیر  
ہوتا ہے، اور ہر امیر فطرتاً اک خواجہ سرا؟ دلی کا ایک ایک چہ اوداس  
کے کرۂ باد کا ایک ایک جوجہ ہوا اسی روح کی پرورش کا دیرینہ دایم  
ہے۔ پس عہد جدید کی ساری طاغوت شکنیوں کے علی الرغم یہاں کا  
قدیم الایام سیاسی سومنات آج بھی خاصا باب و تاب ہے۔ البتہ اس  
معبد کے مجاوروں کی اکثریت محمود غزنوی اور ابراہیم خلیل اللہ کے نام لیا  
دہلیوں کے خانوادوں سے بھرتی ہوا کرتی ہے اللہ

اگر حقیقت اسلام درجہ انست بزار خندہ کفرست برسلانی!!  
چنانچہ انگلستان کے سیاسی سینٹ ہال میں جو زلزلہ زیر ذکر میونسپل  
ریزلیشن سے ڈالا گیا اس میں ایک سے ایک بڑھ کر ستون اسلام  
ترجہ توحید نے اس کی ستر زلزل بنیادوں کی شہت پناہی کی، اور اپنے  
عقیدے میں اپنے صنم کبیر نیز اپنے "نفع کثیر" دونوں کے تحفظ کی ضمانت  
کر لی!۔

تو چاہے تو بے خاک بھی اک بندہ پاک میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہر جلع

اللہ اللہ سرکاری صدر کا ظل الہی! — اگر آپ کہیں کہ غیرت قومی  
کے لئے یہ مقدر بھی کس درجہ شرمناک ہے تو معاف فرمائیے۔ ہماری قوم  
جاہلوں کی آنکھوں پر ایسے حجابات غلیظ بٹھے ہوئے ہیں کہ وہ اس ذلت  
آفرینی کے دیکھنے سے قطعاً قاصر ہے! ساتھ ہی خان بہادر اتنا بلند بانگ  
اسم اعظم ہے کہ ہر جاہل کا سامعہ اس کے تلفظ ہی پر مرعوب ہو جاتا ہے!  
نئی دہلی کی حالت پرانی دہلی سے کہیں زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔ بر اعظم  
ایشیا کا یہ جدید ترین شہنشاہی شہر دنیا فوس ترین آئینی زندگی رکھتا  
ہے! یعنی اس کی ملکہ عالیہ کے ایوان ذی شان کی کرسیوں کو ایک بھی  
مفتب شدہ صبر کی نشست داغدار نہیں کرتی! یہ پارلیمنٹوں کی والدہ ماجدہ  
دلی قوم کا اک آزاد شہر ہے۔ یا مثلاًئی خاں دچنگیز کا مستقر استبداد  
تصاہر کان بلو؟ (۱۰۱-خ)

## یورپ

یورپ کے سیاسی بیجان و بجران کی دیگ سکون و تہرید پر آتی  
سلموم نہیں ہوتی۔ سرچمبرلین صدر اعظم برطانیہ، اپنے محبوب عقیدے  
میں اک نوحہ شغلہ کر اٹھے تھے۔ جس کی نسبت ان کا راسخ ایمان یہ تھا کہ  
اگر اللہ شافی۔ اللہ کافی کے زمرہ ہائے دعا کے زیر سایہ اس کے پلانے  
کا موقع انہیں دیا گیا تو وہ فری بر اعظم اور اس کے بعد ہفت اقلیم کے  
اس رفتہ کی متاع گم گشتہ کو آپ کی ہتھیلی پر لاکر رکھ دیں گے! —  
انہوں نے پہلے تمام یورپ پر اک نگاہ غلط انداز دالی اور بیک نظر  
اس کے ماؤف ترین نقطہ بدن پر انجلی رکھ دی! یہ عبارت سحر  
امی ہے!

انہوں نے کہا کہ یورپ کا اصل نقشہ گز سوتیلی ہے۔ اور اس کے  
جذبہ فتنہ گری کا ذریعہ علاج شافی اک معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ اتنی  
فاتحکار چیز ہے کہ اگر تریفالگر ایکویرٹاؤر کی چوٹی پر کھڑے ہو کر بھی وہ  
اس کی اثر آفرینی مسولینی سے کریں تو منافی مذہبی کوئی بات نہ ہوگی۔  
بڑے، لاغر اندام چمبرلین کا دل ایسا ٹوٹ کے مسولینی کے تسلیم خط  
خال پر آیا کہ مجنوں کے عشق یقی کا رومان سر پر گیا ہے

عشق پر زد نہیں ہے یہ وہ قاتلِ غائب کو لگانے لگے اور بچانے نہ بنے؛  
اُٹلی کے آنکھوں سے "پر پہلی قریانی ستر چہرین نے اپنے نوجوان فرزند  
سیاست کپتان آیدن کی چڑھائی جس غریب نے اضطراباً کہہ دیا تھا کہ  
آپ کس مزدوم دُر کو اپنا دل بڑبا رہے ہیں؟" صاحبِ حال چہرین نے آیدن  
کو جھڑک دیا: ادھر

گفت خامش شود تو مجھوں نیستی

بالآخر چہرین اور سولینی کی بغل گیری میں حائل کوئی کاٹنا نہ رہا۔ اور  
آزادان کی پیش کشِ عشق کے کام و بار شروع ہوئے۔ وزیرِ اعظمِ اٹلی  
نے بھارتیوں کے پورے نصف پانی سے آتشِ خوارِ آلِ دیوس کا غضب ٹھنڈا  
کیا؛ لیکن قبل اس کے کہ اس عملی تدبیر کے اثرات مرتب ہوں۔ ہر ٹہلنے  
کا بغاوتِ کرب کے سارے جہنم کی حرارت کو اپنی جلو میں لئے روتہ آدمی کا  
اُس نے اپنے گرجے میں شش معائنے اور آتشِ افروز خطبوں سے اُٹلی کی فضا  
میں جو نزاع کی امواج پیدا کیں اُن کی پیمائش آپ سولینی کی مابعد تغیر  
میں آئے کیجئے۔ جس میں اعلان کیا گیا کہ اُٹلی اور جرمنی کا اتحاد غیر متزلزل  
ہے۔ دونوں کو جو طاقت و نفرت نصیب ہوئی ہے وہ ایک دوسرے کی  
پشت گرمی کا نتیجہ ہے۔ جرمنی کا الحاقِ آسٹریا پر ہمارا صاف لوگوں کو

بُری طرح چراغ پا کر چکا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ مسکند کے حالات اب اک  
قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ مستقبل کی لامحدود دُوریوں تک روتہ اور برتن  
غلامِ بھنا نظر آتے ہیں؟

چنانچہ اسپن سے سولینی کی موعودہ دست کشی نے یہ کمرٹھ دکھایا کہ  
فرینکو کے دست و بازو میں شاید وہ چند قوت اُٹلی۔ اور اس نے سارے  
اسپن کو بھرا دیا قیاس اور بھرا آدم کے سوا مل کے درمیان پامال کر ڈالا؛

اٹلیستان کے بعد اب فرانس دو سرانگہ کا برابر فرہی بن رہا ہے  
وہ جب اٹلیستان کی سی تلخ پیشگی سے قاصر نظر آیا تو ٹھہرنے اپنے تازہ  
دم جیوش قدرتی حصارِ پیرنیز پر دوڑا دیئے مانتویز یہ ہے کہ اٹلیستان کے  
بے دردانہ و بزدلانہ سکوت سے فائدہ اٹھا کر فرانس کو مرعوب و مغلوب  
کر لیا جائے۔ دُوس سے بھی اس کے روابطِ دوستی منقطع کر دیئے جائیں  
اور سارے فرخشوں کو صاف کر کے دنیا کا اک نیا نقشہ بنایا جائے جس پر  
فرانس اور اٹلیستان سے طوفانِ کربا و مستحکم کرائے جائیں۔ کشور کشائی کا یہ بے  
پناہ جلدس رواں دواں ہے۔ آج کل وہ ڈیکو سکود کیا کی جرمن سرحد  
کو پتھیرے دے رہا ہے۔ بہت جلد یہ امر مقدور اخبارات میں اسناد  
بزمِ داغ بن جائے گا۔ (۱۰-۱۱ خ)

چونکہ ملتِ انساب ہو جاتے ہیں  
اگر رخ سے گلِ خراب ہو جاتے ہیں  
انسان کے سینے میں نیر کے چراغ  
کے چمپے جی با بایاب ہو جاتے ہیں

پامال خزاں طرب کا قتل ہو جاتے  
گیمین شکرِ خون سے داغ ہو جاتے  
سب دل کی تمنائیں گلِ جانیں اگر  
انسان کو زندگی جیسے ہو جاتے

# سلائیٹ میسور

کی بنی ہوئی جار جبٹ، کرب

Testidious people -

یاسائن ملاحظہ فرمائیے یقیناً

آپ ان کی عمدہ بناوٹ اور

خوبصورتی کو دیکھ کر ہندوستانی

مصنعت پر تعجب رہ جائیں گے

کیونکہ وہ بالکل ایسی ہی عمدہ

بنی کارآمد، دیرپا اور مضبوط

Govt Silk Weaving Factory

MYSORE

They are durable  
Attractive and  
Superior Quality

مال سے تیار کی جاتی ہیں، جیسے ولایتی، کثیر تعداد میں نئی قسم اور  
عیدید ترین ڈیزائن کے نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خالص اور مستر  
خالص ریشم سے تیار کی گئی ہیں۔ اس میں کسی قسم کی ولایتی یا نقلی  
آئینہ نش نہیں ہے۔

## گورنمنٹ سلائیٹ میسور

ایجنٹ برائے دہلی اور صوبہات متحدہ

میسرز گوگل چند کھٹہ، اینڈ کمپنی سودیشی کلاں چنٹ

دہلی کلاں مارکیٹ۔ لکشمی بازار گیٹ۔ کونسل روڈ دہلی

## عروسی

یہ ایک کامیاب علاج ہے جو بعد روغن عروس ترتیب دیا گیا مگر دراصل  
عروسی کی کامیابی کا راز بقا منائے خریدار ان طشت ازہام کیا جاتا ہے جو صلیبت  
اشارہ اشتہار میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن اس طرح پر خط و کتابت کی طوالت لوگوں  
کو تکلیف دہ تھی۔ تاہم دوسروں کے متقاضی میں کامیاب اور مانگ زیادہ تھی  
اور صاحب ضرورت کو خاص طور پر لکھا جاتا تھا (کہ اگر لاٹری کے سوا پیش پس  
میں ناہمواری دیکھی ہو تو پیسے و شیشیاں جو دن میں بالکل اس عیب کو رفع  
کر دیں گی، موافق ہدایت استعمال کریں جن کی قیمت مبلغ مقرر ہے۔ پھر عروسی کا  
استعمال طاعت رفتہ اُبھار کر دائمی نفع کا باعث ہو گا) ورنہ معمولی شکایات تو  
عروسی کھودے گی یہ علاج ہر موسم میں ہو سکتا ہے۔ اس کے ہمراہ چار چیزیں  
موسی۔ بناتی، کھیدی، یعنی اور دی جاتی ہیں ایک سٹ عروسی ہفتہ بھر کو کافی  
ہوتا ہے جس کی قیمت ۱۰۰ ملاوہ محصول ڈاک مقرر ہے۔ صاحب فرمائش نام و  
پتہ خوشخط تحریر فرمائیں۔

## شفا خانہ رضویہ چاندنی محل دہلی

### ناظرین رسالہ کلیم

اگر آپ ادب اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ کلیم کی غریبوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ملک کے بہترین شعرا اور ادبا کے حصے بڑھانا چاہتے ہیں  
اگر آپ اپنے علمی و ادبی ذوق کو ترقی دینا چاہتے ہیں  
اگر آپ اردو کو ہندوستان کی واحد زبان دیکھنا چاہتے ہیں۔  
اگر آپ ماضی اور حال کے شعرا اور ادبا کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں  
اگر آپ ایسی کتب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ملک کی ضروریات کی نظر  
رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

اگر آپ کفایت بہترین اخلاقی اور ادبی کتب خریدنا چاہتے ہیں

کلیم بک ڈپو جینتی نو اس نمبر ۱۰ دریا گنج دہلی سے خریدیے



# عالیجناب شرفالملک بہادر حکیم و جبرن خان خاں صاحب کے چار منظر عیلت

|                                                                                                                                                                                                                                                                        |                                                                                                                                                                                                              |                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                            |                                                                                                                                                                                                                                                                       |
|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| <p><b>لڑکا پیدا کر نیکی گولیاں</b></p> <p>ان گولیوں کے استعمال سے شرطیہ اور مکی لڑکا پیدا ہوتا ہے جس شرط پر آپ چاہیں خیر یا لڑکا ہونے کے بعد رقم ادا کرنے کا اقرار نامہ بھی کر مکت منگو سکتے ہیں۔ جس کے لئے ہر جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے پیشگی قیمت دس روپے مقرر ہے۔</p> | <p><b>اکسیر دوق</b></p> <p>تپ دوق، با مخصوص ہڈیوں کے تپ دوق کی بے نظیر اور لا جواب دوا ہے، ہڈیوں کی بے قاعدگی اور ناسور کے لئے بھی لا جواب چیز ہے۔ قیمت فی شیشی جو پندرہ دوز کے لئے کافی ہے پانچ روپے صر</p> | <p><b>حب مقوی غنبر و جابر اولی</b></p> <p>ان گولیوں کے چند روزہ استعمال سے بطن جواتی حاصل کر سکتے ہیں۔ بڑھاپے کو دور کر سکتے ہیں۔ اور از سر نو اولاد پیدا کرنے کے قابل بن سکتے ہیں، پڑمردہ اور بے رونق چہرے کو تروتازگی اور شرم میں تبدیل کر سکتے ہیں منف ہاہ اور کڑوی کسر پھول کے لئے پگولیاں آب جابر ہیں۔ فی دین پیر کی گولی صبح اور ایک لے وقت دینا</p> | <p><b>روغن غنیش زہاں نمبرا</b></p> <p>اسے ہر صبح و شام عضو پر مالش کیا گیا جاتا ہے۔ آٹھ دس روز کے استعمال سے عضو مخصوص کی ہر کمزوری کچی، کچی، و بطن بطن اور ہو جائیگی۔ جن لوگوں نے جوانی میں بد اعتدالیاں کی ہوں ان کے لئے یہ روغن اکسیر بہ قیمت فی شیشی تین روپے</p> |
|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|

لے کا پتہ: شاہی مطب نر و جامع مسجد دہلی۔ ٹیلیفون نمبر ۶۲۵۵۔ بہت صحت ارسال کی جاتی ہے

## مصری جدید برقعہ

دو حصوں میں منقسم



تشریح زیریں حصہ

تشریح بالائی حصہ

سر سے شروع ہو کر ہاتھوں کی لمبائی تک رہتا ہے، اس میں نہایت خوبصورت کندے سے شروع ہو کر پیر کے نچلے تک رہتا ہے، انکی شکل اور دو کوٹ کے ہر کمر کے اوپر خوبصورت پلیٹ پڑی ہیں یہو میں جب ہر کمر کے اوپر دو کوٹ کے بشرط دلچسپی منگائیں، ناپ کندے سے پیر کے نچلے تک اور سر کی گولائی تک ناپ روانہ کریں۔ قیمت سفید یا رنگین سوئی چھ روپے۔ شرو روپے۔ کریپ سنگ بارہ روپے۔ بوسکی پندرہ روپے۔ ناکسند ہونے پر اسی روند واپس کر دیں۔

خاتون اسٹورنسٹر چاندنی چوک دہلی



ہر ایک کے ذمہ ایک سنیے والا ہے  
 کی خدمت میں ایک ملک و چار  
 دو آئے غرض کہ اس کی  
 ہر ایک کے ذمہ ایک سنیے والا ہے  
 کی خدمت میں ایک ملک و چار

۳۰۰۰  
تین ہزار روپے

| نمبر شمار | اشارات                                     | مقطع  | جوابات |
|-----------|--------------------------------------------|-------|--------|
| ۱         | میسر صدی کی حیرت انگیز ایجاد               | ر     | ریڈیو  |
| ۲         | خواہش - آرزو                               | ذ و   | ذوق    |
| ۳         | برعزت میں اس بات کی غولی ہوتی ہے           | ح ی   | حضرت   |
| ۴         | ہندوستان کی ایک فلم کہانی                  | میں ن | سنگیت  |
| ۵         | مبہنی - مخول                               | م ز   | مزاح   |
| ۶         | انسان اسے حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے | ر ا   | راز    |
| ۷         | سرزمین مہارت کا مشہور نقطہ                 | ک ش م | کشمیر  |

ہندوؤں کی ملت کھیلنا اپنی سستی خیر خواہی اور چاہیں جس طرح نبرا کے خالی خاندان  
چند بھائی اور وکلا سے لیتے ہیں پوچھتا ہے جو طلبہ لفظ ہے۔  
مشرطہ نہیں داغ دنی مل مرث چھ آئے ہے۔ لہذا ہی حساب سے آپ  
جس قدر چاہیں مل بھیج سکتے ہیں۔  
ایک مل کی نہیں داغ دنیوں کی مرث میں دیکھ سکتے ہیں خاندان کی ذلت  
چند لکھنوی آرڈر یا پرنٹل آرڈر کی چاہیے۔  
ہندوؤں کے خاندان کے ساتھ رہنے کا اختیار ہوگا۔

نام علی و حسن شدہ ایک دوست پر جانے ضروری ہیں۔ سفید کا نام --- کہ لکھو اللہ دیکھ کر پتہ آجائے۔ برمنگھم جیل روم و قریبی باغ میں

پیشی مل سکے ہاں گئے ہیں۔

۵۔ اس ستر کا محفوظ کردہ سر پہرہ جل ۲۸ ح ۱۱ شہ کے اخبارات میں شائع کر دیا ہونے کا نتیجہ کے دن دفتر کی ٹین میں ہتھن ۵ روک ٹوک آسکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر پیوگر کو تاریخ داخلہ کرنے کا اعتبار ہوگا۔

فوٹو: راجدھن ٹی بی کے کامروٹ بنیں۔ ہر کپڑے کو مکمل طور پر ہفت آگاہ کیا جائے گا اور ہر تقسیم انعامات میں کوئی تخفیف نہ کی جائے گی۔

بیتہ مینجری دی پروگریسو کمیٹی نشنل جموں سٹیٹ (پنجاب)



# ہندوستان کا ترمیمی سیاسی مسئلہ فیڈریشن یا وفاق کا قیام ہے

اس موضوع پر اردو زبان میں پہلی بار ایک جامع اور دلچسپ کتاب آسان زبان میں شائع کی گئی ہے۔ اس کا نام "وفاقی ہند" ہے۔ وفاقی ہند کے مطالبے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ گذشتہ ۱۵۰ سے لے کر اب تک ہندوستان پر کس طرح حکومت کی گئی ہے۔ اور جدید آئین ہند ۱۹۴۷ء کی رو سے کس قسم کی فیڈرل یا وفاقی حکومت قائم کی جا رہی ہے۔ وفاقی ہند میں وفاق کی تشریح کر کے بتایا ہے کہ اس ڈھنگ کی حکومت کس طرح چلائی جاتی ہے، اس کی تاریخ کیا ہے اور اس حکومت کے دستوری اجزاء کیا کیا ہوتے ہیں۔ گذشتہ ۱۵۰ سے لے کر ۱۹۴۷ء تک طرز حکومت میں جو جو آئینی تبدیلیاں ہوئی رہی ہیں، ان کو بھی اجمالاً بیان کر دیا ہے۔ ریاستوں کی قدیم و جدید پولیٹیشن پر پوری طرح روشنی ڈالی ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات، ان کا دائرہ عمل، مرکزی اور صوبائی کونسلوں اور اسمبلیوں کا طریق انتخاب، صوبائی خود اختیاری، گورنر جنرل کی عائد پولیٹیشن، ریلوے کا بندوبست، سرکاری نوکریاں، مرکز، صوبوں اور ریاستوں کے انتظامی تعلقات، وفاقی مالیات، انصاف و عدالت۔

غرض جدید دستور کی کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں ہے۔ آخر میں پانچ طبعی سبب ہیں جن سے نفس معنوں کی مزید تشریح و توضیح ہو جاتی ہے۔ جا بجا نقبے بھی دئے ہیں۔ زبان نہایت سادہ، اور انداز بیان نہایت سہل ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اور تیاری بہترین ہے

قیمت صرف ایک روپیہ

کلیم بک ڈپو۔ دریا گنج نمبر ۱۸ جنیتی نو اس دہلی

## دولہا بھائی

مجھے دہلی سے پری جمال صاحبین مزدور لا دینا اور نہ میں تم سے ہرگز نہ بروں کی میں میری ہی کو مشغولی کرتے ہیں وہ دہلی کے ایک خاندانی حکیم صاحب کا بھادر کردہ ہے خوشیوں کا جواب اور غم میں اکیسہ ہے۔ پری جمال صاحبین (میرٹھ) بھادر ہے۔ کاہ رنگ گویا ہوا چہ چند روز کی کرنا سے غم کی مانند غم اور غلاب کی پنک کی طرح شہر و سفید گل آئی ہے۔ چہرے کی قدم چھائیاں۔ ہاں سے غم دہلی کے لئے دہلی میں رہے ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں گلیہ میں ایک صاحبین دانی ایک روپہ دھو

زنا نہ سنگھار کس (میرٹھ) بھادر ہے۔ دہلی کے کس میں پانچ چیزیں اور انعام ہے (۱) پری جمال صاحبین ایک ٹیکہ (۲) پری جمال ٹیکہ (۳) خوشبو دار سٹیک ایک تو (۴) مایہ کی پیار ایک ٹیکہ (۵) دہلی صاحبین ایک ٹیکہ اور (۶) شہر نہ تو نعمت۔ حقیقت لی کس ایک روپہ دہلی کے لئے دہلی

## لطف کی رات کیوں کر گزرتی ہے؟

وہ صحت دہلی کے حکمران قدیم خاندان شریفی کے ایک فرمانی صاحب کلیم محمد یعقوب خاں صاحب کی تھی بیان کے وہ مجربات ہیں جن کو حب عدن۔ افریقہ۔ امریکا تک اپنے اکیر اسے کا سفر میں ہے۔ آدھائیے اور میں حاصل کیے۔

موسمی پریم یا ست شباب کی جان ہے۔ طرہین کو اس قدر خوش کرتا ہے کہ دن کی کامز آجاتا ہے بے مشق خود عاشق بن جاتا ہے۔ حقیقت لی شیطانی طبع ہاں ایک روپہ

من کی موج پسند ہی گویا نہایت معوی اور بھروسہ کا ہے۔ اگر کسی میں۔ وقت ہاں

من کی موج قد پید کرتا ہے کہ مر دھیرول ہوجاتا ہے لی دہلی ایک روپہ آٹھ آنے

۴-۵۔ منیجر دو اخانہ نورتن بازار فراشتخانہ دہلی

ادارۂ ادبیات اردو کا مصور و چھپا دہلی سالہ

# سبب

ذیونگوانی ذیواد اسرت

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحبزادہ میکش (عثمانیہ)

پروفیسر جامعہ عثمانیہ

مسالانہ چند

نمونہ کا پرچہ

سات آنے

چار روپے آٹھ آنے (الطبع)

ملنی کا پتہ

خواجہ حمید الدین بہتم سبب رفت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن

# ادبی دنیا

ملک بھر کے جادو نگار ادیبوں اور شعراء کے بہترین افکار  
۸۶ دلاویز افسانے، مضامین اور نظمیں  
۸۸ مشرق و مغرب کے بلند ترین مصوروں کے نظر افروز شاہکار  
۸۸ بہت رنگ و یک رنگ تصاویر

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے۔ علاوہ محصول ڈاک

سالانہ خریداروں کو مفت

سالانہ چندہ پانچ روپے مع محصول ڈاک

آج ہی اپنا نام خریداروں کی فہرست میں درج کرا کر یہ بے نظیر تحفہ مفت حاصل کیجئے

یہیچ رسالہ ادبی دنیا لاہور

نئے سال کا نیا تحفہ

آئی۔ سی۔ اس۔

اُردو کے بہترین فسانہ نگار پروفیسر شید علی عباس، حسینی۔ ایم، اے۔

مصنف ”رفیق تنہائی“، سر سید احمد پاشا، وغیرہ کے

چودہ انقلاب انگیز افسانوں کا تازہ ترین، مجلد، ودیدہ زیب مجموعہ

ہیڈ آفس :- اٹھین پریس لیڈ آف آباد۔ یا براج :- لکھنؤ۔ لاہور۔ دہلی چیلپور۔ بنارس۔ کلکتہ

سے طلب فرمائیے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

# مطبوعات ۱۹۳۸ء

دہلی کا سنبھالا تذکرہ مہٹی مرحوم کا اسے دوست نہ چھوڑا خواجہ محمد شفیع دہلوی نے دہلی مرحوم کی داستان الم: اس کے ایام عروج کی مرتبہ نگاری، سوئز کے دل ہے اختیار ہو جاتا ہے، کتابت، طباعت اور تجدید کے لئے مکتبہ کا نام کافی ہے۔ صفحات ۵۵ قیمت فی جلد ایک روپیہ

لطائف غائب { سترایم، اسے، شاہ، پی، ایس، سی، الیت، پی، ای، مرزا اسد اللہ خاں غائب کی شوخی بیان، طوٹ طبعی اور ظرافت سے مغلطہ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھے۔ قیمت ایک روپیہ۔

شعلہ طور { تیس ثانی، شاعر فطرت حضرت مگر مراد آبادی کے کلام کا مجموعہ، جو حضرات شعلہ طور پر ایک دفعہ بھی اچھٹی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں وہ اسے شعلہ طور اس طرح لئے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زمانہ انقلاب فرانس میں معاہدہ عمرانی لئے پھرتے تھے۔ اس ایڈیشن میں چند نئی سحرانہ غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ باطل نئی ترتیب۔ از حد دیدہ زیب۔ ہج رنگی سنہرا کر۔ اور جگر کی ایک مینیر تصویر۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

سید حسین { مرد غائب کے کیا بلکہ نایاب فارسی کلام کا مجموعہ۔ اس میں قصائد، قطعات، مثنویاں، ترکیب بند، ترجیع بند، غزلیات اور رباعیات سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مرزا غائب کی مکمل سوانح حیات اور تصنیفات کا تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ روپے

ذکر غائب { مرزا اسد اللہ خاں غائب کی مکمل سوانح حیات، اب تک مرزا صاحب کی سوانح حیات پر یادگار غائب، غائب اور غائب صاحب کی ہنسی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود غائب کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو تھے جو تاریکی میں تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں تمام ممکن ذرائع سے معلومات فراہم کر کے غائب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب اتنی جامع اور مختصر ہے کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے عموماً اور یونیورسٹی کے طلباء کے لئے خصوصاً از بس مفید۔ قیمت آٹھ آنے

قرآن پاک کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا؟ یہ کتاب بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مد نظر رکھ کر آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قرآن پاک آنحضرت پر کس طرح اترتا تھا، آپ کس طرح لوگوں تک پہنچاتے تھے کیسے اس کی حفاظت آپ نے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے کی۔ اور کیسے اس نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ بہت مفصل مع مثال قیمت چھ آنے

دہلی { بچوں کے لئے دہلی کی خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان، جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی۔ ہلک کی چھ تصاویر۔ اچھی اور دہلی ایسی ہوئی دہلیوں کے دو نقشے۔ قیمت چار آنے۔

## مکتبہ جامعہ

دہلی — نئی دہلی — لاہور

نوروز

نوروز

دواشن چکینیاں میں

جملان

نوروز

عام ہائی گزوری اور طاقت مرد شک  
لے اس قدر مفید ہے کہ کسی بھی ایک مقام میں  
کسی تمام انسانہ جس کے مفید ہو جائے  
مردی و شکیناں کی کیمیا کو سونڈا کی  
دودھ کے ساتھ استعمال کریں  
قیمت ۱۲ قرص ہارے آئے

عام ہائی گزوری اور طاقت مرد شک  
لے اس قدر مفید ہے کہ کسی بھی ایک مقام میں  
کسی تمام انسانہ جس کے مفید ہو جائے  
مردی و شکیناں کی کیمیا کو سونڈا کی  
دودھ کے ساتھ استعمال کریں  
قیمت ۱۲ قرص ہارے آئے

# جمیلان

عالیجا بیسٹ الملک حکیم جمیل خان صاحب سیر پرست ہندوستانی دواخانہ دہلی  
وہ نسخہ جس سے دولاکھ سے زائد مریضوں کو آپ تک آرام و فائدہ ہو چکا ہے

طراز دواشن

طراز دواشن

بیطلا آن لوگوں  
کہتے ہیں جن میں  
سستی اور خوش  
کی کمی پائی جاتی ہے  
اس کے استعمال  
سے پہلی رات میرا  
ظاہر ہوتا ہے سبیل  
استعمال کی گزوری  
سستی۔ نگلو  
جملان کی خواہیاں  
دور ہو جاتی ہیں۔  
نہایت مفید چیز ہے  
قیمت شیشی ایک  
اشہ بارہ آئے۔

ان لوگوں کہتے  
ہے اپنے استعمال  
میں خوب کر چکے  
ہیں اور خدا کا عین  
نے انہیں کسی تباہی  
میں نہ رکھا ہے۔  
طراز دواشن  
کے حکم کے ساتھ  
کی کمی پائی جاتی ہے  
اور کئی شہر میں  
ہے۔ اور لوگوں سے  
ماتلا سونڈا کی  
اور فوٹو کے ساتھ  
ہوئی جو قیمت شیشی  
ہارے آئے۔

جریان کا نتیجہ کیا ہے ۱ دل و دماغ و طبع کا کمزور ہونا۔ ۲ ہاضمہ کا بگاڑ۔ ۳ حافظہ کی خرابی۔  
ہمت کی کمی۔ طبیعت کی سستی۔ اولاد سے محرومی جو رول کا درد اور عام ناتوانی پھر  
رفتہ رفتہ انیولیا یا جن باکوئی سخت بیماری مثلاً وٹو ویل وغیرہ۔ اگر آپ کو جریان کی  
شکایت ہو تو فوراً نو صبح کیجئے۔ آج ہی اس سببیں باور کا مہاب دوا کا استعمال شروع  
کر دیجئے۔ جمیلان مرض جریان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہو چکی ہے۔  
جس سے اب تک دولاکھ سے زائد مریضوں کو فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جریان کا ہے پورا ہونا چکا ہوا  
نیا ہر حالت میں اس سے فائدہ ہو رہا ہے۔ رفتہ رفتہ دل و دماغ کی کمزوری اور  
اضمار کا اضمحل دودھ کو کمزور سستی اصل حالت پر آ جاتی ہے۔ بعض پیدا ہونے پر آتا۔  
یوگ خوب لگتی ہے۔ غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے۔ زور دھیرہ پر سستی جھکنے لگتی ہے۔  
جریان کی دواؤں میں جمیلان سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔  
ترکیب استعمال۔ دودھ میں ۱۲ قرص دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔  
قرص تیل۔ گرم اور تیل جیزوں سے پرہیز۔

حبت نمک  
یہ گولیاں دھت پریشانی سے جانتے ہیں صحت کی  
حکایت بالکل دور پہنچاتی ہے تمام صحت کش  
کی چیزوں سے پاک ہیں وہی دواؤں میں لوگوں کو  
پیدا ہونے پر آتا۔ دودھ کو کمزور سستی  
اور فوٹو کے ساتھ ہوئی جو قیمت شیشی  
ہارے آئے۔

قیمت شیشی ہندوستانی  
چار روپے ۱ اشہ آئے

قرص عجیب  
یہ ایک عجیب و غریب دوا ہے جس سے بہتر  
دوا دریافت نہیں ہوئی صرف دوا کی شکایت  
نہیں ہوتی بلکہ سستی و صحت کش  
کی چیزوں سے پاک ہیں وہی دواؤں میں لوگوں کو  
پیدا ہونے پر آتا۔ دودھ کو کمزور سستی  
اور فوٹو کے ساتھ ہوئی جو قیمت شیشی  
ہارے آئے۔

نوروز پرستانی دواخانہ دہلی

# ایک غریب مزاج بہارانی

نے اپنے صدرِ عظم سے کہا کہ دنیا کے ہر چار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کر سکوں، تعمیل حکم کیلئے فردوسِ شال  
انجینئر تسمانیہ کے گھپاش مرغزاؤں  
پھول دُور دراز سفر کے بعد ہدائی  
اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی  
بہارانی کی خشن شناس نگاہوں کو  
کے پورا نہ ہونے سے غول رہنے  
کو فکر و انگیر ہوا، اور وزراء سے  
نے اصغر علی محمد علی سے عطر



کشمیرِ جنتِ نظیر سوئزرلینڈ، شباب  
میں گلِ مینی کی گئی، جب سب  
کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر  
اس قدر رُجھائے ہوئے تھے کہ  
تکلیف ہوئی، بہارانی اس غمِ آہش  
لگی، کھانا پینا ترک کر دیا۔ بہاراجہ  
مشورہ طلب کیا، مہتمم توشہ خانہ  
منگوانے کو کہا، راجے سے معقول تھی،

فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو بہارانی کا شباب رفتہ ایک بار سہرا اپنی پوری پہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

## اصغر علی محمد علی صاحب عطر

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

تَاَذَةُ تَرَيْنَ شَاهَكَارَ

# فکر و شاط

نقش و نگار اور شعلہ و شبنم کے بعد یہ شاعر انقلاب کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جس میں بالکل نئی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ یہ تمام نظمیں نباض فطرت اور حساس شاعر کے زبردست غور و فکر اور طویل مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ ایک ایک شعر میں مسائلِ حیات اور دنیا کے رنگارنگ واقعات پر ایسا رنگین تبصرہ کیا ہے جس کی تشریح و تفسیر و فقرات میں نہیں سمجھ سکتی اور بیان کی شگفتگی و شادابی پر ہزاروں جہن نثار ہیں۔ شاعر انقلاب نے اپنے پیام کے ذریعے اپنے مخاطب کو فکر کی چچ و درچچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ اُسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کرائی ہے۔ دماغ کو الجھنوں میں نہیں ڈالا ہے بلکہ ساز و دل کے تاروں کو بھی چھیڑا ہے، اور اُن سے وہ موسیقی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے پر عالم و جد طاری ہو جاتا ہے، کتابت، طباعت، کاغذ نہایت اعلیٰ ہے، سائز بڑا، صفحات ۱۲۵ سرورق خوشنما رنگین، کتاب مجلد ہے۔ ۱۰ اور

قیمت ایک روپیہ

منہج کلیم باس ڈپو، حنیفی نو اس نمبر، دریا گنج، دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۹

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی

تازہ ترین تصنیف

# جنون و حکمت

یعنی

مجموعہ رباعیات

رباعی، تمام اصناف سخن میں وہ تہما رنگین، عمیق اور فلسفیانہ صنف ہے جو غلیم شعرا کی مشائی کے نقطہ کمال پر جلوہ گر ہوا کرتی ہے، اور کسی شاعر کو اس وقت تک حقیقی رباعی گو شاعر کا پُر شکوہ خطاب نہیں مل سکتا، جب تک کہ اس کی بنی پناہ جنون پر تدفیلی قوت بند ہوتے ہوئے حکمت و بصیرت کے آسمان سے ہڈنٹ نہیں ہو جاتی۔ بہ نسبت ہندوستان میں تمام دوسری چیزوں کی طرح رباعی بھی ہر چہ گیر وطنی ملت شوڈ کے زمرے میں داخل ہو کر ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، یا دامن طریقت نے بزم خودیہ سجد رکھا ہے کہ رباعی نام ہے رباعی کی بحروں میں چار مصرعے موزوں کر دینے کا اور بس۔۔۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو رباعی شاعرانہ مطالعے، شاعرانہ تفکر، شاعرانہ بصیرت، شاعرانہ رنگینی خیال اور شاعرانہ حکمت کا ایک جوہر ہے کہ اگر اس کے ایک حرف کی بھی تفصیل کر دی جائے تو دفتر کے دفتر رنگین ہو جائیں۔

اگر آپ کے دل میں اکثر یہ تہا پیدا ہوئی ہے کہ کاش ہندوستان میں بھی کوئی خیام پیدا ہوا ہوتا تو آپ کا یہ اولین فرض ہے کہ پہلی فرصت میں **جنون و حکمت** کا مطالعہ فرمائیں اور دیکھ لیں کہ فیاض قدت نے آخر کار آپ کے ہندوستان میں ایک خیام پیدا کر دیا ہے اور یہ بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ اس کی قدر نہ فرمائیں۔ آپ کے اور ایمان کے خیام میں فرق اتنا ہے کہ ایران کے خیام کو ایک فیئرز جبریل مل گیا تھا جس نے اسے ایک زندہ قوم سے روشناس کرا دیا تھا، لیکن آپ کا خیام ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہے جو مرده اور غلام ہے اور غلامی کو صرف یہی نہیں کہ کوئی فیئرز جبریل نہیں ملتا، بلکہ خود اس کی قوم بھی اس کی قدر شناسی کے واسطے آسانی سے تیار نہیں ہوا کرتی۔

جنون و حکمت مندرجہ ذیل ابواب پر منقسم ہے۔ (۱) معارف (۲) خوابات (۳) حسن و عشق (۴) پیرانہ سالوں (۵) منفردات

قیمت صرف تین روپے، علاوہ محصول ڈاک

مینجر کلیم بک ڈپو جینی نواس ڈیریا گنج دہلی

